عشرہ مبشرہ

بشیر ساجد

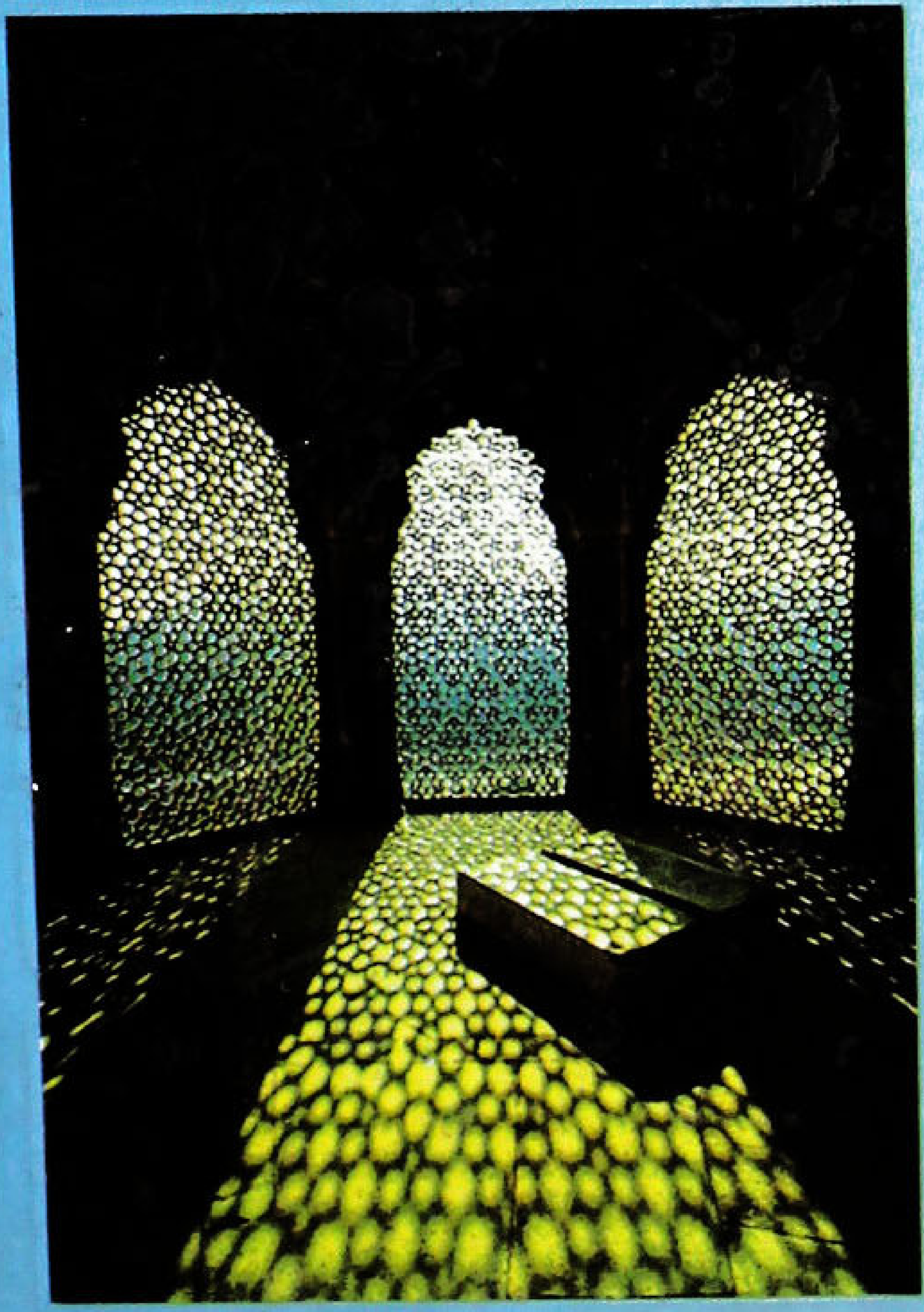

عشرۂ مبشرہ

رضوان اللہ علیہم اجمعین

بشیر ساجد

البدر پبلی کیشنز
23 راحت مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون:042-37225030-37245030-0300-8485030

297-9922

﴿جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں﴾

☆ نام کتاب عشرہ مبشرہ
☆ مصنف بشیر ساجد
☆ ناشر علی سعید
☆ اشاعت دسمبر 2013ء
☆ مطبع نوید حفیظ پرنٹرز لاہور
☆ ہدیہ -/700 روپے

محبِّ محترم

چودھری سردار علی رستگار

کے نام

اقبال کی دعائیں

یوں تو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اردو اور فارسی کلام میں ملت اسلامیہ کے حق میں متعدد پر خلوص اور پر سوز دعائیں ہیں، یہاں صرف بانگ درا اور بال جبریل سے کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ یہ ایسے اشعار ہیں کہ انہیں مناجاتِ صبح گاہی کے طور پر پڑھنے کی ضرورت ہے۔

(۱)

یا ربّ دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے — پھر شوق تماشا دے، پھر ذوق تقاضا دے
محروم تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے — دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل — اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر — اس محملِ خالی کو پھر شاہد لیلا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو — وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر — خودداریٔ ساحل دے، آزادیٔ دریا دے
بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو — سینوں میں اجالا کر، دل صورت مینا دے
احساسِ عنایت کر آثارِ مصیبت کا — امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

(بانگ درا)

(۲)

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے
شرابِ کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے — نفس اس بدن میں تیرے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضٰی رضی اللہ عنہ سوزِ صدیق رضی اللہ عنہ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنا کو سینے میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ تو گرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

فہرست

عنوان	صفحہ
اقبال کی دعائیں	۴
حرفِ اوّل	۱۷
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ	
(ثانی اثنین)	۳۵
چراغ اور پروانہ	۳۶
ابتدائی حالات	۳۸
کنیت	۳۹
قبولِ اسلام سے قبل کی مکی زندگی	۳۹
قبولِ اسلام اور تبلیغی سرگرمیاں	۴۰
تبلیغ اسلام	۴۲
مسلم غلاموں، لونڈیوں کی آزادی	۴۴
واقعۂ معراج کی تصدیق	۴۵
مخالفت کا طوفان	۴۵
ہجرتِ حبشہ کا ارادہ	۴۶
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجیت رسول ﷺ میں	۴۷
ہجرتِ مدینہ	۴۹
مدنی زندگی	۵۵
مدینہ میں سرگرمیاں	۵۵
غزواتِ نبوی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ	۵۶
غزوۂ بدر	۵۷
جنگی قیدیوں سے سلوک	۵۹
غزوۂ احد	۶۰
واقعۂ افک	۶۳
غزوۂ خندق	۶۴
مدینہ کے یہودی	۶۴
صلح حدیبیہ (ذی قعدہ ۶ ھ)	۶۶
فتح خیبر (محرم ۷ ہجری)	۶۷
فتح مکہ (رمضان ۸ ہجری)	۶۸
ابوقحافہ کا قبول اسلام...... چار پشتیں صحابی	۶۹
غزواتِ حنین وطائف (۸ ھ)	۶۹
غزوۂ تبوک (۹ ھ)	۷۰
پہلا اسلامی حج (۹ ھ)	۷۰
حجۃ الوداع (۱۰ ھ)	۷۰
حضور ﷺ کی وفات اور ابوبکر رضی اللہ عنہ	۷۱
انتخاب بطور خلیفہ	۷۴
پہلا خطبۂ خلافت	۷۹
ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے بارے میں چند خیالات	۸۰
خلیفہ کا وظیفہ	۸۸
آندھی ہو یا طوفان!	۸۹
اسامہ بن زید W کی مہم	۸۹
گھمبیر مسائل	۹۲
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن......	۹۳
منکرین زکوٰۃ	۹۴
مرتدین کا انسداد	۹۷
جھوٹے مدعیانِ نبوت اور مرتدین کا خاتمہ	۹۷
۱- اسود عنسی	۹۸
۲- طلیحہ بن خویلد اسدی	۹۸
۳- سجاح	۹۸
۴- مسیلمہ کذاب	۹۸
ارتداد و بغاوت کا خاتمہ (ایک جائزہ)	۱۰۰

عنوان	صفحہ
حج	۱۰۳
روم وایران سے آویزش	۱۰۴
عساکر اسلامی جزیرۃ العرب سے باہر کا رخ کرتے ہیں	
بابِ فتوحات کھلتا ہے	۱۰۷
عراق کی فتح	۱۰۸
جنگ فراض (ذی قعدہ ۱۲ھ۔جنوری ۶۳۴ء)	۱۱۳
مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب	۱۱۵
عراق کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام	۱۱۶
شام وفلسطین کی مہم (۱۲-۱۳ھ)	۱۱۷
فوجوں کو نصیحت	۱۱۹
رومیوں سے تصادم	۱۲۱
اجنادین کا معرکہ (۲۸ جمادی الاولی ۱۳ھ......	
۳۱ جولائی ۶۳۴ء)	۱۲۱
عراق کی صورتِ حال، مثنیٰ کی مدینہ میں حاضری	۱۲۳
جمع قرآن	۱۲۴
صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی علالت اور وفات	۱۲۷
مدت خلافت	۱۲۹
عمر	۱۲۹
چار پشتیں صحابی	۱۲۹
صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذاتی اور خاندانی وصیتیں	۱۲۹
بیت المال کے وظیفہ کی واپسی	۱۳۰
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے زمین کی واپسی	۱۳۱
خمس کی وصیت	۱۳۱
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانشینی کی وصیت	۱۳۱
فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو نصائح	۱۳۵
ازواج واولاد	۱۳۵
۱-قتیلہ بنت عبدالعزیٰ	۱۳۵
۲- حضرت ام رومان بنت عامر رضی اللہ عنہا	۱۳۶
۳-حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بنت عمیس	۱۳۶
۴-حضرت حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ	۱۳۶
حلیہ	۱۳۶
مہرِ خلافت	۱۳۷
حکومت کا نظم ونسق	۱۳۷
مملکت کی صوبوں میں تقسیم	۱۳۷
فوجی نظام اور ضابطۂ عمل	۱۳۸
مالی انتظام۔تقسیم اموال میں مساوات	۱۳۹
محکمہ عدالت	۱۳۹
محکمہ افتاء	۱۴۰
اشاعت اسلام	۱۴۰
ذمیوں سے سلوک	۱۴۰
عہد صدیقی پر مختصر تبصرہ	۱۴۱
سیرتِ صدیقی	۱۴۶
بعد از نبی ﷺ بزرگ توئی	۱۴۶
تصوف	۱۵۲
صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات پر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا خطبہ	۱۵۲
حرفِ آخر	۱۵۴
حضرت عمر رضی اللہ عنہ	
(فاروقِ اعظم)	۱۵۵
قوم کا سردار قوم کا خادم	۱۵۷
منظر بدلتا ہے	۱۵۸
منظر ایک دفعہ پھر بدلتا ہے	۱۵۹
کون فاروق اعظم؟	۱۶۰
خاندان، پیدائش اور اسلام سے پہلے کی مکی زندگی	۱۶۰
پیدائش	۱۶۱
لڑکپن اور جوانی	۱۶۱
شادی، معاش اور دوسری ذمہ داریاں	۱۶۲

عنوان	صفحہ
قبولِ اسلام	۱۶۳
قبولِ اسلام کے وقت عمر	۱۶۷
قبولِ اسلام کے بعد	۱۶۷
فاروق	۱۶۹
ہجرت اور مدنی زندگی	۱۶۹
مؤاخاۃ	۱۶۹
مدنی زندگی	۱۷۰
غزواتِ نبوی میں شرکت	۱۷۱
غزوۂ بدر (۱۷ رمضان ۲ ہجری...... ۱۶ مارچ ۶۲۴ء)	۱۷۱
غزوۂ احد (۷ شوال ۳ھ...... ۲۱ مارچ ۶۲۵ء)	۱۷۲
حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا زمرۂ امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں	
غزوۂ خندق (شوال ۵ھ...... ۶۲۷ء)	۱۷۳
بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ (۶ھ...... ۶۲۸ء)	۱۷۳
غزوۂ خیبر (۷ھ...... ۶۲۹ء)	۱۷۴
اسلام میں پہلا وقف	۱۷۵
فتح مکہ (۱۰ رمضان ۸ھ یکم جنوری ۶۳۰ء)	۱۷۵
غزوۂ حنین (شوال ۸ھ...... فروری ۶۳۰ء)	۱۷۶
تبوک کی مہم (رجب ۹ھ...... ستمبر ۶۳۰ء)	۱۷۶
واقعہ ایلاء	۱۷۶
حجۃ الوداع (۱۰...... ۶۳۲ء)	۱۷۷
واقعۂ قرطاس	۱۷۷
حضور ﷺ کی وفات پر	۱۷۷
عہد صدیقی میں	۱۷۸
خلافت کے لئے نامزدگی	۱۷۸
دورِ خلافت	۱۷۹
۲۴ جمادی الآخر ۱۳ھ تا ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ	۱۷۹
۲۳-اگست ۶۳۴ء تا نومبر ۶۴۴ء	۱۷۹
خطبۂ خلافت	۱۷۹
فتوحاتِ فاروقی	۱۸۱
عراق و ایران	۱۸۲
نمارق، سقاطیہ، بارسماء	۱۸۳
۱۳ھ (اکتوبر ۶۳۴ء)	۱۸۳
ایرانی جرنیل جابان کی گرفتاری اور رہائی کا واقعہ:	۱۸۳
پرتکلف دعوت:	۱۸۴
واقعہ جسر (رمضان ۱۳ھ...... اکتوبر ۶۳۴ء)	۱۸۴
جنگ بویب (رمضان ۱۳ھ...... نومبر ۶۳۴ء)	۱۸۵
جنگِ قادسیہ (رمضان ۱۴ھ...... نومبر ۶۳۵ء)	۱۸۵
عجیب واقعہ	۱۸۶
حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ہدایات	۱۸۶
یزدگرد کے دربار میں اسلامی سفیر	۱۸۸
قادسیہ کا قاصد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خطبہ	۱۹۲
بابل، کوثی اور بہرہ شیر (۱۵ھ...... ۶۳۶ء)	۱۹۳
مدائن کی فتح (صفر ۱۶ھ...... مارچ ۶۳۷ء)......	
دجلہ میں گھوڑے دوڑا دیئے	۱۹۳
جنگ جلولا (ذی قعدہ ۱۶ ہجری...... دسمبر ۶۳۷ء)	۱۹۵
خمس کو دیکھ کر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ رو پڑے	۱۹۵
حلوان، ابلہ، شط العرب، تکریت، جزیرہ وغیرہ	
بصرہ کی بنیاد	۱۹۵
خوزستان (۱۶-۱۷ ہجری...... ۶۳۷-۶۳۸ء)	۱۹۶
ہرمزان کا واقعہ	۱۹۶
جندی سابور کا واقعہ...... غلام کی امان	۱۹۸
جنگ نہاوند (۲۱ھ...... ۶۴۲ء)	۱۹۸
ایران پر حملۂ عام (۲۱ ہجری...... ۶۴۲ء)	۲۰۰
صحابہ رضی اللہ عنہم	۲۰۱
حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ:	
غذا میں عامۃ المسلمین کے ساتھ مساوات	۲۰۱

عنوان	صفحہ
ساریہ رضی اللہ عنہ کی مہم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت	۲۰۲
یزدگرد ترکستان میں	۲۰۳
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقریر	۲۰۴
فتح ایران پر ایرانیوں کا ردِ عمل	۲۰۴
بازنطینیوں سے جنگ	۲۰۸
شام، فلسطین، اردن اور مصر کی فتح	۲۰۸
دمشق (رجب ۱۴ھ..... مارچ ۶۳۵ء)	۲۰۸
اردن کی فتح۔فحل کا معرکہ (ذی قعدہ ۱۴ھ..... جولائی ۶۳۵ء)	۲۰۹
حمص وغیرہ کی فتح (۱۴ھ..... ۶۳۵ء)	۲۱۰
یرموک کی فیصلہ کن جنگ (رجب ۱۵ھ اگست ۶۳۶ء)	۲۱۰
ذمیوں کو شہر سے نکالنے کی مخالفت	۲۱۱
جزیہ کی واپسی	۲۱۱
جبلہ بن ایہم غسانی کا واقعہ	۲۱۴
فلسطین۔بیت المقدس (۱۶ھ..... ۶۳۷ء)	۲۱۴
یروشلم کی فتح پر مولانا ابوالکلام آزاد کے تاثرات	۲۱۶
متفرق کارروائیاں	۲۱۷
مجاہدین کے لئے سرکاری کھانا	۲۱۷
اذان بلالی رضی اللہ عنہ	۲۱۷
مسجد کی تعمیر	۲۱۸
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سفر ہائے شام وفلسطین	۲۱۸
حمص کی بغاوت، جزیرہ کی فتح۔نیز ایشیائے کوچک	۲۱۸
مصر کی فتح (۲۰ھ..... ۶۴۱ء)	۲۱۹
فسطاط	۲۲۰
حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ کا قاصد..... جہانگیری سے ہے دشوار تر کار جہانبانی!	۲۲۰
مصری جنگی قیدیوں سے سلوک	۲۲۰
مصری اراضی	۲۲۱
نیل کی دلہن	۲۲۱
اسکندریہ کا کتب خانہ	۲۲۲
طرابلس کی فتح	۲۲۲
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے مکان کی تعمیر	۲۲۲
فتوحاتِ فاروقی پر تبصرہ	۲۲۲
فتوحات کی وسعت	۲۲۷
فاروقی فتوحات کے اثرات	۲۲۸
متفرق واقعات اور اقدامات	۲۳۰
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی (۱۷ ہجری)	۲۳۰
عرب میں قحط (۱۸ھ)	۲۳۲
طاعون عمواس (۱۸ھ)	۲۳۴
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سفر شام	۲۳۵
غیر مسلموں کا عرب سے اخراج (۱۵ھ)	۲۳۶
سن ہجری کا اجراء (۱۶ھ)	۲۳۷
حکومت کا نظم ونسق	۲۳۸
عمال کے فرائض اور ان کا محاسبہ	۲۳۹
عمال سے عہد	۲۴۱
اثاثوں کی فہرست اور پڑتال	۲۴۲
نظام عدالت	۲۴۴
فوجی نظام	۲۴۶
دیوان..... دفتر رجسٹریشن..... وظائف	۲۴۷
صیغۂ محاصل وخراج..... مفتوحہ اراضی کا بندوبست	۲۴۹
اراضی کی پیمائش، لگان کی تعیین	۲۵۲
عشر	۲۵۲
دیگر محاصل	۲۵۳
بیت المال	۲۵۳
نظام آب پاشی	۲۵۳
پولیس، احتساب کے محکمے اور جیل خانے	۲۵۳

عنوان	صفحہ
محکمہ افتاء	۲۵۴
فقہ واجتہاد	۲۵۴
شعبۂ تعلیم	۲۵۴
اشاعتِ اسلام	۲۵۵
تعمیرات اور متفرق رفاہی اقدامات	۲۵۷
نئے شہر اور چھاؤنیاں	۲۵۷
بصرہ	۲۵۷
کوفہ	۲۵۷
فسطاط	۲۵۸
موصل	۲۵۸
مساجد اور دیگر عمارات وغیرہ	۲۵۸
حرم کعبہ کی توسیع	۲۵۸
مسجد نبوی کی توسیع	۲۵۸
مردم شماری	۲۵۹
سکہ کا اجراء	۲۵۹
انسداد بے رحمی جانوراں	۲۵۹
ذمیوں کے حقوق	۲۶۰
یہودی کی زمین واپس کردی	۲۶۲
ذمی کا روزینہ	۲۶۲
شام کے ذمی	۲۶۲
حمص کے ذمیوں کا جزیہ واپس	۲۶۳
غلامی	۲۶۳
معاشرتی اور معاشی مسئلہ کا حل	۲۶۴
قرضِ حسنہ	۲۷۰
عدل ومساوات	۲۷۲
شہادت	۲۷۴
۲۶ ذی الحجہ ۲۳ ہجری	۲۷۴
خطبہ	۲۷۴
آخری وصیتیں	۲۷۷
جانشینی کا مسئلہ..... انتخابی کمیٹی	۲۷۸
اپنے جانشین کے لئے وصیتیں	۲۸۰
حضرت عبداللہ ابن عباس W کا خراج تحسین	۲۸۱
وفات	۲۸۲
عمر اور مدت خلافت	۲۸۳
حضرت عمر ؓ کے متعلق بزرگ صحابہ ؓ کی آراء	۲۸۴
کیا حضرت عمر ؓ کی شہادت کسی سازش کا نتیجہ تھی؟	۲۸۵
حضرت عبیداللہ بن عمر W کی انتقامی کارروائی	۲۸۷
حضرت عمر ؓ کے ازواج واولاد	۲۸۸
بیٹے پر حد جاری کی	۲۹۰
حضرت عمر ؓ کا حلیہ	۲۹۰
خلافت فاروقی پر تبصرہ	۲۹۱
شورائی نظام	۲۹۳
وحدت اقوام	۲۹۷
سیرت وکردار	۲۹۸
محاسبۂ نفس	۳۰۱
سادہ زندگی اور معاشرت	۳۰۱
ذریعۂ معاش	۳۰۲
معاشی مساوات کا اعلیٰ نمونہ	۳۰۲
احساس ذمہ داری	۳۰۴
باریابی عام.......... آزادئ اظہار	۳۰۴
خدمت خلق	۳۰۵
بیت المال	۳۰۶
اجتماعی زندگی میں انقلاب	۳۱۰
اخلاق عالیہ	۳۱۰
خوف خدا	۳۱۲
جمال وجلال کا امتزاج	۳۱۲

عنوان	صفحہ
دینی غیرت	۳۱۳
قوتِ فیصلہ، عزم محکم	۳۱۳
دیو قامت شخصیت، عقلیت پسند ذہن	۳۱۴
فضل وکمال	۳۱۵
اہل بیت سے تعلقات	۳۱۵
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا	۳۱۷
رسول اللہ ﷺ کے خواب	۳۱۹
ایک متعصب مستشرق کا خراج تحسین	۳۱۹
حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ	
(ذوالنورین)	۳۲۳
بیعت رضوان کا ہیرو	۳۲۵
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خاندان، قبولِ اسلام اور مکی زندگی	۳۲۸
نسب اور خاندان	۳۲۸
پیدائش	۳۲۸
اسلام سے پہلے کی زندگی	۳۲۹
قبولِ اسلام	۳۲۹
حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے عقد	۳۳۰
ہجرتِ حبشہ	۳۳۰
ہجرتِ مدینہ اور مدنی زندگی	۳۳۱
مواخاۃ	۳۳۱
حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے عقد	۳۳۱
غزواتِ نبوی میں شرکت	۳۳۲
غزوۂ تبوک۔ جیش العسرہ	۳۳۳
دیگر رفاہی کام۔ جنت کی بشارتیں	۳۳۳
مسجد نبوی کی توسیع کے لئے زمین	۳۳۴
کاتبِ وحی	۳۳۴
شیخین W سے تعاون	۳۳۴
انتخاب بطور خلیفہ	۳۳۵

عنوان	صفحہ
خطبہ بیعت	۳۴۰
پہلا مقدمہ	۳۴۰
حکام اور عوام کے نام احکام وہدایات	۳۴۲
سول حکام کے نام	۳۴۲
فوجی سالاروں کے نام	۳۴۳
محصلین خراج کے نام	۳۴۳
عامتہ المسلمین کے نام	۳۴۳
بعض ابتدائی اقدامات	۳۴۴
عطیات میں اضافہ	۳۴۴
رمضان میں کھانے کی تقسیم	۳۴۴
فاروقی عمال	۳۴۴
خلافت عثمانی کا ابتدائی دور	۳۴۴
بغاوتیں اور فتوحات	۳۴۴
یزدگرد کا انجام	۳۴۵
اسکندریہ کی بغاوت	۳۴۵
ایشیائے کوچک۔ ایک مسلمان خاتون کی بہادری	۳۴۶
نئی فتوحات	۳۴۶
طخارستان کی فتح	۳۴۷
کش اور دوار	۳۴۷
غزنی وکابل	۳۴۷
بلخ، نساء، سرخس، فرغانہ	۳۴۷
قبرص اور بعض دوسرے رومی مقبوضات کی فتح	۳۴۸
بحری بیڑے کا قیام	۳۴۸
قسطنطنیہ پر حملہ	۳۴۹
شمالی افریقہ.....فتح طرابلس	۳۴۹
الجزائر، تیونس، مراکش	۳۴۹
حبشہ	۳۵۰
اندلس	۳۵۰

عنوان	صفحہ
عثمانی فتوحات کی وسعت وخصوصیت	۳۵۰
حکومت کا نظم ونسق	۳۵۲
فوجی انتظامات	۳۵۳
چراگاہیں	۳۵۴
گورنروں کا عزل ونصب	۳۵۴
حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ	۵
ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا تقرر	۳۵۵
حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی معزولی	۳۵۶
عبداللہ ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا تقرر	۳۵۷
حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی برطرفی اور عبداللہ	
ابن عامر کا تقرر بطور گورنر بصرہ	۳۵۷
سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا تقرر بطور گورنر کوفہ	۳۵۸
ولائت کوفہ پر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا تقرر فتنہ	
وشورش کے ابتدائی آثار	۳۶۰
سرمایہ داری کا آغاز	۳۶۲
حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ	۳۶۳
جمع واشاعت قرآن	۳۶۷
متفرق اقدامات وواقعات	۳۷۱
مسجد حرام کی توسیع (۲۶ ہجری)	۳۷۱
مسجد نبوی میں توسیع (۲۹ ہجری)	۳۷۱
مدینہ کا حفاظتی بند	۳۷۲
قلعے اور چھاؤنیاں	۳۷۲
کبوتر بازی کی ممانعت	۳۷۲
دیگر رفاہی اقدامات وتعمیرات	۳۷۲
خاتم نبوت کی گمشدگی	۳۷۲
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش کے اسباب	۳۷۳
بدوی قبائل	۳۷۶
قریش......بنوہاشم	۳۷۷
مروان بن الحکم	۳۷۸
عبداللہ ابن سبا	۳۸۴
عبداللہ ابن سبا کا کردار	۳۸۶
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات	۳۹۱
مجلس شوریٰ کا تعطل	۴۰۱
کوفی وفد	۴۰۱
اصلاحِ حالات کی کوشش	۴۰۲
عمال سے مشورہ	۴۰۲
حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشورہ	۴۰۳
تحقیقاتی کمیشن	۴۰۵
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اعلان عام	۴۰۶
عمال سے آخری مشورہ	۴۰۶
مجلس شوریٰ کا اجلاس	۴۰۷
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تجویز	۴۰۷
سازش زور پکڑتی ہے	۴۰۹
شہادت عظمیٰ	۴۱۰
(۳۵ھ)	۴۱۰
باغیوں کی مدینہ میں آمد	۴۱۱
باغیوں کی دوبارہ آمد	۴۱۲
محاصرہ	۴۱۴
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر سنگ باری	۴۱۵
محاصرہ کی شدت	۴۱۶
کھانا پینا بند	۴۱۷
حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا باغیوں سے خطاب	۴۱۹
بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن	۴۲۰
فسیکفیکهم اللہ وہو السمیع العلیم	۴۲۲
گھر بار لوٹ لیا	۴۲۲
بیت المال لوٹ لیا	۴۲۲

عنوان	صفحہ
تدفین	۴۲۳
عمر اور مدت خلافت	۴۲۴
شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا ردِّ عمل	۴۲۴
راز دارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ	۴۲۴
حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ	۴۲۵
حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ (یکے از عشرہ مبشرہ)	۴۲۵
فاتح قادسیہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ	۴۲۵
حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	۴۲۵
حضرت ثمامہ بن عدی رضی اللہ عنہ	۴۲۵
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما	۴۲۵
خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس بن مالک	۴۲۵
ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا	۴۲۵
مرثیے	۴۲۶
ولید بن عقبہ:	۴۲۷
نضر بن حارث سہمی:	۴۲۷
شہادت پر تبصرہ	۴۲۸
فضائل اور سیرت و کردار	۴۳۸
عظیم انسان	۴۴۳
طرز معاش و بود و باش	۴۴۴
حلیہ	۴۴۴
ازواج و اولاد	۴۴۴
۱- حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	۴۴۴
۲- حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	۴۴۵
۳- فاختہ بنت غزوان رضی اللہ عنہا	۴۴۵
۴- ام عمرو بنت جندب رضی اللہ عنہا	۴۴۵
۵- فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت الولید بن عبد شمس	۴۴۵
۶- ام البنین بنت عینیہ بن حصن الفزاری رضی اللہ عنہا	۴۴۵
۷- رملہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا	۴۴۵
۸- نائلہ بنت الفرافصہ رضی اللہ عنہا	۴۴۵
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور	۴۴۶
حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق	۴۴۶
ضمیمہ	۴۵۰
قرآن کا متن غیر محرف اور غیر مبدل ہے	۴۵۰
مثالیں:	۴۵۳
راشد خلیفہ کا کام	۴۵۴
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	۴۵۵
حروف مقطعات	۴۵۶
حضرت علی کرم اللہ وجہہ	
(فاتح خیبر)	۴۵۹
فاتح خیبر	۴۶۱
پیدائش اور نام و نسب	۴۶۲
قبولِ اسلام	۴۶۳
مکی زندگی	۴۶۵
ہجرت	۴۶۵
مواخاۃ	۴۶۶
مدنی زندگی..... غزوات میں شرکت	۴۶۶
واقعۂ تبوک۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت	۴۶۸
حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے شادی	۴۶۸
حج اور اعلانِ برأت	۴۶۹
سرایا	۴۶۹
یمن میں تعیناتی۔ دعوت و تبلیغ اسلام	۴۷۰
حجۃ الوداع میں شرکت	۴۷۰
غدیر خم	۴۷۰
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین	۴۷۱
پیشرو خلفاء کی بیعت	۴۷۱
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت..... کار مشکل	۴۷۵

عنوان	صفحہ
۲۴ ذی الحجہ ۳۵ ہجری.....(۲۳ جون ۶۵۶ء)	۴۷۵
کانٹوں کی سیج	۴۷۸
قاتلین عثمان ؓ سے قصاص	۴۸۱
عمالِ عثمانی کی معزولی	۴۸۳
نئے عمال کا تقرر	۴۸۴
علی ؓ.....معاویہ ؓ خط وکتابت	۴۸۴
حضرت علی ؓ کی تیاریاں	۴۸۶
طلحہ ؓ، زبیر ؓ اور عائشہ ؓ	۴۸۷
جنگ جمل (جمادی الثانی ۳۶ھ.....دسمبر ۶۵۶ء)	۴۹۱
حوأب کے کتے	۴۹۲
صلح کی امید	۴۹۵
سبائی گروہ کی شرانگیزی	۴۹۵
سبائیوں کا حملہ	۴۹۶
حضرت علی ؓ، طلحہ ؓ اور زبیر ؓ کی گفتگو.....	
طلحہ ؓ اور زبیر ؓ کی شہادت	۴۹۶
جنگ کا خاتمہ	۴۹۸
حضرت علی ؓ کی ہدایات	۴۹۸
حضرت علی ؓ کی حضرت عائشہ ؓ کی خدمت میں حاضری	۴۹۹
مقتولین کی تدفین	۴۹۹
مخالفین کا مال واسباب	۴۹۹
حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کا اظہار حسرت	۵۰۰
حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کی مکہ روانگی	۵۰۰
جنگ جمل کے نتائج	۵۰۱
کیا جنگ جمل نہیں ہوئی؟	۵۰۴
اُمت مسلمہ کے اتحاد کے تابوت میں آخری کیل	۵۰۸
جنگ صفین	۵۰۸
(ذی الحجہ ۳۶ھ)	۵۰۸
جریر ؓ کا مشن ناکام	۵۰۹
مصالحت کی کوششیں	۵۰۹
آمنا سامنا.....جنگ صفین	۵۱۰
جنگ زوروں پر	۵۱۱
حضرت عمار بن یاسر ؓ کی شہادت	۵۱۲
لیلۃ الحریر اور تحکیم کی پیشکش	۵۱۳
معاہدۂ تحکیم	۵۱۴
فیصلہ تحکیم	۵۱۵
فیصلہ کا اعلان	۵۱۶
تحکیم کے بعد	۵۱۹
خوارج اور جنگ نہرواں	۵۱۹
نہروان کے بعد	۵۲۱
علوی فوج کی بے حسی	۵۲۲
حضرت معاویہ ؓ کے علوی مقبوضات پر حملے	۵۲۴
مصر (۳۸ھ)	۵۲۵
دوسرے علوی مقبوضات پر حملے	۵۲۶
حضرت معاویہ ؓ سے مصالحت	۵۲۸
حضرت معاویہ ؓ کی کامیابی کی وجوہات	۵۲۹
فتوحات اور بغاوتوں کا استیصال	۵۳۱
شہادت	۵۳۲
قاتل کے متعلق وصیت	۵۳۴
تاریخ وفات	۵۳۴
عمر	۵۳۵
تدفین	۵۳۵
عجیب اتفاق	۵۳۵
حضرت علی ؓ کی مدتِ خلافت	۵۳۵
ابن ملجم کا انجام	۵۳۶
حضرت معاویہ ؓ کا اظہار افسوس	۵۳۶

عنوان	صفحہ
حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کا اظہارِ افسوس	۵۳۶
اپنا جانشین مقرر کرنے سے احتراز	۵۳۷
حضرت علی ؓ کے آخری نصائح	۵۳۷
آخری وصیت	۵۳۸
ترکہ	۵۳۹
حلیہ، لباس، غذا وغیرہ	۵۴۰
ازواج واولاد	۵۴۰
حضرت علی ؓ کا مرثیہ	۵۴۴
حضرت علی ؓ کا عہد خلافت	۵۴۴
مختصر جائزہ	۵۴۴
نظم حکومت	۵۴۶
بیت المال	۵۴۷
مالی اصلاحات	۵۴۷
فوجی استحکامات	۵۴۸
ذمی رعایا سے سلوک	۵۴۸
حضرت علی ؓ کے فضائل ومحاسن	۵۴۸
سیرت وکردار	۵۵۱
انفاق فی سبیل اللہ	۵۵۱
سادہ زندگی	۵۵۱
شجاعت	۵۵۲
صائب الرائے	۵۵۳
عدل ومساوات	۵۵۳
بازاروں کی نگرانی	۵۵۴
ایک جامع تبصرہ	۵۵۴
دارمیہ حجونیہ کا واقعہ	۵۵۵
حضرت علی ؓ اور صحابہ کبار ؓ	۵۵۶
اصحاب رسول ﷺ	۵۵۹
حضرت علی ؓ کا خط حضرت معاویہ ؓ کے نام	۵۶۰
حضرت عمر ؓ کے حق میں دعائے خیر	۵۶۰
خلافت عثمان ؓ	۵۶۱
فرقہ بندی کی مذمت اور ممانعت	۵۶۱
ابوبکر ؓ وعمر ؓ	۵۶۳
باہمی تعاون	۵۶۳
طلحہ ؓ وزبیر ؓ	۵۶۴
حضرت عائشہ صدیقہ ؓ	۵۶۵
افراط وتفریط	۵۶۵
بلاتبصرہ	۵۶۵
خلافت راشدہ کا خاتمہ	۵۶۸
حضرت ابو عبیدہ بن الجراح ؓ	
(امین الامت)	۵۷۱
۲ہجری	۵۷۳
نام ونسب - پیدائش	۵۷۵
قبولِ اسلام	۵۷۵
ہجرت	۵۷۵
مدنی زندگی۔ غزوات وسرایا	۵۷۶
ابوبکر ؓ وعمر ؓ کے عہد میں	۵۷۸
سپہ سالاری	۵۷۸
جنگ اجنادین۔ دیگر فتوحات	۵۸۰
فتح دمشق	۵۸۰
معرکۂ فحل	۵۸۲
حمص	۵۸۳
فتح لاذقیہ	۵۸۳
معرکۂ یرموک (رجب ۱۵ہجری)	۵۸۴
جنگ یرموک کا ایک واقعہ	۵۸۶
فتح بیت المقدس کے موقع پر	۵۸۸
رومیوں کی آخری کوشش	۵۸۸

عنوان	صفحہ
شام، آرمینیا، الجزیرہ میں بازنطینی حکومت کا خاتمہ	۵۸۹
گورنری	۵۸۹
طاعون عمواس اور وفات	۵۹۰
مدفن	۵۹۰
اولاد و ازواج	۵۹۱
ذریعۂ معاش	۵۹۱
حلیہ	۵۹۱
سیرت و اخلاق	۵۹۱
حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ	
شاہ سوارِ اسلام (رجل صالح)	۵۹۷
شوال ۳ ہجری	۵۹۹
ایک دوسرا موقع ''رجل صالح''	۶۰۰
نام و نسب	۶۰۱
پیدائش	۶۰۲
قبولِ اسلام	۶۰۲
ہجرت	۶۰۴
مؤاخاۃ	۶۰۴
غزوات۔ راہِ خدا میں پہلا تیر	۶۰۴
بیماری اور حضور ﷺ کی پیشین گوئی	۶۰۵
خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں	۶۰۶
سوئے ایران	۶۰۷
جنگ قادسیہ	۶۰۸
ابو محجن ثقفی رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۶۱۴
بابل۔ کوثی۔ بہرہ شیر	۶۱۶
مدائن کی فتح (۱۵ ہجری)	۶۱۶
جلولا اور دیگر فتوحات	۶۱۸
گورنری۔ نظم و نسق	۶۱۹
کوفہ کی تعمیر (۱۷ ہجری)	۶۱۹
حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے خلاف شکایات اور تحقیقات	۶۲۰
سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا	۶۲۱
اہل کوفہ کے حق میں بددعا	۶۲۱
گورنری سے علیحدگی	۶۲۲
متفرق انتظامات	۶۲۲
خلافت عثمان رضی اللہ عنہ	۶۲۳
دوبارہ گورنری اور معزولی	۶۲۳
حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں	۶۲۵
وفات	۶۲۶
حلیہ	۶۲۶
ازواج و اولاد	۶۲۶
سیرت و کردار	۶۲۷
حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ	
ثالث بالخیر (دومۃ الجندل کا جوانمرد)	۶۳۱
خاندان..... پیدائش	۶۳۴
قبولِ اسلام	۶۳۵
ہجرت	۶۳۵
مؤاخاۃ	۶۳۶
غزوات میں شرکت	۶۳۶
عہد خلفائے راشدین میں	۶۳۷
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب میں کردار	۶۳۹
ذریعۂ معاش	۶۴۵
انفاق فی سبیل اللہ	۶۴۵
ترکہ اور وصیت	۶۴۶
امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی حفاظت اور خبر گیری	۶۴۷
سیرت و اخلاق و علم و فضل	۶۴۷
حلیہ	۶۵۲
ازواج و اولاد	۶۵۳

عنوان	صفحہ
روایت حدیث	۶۵۳
عالم عابد سے بہتر ہے	۶۵۳
بہترین اعمال	۶۵۳
صدقہ دین، معاف کرنے اور سوال نہ کرنے کی عظمت	۶۵۳
عورت اور جنت	۶۵۴
صلۂ رحمی اور قطع رحم	۶۵۴
مریض کی عیادت	۶۵۴
غلاموں سے سلوک	۶۵۴
وفات	۶۵۵
حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ	
صاحب امر......(چلتا پھرتا شہید)	۶۵۷
ابتدائی حالات......نام ونسب	۶۶۱
قبولِ اسلام	۶۶۱
ہجرت	۶۶۱
مواخاۃ	۶۶۱
غزوات میں شرکت۔ طلحۃ الخیر، طلحۃ الجواد، طلحۃ الفیاض	۶۶۲
خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں	۶۶۳
جنگ جمل اور شہادت	۶۶۶
مدفن	۶۶۷
عمر/مماثلت	۶۶۷
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:	۶۶۷
حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا حلیہ	۶۶۹
ذریعۂ معاش	۶۶۹
اولاد و ازواج	۶۶۹
سیرت و کردار	۶۷۰
روایت حدیث	۶۷۱
حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	
(حواریٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم)	۶۷۳
۵ ہجری	۶۷۵
خاندان اور قبولِ اسلام	۶۷۶
ہجرت	۶۷۸
مدنی زندگی، غزوات میں شرکت	۶۷۹
خلفائے راشدین کے عہد میں	۶۸۱
فتح مصر	۶۸۲
حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف اور جنگ جمل	۶۸۴
شہادت	۶۸۶
حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی عمر	۶۸۹
حلیہ	۶۸۹
ازواج و اولاد	۶۸۹
مرثیے	۶۹۰
سیرت و اخلاق	۶۹۱
روایت حدیث	۶۹۴
حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ	
(دگرگوں کرد تقدیر عمر رضی اللہ عنہ را)	۶۹۵
خاندان	۶۹۸
قبولِ اسلام	۶۹۹
ہجرت	۷۰۰
مؤاخاۃ	۷۰۰
غزوات میں شرکت	۷۰۰
عہد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں	۷۰۰
وفات	۷۰۲
سیرت و کردار	۷۰۲
روایتِ حدیث	۷۰۳

حرفِ اوّل

کیا کررہے ہو آج کل؟

کتاب لکھ رہا ہوں

کس موضوع پر؟

عشرۂ مبشرہ پر

عشرۂ مبشرہ؟ کیا مطلب؟

عشرۂ مبشرہ سے مراد وہ دس اصحاب رسول ﷺ ہیں جنہیں ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دی گئی۔

ان کے نام؟

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ، علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ............

یہ نام تو معلوم ہیں، باقی بتاؤ

ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ

اچھا، حضور ﷺ نے انہیں جنت کی بشارت کیوں دی؟

اس لئے کہ انہوں نے اسلام کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہا، اسلام کی خاطر مصیبتیں جھیلیں، قربانیاں دیں، گھربار اور وطن چھوڑا، ہجرت کی، اللہ کی راہ میں جہاد کیا، تقویٰ، اخلاص، بے لوثی، صبر واستقامت اور جاں نثاری کا مظاہرہ کیا۔ ہر حال میں رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیا۔ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں اور جان ومال سے بڑھ کر آپ ﷺ سے محبت کی۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ انہوں نے رسول خدا ﷺ سے اپنے عمل کی زبان سے کہہ دیا۔

ترے آستاں پہ جینا، ترے آستاں پہ مرنا
یہی غائت تمنا، یہی اوجِ سرفرازی

تم نے عجیب بات بتائی جو کبھی پہلے سننے میں نہ آئی۔

اگر آپ نے قرآن مجید فرقانِ حمید میں سورۂ توبہ کی آیات ۲۰-۲۱ ترجمہ کے ساتھ مطالعہ کی ہوتیں تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اللہ نے ان بزرگ ہستیوں کو اپنی خوشنودی اور جنت کی بشارت کیسے شاندار الفاظ میں دی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بلند مرتبہ ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ ان کا ربّ انہیں اپنی خوشنودی اور رحمت اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لئے پائدار عیش کے سامان ہیں۔ اور یہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔''

(التوبہ۔ آیہ ۲۰-۲۱)

اسی طرح قرآنِ مجید میں متعدد دوسرے مقامات پر سابقین الاولین مہاجرین وانصار کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

لیکن یہ آیات تو صحابہ کے ایک خاصے بڑے گروہ کے لئے عمومی بشارت کی حیثیت رکھتی معلوم ہوتی ہیں نہ کہ تمہارے بیان کردہ صرف دس صحابہ کے لئے؟

ہاں! لیکن مذکورہ دس صحابہ کو اس عمومی بشارت کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے خصوصی بشارت بھی دی۔ مشکوٰۃ میں سنن ترمذی اور مسند ابن ماجہ کے حوالے سے یہ حدیث آتی ہے کہ

''عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ جنت میں ہے اور عمر رضی اللہ عنہ جنت میں ہے اور عثمان رضی اللہ عنہ جنت میں ہے اور علی رضی اللہ عنہ جنت میں ہے اور زبیر رضی اللہ عنہ جنت میں ہے اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جنت میں ہے اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جنت میں ہے اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ جنت میں ہے اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جنت میں ہے۔''

اسی مضمون کی حدیث حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ البتہ اس میں انہوں نے ازراہ انکسار اپنا نام نہیں لیا صرف اتنا کہا کہ اگر میں چاہوں تو ایک اور نام بھی بتا سکتا ہوں۔

کیا قرآن مجید میں یا حدیث میں ان دس صحابہ کو عشرۂ مبشرہ کہہ کر پکارا گیا ہے؟

نہیں۔ قرآن تو کیا یہ اصطلاح حدیث میں بھی نہیں آئی۔ لیکن یہ تصور احادیث ہی سے لیا گیا۔ احادیث میں عموماً یہ الفاظ ملتے ہیں عشرۃ فی الجنۃ جس کے بعد ان بزرگ صحابہ کے نام آتے ہیں۔ یہ وہ بزرگ تھے جو صف قتال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے اور صف نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے (یعنی بہت قریب) رہا کرتے تھے۔[1]

وہ اپنی سبقت فی الایمان اور کارناموں کی وجہ سے دوسروں سے ممتاز ہوتے گئے۔[2]

۱- اسد الغابہ بروایت سعید بن مسیب صفِ نماز میں قریب ہونے کا حق اس شخص کو ہوتا ہے جو امام کے بعد امام بننے کی اہلیت رکھتا ہو۔ مؤلف

۲- عشرۂ مبشرہ کے صحابہ ..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوا...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے چند ہی روز کے اندر ایمان لائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رہتے تھے بچوں میں سب سے پہلے مسلمان ہوئے اور سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ آزاد مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آتے ہیں۔ جسٹس سید امیر علی لکھتے ہیں:

''ان (زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ) کے بعد قبیلہ قریش کے ایک معزز رکن عبداللہ بن ابوقحافہ، جنہوں نے آگے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

''گڈ! وری گڈ! جب کتاب چھپے تو ایک جلد مجھے ضرور دینا۔''

چند سال ہوئے آل پاکستان زبیری ایسوسی ایشن کراچی کی طرف سے اخبارات میں دعوتِ عام کے جواب میں راقم نے حواریٔ رسول ﷺ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ پر ایک مضمون لکھا جس پر ایسوسی ایشن مذکور نے مجھے ایوارڈ دیا۔ میں نے خیال کیا کہ میرے اندازِ تحریر کو پسند کیا گیا ہے۔ لہٰذا میں نے اس برگزیدہ گروہ کے دسوں ارکان کے متعلق کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ کتاب کی تکمیل میں کچھ مختلف مصروفیات اور کچھ علالت کی بناء پر تاخیر ہوتی رہی اور اس اثناء میں اپنے ملنے والوں سے مذکورہ بالاقسم کی گفتگوئیں ہوتی رہیں۔ ملنے والوں میں اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ برسرکار اور ریٹائرڈ سرکاری افسر، تاجر، صنعت کار، ادیب، صحافی، دانشور اور شاعر ہوتے۔ ان میں سے نوے فیصد کو عشرۂ مبشرہ کے ماسوائے خلفائے راشدین کے نام تک معلوم نہ تھے۔ اس میں ان سے زیادہ ان کی تعلیم کا قصور تھا۔ کھلی آنکھیں تو میری خانہ صیاد میں آ کر۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنے زمانے کو خیر القرون (بہترین زمانہ) فرمایا ہے اور جن بزرگوں کا یہاں تذکرہ منظور ہے ان کا تعلق اسی زمانے سے ہے۔ اسلام کی تاریخ کے اس بہترین زمانے کے حالات وشخصیات سے بے خبری پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کی سیاسی، معاشرتی، معاشی، تمدنی، تہذیبی، ثقافتی، روحانی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اسے اپنی گزشتہ تاریخ کا علم اور شعور ہوتا کہ وہ اس سے اپنے مستقبل کے لئے رہنمائی اور تخلیقی تحریک حاصل کر سکے۔ لامینٹین (Lamantin) کے بقول ''تاریخ ہمیں سب کچھ سکھاتی ہے حتیٰ کہ مستقبل بھی۔'' ایک دوسرا مغربی دانشور گارفیلڈ کہتا ہے کہ ''تاریخ مستقبل کی پیش گوئیوں کی کھلی کتاب ہے'' مبارک ہیں وہ قومیں جو اپنی گزشتہ تاریخ میں اپنے مستقبل کی پیش گوئیاں پڑھ لیتی ہیں اور تاریخی وقت کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر اپنے مستقبل کو محفوظ اور روشن بنا لیتی ہیں۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے سوا شاید ہی کوئی ایسا مجموعہ افراد ہوگا جو ایک قوم کہلانے کا مدعی ہو اور جس نے اپنی گزشتہ تاریخ کو دفترِ بے معنی اور قصہ کہانی سمجھ کر غرق مئے ناب اولیٰ قرار دیا ہو۔

چل کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نام سے شہرت پائی، دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ آپ خاندان تیم ابن مرہ کے ایک ممتاز فرد اور ایک دولت مند تاجر تھے۔ حلیم الطبع، صائب الرائے، بیدار مغز، دیانتدار اور ہر دلعزیز اپنے ہم عصروں میں بڑی وقعت رکھتے تھے ...... آپ کے بااثر وجحت قبولِ اسلام کا لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ پانچ ممتاز افراد نے ان کی مثال کی تقلید کی جن میں اموی خاندان کے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی تھے جو بعد میں خلیفۂ سوم ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جنہوں نے بعد میں ایران فتح کیا اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے۔ ان سب حضرات نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔'' (سپرٹ آف اسلام کا ترجمہ روح اسلام ص ۹۸)

مصنف پانچ کا ذکر کر کے پانچویں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا نام لینا بھول گئے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور سعید بن زید بھی ایک دو دن کے فرق سے ایمان لے آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قدرے بعد میں آئے۔ امیر علی مزید لکھتے ہیں۔

''ان لوگوں نے آپ ﷺ کی خاطر ظلم وستم سہا، خطرات کا سامنا کیا، جسمانی اذیتیں برداشت کیں اور معاشرتی انقطاع'' کی ذہنی تکلیف اٹھائی۔ یہاں تک کہ اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ (روح اسلام ص ۹۹)

ہم میں علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کا تاریخی شعور سب سے زیادہ گہرا اور تیز تھا۔ انہوں نے فرمایا۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

انہوں نے اسلامی تاریخ کی روایت کے تسلسل اور اس کے گہرے سنجیدہ مطالعہ کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ مثنوی رموز بے خودی میں فرماتے ہیں (ترجمہ)

''جب فرد اپنی تاریخی روایات سے قطع تعلق کر لیتا ہے تو اس کا فہم و ادراک کند ہو جاتا ہے۔ قوم اپنی سرگزشت کے سرمہ سے روشن بصر ہوتی ہے اور اپنی تاریخ کو یاد رکھنے سے اس میں خودشناسی کا جوہر پیدا ہوتا ہے۔ جو قوم اپنی تاریخ کو فراموش کر دیتی ہے وہ بالآخر نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ فرد ہو یا قوم، اُس کے نسخۂ وجود کی شیرازہ بندی اس کی اپنی تاریخ کے ساتھ مسلسل ربط سے ہوتی ہے۔

اے وہ شخص! کہ تو اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکا ہے، کیا تو تاریخ کو محض قصہ کہانی سمجھتا ہے؟ تاریخ تجھے تیری ذات، تیرے وجود کا شعور عطا کرتی ہے، دانائے کار اور مرد راہداں بناتی ہے۔ تاریخ روح کو تاب و توان بخشتی ہے اور جسم ملت کے لئے اعصاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ تجھے اپنی سان پر خنجر کی طرح تیز کر کے دنیا کے مقابلے کے لئے تیار کرتی ہے۔ تاریخ کی شمع قوموں کی قسمت کا ستارہ بن کر ان کے ماضی و حال کو روشن کرتی ہے۔ وہ چشم پرکار و ہوشیار ہے جو تیرے ماضی کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ لیتی ہے اور اسے از سرِ نو زندہ کر دکھاتی ہے۔ اس لئے اپنی تاریخ کو یاد اور محفوظ رکھ۔ تیری محکمی اور پائندگی کا راز اسی میں ہے۔ تاریخ کے نفس ہائے رمیدہ ہی تجھے نئی زندگی بخش سکتے ہیں۔ اپنے ماضی کا اپنے حال سے مضبوط رشتہ جوڑنے سے ہی تجھے کارزار حیات میں کامیابی حاصل ہوگی۔ تیرے ماضی ہی سے تیرا حال نکھر کر سامنے آئے گا۔ اور تیرا حال تیرے مستقبل کو جنم دے گا اگر زندگی جاوداں چاہتا ہے تو اپنے ماضی کا رشتہ اپنے حال اور مستقبل سے منقطع نہ کر۔ تاریخی روایت کے تسلسل کو قائم رکھ۔''

ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے اپنے شاندار ماضی اور اسلامی تاریخ سے منہ موڑ لیا ہے۔ ہماری نئی نسل کو کعبہ کی بجائے ترکستان کی راہ پر چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یورپ، امریکہ اور روس کی تاریخ، تہذیب اور تمدن ہمارے مرکز فکر و عمل بن رہے ہیں۔ جیسے انہی کی تقلید میں ترقی و تجدید کا راز مضمر ہو۔ اور تو اور نئی نسل کو قیامِ پاکستان کے تاریخی اسباب اور پس منظر سے بھی بڑی حد تک بیگانہ رکھا جا رہا ہے اور اس میں یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ کرنے والے اور لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ لگانے والے خاکم بدہن گمراہ اور احمق تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قومی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ متحدہ قومیت کی بجائے علاقائی، گروہی، لسانی اور ثقافتی قومیتوں کے نعرے بلند کئے جا رہے ہیں۔ اپنی اسلامی تاریخ و ثقافت کی طرف رجوع کرنے کی بجائے ہم عملاً مغربی تہذیب اور تصورِ حیات کو اپنا رہے ہیں اور ساتھ ہی اپنی تاریخ کو ہڑپہ، موہنجوڈارو، ٹیکسلا اور بلوچستان کے نو دریافت کھنڈروں سے ملانے اور اس

طرح اپنی تہذیب، تمدن اور ثقافت کی ''قدامت'' ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گویا پاکستان ہڑپہ، موہنجوڈارو وغیرہ کی تہذیبی وثقافتی اقدار وروایات کے احیاء کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ شاید اس طرح ہم مغرب کی ترقی یافتہ اور مہذب قوموں میں شمار ہونا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی پوپھی آئی ہو گزرے ہیں۔ ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈروں سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے ہم ان پر فخر کرتے ہیں اور انہیں سیاحت گاہیں اور تفریح گاہیں بنا رہے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ ممکن ہے یہ قدیم بستیاں اپنے باشندوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے خدائی عذاب کا نشانہ بنی ہوں جس طرح عاد، ثمود، مدین اور سدوم کی بستیوں پر اللہ کا قہر نازل ہوا تھا اور اس لئے ان سے دور رہنا چاہئے اور عبرت حاصل کرنی چاہئے جس طرح کہ قوم ثمود کی بستیوں کے کھنڈروں سے گزرتے وقت حضور اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو وہاں کی سیر کرنے کی بجائے جلدی سے آگے نکل جانے کی ہدایت کی تھی لیکن ہم ان بستیوں سے تہذیب اور ثقافت تلاش کر رہے ہیں۔ شاعر مسعود انور نے کیا خوب طنز کی ہے ؎

اجڑا سا وہ نگر کہ ہڑپہ ہے جس کا نام — اس قریۂ شکستہ و شہر خراب سے
عبرت کی اک چھٹانک بھی حاصل نہ ہو سکی — کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

پاکستانی مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کا آغاز ہڑپہ اور موہنجوڈارو سے ہونا چاہئے یا اسلام کے ابتدائی گہواروں مکہ اور مدینہ سے؟ سوچئے![1]

تمہید کافی طویل ہوگئی۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں ان دس بزرگ صحابہ کے حالات محض تبرکاً اظہارِ عقیدت اور حصولِ ثواب کے لئے نہیں لکھنا چاہتا نہ محض معلومات کی فراہمی کی خاطر۔ یہ کام بعض دوسرے حضرات کر چکے ہیں۔ میرا مقصد یہ دیکھنا اور دکھانا ہے کہ نئے زمانے اور نئے حالات میں ان مقدس ہستیوں کی زندگیوں سے ہم کیا عملی اور فکری رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں اور لادین مغربی خیالات وتصورات اور گھناؤنی مادہ پرستی کے سیلاب کے سامنے بند باندھنے میں ان سے کیا مدد مل سکتی ہے؟ جناب رسالت مآب ﷺ کی رحلت کے بعد زمامِ کار انہی بزرگوں کے ہاتھ میں آئی۔ اور انہیں آئندہ تیس سال کے دوران میں نت نئے مسائل سے سابقہ پڑا جنہیں انہوں نے قرآن وسنت کی روشنی میں اور جہاں ضروری سمجھا اجتہاد سے کام لے کر حل کیا۔ خلافت وحکومت کا قیام اور اس کا نظم ونسق، فتنۂ ارتداد، انکارِ زکوٰۃ اور بغاوت، جھوٹے نبی، روم وایران کی سپر پاورز سے آویزش، جہاد، جنگ، صلح، امن، فتوحات، اموالِ غنیمت، محصولات، مفتوح اقوام سے تعلقات اور سلوک، خارجہ تعلقات مفتوحہ علاقوں کا نظم ونسق، عمال کا تقرر اور ان کی ذمہ داریاں، ان کا محاسبہ، خلیفہ یا حاکم وقت کے فرائض اور رعایا سے اس کے

۱- کراچی کے ایک آغا خانی دانشور اور حیدرآباد یونیورسٹی کے سندھیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے سابق سربراہ نے اپنی انگریزی تصنیف ''سندھی کلچر ...... ایک ابتدائی سروے'' میں لکھا ہے کہ موہنجوڈارو اور وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب سندھی ثقافت کا منبع ہے اور یہ کہ سندھی ثقافت کی روایت دنیا کی ایک قدیم ترین ثقافتی روایت بھی ہے جو مصر، عراق اور چین کی ثقافتوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر سندھ میں اسلامی ثقافت کا اتا پتا نہیں ملتا۔ جی۔ ایم سید بھی سندھ کی گزشتہ چار ہزار سالہ تاریخ کی بناء پر سندھ کے قومی کردار اور ثقافت کی تشکیل وتعمیر کے درپے ہیں۔ گویا اسلام اور مسلم تہذیب وثقافت کو سندھ کے دہانے میں غرق کر دیا جائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مؤلف

تعلقات خلیفہ اور عمال کی عوام کے سامنے جواب دہی، رفاہی ریاست کا قیام، عوام کے لئے روٹی، کپڑے، مکان کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری، ہر بچے، بوڑھے، مرد، عورت کے لئے روزینے، بیت المال میں سے ہر محتاج خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی، مالی امداد کا حقدار، حاکم کے بھی وہی حقوق جو عوام کے زکوٰۃ، جزیہ، عشر خراج اور دوسرے ٹیکسوں کی وصولی کا منصفانہ انتظام، حج، زکوٰۃ اور نماز کا نظام، عدالتی نظام، قاضی (جج) اپنے فیصلوں میں آزاد، قاضی خلیفہ کو بھی عدالت میں بلانے اور اس کے خلاف فیصلہ دینے کا مجاز اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف قاضی وقت نے فیصلے دیئے اور دونوں خلفاء نے بطیّب خاطر قبول کئے۔ مجلس شوریٰ کا قیام، نظامِ اراضی، ملت اسلامیہ کا اتحاد اور سالمیت، جمع وترتیب قرآن، قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم کے لئے مراکز کا قیام، شہروں، چھاؤنیوں، ہسپتالوں، سراؤں، مہمان خانوں، سڑکوں، نہروں کی تعمیر۔ تخریبی تفریحی مشاغل پر پابندی، غرضیکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد بیسیوں نئے مسائل پیدا ہوئے۔ صحابہ میں باہمی اختلافات بھی پیدا ہوئے جو ذاتی اغراض کی بجائے نیک نیتی اور اجتماعی مفادات پر مبنی تھے (مثلاً مسئلہ تقسیم اراضی) اور باہمی صلاح مشورہ سے حل کئے گئے۔ مخالفت برائے مخالفت کا کہیں شائبہ تک نہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا نیک نیتی پر مبنی اختلاف باعثِ رحمت ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ میری اُمت ضلالت پر جمع نہ ہوگی۔ عشرۂ مبشرہ کی زندگیوں کے مطالعہ سے ہمیں نئے حکومتی مسائل اور اختلافات کے حل میں رہنمائی مل سکتی ہے۔ بزرگ صحابہ بغیر کسی ذہنی تحفظ اور انانیت کے ایک دوسرے سے مشورہ کرتے تھے اور صائب مشورے قبول کرتے تھے حتیٰ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے زمانۂ جنگ میں بھی مذہبی مسائل کے حل کے لئے بلا جھجک مشورہ طلب کرتے تھے اور آنجناب رضی اللہ عنہ جواب دیتے تھے۔ آج مسلمان حکومتیں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی کشمکش میں گرفتار ہیں کیونکہ مغرب کی تقلید میں ہم کسی ترقی یافتہ حکومت کے لئے اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ حزبِ اختلاف کیسا ہی صائب مشورہ کیوں نہ دے حزبِ اقتدار اسے قبول کرنا خلاف شان خیال کرتی ہے۔ اور حزبِ اقتدار خواہ کتنا ہی اچھا کام کیوں نہ کرے حزبِ اختلاف اس میں کیڑے ڈالنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ خدا کرے کہ مسلمان حکومتیں سچائی اور سلامتی کا راستہ اختیار کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بزرگ صحابہ کے اسوۂ کو مشعل راہ بنائیں۔ باہمی اخلاص ومحبت، افہام وتفہیم اور اجتماعی خیر خواہی کا رویہ اپنائیں۔ نفاق کی بجائے اتفاق پیدا کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں دنیا کے مختلف مذاہب، یہودیوں، عیسائیوں، ہندوؤں، بودھوں کی مذہبی کتابوں اور روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کو ایک آخری نبی کا انتظار تھا۔ ان کی کتابوں میں پیشن گوئیاں اور بشارتیں موجود تھیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات میں انہیں "وہ نبی" کہا گیا۔ ہندوؤں کے ویدوں پرانوں میں "مامح رشی" اور "کلکی اوتار"۔ بودھوں کی روایات میں آخری بدھ[1] صدہا سال سے مشرق ومغرب کی قومیں اس آخری نبی کی منتظر تھیں نہ صرف اس کی بلکہ اس کے رفقاء صحابہ کی بھی۔ پھر ایک رحمت حق کو حرکت ہوئی

۱۔ جہاں تک راقم کو یاد پڑتا ہے مہاتما بدھ نے بھی اپنے ایک شاگرد نندا کے استفسار کے جواب میں ایک آنے والے آخری بدھ کی بشارت دی تھی لیکن اس وقت مجھے حوالہ یاد نہیں۔ مؤلف

۱۲۴۹۲۴

اور دعائے خلیل اور نوید مسیحا اور اللہ کے کتنے ہی دوسرے پیغمبروں موسیٰ علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام وغیرہم کی بشارتوں کی صداقت کے ظہور کا وقت آ پہنچا۔

(ا) ''خدا سینا سے آیا اور شعیر[1] سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی'' [2]

(عہد نامہ عتیق، کتاب استثنا ۳۳ باب ۱ آیت ۲)

(ب) انجیل یوحنا اور انجیل برنباس میں حضرت مسیح نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی [3]

(ج) حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا ''میرا محبوب سرخ وسفید ہے (خلوی محمدیم) دس ہزار آدمیوں کے درمیان جھنڈے کی طرح کھڑا ہوتا ہے۔[4] (عہد نامہ عتیق غزل الغزلات، باب ۵ آیت ۱۰)

(د) اللہ جنوب سے اور وہ جو قدوس ہے کوہِ فاران سے آیا۔ اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی [5] (عہد نامہ عتیق، صحیفہ حبقوق نبی باب ۳ ۲ آیت ۳)

(ر) ہندو مذہب کی چار مقدس ترین اور قدیم ترین کتابیں وید ہیں آخری وید کا نام اتھروید ہے۔ جدید محققین کے مطابق یہ وید چار ہزار سال پرانے ہیں۔ اتھرووید کے بیسویں باب کے کنتاپ سوکت کے پہلے منتر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء یعنی صحابہ کے بارے میں آیا ہے۔

''اس (برہما یعنی خدا) نے مامح رشی کو سو دینار، دس تسبیحیں، تین سو گھوڑے اور دس ہزار گائیں دیں۔''

(ترجمہ از پنڈت کھیم کرن و پروفیسر راجہ رام)

مامح سے مراد بہت تعریف کیا گیا پیغمبر یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مامح محمد ہی کا سنسکرتی تلفظ معلوم ہوتا ہے۔

سو طلائی دینار سے وہ سابقون الاولون صحابہ اور صحابیات مراد ہیں جنہوں نے مکہ سے حبشہ ہجرت کی (بعد

۱۔ فلسطین کی ایک پہاڑی

۲۔ فاران مکہ کا قدیم نام ہے اور وہاں کی ایک پہاڑی کا بھی۔ دس ہزار قدوسیوں سے مراد وہ دس ہزار بزرگ صحابہ ہیں جو فتح مکہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے۔ مکہ یا وادیٔ مکہ کے لئے فاران کا لفظ عربی، فارسی اور اردو لٹریچر میں استعمال ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے اپنی مسدس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا ''اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر'' علامہ اقبال نے بانگ درا میں اپنی نظم ''دعا'' میں لکھا ہے

پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے

۳۔ تفصیلی حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد ۵ صفحات ۶۹ تا ۲۷

۴۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے صاف صاف محمد کہا، یہودیوں نے سرخ وسفید بنا دیا۔ دس ہزار صحابہ کا ذکر یہاں موجود ہے۔ مؤلف

۵۔ مدینہ سے مکہ جانب جنوب ہے اور فاران مکہ کا قدیم نام ہے۔ قدوس سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مؤلف

میں دوسری ہجرت مدینہ بھی کی)

دس تسبیحوں سے مراد عشرۂ مبشرہ ہیں

تین سو گھوڑوں سے مراد اصحابِ بدر ہیں۔

دس ہزار گائیوں سے مراد وہ دس ہزار صحابہ ہیں جو فتح مکہ میں آنحضرت ﷺ کے ہمرکاب تھے۔[۱]

دس ہزار قدوسیوں یا دس ہزار گایوں کے جلو میں آتشی شریعت لے کر آنے والے دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے آخری (خاتم النبیین) پیغمبر محمد ﷺ ہی تھے۔ پیشن گوئیوں کی سب علامتیں انہی پر صادق آتی ہیں۔[۲]

حال ہی میں بھارت کے ممتاز عالموں اور پنڈتوں نے ایک کتاب ''کلکی اوتار اور محمد صاحب'' میں اعلان کیا ہے کہ انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے آنے والے جس کلکی اوتار کا عقیدہ ہندوؤں میں چلا آتا ہے وہ محمد عربی کے روپ میں آچکے ہیں۔ کتاب کے مصنف پنڈت وید پرشاد اپادھیا ایم۔اے ہیں جو الہ آباد کی پر باگ یونیورسٹی میں سنسکرت کے ریسرچ سکالر ہیں۔ ان کی تحقیق پر آٹھ دوسرے ممتاز پنڈتوں نے نظرثانی کی ہے اور پرزور تائیدی نوٹ لکھے ہیں۔ مصنف اور ان کے مؤیدین نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں پرانوں سے جو ویدوں ہی کی طرح اہم، مقدس اور قدیم سمجھے جاتے ہیں، متعدد حوالے نقل[۳] کیے ہیں۔ پرانوں میں کلکی اوتار کی پیدائش، ملک خاندان، والدین کے بارے میں جو کچھ مرقوم ہے وہ حضرت محمد ﷺ کے سوا کسی دوسرے بزرگ یا پیغمبر پر صادق نہیں آتا۔ کلکی اوتار اپنے چار ممتاز پیروؤں کی مدد سے شیطان کو شکست دیں گے۔ چنانچہ محمد ﷺ عربی نے اپنے چار خلفائے راشدین۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ کے تعاون سے سرزمین عرب سے شرک و بت پرستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور شیطانی قوتوں کو شکست دی۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفاء نے عرب اور اردگرد کے دوسرے ممالک کو بھی ضلالت، گمراہی اور گناہ کے اندھیروں سے پاک کر دیا۔ بھارت کے ایک بڑے حصے میں بھی تطہیر اور صفائی کا یہ کام ہوا۔ اسی لئے وہاں آج بھی پندرہ کروڑ محمد ﷺ کے نام لیوا موجود ہیں۔

حضرت محمد ﷺ کے جن دس ہزار قدوسیوں یا گایوں، تین سو گھوڑوں کا حوالہ پچھلے صفحات میں دیا گیا ہے۔ یعنی فتح مکہ اور فتح بدر میں شامل ہونے والے صحابہ۔ ان میں الگ طور پر مذکور دس تسبیحیں یا دس گلدستے بھی ہر بار

---

[۱] گائے کو رعب و جلال اور ہلاکت کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔ (رگوید، منڈل ۵، سوکت ۵۶ منتر ۳) گئے صلح و اتفاق کی علامت بھی ہے۔ (رگوید، منڈل ۱۰، سوکت ۱۱۲، منتر ۳) یعنی محمد ﷺ کے ساتھی گائے کی طرح مقدس اور رحم و محبت کے مجسمہ ہیں اور اندر دیوتا کی طرح بارعب اور خوفناک بھی۔ قرآن میں انہیں اشداء علی الکفار اور رحماء بینھم (۲۹:۲۶) کہا گیا ہے۔

[۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، بھارت اور ہفت روزہ ''ختم نبوت'' کراچی نیز صدیقی ٹرسٹ کراچی کا شائع کردہ کتابچہ ''حضرت محمد سچے رسول اور نبی آخرالزماں ہیں'' مؤلف

[۳] ان حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو الحاج بشیر الدین پنڈت کا مضمون ''ہندوؤں کی کتب مقدسہ میں بشارات آنحضرت ﷺ''، نقوش: رسول نمبر جلد ۴ صفحہ ۵۵۴

شامل ہیں جن سے مراد عشرۂ مبشرہ ہیں۔ یہ حق و باطل کی پہلی جنگ ''غزوۂ بدر'' میں بھی شامل تھے۔ فتح مکہ والے دس ہزار قدوسیوں میں بھی موجود تھے۔ ان میں سے بعض ان سو طلائی دیناروں میں بھی تھے جن سے مراد حبشہ کو ہجرت کرنے والے صحابہ ہیں۔ یہ دس صحابہ جنگ احزاب میں بھی تھے جس کا ذکر اتھروید کانڈ ۲۰ سوکت ۲۱ منتر ۶ میں آیا ہے۔ غزوۂ احزاب کے غازیوں کا ذکر یوں ہے۔

> ''اے صادقوں کے رب! تجھے ان سرور دینے والوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں اور مستانہ ترانوں سے دشمن کی جنگ میں مسرور کیا۔ جب حمد کرنے والے نیز عبادت کرنے والے کے لئے تو نے دس ہزار دشمنوں کو بغیر مقابلہ شکست خوردہ کر دیا۔''[1]

غزوۂ احزاب میں دشمن کی تعداد دس ہزار تھی اور واقعی وہ بغیر مقابلہ شکست خوردہ ہو کر چلے گئے۔ غزوۂ بدر میں شامل صحابہ کو اپنے بہادرانہ کارناموں اور مستانہ ترانوں سے دشمن کی جنگ میں مسرور کرنے والے کہا گیا ہے۔ غزوۂ احزاب میں بھی عشرۂ مبشرہ شامل تھے۔

ان تمام حوالوں سے ایک بات واضح ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی زندگی اور مشن کے تمام اہم واقعات میں حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی، عبدالرحمان بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ، زبیر، ابوعبیدہ اور سعید بن زید (رضی اللہ عنہم) نے سرگرم اور جانفروشانہ کردار ادا کیا۔

۱- یہ دس بزرگ صحابہ سابقون الاولون مہاجر صحابہ میں ممتاز ہیں۔ انہوں نے اس وقت اسلام قبول کیا جب مشرکین مکہ کی وجہ سے ایسا کرنا آبیل مجھے مار کے مترادف تھا۔ انہوں نے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور مکی معاشرہ کی مخالفت مول لی۔ طرح طرح کے شدائد اور مظالم برداشت کئے لیکن اسلام کا دامن نہ چھوڑا۔

۲- رسول اکرم ﷺ کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور رہے اور مشرکین کے معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کی اذیت ناک سختیاں برداشت کیں۔

۳- حضور ﷺ کے حکم پر اپنا وطن، گھربار، مال، جائیداد اور عزہ واقارب کو چھوڑ کر ہجرت کی۔

۴- جب دشمنوں نے مکہ سے ہجرت کر جانے کے بعد بھی پیچھا نہ چھوڑا تو غزوۂ بدر میں جانفروشی سے مقابلہ کر کے انہیں شکست دی اور اتھر وید کی پیشین گوئی کے تین سو گھوڑوں کے مصداق ٹھہرے۔

۵- غزوۂ احزاب کے اس قدوسی لشکر میں بھی شامل تھے جس نے دس ہزار دشمنوں کو بلا مقابلہ شکست دی۔

(الاحزاب: آیات ۹ تا ۲۵)

۶- بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ میں شرکت کی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح میں ان سے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔[2]

---

[1] نقوش رسول نمبر جلد ۴ صفحہ ۵۵۶

[2] ''اے نبی جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے، وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے، ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔'' (الفتح آیہ ۱۰)

''اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے (اے نبی ﷺ!) تم سے بیعت کر رہے تھے۔'' (الفتح آیہ ۱۸) (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۷- فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار قدوسیوں کے اس لشکر میں بھی شامل تھے جس کا ذکر عہد نامہ عتیق کی پیشین گوئیوں میں بھی ہے۔

۸- سفر تبوک کے جیش العسرۃ کے لئے کسی نے اپنا سارا مال ومتاع حضور ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا، کسی نے نصف، کسی نے ہزاروں طلائی دینار، اونٹ گھوڑے اور سامان سفر لا کر ڈھیر کر دیا۔ سب نے عام صحابہ سے بڑھ چڑھ کر مالی قربانی دی اور پھر اس دور دراز اور خطرناک سفر میں خوشی سے شرکت کی۔

۹- حجۃ الوداع کے اہم موقع پر جب ایک لاکھ سے زائد صحابہ کی موجودگی میں دین کی تکمیل اور شیطانی قوتوں کی مکمل ہزیمت کا اعلان کیا گیا تو بھی نبی رحمت ﷺ کے ہمراہ تھے۔

۱۰- علاوہ ازیں یہ بزرگ صحابہ غزوۂ احد، غزوۂ خیبر، غزوۂ حنین اور متعدد دوسرے غزوات میں بھی جنابِ رسالت مآب ﷺ کے ہمرکاب رہے اور کسی قسم کی قربانی دینے اور اطاعت بجالانے سے دریغ نہیں کیا۔

۱۱- ان کی عظیم ولاثانی خدمات پر اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے (رضی اللہ عنہم ورضوعنہ) رسول خدا نے انہیں جیتے جی جنت کی بشارت دی۔

یہ مردان خدامست، آسمان ہدایت کے ستارے، اس زمین پر اللہ کی قدرت ورحمت کے چلتے پھرتے نشان تھے۔ یہ وہ بندگان مولا صفات تھے جن کے ہاتھ اللہ کے ہاتھ تھے، کارکشا، کارساز۔ ملت اسلامیہ کے قوام اور تاریخ اسلامیہ کے صورت گر۔ جنہوں نے اپنے خون جگر اور اپنی قربانیوں سے اسلام کے رنگ روپ کو نکھارا۔ وہ خود اللہ کی خشیت اور اطاعت کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگے ہوئے تھے اور عشق رسول ﷺ کی خوشبو سے معطر تھے۔ اور اس رنگ اور خوشبو سے بہتر اور کون سے رنگ وبو ہو سکتے ہیں؟

اور پھر ان میں سے ممتاز ترین دس اصحاب رسول ﷺ...... عشرۂ مبشرہ...... دس جنتی، دس رتن! دین فطرت کے پاکیزہ دودھ کی بالائی!

دنیا کی تاریخ کو ایک سرے سے دوسرے سر تک کھنگال جایئے، کسی پیغمبر، کسی داعی، کسی فرمانروا کو ایسے قابل اعتماد جاں نثار، ایسے سربکف، ایسے مخلص، ایسے متقی، ایسے نیکوکار، ایسے اطاعت گزار، ایسے حق گو، ایسے صابر، ایسے شاکر، ایسے متوکل، ایسے شجاع، ایسے فاتح، ایسے منتظم، ایسے صاحب عزم، ایسے منکسر، ایسے سخی، ایسے جواد، ایسے عادل، ایسے حق شناس، ایسے مساوات پسند، ایسے دیانتدار، ایسے عارف باللہ، خدائے واحد کو پوجنے والے افراد، اس کے سوا کسی سے نہ ڈرنے والے رفقاء مصاحب اور مشیر میسر نہیں آئے۔

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع وسجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں پاؤ گے۔ سجود کے نشان ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی، کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔'' (الفتح آیہ ۲۹)

جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ میرے صحابہ میں مہاجرین وانصار کا مرتبہ سب سے بلند ہے اور مہاجرین وانصار میں اہل حدیبیہ کا مرتبہ اور اہل حدیبیہ میں اہل بدر کا مرتبہ۔ عشرۂ مبشرہ اہل بدر میں بھی شامل تھے اور دوسرے غزوات ومشاہدات نبوی میں بھی۔ اس لئے دوسرے مہاجرین وانصار سے بھی وہ مراتب وفضائل میں بلند تر ہیں۔ انہوں نے منادی کرنے والے ﷺ کی ندا پر سب سے پہلے لبیک کہی۔ تلواروں کے سائے میں خدا اور رسول ﷺ کے عشق کی نمازیں پڑھیں۔ اپنی ساری توانائیاں دین حق کی سربلندی کے لئے وقف کر دیں۔ حق و باطل کے معرکے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو قتل کرنا چاہا مگر رحمت اللعالمین نے روک دیا، عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کافر ماموں کو اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے کافر باپ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ دوسروں نے بھی عظیم قربانیاں دیں۔ اور فداکاری کے مظاہرے کئے۔ ان کی نظر میں راہ حق میں جان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

اے زندگی سپرد خدا کر دیا تجھے — بے فکر ہو گئے ترے سود و زیاں سے ہم

گاڈے فرے ہگنز نے اپنی تصنیف ''اپالوجی'' میں لکھا:

''عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد (ﷺ) نے وہ درجہ نشۂ دینی کا اپنے پیروؤں میں پیدا کیا جس کو مسیح کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ جب مسیح علیہ السلام کو سولی پر لے گئے[1] تو ان کے پیرو بھاگ گئے اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجے میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے۔ اس کے برعکس محمد ﷺ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ ﷺ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر دشمنوں پر آپ ﷺ کو غالب کیا''[2]

اصحاب محمد ﷺ نے آپ ﷺ سے عرض کیا:

''یارسول اللہ! ہم آپ ﷺ کو وہ جواب نہیں دیتے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ کو دیا تھا کہ تم اور تمہارا رب جاؤ اور دونوں لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ بلکہ اس ذات کی قسم ہے۔ جس نے آپ کو برحق نبی مبعوث فرمایا ہم آپ کے آگے بھی لڑیں گے، پیچھے بھی لڑیں گے، آپ ﷺ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے۔ دشمن آپ ﷺ تک نہیں پہنچ سکے گا جب تک ہماری لاشوں پر سے نہ گزرے۔

ہم آپ پر ایمان لائے۔ آپ ﷺ کی اطاعت کا عہد کیا۔ اللہ عزوجل کی قسم جس نے آپ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا، آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود جائیں۔ انشاء اللہ آپ ہمیں میدانِ جنگ میں ثابت قدم اور شجاع پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے آپ ﷺ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے گا''[3]

---

[1] عیسائی اعتقاد کے مطابق

[2] بحوالہ سیرت النبی ﷺ جلد اول، صفحہ ۲۴۳ طبع چہارم

[3] تاریخ طبری جلد اول، حالات غزوہ بدر (ملخصاً)

چند ہی سال بعد دس ہزار قدوسیوں کی شکل میں یہ جاں نثارانِ محمد ﷺ اپنے آتشیں شریعت والے ہادی و آقا کی زیر قیادت ابراہیم خلیل اللہ کے تعمیر کردہ پہلے خانۂ خدا کو بتوں سے پاک کرنے اور اس میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے مکہ پہنچ گئے اور ان کے آقا سرورِ کائنات نے اپنے جانی دشمنوں کو بھی لاتثریب علیکم الیوم کا اعلان کر کے عام معافی دیدی۔ توحید خداوندی کا بول بالا ہوا اور سرزمین عرب سے بتوں کی خدائی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور شیطان مایوس ہو گیا۔

انجیل متی کی آیات ۱۳ اور ۱۵ کے مطابق دراصل یہی مقدس ہستیاں ''زمین کا نمک'' اور دنیا کا نور تھیں۔ انہی کو خدائے قدوس نے اپنی خوشنودی کی خوشخبری دی۔ اللہ نے ان کا تقویٰ میں امتحان لیا اور وہ اس میں کامیاب رہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا سبھی صحابہ کو مختلف مقامات پر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی اور جنت کی بشارت دی ہے۔ اور حضور اکرم ﷺ نے انہیں ہدایت کے ستارے کہا ہے۔ عشرۂ مبشرہ ان میں کے دس روشن ترین ستارے ہیں۔ حضور ﷺ نے اپنے نام لیواؤں کو تمام صحابہ کو بلا تفریق واحدے برا کہنے سے منع فرمایا ہے۔ اتھرو وید میں انہیں دس تسبیحیں یا دس گلدستے کہا گیا ہے۔ دس کا عدد اسلامی روایات میں ایک خاص روحانی معنویت رکھتا ہے۔ مثلاً سورۂ الفجر (۸۹) میں اللہ تعالیٰ نے دس راتوں (ولیال عشر) کی قسم کھائی ہے اور پھر رمضان کے آخری عشرہ کی اعتکاف کی دس راتیں جو روحانی عروج و سعادت کی دس راتیں ہوتی ہیں۔ ذی الحجہ کے ابتدائی دس دن جو سنت ابراہیمی کے اتباع میں حج اور قربانی کا ایک زندہ جاوید اور عظیم مظاہرہ ہوتے ہیں اور پھر عشرۂ محرم جس سے اسلامی تقویم یعنی سن ہجری کی ابتداء ہوتی ہے اور نواسۂ رسول ﷺ حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی شہادتِ عظمیٰ کا بھی انہی ایام عشرہ سے تعلق ہے۔ عشرۂ اعتکاف میں بھی دوسری عبادات کے ساتھ روزے رکھے جاتے ہیں۔ ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو بھی خاص طور پر روزہ رکھا جاتا ہے۔ محرم کی نویں اور دسویں تاریخوں کو روزہ رکھنے کی بھی رسول اللہ ﷺ نے تاکید فرمائی ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کو ہدایت کے ستارے کہا ہے۔ لوگ پرانے وقتوں میں زہرہ، مشتری، چاند، زحل، عطارد اور دوسرے آسمانی نجوم سے سفر اور موسموں اور بعض انسانی گروہ اپنی قسمتوں کے بارے میں بھی رہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ ہیئت دانوں کے نزدیک ہماری زمین سے متعلق نظامِ شمسی کے یہ دس سیارے ہیں۔

سورج، چاند، زہرہ، مشتری، عطارد، مریخ، زحل، یورینس، نپ چون اور پلوٹو

عشرۂ مبشرہ کو ملت اسلامیہ کے دس سیارے بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ بزرگ ملت اسلامیہ کی تاریخ پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے۔ ان کی کوششوں سے اسلام پھیلا اور اسے شوکت اور غلبہ حاصل ہوا۔ مشہور انگریز ماہر علم الاعداد کیرو کے خیال کے مطابق ۱۰ کا عدد بڑی گہری معنویت رکھتا ہے۔ ہندسہ ا خالق مطلق کی توحید کا نمائندہ ہے اور صفر ابدیت کی علامت ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عشرۂ مبشرہ ابدی بشارت و سعادت اور خدائے واحد کی خوشنودی کے حامل ہیں۔ دس کا عدد مختصر کرنے سے ایک رہ جاتا ہے (۱+۰=۱) یعنی توحید اور یکتائی کا عدد۔

آپ چاہیں تو عشرۂ مبشرہ کو پیغمبرِ اسلام ﷺ کے مقدس اور بابرکت ہاتھوں کی دس انگلیاں بھی کہہ سکتے ہیں۔ دس انگلیاں، دسواں چراغ، انگلیوں ہی سے کام کئے اور لئے جاتے ہیں۔ مقدس ہاتھوں کی انگلیوں سے معجزے اور کرامتیں ظہور میں آتی رہی ہیں۔

بہرحال یہ دس بزرگ ہستیاں ہیں جنہوں نے نہ صرف تاریخِ اسلام کو جس رخ پر ڈالا بلکہ دنیا کی تاریخ کا دھارا بھی بدل دیا۔

ان دس بزرگوں کی اپنی اپنی نمایاں شان ہے۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است! رسول اکرم ﷺ کے بعد دوسرے صحابہ انہی کی طرف رہنمائی کے لئے دیکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے بعد اپنی جانشینی کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر مشتمل انتخابی کونسل نامزد کی۔[1] اور فرمایا کہ یہ حضرات اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ دوسرا کوئی شخص اس امرِ خلافت کا ان لوگوں سے زیادہ حقدار نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی وفات تک ان سے خوش تھے۔ یہ تمام حضرات سابق الایمان مہاجرین میں سے ہیں۔ اور اپنے اخلاقِ حمیدہ، اوصاف برگزیدہ، کارناموں اور قربانیوں کی بناء پر اصحابِ رسول ﷺ کے سرخیل، حسب خدا حب رسول ﷺ حب دین، حب ایمان، فہم قرآن اور سمع و طاعت میں ممتاز۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ہیرو تھا اور حضور اکرم ﷺ ہیروؤں کے ہیرو۔ ٹامس کارلائل نے گزشتہ صدی میں آپ ﷺ کو ہیرو پیغمبر لکھا۔ کسی نے دنیا کا سب سے بڑا قانون ساز قرار دیا۔ کسی نے لکھا کہ اگر محمد خدا کا پیغمبر نہیں تو پھر دنیا میں کوئی بھی خدا کا پیغمبر نہیں ہوا۔ کسی نے لکھا کہ اگر محمد سچے پیغمبر نہ ہوتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ جیسے لوگ کبھی ان کی پیروی اختیار نہ کرتے۔ وغیرہ وغیرہ۔

حضرات عشرۂ مبشرہ صحیح معنی میں عظیم المرتبہ ہیرو تھے۔ غیر مسلم مؤرخین اور محققین نے بھی انہیں ہیرو تسلیم کیا۔ انہوں نے اللہ کے آخری پیغمبر ﷺ اور مخبر صادق کے پیغام رشد و ہدایت کو اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر دنیا میں پھیلایا ضلالت و گمراہی اور ظلم و جہل کی تاریکیوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو روشنی، آزادی، عدل اور مساوات کی راہ دکھائی۔ دنیا کو نسل، رنگ اور خون کے امتیازات سے نجات دلائی۔ قیصر و کسریٰ کے پنجۂ استبداد میں تڑپنے پھڑکنے والی کمزور و بے بس مخلوق کے دلوں کو سوزِ یقیں سے گرمایا۔ احترامِ انسانیت کا علم بلند کیا۔ لوگوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کے تحفظ کو معاشرے اور حکومت کی بنیادی قدروں اور اصولوں میں شامل کیا۔ روٹی، کپڑے اور مکان کے حصول کو ہر شہری کا حق قرار دیا۔ حاکم و محکوم کے درمیان حائل پردوں کو اٹھایا۔

نے کوئی فغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں

محمد رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ جاں نثاروں نے دنیا میں پہلی مرتبہ فلاحی مملکت قائم کی جس کی بنیاد خوف خدا، عدل و مساوات، احترامِ انسانیت، آزادیٔ اظہار اور شورائی جمہوریت پر تھی۔ سب کے حقوق برابر تھے کسی کو

---

[1] حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو اس میں اس لئے شامل نہ کیا کہ وہ آپ رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے اور آپ اپنے رشتہ داروں کو امرِ خلافت سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ مؤلف

کسی پر ترجیح نہ تھی۔ البتہ بزرگی کا معیار تقویٰ تھا۔ امورِ مملکت میں مشورہ دینے میں سب آزاد اور بے باک تھے۔ رعایا کا ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سربراہ مملکت کو مجمع عام میں ٹوک سکتا اور جواب طلبی کرسکتا تھا۔ خلیفہ پر مقدمہ دائر کر کے اسے قاضی کی عدالت میں بلوا سکتا تھا غریب اور کمزور ترین بڑھیا سربراہِ حکومت کو راہ چلتے روک کر اپنی تکلیف اور ضرورت بیان کرسکتی تھی۔ اور وہ آگے بڑھنے سے پہلے اس کی حاجت روائی کرتا تھا۔ یہ بزرگ اپنے خادموں کو بھی وہی کھلاتے اور پہناتے تھے جو خود کھاتے پہنتے تھے اور ان سے مساویانہ سلوک کرتے تھے۔ ان میں انتہائی عبادت گزار اور زاہد مرتاض بھی تھے۔ حافظ قرآن اور کاتب وحی بھی۔ فقیہ محدث اور اعلیٰ درجے کے منتظم بھی صاحب سیف وقلم بھی، دلوں کو فتح کرنے والے بھی اور ملکوں کو تسخیر کرنے والے بھی بڑے جنگجو اور فاتح بھی بڑے منکسر المزاج اور دلنواز بھی، راہِ خدا میں اپنا مال ومنال بے دریغ خرچ کرنے اور لٹانے والے بھی، حق وصداقت کی خاطر ہر قسم کی سختیاں اور شدائد برداشت کرنے والے بھی (نہ کہ لوگوں کو ناحق قتل کرنے اور کرانے والے اور ان پر ظلم ڈھانے والے) انصاف کرنے والے اور مظلوموں کو تحفظ دینے والے بھی (نہ کہ لوگوں کو اغواء کرنے کرانے والے اور امتناعی نظر بندی میں رکھنے والے) لوگوں کی عزت وآبرو کی حفاظت کرنے والے بھی (نہ کہ لوگوں کی عزتوں پر ڈاکہ ڈالنے والے) لوگوں کی گردنیں چھڑانے والے بھی (نہ کہ ان کی گردنوں میں طوقِ غلامی ڈالنے والے) نظم عالم کی اصلاح اور درستی کرنے والے بھی (نہ کہ فتنہ وفساد پیدا کرنے والے) اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے حق کی خاطر جانیں دینے اور لینے والے بھی (نہ کہ حرص وطمع کی خاطر قتل وغارت گری کرنے والے اور ذاتی عداوت کی بنا پر مار ڈالنے والے) نیکی کا حکم دینے والے برائی سے روکنے والے، نماز اور زکوٰۃ کا حکم دینے والے اور دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنے والے بھی۔

ان کی محبت واطاعت رسول ﷺ، خشیت خداوندی، زُہد وتقویٰ، جذبۂ سرفروشی خلوص، بے لوثی اور ماسواء اللہ سے بے خوفی اور بے پروائی نے دنیا کو محیر العقول واقعات ومشاہدات سے دوچار کیا۔ دیکھنے والوں نے کہا کہ بندے ہوں تو ایسے ہوں، حاکم ہوں تو ایسے ہوں۔ ان کے دن جہاد فی سبیل اللہ میں گھوڑوں کی پیٹھوں اور راتیں خیموں کے ننگے فرش زمین پر رکوع وسجود میں بسر ہوتی تھیں (نہ کہ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں لذات شرب وطعام اور خواب استراحت میں) ان میں اپنے وقت کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمران اور منتظم بھی تھے۔ بدر، احد، خندق، خیبر، حنین، یرموک اور قادسیہ کے تیغ زن اور تیر انداز بھی۔ عراق، ایران، فلسطین، شام اور مصر کے فاتح بھی تھے۔ نان شعیر پر گزر کر کے لوگوں میں دنیا کو چار کونوں سے آنے والا مال تقسیم کر کے سجدۂ شکر ادا کرنے والے بھی۔ خود قرض لے کر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے والے بھی، حاکم اور فرمانروا بن کر مسجد کے خاک آلود ننگے فرش پر بیٹھنے اور وہیں اینٹ کا تکیہ بنا کر لیٹنے سونے والے بھی اور اپنی سادہ وضع اور پیوند لگے لباس سے دنیا کے جابر حکمرانوں پر ہیبت اور لرزہ طاری کر دینے والے بھی۔ ہر نوعِ غلامی کے لئے موت کا پیغام۔ ع

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے

وہ دنیا کے حکمرانوں کے لئے عبرت کا تازیانہ اور محکوموں، زیردستوں کے لئے رحمت وشفقت کے فرشتے بن گئے۔

ان میں امت کا سب سے رحم دل اور شفیق لیکن کوہساروں کا سا عزم محکم رکھنے والا دین کو خطرات کے ہجوم سے نکالنے اور اپنے مال سے غلام مسلمانوں کی گردنیں چھڑانے والا رفیق ہجرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ہے، قیصرو کسریٰ کی عظمتوں کو اپنے پاؤں تلے روندنے والا اور عدل و مساوات کی بنیاد پر دنیا کی سب سے بڑی اور فلاحی مملکت قائم کرنے والا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو عالی قدر صاحب زادیوں سے یکے بعد دیگرے ازدواج کا اعزاز حاصل کرنے والا اور اسلام اور مسلمانوں پر جنگ اور امن کی حالتوں میں اپنی کثیر دولت بے دریغ لٹانے والا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی ہے۔ دشمنوں کے محاصرے میں بستر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بے فکر ہو کر سونے والا فاتح خیبر اور بہترین قاضی علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی ہے۔ امین الامت فاتح شام و فلسطین ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں سب سے پہلے تلوار اٹھانے والا احواریٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بھی ہے۔ اپنی فدا کاری سے یوم احد کا ہیرو کہلانے والا اور اسلام کی راہ میں مالِ کثیر خرچ کرنے والا طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ بھی ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواد، خیر اور فیاض کہا۔ ان میں ایران فتح کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق ایک قوم (ایرانی) کو نقصان اور دوسری (مسلمان) کو نفع پہنچانے والا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی ہے۔ سات سات سو اونٹوں پر لدے ہوئے اناج اور دوسری اشیائے ضرورت کے انبار قحط زدہ مسلمانوں میں لٹا دینے والا اور جنگی مہمات میں اپنی دولت کے دروازے کھول دینے والا امت کا ثالث بالخیر اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن کا بے لوث خدمت گزار عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی ہے۔ ان میں سعید بن زید رضی اللہ عنہ بھی ہے۔ جس کا موحد باپ حشر میں اکیلا ایک امت کی شکل میں آئے گا اور جس کے گھر میں داخلے سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی تقدیر بدل گئی۔ یہ تھے عشرہ مبشرہ۔ دنیا نے اپنے خزانے ان کے پاؤں میں ڈال دیئے لیکن انہوں نے متاع بندگی دے کر شانِ خداوندی لینا پسند نہ کیا۔ خوشحالی کے بے پناہ دور میں بھی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا سادہ و غریبانہ طرز معاشرت ان کے پیش نظر رہا۔ آئی ہوئی دولت کو بھی اسلام اور مسلمانوں پر خرچ کیا۔ اللہ نے ان سے خلافت ارضی اور جنت الفردوس کا وعدہ کیا۔ ارشاد ہوا۔

"یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو یہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔" (الحج آیہ ۴۱)

چنانچہ انہوں نے ایسا کر دکھایا۔ وہ قیادت کے اوصاف اور شرائط کا معیار قرار پائے۔ دین و دنیا کی ذمہ داریوں سے بوجوہ احسن عہدہ برآ ہونے والے! زندگی کے بے کراں سمندر میں سفر کے لئے روشنی کا مینار!

منصف مزاج غیر مسلم مؤرخین بھی ان کی عظمت کے معترف ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری نئی نوجوان نسل جس سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ ان عظیم اور مقدس ہستیوں کے اعلیٰ فکر و کردار، قربانیوں اور کارناموں سے بڑی حد تک ناواقف ہے یا اسے دانستہ ناواقف رکھا جا رہا ہے۔ ہمارے جدید ذرائع ابلاغ ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبارات و رسائل میں مغرب کی مشہور شخصیات، لیڈروں، جرنیلوں، مدبروں، سیاستدانوں، سائنس دانوں حتیٰ کہ ایکٹروں، ایکٹرسوں اور کھلاڑیوں تک کے بارے میں سوال پوچھے جاتے ہیں اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔

ہمارے بعض لائق اظہار یہ نویس اور قلم کار قدیم یونان اور روما کے اعاظم رجال کے کارناموں اور اقوال کے حوالے دیتے ہیں۔ لیکن ابتدائی اسلامی تاریخ کے ہیروؤں کے کارناموں اور مقولوں کا حوالہ دینے کی انہیں توفیق نہیں ہوتی۔ خود ہمارے ملک کی فلمی اور ٹیلیویژنی ایکٹرسوں کے بڑے بڑے فوٹو اخبارات کے سرورق اور پچھلے صفحہ پر نمایاں طور پر شائع کئے جاتے ہیں اور ان کے بارے میں مضامین اور انٹرویو بھی چھاپے جاتے ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ کہ خود بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے سیاسی لیڈروں اور قابل اعتماد و احترام شخصیتوں کے فوٹو ان ایکٹرسوں کے ساتھ انہی صفحات کے کونوں، کھدروں میں جگہ پاتے ہیں۔ یوں ان کی دیدہ و دانستہ تحقیر کی جاتی ہے۔ ایسا تقریباً ہر روز یا کم سے کم ہر جمعہ کو ہوتا ہے۔ اس معاملے میں پاکستان کے دو سب سے بڑے اور کثیر الاشاعت اردو روزنامے جنگ اور نوائے وقت پیش پیش ہیں۔ ممکن ہے دوسرے نسبتاً کم اشاعت والے روزنامے بھی بے حیائی اور بدمذاقی کی اس دوڑ میں شامل ہوں لیکن راقم کو ان کے مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا۔ ○

کیا ہمارے ذہن اس قدر مسخ اور ماؤف ہو چکے ہیں کہ ہم بنی سنوری فیشن زدہ خوبصورت نوجوان لڑکیوں کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ وہی ہماری قوم کے اعصاب پر سوار ہیں اور ہمارے قومی اخبارات اور ٹیلی ویژن ان کی تشہیر کا ذریعہ ہیں۔ ہم کیا سوچ رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں؟ خدا نہ کرے کہ ہم سب کو اس طرزِ عمل کے نتائج سے دوچار ہونا پڑے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

ہمارے نوجوان جنہیں ستاروں پر کمندیں ڈالنی چاہئیں۔ ان میں سے بہت سے فلمی ستارے اور گویئے بننے کی دھن میں لگے رہتے ہیں اور ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو اچھی خاصی تعلیم پائے ہوتے ہیں اور ان کے باپ دادا قوم کی ذمہ دار اور محترم ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف یہ عالم ہے کہ خلفائے راشدین کے بارے میں تو ان کی برسیوں کے مواقع پر اخبارات میں رسمی قسم کے مضامین خانہ پری کے لئے شائع کر دیئے جاتے ہیں جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ اور ٹی وی اور ریڈیو پر بے مغز قسم کے مذاکروں اور تقریروں کا انتظام بادلِ ناخواستہ کر دیا جاتا ہے۔ بہت کم نوجوان ادھر متوجہ ہوتے ہیں۔ قارئین، ناظرین، سامعین کچھ حاصل نہیں کر پاتے۔ عشرۂ مبشرہ کے بقیہ چھ حضرات کے بارے میں تو نہ اخبارات میں مضامین چھپتے ہیں نہ ٹی وی اور ریڈیو پر مذاکرے اور تقریریں ہوتی ہیں۔ نہ نیلام گھر، پرکھ، جہاں نما یونیورسٹی چیلنج وغیرہ پروگراموں میں سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ اگر بھولے سے کوئی سوال پوچھ بھی لیا جائے تو مسئول الیہ آنکھیں جھپکتا اور منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا نیلام گھر کے ایک پروگرام میں سوال پوچھا گیا کہ فلسطین کس مسلمان حکمران کے عہد میں فتح ہوا؟ جواب

○ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی مرحوم کے بقول ''میر خلیل الرحمن سولہ سنگار سے آراستہ حسین و جمیل عورتوں کی تصویریں اخبار جنگ میں چھاپ کر بدترین قسم کی پراسٹی ٹیوشن (Prosititution) کر رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔'' ...... (ماہنامہ میثاق اکتوبر ۱۹۸۹ صفحہ ۵۷ بحوالہ ہفتہ وار ''زندگی'' لاہور۔) بہرحال ان دونوں بڑے اخباروں میں مقابلہ جاری ہے۔

دینے والے بنے سنورے میاں بیوی ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے بالآخر نفی میں سر ہلا دیئے۔ فلسطین حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتح ہوا اور اس جہاد میں عشرۂ مبشرہ میں کے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ (سپہ سالار) حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ شامل تھے۔ ٹی وی اور وی سی آر مسلمان نوجوانوں کی اخلاق سوزی اور ان میں بے دینی پھیلانے میں اخبارات اور ریڈیو سے بھی کہیں آگے ہیں اور نئی نسل کی گمراہی اور ذہنی انتشار میں ان کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ ان کے ذریعے گھروں میں فحش فلمیں گھس آئی ہیں جو رات کے تقریباً ایک بجے تک دیکھی جاتی ہیں۔ پھر دیکھنے والے سوتے ہیں تو اگلی صبح کو نو بجے سے پہلے نہیں اٹھتے۔ انہیں نماز ادا کرنے اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ رضی اللہ عنہم کے مطالعہ کی فرصت ہی کہاں ہوتی ہے؟ لہٰذا ان کی مقدس زندگیوں اور کارناموں سے سبق اور تخلیقی وتعمیری تحریک کیا حاصل کریں گے؟ نوجوانوں کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت میلوں ٹھیلوں، یوتھ فیسٹیول، رقص وسرود، پاپ میوزک (واقعی پاپ) اور عشقیہ ڈراموں میں الجھایا جا رہا ہے۔ یہ نشہ بھی چرس، افیون، ہیروئن وغیرہ کے نشے سے کم نہیں۔ فرعون کو ایسے نشے کی نہ سوجھی ورنہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کے خون سے ہاتھ نہ رنگتا۔ نئی نسل سے زیادہ قصور ہمارا اور حکومت کا ہے کہ اسے صحیح خطوط پر تعلیم نہیں دی جا رہی۔ آج تک کوئی صحت مند نظام تعلیم وضع ہی نہیں کیا گیا۔ اور پھر مزید بدقسمتی یہ کہ قرآن کی بجائے اس کے ہاتھ میں کلاشن کوف تھما دی ہے۔ کالج اور یونیورسٹیاں قتل گاہیں بن گئے ہیں۔ قرآن وحدیث کے ساتھ اسلامی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور نظامِ معیشت کو بھی طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا ہے تاکہ نئی نسل کو کمیونسٹ، سوشلسٹ، دہریہ، صوبہ پرست، ضلع پرست، زمین پرست، زبان پرست، زن پرست، زر پرست وغیرہ بنانے میں آسانی ہو اور ان کی نظریں مکہ اور مدینہ سے ہٹا کر واشنگٹن، ماسکو، لندن، پیرس وغیرہ پر گاڑ دی جائیں۔

یہ متوسط ضخامت کی کتاب نئی نسل کی اسلامی تاریخ وتصورات کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ مفصل لکھنے کے لئے کئی جلدیں درکار ہوتیں جن کے پڑھنے کی ٹی وی اور وی سی آر کے لاسے پر لگے ہوؤں کو شاید فرصت نہ ہوتی جب کہ راقم کا مقصد ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ اپنے ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں سوچا جائے اور ہمیں جس زہریلی، اخلاقی، تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی، سیاسی فضا میں سانس لینے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ اس سے باہر نکلا جائے۔ خلفائے راشدین کے حالات کے بارے میں مفصل کتابیں مل جاتی ہیں۔ بعض بہت اچھی ہیں لیکن بقیہ عشرۂ مبشرہ کے بارے میں کتابی خلاء پایا جاتا ہے۔ یہ مقدس ہستیاں، یہ مردانِ بزرگ فرشتے نہ تھے بہرحال انسان تھے۔ ان سے قومی اہمیت کے بعض فیصلوں میں غلطیاں بھی ہوئیں، ان میں اختلافات بھی پیدا ہوئے لیکن وہ ذاتی عناد اور دنیاوی اغراض کی وجہ سے نہ تھے۔ ان کی نیتوں میں خلوص تھا اور مقصد اصلاح تھا نہ کہ فساد۔ بہرحال ان کے اعمال کے بارے میں ہم پندرھویں صدی کے مسلمانوں سے کوئی بازپرس نہ ہوگی جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۲:۱۴۱)

(ترجمہ: وہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے۔ ان کی کمائی ان کے لئے تھی اور تمہاری کمائی تمہارے لئے۔ تم سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہ)

گزشتہ مؤرخین ان کے خلوص اور نیک نیتی کی وجہ سے ان کے بعض غلط اقدامات یا فیصلوں کو ان کی اجتہادی غلطیاں کہتے آئے۔ جدید عہد اور ذہن کے لوگ چاہیں تو انہیں محض غلطیاں (نہ کہ گناہ) کہہ لیں لیکن ان کی نیتوں میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ الاعمال بالنیات۔ ان کی غلطیوں کو اچھالنے کی بجائے ان کے افکار، کردار، قربانیوں اور کارناموں سے بصیرت اور تخلیقی تحریک حاصل کرنی چاہیے[1] انہی بزرگوں کی کوششوں اور قربانیوں کے طفیل ہم مسلمان ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ان کے مشن کو تازہ کریں اور آگے بڑھائیں۔ مشرق ومغرب میں نئے دور کا آغاز کریں اور اس مقصد کے لئے جذب اندروں سے اپنی صفوں میں درستی اور یک جہتی پیدا کریں۔ راقم کا ایمان ہے کہ اسلام کے غلبہ وشوکت کا دورِ ثانی انشاء اللہ ضرور اور جلدی آئے گا۔ دنیا اس کی منتظر ہے۔ ہم نہ دیکھیں گے ہمارے بعد دوسرے دیکھیں گے۔

آخری بات جو ہم سب کو علامہ اقبال رحمتہ اللہ کے الفاظ میں یاد رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو قرآن کی تعلیم میں ڈھالیں جیسا کہ عشرۂ مبشرہ نے کیا۔ ہماری دنیاوی اور اخروی سعادت ونجات کا راز اسی میں ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

احقر العباد

بشیر ساجد

۳۳۰-آر بلاک ماڈل ٹاؤن توسیعی سکیم لاہور

۱- پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم کے بارے میں معلوم ہوا کہ دوسری عالمی جنگ کے بانی مبانی جرمنی کے آنجہانی ڈکٹیٹر ایڈولف ہٹلر کی فوٹو ان کے ذاتی کمرے میں آویزاں رہتی تھی اور اس کی خودنوشت سوانح عمری ان کے زیر مطالعہ۔ کسی ذریعے سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آیا انہوں نے کبھی سیرتِ رسول ﷺ اور سیرتِ خلفائے راشدین کا بھی مطالعہ کیا؟ مؤلف

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

(ثانی اثنین)

همت او کشت ملت را چو ابر
ثانیِ اسلام و غار و بدر و قبر

(اقبالؒ)

چراغ اور پروانہ

۱- جو کچھ اللہ نے میرے سینے میں ڈالا، میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سینے میں ڈال دیا

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

۲- اگر میں اللہ کے سوا انسانوں میں سے کسی کو اپنا خلیل (دوست) بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

۳- پیغمبر کے سوا سورج ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بہتر کسی انسان پر طلوع و غروب نہیں ہوا۔

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

۴- میں نے سب کے احسانوں کا بدلہ چکا دیا لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے احسانات مجھ پر باقی ہیں

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

۵- امت محمدیہ میں سے ابوبکر رضی اللہ عنہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

۶- ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دور حکومت مختصر تھا لیکن خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد دین اسلام کسی اور کا اتنا ممنونِ احسان نہیں جتنا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا۔ (سر ولیم میور)

۷- اگر اسلام کو نسبتاً کم عمر بیس ابوبکر مل گئے ہوتے تو آج ساری دنیا اسلام کے حلقہ بگوش ہوتی۔

(ایچ۔جی۔ویلز)

رجب ۹ھ (اکتوبر ۶۳۰ء)۔ صحرائے عرب کی گرمی اپنے شباب پر ہے۔ نوزائیدہ اسلامی مملکت کی شمالی سرحد سے متواتر تشویشناک خبریں آرہی ہیں کہ بازنطینی شہنشاہ ہرقل ایک لشکر جرار کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہا ہے۔ ادھر شدید گرمی، قحط سالی، عسرت اور بے سروسامانی کا عالم ہے۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم فتح مکہ، غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف سے فارغ ہوئے ہیں۔ بہت سے زخمی اور شہید ہوئے باقی ماندہ تھکے ہوئے اور ضروری سروسامان سے عاری ہیں۔ اس وقت انہیں اپنی تجارت اور زراعت پر توجہ کر کے اپنے اور اہل وعیال کے لئے سامان معاش فراہم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس عالم میں ایک دن مسجد نبوی اور مدینہ کے کوچہ و بازار میں منادی ہوتی ہے کہ مسلمانو! دشمنوں کے خلاف جہاد کے لئے کمربستہ ہو جاؤ اور از قسم نقد و جنس جس کے پاس جو کچھ زائد از ضرورت ہو جہاد فنڈ کے لئے لے آئے۔ منادی سنتے ہی جاں نثاران رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی اپنی بضاعت کے مطابق نقد و جنس، اسلحہ و آلات، اسپ و شتر وغیرہ لے کر مسجد نبوی میں

حاضر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ایک تہائی فوج (جو تیس ہزار مجاہدین پر مشتمل ہے) کے تمام اخراجات اپنے ذمہ لیتے ہیں، نیز ایک ہزار اونٹ ستر گھوڑے اور ایک ہزار طلائی دینار نقد پیش کرتے ہیں۔ دوسرے متمول صحابہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ بھی بہت سا نقد و جنس لے کر آتے ہیں۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس بھی اس دن غیر معمولی طور پر کافی مال و اسباب موجود تھا۔ وہ اس کا نصف لا کر رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ڈھیر لگا دیتے ہیں اور ایک گونہ اطمینان محسوس کرتے ہیں کہ آج اپنے اکثر ساتھیوں پر سبقت لے جائیں گے۔ ایک صحابی کچھ کھجوریں لے کر آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے یہ کھجوریں ایک شخص کے باغ کو رات بھر پانی دینے کے بعد بطور مزدوری حاصل کی ہیں۔ میرے پاس ان کے سوا اور کچھ پیش کرنے کے لئے نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان تھوڑی سی کھجوروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور قبول فرماتے ہیں۔

اتنے میں ایک وجیہہ اور پروقار دبلے پتلے صاحب آتے ہیں۔ گوری رنگت، ستا ہوا چہرہ، قدرے اندر کو دھنسی ہوئی روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، موزوں قامت، داڑھی پر مہندی کا خضاب۔ حاضرین کی آنکھیں ان کی طرف اٹھتی ہیں۔ وہ بہت سی متاع نقد و جنس، سامان رسد، اسلحہ اور جنگی ضرورت کی دوسری اشیاء کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انبار لگا دیتے ہیں۔ اونٹ، گھوڑے وغیرہ اس کے علاوہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم متبسم ہو کر پوچھتے ہیں کہ اپنے اہل و عیال کے لئے بھی کچھ چھوڑا؟

جواب عرض کیا جاتا ہے کہ ''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام چھوڑ آیا ہوں۔'' مجمع دم بخود رہ جاتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گرانمایہ پیشکش بے مایہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ حسرت انگیز احساس بڑی شدت سے ابھرتا ہے کہ وہ اس شخص پر کبھی سبقت نہیں لے جا سکیں گے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ اپنے گھر کا سارا مال و متاع لا کر اپنے آقا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دینے والا کون تھا؟ یہ عثمان ابوقحافہ کے بیٹے عبداللہ تھے جنہیں گزشتہ چودہ سو سال سے دنیا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔ آزاد مردوں میں سے پہلے مسلمان! بانی اسلام کے بعد اسلام کے پہلے مبلغ! مسلمان لونڈیوں غلاموں کو اپنا سرمایہ خرچ کر کے آزاد کرنے والے! سفر ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق و دمساز جنہیں قرآن نے ''ثانی اثنین'' کے خطاب سے نوازا اور جن کے صدق و صفا اور خلوص و جاں نثار پر اللہ کی مقدس کتاب نے ہمیشہ کے لئے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ جنہوں نے اپنا جان و مال، اہل و عیال، عزت و ناموس سب کچھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وقف کر دیا اور جن کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کچھ فرمایا جس کا حوالہ اس باب کے آغاز میں دیا جا چکا ہے۔

غزوۂ تبوک کے جیش العسرہ کی تیاری کے اس واقعہ کا ذکر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک موثر اور دل نشین نظم

میں کیا ہے جس کا دوسرا بند یہ ہے۔

اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آگیا جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مرد وفا سرشت ہر چیز جس سے چشم جہاں میں ہو اعتبار
ملک یمین و درہم و دینار و رخت وجنس اسپ قمر سم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہئے فکر عیال بھی کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
اے تجھ سے دیدۂ مہ وانجم فروغ گیر! اے تیری ذات باعث تکوین روزگار
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے ہے خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بس

(بانگ درا)

آخری شعر تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

ایک مستشرق کہتا ہے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اس لئے احترام کرتا ہے کہ انہوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے انسان پیدا کر دکھائے۔ مسلم اور غیر مسلم مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کی بہترین اور عظیم ترین ہستی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ بلکہ انبیاء کے بعد افضل البشر۔ ان کی زندگی کو اسلام کی معجزانہ اور انقلاب آفرین تعلیمات کی صداقت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

تفصیل آئندہ ابواب میں ملاحظہ فرمایئے۔

ابتدائی حالات

یہ پہلے مسلمان مرد آزاد۔ مکہ کے معزز شہری اور سرکردہ تاجر عام الفیل سے اڑھائی سال بعد قریش کے قبیلہ تیم میں پیدا ہوئے۔ جو قریش کے چھوٹے قبیلوں میں سے ایک تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اڑھائی سال چھوٹے تھے۔ والد کا نام عثمان تھا جو اپنی کنیت ابوقحافہ سے معروف تھے اور ہیں۔ شجرۂ نسب آٹھویں پشت میں مرہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ والدہ کا نام سلمٰی ام الخیر تھا جو ابوقحافہ کے چچا صخر کی بیٹی تھیں۔ تاریخ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کسی بھائی کا ذکر نہیں ملتا۔ ایک روایت میں ان کے بھائیوں معتق اور معتیق کا ذکر آیا ہے جو بہت کمسنی میں فوت ہو گئے۔ چونکہ اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔ اس لئے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پیدائش پر ان کی والدہ انہیں خانہ کعبہ میں لے گئیں۔ ان کا نام ابتداء عبدالکعبہ رکھا اور کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا پھر اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! یہ بچہ موت کے پنجے سے بچ گیا ہے۔ اب تو اسے آزاد کر دے اور مجھے دیدے۔ لہٰذا انہیں عتیق (آزاد) کہا جانے لگا۔

قبول اسلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام بدل کر عبداللہ رکھ دیا لیکن عتیق کا لقب جاری رہا۔ اس لفظ کے مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں مثلاً حسین و جوانمرد ہونا یا نسباً بے عیب ہونا یا اچھے کاموں میں سبقت کرنا۔ زیادہ صحیح روایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ لقب ہجرت کے بعد ایک موقع پر خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم حاضر تھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ آتے دکھائی دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی عتیق (دوزخ کی آگ سے آزاد) کو دیکھنا ہو وہ اس آنے والے شخص کو (ابوبکر) کو دیکھ لے۔ تب سے لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عتیق کہنے لگے۔

کنیت

جوان ہوئے تو آپ کی کنیت ابوبکر پڑ گئی۔ بکر، جوان اونٹ کو کہتے ہیں۔ چونکہ آپ کو اونٹوں کی پرورش اور غور و پرداخت میں بہت دلچسپی اور مہارت تھی۔ اس لئے لوگوں نے ابوبکر (اونٹ کا باپ یا اونٹوں کا ماہر یا اونٹوں سے بہت زیادہ شفقت رکھنے والا) کہنا شروع کر دیا۔ بعض مؤرخین کے بقول یہ کنیت اس لئے پڑی کہ آپ سب سے پہلے اسلام لائے انہ بکر الی الاسلام قبل غیرہ (انہوں نے دوسروں سے پہلے اسلام کی طرف پیش قدمی کی) لیکن علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ ان کو پاکیزہ خصلتوں میں ابتکار (پیش پیش ہونے) کی وجہ سے ابوبکر کہا جاتا تھا، زمخشری کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہ کنیت دور جاہلیت ہی میں مشہور اور اصل نام اور لقب وغیرہ پر غالب آچکی تھی۔ مسلمانوں کے علاوہ بقیہ دنیا اور تاریخ نے بھی آپ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نام سے یاد رکھا۔

قبولِ اسلام سے قبل کی مکی زندگی

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر اس زمانے کے مکی معاشرے کے لحاظ سے خصوصی توجہ دی گئی ہوگی۔ ان کے والد عثمان ابوقحافہ کا شمار مکہ کے خوشحال لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ تجارت پیشہ تھے۔ قبیلہ تیم کے نمائندہ کے طور پر اشناق کا منصب ان کے سپرد رہا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نوشت و خواند بھی سیکھی۔ وہ مکہ کے ان ڈیڑھ درجن افراد میں سے تھے جو ظہور اسلام کے وقت لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ وہ ایک ماہر نساب بھی تھے۔ قریش کے تمام خاندانوں کے نسب انہیں از بر تھے اور اس میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ مروجہ اسلحہ کے استعمال میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ مکہ کے عام رواج کے مطابق انہوں نے لڑکپن میں اپنے خاندان کے اونٹ بکری بھی چرائے ہوں گے۔ کیونکہ اس وادی غیر ذی زرع، میں اونٹ اور بکریاں ہی بنیادی اثاثہ ہوتی تھیں اونٹوں کے علاج معالجہ کے تو ماہر تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی ان کے پاس بکریوں کا ایک ریوڑ تھا۔ عرب معاشرے میں شعر گوئی کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو شعر گوئی اور شعر فہمی میں بھی کمال حاصل تھا لیکن اسلام لانے کے بعد شعر گوئی ترک کر دی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں انہوں نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ کپڑے کی تجارت کے سلسلے میں یمن، عراق، شام وغیرہ ممالک کے سفر کئے۔ اپنے حسن اخلاق، دیانت، خوش معاملگی، ملنساری، اصول پسندی اور کاروباری سوجھ بوجھ کی بنا پر جلدی ہی امیر اور کامیاب تاجروں میں شمار ہونے لگے۔ اپنی فطری سلیم الطبعی کی وجہ سے ان تمام اخلاقی برائیوں اور گراوٹوں سے محفوظ رہے۔ جو اس زمانے کے عرب معاشرے میں عام رائج تھیں۔ وہ

بت پرستی، شراب نوشی، زنا کاری، قمار بازی اور دوسرے اخلاقی جرائم نیز اہل مکہ کے غلط اعتقادات سے بھی بچے رہے۔ اہل مکہ ان کی خوش خلقی، نرم خوئی، حسن معاملت، دیانتداری، راست گوئی، پاکبازی، رحم دلی، فیاضی، سنجیدگی اور متانت کے معترف تھے۔ اور ان کے اعلیٰ انسانی اوصاف کی وجہ سے انہیں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے حالانکہ ان کا قبیلہ قریش کے بڑے قبیلوں میں سے نہ تھا۔ چنانچہ وہ مکہ کے ان دس آدمیوں میں سے ایک ہو گئے۔ جو اسلام سے پہلے اور بعد میں بھی لیڈر شمار ہوتے تھے۔ آپ مکہ کی ایک معتمد علیہ اور ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ اشناق کا منصب آپ کے سپرد تھا دیت یعنی خوں بہا کے فیصلے آپ کرتے تھے اور خوں بہا کی رقوم آپ کے پاس جمع ہوتی تھیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بچپن ہی سے دوستی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ طبائع کی یکسانی اور مماثلت کی بنا پر دوستی و یگانگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تجارت میں ہم پیشگی، رفاقت، دیانت اور اصول پسندی نے دوستی کو مزید استحکام بخشا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جس محلے میں رہتی تھیں وہ اونچے درجے کے قریشی تاجروں اور رئیسوں کا محلّہ تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی اسی محلے میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و صحبت پہلے سے زیادہ میسر آنے لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ سیرت و کردار کے مطالعہ و مشاہدہ کا خوب موقع ملا اور مسلم اول اور خلیفۂ اول کی سیرت کی تشکیل کے لئے زمین تیار ہوتی رہی اور جب اسلام کی باران رحمت کا نزول ہوا تو یہ زمین سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سیراب ہوئی۔

قبولِ اسلام اور تبلیغی سرگرمیاں

ابوبکر بن ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً اڑتیس سال تھی جب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا لیکن ابھی تبلیغ عام کا حکم نہیں ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انفرادی طور پر اسلام کی دعوت دیتے تھے ابوبکر رضی اللہ عنہ تجارت کے سلسلے میں یمن کی طرف گئے ہوئے تھے۔ چونکہ وہ اپنے تموّل، فراست، اصابت رائے، دور اندیشی، معاملہ فہمی، تجربہ کاری اور حسن اخلاق کی وجہ سے مکہ کے سرداروں اور لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ اور کثیر الاحباب تھے۔ اس لئے جب تجارتی سفر سے واپس آئے تو دوسرے معززین مکہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ ان سے ملنے آئے اور بتایا کہ ابوطالب کے یتیم بھتیجے محمد بن عبداللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اللہ کے پیغمبر ہیں اور اللہ کی طرف سے جبریل فرشتے کے ذریعے سے ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔ ہم لوگ بے چینی سے تمہاری واپسی کے منتظر تھے کیونکہ اس فتنے کی روک تھام کے لئے ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ سالہا سال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت و اخلاق، راست گوئی اور حسن معاشرت کو دیکھتے چلے آ رہے تھے اور بسا اوقات تجارتی سفر بھی ایک ساتھ کئے تھے۔ اس لئے نبوت کی خبر سن کر انہیں کوئی تعجب نہیں ہوا۔ وہ اپنے ملاقاتیوں سے فرصت پا کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وحی و نبوت کے متعلق آپ کی زبان سے سن کر وہیں

پہلی ہی ملاقات میں ایمان لے آئے۔ کسی تذبذب اور ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ ۱

بعد میں کسی موقع پر حضور نے فرمایا کہ ''جب بھی میں نے کسی کو اسلام پیش کیا تو اس نے قبول کرنے سے پہلے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس نے رتی بھر ہچکچاہٹ اور پس و پیش کے بغیر اسلام قبول کر لیا۔ بعض روایات میں ہے کہ نبوت پر فائز ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ابوبکر کے ہاں تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی جو انہوں نے بلاتوقف قبول کر لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت اور تعلیم سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے محاسن کو جلا اور تکمیل ملی اور شخصیت میں عظمت کا وہ نکھار پیدا ہوا جس نے انہیں افضل البشر بعد انبیاء بنا دیا۔ وہ اسلام کے بہترین اور مثالی ہیرو بن گئے۔

ان کا شمار پہلے چار مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ سب سے اول مسلمان حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ پھر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، مؤرخین ان میں یوں تطبیق دیتے ہیں کہ خواتین میں پہلی مسلمان ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا، آزاد بالغ مردوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ اور بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ۲

بہر حال اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ کی دو آزاد، صاحب حیثیت اور محترم شخصیتیں تھیں اور ان دونوں کا مال اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں خرچ ہوا۔ اور دونوں کے ذاتی اثر و رسوخ سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام کو چھپایا نہیں بلکہ اس کا علی الاعلان اظہار کیا اور اپنے ملنے جلنے والوں کو اس کی دعوت دی۔ شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے قصیدہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں کہا ہے۔

الثانی　التالی　المحمود　مشهده

و　اول　الناس　منهم　صدق　ارسلا

(ترجمہ: وہی ثانی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد متصل ہیں جن کی مشکلات میں موجودگی کی تعریف کی گئی ہے
اور وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے رسولوں کی تصدیق کی)

---

۱ ایمان ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق چند اور روایات بھی موجود ہیں جن میں سے شرح مواہب میں علامہ زرقانی کی یہ روایت بھی وقیع اور قابل توجہ ہے کہ ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکم بن حزام کے ہاں بیٹھے تھے کہ موخر الذکر (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی لونڈی نے ان سے آ کر کہا کہ آپ کی پھوپھی کہہ رہی تھیں کہ ان کے شوہر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ویسے ہی اللہ کے نبی ہیں جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ یہ سنتے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وہاں سے اٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ کر ان سے اس بات کی تصدیق چاہی اور پھر وہیں بلاتامل مسلمان ہو گئے۔ مؤلف

۲ عجیب بات ہے کہ مؤرخین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادیوں کے اسلام کا ذکر کرنا بھول جاتے ہیں حالانکہ وہ بھی اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ یقیناً ایمان لائی ہوں گی۔ اگر ایک کمسن بچے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان کا ذکر چوتھے مسلمان کی حیثیت سے کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے تو کمسن لڑکیوں میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کیوں نہ ہو؟ مؤلف

اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مطمئن ہو کر اپنی جگہ بیٹھ نہیں گئے۔ یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا تھا۔ انہوں نے نئے دین کے دور رس تقاضوں کو سمجھ لیا اور اس کے اثرات وثمرات کو بھی چشم تصور سے دیکھ لیا۔ عشق نبرد پیشہ طلب گار تھا! چنانچہ انہوں نے دامے درمے، قدمے، سخنے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت کرنے کا تہیہ کر لیا۔ بلکہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی زندگی اور عزت وآبرو بھی داؤ پر لگا دی۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد وہ غیر اللہ سے بے پروا اور بے خوف ہو گئے۔ ان کا واحد مقصد حیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واطاعت اور اسلام کی تبلیغ واشاعت بن گیا۔

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفان موج افزا
دل انگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ پہلے مبلغ تھے۔ انہوں نے کامل ایمان واطاعت کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی مثال دنیا کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان کے خلوص، جوش وجذبہ، جاں نثاری اور فہم وتدبر نے انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ قریب کر دیا۔ اور ہر معاملے میں باہمی صلاح مشورے ہونے لگے۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے معتمد علیہ بن گئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے والدین کو اسلام کی محبت وشیفتگی میں روز افزوں ترقی کرتے ہی دیکھا۔ ہجرت سے قبل مکہ میں کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح یا شام کو ہمارے ہاں تشریف نہ لائے ہوں۔"

تبلیغ اسلام

چونکہ اپنے حسن اخلاق، ملن ساری اور ایک امیر ودیانتدار تاجر کی حیثیت سے ابوبکر رضی اللہ عنہ مکی معاشرے میں ہر دلعزیز تھے اور ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ اور لوگوں کو ان کی اصابت رائے اور خلوص پر اعتماد تھا، اس لئے جب انہوں نے اپنے ملنے والوں میں اسلام کی بے لوث تبلیغ شروع کی تو اس نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا اور متعدد سعید اور ممتاز روحوں نے لبیک کہا۔ ان کی تبلیغ سے ایمان لانے والوں میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (جو بعد میں تیسرے خلیفہ راشد ہوئے) عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ (جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خلیفہ کے انتخاب میں چیف الیکشن کمشنر کا کردار ادا کیا) طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (فاتح قادسیہ) ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ (فاتح شام) نمایاں ہیں۔ یہ سب حضرات عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں۔ ان کا قبول اسلام ملت اسلامیہ کے لئے گوناگوں برکات کا موجب ہوا اور ان کے شاندار کارنامے تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ عشرۂ مبشرہ میں سے صرف تین صحابہ ایسے ہیں جو دوسرے اسباب وحالات کی بناء پر مسلمان ہوئے یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ۔ بعض دوسرے اکابر صحابہ مثلاً حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ، ابوسلمہ رضی اللہ عنہ، خالد بن سعید رضی اللہ عنہ بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کی تبلیغ سے ایمان لائے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص تھے جن کے ایمان لانے سے اسلام کو مکی معاشرے میں اہمیت اور تقویت حاصل ہوئی۔ اور اس کی جڑیں

قائم ہوگئیں۔ پھر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے سے اسلام کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ محمد حسین ہیکل رقمطراز ہیں۔

''وہ (مستشرقین) کہتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قسم کی دینوی فائدے کی توقع نہ تھی۔ اس کے برعکس وہ شب و روز یہ دیکھتے تھے کہ مکہ والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر قسم کی تکلیفیں دیتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کو تنگ کرتے ہیں۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوے میں جھوٹے ہوتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے عقل مند اور مدبر شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعاوی کی تصدیق کرنے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر طرح مدد کرنے اور قریش میں خود اپنی پوزیشن خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ محض اپنی عقل و فراست کے بل بوتے پر اپنے اندر وہ ایمان پیدا نہ کر سکتے تھے جو انسان کو تمام خطرات سے بے پروا کر کے اس میں شدید تڑپ اور دھن پیدا کر دیتا ہے۔ جس ایمان کا مظاہرہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا اور جس طرح انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کی تصدیق کی وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام یقیناً خدا کی طرف سے ہے کیونکہ ایک باطل مذہب اور ایک جھوٹا شخص کبھی اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ایسا ایمان پیدا نہیں کر سکتا۔''[۱]

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انتہائی جرأت ایمانی اور عزیمت و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسلام کی علانیہ تبلیغ و اشاعت کی اور مخالفت اور ایذا رسانی کے تمام خطرات کو انگیز کیا۔ انہوں نے اس قسم کے خدشات کو دل میں آنے ہی نہیں دیا کہ مفاد پرست سرداران قریش جو بیت اللہ شریف کے متولی اور پروہت تھے اور محض اس بناء پر سارے عرب میں محترم اور ممتاز تھے۔ ان کی علانیہ تبلیغ اسلام کو اپنے مذہبی، معاشی، معاشرتی اور پروہتانہ مفادات کے خلاف پا کر ان کے دشمن اور درپے آزار ہو جائیں گے اور ان کی تجارت، جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائیں گے۔ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح جسمانی طور پر بہت زیادہ طاقتور اور جنگ جو نہ تھے کہ مشرکین محض اس بناء پر ان سے خوف کھاتے اور ان پر ہاتھ ڈالنے سے ہچکچاتے، ان کا قبیلہ بھی قریش کا سب سے چھوٹا قبیلہ تھا جو ابھی مسلمان نہ ہوا تھا اور اگر مسلمان ہوتا بھی تو مخالفین کے مقابلے میں ان کی موثر مدد کرنے کے قابل نہ تھا۔ لیکن ان کے کمزور و نحیف جسم میں بے حد مضبوط اور جرأت مند دل تھا۔ جس نے انہیں خوف خدا کے سوا ہر قسم کے خوف سے بے پروا کر دیا تھا۔ انہوں نے عافیت خواہی اور مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور سربلندی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مخلصانہ محبت و اطاعت و رفاقت کو اپنا مشن بنا لیا۔ ہر چہ باداباد۔ عام لوگ بھی ان کی زندہ و روشن مثال سے متاثر ہوتے تھے اور سوچتے تھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا صاحب فہم و فراست، تجربہ کار اور جہاندیدہ تاجر یونہی کسی فریب و افسوں سے نئے دین کا حلقہ بگوش نہیں بن سکتا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی مشنوں میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہتے اور مختلف قبائل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف

۱- ابوبکر صدیق اکبر۔ مترجمہ محمد احمد پانی پتی۔ شائع کردہ مکتبہ میری لائبریری لاہور۔ صفحہ ۴۷-۴۸

کراتے کیونکہ ایک ماہر نساب کی حیثیت سے وہ بیشتر عرب قبائل کے نسب سے بخوبی آگاہ تھے نیز کثیر الملاقات تھے۔اس لئے تبلیغی دوروں میں اس آگاہی کا فائدہ اٹھاتے تھے لوگ ان سے جلدی گھل مل جاتے تھے۔

مسلم غلاموں، لونڈیوں کی آزادی

مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں میں ایک طبقہ ستم رسیدہ بیکس لونڈیوں، غلاموں کا تھا۔ وہ پہلے ہی نامساعد حالات کی چکی میں پس رہے تھے قبول اسلام کی وجہ سے ان کے آقاؤں نے ان پر ظلم وتشدد کے دروازے کھول دیئے اور انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچانا شروع کیں تا کہ وہ کسی طرح اسلام سے منحرف ہو جائیں۔ مگر یہ وہ نشہ نہیں تھا جو اذیتوں کی ترشی سے اتر جاتا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان مشرک وظالم مالکوں کو منہ مانگی قیمتیں دے کر بیسیوں صاحب ایمان مظلوم لونڈیوں، غلاموں کو آزاد کرایا۔ ان میں مشہور ومعروف موذن رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ ان کی والدہ حمامہ رضی اللہ عنہا، عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ (جو سفر ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمرکاب رہے) حضرت ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ، حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام عبیس رضی اللہ عنہا، حضرت نہدیہ رضی اللہ عنہا اور ان کی صاحب زادی اور بنی مومل کی لونڈی لبینہ یالبیبہ کے نام نمایاں ہیں۔ آزاد کرانے کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان میں سے کسی پر کوئی احسان نہیں رکھا نہ کبھی جتایا۔ یہ واقعہ سبق آموز ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دینا ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ اشھد ان محمد رسول اللہ کے الفاظ ادا کرتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انگلی سے اشارہ کرنے کے عادی تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرما جانے کے بعد کس کی طرف اشارہ کریں؟ مشار الیہ نہیں رہا تھا۔ نگاہیں انہیں ڈھونڈیں گی یہ تصور بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عنان خلافت سنبھالی تو ایک دن صحن مسجد میں آپ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ اذان کا وقت ہو گیا تو بعض صحابہ کی خواہش پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان دینے کو کہا۔ بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! کیا تم اپنی خلافت کے زعم میں مجھے یہ حکم دیتے ہو یا اس لئے کہ تم نے اپنا مال خرچ کر کے مجھے غلامی سے چھڑایا تھا؟'' حضرت ابوبکر نے نرمی سے جواب دیا کہ ''اے بلال رضی اللہ عنہ! ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔ صرف درخواست ہے'' بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''مجھے یہ درخواست منظور نہیں'' حضرت ابوبکر خاموش ہو گئے۔

جب آپ کے والد ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ آپ کمزور، ضعیف اور بے سہارا غلاموں، لونڈیوں پر روپیہ صرف کر کے انہیں آزاد کراتے ہیں تو کہا کہ ''بیٹا! اگر تم کمزور غلاموں کی بجائے قوی وتوانا غلاموں کو آزاد کراؤ تو وہ تمہاری مدد اور محافظت کے لئے کام آئیں گے۔'' حضرت ابوبکر نے جواب دیا کہ ''ابا جان! میں اللہ اور اس کے دین کی خاطر انہیں آزاد کراتا ہوں۔''

مسلم غلاموں کی آزادی کے علاوہ بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا تجارتی سرمایہ اسلام کے کام کو فروغ دینے کے لئے

بے دریغ خرچ کیا۔ قبول اسلام کے وقت ان کے پاس چالیس ہزار درہم نقد موجود تھے۔ یہ نقد سرمایہ اور اپنے تجارتی اثاثہ سے حاصل ہونے والا منافع انہوں نے مسلمان غلاموں کی گردنیں چھڑانے کے علاوہ مفلوک الحال مسلمانوں کی مدد کرنے اور مسلم برادری کی اجتماعی ضروریات پوری کرنے پر کھلے دل سے خرچ کیا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا کہ ''سب سے زیادہ میں جس کی صحبت اور دولت کا ممنون ہوا ہوں وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔[1]''

واقعۂ معراج کی تصدیق

جب حضور اکرم ﷺ نے اہل مکہ کے سامنے واقعۂ معراج کا ذکر کیا تو ابوجہل اور دوسرے اکابر قریش نے ایک فاتحانہ انداز میں اس کا مذاق اڑایا اور سمجھے کہ محمد ﷺ کو جھٹلانے کا یہ موقع خوب ہاتھ آیا۔ چونکہ صاحب معراج ﷺ کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی مسلمانوں میں سب سے سربرآوردہ تھے اور قبول اسلام سے پہلے بھی اہل مکہ میں ایک معزز و محترم سردار مانے جاتے تھے، اس لئے ابوجہل اور دوسرے سردارانِ قریش ان کے پاس گئے اور کہا کہ دیکھو! اب تمہارے دوست محمد (ﷺ) نے نیا شوشہ چھوڑا ہے، کہتا ہے کہ راتوں رات بیت المقدس گیا، وہاں نماز پڑھی، آسمانوں پر چڑھا، بہشت و دوزخ کی سیر کی اور پھر واپس بھی آ گیا۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صرف اتنا پوچھا کہ کیا واقعی انہوں نے یہ بات کہی ہے؟

جب سب نے یک زبان ہو کر ہاں کہا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بڑے اطمینان اور تیقن کے ساتھ جواب دیا کہ ''اگر انہوں نے ایسا کہا ہے تو سچ ہی کہا ہے۔ جب ان کے پاس دن رات آسمانوں سے آناً فاناً وحی آ جاتی ہے تو ان کے راتوں رات آسمانوں پر جانے اور واپس آ جانے میں تعجب کی کیا بات ہے۔'' واقعۂ معراج کی فوراً اور بلا ہچکچاہٹ تصدیق کرنے سے حضور اکرم ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ''صدیق'' کا لقب دیا۔ اور وہ رہتی دنیا تک کے لئے ابوبکر صدیق بلکہ صدیق اکبر مشہور ہو گئے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ صدیق کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ایسا شخص جو نہایت راست باز ہو، جس کے اندر صداقت پسندی اور حق پرستی کمال درجہ پر ہو۔ جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ استعمال کرے، جب ساتھ دے تو حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے اور سچے دل سے دے اور جس چیز کو حق کے خلاف پائے اس کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا کمزوری نہ دکھائے۔ جس کی سیرت ایسی ستھری اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر کسی کو بھی اس سے خالص راست روی کے سوا کسی دوسرے طرز عمل کا اندیشہ نہ ہو۔''

(تفہیم القرآن جلد اول۔ سورۃ النساء، حاشیہ نمبر ۹۹)

مخالفت کا طوفان

جوں جوں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں تیزی آتی گئی اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی قریش کی طرف سے

۱۔ سیرت النبی جلد دوم

مخالفت میں بھی شدت آتی گئی۔ پہلے وہ صرف مسلمان لونڈی غلاموں اور کمزور اور بے سہارا مسلمانوں پر دست ستم دراز کرتے تھے پھر وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ہاتھ اٹھانے لگے تاکہ کسی طرح اس نئے دین کی اشاعت بند ہو۔ ایسے مواقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ ایک دفعہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں نماز پڑھ رہے تھے تو عقبہ بن ابی معیط نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں چادر لپیٹ کر بل دینا اور گلا گھونٹنا شروع کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے گردن سے پکڑ کر دھکا دے کر دور ہٹا دیا اور کہا کہ ''کیا تم اس شخص کو صرف اس لئے مار ڈالنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور تمہارے پاس اپنے رب سے روشن دلائل بھی لے کر آیا ہے [۱]؟'' ایک دوسرے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسجد حرام تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت ابوبکر نے قریش کے مجمع میں تقریر کی اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی۔ حرم میں علانیہ دعوت اسلام کا یہ پہلا موقع تھا۔ کفار قریش نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر حملہ کر کے انہیں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ عتبہ بن ربیعہ نے ان کے منہ پر اتنے جوتے مارے کہ سارا منہ سوج گیا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ آخر ان کے قبیلہ بنی تیم کے لوگوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے آ کر چھڑایا اور گھر پہنچایا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خستہ حالت دیکھ کر انہیں خدشہ ہوا کہ وہ زندہ نہ بچیں گے۔ اس لئے انہوں نے عتبہ کو دھمکی دی کہ اگر ابوبکر مر گیا تو تمہیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔ شام تک آپ رضی اللہ عنہ بے سدھ پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت پوچھی۔ اس پر آپ کے اہل قبیلہ بنی تیم جو ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے۔ آپ کو برا بھلا کہہ کر اور ناراض ہو کر چلے گئے کہ مرنے کے قریب پہنچ کر بھی اپنے سے زیادہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فکر مند ہے۔ پھر جب تک دار ارقم میں جا کر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہ لیا، اطمینان نہ ہوا۔ یہ وہ فدا کارانہ مظاہرۂ ایمان تھا جس سے متاثر ہو کر آپ کی والدہ ام الخیر رضی اللہ عنہا بھی ایمان لے آئیں۔ ایمان لانے والوں میں ان کا انتالیسواں نمبر تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے وقت ایمان لائے۔

ہجرتِ حبشہ کا ارادہ

قریش کے مظالم سے تنگ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ اپنی وجاہت و سیادت کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی مخالفین اسلام کی دست درازیوں سے محفوظ نہ تھے۔ تاہم وہ بدستور تبلیغ دین اور مظلوموں کی اعانت کرنے میں مصروف رہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ بھی انتہائی مجبور و لاچار ہو کر یمن کے راستے حبشہ کی طرف عازم ہجرت ہوئے۔ برک الغماد تک پہنچے تھے کہ ابن دغنہ سے ملاقات ہو گئی جو قبیلہ قارہ کا سردار تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے جب ان کے ارادہ سے آگاہی ہوئی تو اس نے انہیں اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا اور کہا۔

---

[۱] اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ و قد جاء کم بالبینات من ربکم (سورہ المومن پارہ ۲۴)

صحیح بخاری۔ نیز نسائی اور ابن ابی حاتم نیز سیرت ابن ہشام

"اے ابوبکر! آپ جیسے شخص کو مکہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمان نواز ہیں، حاجت مندوں کی حاجت برآری کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کے دکھ درد میں کام آتے ہیں۔ آپ ہمیشہ سچی بات کہتے ہیں۔ آپ معاشرے کی زینت ہیں۔ میں آپ کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ میرے ساتھ مکہ واپس چلئے۔"

ابن دغنہ اپنی امان کی ذمہ داری پر حضرت ابوبکر کو مکہ واپس لایا۔ سرداران قریش میں اپنی امان کا اعلان کیا اور انہیں ملامت کی کہ تم ایک ایسے شخص کو شہر بدر کئے دیتے ہو جو ہمیشہ غریبوں حاجت مندوں کے کام آتا ہے۔ دوسروں کی تکالیف، مشکلات اور رنج وغم میں امداد، ہمدردی اور غم خواری کرتا ہے۔ قریش نے ابن دغنہ کی امان کو اس شرط پر قبول کرلیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ صرف اپنے گھر کے صحن کی حدود میں نماز پڑھیں اور قرآن کی تلاوت کریں تا کہ دوسروں تک ان کی آواز نہ پہنچے۔ انہیں خوف تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سن کران کی عورتیں، بچے اور نوجوان متاثر ہوں گے۔ اور اسلام کا کلمہ پڑھنے لگیں گے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گھر کے صحن میں ایک چھوٹی سی مسجد بنالی اور وہاں نماز پڑھنے لگے۔ رقیق القلب تو تھے ہی اور پھر اخلاص فی الدین اس پر مستزاد، ان کی تلاوت کی آواز سن کر اردگرد کے مکانوں کی عورتیں، بچے اور نوجوان دیواروں سے لگ کر یا دیواروں پر چڑھ کر قرآن سننے کے لئے ہجوم کرنے لگے اور اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہونے لگے۔ اس پر قریش نے ابن دغنہ سے شکایت کی کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے معاہدہ سے انحراف کیا ہے۔ ابن دغنہ کے پوچھنے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صاف کہہ دیا کہ "مجھے تمہاری امان کی ضرورت نہیں۔ مجھے اللہ کی امان کافی ہے۔" ابن دغنہ بری الذمہ ہوگیا۔ اس کے بعد قریش سے وقتاً فوقتاً چپقلش ہوتی رہی لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی دینی سرگرمیوں سے باز نہیں آئے۔ اور مخالفت کے طوفان میں آخر دم تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں مکہ ہی میں رہے حتیٰ کہ ہجرتِ مدینہ کا حکم آ گیا۔ شعب ابی طالب کے مقاطعہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور وہ تمام جاں گداز شدائد بطیب خاطر برداشت کئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بنی ہاشم اور دوسرے مسلمانوں کو متواتر تین سال تک برداشت کرنا پڑے۔ قیاس کہتا ہے کہ اس ظالمانہ مقاطعہ کو ختم کرانے میں بعض دوسروں کے علاوہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اہم کردار ادا کیا ہوگا۔ وہ مذاکرات کرنے اور اپنی پختہ فہم وفکر سے مخاطبین کو متاثر کرنے میں ماہر تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں

۱۰ نبوی کو عام الحزن (رنج وغم کا سال) کہا جاتا ہے کیونکہ اس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشفق و مددگار چچا ابوطالب اور اسلام کی خاتونِ اول حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دو انتہائی عزیز، بااثر اور غمگسار ہستیوں کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا جب کہ قریش کی مخالفت نقطہ عروج پر تھی۔ انہی دنوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کمسن صاحب زادی حضرت عائشہ کی تصویر خواب میں فرشتے نے یہ کہہ کر دکھائی کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں۔ دو دفعہ ایسا ہوا۔ پھر ایک مسلمان خاتون خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا کی تحریک پر

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کا نکاح حضور ﷺ سے کر دیا۔ یوں حضرت ابوبکر صدیق کو حضور ﷺ کی مصاہرت اور حضرت عائشہؓ کو ام المومنین ہونے کا شرف و اعزاز حاصل ہوا۔ رخصتی ہجرت کے بعد مدینہ جا کر ہوئی جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے، حضرت عائشہؓ کا حضور ﷺ سے نکاح امت مسلمہ کے لئے بے حد باعث برکت و رحمت ثابت ہوا۔ آگے چل کر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اہم دینی و تاریخی کردار ادا کیا۔ خاص کر عورتوں کے مسائل سے متعلق زیادہ تر احکام انہی کی روایات پر مبنی ہیں۔ یہ نکاح حکمت و رضائے الٰہی کی بے شمار مصلحتوں پر مبنی تھا۔ [1]

---

[1] محدثین: فقہا اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر ۶ سال اور رخصتی کے وقت نو سال تھی۔ صحیحین اور دوسری کتب حدیث کے علاوہ اہل سنت کے مذاہب اربعہ کے فقہا بھی اس پر متفق ہیں اور تزویج عائشہؓ سے انہوں نے کمسنی کی شادی کے جواز اور ضمنی فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے۔ مثلاً امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام نوویؒ، علامہ سرخسیؒ، امام ابن ہمامؒ سلیمان باجیؒ، امام بیہقیؒ، ابن قدامہؒ وغیرہ۔ سیرت نگاروں اور مؤرخین میں سب سے پہلے سیرت نگار ابن اسحاق ان کے بعد ابن ہشام پھر سب سے پہلے مؤرخ اسلام امام ابن جریر طبری، محمد بن سعد (طبقات)، حافظ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ) ابن عساکر (تاریخ)، ابن خلکان (وفیات الاعیان) وغیرہ۔ نیز اسماء الرجال کی مستند و معتبر کتابوں الاستیعاب، الاصابہ اور اسد الغابہ میں بھی حضرت عائشہؓ کی تزویج اور زفاف کے بارے میں یہی کچھ لکھا ہے۔ مشہور مصری مصنف محمد حسین ہیکل نے بھی حیات محمد میں اس کی تصدیق کی ہے۔ برصغیر ہندو پاکستان کے محققین علماء شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (حجۃ اللہ البالغہ) شبلی نعمانی (سیرت النبی) سید سلیمان ندوی (سیرت عائشہ، نیز کتابچہ ''حضرت عائشہ صدیقہ کی عمر پر تحقیقی نظر'')۔ قاضی سلیمان منصور پوری (رحمت للعالمین) جسٹس سید امیر علی (سپرٹ آف اسلام) سید ابوالاعلی مودودیؒ (سیرت سرور عالم) بھی اس پر متفق ہیں۔ لیکن بعض حضرات جن کی تعداد آٹے میں نمک کی سی ہے اور جن کے اذہان مغربی تہذیب و معاشرت سے بری طرح متاثر اور مرعوب ہیں وہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عائشہ کی عمر بوقت نکاح ۱۶ یا ۱۹ سال تھی۔ ان میں مولوی محمد علی لاہوری (امیر جماعت احمدیہ لاہور) غلام احمد پرویز، حکیم نیاز الدین اور بعض دوسرے شامل ہیں۔

ایک صاحب شہیر نیازی نے تو اپنی بات کی اپچ میں حد کر دی اور یہاں تک لکھ دیا کہ موجودہ صحیح بخاری جعلی کتاب ہے۔ اصل مسودہ گم ہو گیا تھا اور مروجہ نسخہ کسی دوسرے شخص نے بہت سے تغیر و تحریف کے ساتھ مرتب کیا جس میں اس نے حضرت عائشہؓ کی عمر سولہ سال کی بجائے چھ سال کر دی یعنی ستہ عشرہ (سولہ) سے عشرہ کا لفظ کاٹ کر محض ستہ رہنے دیا۔ موصوف نے اپنے دعویٰ کا کوئی ثبوت اور حوالہ پیش نہیں کیا۔ احساس کمتری اور ذہنی بددیانتی کی یہ انتہا ہے۔ امت مسلمہ صحیح بخاری کو قرآن مجید کے بعد اصح الکتب مانتی ہے۔ اس کی بے شمار شرحیں اور تنقیدیں لکھی گئیں۔ مغربی مستشرقین نے بھی طبع آزمائی کی۔ اعتراضات اور نکتہ چینی بھی کی۔ لیکن کسی کو شہیر نیازی کی سی اپج نہ سوجھی کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یہ صرف صحیح بخاری ہی نہیں جس میں حضرت عائشہ کی عمر بوقت نکاح چھ سال درج ہے بلکہ امام بخاری کے پیشرؤوں، ہم عصروں اور بعد میں آنے والوں نے بھی یہی عمر دی ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ ویسے بھی اگر نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر ۱۶ یا ۱۹ سال ہوتی تو رخصتی کو تین سال موخر کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مسٹر شہیر نیازی نے اپنے ایک انگریزی مضمون ''اسلام میں کم سنی کی شادی'' (Child Marriagein Islam) مطبوعہ ڈان کراچی (۱۷ اگست ۱۹۸۵) جو مغربیت زدہ عورتوں کی تحریک کی حمایت کے سلسلے کی ایک کڑی تھا، میں ایسے ہی بے سروپا دعوے کئے تھے اور غلط سلط، غیر مصدقہ اور محرف حوالے دیئے تھے۔ اس کے جواب میں راقم الحروف نے روزنامہ جسارت (کراچی) میں تردیدی مضمون لکھ کر اس کی قلعی کھول دی تھی۔ (ڈان نے چھاپنے سے انکار کر دیا) قرآن مجید میں کمسنی کی شادی کے خلاف کوئی نص صریح موجود نہیں۔ خود رسول اکرم ﷺ نے اپنی بڑی صاحب زادی حضرت زینب کا نکاح ابوالعاص ؓ سے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہجرتِ مدینہ

ابوطالب اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد جب قریش کا تمرد، اسلام دشمنی اور ایذا رسانی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئے تو حج کے موقع پر یثرب سے قبیلہ خزرج کے چھ آدمی مکہ آئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ دوسرے سال یثرب کے بارہ آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے اور پھر بیعت عقبہ ثانیہ واقع ہوئی جس میں یثرب کے بہتر (۷۲) افراد نے اسلام قبول کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ اور صلح و جنگ ہر حال میں وفاداری اور جان نثاری کا حلف اٹھایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب ہجرت کرنے کی دعوت دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم خداوندی کے تحت اہل یثرب کے ساتھ جینے مرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو یثرب میں مبلغ اور معلم بنا کر بھیج دیا۔ ان کی مساعی سے اوس خزرج کے سردار اور رؤسا اسلام لے آئے۔ عامتہ الناس نے بڑی سرعت سے ان کی تقلید کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت اور اہل یثرب کی دعوت پر مکہ کے ستم رسیدہ مسلمانوں نے ایک ایک دو دو کر کے یثرب پہنچنا شروع کر دیا۔ اکثر کو گھر بار، مال و جائیداد کی قربانی دینے کے علاوہ قریش کے ہاتھوں شدید تکالیف اٹھانا پڑیں۔ بہر حال محرم ۱۳ نبوی میں ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور تقریباً دو ماہ کے اندر مسلمانانِ مکہ کے تقریباً دو سو خاندان مدینہ پہنچ گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ صرف چند کمزور اور معذور مسلمان مکہ میں رہ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہجرت کی اجازت چاہی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ابھی رک جاؤ، شاید ہجرت کے لئے اللہ تمہارا کوئی ساتھی پیدا کر دے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اشارہ سمجھ گئے۔ اس میں دو مصلحتیں تھیں ایک تو یہ کہ قریش کو یہ تاثر رہے کہ ہجرتِ حبشہ کی طرح اب بھی عامتہ المسلمین ہی مدینہ جا رہے ہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے عزیز ترین رفقا اور رشتہ دار مکہ ہی میں رہیں گے۔ اس لئے ان سے بعد میں نپٹ لینا آسان ہو گا۔ دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے پہلے مہاجرین کی ایک خاصی تعداد وہاں پہنچ چکی ہوتا کہ وہاں ہر بات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کلیتہً مدینہ کے نو نیاز نو مسلموں (جنہیں آپ نے انصار کا معزز لقب دیا) پر انحصار نہ کرنا پڑے۔ مہاجرین آپ کے مزاج، طرز فکر اور طریق کار سے پوری طرح آگاہ تھے جب کہ انصار مدینہ کو ہر معاملے میں نئے سرے سے تربیت اور آگاہی درکار تھی۔ مہاجرین پہلے سے آزمودہ تھے جب کہ انصار کی آزمائش کا دور اب شروع ہونا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ سمجھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے دو تیز رفتار

دس سال کی عمر میں کیا۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح بھی تقریباً سات سال کی عمر میں ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے کئے لیکن رخصتی سے پہلے ہی طلاق ہو گئی۔ پھر انہی دونوں صاحب زادیوں کے نکاح یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کئے اور اسی بنا پر وہ ذوالنورین کہلائے۔ نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی صاحب زادی حضرت ام کلثوم کا نکاح بھی کم سنی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کیا اور ان سے صاحب زادے زید بن عمر اور صاحب زادی رقیہ پیدا ہوئیں۔ تاریخ میں بعض دوسرے صحابہ کے ہاں بھی کم سنی کے نکاح کی مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت عائشہ کے نکاح کی مثال سے فقہا نے کمسنی کی شادی کے متعلق مسائل اخذ کئے۔ اگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کم سنی کے نکاح کی ممانعت کرنا ہوتی تو صاف صاف امتناعی حکم دے دیا ہوتا۔ اسلام دین فطرت ہے اس میں ایسا کوئی حکم موجود نہیں۔ مؤلف

سانڈنیاں آٹھ سو درہم میں خریدیں اور انہیں خوب کھلانا پلانا شروع کیا۔ تمام ضروری سامان سفر بھی تیار کرلیا اور انتظار کرنے لگے کہ کب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہجرت کا سگنل ملتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ دن میں ایک دفعہ صبح یا شام کو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر ضرور تشریف لے جاتے اور باہم صلاح و مشورہ ہوتا۔ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلاف معمول دوپہر کے وقت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے اور تخلیہ کروا کر فرمایا کہ ''اے ابو بکر! اللہ کی طرف سے ہجرت کا حکم آ گیا۔ تم بھی میرے ہمراہ چلو گے'' ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی باوجود یکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ قریش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اور مدینہ کا سفر انتہائی خطرناک ہوگا کیونکہ ان کا تعاقب کیا جائے گا، انہوں نے اسی رات یثرب کی روانگی کے انتظامات مکمل کر لئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اشارۂ غیبی سے یا اہل مکہ میں سے کسی خیر خواہ کے ذریعے معلوم ہو گیا تھا کہ اس رات قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر ایک ہجوم کی صورت میں حملہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم کر دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ تاکہ اسلام کی جڑ بنیاد ہی کاٹ دی جائے۔ اس طرح جو مسلمان ہجرت کر کے مدینہ جا چکے تھے لاوارث اور بے یار و مددگار ہو کر رہ جائیں گے۔ وہ یا تو اسلام سے منہ موڑ کر مکہ واپس آ کر پھر سے مشرک معاشرے میں جذب ہو جائیں گے یا یثرب کے یہودیوں اور منافقوں کے ہاتھوں ختم ہو جائیں گے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کے قاتلانہ منصوبے سے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و نصرتِ خداوندی پر کامل بھروسہ تھا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرا شخص جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارادۂ ہجرت سے آگاہ کیا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ جنہیں اس رات آپ کے بستر مبارک پر آپ کی جانی پہچانی چادر اوڑھ کر سونا تھا تاکہ قریش یہ سمجھیں کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر دراز ہیں۔ چنانچہ جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بے فکر اور مطمئن ہو کر بستر نبوی پر سو گئے۔ تہائی رات گزرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے ہوئے رسالت کدہ سے برآمد ہوئے۔ قریش کے مختلف قبائل کے افراد پر مشتمل ایک بڑے جتھے نے چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ آپ نے ایک مٹھی بھر خاک ان کی طرف پھینکی اور فرمایا شَاهَتِ الْوُجُوْهُ (بدشکل اور رسوا ہوئے منہ) پھر اطمینان سے ان کے درمیان سے گزر گئے۔ جیسے انہیں نیند آ گئی ہو۔ کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ وہ تو پہلے ہی سراپا انتظار تھے اور جاگ رہے تھے۔ ضروری سامانِ سفر تیار تھا۔ اپنا نقد اثاثہ جو اللہ کی راہ میں خرچ ہوتے ہوتے چالیس ہزار میں سے صرف پانچ ہزار درہم باقی رہ گیا تھا، ساتھ لیا۔ تاکہ اثنائے سفر میں نیز مدینہ پہنچ کر بوقت ضرورت کام آئے۔ اہل خانہ کو خدا کے سپرد کیا توشہ دان باندھنے کے لئے کوئی چیز نہ ملی تو اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے اپنا کمر کا پٹکا پھاڑ کر دو ٹکڑے کئے اور ایک سے توشہ دان باندھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسماء کو ذات النطاقین (دو پٹکوں والی) کے لقب سے نوازا۔ یہ لقب مسلمانوں میں اور تاریخ میں ان کے نام کا جزو بن گیا اور اعزازی شناخت بھی۔ یہی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ہجرت کے وقت گھر میں صرف اللہ کا نام چھوڑ گئے۔ اسماء رضی اللہ عنہا کے دادا ابو قحافہ جن کی عمر اسی سال تھی اور وہ نابینا تھے آئے اور کہا کہ لڑکی! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ تم لوگوں کی ضرورت کے لئے کوئی دام و

درم نہیں چھوڑ گیا۔'' حضرت اسماء نے جواب دیا کہ ''داداجان! وہ ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں'' پھر کپڑے میں پتھر کنکر لپیٹ کر دیوار کے اس گڑھے میں رکھ دیئے۔ جہاں زرونقد رکھا جاتا تھا۔ ابوقحافہ نے ٹٹول کر دیکھا اور مطمئن ہو گئے۔ اس توکل علی اللہ کا مظاہرہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہی کرسکتی تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکان کی عقبی کھڑکی سے رات کی تاریکی میں نکل گئے اور شہر سے تین چار میل دور غار ثور میں قیام کیا۔ اس دوران میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ قریش کی خبریں پہنچاتے رہے۔ ان کی جواں سال صاحب زادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا تمام خطرات کو انگیز کر کے کھانا پہنچاتی رہیں اور ان کے آزاد کردہ غلام حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ دن کو گردونواح میں بکریاں چراتے اور دونوں صاحبان کو دودھ پہنچاتے، رات کو بکریاں واپس لے جاتے ہوئے عبداللہ اور اسماء رضی اللہ عنہما کے قدموں کے نشان مٹا دیتے۔ غرضیکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تقریباً سارا گھرانہ ہجرت کے عمل میں شریک ہو گیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے محاصرہ کی رات جب صبح ہوئی تو محاصرین کو یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی اور اعصاب شکن جھلاہٹ بھی کہ بستر نبوی پر حضرت علی رضی اللہ عنہ ابن طالب کو شب بسری کا شرف حاصل ہوا اور خود صاحب بستر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گئے تھے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پکڑ دھکڑ کی مگر وہ کب کچھ بتا کر دینے والے تھے۔ آخر انہیں چھوڑ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف بھاگے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اپنے گھر کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا ٹھکانہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا گھر ہی ہوسکتا تھا۔ وہاں پہنچ کر ابوجہل نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے بڑی درشتی سے پوچھا کہ ''لڑکی! تیرا باپ کہاں ہے؟'' انہوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ ''مجھے کیا معلوم'' ابوجہل نے انہیں خائف کر کے اصل حقیقت اگلوانے کے لئے اس زناٹے کا چانٹا رسید کیا کہ ان کا کان زخمی ہو گیا اور کان کی بالی دور جا گری۔ پھر بھی اسماء رضی اللہ عنہا نے کچھ بتا کر نہ دیا۔ مایوس و نامراد ہو کر ابوجہل اور اس کے ساتھی وہاں سے واپس ہوئے اور اعلان کر دیا کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے لائے گا اسے سو اونٹ انعام دیئے جائیں گے۔ اونٹوں کے لالچ میں بہت سے لوگ دوڑ پڑے مگر دلوں کے اندھے آنکھوں کے بھی اندھے رہے۔

غارِ ثور کی طرف جاتے ہوئے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کبھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے چلتے اور کبھی پیچھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تعاقب کرنے والوں کا خیال آتا ہے تو پیچھے چلنے لگتا ہوں اور جب یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں آگے کوئی خطرہ نہ ہو تو آگے ہو جاتا ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تمہارا مطلب ہے کہ کوئی آفت آئے تو میری بجائے تم پر آئے؟'' عرض کیا کہ ''جی ہاں'' یہ تھا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جذبۂ فداکاری۔

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رات کی تاریکی میں غار ثور تک پہنچے تھے۔ اس لئے موخر الذکر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا تاکہ کانٹوں اور نکیلے پتھروں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں زخمی نہ ہوں اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کے نشان غار کے قریب دکھائی دیں۔ غار پر پہنچ کر حضرت ابوبکر صدیق پہلے خود غار میں

داخل ہوئے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا اور صاف کیا۔ مبادا اندر کوئی سانپ، بچھو، درندہ وغیرہ ہو۔ سوراخوں کو اپنی چادر کے ٹکڑوں سے بند کیا۔ غار میں آنحضرت ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زانو پر سر مبارک رکھ کر سو گئے لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کی حفاظت کی خاطر جاگتے رہے۔ جاں نثار رسول ﷺ کی آنکھوں میں نیند کہاں؟ اس وقت ابوبکر کا زانو ماضی، حال اور مستقبل کی دنیا کے عظیم ترین اور مقدس ترین انسان اور کائنات کے بہترین گنج خوبی کی تکیہ گاہ تھا۔ جس کی حفاظت کی سعادت اللہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قسمت میں لکھ دی تھی۔ حفاظت کی اس سعی میں ان کے نزدیک اپنی جان دے دینے کی ذرا بھی اہمیت نہ تھی۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ ایک سوراخ بند کرنے سے رہ گیا ہے۔ چادر ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے اس پر اپنا پاؤں رکھ دیا تاکہ اگر اس میں کوئی زہریلا جانور ہو بھی تو باہر نہ نکلنے پائے۔ اور حضور ﷺ کی کوئی گزند نہ پہنچے۔ بعض روایات میں ہے کہ اسی سوراخ سے کسی سانپ یا دوسرے زہریلے جانور نے ان کے پاؤں پر ڈنک مارا۔ درد کی شدت سے ان کے آنسو بہہ نکلے لیکن سوراخ سے پاؤں پھر بھی نہیں ہٹایا۔ آنسوؤں کے قطرے رسول اللہ ﷺ کے روئے اقدس پر ٹپکے اور آپ ﷺ بیدار ہو گئے۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آنسوؤں کی وجہ معلوم ہوئی تو آپ نے اپنا لب مبارک ان کے پاؤں پر ڈسنے کی جگہ لگائی اور تکلیف جاتی رہی۔

قریش حضور ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہجرت کی اہمیت اور اس کے اثرات و نتائج کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یثرب کی طرف آپ ﷺ کی ہجرت تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کا اہم ترین واقعہ ہے جس سے ملکوں اور قوموں کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، تہذیبی، روحانی، مذہبی تاریخ کے دھاروں کے رخ بدل گئے۔ قریش مکہ نے بارہا کوشش کی تھی کہ محمد ﷺ اپنے پیش کردہ دین کے اصولوں کے بارے میں کچھ لو اور کچھ دو، کی بنیاد پر ان سے سمجھوتہ کر لیں۔ دنیا کے سابقہ ادیان بدھ مت، یہودیت، ہندومت، عیسائیت، مجوسیت وغیرہ نے ایسے سمجھوتے کئے تھے مگر اسلام کے اصولوں میں کسی سمجھوتے کی گنجائش نہ تھی۔ یہ توحید خالص ...... لا الہ الا اللہ۔ کا دین تھا۔ آخر قریش نے مایوس اور سیخ پا ہو کر انتہائی اقدام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ قریش کے جاسوس اور سو اونٹوں کے انعام کے حریص محمد ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو چاروں طرف ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ انہوں نے پہاڑیاں، کھاڑیاں، جھاڑیاں، وادیاں، دشت اور صحرا سب چھان مارے۔ ایک دفعہ تو عین غارِ ثور کے دہانے پر پہنچ گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے پاؤں کی چاپ سنی، ان کے سایوں کو غار کے اندر منعکس دیکھا اور ان کی آوازیں سنیں تو وہ متردد ہوئے کہ اگر ان ظالموں نے ذرا جھک کر غار کے اندر نظر کی تو ہادئ کائنات، رحمت اللعالمین ﷺ کو دیکھ لیں گے اور خود ابوبکر کو بھی۔ پھر جانے کیا ہو۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی فکر نہ تھی۔ انہیں دنیا کے ہادی، رہنما اور آخری نجات دہندہ کی سلامتی کی فکر تھی۔ خدانخواستہ اگر انہیں کوئی ضرر پہنچا تو دنیا کی ہدایت اور نجات کا مشن ادھورا رہ جائے گا۔

انہیں اپنی جان کی پروانہ تھی، وہ ایسی ہزاروں جانیں شمع رسالت پر پروانہ وار قربان کر سکتے تھے، گزشتہ تیرہ سال میں انہوں نے فداکاری کا بارہا مظاہرہ کیا تھا۔ نہ صرف ان کی اپنی جان بلکہ ان کے اہل وعیال کی جانیں بھی فدا کئے جانے کے لئے وقف تھیں۔ کافروں کو غار کے دہانے پر کھڑا دیکھ کر ان کے دل میں جو خطرہ گزرا وہ انہوں نے آہستگی سے حضور ختمی مرتبت ﷺ سے عرض کیا۔ آپ ﷺ نے کامل اطمینان و سکون سے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ! لَا

تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (غم نہ کر اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے) پس اللہ نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور وہ دشمنوں کی موجودگی سے بے پرواہو گئے۔ایک کافر نے غار کے اندر جانے کا ارادہ بھی کیا لیکن اس نے دیکھا کہ غار کے دہانے پر مکڑی نے جالا بن رکھا ہے اور ایک طرف کبوتر کا گھونسلا ہے جس میں انڈے ہیں۔اسے یقین ہو گیا کہ غار کے اندر کوئی انسان ایک دو دن کے اندر نہیں گیا ورنہ مکڑی کا جالا اور کبوتر کا گھونسلا اور انڈے وہاں نہ ہوتے۔چنانچہ وہ اپنے ارادے سے باز رہا اور دوسروں کو بھی یہ بات بتائی۔سب وہاں سے چلے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی سورۂ توبہ[1] میں اس واقعہ کا ذکر کر کے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب،اور ثانی اثنین (دو میں کا دوسرا) کہہ کر انہیں جاودانی عظمت و شرف سے سرفراز کر دیا۔دنیا کے لاکھوں، کروڑوں مسلمان روزانہ اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں جس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ،دو میں کا دوسرا،خود اللہ نے فرمایا ہے اور پھر وہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا حوالہ کہ ''اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے''یعنی تیسرا خود خدا ہے۔کیسی عالی شان تثلیث ہے یہ!ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ وہ رفعت شان ہے جو کسی دوسرے صحابی کو نصیب نہ ہوئی۔غار ثور میں رفاقت اور جذبۂ جاں نثاری نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے فارسی اور اردو ادب میں ''یار غار'' کا لقب ایجاد کیا جس کا مطلب انتہائی جاں نثار اور مشکل وقت میں کام آنے والا دوست ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اور آزاد کردہ غلام اور چرواہے حضرت عامر بن فہیرہ روزانہ آ کر اہل مکہ کی کارروائیوں کی خبریں دیتے تھے۔تین دن بعد انہوں نے بتایا کہ دشمن تھک ہار کر اور مایوس ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور تلاش ترک کر دی ہے۔تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی خرید کردہ سانڈنیاں منگوائیں جنہیں اس خاص مہم کے لئے انہوں نے خوب کھلا پلا کر تیار کیا تھا اور ایک کی قیمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس سے انہیں باصرار ادا کر دی تھی۔ایک مشرک مگر قابل اعتماد رہنما عبداللہ بن اریقط کو اجرت پر ساتھ لیا جو پہلے سے ادا کر دی گئی تھی۔ایک اونٹنی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے،دوسری پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے پیچھے حضرت عامر بن فہیرہ۔تیسری پر عبداللہ بن اریقط۔یہ مختصر اور مقدس قافلہ یکم ربیع الاول ۱۳ نبوی (۱۲ ستمبر ۶۲۲ عیسوی) کو غار ثور سے روانہ ہوا اور ایک رات اور ایک دن مسلسل سرگرم سفر رہا تا کہ دشمنوں کی حدود سے جلدی سے جلدی دور نکل جائے۔اگلے دن جب دھوپ میں شدت آ گئی اور لگاتار سفر سے کچھ تکان بھی محسوس ہونے لگی تو سواریاں ٹھہرائی گئیں۔ایک چٹان کے سائے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زمین صاف کر کے اپنی چادر بچھائی تا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم استراحت فرمائیں۔قریب ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا۔اس کی اجازت سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک دودھیل بکری کا تھن پہلے اچھی طرح صاف کیا۔پھر ایک صاف برتن میں دودھ دوہا اور کپڑے سے ڈھانپ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ٹھنڈا کرنے کے لئے تھوڑا سا پانی ملایا اور آپ نے نوش جان فرمایا۔چرواہا بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حسن ادب اور خدمت گزاری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔پھر آگے روانہ ہوئے۔سراقہ بن مالک نے سو اونٹوں کے لالچ میں تعاقب کیا اور قریب پہنچ گیا۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ لیا اور

[1] سورۃ توبہ آیت ۴۰

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا۔ سراقہ کے گھوڑے نے سکندری کھائی اور وہ گر پڑا۔ دوبارہ سوار ہو کر چلا تو گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا۔ سراقہ خوفزدہ ہو گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اس نے امان چاہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے امان نامہ لکھ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اے سراقہ! میں تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھتا ہوں۔''[1] ایک تاجر اور ماہر نساب کی حیثیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت جانے پہچانے شخص تھے۔ اثنائے سفر میں انہیں بہت سے واقف کار ملے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھی کون ہیں؟ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ میرے رہنما ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مراد دینی رہنما سے تھی۔ پوچھنے والوں نے سفر کا رہنما سمجھا۔ سفرِ ہجرت میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق و دمساز، صلاح کار، خادم خاص اور محافظ کا تھا۔

اپنے اہل و عیال کو وہ اللہ کے بھروسے پر اپنے دشمنوں کے درمیان چھوڑ آئے تھے۔

۱۲ ربیع الاول (۲۴ ستمبر ۶۲۲ء) کو پیر کے دن دوپہر کے وقت قافلۂ نبوی یثرب کی مضافاتی بستی قبا پہنچ گیا۔

اہل یثرب چشم براہ تھے۔ لیکن اکثر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور کے سر مبارک پر اپنی چادر تان لی تا کہ لوگ خادم اور مخدوم کو پہچان لیں، قبا میں حضرت کلثوم بن ہدم کے مکان پر چند روز قیام فرمایا۔ لوگ وہیں جوق در جوق بارگاہ نبوی میں حاضر ہوتے رہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تعارف اور ملاقات کا اہتمام کرتے رہے۔ پھر کوکبۂ نبوی نے یثرب میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاں نزول اجلال فرمایا۔ تب سے یثرب (لٹیروں کی بستی) نہ رہا بلکہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (رسول خدا کا شہر) ہو گیا اور مختصراً مدینہ کہلایا اس شہر نے اسلامی تاریخ میں خصوصاً اور عالمی تاریخ میں عموماً جو کردار ادا کیا ہے اس کی بناء پر دنیا کا شاید ہی کوئی ملک یا قوم ہو جو اس سے ناواقف ہو۔

ہجرت نبوی کے عمل میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تقریباً سارا گھرانا شریک تھا۔ لیکن کسی نے، خواہ وہ شریک نہ بھی رہا ہو مثلاً عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ، دشمنوں کے سامنے اس راز کی نقاب کشائی نہ کی اور اسے اپنے سینوں میں امانت کی طرح محفوظ رکھا۔ بعد میں ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی غار ثور کی ایک نیکی عمر رضی اللہ عنہ کی ساری زندگی کی نیکیوں سے بڑھ کر ہے اور خدا کی قسم! ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک رات آل عمر رضی اللہ عنہ سے افضل ہے اور ان کا ایک دن آل عمر رضی اللہ عنہ سے افضل ہے۔

ہجرتِ مدینہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک انقلاب آفریں اقدام تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ اور عشرہ مبشرہ کے بقیہ اصحاب اگرچہ پہلے بھی مسلمانوں میں نمایاں تھے لیکن ہجرت کے بعد انہوں نے جو کردار ادا کیا۔ اس نے مسلمانوں میں ان کی عظمت و تفوق پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ہجرت کا واقعہ پیش نہ آتا تو شاید بقیہ دنیا ان زعمائے اسلام کے ناموں اور کارناموں سے کبھی آشنا نہ ہو پاتی۔

---

[1] سراقہ مسلمان ہوئے اور یہ پیش گوئی عہد فاروقی میں مدائن کی فتح کے بعد پوری ہوئی جب مالِ غنیمت میں کسریٰ کے کنگن بھی آئے اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سراقہ کو پہنا کر لوگوں کو دکھائے اور عبرت کا سماں پیدا ہو گیا۔ مولف

مدنی زندگی

مدینہ پہنچ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام فرمایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مدینہ کی مضافاتی بستی سخ میں قبیلہ خزرج کے ایک سرکردہ مسلمان حضرت زید بن خارجہ بن ابی زہیر رضی اللہ عنہ کے ہاں مہمان ٹھہرے۔ طبائع کی یکرنگی اور معاشرتی اور دینی مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اسلامی مواخاۃ قائم کردی اور انہوں نے اپنی صاحبزادی حبیبہ رضی اللہ عنہا کا عقد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ حضرت حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام کلثوم پیدا ہوئیں۔

کچھ دن بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی بنیاد رکھی۔ مسجد کے لئے جو زمین حاصل کی گئی اس کی قیمت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی جیب سے ادا کی۔ مہاجرین صحابہ کو مسجد کے اردگرد رہائشی پلاٹ عطا کئے۔ ایک پلاٹ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی عطا کیا۔ انہوں نے وہاں اپنا مکان تعمیر کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے اس کی ایک کھڑکی صحن مسجد کی طرف رکھی جس سے مسجد میں آتے جاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کے وقت حکم دیا کہ تمام صحابہ کے مکانوں کی صحن مسجد میں کھلنے والی کھڑکیاں بند کردی جائیں۔ سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مکان کی کہ وہ بدستور کھلی رہے گی۔

جب آپ کے اہل وعیال مکہ سے مدینہ آگئے تو انہیں اسی مکان میں رکھا البتہ خود اپنی انصاری بیوی حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ سخ ہی میں مقیم رہے۔ روزانہ وہاں سے کبھی پیدل اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ آتے اور سارا دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزارتے۔ خلیفہ ہونے تک یہی دستور رہا۔ جب اس روزانہ کی آمدورفت سے کاروبارِ خلافت کی انجام دہی میں تاخیر کا اندیشہ ہوا تو مستقلاً مدینہ والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ البتہ جمعرات کی شام کو سخ چلے جاتے اور اگلے دن نماز جمعہ کے وقت تک وہیں رہتے۔ پھر وہاں سے تیار ہو کر آتے، خطبہ دیتے اور امامت کرتے۔

مدینہ میں سرگرمیاں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے اسلام کی سربلندی اور فتح وکامرانی کا باب وا ہوا اور پہلی اسلامی مملکت اور معاشرے کی بنیاد پڑی۔ نئے نئے مسائل درپیش ہوئے، مہاجرین صحابہ کی اکثریت انتہائی ناداری اور بے سروسامانی کے عالم میں مدینہ پہنچی تھی، اولین مسئلہ ان کی آبادکاری اور انصار مدینہ کی آبادی میں ان کے انجذاب اور وسائل معاش کا تھا تاکہ مسلمانوں کا ایک مستحکم معاشرہ قائم ہو سکے۔ مسلمانوں کے اندرونی ارتباط و استحکام کے ساتھ ساتھ حوالئی مدینہ کی یہودی آبادیوں سے صلح وارتباط اور دشمنوں کے مقابلے میں باہمی امداد کے معاہدے کا سوال بھی نہایت اہم تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبانہ روز توجہ ان مسائل پر مرکوز رہتی تھی۔ انہیں حل کرنے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست راست تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اصابت رائے اور متوازن مزاج پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت اعتماد تھا۔ بالفاظ دیگر ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر تھے۔

ہجرت کے ابتدائی ایام کے بعد جب حالات قدرے پرسکون ہوئے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنا تجارتی کاروبار شروع کر دیا اور مدینہ کے بازار میں کپڑا بیچنے لگے۔ لیکن ان کا زیادہ وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزرتا تھا۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے شام، یمن، عراق وغیرہ ممالک کے تجارتی سفر نہیں کئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے سخ میں کپڑا بننے کی کھڈیاں لگائی تھیں۔ بہرحال مکہ میں جو تجارتی خوشحالی انہیں حاصل تھی مدینہ میں حاصل نہ ہوئی۔ نہ انہوں نے اس کے لئے کوئی زیادہ کوشش کی۔ معقول گزر بسر کے لئے کما لیتے تھے۔ ورنہ بیشتر اوقات نوزائیدہ مملکت کی مضبوطی، حفاظت اور فلاح و بہبود کی تدابیر سوچنے اور اختیار کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے اور گوش بر آواز رہتے کہ زبان وحی ترجمان سے کوئی حکم صادر ہو تو اس کی تعمیل میں لگ جائیں۔ مدینہ پہنچ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی عمل میں آئی اور وہ زوجہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المومنین کی حیثیت سے کاشانۂ نبوی میں داخل ہوئیں۔ یہ تزویج حکمت و مصلحت خداوندی کی آئینہ دار تھی اور امت مسلمہ کے لئے بے حد بابرکت ثابت ہوئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عالم تھا کہ تاریخ نے ان کا یہ قول محفوظ رکھا ہے کہ "دنیا کی چیزوں میں مجھے تین چیزیں پیاری ہیں۔"

۱- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے مبارک کی طرف دیکھتے رہنا۔

۲- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا مال خرچ کرنا۔

۳- میری لڑکی کا رسول اللہ کی زوجیت میں ہونا۔

ایک دفعہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ اللہ ابو بکر رضی اللہ عنہ پر رحم کرے۔ اس نے اپنی بیٹی میری زوجیت میں دی، ہجرت میں میرا ساتھ دیا اور بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کیا۔"

غزواتِ نبوی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ

مشرکین مکہ کو مدینہ کے یہودیوں اور منافقوں کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انصار و مہاجرین کے متعلق خبریں پہنچ رہی تھیں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے بچ کر نکل آنے پر غم و غصہ سے باؤلے ہو رہے تھے۔ جس روحانی، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی انقلاب سے وہ گزشتہ تیرہ برس سے خائف تھے اب مدینہ کی سرزمین میں اس مبارک انقلاب کا آفتاب طلوع ہو کر اپنی کرنیں بکھیرنے لگا تھا۔ انصار و مہاجرین میں مواخاۃ قائم ہو چکی تھی۔ مدینہ کے پرانے اور نئے باشندوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں رہا تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک تھے۔ بلکہ انصار مدینہ نے بے نظیر ایثار کا مظاہرہ کیا اور اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے اموال، اراضی، باغات وغیرہ کا نصف حصہ پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ مدینہ انقلاب کی سرزمین بن گیا اور بقیہ عرب کے لئے بہترین اور صالح ترین اجتماعی زندگی کا روشن نمونہ۔ مسلمانوں کا ایک دینی اور سیاسی مرکز قائم ہو گیا۔

یہ سب اطلاعیں قریش کو پہنچ رہی تھیں۔ مدینہ میں مسلمانوں کی ریاست اور سیادت قائم ہو جانے سے انہیں اپنی شامی تجارت بھی خطرے میں پڑتی دکھائی دینے لگی کیونکہ ان کے تجارتی قافلے مدینہ کے قریب سے ہو کر

گزرتے تھے اور انہیں ڈر تھا کہ ان کے ستائے ہوئے مسلمان انتقاماً ان کے قافلوں پر حملہ کر کے ان کا مال و اسباب لوٹیں گے اور اہل قافلہ کو قتل کریں گے یا قیدی بنائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے مدینہ کے یہودیوں اور منافقوں کو دھمکی آمیز پیغام بھیجے کہ اگر تم لوگ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے شہر سے نہیں نکالو گے اور ہمارے حوالے نہیں کرو گے تو ہم ایک زبردست فوج کے ساتھ حملہ کر کے تمہارے شہر کو تباہ اور تمہیں قتل کر کے تمہاری عورتوں بچوں کو لونڈی غلام بنالیں گے اور تمہارے اموال و جائیداد کو اپنے تصرف میں لائیں گے۔

حضور ﷺ ان دھمکی آمیز پیغاموں سے بے خبر نہ تھے۔ آپ ﷺ کے حکم سے صحابہ چوکس رہتے تھے۔ اہل مکہ کی حرکات و سکنات پر خصوصی نظر رکھی جاتی تھی۔

غزوۂ بدر (رمضان ۲ھ-۶۲۳ء)

آخر قریش نے اپنے تجارتی قافلے پر مسلمانوں کے حملے کو بہانہ بنا کر مدینہ پر چڑھائی کر دی حالانکہ قافلہ بچ کر نکل گیا تھا اور قافلہ سالار ابوسفیان نے تیز رفتار قاصد بھیج کر قافلہ کی سلامتی کی اطلاع دیدی تھی اور جنگ کے لئے نکلنے سے منع کر دیا تھا لیکن ابوجہل اور دوسرے سردارانِ قریش کو ان کے زعم باطل کے مطابق محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو سبق سکھانے اور تہس نہس کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کو یہ منظور تھا کہ ان سرکش اور متمرد انسانوں کی زندگی کی طنابیں کھینچ کر اپنے دین اسلام کو پھیلنے کا موقع دے۔ اپنے ان حق ناشناس اور مغرور بندوں کو اس نے بہت ڈھیل دی تھی جس کی انہوں نے قدر نہ کی اور بار بار کی تنبیہ کے باوجود نوشتۂ دیوار کو نہ پڑھا۔ چنانچہ وہ انہیں ان کے محفوظ ٹھکانوں سے نکال کر بدر کے میدان میں لے آیا جہاں موت ان کی گھات میں تھی اور جہاں انہیں ابدی ذلت و خسرات سے ہمکنار ہونا تھا۔

حق و باطل اور خیر و شر کا یہ پہلا مقابلہ تھا جس پر دنیا کے مستقبل اور فلاح و سعادت کا انحصار تھا۔ اب تک مسلمانوں کو دشمنوں کے خلاف جہاد و قتال کا حکم نہ تھا لیکن اسلام کو بتدریج مدینہ کی حدود سے نکل کر سارے عرب اور اطراف و اکناف کے ممالک اور پھر دور دراز کے دیسوں میں اپنی روشنی پھیلانا تھی۔ اس لئے حکم ہوا کہ عدم مزاحمت اور مقاومت مجہول کو خیر باد کہا جائے اور دشمنوں کی چیرہ دستیوں کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔

جب بدر میں قریش کے مقابلہ کی نیت سے حضور ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ قریش سے جنگ تو کیا اگر آپ ﷺ ہم کو سمندر میں کود پڑنے کا حکم دیں گے تو ہم بلا ہچکچاہٹ کود پڑیں گے اور پھر مزید عرض کیا گیا کہ "حضور ﷺ! ہم موسیٰ علیہ السلام کی امت نہیں جس نے اپنے نبی سے کہا تھا کہ جاؤ تم لڑو اور تمہارا خدا لڑے ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔ بلکہ حضور ﷺ! ہم تو آپ کے دائیں بائیں، آگے پیچھے، چاروں طرف لڑیں گے۔" یہ سن کر حضور ﷺ کا روئے اقدس اطمینان و مسرت سے جگمگا اٹھا اور آپ ﷺ نے بدر کی جانب کوچ کی تیاری کا حکم دے دیا۔

۳ رمضان المبارک ۲ھ کو آپ ﷺ تین سو تیرہ مجاہدین کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۱۷ رمضان کو

میدان بدر میں پہنچ گئے۔ مجاہدین کی اکثریت انصار پر مشتمل تھی۔ صرف ساٹھ مہاجر صحابہ کفر اور اسلام کے اس اولین معرکہ میں شریک ہوئے۔ تین سو تیرہ کی اس جماعت مجاہدین میں صرف دو گھوڑ سوار تھے اور ستر شتر سوار۔ اسلحہ بھی محدود اور کمتر درجے کا تھا۔ لیکن ان کے دل مضبوط اور مطمئن تھے۔ وہ راہ خدا کے سپاہی تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اللہ کے دشمنوں سے لڑ کر اور انہیں جہنم رسید کر کے غازی ہوں گے اور اگر اس کوشش میں خود مارے گئے تو شہید ہوں گے۔ دونوں صورتوں میں اعلیٰ ترین جنت اور حیاتِ جاوداں کے مستحق

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

ان کے مقابلے میں قریش کا لشکر ایک ہزار آزمودہ جنگ جوؤں پر مشتمل تھا جو اسلام اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر تلا ہوا تھا لشکر قریش کے پاس ایک سو جنگی گھوڑے اور سات سو اونٹ تھے اور آلات حرب اور سامان رسد کی افراط۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک ٹیلے پر عریش (سائبان) کھڑا کر دیا تھا اور اتفاق رائے سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا باڈی گارڈ مقرر کیا گیا تھا۔ غار ثور میں بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ثانی اثنین تھے اور بدر میں بھی انہی کو یہ شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے باڈی گارڈ ہونے کا فریضہ بدرجہ احسن پورا کیا۔ انتہائی خطرناک موقع تھا مگر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے وہ نہایت جرأت و پامردی اور عزم و استقلال سے ڈٹے رہے۔ جنگ سے پہلے کی رات کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بڑی دیر تک بڑی بے قراری، دلسوزی اور عجز والحاح سے بارگاہِ باری تعالیٰ میں سر بسجود ہو کر اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتے رہے کہ "بار الہا! اگر یہ تیرے مٹھی بھر مخلص، فرمانبردار اور اطاعت گزار بندے اس معرکۂ حق و باطل میں جاں بحق ہو گئے تو پھر قیامت تک اس دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا، بار الہا! فتح و نصرت کا جو وعدہ تو نے مجھ سے کیا ہے۔ آج اسے پورا کر اور اپنے دین کو سربلند کر۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اضطراب اور بے قراری کو دیکھ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر کا کونہ تھام کر رندھے ہوئے گلے سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں بس اس قدر دعا کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فتح و نصرت کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔" ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایمان محکم سے لبریز گزارش میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالآخر دعا ختم کر دی۔

صبح کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے عزم و یقین کے ساتھ مٹھی بھر اہل ایمان کی صف بندی کی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فوج کے میمنہ کا سردار مقرر کیا۔ انہوں نے حق و باطل کے اس اولیں معرکہ میں بڑی شجاعت واستقامت کا مظاہرہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا فریضہ بھی ادا کیا۔ آخر اللہ نے مسلمانوں کو شاندار فتح عطا کی قریش کے بڑے بڑے مغرور اور سرکش سردار مثلاً ابوجہل، عتبہ، شیبہ ولید وغیرہ مارے گئے۔ اس جنگ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالرحمٰن جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ قریش کی طرف سے لڑے تھے۔ انہوں نے عام جنگ شروع

ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر مبارزت طلبی کی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ خود مقابلے کے لئے چلے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روک لیا اور فرمایا "کہ تلوار نیام میں کرو اور ہمیں اپنی صحبت سے متمتع ہونے دو۔" اللہ! اللہ! کیا شان صدیقی ہے کہ اسلام کی حفاظت اور حمایت کی خاطر بیٹے پر تلوار چلانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں! اسلام لانے کے بعد جب عبدالرحمٰن مدینہ آگئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "ابا جان! بدر کی جنگ میں ایک دفعہ آپ میری تلوار کی زد میں آگئے تھے لیکن میں نے اپنا ہاتھ روک لیا" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "خدا کی قسم! اگر تو میری تلوار کی زد میں آگیا ہوتا تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا۔" اس فیصلہ کن اور تاریخ ساز معرکہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو عظیم کردار ادا کیا وہ دوسرے مسلمانوں کے دلوں میں نقش ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اپنی خلافت کے دور میں ایک دفعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک بڑے ہجوم سے مخاطب ہو کر پوچھا تھا کہ "سب سے بہادر کون ہے؟" لوگوں نے کہا کہ آپ۔ فرمایا "نہیں بلکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ابن قحافہ رضی اللہ عنہ" غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک سائبان بنایا گیا تھا، سوال پیدا ہوا کہ کفار کی روک تھام کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کون رہے گا؟ خدا کی قسم! ہم میں سے کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ تلوار کھینچ کر کھڑے ہوئے۔ جس کسی نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دلیرانہ مدافعت کی۔ اس لئے وہ شجاع ترین انسان تھے۔ ان کے نحیف جسم میں انتہائی قوی روح تھی۔ غزوۂ بدر کے گھمسان میں انہوں نے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی، ہم میں سے کوئی دوسرا نہ کر سکا۔"

جنگی قیدیوں سے سلوک

بدر کا معرکہ روشنی اور تاریکی، نیکی اور بدی، توحید اور شرک و بت پرستی، اعلیٰ اقدارِ انسانیت اور اقدارِ ضلالت کے مابین محاربہ تھا۔ سچائی اور اعلیٰ انسانی اقدار کو غلبہ حاصل ہوا۔ شرک و جاہلیت کی تاریکی پر حق وصداقت کی روشنی غالب آئی۔ جاہلیت کے بڑے بڑے ستون سرنگوں ہو گئے۔ ابوجہل سمیت ستر جہنم واصل ہوئے اور ستر مشکیں کس کر ذلت و خواری کے عالم میں مدینہ لائے گئے۔ یہ وہ ناکسان دہر تھے جنہوں نے داعیٔ اسلام اور ان کے پیروؤں کو مکہ میں طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں اور ان کی زندگی دو بھر کر دی تھی اور قتل کے منصوبے بنائے تھے۔ لہٰذا قدرتی طور پر ان کے دل و دماغ پر یہ خوف طاری تھا کہ ان سے انتقام لیا جائے گا اور مروجہ جنگی دستور کے مطابق انہیں اذیتیں دے دے کر جہنم رسید کیا جائے گا۔ وہ میدانِ جنگ میں دیکھ چکے تھے کہ مسلمانوں کو دین کے رشتہ کے سوا کوئی دوسرا رشتہ عزیز نہ تھا۔ انہوں نے اپنے کافر رشتہ داروں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو اپنے مقابل پا کر اس کی گردن اڑا دی تھی، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے اپنے کافر باپ کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی، اس لئے اسیران قریش ہول زدہ تھے کیونکہ وہ اسلام کے پیروؤں کو بھی لات ومنات کے پیروؤں کے معیار پر جانچ رہے تھے۔ لیکن ان کے اندیشہ ہائے دور و دراز کے برعکس انہیں پہلا خوشگوار تعجب تو یہ دیکھ کر ہوا کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں نے انہیں مہمانوں کی طرح رکھا۔ خود بھوکے رہے لیکن ان جنگی قیدیوں کو اچھی طرح کھلایا پلایا اور

ان پر کسی قسم کی کوئی سختی نہیں کی۔ اگلے دن ان کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے لئے حضور ﷺ نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مشورہ یہ تھا کہ سب کو قتل کر دیا جائے اور ہر مہاجر مسلمان اپنے کافر قیدی رشتہ دار کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ تاکہ کفار قریش پر آئندہ کے لئے مسلمانوں کا رعب وداب قائم ہو جائے اور کم سے کم یہ ستر قیدی تو پھر کبھی مقابلے پر نہ آسکیں۔ لیکن جب حضور ﷺ نے حلیم الطبع اور دوراندیش ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے طلب کی تو انہوں نے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ ﷺ! یہ لوگ آخر ہمارے بھائی بند ہیں ان سے فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر یہ سب کے سب یا ان میں سے کچھ مسلمان ہو جائیں یا آئندہ چل کر ان کی اولادیں اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کریں اور ان کے دلوں میں کسی انتقام کی خلش نہ رہے۔''

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان اسیران جنگ کے ہاتھوں مکہ میں سخت اذیتیں جھیل چکے تھے پھر بھی انہوں نے رحم کا مشورہ دیا جو آگے چل کر درست ثابت ہوا۔

جناب رحمت للعالمین ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مشورے کو پسند فرمایا اور اسیران قریش کو رہا کر دیا۔ ان میں سے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان سے نقد زر فدیہ بھی نہیں لیا بلکہ ان کی رہائی کی یہ شرط ٹھہرائی کہ ان میں سے ہر ایک دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھادے۔ اس حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہائی کے بعد کچھ قیدی مسلمان ہو گئے۔ بقیہ کے دلوں میں مسلمانوں کی برتری کا رعب چھا گیا اور مسلمانوں میں نوشت وخواند پھیل گئی۔

غزوۂ احد (۳ھ)

غزوۂ بدر کے اسیروں سے اگرچہ بہت اچھا سلوک کیا گیا تھا لیکن اب اسلام دشمنی کے علاوہ ان کی مخالفت میں انتقام کا جذبہ بھی شامل ہو گیا۔ کعبہ کے متولی قریش کے ستر سردار اور جنگ جو مسلمانوں کے ہاتھوں بدر کی سرزمین پر خاک وخون میں لوٹے تھے اور مزید ستر کو قید و بند کی ذلت اٹھانا پڑی تھی۔ اس طرح قریش کا وقار دوسرے عرب قبائل کے نزدیک خاک میں مل گیا تھا۔ اپنے مقتولوں کے انتقام کے علاوہ قریش یہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو زک پہنچا کر قبائل عرب میں اپنا کھویا ہوا وقار بحال کریں تاکہ ان کی کعبہ کی تولیت و پیشوائیت اور تجارت متاثر نہ ہو، مکہ کے اردگرد بعض دوسرے قبائل جو جنگ بدر تک غیر جانبدار رہے تھے اور اسلام کی مخالفت میں سرگرم نہ تھے، اب قریش کی شرمناک شکست اور اسلامی ریاست کے قیام سے وہ بھی چوکنا ہو گئے اور انہیں بھی فکر لاحق ہو گئی۔ لہٰذا انہوں نے بھی قریش سے اتحاد قائم کر لیا۔ مدینہ کے یہودی جو باقاعدہ تحریری معاہدہ کر کے مسلمانوں کے اتحادی بن چکے تھے۔ اب مسلمانوں کی کامیابی سے ان کے سینے بغض وحسد سے بھر گئے اور انہیں انصار اور مدینہ کی ریاست میں اپنی پوزیشن گرتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ چنانچہ انہوں نے قریش سے خفیہ ساز باز شروع کر دی اور انہیں برانگیختہ کرنا شروع کیا۔ قریش کے مقتولوں کے مرثیے کہے اور مکہ جا جا کر ان کے جذبۂ انتقام کو بھڑکایا۔ قریش نے سال بھر خوب جنگی تیاری کی اور پھر تین ہزار جنگ جوؤں کے ساتھ مدینہ پر

چڑھائی کردی۔

اس کینہ جو لشکر کو سات سو مسلمانوں نے احد کے میدان میں روکا۔ غزوۂ بدر میں مسلمانوں اور کفار کا تناسب ایک اور تین کا تھا۔ احد میں ایک اور چار کا، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ تاہم بدر کی فتح نے مسلمانوں کے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ پر جوش نوجوانوں کی اکثریت نے قلعہ بند ہو کر مدافعت کرنے کی بجائے کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ کرنے کو ترجیح دی۔ پہلے ہلہ میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے تابڑ توڑ شیرانہ حملوں کی تاب نہ لا کر دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور مسلمان مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے۔

درہ کے پچاس محافظ تیر اندازوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ خواہ مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست، وہ برابر اپنی پوزیشن پر قائم رہیں اور اپنی جگہ ہرگز نہ چھوڑیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ دشمن نے راہ فرار اختیار کی ہے تو تیر اندازوں کی اکثریت نے اپنے سالار حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے منع کرنے کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ دی کہ مبادا غنیمت سے محروم رہ جائیں[1] درے کو خالی پا کر قریش کے گھوڑ سوار رسالے نے خالد بن ولید (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ادھر سے مسلمانوں کی پشت پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے مسلمان فوج میں سخت افراتفری مچ گئی اور اپنے پرائے کی ہوش نہ رہی، پھر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی غلط افواہ پھیل جانے سے مسلمانوں کے رہے سہے حوصلے بھی پست ہو گئے اور ان کی اکثریت یہ سوچ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئی کہ جب بانی اسلام ہی نہ رہے تو اب کیوں اور کس کے لئے لڑا جائے، اس کے برعکس ایسے جاں نثار بھی تھے جنہوں نے یہ کہا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں رہے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے؟ اور پھر دشمنوں کی صفوں میں گھس کر انہیں ہلاک و زخمی کرتے ہوئے شہادت کی معراج کو پا گئے۔

اس انتشار کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنوں نے اپنے حملے کا سارا زور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر مرکوز کر دیا۔ قیامت کا عالم تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر زخم آئے۔ سامنے کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔ اس نازک وقت میں ابوبکر رضی اللہ عنہ برابر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور چند دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ دشمنوں سے لگاتار نبرد آزما اور آپ کے دفاع کے لئے کوشاں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک گڑھے میں گر گئے تو سب سے پہلے وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] مالِ غنیمت کے لالچ میں آ کر ہزیمت اٹھانے کا یہ پہلا واقعہ اسلامی تاریخ کی دوسری جنگ ہی میں پیش آ گیا۔ حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی نے اسے اور گھمبیر بنا دیا۔ سورۂ آل عمران میں اس جنگ کی صورت حال پر خود اللہ تعالیٰ کا تبصرہ و تجزیہ بے حد بصیرت افروز ہے۔ لیکن اس کا سبق مسلمانوں نے پورے طور پر ذہن نشین نہیں کیا۔ بعد کی تاریخ میں بھی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ غنیمت کی حرص نے شکست سے دوچار کر دیا۔ فتح مکہ کے بعد حنین میں بھی ایسی ہی صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ نیز ۷۳۲ء (۱۱۶ھ) میں جب عبدالرحمٰن غافقی کی سپہ سالاری میں مسلمانوں نے شمالی فرانس پر حملہ کیا اور فتح کا واضح امکان تھا تو اسی غنیمت کے لالچ نے ٹورز کے میدان میں مسلمانوں کو فرانکوں کے مقابلے میں شکست سے دوچار کر دیا اور آئندہ کے لئے یورپ کی فتح ایک خواب پریشان ہو کر رہ گئی۔ اور تاریخ کا دھارا بدل گیا۔ یورپی مؤرخین نے اس پر خوب بغلیں بجائی ہیں۔ مؤلف

امداد و دفاع کو ابو بکر رضی اللہ عنہ پہنچے۔ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے گڑھے میں داخل ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی پشت پر اٹھایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا اور باہر نکالا۔ خود کی کڑیاں جو ضرب لگنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک میں گھس گئی تھی۔ ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے اپنے دانتوں سے کھینچ کر نکالیں اس کوشش میں ان کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ مالک بن سنان رضی اللہ عنہ نے روئے اقدس سے خون صاف کیا۔ ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے لگاتار تیر اندازی کر کے دشمنوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رکھنے کی کوشش کی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ تلوار سے ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے دشمنوں کی صفوں کو تہ و بالا کر ڈالا اور پھر وہ اور ابو طلحہ رضی اللہ عنہ ڈھال بن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر جھک گئے تاکہ دشمن کا تیر، تلوار نیزے وغیرہ کا جو وار ہو اپنے اوپر لیں۔ زید بن سکن انصاری رضی اللہ عنہ اور ان کے سات ساتھیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت پر لبیک کہا کہ ''کون مجھ پر جان دیتا ہے؟'' اور دشمنوں کی صفوں میں گھس کر متعدد کو جہنم رسید اور زخمی کیا تا آنکہ سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جانیں قربان کر دیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سے دشمنوں کا نرغہ ٹوٹ گیا۔ جنگ کے اختتام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان موت کی بیعت کرنے والوں کے بارے میں پوچھا۔ معلوم کہا کہ سب کے سب بیعت کا حق ادا کر کے شہید ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زید بن سکن رضی اللہ عنہ کی لاش کو ڈھونڈ کر میرے پاس لاؤ، صحابہ دوڑ پڑے۔ زید رضی اللہ عنہ میں ابھی کچھ رمق جان باقی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس منگوایا اور پوچھا کہ کوئی آخری خواہش ہو تو بتاؤ؟ زید رضی اللہ عنہ نے سرور کائنات رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر سر رکھ دیا پائے مبارک کو بوسہ دیا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے کہ بوقت جاں سپردن بہ سرش رسیدہ باشی

(آپ کا وہ جاں نثار نیاز مند کیسے فخر و ناز سے اس دنیا سے رخصت ہوا ہوگا جس کی جاں کنی کے وقت آپ اس کے سر پر موجود ہوں)

غرضیکہ جو درجن بھر صحابہ رضی اللہ عنہم اس انتہائی نازک صورتحال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں رہے اور جنہوں نے اپنی جانوں کو حقیر اور پرکاہ سمجھتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں یہ جنگ لڑی اور دشمنوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور کیا۔ ان میں ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ پر چڑھ گئے۔ کعب ابن مالک انصاری رضی اللہ عنہ نے حضور کو پہچان کر بلند آواز سے پکارا کہ مسلمانو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ سلامت ہیں، ادھر آؤ۔ تب منتشر مسلمان پلٹے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف بے جگری سے لڑے حتیٰ کہ قریش نے خود ہی جنگ بند کر دی۔

سالار قریش ابو سفیان نے میدان احد سے جانے سے پہلے مسلمانوں کے اس مجمع کو مخاطب کیا جو پہاڑی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گیا تھا۔

''کیا تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟'' حضور نے جواب دینے سے منع فرما دیا

''کیا تم میں ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں؟'' کوئی جواب نہیں دیا گیا

''کیا تم میں عمر رضی اللہ عنہ ہیں؟'' بدستور خاموشی

اس پر ابوسفیان نے کہا کہ سب قتل ہو گئے (معاذ اللہ) اور ہبل کی جے کا نعرہ لگایا اس پر عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے کہا کہ "اے دشمن خدا! محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور ہم بھی زندہ ہیں۔"

ابوسفیان کے ان استفسارات سے ظاہر ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں میں سب سے اہم شخصیتیں ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کو سمجھتا تھا اور بجا طور پر ایسا سمجھتا تھا۔ وہ مکہ میں ان دونوں حضرات کا نمایاں اسلامی کردار مشاہدہ کر چکا تھا اور مدینہ میں ہجرت کر آنے کے بعد بھی جو اہم کردار وہ ادا کر رہے تھے اس سے بھی بے خبر نہ تھا۔

اگرچہ ابوسفیان اور اس کا لشکر میدانِ جنگ سے ہٹ کر مکہ روانہ ہو گیا تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت کے تحت یہ ضروری سمجھا کہ اس کے تعاقب میں صحابہ کو روانہ کریں تاکہ قریش پر مسلمانوں کی جرأت و جانبازی کا نقش مرتسم ہو جائے اور اگر راستے سے پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنے کا خیال انہیں آئے بھی تو مسلمانوں کو اپنے تعاقب میں پا کر باز رہیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب زخمی، خستہ اور تھکے ہارے صحابہ سے قریش کا تعاقب کرنے کے لئے کہا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور دوسرے ستر صحابہ نے ارشاد کی تعمیل کی حالانکہ ان کی اکثریت زخموں سے چور تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازہ صحیح نکلا۔ رستے میں ابوسفیان اور دوسرے سرداران قریش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ فتح کو ادھوری چھوڑ آئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے فتح کی تکمیل اور اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے پلٹ کر مسلمانوں پر دوبارہ حملے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ خود مسلمانوں کا لشکر ان کے تعاقب میں چلا آرہا ہے تو ارادہ ترک کر کے مکہ پہنچنے کے لئے اپنی رفتار تیز کر دی۔ مسلمان حمراء الاسد تک تعاقب کر کے واپس چلے گئے۔ قریش اپنی فتح سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ جس مقصد خاص کے لئے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کی تھی، اس کے حصول میں ناکام رہے۔ البتہ مسلمانوں کی اس عارضی ہزیمت سے بعض عرب قبائل کو شہ ملی اور وہ قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ میں لگ گئے۔ ان کی سرزنش کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سرایا بھیجے۔ بدر سے تبوک تک سب غزوات اور مہمات میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نمایاں حصہ لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست راست بنے رہے۔ بعض سرایا کے سالار بن کر بھی گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کا کوئی واقعہ ایسا نہیں جس میں ابوبکر نے شرکت کر کے تعمیری کردار ادا نہ کیا ہو۔

واقعۂ افک

غزوۂ بنی مصطلق (۵ھ) سے مراجعت کے دوران میں عبداللہ ابن ابی منافق اور اس کے ساتھیوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سخت صدمہ ہوا لیکن صبر و تحمل سے کام لیا۔ آخر خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور آیہ ۱۱ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت نازل فرمائی۔ منافقوں کی بہتان طرازیوں کو ہوا دینے میں بعض مخلص مسلمان بھی نادانستہ طور پر شامل ہو گئے تھے، انہی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے جو بدر و احد کے غزوات میں شریک رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کی مالی

امداد کیا کرتے تھے لیکن واقعۂ افک کے بعد انہوں نے یہ امداد بند کر دی۔ اس پر قرآن مجید میں حکم نازل ہوا کہ جو مسلمان اپنے غریب بھائیوں کی مالی امداد کیا کرتے تھے انہیں یہ امداد جاری رکھنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی امداد پھر سے شروع کر دی اور کبھی جتایا نہیں، عفو و درگزر سے کام لینا ان کا شعار تھا اگرچہ یہ واقعہ ان کی خاندانی زندگی کا سخت ترین واقعہ تھا۔

غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی کے دوران ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار کہیں گر گیا۔ اسے تلاش کرنے کے لئے لشکر کو ایسی جگہ رکنا پڑا جہاں پانی دستیاب نہ تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وضو کے لئے پانی نہ ملا۔ تب تیمّم کی آیت نازل ہوئی۔ انصار کے قبیلہ اوس کے سردار حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے خوش ہو کر کہا ''اے آل ابوبکر رضی اللہ عنہ! یہ تیمّم کا حکم نازل ہونا تمہاری پہلی برکت نہیں بلکہ تمہاری برکت سے اور بھی بہت سی سہولتوں اور آسائشوں کے احکام نازل ہو چکے ہیں۔''

غزوۂ خندق (۵ھ)

یہ غزوہ جسے غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ قریش کے ساتھ یہود مدینہ بنو قریظہ اور متعدد دوسرے عرب قبائل کی ساز باز اور سرگرم معاونت و اتحاد سے پیش آیا۔ دس ہزار کا عظیم الشان لشکر جو ہر طرح کے اسلحہ و سامان اور کیل کانٹے سے لیس تھا مدینہ پر چڑھ آیا۔ اس سے پہلے اتنا بڑا لشکر مسلمانوں کے خلاف تو کیا عرب کی پوری گزشتہ تاریخ میں بھی کبھی کہیں جمع نہیں ہوا تھا۔ اور نہ کبھی اس سے پہلے عرب کی جنگی تاریخ میں دفاعی خندقیں کھودی گئی تھیں۔ مسلمانوں نے اپنا دفاع مدینہ کے گرد خندق کھود کر کیا جو حملہ آوروں کے لئے نئی چیز تھی۔ دشمن کا لشکر اسے عبور نہ کر سکا۔ خندق کے ایک حصہ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بطور سالار تعینات تھے۔ ادھر سے کوئی اکا دکا دشمن سوار بھی خندق پھلانگ کر اندر نہ آ سکا۔ کفار کی پسپائی کے بعد اس مقام پر ایک مسجد تعمیر کی گئی جو مسجد ابوبکر رضی اللہ عنہ کہلائی۔ یہ مسجد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے (اٹھارہویں صدی) تک علیٰ حالہ قائم تھی۔ اب بھی وہاں ایک نو تعمیر مسجد موجود ہے اور زیارت گاہ عام ہے۔ راقم الحروف نے بھی اس کی زیارت کی ہے۔

ایک ماہ کے طویل اور صبر آزما محاصرے کے بعد قریش اور ان کے حلیف خائب و خاسر ہو کر پسپا ہوئے۔ اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی یہ آخری اور بھرپور جارحانہ کوشش تھی جو بری طرح ناکام ہوئی۔ اس کے بعد پھر کبھی قریش نوزائیدہ اسلامی مملکت مدینہ پر حملہ آور نہ ہو سکے اور مسلمانوں کا رعب و داب عرب پر چھا تا گیا۔

مدینہ کے یہودی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کی مدینہ آمد پر وہاں کے یہودی قبائل بنو قینقاع بنو نضیر اور بنو قریظہ سے باہمی امن و تعاون کا باقاعدہ معاہدہ لکھا گیا تھا جو آج بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ وہ انصار مدینہ اوس و خزرج کو اپنے اثر و رسوخ سے مہاجرین کے خلاف بھڑکا کر انہیں اور ساتھ ہی اسلام کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہودی دولت مند تھے۔ تجارت اور زراعت پر چھائے ہوئے تھے انہوں نے اپنی

مضبوط گڑھیاں بنا رکھی تھیں اور اوس و خزرج مالی طور پر ان کے دست نگر رہتے تھے اور بعض کے بعض کے ساتھ حلیفانہ تعلقات تھے، اس لئے یہودی مطمئن تھے کہ مکر و عیاری سے کام لے کر وہ کامیاب ہوں گے، انہوں نے انصار و مہاجرین میں نفاق و عداوت کا بیج بونے کی بہت کوشش کی۔ عبداللہ بن ابی منافق اور اس کے پیروؤں نے ان کا ساتھ دیا۔ مگر مدینہ میں اسلام کو روز افزوں استحکام حاصل ہوتا گیا اور انصار و مہاجرین کی باہمی مواخاۃ نے انہیں بنیان مرصوص بنا دیا۔ آخر جب یہودیوں کی سازشیں اور غداریاں بے نقاب ہوتی گئیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بنو قینقاع شام کی طرف چلے گئے اور بنو نضیر خیبر میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہودیوں کے آخری قبیلہ بنو قریظہ کی غداری زیادہ گھناؤنی تھی۔ اس نے عین جنگ خندق کے دوران میں قریش کی انگیخت پر مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنا چاہا تھا۔ جس گڑھی میں مسلمان عورتیں اور بچے محفوظ رکھے گئے تھے، بنو قریظہ نے اس پر حملہ کر کے انہیں تلوار کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ بنایا جو ناکام رہا۔ جنگ خندق سے فراغت کے بعد جب مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا اور بالآخر وہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکے تو انہوں نے اپنے سابق حلیف حضرت سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ کو حکم بنایا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تورات کے مطابق فیصلہ دیا کہ اسلحہ بردار یہودی مرد قتل کئے جائیں۔ ان کی عورتیں اور بچے گرفتار کئے جائیں اور ان کے اموال و جائیداد بحق حکومت اسلامی ضبط کئے جائیں۔ اس طرح یہودیوں کے وجود سے مدینہ پاک تو ہو گیا لیکن یہودیوں کی سازشوں کا دائرہ مزید پھیل گیا اور وہ خیبر شام وغیرہ میں سرگرم کار ہو گئے۔ اسی لئے خیبر پر چڑھائی کرنا پڑی اور رومی سلطنت سے آویزش کے اسباب پیدا ہوتے گئے۔

یہودیوں سے نمٹنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زبان، مشیر اور معاون رہے۔ جب یہودیوں کی در پردہ سازشیں جاری تھیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ ان میں تبلیغ اسلام کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے۔ وہ اپنی فطری حلیم الطبعی کی وجہ سے اس کام کے لئے بہت موزوں تھے۔ لیکن ایک موقع پر ان کی حلیم الطبعی پر ان کی اسلامی غیرت غالب آ گئی۔ مدینہ ایک سرکردہ یہودی عالم فنحاس کے ہاں ایک دفعہ یہودیوں کا اجتماع تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ادھر سے گزرے تو اسے اسلام کی تبلیغ کا اچھا موقع سمجھا۔ انہوں نے فنحاس اور اس کے ساتھیوں کو اسلام کی دعوت دی اور کہا ''تم جانتے ہو کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور اسی کی جانب سے تمہارے پاس حق لے کر آئے ہیں۔ جسے تم تورات میں بھی درج پاتے ہو۔ اس لئے اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ۔'' لیکن فنحاس نے طعن و تمسخر سے کام لیا اور اسلامی تعلیمات اور قرآنی آیات کا استہزا اڑایا۔ اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ آپے سے باہر ہو گئے اور فنحاس کے ایک زناٹے کا طمانچہ رسید کیا اور فرمایا ''اے دشمن خدا! اگر مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔'' یہ واقعہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نوجوانی کا نہیں بلکہ اس وقت کا ہے جب ان کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی اور اس عمر میں جوانی کے زمانے کی سی حدت خون میں باقی نہیں رہتی۔ جوانی یا بڑھاپا، ابوبکر رضی اللہ عنہ اللہ کی آیات اور رسول اسلام پر طعن و استہزا کو ہرگز برداشت کرنے پر تیار نہ تھے۔

صلح حدیبیہ (ذی قعدہ ٦ ھ)

٦ ہجری میں حضور اکرم چودہ سو صحابہ کے ہمراہ عمرہ کے ارادہ سے عازم مکہ ہوئے جب مکہ کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ قریش آمادۂ جنگ ہیں اور وہ مسلمانوں کو کسی حالت میں بھی مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ مسلمان جنگ کی نیت سے نہیں گئے تھے۔ ان کے پاس میان میں تلواروں اور قربانی کے اونٹوں کے سوا کچھ نہ تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ایک منزل ادھر حدیبیہ کے گاؤں (جواب شمیسی کہلاتا ہے) کے قریب ڈیرہ ڈال دیا اور قریش سے نامہ و پیام شروع کیا۔ قریش کو حق نہ تھا کہ کسی بھی آنے والے کو حج و عمرہ سے روکتے لیکن اپنی جھوٹی انا کی خاطر انہوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں صدیوں پرانی روایت پس پشت ڈال دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر بن کر اہل مکہ کے پاس گئے انہیں وہیں روک لیا اور ان کے قتل کی افواہ مشہور ہو گئی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ببول کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا انتقام لینے اور دشمن کا آخری دم تک مقابلہ کرنے کی بیعت لی اور تمام صحابہ نے عہد کیا کہ جب تک جسم میں جان باقی ہے منہ نہ موڑیں گے۔ یہی وہ بیعت رضوان ہے جس کا ذکر اللہ نے سورہ فتح میں کیا اور چودہ سو صحابہ کو بلا استثنا اپنی خوشنودی کا سرٹیفکیٹ عطا فرمایا۔ قریش مکہ کو اس کی اطلاع ملی تو ان کے دماغ ٹھکانے آئے اور گفت و شنید کے لئے یکے بعد دیگرے اپنے سفیر بھیجنے شروع کئے۔ ابتداء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو مرعوب کرنے کے لئے قریش کے سفیر عروہ بن مسعود ثقفی نے اپنی جنگی تیاریوں کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ اس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے جواب دیا کہ ''لات وغیرہ کے پوجنے والوں کا یہ اہتمام ہے تو کیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد سے منہ موڑ لیں گے؟'' عروہ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''یہ ابو بکر ابن ابی قحافہ ہیں'' اس نے کہا کہ ''اگر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے احسان مجھ پر نہ ہوتے تو میں اس کا جواب دیتا'' آخر بڑی ردوکد کے بعد طے پایا کہ اس سال مسلمان واپس چلے جائیں اور اگلے سال عمرہ کے لئے آئیں۔ بقیہ شرائط حسب ذیل تھیں۔

١- جب مسلمان اگلے سال عمرہ کے لئے آئیں تو مکہ میں تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں گے۔

٢- ہتھیاروں میں سے صرف تلواریں ساتھ لا سکتے ہیں جو میان میں ہوں گی

٣- پہلے سے مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو اپنے ساتھ مدینہ نہیں لے جائیں گے۔ اگر مدینہ سے آنے والے مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اسے زبردستی واپس اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔

٤- مکہ کے مسلمانوں میں سے اگر کوئی شخص اپنے طور پر مدینہ چلا جائے گا تو اسے واپس کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ چلا آئے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

٥- عرب قبائل کو اختیار ہو گا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں اتحاد کر لیں۔

٦- اس معاہدہ صلح کی میعاد دس سال ہو گی۔

بظاہر اس صلح میں قریش کا پلہ بھاری نظر آتا تھا۔ اکثر مسلمانوں کو شرائط صلح سخت ناگوار گزریں۔ حضرت

عمر رضی اللہ عنہ جیسے جوشیلے اور اسلامی حمیت کے علمبردار شخص نے انہیں اسلام کی کمزوری اور ہتک پر محمول کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال و جواب بھی کیے (جس کا انہیں بعد میں ہمیشہ افسوس رہا) لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو سب کچھ حکم خداوندی سے کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر بھی عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ لیکن نبوت کا وہ رمز شناس کامل طور پر مطمئن تھا۔ ان کی صدیقیت کا یہی تقاضا تھا کہ اپنے ہادی و رہنما (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہر قول و فعل پر آمنا و صدقنا کہیں اور بلا چون و چرا سر تسلیم خم کر دیں۔ انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ کو سمجھایا کہ "حضور کی رکاب تھام لو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا ہے۔ اللہ کے حکم سے دین اور مسلمانوں کے فائدے کے لئے کیا ہے۔ اس لئے کسی قسم کی دل گرفتگی اور بے اطمینانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کے شایان شان نہیں۔ عنقریب اس صلح کے نتائج ظاہر ہوں گے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی مطمئن ہو گئے۔ حدیبیہ سے مراجعت کے دوران میں سورۂ فتح نازل ہوئی تو اللہ نے اس صلح کو فتح مبین قرار دیا۔ مسلمانوں کے قلوب اطمینان و یقین سے بھر گئے۔

اس صلح کے بعد جب مسلمانوں اور اہل مکہ میں بے روک ٹوک میل جول شروع ہوا تو کفار مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق سے متاثر ہو کر خود بخود حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان کی دو سالہ مدت میں جس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے اتنے گزشتہ اکیس سال میں نہ ہوئے تھے۔

اس اثناء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین روم و ایران اور رؤسائے عرب کو تبلیغی دعوت نامے بھی ارسال کیے۔

فتح خیبر (محرم ۷ ہجری)

یہودی قبیلہ بنو نضیر مدینہ سے نکل کر خیبر میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کے زعما کو وہاں بھی سرداری حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن وہاں بھی یہ لوگ اپنی کینہ جو اور سازشی فطرت کے باعث اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے تانے بانے بنتے رہتے تھے۔ قریش کے علاوہ طاقتور عرب قبیلے بنو غطفان کو مسلمانوں پر حملہ کے لئے بھڑکاتے تھے۔ خیبر میں ان کے متعدد مضبوط قلعے تھے جنہیں وہ ناقابل تسخیر سمجھتے تھے۔ مضبوط قلعوں اور بیس ہزار مسلح جنگ جوؤں کی موجودگی میں انہیں یہ خیال بھی نہ آ سکتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے قلیل التعداد صحابہ کبھی خیبر پر حملہ کریں گے۔ بہر حال جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک خیبر کے یہودیوں کے سازشی منصوبوں کی متواتر خبریں پہنچیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کر لینے کی دعوت دی جسے انہوں نے اپنی تعداد اور طاقت کے زعم میں حقارت سے ٹھکرا دیا۔ مجبور ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ سو صحابہ کے ساتھ خیبر پر چڑھائی کی۔ یہود کے چھ قلعے یکے بعد دیگرے فتح کر لئے گئے۔ ایک قلعہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں فتح ہوا۔ آخری اور سب سے مضبوط قلعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ بنو غطفان یہودیوں کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔ اس کے بعد فدک اور تیما بھی مسلمانوں کے تسلط میں آ گئے۔

فتح مکہ (رمضان ۸ ہجری)

قریش بمشکل دو سال معاہدۂ حدیبیہ پر قائم رہے۔ انہوں نے بنی بکر کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے حلیف و متعہد قبیلہ بنی خزاعہ کا عین حدود حرم میں قتل عام کیا اور اس طرح شرائط صلح کی علانیہ خلاف ورزی کی۔ جب بنی خزاعہ کے مظلوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فریاد لے کر آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو پیغام بھیجا کہ یا تو بنی خزاعہ کے مقتولوں کا خوں بہا ادا کریں یا بنی بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں تا کہ مؤخر الذکر سے الگ طور پر نپٹ لیا جائے۔ لیکن قریش نے ان بے حد منصفانہ مطالبوں میں سے کسی ایک کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر چڑھائی کا فیصلہ کر لیا۔ بعد میں قریش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ابوسفیان معاہدہ کی تجدید کے لئے مدینہ گیا اور سیدھا اپنی صاحب زادی ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے وہاں جا کر بستر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیٹھنا چاہا۔ انہوں نے بستر نیچے سے کھینچ لیا اور فرمایا کہ خدا کا دشمن خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر نہیں بیٹھ سکتا۔ پہلا ہی شگون اچھا نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر تجدید معاہدہ کی بات کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ ابوسفیان جانتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں میں سب سے اہم شخصیت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اس لئے ان سے مل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرنے کو کہا مگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ سے واقف تھے۔ اس لئے صاف انکار کر دیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملا مگر بے سود۔ آخر مسجد نبوی میں اپنی طرف سے یک طرفہ اعلان کر کے مکہ لوٹ گیا کہ معاہدۂ صلح برقرار ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صلح نامہ حدیبیہ کی تحریر کے وقت ہی سے اپنی پیغمبرانہ بصیرت سے جانتے تھے کہ قریش بدعہدی کریں گے لیکن اتمام حجت کے لئے نیز تبلیغ دین کے لئے کچھ امن کا وقفہ حاصل کرنے کی مصلحت کے تحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بظاہر تمام ناجائز و نامناسب شرائط مان لی تھیں جو صحابہ کو ناگوار بھی گزری تھیں۔ دین حق کو بہر حال اپنے اصل مرکز مکہ کی طرف آنا ہی تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اسلام اور اس کے پیرو حرم کعبہ سے دور رہیں اور وہ مرکز توحید کی بجائے بت خانہ بنا رہے۔ قریش نے بدعہدی کر کے ضروری کارروائی کا جواز فراہم کر دیا۔

جب دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ایک حصۂ فوج کے علمبردار تھے۔ سب کو ہدایت تھی کہ جب تک قریش کی طرف سے پہل نہ ہو کسی پر ہتھیار نہ اٹھایا جائے۔ جو لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیں یا حرم کعبہ میں داخل ہو جائیں یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لیں وہ مامون ہیں۔ اور ان کے جان و مال محفوظ۔[1] چنانچہ اسلام کی پاک فوج کا داخلہ انتہائی پر امن طور پر ہوا۔ البتہ قریش کے بعض شورہ پشت فوج کے ایک حصہ سے مزاحم ہوئے۔ دو مسلمان اور تیرہ کافر مارے گئے۔ یعنی عرب کا دل اور اس کا سب سے اہم دینی، تجارتی، ثقافتی مرکز مکہ فتح کرنے میں صرف تیرہ آدمیوں کا خون بہا وہ بھی فاتح کی مرضی اور ارادے سے نہیں۔ آج کی بزعم خود مہذب، متمدن اور ترقی یافتہ قومیں اور ان کی منظم فوجیں اپنے

---

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں داخلہ سے پہلے ابوسفیان حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی معیت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو چکا تھا۔ مؤلف

دشمنوں پر جو ہلاکت و بربادی لاتی ہیں اور جس طرح متحارب فوجیوں کے علاوہ شہری آبادیوں، بے گناہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارتی، گھروں اور عصمتوں کو لوٹتی، جائیدادوں، کھیتوں کو تباہ کرتی اور شہروں کو راکھ کا ڈھیر بناتی ہیں۔ ذرا اس کا تصور کیجئے اور پھر فتح مکہ کے وقت مسلمانوں اور ان کے سالار اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عمل پر نظر ڈالئے۔ کیا تاریخ اس قسم کی پرامن فتح کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھکی ہوئی پرغرور گردنوں اور شرمسار چہروں کے مجمع میں اعلان فرمایا کہ "جاؤ، تم پر کوئی گرفت نہیں، تم آزاد ہو۔" حق ظاہر ہوا اور باطل مٹ گیا۔ حرم کعبہ ہمیشہ کے لئے بتوں سے پاک ہوگیا اور شیطان اور باطل کی قوتیں اس سے قطعاً مایوس ہوگئیں کہ پھر کبھی کعبہ میں یا سرزمین عرب میں بتوں کی پرستش ہوگی۔

ابوقحافہ کا قبول اسلام...... چار پشتیں صحابی

جب ادھر سے فرصت ملی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے ضعیف اور نابینا والد ابوقحافہ سے ملنے ان کے ہاں گئے اور انہیں بیعت اسلام کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھ کر فرمایا کہ "ابوبکر رضی اللہ عنہ! انہیں یہاں آنے کی کیوں تکلیف دی؟ میں خود ان کے گھر جا کر انہیں مسلمان کرتا۔" (ایسا جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی دوسرے کے لئے نہ فرمایا۔ یہ عزت بھی ابوبکر ہی کے گھرانے کو حاصل ہے) ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! انہی کا یہاں آنا مناسب تھا۔" ابوقحافہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک زندہ رہے۔ خوش نصیب ہے وہ باپ جسے ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا فرزند ملا! ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کی چار پشتیں صحابی ہیں کسی اور کو یہ فخر حاصل نہیں ہوا۔

۱- باپ صحابی ۲- خود صحابی ۳- بیٹے عبدالرحمٰن اور عبداللہ صحابی ۴- پوتہ عتیق بن عبدالرحمٰن صحابی۔

خواتین خاندان میں سے آپ کی والدہ ام الخیر رضی اللہ عنہا، بیویاں ام رومان رضی اللہ عنہا اور حبیبہ رضی اللہ عنہا۔ بیٹیاں اسماء رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا صحابیات کے مقدس زمرے میں ہیں بلکہ آخر الذکر حضرت عائشہ صدیقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں شامل اور ام المومنین ہیں۔ ایں خانہ تمام آفتاب است!

غزوات حنین و طائف (۸ھ)

فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین میں بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے اور جب مکہ کے نومسلموں کی غلطی سے عارضی طور پر مسلمانوں کے پاؤں اکھڑے اور غزوۂ احد کی سی افراتفری پھیلی اور معدودے چند صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ گئے تو بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ ثابت قدم رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے مستعد اور کوشاں۔

حنین سے بھاگ کر جب کچھ دشمنوں نے طائف میں پناہ لی اور قلعہ بند ہوگئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ کرلیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ بدستور ساتھ تھے ان کے بیٹے عبداللہ جنہوں نے ہجرت کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ طائف کے محاصرہ کے دوران میں دشمن کے تیروں کی بوچھاڑ سے سخت زخمی ہوگئے۔ بعدازاں مدینہ میں انہیں زخموں کے کھل جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ اس طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی راہ میں اپنے بیٹے کی قربانی بھی دی۔

غزوۂ تبوک (۹ھ)

اس کا ذکر ابتدائی باب میں کیا جا چکا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپیل پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا سارا اثاثہ لا کر خدمت نبوی میں پیش کر دیا تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ گھر والوں کے لئے بھی کچھ چھوڑا؟ تو جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اور میرے گھر والوں کو کافی ہیں۔ اس ایثار کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کبھی سبقت نہیں لے جا سکتا۔"

اس مہم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع افواج اور علمداری کے فرائض ابوبکر کو تفویض کئے تھے۔ مگر جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ رومیوں پر مسلمانوں کا رعب چھا گیا اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ علاقے اور قبائل اسلام میں داخل ہو گئے۔

پہلا اسلامی حج (۹ھ)

مکہ کی فتح اور حنین و طائف کے غزوات سے فارغ ہو کر جب حضور مدینہ تشریف لے گئے تو مختلف تنظیمی و تبلیغی امور میں مصروف ہو گئے۔ تبوک کی مہم پیش آئی۔ پھر عرب قبائل کے وفود کا تانتا بندھ گیا۔ اسی لئے ۹ھ کو عام الوفود کہا جاتا ہے۔ اسی دوران میں حج کا زمانہ آ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اپنی مصروفیات کی بناء پر نیز ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مرتبہ نیابت اور سیکنڈ ان کمانڈ کی حیثیت کو لوگوں پر واضح کرنے کے لئے انہیں تین سو صحابہ پر امیر الحج مقرر کر کے مکہ روانہ کیا اور اپنی طرف سے بھی قربانی کے بیس اونٹ ساتھ کر دیئے۔ فتح مکہ کے بعد یہ پہلا حج تھا جو مسلمانوں نے آزادانہ اسلامی طریقے سے ادا کیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے امیر الحج تھے مشرکین کے لئے جاہلی طریقے سے یہ آخری حج تھا۔ اس کے بعد جاہلیت کی رسوم ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مناسک حج کی تعلیم دی اور یوم النحر (قربانی کا دن) کو خطبہ پڑھا۔

حجتہ الوداع (۱۰ھ)

عرب سے کفر و شرک کا نام و نشان تک مٹ گیا تو ۱۰ھ کے اواخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج پر تشریف لے جانے کا عزم کیا۔ یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا اور آخری حج تھا۔ جو تاریخ میں حجتہ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ ۲۶ ذی قعدہ ۱۰ھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ اور صحابیات کے ایک انبوہ کثیر کے ساتھ عازم مکہ ہوئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ بدستور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے۔ راستہ میں بہت سے دوسرے لوگ ساتھ ملتے گئے اور متعدد قبائل براہ راست مکہ پہنچ گئے۔ میدان عرفات میں تقریباً سوا لاکھ علمبرداران توحید کا اجتماع ہوا جن کی آنکھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے اقدس پر اور کان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر لگے ہوئے تھے اور دشت و جبل لبیک اللھم لبیک کی صداؤں سے گونج رہے تھے۔ "خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور اکیلے تمام قبائل کو شکست دی۔"

اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فصیح و بلیغ اور جامع خطبہ دیا اسے خطبہ الوداع کے نام سے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ اسے اپنی معنوی اہمیت کے لحاظ سے انسانیت کا منشور کہا جا سکتا ہے۔ جب سوا لاکھ کے مجمع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم

آخری تبلیغ رسالت فرما چکے تو حق تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ ''آج ہم نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کیا۔'' (المائدہ:۳)

تکمیل دین کے اس خدائی اعلان سے حاضرین میں مسرت کی لہر دوڑ گئی لیکن اس مجمع کثیر میں اللہ کا ایک بندہ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) ایسا بھی تھا جس کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ اردگرد کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ خوش ہونے کا موقع ہے نہ کہ رونے کا! اس نے بادیدۂ تر جواب دیا کہ جب دین مکمل ہو گیا تو دین کے پیغامبر کی ضرورت نہ رہی۔ میں اس لئے روتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم سے رخصت ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ بھلا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا ایسی دوربین فراست کا مالک کون ہو سکتا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ حج سے مراجعت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً تین ماہ زندہ رہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور ابوبکر رضی اللہ عنہ

سورۂ نصر اور آیہ الیوم اکملت لکم دینکم کے نزول نیز وحی خفی کے بعض دوسرے اشارات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معلوم ہو گیا تھا کہ رحلت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ چنانچہ حج کے موقع پر اپنے خطبہ میں یہ ارشاد فرما کر کہ ''حج کے مسائل سیکھ لو، میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت آئے۔'' اس طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔

۱۸ یا ۱۹ صفر ۱۱ھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع میں تشریف لے جا کر دیر تک وہاں کے مدفونوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہے۔ گھر واپس پہنچنے پر طبیعت ناساز ہو گئی۔ علالت کے ابتدائی دنوں میں مسجد میں تشریف لے جا کر نماز کی امامت فرماتے رہے۔ جب مرض نے شدت اختیار کر لی اور ضعف کا غلبہ ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت رقیق القلب ہیں۔ آپ کی جگہ ان سے کھڑا نہ ہوا جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کہنے سے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی) نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ عمر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کے لئے نامزد فرمائیں لیکن آپ نے قدرے سختی سے تاکیدی حکم دیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور صرف ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نماز پڑھائیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت تک انہوں نے سترہ نمازیں پڑھائیں۔ ایک دن کسی نماز کے وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آنے میں کچھ دیر ہو گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کے لئے کہا۔ ان کی بلند تکبیر کی آواز پہچان کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بستر علالت سے کہلا بھیجا کہ اللہ اور مسلمان یہ بات پسند کرتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں۔

بیماری کے دوران میں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی تو مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ کر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''اللہ نے اپنے ایک بندے کو اس دنیا کی زندگی اور اپنے قرب کی اخروی زندگی کے درمیان انتخاب کا اختیار دیا اور اس نے قرب الٰہی کی اخروی زندگی کو چن لیا۔ مجمع میں صرف ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ کی معنویت کو سمجھا اور رونے لگے اور کہا۔

''ہماری اور ہمارے ماں باپ کی جانیں آپ ﷺ پر قربان! کیا ہم آپ ﷺ کے بغیر زندہ رہ سکیں گے؟''

حضور ﷺ نے فرمایا ''ابوبکر صبر سے کام لو'' پھر حکم دیا کہ مسجد کی طرف کھلنے والے تمام گھروں کے دریچے بند کر دیئے جائیں سوائے ابوبکر کے مکان کے۔ مزید فرمایا کہ ''سب سے زیادہ میں جس شخص کی دولت و رفاقت کا ممنون ہوں وہ ابوبکر ہیں۔ اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔ لیکن یہ رفاقت اور اخوت اس وقت تک کے لئے ہے جب تک کہ اللہ ہمیں اپنے پاس جمع نہیں کرتا۔''

رحلت سے ایک دن پہلے اتوار کی صبح کو حضور ﷺ کی طبیعت نے سنبھالا لیا اور آپ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کے سہارے مسجد میں تشریف لائے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی آہٹ پا کر پیچھے ہٹنا چاہا لیکن آپ ﷺ نے انہیں اشارہ سے روک دیا اور خود ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز ادا کی۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں واپس تشریف لے گئے۔ کچھ دیر کے بعد دوبارہ بخار آ گیا اور مرض نے شدت اختیار کر لی۔ اگلے روز پھر آخری بار طبیعت سنبھلی، اگرچہ ضعف غالب تھا، آپ نے حجرہ مبارک کا پردہ اٹھا کر صحابہ رضی اللہ عنہم کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز فجر ادا کرتے دیکھا اور روئے اقدس فرط مسرت سے چمک اٹھا۔ صحابہ کو خیال ہوا کہ آپ ﷺ مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لانا چاہتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں اور جائے امامت آپ ﷺ کے لئے چھوڑ دیں لیکن آپ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور پھر حجرے کا پردہ گرا دیا۔ اسی دن سہ پہر کے قریب آپ ﷺ کی روح اقدس واطہر اپنے رفیق اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔ مشہور ترین روایت کے مطابق یہ پیر کا دن اور ۱۱ھ کے ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ (۸ جون ۶۳۲ء) تھی۔[1]

حضور ﷺ کی علالت کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کئی دن سے اپنے گھر سخ نہیں گئے تھے۔ حضور ﷺ کے وصال کے دن یہ خیال کر کے کہ حضور ﷺ کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔ فجر کی نماز کے بعد آپ ﷺ سے اجازت لے کر اپنی زوجہ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی ضروریات کی دیکھ بھال کے لئے سخ چلے گئے۔ لیکن جب حضور ختمی مرتبت ﷺ کی رحلت کی خبر مدینہ اور مضافاتِ مدینہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ بہ عجلت تمام گھوڑے پر سوار ہو کر مسجد نبوی میں پہنچے۔ عاشق رسول ﷺ کی زندگی میں آزمائش کا سب سے بڑا موقع آ گیا تھا۔ مسجد میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجمع پر عجیب اضطراب اور سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ بھی فوت ہو سکتے ہیں اور اگر واقعی فوت ہو گئے ہیں۔ تو اب کیا ہوگا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جری اور مضبوط دل و دماغ کے شخص پر وحشت اور حواس باختگی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ حضور ﷺ فوت نہیں ہوئے۔ جو شخص یہ کہے گا کہ آپ ﷺ فوت ہو گئے ہیں میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ اس حادثۂ عظیم و جانکاہ کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے حواس بجا رکھے۔ انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ

---

[1] ڈاکٹر محمد حمید اللہ اسے مشہور ترین روایت کہتے ہیں۔ لیکن ۲ ربیع الاول ۱۱ھ (۲۵ مئی ۶۳۲ء) کو معتبر ترین روایت مانتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب ''محمد رسول اللہ'' مولف

کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ضبط و تمکین کا مجسمہ بنے ہوئے سیدھے حجرۂ مبارک میں چلے گئے۔روئے انور سے چادر ہٹا کر آپ ﷺ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا'' آپ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان ہوں! کیا ہی بابرکت تھی آپ کی زندگی اور کیا ہی پاکیزہ ہے آپ کی موت! وہ موت جو اللہ نے آپ کے لئے مقدر کی تھی آ چکی ،اس کے بعد دوسری موت نہیں آئے گی۔'' پھر چہرۂ مبارک چادر سے ڈھانک دیا اور اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے مسجد میں واپس آئے۔ وہاں عمر رضی اللہ عنہ بدستور لوگوں کو دھمکا رہے تھے کہ خبردار! اگر کسی نے کہا کہ حضور ﷺ فوت ہو گئے ہیں'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا اے عمر! بیٹھ جاؤ۔لیکن عمر رضی اللہ عنہ نہیں بیٹھے۔

بڑا مشکل اور نازک وقت تھا۔صحابہ کے دل و دماغ انتہائی رنج و غم اور فکر و تشویش کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ فہم و فراست اور تحمل و تدبر سے کام نہ لیتے تو خدا جانے کیا ہوتا اور تاریخ کیا رخ اختیار کرتی۔انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔اور مسجد کے ایک طرف قدرے اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر صحابہ کے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا:

'' اے لوگو! جو محمد ﷺ کو پوجتا تھا وہ جان لے کہ محمد ﷺ فوت ہو گئے۔لیکن جو اللہ کو پوجتا تھا وہ جان لے کہ اللہ حی و قیوم ہے اور کبھی نہیں مرے گا۔''

اس کے بعد انہوں نے سورہ آل عمران کی آیت (۱۴۴) پڑھی۔

'' محمد ﷺ ایک پیغمبر کے سوا کچھ بھی نہیں۔اس سے پہلے بھی پیغمبر گزر چکے ہیں۔اس لئے اگر وہ مر جائیں یا مار ڈالے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر الٹے پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں پر الٹا پھرے گا تو اللہ کا کوئی نقصان نہیں کرے گا اور اللہ شکر گزاروں کو اچھا بدلہ دے گا۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ آیت سن کر مجمع کو یکایک یاد آیا کہ قرآن مجید میں یہ آیت بھی موجود ہے اور عمر رضی اللہ عنہ کی تو یہ حالت ہوئی کہ ان کے پاؤں لڑکھڑا گئے جیسے ٹانگوں میں سکت نہ رہی ہو۔اور وہ زمین پر گر گئے۔ انہیں یقین آ گیا کہ رسول اللہ ﷺ واقعی فوت ہو گئے۔ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مختصر مگر مؤثر تقریر سے ماحول میں قدرے سکون پیدا ہوا اور بے قرار و مضطرب مجمع سنبھل گیا۔بہت سے لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔رسول اللہ ﷺ کی وفات کے یقین کا یہ قدرتی ردعمل تھا۔

اس کے بعد حضور ﷺ کی تکفین و تدفین کا سوال پیدا ہوا کہ غسل کون دے اور دفن کہاں کیا جائے؟ بعض کا خیال تھا کہ جسد اطہر کو بیت المقدس لے جا کر دفن کیا جائے۔یہ دونوں مسئلے بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی باخبری اور خوش تدبیری سے حل ہو گئے۔انہوں نے کہا کہ اہل بیت غسل دیں اور جہاں آپ ﷺ کا انتقال ہوا وہیں دفن کیا جائے۔چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما نے غسل دیا اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اور حضرت شقران رضی اللہ عنہ نے ان کی مدد کی۔دفن کا انتظام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں کیا گیا کیونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی ایک حدیث کا حوالہ دیا کہ پیغمبر کا جہاں انتقال ہوتا ہے وہیں دفن کیا جاتا ہے۔سب نے اس سے اتفاق کیا۔

ورنہ ممکن تھا کہ یہ دونوں امور وجہ نزاع بن جاتے۔

انتخاب بطور خلیفہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں رسالت، قیادت، حکومت، عدالت سب جمع تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ رسالت ختم ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی کتاب اور اپنی سنت امت کی رہنمائی کے لئے چھوڑ گئے۔ اب مسلمانوں کے سامنے یہ سوال تھا کہ مسلمانوں کا قائد اور اسلامی مملکت کا سربراہ کون ہو؟ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکفین و تدفین بھی نہ ہونے پائی تھی کہ یہ خبر وحشت اثر ملی کہ انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے ہیں تاکہ اپنے میں سے کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین منتخب کرلیں۔ یہ شوشہ چھیڑنے میں منافقین کا ہاتھ تھا۔ بظاہر انہوں نے انصار مدینہ سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور ان کے حق خلافت کی حمایت اور تائید۔ بڑا ہی نازک اور بحران انگیز موقع تھا۔ نہ صرف امت مسلمہ کی وحدت و یکجہتی اور نوزائیدہ اسلامی مملکت کی بقا خطرے میں تھے بلکہ خود دین اسلام کا مستقبل داؤ پر تھا۔ اس لئے فوری کارروائی کی ضرورت تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں نہ تو کسی کو خلافت و جانشینی کے لئے صراحت کے ساتھ نامزد کیا تھا، نہ انتخاب خلیفہ کے لئے کوئی طریق کار مقرر کیا تھا بلکہ معاملہ اجماع امت پر چھوڑ دیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اپنا جانشین نامزد کردیا ہوتا تو نہ تو انصار کے سقیفۂ بنی ساعدہ میں اپنے میں سے خلیفہ منتخب کرنے کے لئے جمع ہونے کا سوال پیدا ہوتا نہ مہاجرین کا وہاں جا کر ان کو اس امر سے باز رکھنے اور اپنا استحقاق جتانے کا نہ کسی اور فریق کی طرف سے اپنا دعویٰ پیش کرنے کا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے سامنے سب کے سر اطاعت جھک جاتے۔ البتہ اپنی آخری علالت کے دوران میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کی نماز کا امام بطور خاص ضرور مقرر کیا تھا اور سب کے سامنے ان کی تعریف بھی کی تھی، امامت کے لئے کسی دوسرے حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہ فرمایا بلکہ ایک دفعہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پہنچنے میں قدرے دیر ہوئی تو لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کے لئے آگے کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قرأت کی آواز سنی تو اپنے حجرہ سے قدرے سختی سے ہدایت کی کہ نماز ابوبکر اور صرف ابوبکر رضی اللہ عنہ پڑھائیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سترہ نمازیں پڑھائیں اور فجر کی ایک نماز خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ادا کی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کا انتظام کررہے تھے کہ ایک صحابی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آکر اطلاع دی کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہے اور ان کے زعما اپنے میں سے خلیفہ کے انتخاب کے لئے تقریریں کررہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو باہر بلایا پہلے تو انہوں نے اپنی مشغولیت کی بناء پر معذرت کی لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاملے کی فوری اہمیت پر زور دیا تو مجبوراً باہر آئے اور حالات سن کر معاملہ کی اہمیت اور فوری کارروائی کی ضرورت کا احساس ہوا اور نہ ملت کا شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ

تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی محبت اور خیر خواہی نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے محبوب ترین آقا و مولا اور اپنی پیاری بیٹی کے عظیم و مقدس شوہر کی تجہیز و تکفین کا کام حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے اہل بیت کے سپرد کر کے ملت اسلامیہ کو ہولناک فتنہ سے بچانے کی کوشش کریں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی ہمراہی میں بڑی عجلت کے ساتھ سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچے۔ بعض خیر خواہوں نے خطرے سے خبردار کیا اور سقیفہ بنی ساعدہ میں جانے سے منع بھی کیا لیکن اسلام اور ملت کے مفاد کو خطرے میں دیکھ کر انہوں نے ذاتی خطرے کی پروانہ کی اور وہاں پہنچ گئے۔ وہاں انصار کے حق خلافت اور ان کی اکثریت والے قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ کے انتخاب کے لئے تقریریں کی جارہی تھیں اور مجمع میں جوش و خروش تھا۔ انصار کا خیال تھا کہ اسلام کو غلبہ ان کی اکثریت، حمایت اور تلواروں کے زور سے حاصل ہوا۔ مہاجرین ویسے بھی اقلیت میں ہیں۔ اس لئے خلافت انصار کا حق ہے۔ خاص کر اکثریتی قبیلہ خزرج کا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بعض انصار سے تلخ گفتگو بھی ہوئی۔ لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انہیں روک دیا۔ صورت حال کا بڑے صبر و سکون اور تدبر سے جائزہ لیا اور پھر خود بڑی نرمی سے مدبرانہ تقریر کی۔ پہلے انصار کی شاندار اسلامی خدمات کا اعتراف کیا۔ پھر اسلام کے السابقون الاولون کی حیثیت سے نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب اور ہم قبیلگی اور تمام اہل عرب میں قریش کی عظمت و بزرگی کی بناء پر مہاجرین کے حق فائق کی طرف توجہ دلائی اور ان کی قربانیوں کا ذکر کیا۔ آخر میں یہ بات بھی انصار کے ذہن نشین کرائی کہ اسلام اب مدینہ تک محدود نہیں رہا تھا بلکہ سارے عرب میں پھیل چکا تھا۔ سارے عرب کے قبائل قریش کی سیادت و خلافت کے سوا کسی دوسرے کی سیادت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ کعبہ کی تولیت کی بناء پر سارا عرب ایام جاہلیت سے قریش کی مذہبی سیادت کو تسلیم کرتا چلا آیا تھا۔ لہٰذا قریش ہی خلافت کے مستحق ہیں۔[1] آخر میں کہا کہ "یہ زیادہ مناسب ہے کہ ہم (مہاجرین قریش) امیر ہوں اور آپ لوگ (انصار) وزیر۔ آپ کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جائے گا۔ یہاں عمر رضی اللہ عنہ اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں جو تقرب حاصل تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ آپ لوگ ان دونوں میں سے جس کے ہاتھ پر چاہیں بیعت کر لیں۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے مختصر تقریر میں انصار سے کہا کہ اے گروہ انصار! تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے لائے ہوئے دین کی حمایت اور مدد کرنے میں اوروں پر سبقت کی۔ حتیٰ کہ اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اب اسے

---

[1] انصار کاشتکار تھے۔ تجارت پیشہ قریش اور بدوی قبائل کاشتکاروں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔ جنگ بدر کے موقع پر جب تین سرداران قریش نے مبارزت طلبی کی تو مسلمانوں میں سے تین انصاری نوجوان مقابلے کے لئے نکلے۔ لیکن مبارزت طلب قریش نے انہیں اپنے سے گھٹیا سمجھا اور ان سے لڑنا اپنی کسرِ شان۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکار کر کہا کہ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم سے لڑنے کے لئے ہمارے برابر کے لوگوں کو بھیج۔" اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کو مقابلے کے لئے بھیجا۔ قریش اور دوسرے قبائل کی اس ذہنیت کو مدِنظر رکھا جائے تو انصاری خلیفہ کی قبولیت عام کا کوئی امکان نہ تھا اور ابتداء ہی سے اختلافات پیدا ہونے اور ملی انتشار کا خطرہ تھا۔ مؤلف

درہم برہم کرنے میں سبقت نہ کرو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی علالت کے دوران میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہماری نماز کا امام مقرر کیا اور کسی دوسرے کو نماز پڑھانے کی اجازت نہ دی۔ اب کون ہے جو اس معاملے میں ابو بکر رضی اللہ عنہ پر سبقت کرے؟ سبھی نے کہا، خدا نہ کرے کہ ایسا ہو!

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ عمر رضی اللہ عنہ اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام پیش کئے۔ ان دونوں حضرات نے یک زبان ہو کر کہا کہ ''آپ ہم سب سے افضل ہیں۔ آپ ثانی اثنین ہیں۔ حضور کے مقرر کردہ امام نماز ہیں۔ آپ سے بڑھ کر خلافت کا حق دار کون ہو سکتا ہے؟ اپنا ہاتھ بڑھائیے، ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ قریشیت اور امامت نماز نے بڑی حد تک فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی راہ میں قربانیاں بھی سب سے زیادہ دی تھیں اور مہاجر اور انصار سبھی ان کی بڑائی کے معترف تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر بیعت کر لی۔ ان کے بعد حضرت بشیر بن سعد انصاری اور حضرت زید بن ثابت انصاری نے بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ دے دیئے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت بشیر بن سعد انصاری نے سب سے پہلے بیعت کی۔ اس اثناء میں اور مہاجرین اور انصار بھی جمع ہو گئے تھے۔ ان تینوں بزرگوں کے بعد باقی مجمع بھی بیعت کے لئے ٹوٹ پڑا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شخصیت مہاجرین و انصار میں یکساں طور پر محترم اور ہر دلعزیز تھی۔ ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقرب بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ ان کے انتخاب سے ملت مسلمہ ایک ایسے زبردست اور خطرناک فتنہ و انقلاب سے بچ گئی جو اس کی صفوں کو درہم برہم کر کے اس کا شیرازہ بکھیر دیتا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے انصار کو یقین ہو گیا کہ اہل عرب قریش کے سوا کسی دوسرے قبیلے کے کسی فرد کی خلافت پر راضی نہ ہوں گے۔ لہٰذا انہوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد بھی پھر کبھی خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور ان کے بعد ان کے قریشی جانشینوں کی بیعت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے باہمی جھگڑوں اور جنگوں کے دوران میں بھی انصار نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی۔

دوسرے دن مسجد نبوی میں بیعت عام ہوئی۔ علامہ طبری نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ، جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، سے روایت کی ہے کہ سوا مرتدین کے یا اس شخص کے جو حالت ارتداد کے قریب پہنچ گیا تھا کسی شخص نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پہلو تہی نہیں کی۔ آخر الذکر سے ان کی مراد غالباً حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے ہے جو خود خلافت کے امیدوار تھے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے بعد انہوں نے آخری دم تک ان کی بیعت نہ کی نہ کسی نے ان سے تعرض کیا بلکہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس روایت سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی مسجد میں بیعت عام کے وقت بیعت کر لی اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین کے سلسلے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی ہدایات پر عمل کیا۔

فاضل شیعہ مؤرخ جسٹس سید امیر علی نے بھی اپنی تصنیف ''مختصر تاریخ صحرا نشینیاں'' میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کو قبائل عرب کے رواج کی روشنی میں جائز و مناسب قرار دیا ہے۔ جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے بنو ہاشم

نے قبول کر کے بیعت کر لی۔طبری کی ایک روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب اپنے گھر میں معلوم ہوا کہ مسجد میں ابوبکر کی بیعت عام ہو رہی ہے تو اس وقت ان کے بدن پر ایک قمیض کے سوا کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا۔وہ اسی حالت میں جلدی جلدی مسجد میں آئے اور بیعت کرنے کے بعد گھر سے اور کپڑے منگا کر زیب تن کئے۔دوسری روایت جو زیادہ متداول ہے یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت تقریباً چھ ماہ بعد کی جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔اس دوران میں قرآن جمع کرنے میں مصروف اور خانہ نشین رہے۔صرف نماز کی خاطر مسجد میں جاتے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کی اقتدا میں پڑھتے تھے۔اسی اثناء میں جب مرتدین اور منکرین زکوٰۃ مدینہ پر حملہ کی نیت سے قریب پہنچ گئے تو ان کے مقابلے کے لئے ایک دستہ کی قیادت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے بیعت نہ کی ہوتی تو دشمن کو مار بھگانے کے لئے مسلمانوں کے دستہ کی قیادت کیوں کرتے؟ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت عام منعقد ہو جانے کے بعد حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ان سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مال سے اپنے حصے کا مطالبہ کرنے کے لئے جاتی ہیں جو بطور خاص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف میں تھا یعنی خیبر، فدک اور مدینہ کی زمینیں۔انہوں نے ایسا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اجازت ہی سے کیا ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ برحق اور مختار کل تسلیم کر لیا ورنہ اپنا مقدمہ لے کر ان کے پاس کیوں جاتے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا حوالہ دیا کہ "ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ہم جو کچھ چھوڑیں صدقہ ہوتا ہے۔" اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مطالبہ تسلیم کرنے سے معذرت کر دی اور فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے سرمو سرتابی نہیں کروں گا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو فدک، خیبر اور مدینہ کی جائیدادوں کی آمدنی میں سے جو کچھ دیا جاتا تھا وہ دیا جاتا رہے گا۔مزید فرمایا کہ "خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا سلوک کرنے کے معاملے میں مجھے اپنے اقربا سے زیادہ عزیز ہیں۔" حضرت فاطمہ کو یہ جواب پسند نہ آیا۔بہر حال انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔چند ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مطالبۂ جائیداد کے متعلق روایت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث صحیح تھی تو حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی ناراضگی سمجھ میں نہیں آتی۔اور اگر صحیح نہ تھی یا اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باغ فدک آپ کو بطور ہبہ دے دیا تھا، جس پر آپ کا قبضہ نہیں ہوا تھا، تو حدیث وراثت کے غلط ہونے اور ہبہ کے ثبوت میں گواہ پیش کرتیں۔کہا جاتا ہے کہ آپ نے عمر رسیدہ حضرت ام یمن رضی اللہ عنہا کا نام لیا تھا مگر وہ پیش نہ ہوئیں۔خواتین جنت کی سردار بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ معمولی دنیاوی جائیداد کے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ایک عام مقدمہ باز کی طرح جھگڑا کرتیں۔قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خانہ نشین ہو کر سوگوار رہیں اور علائق دنیا سے کنارہ کش کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کے وقت ان سے فرمایا تھا کہ "تم سب سے پہلے آ کر مجھے ملو گی۔"

لہٰذا انہیں ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جلد سے جلد پہنچ جانے ہی کا خیال لگا رہتا تھا نہ کہ فدک اور دوسرے اسباب دنیوی کا۔ وہ بے حد سیر چشم تھیں۔ ویسے بھی فدک، خیبر اور مدینہ کی اراضی کی آمدنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے جانشین اہل بیت اور دیگر بنو ہاشم کی ضروریات پر خرچ کرتے رہے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو مدینہ کی اراضی کا انتظام حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا تھا۔ البتہ خیبر اور فدک کو ان سرکاری اور اتفاقی مصارف کے لئے رکھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوتے تھے۔ اور اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کی ذمہ داری تھی۔ ویسے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ قابل تقسیم ہوتا تو اس میں ازواج مطہرات کا بھی حصہ ہوتا۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی صاحب زادیوں سمیت کسی کو کچھ نہیں دیا گیا۔ ہبہ کا دعویٰ بھی روایات کی چھان پھٹک سے ثابت نہیں ہوتا۔

حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا اور دیگر بنو ہاشم کی حق تلفی کی روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی محاذ آرائیوں کے دوران میں یا ان کے بعد سبائیوں اور عجمیوں نے خاص اغراض کے ماتحت وضع کیں۔ اگر دعویٰ حق بجانب ہوتا تو کم سے کم حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں فدک پر قبضہ کر کے اپنی اولاد اور دوسرے بنو ہاشم کو دے سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا جیسی عالی ظرف، باوقار اور سیر چشم خاتون سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ فدک کے معاملہ کو اپنی انا اور احساس محرومی کا مسئلہ بنا لیتیں۔ جب کہ عہد نبوی میں ساری عمر چکی پیستی اور مشکوں سے پانی بھرتی رہیں اور بعض دفعہ فاقے بھی کرتی رہیں۔ حق تلفی اور محرومی کی ایسی مزید روایات بنو عباس کے عہد اقتدار میں سیاسی مقاصد کے لئے وضع کی گئیں۔ خود بنو عباس بنوامیہ کے مخالف تھے ہی، سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ وہ عجمیوں کی مدد سے برسر اقتدار آئے اور عجمی ان کے کاروبار حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ دونوں حالتوں میں عجمیوں کا سازشی اور انتقامی ذہن کارفرما معلوم ہوتا ہے اور یہی عجمی تھے جنہوں نے بالآخر ہلاکو کی مدد سے عباسی سلطنت و خلافت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرا دیا۔

یہ درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قریبی رشتہ داری کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے لیکن جب اکثریت نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی دوسروں کے ساتھ ان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ خوشدلی سے دے دیا۔ لیکن چونکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سوگواری کی حالت میں تھیں اور آخری دم تک رہیں نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ جمع قرآن میں مصروف رہے، اس لئے وہ اپنا زیادہ وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دلجوئی اور جمع قرآن میں گھر پر گزارتے رہے۔ البتہ جب مرتدین نے مدینہ پر حملہ کیا تو دفاع میں سرگرم حصہ لیا۔ وہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے پورا تعاون کرتے رہے اور ہر قسم کے مشوروں میں شریک رہے۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں خلافت کی وصیت کی ہوتی تو نہ وہ اپنا حق کسی کو غصب کرنے دیتے، نہ انصار و مہاجرین میں سے کسی کو حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرتابی کی مجال ہوتی۔ کیونکہ انہیں ابتداء ہی سے اطاعت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت دی گئی تھی اور اس میں ان کی بارہا کامیاب آزمائش بھی ہو چکی تھی۔ اگر ایسا کوئی حکم رسول ہوتا تو تمام صحابہ کو معلوم ہوتا اور انصار بھی سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر اپنے میں سے خلیفہ چننے کی کارروائی کا آغاز نہ

کرتے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ بھی وہاں پہنچ کر حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی یاد دہانی کراتے۔ صحابہ کو حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرتابی کی جرأت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

پہلا خطبۂ خلافت

بیعت ہو چکی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتماع سے یوں خطاب کیا:

''اے لوگو! میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے، دن ہو یا رات، کبھی امارت کی ہوس نہیں کی۔ نہ میرا اس طرف میلان تھا۔ میں نے خفیہ یا علانیہ کبھی اللہ سے یہ دعا نہیں کی کہ وہ مجھے امارت بخشے۔ لیکن مجھے اس بات کا یقیناً اندیشہ تھا کہ کہیں (اس نازک موقع پر) کوئی فتنہ پیدا نہ ہو جائے۔ حقیقت میں مجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ جس سے عہدہ برآ ہونا اللہ کی توفیق و تائید کے بغیر میری طاقت سے باہر ہے۔ میں چاہتا تھا کہ آج میری جگہ پر انسانوں میں سے طاقتور ترین انسان ہوتا۔

اب اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے تمہارا امیر منتخب کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں ٹھیک چلوں تو میری مدد کرو۔ اگر میں غلط چلوں تو مجھے ٹھیک کر دو۔ سچائی ایک امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے کمزور میرے نزدیک طاقتور ہوگا تاوقتیکہ میں توفیق الٰہی سے اس کے حقوق ادا نہ کر دوں اور تم میں سے طاقتور میرے نزدیک کمزور ہوگا حتیٰ کہ توفیق الٰہی سے میں اس سے وہ کچھ وصول کر لوں جو اس سے واجب الادا ہے۔ کسی قوم نے راہ خدا میں جہاد ترک نہیں کیا مگر یہ کہ اللہ نے اسے ذلیل کر دیا اور جو قوم بے حیائی و بدکاری کے افعال کی مرتکب ہوتی ہے وہ یقیناً عذاب الٰہی کی مستحق ہو جاتی ہے۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کروں تم بھی میری اطاعت کرو۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔ اور اب نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اللہ تم پر رحم کرے۔'' [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۂ الوداع کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس اولین خطبہ کی اسلامی حکومت کے اساسی اصولوں میں بے حد اہمیت ہے۔ اسے خلافت راشدہ کا منشور کہنا چاہئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے برسر منبر اعلان کر دیا کہ خلافت علیٰ منہاج نبوت ہوگی۔ اس کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر ہے۔ خلیفہ کے لئے

1۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ افتتاحی خطبہ تقریباً سبھی مؤرخین نے نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ''اگر کسی کو میری خلافت پر اعتراض ہو تو میں اسے فسخ کرتا ہوں۔ تم لوگ اپنے میں سے کسی بہتر آدمی کو چن لو۔'' انہوں نے یہ تین دفعہ فرمایا اور تینوں دفعہ حضرت علی نے اٹھ کر کہا کہ ''خدا کی قسم! میں تم سے بیعت نہیں توڑوں گا اور نہ تم کو ہرگز اپنی بیعت فسخ کرنے دوں گا'' (تحفۃ الاحباب فی تاریخ الاصحاب، باب دوم، مصنف شیعہ مؤرخ سید ذاکر حسین جعفری) یہ حقیقت ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں نہ تو کوئی دوسرا شخص اٹھا اور نہ کسی نے بیعت کرنے کے بعد فسخ کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابتداء ہی میں بیعت کر چکے تھے۔ مؤلف

ضروری ہے کہ وہ عدل، مساوات اور اخوت کے اصولوں کو پیش نظر رکھے۔لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔نہ خود عوام کے حقوق اور آزادیاں سلب کرے نہ کسی دوسرے کو کرنے دے۔خلیفہ ایک مطلق العنان آمر نہیں ہوسکتا۔ مغربی دنیا میں آزادی، مساوات اور انسانی برادری کا چرچا انقلاب فرانس کے دوران میں تھوڑے عرصے کے لئے ہوا اور پھر نپولین نے اپنی آمریت مسلط کر دی۔آج ادارہ اقوام متحدہ (یو این او) میں انسانی حقوق کا بہت چرچا ہے لیکن سب زبانی جمع خرچ۔طاقتور قومیں آئے دن کمزور قوموں کے حقوق سلب کر رہی ہیں۔دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب...... تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری اگر مسلمان اور دنیا کے دوسرے حکمران رسول اللہ ﷺ کے خطبہ حجتہ الوداع اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے افتتاحی خطبہ خلافت کو اپنی سیاسی، معاشی، معاشرتی پالیسیوں اور عملوں کا محور اور سنگ بنیاد بنالیں اور ان سے رہنمائی حاصل کریں تو کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے۔

بیعت ہو چکنے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بلا توقف اور بلا تکلف نظم ونسق خلافت سنبھال کر کام کرنا شروع کر دیا۔لوگوں نے ابتداء میں انہیں خلیفہ اللہ کہہ کر مخاطب کیا تو منع کر دیا اور فرمایا کہ میں خلیفہ رسول اللہ ہوں۔منبر نبوی پر جب خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تو احتراماً اس زینہ سے ایک زینہ نیچے بیٹھتے جہاں رسول اللہ ﷺ بیٹھا کرتے تھے۔بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے دوران میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی ایک زینہ نیچے بیٹھتے جو سب سے آخری زینہ تھا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے بارے میں چند خیالات

خلافت کا ادارہ اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے دنیا کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کی وفات تک مسلمانوں نے آپ ﷺ کے جانشین کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا۔خود آپ ﷺ نے اپنی جانشینی کے لئے نہ تو کسی کو علی الاعلان نامزد کیا نہ اپنے جانشین کے انتخاب کے لئے کوئی واضح اور مفصل طریقہ کار متعین کیا۔اگر آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں کسی کو نامزد کر دیا ہوتا تو اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔آپ ﷺ نے اپنے آخری ایام میں نوجوان حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا اور تمام اکابر صحابہ ان کی ماتحتی میں تھے، کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد اسامہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالاری سے برطرف کرتا۔نامزد خلیفہ کو بھی کوئی فرد یا افراد کا مجموعہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔البتہ قرآن مجید میں امت مسلمہ کے اجتماعی طریق کار کے متعلق مختصر الفاظ میں فرما دیا گیا کہ امرھم شوریٰ بینھم (۴۲:۶۱) یعنی وہ (مسلمان) اپنے اجتماعی معاملات باہمی صلاح مشورے سے طے کرتے ہیں۔نیز رسول اکرم ﷺ سے بھی سربراہ مملکت کی حیثیت سے فرمایا گیا تھا کہ وشاورھم فی الامر (۳:۱۵۹) یعنی معاملات کی انجام دہی میں ان (صحابہ) سے بھی صلاح مشورہ کیجئے۔چنانچہ آپ ﷺ جنگ وصلح وغیرہ معاملات میں صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔حدیث اور تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔مشاورت فی الامر کی قرآنی تاکید کے علاوہ قبائل عرب کا مزاج اور دستور بھی جمہوری نوعیت کا تھا۔مشہور شیعہ مؤرخ جسٹس سید امیر علی مرحوم لکھتے ہیں:

''عربوں میں قبیلہ کی سرداری جدی پشتی نہیں ہوتی اور ورثہ میں نہیں ملتی بلکہ اس کا فیصلہ بذریعہ انتخاب ہوتا ہے۔ عام رائے دہندگی کے اصول کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے اور سردار کے انتخاب میں قبیلہ کے تمام افراد اپنا حق رائے دہندگی استعمال کرتے ہیں۔ فوت ہونے والے سردار کے خاندان کے پسماندہ مردوں میں سے سنیارٹی کی بنیاد پر انتخاب کیا جاتا ہے۔ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جانشین کے انتخاب کے لئے اس قدیم قبائلی رسم ورواج کا اتباع کیا گیا کیونکہ موقع کی نزاکت کسی تاخیر کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔ اپنی عمر نیز مکہ میں اپنی پوزیشن کی بناء پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عربوں کے نزدیک بڑی قدر ومنزلت حاصل تھی۔ انہیں بڑی عجلت سے خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم منتخب کرلیا گیا۔ ان کی عقل و فراست اور اعتدال پسندی مسلم تھی۔ علی رضی اللہ عنہ اور خاندان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سرکردہ افراد نے ان کے انتخاب کو تسلیم کرلیا۔'' [1]

اس قبائلی جمہوری معیار پر بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی پورے اترتے تھے اگرچہ انتخاب خلیفہ کا معیار خالص اسلامی بنیادوں پر تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام کے السابقون الاولون میں سب سے عمر رسیدہ اور سربرآوردہ تھے۔ اسلام سے پہلے وہ مکہ کے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ اور اسلام کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمبر ۲ خیال کئے جاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر بھی تھے اور رفیق غار۔ ثانی اثنین بھی۔ ان کی اسلامی خدمات، قربانیاں، تدین، فہم وفراست، بصیرت و دوراندیشی، اولوالعزمی، تدبر، تحمل، اعلیٰ اخلاق، جذبہ ایثار، ملت کی خیرخواہی اور قائدانہ صلاحیتیں سب کے نزدیک مسلم تھیں۔ مخالفین بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو نمبر ۲ سمجھتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ احد کے آخر میں جب ابوسفیان نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رفقا زندہ بچے یا شہید ہوگئے، تو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پھر عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں۔ بعدازاں جب معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کے لئے وہ مدینہ آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدید معاہدہ میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مل کر سفارش کرنے کو کہا مگر انہوں نے انکار کردیا۔ اور کنویں سے ڈول کھینچنے والی حدیث تو مشہور و معروف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے آپ کو کنویں کی جگت پر دیکھا جس پر ڈول پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس میں سے اتنے ڈول نکالے جتنے اللہ نے چاہے، پھر اس ڈول کو ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لیا۔ انہوں نے بھی اس سے ایک دو ڈول کھینچے مگر ان کے کھینچنے میں کسی قدر ضعف تھا۔ پھر یہ ڈول ایک بڑا ڈول بن گیا تو خطاب کے بیٹے عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس طرح کھینچا کہ کسی طاقتور آدمی کو میں نے ان کے برابر کھینچتے نہیں دیکھا یہاں تک کہ حوض لبالب بھر گیا۔ [2]

یہ گویا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی پیش گوئی تھی۔ ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

---

[1] مختصر تاریخ عرب (A Short History of the Cerasens) صفحہ ۲۱

[2] صحیح بخاری و مسلم

خاتون کے استفسار کے جواب میں فرمایا تھا کہ اگر اگلی دفعہ تو مجھے نہ پائے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جانا۔ یہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف اشارہ تھا۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ آزاد بالغ مردوں میں سب سے قدیم الاسلام تھے۔ آغاز نبوت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین رفیق، صلاح کار اور جاں نثار رہے تھے۔ ہر نازک اور اہم موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا اور کسی قسم کی قربانی دینے سے گریز نہیں کیا تھا۔ وہ واحد شخص تھے جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص اپنے رفیق ہجرت کے طور پر منتخب کیا اور اللہ نے انہیں اپنی کتاب مقدس میں ''ثانی اثنین'' کہا اور پھر لاتحزن ان اللہ معنا (غم نہ کر اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے) کے شرف سے نوازا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ ایک ہی معیت الٰہیہ میں شامل ہیں اور صاحب سکینت ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میری ساری عمر کی نیکیاں ابو بکر رضی اللہ عنہ کی غار ثور کی ایک نیکی کے برابر نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ سب سے پہلے مسلمان تھے۔ جنہوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور ایسے افراد کو حلقہ بگوش اسلام کیا جو آگے چل کر اسلام کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے اور تاریخ کے صفحات پر ان کے کارنامے ثبت ہو گئے، مثلاً حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ مسلمان غلاموں، لونڈیوں کو ان کے ظالم مشرک آقاؤں سے آزاد کرانے میں دل کھول کر اپنا ذاتی سرمایہ خرچ کیا۔

مؤذن رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی انہی میں سے تھے۔

مدینہ میں مسجد نبوی کے لئے زمین کی قیمت بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی نے اپنے مال میں سے ادا کی تھی اور غزوۂ تبوک کی تیاری کے وقت اپنے گھر کا تمام مال ومتاع لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا۔

ان کی خدمات، جاں نثاری اور اخلاص فی الاسلام کا اعتراف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر فرمایا۔ مثلاً

- ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مال سے مجھے سب سے زیادہ فائدہ پہنچا۔
- میں نے سب کے احسانوں کا بدلہ چکا دیا مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے احسان مجھ پر باقی ہیں۔
- پیغمبروں کے سوا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بہتر کسی انسان پر سورج طلوع نہیں ہوا۔
- اگر میں اللہ کے سوا انسانوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔
- اللہ اور مومنین ابو بکر رضی اللہ عنہ کی امارت کے سوا کسی دوسرے کی امارت کو قبول نہیں کریں گے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مناقب میں بہت سی احادیث صحاح ستہ اور دوسری کتب میں موجود ہیں جو ان کو دوسرے صحابہ سے مراتب میں بلند ظاہر کرتی ہیں۔ اپنے مزاج وسیرت کے لحاظ سے ابو بکر رضی اللہ عنہ دوسرے صحابہ کے مقابلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔ اور جیسا کہ قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی نے ارشاد الطالبین میں شرح صحیح بخاری (کتاب الجنائز) کے حوالے سے امام محمد ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ ایک خمیر سے پیدا ہوئے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری علالت میں تاکیداً ابو بکر رضی اللہ عنہ اور صرف ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کی نماز کا امام مقرر کیا اور خود بھی ان کی امامت میں نماز ادا کی۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ابو بکر کو پہلا امیر الحج مقرر کیا تھا۔ اپنی حیات اقدس کے دوران میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر بھی تھے اور مسلمانوں کے امیر بھی۔ اس حیثیت سے مسلمانوں کی نماز کی امامت بھی کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیغمبری ختم ہوگئی۔ امارت باقی رہی جس کی ظاہری علامت امامت نماز تھی۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری تفویض کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی امارت کی طرف واضح اشارہ کر دیا جسے سقیفہ بنی ساعدہ کے حاضرین نے تسلیم کیا اور یہ بھی کہ خلیفہ مہاجرین قریش ہی میں سے ہونا چاہئے۔ مہاجرین میں ابو بکر رضی اللہ عنہ سے افضل اور نمایاں کوئی نہ تھا۔ ان کی شخصیت سب کے نزدیک غیر متنازعہ اور ہر دلعزیز تھی۔ لہٰذا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر سب متفق ہو گئے۔ قرآن مجید میں عزت و بزرگی کا معیار تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے۔ ان سے بڑھ کر صاحب تقویٰ کون ہوسکتا تھا؟

اس میں شک نہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت ہنگامی حالات میں ہوئی لیکن سقیفہ کی کارروائی میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ لوگوں نے یہ چاہا ہو کہ نبوت اور خلافت ایک خاندان میں جمع نہ ہونے پائیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں کوئی شخص اٹھا نہ بیعت کرنے کے بعد کسی نے فسخ کی۔ تجارتی تعلقات کی وجہ سے عربوں کو رومیوں اور ایرانیوں کے آسمانی شہنشاہت، کے نظریہ حکومت کا علم تھا لیکن انہوں نے اپنے قبائلی جمہوری دستور اور اسلامی روح کے مطابق خلافتی طرز حکومت اپنایا یا وضع کیا جو آج کل کی سیاسی یا آئینی اصطلاح میں نہ جمہوری ہے نہ شخصی، نہ مذہبی نہ اشرافی بلکہ وہ یہ سب کچھ ہے اور ان سب سے الگ اور ممتاز ہے۔ شہنشاہیت، آمریت اور پاپائیت سے دور۔ بعد میں جب بنو امیہ اقتدار پر قابض ہو گئے۔ تو انہوں نے پڑوس کی بازنطینی شہنشاہیت کے انداز اپنا لئے اور خلافت کو میراث بنا لیا۔

ان کے بعد بغداد کے بنو عباس نے سابق شاہان ایران کی مطلق العنانی اور ظل اللہیت کا مقدس لبادہ اوڑھ لیا۔ پھر بتدریج ایرانی تصورات کے زیر اثر ہی امامت کا نظریہ تیسری صدی ہجری میں پروان چڑھا۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب غیر معمولی حالات میں صرف اہل مدینہ کے اتفاق رائے سے ہوا۔ پھر دوسرے مسلمانوں نے بھی تسلیم کر لیا بعد میں اپنی خلافت کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی ایک خصوصی تقریر میں وضاحت بھی کی تھی کہ اس انتخاب کو آئندہ کے لئے نظیر اور رہنما اصول نہ سمجھا جائے۔ اس وقت امت کے ارباب حل وعقد مدینہ میں جمع تھے اور حالات کی نزاکت فوری کارروائی کی متقاضی تھی۔ بقیہ تینوں خلفائے راشدین کا انتخاب بھی مرکز اسلام مدینہ کے اصحاب شوریٰ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

حالات کی نوعیت کے تحت طریق انتخاب میں تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ ویسے بھی آج کل کے ذرائع ابلاغ و مواصلات میسر نہ تھے کہ پورے عرب میں بیک وقت استصواب کرایا جاتا۔ بہر حال مدینہ سے باہر کے مسلمانوں نے کبھی اعتراض نہیں کیا اور منتخب خلیفہ کی بیعت کرتے رہے۔ کبھی کسی سے زبردستی بیعت نہیں لی گئی۔ بہت بعد میں

جب خلیفہ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف اور مناقشہ کا آغاز ہوا تو مؤخر الذکر کو بیعت کی دعوت دیتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے لکھا کہ ہمارا انتخاب بھی اسی طرح عمل میں آیا جس طرح ہمارے پیشرووں ابوبکر رضی اللہ عنہ عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کا (نہج البلاغہ) جناب شیر خدا رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت قریبہ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نامزدگی کی بنا پر اپنے لئے خلافت وامامت کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ مسلمانوں کی رائے عامہ کی بناء پر۔ نہ انہوں نے کبھی یہ کہا کہ ان کے پیشرووں نے ان سے زبردستی بیعت لی۔ اور یہ کہ وہ خلفائے ثلاثہ کے عہد میں تقیہ کرتے رہے اور اب تو انقلاب ایران کے بعد نئی حکومت نے انتخابات کروا کر عملاً اصول امامت کی نفی کر دی ہے اور شوریٰ کی تصدیق۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا نے سیر المصنفین میں لکھا ہے کہ حیدرآباد (دکن) کی ایک محفل میں ایک دفعہ کچھ ایسا ذکر آیا تو شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی جو اثنا عشری شیعہ تھے اور اپنے علم وفضل کی وجہ سے ممتاز اور مشہور تھے، کہنے لگے کہ یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دب اور ڈر کر ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ وعثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ ایک طرف تو ہم شیعہ انہیں شیر خدا، خیبر شکن، لافتیٰ الا علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کہتے ہیں اور واقعی وہ ایسے تھے، لیکن دوسری طرف ہم خلافت وامامت کے بارے میں انہیں بزدلی اور تقیہ سے متہم کرتے ہیں۔ شیر خدا سے ایسی بزدلی اور مداہنت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے خوشدلی سے بیعت کی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بھی خلافت کے امیدوار رہے اور غالباً اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ اس کا مستحق سمجھتے تھے۔ لیکن عرب کے شورائی دستور کی عمل پیرائی سے وہ چوتھے نمبر پر آئے۔ انہوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں کسی قسم کی سرگرمی نہیں دکھائی بلکہ ان سے ہر طرح تعاون کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو رشتہ مصاہرت بھی قائم ہو گیا تھا۔ ابوبکر کی بیعت کرنے کے بعد آپ نے فرمایا تھا کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جسے ہماری نماز (دین) کی قیادت کے لئے چن لیا ہم نے اسے اپنی دنیا کی قیادت کے لئے بھی چن لیا۔''

عم رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری علالت کے دوران میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مرض سے جانبر نہ ہوں گے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جانشینی کے بارے میں پوچھ لو تا کہ بعد میں جھگڑا پیدا نہ ہو۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر ایسا کرنے سے انکار کر دیا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کر دی تو پھر آئندہ کے لئے بھی کوئی امید نہ رہے گی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کو وراثت نہیں سمجھتے تھے بلکہ نارمل اور انتخابی طریقے سے اسے حاصل کرنا چاہتے تھے جب بھی ایسا ممکن ہو۔ اور پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے بعد جب ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تھوڑے سے ادنیٰ قریش نے ایک معمولی شخص (ابوبکر رضی اللہ عنہ) کی بیعت کر لی (حالانکہ یہی ابوسفیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ابوبکر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمبر ۲ خیال کرتے تھے) اگر آپ چاہتے تو ہم آپ کے موافق اکثریت پیدا کر دیتے اور مدینہ کی وادی کو لشکروں سے بھر دیتے۔ حضرت علی نے جواب دیا کہ ''اے ابوسفیان! تو اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ وہ ہر طرح خلافت کے اہل ہیں۔ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر کی فوری طور پر بیعت کر لی تھی نہ کہ چھ ماہ بعد جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا

انتقال ہوا۔ چھ ماہ بعد ابوسفیان آ کر ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔

مشہور انگریز مستشرق سر ولیم میور جس کی نظر میں شیعہ و سنی یکساں ہیں، اپنی تصنیف خلافت کا عروج و زوال میں لکھتا ہے!

''علی رضی اللہ عنہ کے طرف دار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خود خلافت کے امیدوار تھے۔ لیکن ان کی سابق زندگی یا ان کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے رویہ سے اس قسم کی قیاس آرائی کا کوئی جواز نہیں ملتا۔'' پھر آگے چل کر حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ ''علی رضی اللہ عنہ کے دعوی خلافت کے بارے میں سیاسی فرقہ بندی کی بناء پر رنگ آمیزی کی گئی ہے جو آخر کار علی رضی اللہ عنہ اور اولادِ علی رضی اللہ عنہ کے آسمای حق خلافت و امامت کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کا کہیں ذرہ بھر بھی ثبوت نہیں ملتا کہ علی رضی اللہ عنہ نے کبھی ایسا دعویٰ کیا یا ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران میں دوسروں نے ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش کیا ہو۔ صرف عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہی وہ خلافت کے ایک امیدوار کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آئے لیکن اس وقت بھی ان کا دعویٰ اور امیدواری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سربرآوردہ صحابی کی حیثیت سے تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی سے رشتہ مناکحت کی وجہ سے کسی مفروضہ کی بناء پر نہ تھی۔''

مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنے مضمون ''قرآنی تصور مملکت'' میں جانشینی کے مسئلہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

''لفظ خلیفہ کے ساتھ ہم جانشینی کے خاردار مسئلہ سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس نے تیرہ سو سال (اب چودہ سو سال) سے مسلمانوں کو دو بڑی متخاصم جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے جو اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لئے لائے تھے اور جس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھر تبلیغ کرتے رہے اس کے بنیادی اصولوں میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لئے کیا اصول ہو، اور اس اصول کا ماننا اس سے بھی کم ایک جزو عقیدہ امر بن سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس صورت حال پیدا ہوگئی اور ہر دو فریقوں کے ہاں غلو رکھنے والے خیالات پھیلتے رہے۔... یہ امر کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سیاسی جانشینی کا استحقاق تھا یا نہیں؟ یہ ایک خالص علمی مسئلہ رہ جاتا ہے جس کو آئے دن کی روزمرہ زندگی پر اب تیرہ سو سال بعد اثر انداز ہونے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔''

علامہ اقبال نے اپنے مضمون ''اسلام میں سیاسی فکر[1]'' میں لکھا کہ ''پیغمبر اسلام کی ذات اقدس اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات کے زیر اثر عرب قبائل متحد ہو کر ایک مشترک اور مسلسل پھیلتی ہوئی ملت کی صورت میں ابھرے۔ موروثی ملوکیت کا خیال ان کے اذہان کے لئے ایک قطعی غیر ملکی تصور تھا.... ابتدا ہی سے یہ بنیادی اصول تسلیم کر لیا گیا کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق سیاسی اقتدار اصلاً عوام الناس کے ہاتھوں میں ہے اور ان کی

---

[1] ہندوستان ریویو (الہ آباد) کے دسمبر ۱۹۰۹ء اور جنوری ۱۹۱۰ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی تصنیف ''زندہ رود'' (جلد دوم) کے صفحات ۱۹۰-۱۹۲ پر اس کا حوالہ دیا ہے۔ مولف

اجتماعی رضا کے بغیر کسی قسم کی حاکمیت کا قیام ممکن نہیں......اگرچہ قرآن مجید میں انتخاب کو ریاست کا بنیادی اصول قرار دیئے جانے کے بارے میں کوئی واضح آیت نہیں ہے۔ پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ احکام قرآنی کی روح اسی تصور سے مطابقت رکھتی ہے......اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ موروثی ملوکیت کے تصور کی اسلام میں کوئی گنجائش نہ تھی اور رضائے عوام کو کسی نہ کسی صورت میں خلیفہ کے تقرر کے لئے بنیادی اصول تسلیم کیا گیا۔"

عقلاً و جمہوراً بھی دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور منشائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلسل بہتر ہوتے ہوئے حالات زمانہ اس کے متقاضی نہ تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک ہی خاندان کو قیامت تک کے لئے خلافت سونپ دی جاتی۔ معاملہ امت کے اجماع اور صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کے بارے میں مشہور مصری دانشور اور مصنف محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں۔

"واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی زندگی میں اس اجتماع کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔ اگر اس موقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی اصابت رائے، قوت ارادی اور ذہانت و فرزانگی کو کام میں نہ لاتے تو خود اسلام کے مرکز میں وہ فتنہ پھیل جاتا جو بعد میں عرب کے دوسرے شہروں میں پھیلا اور اس عالم میں پھیلتا کہ اسلام کے بانی کی نعش ابھی گھر میں پڑی ہوتی۔

ذرا غور کیجئے کہ اگر انصار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی باتوں میں آکر اصرار کرتے کہ خلافت ان کا حق ہے اور انہی کو ملنا چاہئے اور دوسری طرف قریش اپنے سوا کسی کی خلافت پر راضی نہ ہوتے تو اس فتنے کا انجام کیا ہوتا؟ خصوصاً اس حالت میں کہ اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر ہتھیاروں سے لیس دشمن سے جنگ کے لئے کوچ کرنے پر بالکل تیار تھا۔ کیا اس صورت میں وہی ہتھیار ایک دوسرے کے خلاف نہ استعمال ہوتے۔ اگر سقیفہ جانے والے مہاجرین ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرے لوگ ہوتے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر ہونے کا شرف اور نہ امین الامت ہونے کا اعزاز حاصل ہوتا، تو انصار و مہاجرین کے درمیان اختلاف کی خلیج بے حد وسیع ہو جاتی اور اس کا جو ہولناک انجام ہوتا اس کا اندازہ بھی آج کا مؤرخ نہیں کرسکتا واقعات کا صحیح اندازہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس اہم اجتماع کو اسلام کی تاریخ میں اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی بیعت عقبۃ الکبریٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کو، یہ بات بھی ان سے پوشیدہ نہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر جو کارنامہ انجام دیا۔ اس نے صریحاً ثابت کردیا کہ وہ دینی لحاظ سے نہایت بلند مرتبہ رکھنے کے علاوہ بحر سیاست کے شناور، انتہائی دوررس اور نتائج و عواقب پر گہری نظر رکھنے والے بھی تھے۔ اور ہر معاملے میں ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس سے بہتر نتائج برآمد ہوں۔ اور ہر ایسی بات سے پہلوتہی کی جائے جس سے شر و فساد پھوٹنے کا امکان ہو۔"[1]

---

[1] ابوبکر۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

حقیقت یہ ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب امت کے بہترین مفاد میں ہوا۔ خود ابو بکر رضی اللہ عنہ خلافت کے خواہش مند نہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی منصب کے خواہش مند کو کبھی منصب عطا نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ طلب خود غرضی اور ہوس جاہ کی غمازی کرتی ہے الا یہ کہ کوئی یوسف علیہ السلام کی سی پیغمبرانہ شخصیت کا حامل ہو، اس لئے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معلومہ طریق کار کے خلاف جاتے۔ سقیفہ میں انہوں نے اپنی بجائے عمر رضی اللہ عنہ اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو پیش کیا اور بعد میں بھی لوگوں سے کہہ دیا کہ اگر وہ ان کی خلافت سے خوش نہ ہوں تو انہیں بیعت فسخ کرنے کا اختیار ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دوسرے کو خلیفہ بنانا چاہا ہوتا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کبھی سرتابی نہ کرتے بلکہ نامزد خلیفہ کے جوتے اپنے سر پر اٹھاتے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے مسلمان گمراہی، انتشار اور تفرقہ وفساد سے بچ گئے اور اسلام کے عالمگیر پیغام کو معلومہ دنیا کے تینوں براعظموں میں پہنچانے اور اسے سربلند کرنے کے قابل ہو گئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ بلکہ ان کے جانشینوں نے بھی خلافت سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہیں کیا۔

پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جس طرح خلافت کو تلوار کی دھار سمجھتے ہوئے انتہائی حزم واحتیاط سے تادم مرگ دین و ملت کے مفاد کے لئے کام کیا، اسے دیکھ کر حضرت عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا کہ ''مجھے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فوراً بعد آنے نے بے حد تھکا دیا''یعنی ابو بکر رضی اللہ عنہ کی جانشینی کے عظیم لوازم اور بلند ترین معیار کو نبھانا اور برقرار رکھنا بہت ہی دشوار اور صبر آزما کام تھا۔

اگر خاندانی وراثت ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ زیادہ حقدار ٹھہرتے ہیں کیونکہ ان کے مقابلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیثیت داماد کی تھی یا پھر چچا زاد بھائی کی۔ چچا کے ہوتے ہوئے داماد یا چچا زاد بھائی وراثت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے رسول اللہ کا خلیفہ اول منتخب ہونے پر کسی قسم کی دنیاوی دھوم دھام، درباری جشن اور ضیافت وغیرہ نہیں ہوئی۔ نہ مبارک سلامت کے غلغلے۔ قرآنی اصطلاح میں یہ خلافت تھی شہنشاہیت نہ تھی۔ روم و ایران کی ہمسایہ سلطنتوں میں جب کوئی نیا حکمران تخت نشین ہوتا تھا تو پر تکلف اور شاندار تقریبات منعقد کی جاتی تھیں نیا حکمران امرائے سلطنت کو مناصب اور خطابات سے نوازتا تھا، جاگیریں عطا کرتا تھا اور رعایا میں بھی داد و دہش کا مظاہرہ کرتا تھا، اس سے تالیف قلوب بھی مطلوب ہوتی تھی اور لوگوں کو مرعوب کرنا بھی۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب کسی مطلق العنان اور جابر حکمران کی تخت نشینی کا معاملہ نہ تھا۔ یہاں تو سید القوم خادم القوم کی کیفیت تھی، ہوس اقتدار نہ تھی۔ دین وملت کی خدمت اور احکام خداوندی کی تعمیل کا جذبہ کارفرما تھا۔ ایک خود غرض دنیا دار اور جابر حکمران اور ایک بے غرض دیندار اور متقی خلیفہ میں یہ بنیادی فرق ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے جانشینوں کے لئے بھی بے غرضی اور سادگی کی مثال قائم کر دی۔ انہوں نے اپنے اور خاندان کے لئے خلافت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

خلیفہ کا وظیفہ

خلیفہ منتخب ہونے سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور ایک روایت کے مطابق سخ میں کپڑا بننے کی کھڈیاں بھی لگا رکھی تھیں۔ اس سے ان کی اور ان کے کنبے کی معقول گزر بسر ہو جاتی تھی۔ انتخاب کے دوسرے ہی دن اپنے کندھوں پر کپڑے کے تھان ڈال کر فروخت کرنے کے لئے بازار چلے تو راہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ مل گئے۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ تجارت چھوڑ دیں اور اپنا سارا وقت اور توانائیاں امور خلافت کے لئے وقف کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تجارت ترک کر دوں تو میں اور میرے اہل و عیال کھائیں کہاں سے؟ اس پر عمر رضی اللہ عنہ، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے آپس میں مشورہ کر کے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کنبے کی ضروریات کا اندازہ کر کے ایک اوسط درجے کے مہاجر کنبے کے معیار کے مطابق خوراک اور سردی، گرمی کے لباس کا انتظام کر دیا۔ نصف بکری کا گوشت روزانہ مقرر کیا اور آپ کے پہننے کے لئے دو چادریں جو پرانی ہو جانے پر واپس کر کے نئی لی جا سکتی تھیں۔ چونکہ بیت المال کا انتظام حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا گیا تھا، لہٰذا خلیفہ اور ان کے کنبے کی ضروریات کفاف کی دیکھ بھال بھی انہی کے ذمہ ٹھہری۔ محمد ابن سعد کے بقول ڈھائی ہزار یا تین ہزار یا چھ ہزار درہم سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ولیئم میور چھ ہزار کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر چھ ہزار بھی ہو تو یہ رقم آج کے ڈیڑھ ہزار پاکستانی روپے کے برابر ہوتی ہے یعنی سوا سو روپیہ ماہوار۔ یہ اتنی حقیر رقم ہے کہ آج پاکستان کی حکومت کے کسی دفتر کا ایک معمولی چپڑاسی بھی اس میں گزارہ نہیں کر سکتا۔ نہ اس پر قانع ہو سکتا ہے چہ جائیکہ سربراہ مملکت۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ ان کے زمانے کی روم و ایران کی سلطنتوں کے شہنشاہوں کے اخراجات کی کوئی حد نہ تھی، سلطنتوں کے تمام خزانے اور وسائل ان کے اختیار میں تھے اور امرائے سلطنت ان کے اخراجات پر کسی قسم کی پابندی لگانے کا اختیار اور جرأت نہ رکھتے تھے لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ تو اس صادق و امین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے جن کے لئے فقر باعث فخر تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت وصیت کر دی کہ ان کا ایک قطعہ اراضی فروخت کر کے بیت المال سے بطور کفاف لی ہوئی تمام رقم واپس کر دی جائے اور ایسا ہی کیا گیا۔ بیت المال کی ایک پانچ درہم کی چادر، ایک اونٹ اور ایک غلام آپ کے پاس تھے وہ بھی وصیت کے مطابق آپ کے جانشین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیج دیئے گئے جنہیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے فرمایا کہ خدا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحم کرے۔ انہوں نے اپنے بعد آنے والے کا کام بہت مشکل بنا دیا ہے۔

بہر حال خلیفہ کے وظیفہ کا تعین ایک اجتہاد تھا جو اسلام کی جمہوری اور مساوات پسند روح کو مدنظر رکھ کر کیا گیا۔ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اس اصول پر عمل کیا گیا۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے تمول کی وجہ سے بیت المال سے وظیفہ نہیں لیا۔ غرضیکہ خلیفہ کو کوئی گراں بہا خصوصی الاؤنس (Sumotuous Allownce) نہیں ملتا تھا۔

پھر بنی امیہ اور بنی عباس نے اپنے دور اقتدار میں رومی و ایرانی شہنشاہوں کی طرح بیت المال کو اپنا ذاتی مال

سمجھ لیا۔

دور حاضر میں مساوی انسانی حقوق کے نام نہاد علمبردار روس، چین وغیرہ ممالک کے اشترا کی سربراہوں کا بھی یہی حال ہے کہ عالی شان محلوں میں رہتے ہیں اور ہر طرح کا سامان تعیش انہیں حاصل ہے۔

سابق روسی سربراہ بریژنیف کے پاس اعلیٰ درجے کی اسی کاریں تھیں۔ مشہور مگر معتوب روسی دانشور اور ادیب سولژے تیسن نے ''روسی رہنماؤں کے نام'' اپنے طویل خط میں زعمائے حکومت کی عیش پسندی کی طرف اشارے کئے ہیں۔ چین میں بھی ایک عام ورکر کے مقابلے میں حکمران طبقے کو کم سے کم چھ گنا زیادہ مشاہرہ ملتا ہے اور شاندار مکانوں کاروں وغیرہ کی سہولتیں اس کے علاوہ ہیں۔

آندھی ہو یا طوفان!

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فوراً امور حکومت کی سرانجام دہی میں منہمک ہو گئے۔ نظم حکومت سیدھا سادہ تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس نے بہت سے انتظامی اور فوجی مسائل کو جنم دیا۔ اپنی حیات اقدس کے دوران میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس حدود اور انصاف سے متعلق مسائل کا فیصلہ کرتے تھے اور بیت المال کے سربراہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ زکوٰۃ، غنیمت وغیرہ کا جو مال آتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود تقسیم فرماتے تھے اور کچھ بچتا نہیں تھا کہ بیت المال میں جمع رکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قضا یعنی انصاف و عدالت کے شعبے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیئے اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو بیت المال کا سربراہ مقرر کیا۔ دارالخلافہ میں کسی تیسرے سول عہدہ کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد مرتدین، منکرین زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت کے فتنوں کے بادل گھرے ہونے شروع ہو گئے۔ ان کے خلاف فوجی اقدامات کی ضرورت سب سے پہلے پیش آئی۔ تفصیل آگے آئے گی۔

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی مہم

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے فوری مسئلہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے لشکر کو سرحد شام کی طرف روانہ کرنے کا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع سے واپس آ کر اس لشکر کی تیاری کا حکم دیا تھا۔ اس مہم کے کئی مقاصد تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتی خط لے کر جو ایلچی شاہ غسان کے پاس گیا تھا اس نے اسے قتل کرا دیا تھا۔ اس کا انتقام لینا اور غسانیوں پر رعب داب قائم کرنا ضروری تھا کیونکہ ادھر سے خبریں آنے لگی تھیں کہ شہنشاہ روم اپنے باجگزار غسانیوں کی مدد سے اسلامی محروسات پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے پہلے بھی ایسا کرنا چاہا تھا لیکن جب پیش قدمی کر کے حضور خود تمیں ہزار جاں نثاروں کے ساتھ تبوک پہنچ گئے تھے تو وہ دبک کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ نیز ۸ ھ میں غزوہ موتہ واقع ہوا تھا۔ اس کا انتقام بھی رومیوں اور غسانیوں سے لینا تھا۔ چونکہ غزوہ موتہ کے سالار اول حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے۔ اور وہ اس غزوہ میں شہید ہوئے تھے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھارہ...... بیس

سالہ اسامہ رضی اللہ عنہ کو سالار لشکر مقرر کیا تا کہ اپنے باپ کا انتقام لیں اور دشمنوں کی تادیب کریں۔ تمام اکابر صحابہ کو اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہونے اور ان کی ماتحتی میں کام کرنے کی ہدایت کی۔ اسامہ ابھی ناتجربہ کار نوجوان تھے۔ اس لئے بعض صحابہ کو ان کا امیر لشکر مقرر کئے جانے کی مصلحت سمجھ میں نہ آئی اور انہیں قدرے ناگوار گزرا۔ یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکیداً فرمایا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ اس منصب کے اہل ہیں اور وہی امیر لشکر ہوں گے۔ لیکن اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر ابھی مدینہ سے باہر مقام جرف تک پہنچا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے لشکر کی روانگی رک گئی۔ قبائل عرب کے ارتداد، ادائے زکوٰۃ سے انکار اور ان کے مدینہ پر یورش کے عزائم کی تشویشناک خبریں آنے لگیں۔ اکابر صحابہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا بلکہ خود اسامہ رضی اللہ عنہ نے بھی کیمپ سے کہلا بھیجا کہ ان خطرناک حالات میں لشکر کی روانگی ملتوی کر دی جائے تا کہ مدینہ کا دفاع کیا جا سکے۔ انصار کا یہ پیغام لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ کے پاس گئے تھے۔ لیکن ڈانٹ کھا کر واپس آ گئے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایسے تمام مشورے یہ کہہ کر رد کر دیئے کہ جس لشکر کی روانگی کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہو ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں کہ اس کی روانگی کو ملتوی کر دے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر مدینہ انسانوں سے خالی ہو جائے اور صرف میں اکیلا یہاں رہ جاؤں اور جنگل کے درندے آ کر میری ٹانگیں نوچیں تب بھی اسامہ کا لشکر اپنی مہم پر ضرور جائے گا۔ پھر یہ مشورہ دیا گیا کہ کسی زیادہ تجربہ کار اور بزرگ صحابی کو امیر لشکر مقرر کیا جائے۔ اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بڑی قطعیت کے ساتھ جواب دیا کہ لشکر کو جس امیر کے ماتحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانگی کا حکم دیا تھا، اسی کی ماتحتی میں روانہ ہو گا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عزم بالجزم دیکھ کر بڑے بڑے صحابہ بھی خاموش ہو گئے۔ چنانچہ اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر روانہ ہوا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امیر لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ سے خصوصی اجازت لے کر عمر رضی اللہ عنہ کو صلاح مشورے کے لئے روک لیا لیکن انہوں نے ایسا اپنے ذاتی حکم سے نہیں کیا۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ امیر لشکر کی اجازت سے کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جنگ موتہ کے سوا تمام جنگیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی کمان میں لڑی گئی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم موقع و محل کی مناسبت سے اہل لشکر کو احکام و ہدایات ساتھ ہی ساتھ دیتے جاتے تھے۔ یہ مہم ایک نوجوان اور ناتجربہ کار امیر کی قیادت میں ایک بہت بڑے دشمن کے مقابلے میں جا رہی تھی جو ہر طرح کے اسلحہ اور سازوسامان سے مسلح تھا اور موتہ کی جنگ میں تین ہزار مسلمانوں کے مقابلے میں ایک لاکھ کا لشکر جرار لا چکا تھا۔ اس لئے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو ضروری ہدایات دینا مناسب سمجھا تا کہ آئندہ کے لئے اسلامی عساکر اور ان کے سالاروں کے لئے ایک جنگی پالیسی متعین ہو جائے اور وہ اس سے انحراف نہ کریں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اسامہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کو رخصت کرنے مقام جرف پر گئے۔ اسامہ رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار تھے جبکہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ (عشرہ مبشرہ کے مرتبہ کے صحابی) ان کے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا "اے خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، یا تو آپ بھی گھوڑے پر سوار ہو جائیں یا مجھے گھوڑے سے اترنے کی اجازت دیں۔" انہوں نے جواب دیا کہ "نہ تو میں گھوڑے پر سوار ہوں گا نہ تم گھوڑے سے اترو گے۔ اگر اللہ کی راہ میں میرے پاؤں بھی گرد آلود ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔ اس کے بعد اسامہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کو

حسب ذیل ہدایات دیں۔

۱- بدعہدی نہ کرنا

۲- خیانت نہ کرنا

۳- دشمنوں کا مثلہ نہ کرنا

۴- بوڑھوں، بچوں، عورتوں کو قتل نہ کرنا

۵- مویشیوں کو کھانے کی ضرورت کے سوا یونہی ذبح نہ کرنا

۶- کھجور اور دوسرے پھلدار درختوں کو نہ جلانا نہ کاٹنا

۷- جب ایسے لوگوں پر تمہارا گزر ہو جنہوں نے اپنے آپ کو خانقاہوں میں عبادت کے لئے وقف کر رکھا ہو، تو ان سے تعرض نہ کرنا۔

۸- ایسے لوگ بھی تمہیں ملیں گے جن کے سر بیچ سے منڈے ہوئے ہوں گے اور چاروں طرف بال جھالروں کی طرح لہراتے ہوں گے۔ انہیں قتل کئے بغیر نہ چھوڑنا۔

۹- اللہ کو ہمیشہ یاد رکھنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرنا۔

۱۰- اپنے امیر کی حکم عدولی نہ کرنا

اب اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ۔ وہی تمہیں شکست اور وبا سے محفوظ رکھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے انیس (بقول بعض چالیس) دن بعد یہ لشکر روانہ ہوا۔ جون، جولائی کی شدید گرمی میں یہ مہم جاری رہی۔ غسانیوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کے قتل کا انتقام لیا گیا اور اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بھی۔ اسامہ رضی اللہ عنہ نے ڈھونڈ کر اپنے والد کے قاتل کو قتل کیا۔ اسلامی لشکر نے دشمن پر اچانک اور کامیاب چھاپے مارے اور بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ قضاعہ، آبل اور دوسرے مخالف قبائل کی بھی سرکوبی کی۔ شمالی سرحد پر رومیوں اور ان کے حلیفوں کے خلاف یہ ایک تادیبی کارروائی تھی۔ اسامہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر رومی علاقوں کے اندر گھس کر جنگ کرنے سے پرہیز کیا۔ تاہم اس فوجی کارروائی سے مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ رومی اور ان کے ماتحت اور حلیف عرب قبائل بنو غسان وغیرہ دب گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پیدا ہونے والے اضطراب اور انتشار سے فائدہ اٹھا کر انہیں مدینہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ دوسرے عرب قبائل جو مائل بہ ارتداد ہو چکے تھے وہ بھی خاصے سہم گئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ مدینہ کی دفاعی پوزیشن بہت مضبوط ہو گی ورنہ ایسے نازک وقت میں اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر مدینہ سے نکل کر دوسروں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ نہ ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کی تیاری کا حکم دیتے وقت اپنے ایلچی اور زید رضی اللہ عنہ کے قتل اور شکست موتہ کے انتقام کی بات تو کھول دی تھی (حالانکہ موتہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمزاد حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی شہید ہوئے تھے، لیکن ان کا نام نہیں لیا کیونکہ سپہ سالاری زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے اسامہ رضی اللہ عنہ کو دینا منظور تھی اور صحابہ کے دلوں میں ان کی وقعت بھی پیدا کرنا تھی) لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے بعد پیدا ہونے والی امکانی شورش و فتنہ کو بھی اپنی چشم

بصیرت سے دیکھ چکے تھے۔ اس لئے اسامہ کا لشکر بھیج کر روم و شام کی سرحد کو محفوظ کرنا بھی ایک بڑا مقصد تھا، جس میں کامیابی ہوئی۔

حضرت ابوبکر نے شہر سے باہر نکل کر اسامہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کا استقبال کیا اور مدینہ میں خوشی منائی گئی، اسامہ کی فتح یابی کا مسلمانوں، رومیوں اور باغیوں پر دوررس اثر پڑا۔ مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کی حالت بھیڑ بکریوں کے ایک ایسے ریوڑ کی سی ہو گئی تھی جس کا کوئی رکھوالا نہ ہو اور ہر وقت ہر طرف سے بھیڑیوں اور دوسرے درندوں کے حملے کا خطرہ ہو، اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انہماک اور عزم و استقلال کا یہ پہلا شیریں پھل تھا اگر وہ مستحکم سیاسی اور فوجی پالیسی اختیار نہ کرتے اور ہچکچاہٹ میں مبتلا ہو جاتے تو حالات بہت زیادہ خراب اور خطرناک ہو جاتے، طاقت کے اس مظاہرے سے مسلمانوں کو مرتدین، منکرین زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت سے نپٹنے میں وہ دشواریاں پیش نہ آئیں جو بصورت دیگر اپنی قلت تعداد اور دشمنوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے پیش آتیں۔

گھمبیر مسائل

عنان خلافت سنبھالنے کے فوراً بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے تین بے حد گھمبیر اور تشویشناک مسائل تھے۔

۱- منکرین زکوٰۃ کی سرکوبی

۲- مرتدین کا استیصال

۳- جھوٹے مدعیان نبوت کا قلع قمع

عرب میں ایک عام ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی سے پہلے ہی بہت سے بدوی قبائل کے اسلام سے مرتد ہو جانے، بعض قبائل کے زکوٰۃ دینے سے انکار کرنے اور بعض جھوٹے مدعیان نبوت کے خروج کی اطلاعیں، مدینہ پہنچ گئی تھیں جو مسلمانوں کے لئے اضطراب و تشویش کا باعث بنیں لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی جگہ پر سکون اور مطمئن رہے۔ آندھی ہو یا طوفان، دشمن ایک ہو یا انیک، انہوں نے اسلام کی صداقت میں اٹل اعتقاد کے ساتھ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی روشنی میں ان سب کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا اور اپنے ایمان محکم، تدبر، دور اندیشی بصیرت اور الوالعزمی سے تمام مشکلات پر قابو پا لیا اور نہ صرف سارا عرب پھر سے اسلام کے حلقہ اطاعت میں آ گیا بلکہ عراق و شام تک اس کی روشنی پہنچ گئی۔ اقبال کے بقول

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
تیرا سفینہ کہ ہے بحر بیکراں کے لئے

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہادی و آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں اسلام کی روشنی کو دوسروں تک پہنچانے کا جو سلسلہ شروع کیا۔ ان کے جانشینوں نے اس کی تکمیل کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن......

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے اگر چہ سارا عرب حلقہ بگوش اسلام ہو چکا تھا، لیکن صدیوں سے نظم وضبط سے آزاد، بدویانہ زندگی اور لا مرکزیت کے خوگر، تمدن و حضارت سے بے بہرہ، اپنے حسب ونسب پر مغرور اور قبائلی عصبیت پر جان دینے والے اعراب کے لئے یہ ایک نیا اور ناخوشگوار تجربہ تھا کہ نہ صرف مدینہ کے مہاجرین و انصار پر مشتمل ایک مرکزی انتظامیہ کا جوا ان کی گردن پر رکھ دیا جائے اور انہیں زکوٰۃ دینے پر مجبور کیا جائے بلکہ انہیں ایک دینی ضابطہ اخلاق کا پابند بھی بنا دیا جائے اور جو اخلاقی ذمائم مثلاً قتل وغارت گری، دختر کشی، زنا کاری، شراب نوشی، قمار بازی وغیرہ ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے، ان سے انہیں سختی سے باز رکھا جائے، یہ ایسے ہی تھا جیسے ایک شیر خوار بچے سے دودھ چھڑایا جائے یا ایک خودسر الھڑ بچھیرے کو لگام دینے اور اس پر سوار ہونے کی کوشش کی جائے۔ اسلام کی اخلاقی، معاشی، سماجی اور سیاسی تعلیمات ابھی پوری طرح ان بدوی قبائل کی اکثریت کی طبائع میں راسخ نہیں ہوئی تھیں کہ حضور علیہ السلام کا وصال ہو گیا اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح عرب کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ منافقوں اور ادھ کچرے مسلمانوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے اور اسلام کا جوا اتار پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہودی اور عیسائی عناصر جو اسلام کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے تھے، انہیں شر و اشتعال پھیلانے کا خوب موقع ہاتھ آیا۔ سرحد پار سے رومیوں اور ایرانوں نے بھی اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت صورت حال کو بگاڑنے میں کردار ادا کیا۔

مدینہ کے گرد ونواح کے بدوی قبائل نیز متعدد دوسرے قبائل کو بھی زکوٰۃ کی ادائیگی بہت ناگوار تھی۔ وہ اسے ایک جبری ٹیکس سمجھتے تھے بدوی قبائل تقریباً سبھی جگہ دمڑی کی بجائے چمڑی دینے کے قائل ہوتے ہیں۔ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور مدینہ کی حکومت کے خلاف ایکا کر لیا۔ بہت سے قبائل سرے سے مرتد ہو گئے اور اپنے جاہلی رسم ورواج کی طرف لوٹ گئے۔ کچھ طالع آزما ذہین قسم کے لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور قبائلی تعصبات کو ابھارا۔ ان کے قبیلوں نے یہ سوچ کر کہ قریش کے نبی سے ہمارا اپنا نبی بہتر ہے، ان سے وابستگی اختیار کر لی، انصار و مہاجرین (مدینہ) قریش (مکہ) اور بنو ثقیف (طائف) کے سوا ارتداد کی وبا کم وبیش ہر قبیلے میں پھیل گئی۔ ان تینوں گروہوں کے دماغوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ پہلے قریش کعبہ کے متولی تھے اور ہم پر اپنے مجد و شرف کی دھونس جماتے تھے۔ پھر ان میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پیغمبری کا دعویٰ کر کے سارے عرب پر اپنی حکومت قائم کر دی۔ اور اب قریش میں سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ لے لی ہے اور خلیفہ بن بیٹھا ہے مدینہ کے کاشتکاروں (انصار) نے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی قریشیوں سے سیاسی اتحاد کر لیا ہے۔ اس طرح قریش کی سہ گانہ سیادت اور برتری بقیہ عرب پر ہمیشہ کے لئے قائم ہو گئی۔ ان کے لئے یہ تصور ناقابل برداشت تھا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان خطرناک اور کمر توڑ دینے والے مسائل کا بڑے تدبر، دوراندیشی اور عزم واستقلال سے مقابلہ کیا اور کامیابی حاصل کی۔ ان کے ایمان محکم نے اسلام کو بچا لیا بعض مستشرقین کے مطابق ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام

کے بانی ثانی ہیں۔

منکرین زکوٰۃ

منکرین زکوٰۃ کا معاملہ بہت اہم اور پیچیدہ تھا۔ یہ لوگ روزے، نماز اور دیگر احکام اسلام کے قائل تھے لیکن مال کی حرص نیز اس غلط تصور کے تحت کہ زکوٰۃ ایک خراج، تاوان یا ٹیکس ہے جو مدینہ کی ریاست انہیں اپنا محکوم سمجھ کر ان سے وصول کرتی ہے، انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ زکوٰۃ ۹ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے فرض ہوئی تھی اور قبائل سے صرف ایک ہی سال کے لئے وصول کی گئی تھی۔ اس کی معنویت، اہمیت اور افادیت قبائل کے پوری طرح ذہن نشین نہ ہو سکی تھی۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے وصولی پر اصرار کیا۔ منکرین زکوٰۃ بھاری تعداد میں مدینہ کے مضافات میں جمع ہو رہے تھے اور ان کے عزائم ڈھکے چھپے نہ تھے۔ ارتداد اور جھوٹے مدعیان نبوت کے امنڈتے ہوئے طوفانوں نے ہراس اور تشویش کی فضا پیدا کر دی تھی، اس لئے اکابر صحابہ خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو نرم روی کا مشورہ دیا اور کہا کہ پہلے مرتدین اور جھوٹے مدعیان نبوت سے نپٹ لیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے خلاف مسلمانوں کی کامیابی سے منکرین زکوٰۃ خود بخود راہ راست پر آ جائیں۔ وہ توحید و رسالت کے منکر نہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا اس کی جان و مال محفوظ ہو گئے، اس لئے ان کے خلاف تلوار کیسے اٹھائی جا سکتی ہے؟ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ دیا کہ ''عمر! تم جاہلیت میں تو بڑے بہادر تھے، کیا اسلام نے تمہیں بزدل بنا دیا؟ خدا کی قسم! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ لوگ بکری کا ایک بچہ یا اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی ایک رسی بطور زکوٰۃ دیتے تھے تو میں ان سے وہ وصول کر کے رہوں گا اگر انکار کریں گے تو ان کے خلاف جہاد کروں گا حتیٰ کہ ان سے وصول کر لوں یا اس کوشش میں مارا جاؤں۔ اللہ نے اپنی کتاب میں نماز اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ حکم دیا ہے۔ ان دونوں میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔

اگر آج انہیں زکوٰۃ معاف کر دی گئی تو کل یہ نماز کی معافی چاہیں گے اور روزے بخشوائیں گے۔ اس طرح دین ختم ہو جائے گا حالانکہ دین مکمل ہو چکا ہے اور وحی کا نزول بند ہو گیا۔ اب کوئی نیا حکم نہیں آئے گا۔ میری زندگی میں تو یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ دین میں تغیر و تبدل کر کے اسے مسخ کیا جائے۔ ان لوگوں کو پورے طور پر اسلام میں داخل ہونا ہوگا۔ زکوٰۃ اسلام کا حق ہے اور میں یہ حق وصول کر کے رہوں گا۔'' پھر یہ کہہ کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ گھر میں چلے گئے کہ آج ابو بکر راہ خدا میں اکیلا لڑے گا اور پھر ہتھیار باندھ کر اونٹ پر سوار ہو کر تنہا جہاد کے لئے نکل گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تیز گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے پیچھے گئے اور انہیں یہ کہہ کر واپس لائے کہ تلوار میان میں کیجئے اور واپس چلئے۔ اگر خلیفہ پر کوئی آفت آئی تو اسلام کا نظام کبھی بھی قائم نہ رہ سکے گا۔''[1]

---

[1] تاریخ الخلفاء از علامہ سیوطی نیز عشرہ مبشرہ مصنفہ قاضی حبیب الرحمٰن نیز خلافت کا عروج و زوال از ولیم میور اور ابو بکر صدیق اکبر از محمد حسین ہیکل۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چھ ماہ تک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی وہ اس واقعہ پر غور فرمائیں۔ یہ سب کچھ پہلے چھ ماہ کے اندر ہوا اور حضرت علی نے بھرپور تعاون کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد میں ایک دستہ کی قیادت بھی کی۔ کیا انہوں نے یہ سب کچھ بیعت کئے بغیر کیا؟ مؤلف

منکرین زکوٰۃ نے مدینہ کا محاصرہ کرنے کے بعد خلیفہ سے مذاکرات کے لئے اپنے نمائندے بھیجے۔ بعض اکابر صحابہ نے ان کا مطالبہ مان لینے کا مشورہ بھی دیا۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی استقامت ایمانی کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی۔ اللہ نے ان کا سینہ منکرین زکوٰۃ سے جہاد کے لئے کھول دیا تھا۔ اگر وہ منکرین زکوٰۃ سے سمجھوتہ کر لیتے تو جیسا کہ سابق مذاہب یہودیت، عیسائیت، بدھ مت وغیرہ حالات سے سمجھوتہ کر کے اپنا حلیہ بگاڑ چکے تھے۔ اسلام کا حال بھی ان سے بہتر نہ ہوتا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام کو بچا لیا۔

منکرین زکوٰۃ زیادہ تر غطفان، ذبیان، بنو کنانہ، عبس اور افترارہ کے قبائل پر مشتمل تھے اور مدینہ کے قریب ابرق اور ذی العرضہ کے مقامات پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ ان کے نمائندے مدینہ کی کمزور دفاعی پوزیشن دیکھ گئے تھے۔ ابوبکر جان گئے تھے کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں گے۔ اس لئے انہوں نے مہاجرین جو انصار و اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے بعد باقی رہ گئے تھے کو مسجد نبوی میں جمع کر کے جنگ کی تیاری کا حکم دیا اور مضافات مدینہ کے وہ قبائل جو اسلام پر ثابت قدم رہے تھے انہیں بھی مدینہ کے اندر بلا لیا۔ علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ایک ایک دستے کا سالار مقرر کر کے مدینہ کی طرف آنے والے فوجی اہمیت کے رستوں کی ناکہ بندی کر دی اور پھر ایک دستے کے ساتھ دشمنوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ مدینہ کی کمزور دفاعی پوزیشن کو جانتے ہوئے دشمنوں کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ الٹا ان پر حملہ ہو سکتا ہے۔ وہ افراتفری میں بھاگ کھڑے ہوئے ان کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ذی القصہ تک ان کا تعاقب کیا۔ پھر نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کو ایک چھوٹے سے دستے کے ساتھ وہاں چھوڑ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ مدینہ واپس آ گئے۔

ذی القصہ کا معرکہ اگرچہ بہت بڑا نہ تھا تاہم نتائج کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوا۔ اسامہ رضی اللہ عنہ کی یلغار اور فتوحات نے باغی قبائل کو پہلے ہی دہشت زدہ کر دیا تھا۔ ذی القصہ کے کامیاب آپریشن سے اردگرد کے مذبذب قبائل مزید متاثر ہوئے۔ بنی تمیم، بنی طے اور بعض دوسرے قبیلوں کے سردار مال زکوٰۃ لے کر خود مدینہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ خلیفہ کے ہاتھ مضبوط ہو گئے اور دشمنوں کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ مانعین زکوٰۃ کی شکست اور فرار سے مسلمانوں کو مالِ غنیمت بھی ہاتھ آیا اور پھر زکوٰۃ کا مال بھی آ گیا۔ اہل مدینہ کی تنگ دستی بھی دور ہوئی اور مرتدین اور مدعیان نبوت کا مقابلہ کرنے کے لئے دلوں میں ایک ولولہ تازہ بھی پیدا ہو گیا۔ عمر رسیدہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان محکم اور کوہ آسا استقامت نے اسلام کو دشمنوں پر غالب کر دیا۔ مئور لکھتا ہے کہ ''ابوبکر کے سیدھے سادے ایمان و یقین نے انہیں یہ کارِ عظیم انجام دینے کے قابل بنا دیا اور انہوں نے اپنے آقا و رہنما (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی لفظی و معنوی پیروی کی۔ اگر ابوبکر نہ ہوتے تو اسلام بدوی قبائل کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے ختم ہو گیا ہوتا۔''

جب مانعین زکوٰۃ، مرتدین اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کے مسائل درپیش تھے تو ابوبکر اور دوسرے اکابر مہاجرین و انصار دن رات انہی کے متعلق سوچتے اور باہم مشورے کرتے تھے۔ رؤسائے قریش جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے اور طلقاء کے زمرے میں آتے تھے۔ شاکی ہوئے کہ انہیں ان کے دوسرے بھائی

بندوں یعنی مہاجرین اولین کے برابر نہیں سمجھا جاتا اور انہیں شوریٰ میں شریک نہیں کیا جاتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیا کہ اپنے بھائیوں کی طرح جہاد کرو، اسلام کو مخالفین کی چیرہ دستیوں سے بچاؤ، مرتدین کی سرکوبی کرو جس سے اسلام اور مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہو۔ کفار عرب کا استیصال کرو تاکہ تمہاری بھی ویسی ہی عزت کی جائے۔ محض مکہ کے رؤسا ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ [1]

لشکر اسامہ کی غیر حاضری میں اور اکابر صحابہ کی رائے کے علی الرغم حکمت، عزیمت اور ایمانی بصیرت سے کام لے کر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بے حد نازک اور ناموافق حالات میں قلیل تعداد کے ساتھ کثیر التعداد مانعین زکوٰۃ کا مقابلہ کرکے انہیں شکست دی۔ یہ گربہ کشتن روز اول کی مثال تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفار کے خلاف پہلی جنگ (بدر) اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اپنے عہد خلافت کی اس پہلی جنگ میں حالات اور نتائج کے لحاظ سے بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ بدر میں بھی تعداد کے لحاظ سے مسلمان دشمنوں کے مقابلے میں بہت کم تھے لیکن فتح یاب ہوئے۔ اسلام کا دینی اور سیاسی تشخص ابھر کر سارے عرب کے سامنے آگیا اور عرب کی حدود سے پرے بھی روم و ایران کی عظیم سلطنتیں اس نئی ابھرتی ہوئی طاقت کا نوٹس لینے پر مجبور ہوگئیں۔ دنیا کی تاریخ ایک نئے موڑ پر آگئی۔ اس طرح مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کے وقت بھی مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلے میں برائے نام تھی لیکن وہ اللہ کی تائید و نصرت پر بھروسہ کرکے لڑے اور دشمنوں پر غالب آئے۔ اسلام کافی حد تک بحران اور خطرے سے نکل گیا اور اسلامی ریاست کی بنیادیں از سر نو مستحکم ہوگئیں۔ مرتدین اور مدعیان نبوت کے خلاف فیصلہ کن جنگوں کے لئے مسلمانوں کے عزم و ہمت میں مزید استواری آگئی اور مذبذب قبائل جو مانعین زکوٰۃ کی کوششوں کی طرف آنکھیں لگائے بیٹھے تھے، پھر سے اسلام پر قائم ہوگئے۔

ورنہ آغاز میں تو یہ عالم تھا کہ مدینہ چاروں طرف سے دشمنوں میں ایسے ہی گھر گیا تھا جیسے بتیس دانتوں میں زبان، مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک روایت میں اس زمانہ کے مسلمانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اس وقت مسلمانوں کی حالت بکریوں کے اس ریوڑ کی سی تھی جو سرد اور طوفانی رات میں کسی چرواہے کے بغیر ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم ایسے مقام پر کھڑے تھے کہ اگر اللہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعے ہماری مدد نہ کرتا تو ہماری ہلاکت یقینی تھی۔ ہم سب مسلمانوں کا بالاتفاق یہ خیال تھا کہ ہم زکوٰۃ کے اونٹوں کی خاطر دوسروں سے جنگ نہ کریں گے اور اللہ کی عبادت میں مصروف ہو جائیں گے یہاں تک کہ ہمیں کاملاً غلبہ حاصل ہو جائے۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ سے لڑنے کا عزم کرلیا۔ انہوں نے منکرین کے سامنے دو باتیں پیش کیں۔ پہلی یہ کہ وہ اپنے لئے ذلت و خواری قبول کریں اور اگر یہ منظور نہیں تو جلاوطنی یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔ اپنے لئے ذلت و خواری قبول کرنے کا یہ مطلب تھا کہ وہ اقرار کریں کہ ان کے مقتول دوزخی اور ہمارے مقتول جنتی ہیں۔ وہ ہمارے مقتولوں کا خون بہا ادا کریں۔ ہم نے ان سے جو مالِ غنیمت حاصل کیا ہے اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کریں۔ لیکن جو مال انہوں نے ہم سے لیا ہے وہ ہمیں واپس کردیں۔ جلاوطنی کی سزا بھگتنے کا یہ

[1] تاریخ ابن خلدون۔ جلد دوم کا اردو ترجمہ۔ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی

مطلب ہے کہ وہ شکست کھانے کے بعد اپنے علاقوں سے نکل جائیں اور دور دراز مقامات میں جا کر زندگی بسر کریں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے استقلال و عزیمت کو دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ ''اکیلے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان ہم سب کے ایمان پر بھاری ہے۔'' وہ یقین محکم اور عمل پیہم سے کامیاب ہوئے۔

مرتدین کا انسداد

منکرین زکوٰۃ کے فوری خطرے سے نپٹنے کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی توجہ ان مرتد قبائل کی طرف مبذول کی جو کھلم کھلا حلقۂ اسلام سے نکل کر جاہلیت کی طرف لوٹ گئے تھے۔ اور اسلام کے خلاف کفر وشرک پھر سے رائج ہو جائے۔ جھوٹے مدعیان نبوت کو بھی ان میں سے اپنے حامی اور رنگروٹ مل رہے تھے ابوبکر نے ان کے مکمل استیصال کا تہیہ کر لیا تھا۔ ان کی زندگی کا مقصد وحید حق کا استقرار اور باطل کا قلع قمع تھا۔

اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر کچھ دن آرام کرنے کے بعد مرتدین کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس اثناء میں ان مختلف قبائل سے بھی امدادی دستے پہنچنے شروع ہو گئے جو اسلام پر ثابت قدم رہے تھے۔ مکہ اور طائف کے مسلمان بھی خاصی جمعیت میں مدینہ پہنچ گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لشکر مجاہدین کو ذی القصہ میں جمع کیا اور سارے لشکر کو گیارہ دستوں میں تقسیم کر کے ہر دستے پر خوب دیکھ بھال کر کے ایک ایک امیر مقرر کیا اور ان کی فوجی کارروائیوں کے لئے علاقے بھی مخصوص کر دیئے۔ ہر امیر کو مفصل ہدایات دیں کہ دشمن کے خلاف کیسے اقدام کرے اور اپنی مہم کو سرانجام دے چکنے کے بعد دوسرے امرائے لشکر سے کیسے تعاون کرے۔ انہیں یہ بھی حکم دیا کہ اپنے اپنے رستے کے مسلمان قبائل کو بھی اپنے ساتھ لے لیں۔ ہر کمانڈر کو تاکید تھی کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے مرتدین کو دوبارہ قبول اسلام کی دعوت دے۔ اگر وہ قبول کر لیں تو ان سے تعرض نہ کیا جائے۔ اس کی علامت کے طور پر یہ طے پایا کہ اسلامی لشکر مرتدین کے قریب پہنچ کر اذان دے۔ اگر وہ اذان کا جواب مرتدین بھی اذان سے دیں تو انہیں مسلمان سمجھا جائے اور ان سے زکوٰۃ وصول کر کے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ بصورت دیگر انہیں ان کے ارتداد کے نتائج سے اچھی طرح آگاہ کیا جائے۔ اگر وہ ارتداد پر اڑے رہیں تو ان سے فیصلہ کن جنگ کی جائے۔

منکرین زکوٰۃ کے معاملہ کی اہمیت اور نزاکت کو بعض مذبذب مسلمانوں کے ذہن نشین کرنے کے لئے بنی عبس اور بنی ذبیان کے مقابلہ کے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خود گئے۔ بنی تمیم کی شاخ یربوع کے سردار مالک بن نویرہ اور دوسرے منکرین زکوٰۃ کی تادیب کے لئے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ انہوں نے سختی سے کام لیا۔ منکرین زکوٰۃ سیدھی راہ پر آ گئے اور زکوٰۃ ادا کر دی۔ بعض قبائل ایسے بھی تھے جو زکوٰۃ کا مال لے کر خود مدینہ حاضر ہو گئے۔

جھوٹے مدعیان نبوت اور مرتدین کا خاتمہ

جھوٹے مدعیان نبوت دراصل حکومت وسیادت کے خواہاں تھے، نبوت کا دعویٰ ایک بہانہ تھا۔ ان کے ساتھ منکرین زکوٰۃ کے بعض شکست خوردہ عناصر اور عام مرتدین بھی مل گئے تھے۔

۱-اسود عنسی

یمن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس کے آخری ایام میں اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور ارد گرد کے مرتد قبائل کو اپنا ہم نوا بنا کر بہت طاقت پکڑ گیا تھا۔ وہ مسلمان عامل کو نکال کر یمن کے دارالحکومت صنعا پر قابض ہو گیا۔ بالآخر وہ ایک ایرانی النسل مخلص مسلمان فیروز کے ہاتھوں قتل ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فیروز کو وہاں کا عامل مقرر کر دیا۔ حضرت مہاجر بن امیہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ مدینہ سے فوجیں لے کر پہنچ گئے اور مرتد قبائل کو شکست دے کر ان کے سرداروں عمرو بن معدیکرب اور قیس بن مکشوح کو گرفتار کر لیا اور انہیں مدینہ بھیج دیا۔ وہ اپنے ارتداد اور بغاوت پر پشیمان اور تائب ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں معاف کر دیا۔ انہوں نے بعد میں عراق اور ایران کی جنگوں میں شجاعانہ کارنامے دکھائے۔

۲-طلیحہ بن خویلد اسدی

یہ مدینہ کے شمال میں بنو اسد کا جھوٹا مدعی نبوت تھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک خونریز جنگ کے بعد اسے شکست دی اور وہ شام کی طرف بھاگ گیا۔ اس کا قبیلہ بنی اسد اور دوسرے مرتد قبائل بنی عبس، بنی ذبیان، بنی فزارہ وغیرہ جو اس کے حلیف تھے، دوبارہ مسلمان ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد طلیحہ بھی اپنے قبیلے میں واپس آ کر مسلمان ہو گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سے تعرض نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عراق کی مہمات خاص کر جنگ قادسیہ میں اس نے مسلمانوں کی طرف سے بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس کا حلیف بنی فزارہ کا سردار عینیہ بھی گرفتار کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے لایا گیا۔ انہوں نے اس کا اسلام قبول کر کے اسے بھی معاف کر دیا۔

۳-سجاح

یہ جھوٹی مدعیہ نبوت مالک بن نویرہ کے قبیلہ یربوع میں سے تھی لیکن اپنے خاندان کے ہمراہ عراق کے عیسائی قبیلہ بنی تغلب میں پلی بڑھی تھی۔ غالباً حسین اور ذہین تھی اور ایرانی حکومت کی سازشی پالیسی بھی اس کی پشت پر تھی۔ وہ اپنی نبوت اور سیادت کا کاروبار چمکانے کے لئے بنی یربوع میں واپس آئی۔ بنی تغلب اور بعض دوسرے عراقی قبائل کا ایک لشکر اس کے ساتھ تھا۔ مالک بن نویرہ اس کا حامی بن گیا۔ لیکن جب مالک بن نویرہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مارا گیا تو سجاح وہاں سے بھاگ کر یمامہ میں مسیلمہ کذاب سے جا ملی اور دونوں نے آپس میں نکاح کر کے رشتہ اتحاد کو مستحکم کر لیا۔ پھر جب مسیلمہ کو بھی شکست ہوئی اور وہ مارا گیا تو سجاح عراق واپس چلی گئی اور اپنے قبیلہ میں خاموش زندگی گزارنے لگی۔ بعد میں مسلمان ہو کر مری۔

۴-مسیلمہ کذاب

مدینہ سے قدرے جنوب مشرق کو یمامہ (نجد) کے علاقہ میں بنی بکر کی ایک طاقتور شاخ بنی حنیفہ آباد تھی۔ یہ لوگ ۹ ھ میں عام الوفود میں مسلمان ہوئے تھے۔ اس قبیلہ کے ایک کم رو اور حقیر سی شخصیت کے مالک آدمی مسیلمہ نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا۔ قبائلی عصبیت کی بناء پر بنی حنیفہ کے چالیس ہزار جنگ جو اس کے گرد جمع ہو گئے اور جب

سجاح نے اس سے نکاح کرلیا تو اس کی فوج بھی مسیلمہ کے ساتھ ہوگئی۔ منکرین زکوٰۃ، مرتدین اور مدعیان نبوت میں مسیلمہ کی پوزیشن سب سے زیادہ مضبوط تھی اور وہ اسلام کے لئے سب سے بڑا چیلنج بن گیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شرجیل بن حسنہ اور عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ کو مسیلمہ سے نپٹنے کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن وہ متحد ہو کر لڑنے کی بجائے مسیلمہ سے الگ الگ لڑے اور دونوں کو ہزیمت ہوئی۔ مسیلمہ کی سرکوبی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قسمت میں لکھی۔

اسلامی اور مسیلمی فوجوں کی مڈبھیڑ عقربا کے مقام پر ہوئی۔ یرموک اور قادسیہ کی جنگوں سے پہلے یہ شدید ترین اور خونریز ترین جنگ تھی بلکہ طبری کے بقول ''اس سے سخت تر جنگ کبھی مسلمانوں کو نہیں لڑنا پڑی۔ ایک لحاظ سے یہ جنگ سارے عرب کے لئے فیصلہ کن تھی۔ یمن، عمان، بحرین، حضرموت، مہرہ وغیرہ کے مرتدین کی نگاہیں ادھر لگی ہوئی تھیں اور ایرانیوں کو بھی اس کے نتیجے کا انتظار تھا کہ اسلام غالب آتا ہے یا جاہلیت۔ مسیلمہ کی فوج بڑے جوش و خروش سے لڑی۔ لیکن بالآخر مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور عزم و استقلال کے سامنے اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مسیلمہ اور اس کی فوج قریبی باغ میں گھس گئے جس کے گرد اونچی چار دیواری تھی۔ لیکن ایک جانباز مسلمان نے دیوار سے کود کر لڑتے بھڑتے پھاٹک کھول دیا پھر مجاہدین نے باغ کے اندر گھس کر بنی حنیفہ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ مسیلمہ کذاب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری کے ہاتھوں اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

اس جنگ میں دس ہزار مرتدین مارے گئے اور تقریباً بارہ سو مسلمان شہید ہوئے۔ اس سے پہلے کسی جنگ میں مسلمانوں کا اس قدر جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس باغ کو تاریخی حالوں میں ''حدیقۃ الموت'' (موت کا باغ) کہا جاتا ہے۔ مسیلمہ کی شکست سے دوسرے مرتدین کی بھی سخت حوصلہ شکنی ہوئی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ دوسرے فوجی سالاروں نے حضرموت، کندہ، بحرین، عمان اور مہرہ میں مرتدین سے خونریز جنگوں کے بعد فتنۂ ارتداد کا خاتمہ کردیا۔ مکہ اور طائف کے دیہاتیوں اور بدوؤں نے بھی اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا تھا۔ اگرچہ شہری آبادی ارتداد سے محفوظ رہی تھی ان دیہاتیوں اور بدوؤں نے لوٹ مار کا بازار گرم کردیا تھا۔ نجران اور تہامہ میں بھی یہی کیفیت ہوئی۔ دوسرے مرتدین کی جنگوں سے فراغت کے بعد ان لٹیروں کی بھی سرکوبی کر کے مکمل امن وامان اور غلبۂ اسلام قائم کردیا گیا۔ ارتداد کے اکثر سرغنوں نے توبہ کی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں معاف کردیا۔ بنی قضاعہ اور بنی سلیم کی شورش ارتداد بھی ختم کردی گئی اور سارا عرب شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک گھٹنا بندھے ہوئے اونٹ کی طرح خاموش بیٹھ گیا۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد روم وایران کی عظیم وقدیم سلطنتوں سے جنگوں کا آغاز ہوگیا جن کے لئے ہر ممکن فوجی قوت درکار تھی۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارتداد کے مرتکب ہو کر تائب ہونے والے قبائل کو استعمال نہیں کیا۔ عہد فاروقی میں انہیں شمولیت کی اجازت دی گئی۔

ارتداد و بغاوت کا خاتمہ (ایک جائزہ)

ہم نے فتنۂ ارتداد کے واقعات کی تفصیل میں جانے سے گریز کیا ہے ورنہ یہ موضوع خود ایک مفصل کتاب کا مقتضی ہے۔ تاہم قاری نے محسوس کیا ہوگا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دس لاکھ سے زائد مربع میل پر پھیلے ہوئے وسیع و عریض ملک کے دور دراز اور دشوار گزار علاقوں مین کثیر التعداد دشمنوں کی سرکوبی کا کار صعب و عظیم درپیش تھا۔ جب کہ دشمنوں کے مقابلے میں ان کے وسائل بہت محدود تھے۔ لیکن انہیں اسلام کی حقانیت اور اللہ کی تائید و نصرت پر یقین کامل تھا۔ انہوں نے اپنی قلیل التعداد اور بے سروسامان فوجوں کو بے دھڑک سارے عرب کے مقابلے میں جھونک دیا اور ان کے ایمان محکم، استقامت عزیمت، بصیرت، دور اندیشی اور تدبر کے سامنے تمام مخالف قوتیں پسپا ہو گئیں۔ کفر و ارتداد کی آندھیاں تھم گئیں۔ اور تمام مہمات کامیابی سے مطلوبہ انجام کو پہنچ گئیں۔ نو مہینے کے مختصر عرصے میں مدینہ کے مضافات سے لے کر یمن، حضر موت، عمان، بحرین، یمامہ، تہامہ تک کے تمام متاثرہ علاقے اور قبائل از سر نو اسلام کی آغوش میں آ گئے اور چاروں طرف امن و امان اور غلبۂ اسلام قائم ہو گیا۔ اللہ نے اپنے دین کو سر بلند کر دیا اور کفر و شرک و ارتداد کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ شیطان اس سرزمین سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو گیا۔ انقلاب فرانس کا ہیرو نپولین بونا پارٹ کہا کرتا تھا کہ خدا ہمیشہ بڑی بڑی فوجوں کا ساتھ دیتا ہے لیکن اگر اس نے صدیق رضی اللہ عنہ اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تو مرتدین کی طرح وہ بھی اپنی اس رائے سے رجوع کر لیتا اور مان لیتا کہ خدا ہمیشہ محکم ایمان و عزیمت والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جس حیرت انگیز قوت فیصلہ، اصابت رائے، عسکری بصیرت اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا، تاریخ میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے۔ بقول اقبال؎

بخود گزیده و محکم چو کوہساران زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

ایک مغربی مصنف نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اس لئے احترام کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے پیروؤں میں ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسے انسان پیدا کر دیئے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ہوں یا عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ ہوں یا علی رضی اللہ عنہ، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہوں یا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہوں یا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، اگر انہیں تربیت گاہ محمدی نصیب نہ ہوئی ہوتی تو یہ اور دوسرے نامور صحابہ مکہ یا مدینہ کے معمولی قبائلی سردار، تاجر یا لیڈر ہوتے، دنیا کی تاریخ میں انہیں کوئی مقام حاصل نہ ہوتا۔ اگر ابو بکر رضی اللہ عنہ فتنۂ ارتداد کے استیصال کے سوا اور کچھ بھی نہ کرتے، تو بھی تاریخ میں وہ ایک عظیم اور غیر فانی انسانیت کی حیثیت سے یاد رکھے جاتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعلیم دی اور اسلام کی بنیاد پر قبائلیت زدہ عرب میں وحدت و یک رنگی پیدا کی اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا سبق دے کر سب کو اخوت اسلامی کے رشتے میں پرو دیا۔ گورے، کالے، عجمی، عربی کا امتیاز ختم کیا لیکن عرب کے شعوب و قبائل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے فوراً بعد اخوت اسلامی، عدل و مساوات اور صلاح و تقویٰ کے اس پیغام

کے خلاف اٹھ کھڑے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پیغام بہت کم لوگوں کو یاد رہے گا۔ ایک دلکش خواب تھا جو تھوڑی مدت کے لئے اہل عرب نے دیکھا پھر وہ ''بیدار'' ہو کر اپنی جاہلیت کی طرف لوٹ گئے اور اسلام کی بیخ کنی پر تل گئے۔ لیکن اللہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے نحیف جسم میں آباد روح کو یقین و ایمان اور عزم و استقلال کی کوہ شکن قوتوں سے معمور کر دیا۔ اور وہ خود اپنے ساتھیوں کے شکوک، بیدلی اور مصالحت پسندی کے باوجود سارے عرب سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے اور اپنے عزم آہنی سے تمام مشکلات پر قابو پا لیا۔ ولیم میور نے درست لکھا ہے کہ ''ان (ابو بکر رضی اللہ عنہ) کی کامیابی کا راز محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کامل ایمان اور ان صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں تھا'' اور ''اگر چہ ان کا عہد خلافت مختصر تھا لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ان (ابو بکر) سے بڑھ کر اسلام کسی دوسرے شخص کا ممنون نہیں۔'' اگر آج بھی ہم میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کا سا ایمان محکم پیدا ہو جائے تو ہم اپنی کھوئی ہوئی شوکت اور غلبۂ رفتہ کو پھر حاصل کر سکتے ہیں۔ اسلام باطل کی قوتوں سے سمجھوتے کا قائل نہیں۔

جنگ ہائے ارتداد نے نئے سرے سے مسلمانوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا۔ اگر چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی ہمسایہ سلطنتوں کے حکمرانوں کو خطوط کے ذریعے اسلام کی دعوت دی تھی لیکن حبشہ (موجود ایتھوپیا) کے شاہ نجاشی کے سوا کوئی مسلمان نہ ہوا۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ روم ہرقل اور والئ مصر مقوقس اسلام کی صداقت کے دل سے قائل ہو گئے تھے لیکن دنیاوی حرص و ہوا اور سیاسی اغراض و مصالح نے انہیں اسلام قبول کرنے سے باز رکھا۔ اسلام ایک عالمگیر دین کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا۔ اس کا پیغام ابدی اور مشرق و مغرب، اسود و احمر سب کے لئے تھا۔ دنیا کی فلاح اور سلامتی اس میں مضمر تھی۔ فتنۂ ارتداد سے فارغ ہو کر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہادی و آقا کے مشن کے اس عالمی پہلو کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ قدرت خود بخود اس کے لئے حالات اور مواقع پیدا کرتی گئی۔ ایرانی اور بازنطینی سلطنتوں سے جو آویزش شروع ہوئی وہ خود ان سلطنتوں کی پیدا کردہ تھی۔ انہوں نے مرتدین، منکرین زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت کی حوصلہ افزائی کی تھی اور ایسے اقدامات کئے تھے جن سے صرف نظر کرنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لئے ممکن نہ تھا۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ فطرتاً نرم خو اور صلح جو انسان تھے۔ لیکن اسلام کے معاملے میں پہاڑوں سے ٹکرا جانے اور طوفان سے لڑ جانے والے۔ انہوں نے اسامہ رضی اللہ عنہ کا قلیل التعداد لشکر غسانیوں اور دیگر شمالی قبائل کی تادیب کے لئے بھیجا حالانکہ بہت نازک وقت تھا اور صحابہ کی ایک بڑی تعداد اس کے حق میں نہ تھی۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جری، مخلص اور آزمودہ انسان کو یہ کہہ کر ڈانٹ دیا کہ ''تیری ماں تجھے روئے! یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مہم کا حکم دیا ہو، میں اسے روک دوں؟ ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں ہو سکتی۔ اگر مدینہ میں میرے سوا کوئی نہ رہے اور جنگل کے بھیڑیئے آ کر میری ٹانگیں نوچیں تو بھی اسامہ کا لشکر ضرور جائے گا۔'' اسی طرح جب منکرین زکوٰۃ سے جنگ نہ کرنے کا مشورہ حالات کی مصلحت کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے غصے میں آ کر ان کی داڑھی پکڑ لی اور فرمایا ''اے عمر! جاہلیت میں تو بہت بہادر تھا، کیا اسلام نے تجھے بزدل بنا دیا ہے؟'' غرضیکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو ہر صورت میں پورا کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے

ہر خطرہ انگیز کرنے پر تیار تھے۔ انہیں اپنی ذاتی قوت وشوکت میں اضافہ اور اپنی انا کی تسکین مطلوب نہ تھی۔ اسلام کی حفاظت اور اشاعت ان کا مطمح نظر تھا۔ تلوار کے زور سے حفاظت اور حسن کردار وگفتار کے بل پر اشاعت، انہوں نے اسامہ رضی اللہ عنہ کی فوج کی روانگی اور منکرین زکوٰۃ اور مرتدین کے خلاف فوجیں بھیجتے وقت جو ہدایات سالاران فوج کو دی تھیں وہ اس پر شاہد ہیں۔ جنگ اور صلح کے معاملات میں اسلامی اخلاق اور اصولوں کو مدنظر رکھا گیا۔ بازنطینی، ایرانی اور دوسرے مطلق العنان حکمرانوں کی طرح ملک گیری اور لوٹ کھسوٹ کے لئے، مالِ غنیمت اور کشور کشائی کے لئے نہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خونریزی کی نہ ان کے جانشینوں نے۔ انہوں نے دفاعی کارروائیاں کیں۔ خواہ مخواہ کی جارحیت ان کے مقاصد سے دور تھی۔ انجیل میں ہے کہ اگر کوئی تیرے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دے۔ لیکن عیسائیوں نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا۔ قرآن نے قصاص کی اجازت دی اور فتنہ وفساد کو قتل سے بدتر (اشد من القتل) قرار دیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کی فوجوں نے اسے ہمیشہ مدنظر رکھا اور فتنہ کے استیصال کے بعد حتی الوسع عفو ودرگزر سے کام لیا۔ فتنہ وفساد کے بڑے بڑے سرغنوں نے بھی جب پشیمانی کا اظہار کر کے معافی چاہی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہ صرف انہیں معاف کر دیا بلکہ اسلام اور اسلامی معاشرے کی خاطر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے انہیں مواقع فراہم کئے۔ طلیحہ اسدی، عیینہ بن حصن فزاری، قرہ بن ہبیرہ، ابوشجرہ، قیس بن مکشوح، عمرو بن معدیکرب، علقمہ بن علاثہ، اشعث بن قیس وغیرہ جو فتنہ ارتداد کی روح رواں تھے سبھی معاف کر دیئے گئے۔ صرف ایک شخص فجاہ بن ایاس کو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آگ میں جلا دیئے جانے کی سزا دی۔ یہ وہ شخص تھا کہ فتنہ کے ایام میں یہ کہہ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بہت سے ہتھیار اور جنگی ساز وسامان لے گیا تھا کہ مرتدین کے خلاف لڑے گا اور ان کا استیصال کرے گا لیکن بدعہدی اور غداری کا مرتکب ہوا اور مسلمانوں ہی کے خلاف قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ بہت سے مسلمان اس کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جب گرفتار ہو کر آیا تو دوسروں کی عبرت کے لئے زندہ جلا دیا گیا۔ بعد میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو افسوس ہوا کہ زندہ جلانے کی بجائے مسلمانوں کے قصاص میں اسے تلوار سے کیوں نہ قتل کیا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مزاج میں سختی ونرمی کا حسین امتزاج تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ وہ رحمت للعالمین تھے لیکن دین کے معاملے میں نرمی یا رورعایت سے کام نہیں لیتے تھے۔ عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کیا اور جھنجھلا کر اور مشتعل ہو کر منکرین زکوٰۃ اور مرتدین کو اپنے ذاتی غیظ وغضب کا نشانہ نہیں بنایا۔ ان میں سے جو لوگ تائب ہو کر دوبارہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے انہیں معاف کر دیا بلکہ اشعث بن قیس کندی سے تو اپنی ہمشیرہ کا نکاح بھی کر دیا...... ان کی اس پالیسی کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ شرک وارتداد کی ہمیشہ کے لئے جڑ بنیاد کٹ گئی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان نازک اور صبر آزما حالات میں گہری قوی بصیرت کا بھی مظاہرہ کیا۔ انہوں نے تمام اکابر اور آزمودہ کار صحابہ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس مدینہ ہی میں صلاح

مشورہ کے لئے رکھا حالانکہ یہ صحابہ خاص کر حضرت علی، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ غزوات نبوی میں شجاعت، جاں نثاری اور عزم واستقلال کے بے مثال مظاہرے کر چکے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی مدینہ میں موجودگی کو ضروری سمجھا اور ان کی جگہ نئے اور متبادل فوجی سالار مثلاً حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ، شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ، خالد بن سعید رضی اللہ عنہ، مہاجر بن امیہ رضی اللہ عنہ، علاء حضرمی رضی اللہ عنہ وغیرہ ڈھونڈ لئے اور وہ ان کی توقعات پر پورے اترے۔ بعد میں روم وایران کی جنگوں میں بھی انہوں نے اہم کارنامے سرانجام دیئے۔ اور عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ وغیرہ ہم بزرگ صحابہ خلیفہ کی مجلس مشاورت کے رکن بن کر مدینہ میں رہے۔

حج

مرتدین کے خلاف مہم کے دوران میں حج کا زمانہ آ گیا۔ چونکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دشمنانِ اسلام کے خلاف مہم کی رہنمائی اور نگرانی میں بے حد مصروف تھے۔ اس لئے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر مکہ بھیجا۔ ان کی قیادت میں مسلمانوں نے حج کیا۔ اگلے سال خود امیر الحج بن کر مکہ تشریف لے گئے۔ یہ اپنے عہد خلافت میں ان کا پہلا اور آخری حج تھا۔ مکہ میں اپنے والد حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ سے ملنے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ نابینا تھے اور اپنے گھر کے باہر بیٹھے تھے۔ لوگوں نے انہیں بتایا کہ آپ کے بیٹے خلیفۂ وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے ہیں۔ وہ کھڑے ہونے لگے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کھڑی اونٹنی سے ہی جلدی سے اتر پائے۔ تاکہ والد کو زحمت نہ ہو اور والد ان کے احترام میں کھڑے ہونے کی بجائے وہ خود آدابِ فرزندی بجا لائیں۔ چنانچہ اونٹنی سے اتر کر باپ سے بغل گیر ہوئے اور خیر و عافیت دریافت کی اور ان کی باتیں بڑی توجہ اور احترام سے سنیں۔ سابق رؤسائے مکہ موجودہ طلقائے مکہ یعنی مکہ کے وہ سربرآوردہ لوگ جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے، باپ بیٹے کی ملاقات کے وقت موجود تھے، ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے ان سے حسن سلوک سے پیش آنے اور انہیں مشوروں میں شامل کرنے کے لئے کہا لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ طرح دے گئے کیونکہ اسلام میں اس قسم کے ترجیحی سلوک کی گنجائش نہیں اور عزت واکرام کا معیار تقویٰ ہے نہ کہ دولت وریاست۔ لوگوں نے احتراماً صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کیا تو انہوں نے منع کر دیا اور فرمایا کہ آپ لوگ اپنا اپنا کام کریں۔

فتح مکہ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے حج کا امیر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بنا کر بھیجا تھا اور اگلے سال خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور سربراہی میں سوا لاکھ مسلمانوں نے فریضہ حج ادا کیا تھا جو اسلام کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا اور آخری حج تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد کا پہلا امیر الحج حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا جو ان کے بعد خلیفہ ہوئے۔ دوسرے حج پر خود تشریف لے گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے حجوں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد کے حجوں میں یہ عجیب معنی خیز مماثلت ہے۔

روم و ایران سے آویزش

عساکر اسلامی جزیرۃ العرب سے باہر کا رخ کرتے ہیں

اقبال کا ایک عبرت انگیز شعر ہے۔

کوئی تقدیر کی حکمت سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکان عثمانی سے کم ترکان تیموری!

جنوبی ایشیا (برصغیر پاک و ہند) کے تاریخی دور میں ترکان تیموری (جنہیں غلطی سے مغل کہا جاتا ہے) کی سلطنت وسعت و قوت اور عظمت و شوکت کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی۔ یورپی طاقتیں انہیں مغل اعظم (The Grand Mughal) کہہ کر پکارتی تھیں۔ یہ مملکت شمال میں بلخ، بخارا، کابل سے لے کر جنوب میں کرناٹک اور شرقاً غرباً بنگال سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر مغربی ایشیا میں عثمانی ترکوں کی سلطنت تھی جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) تھا، وہ قسطنطنیہ جسے رسولِ مقبول ﷺ کی پیشین گوئی کا مصداق بننے کے لئے عثمانی ترک سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں آخری بازنطینی شہنشاہ کو شکست دے کر عالم اسلام کا حصہ بنایا تھا۔

اپنے عروج کے زمانے میں سلطنت عثمانیہ عراق و عرب سے لے کر وسطی یورپ، مصر اور شمالی افریقہ تک وسیع تھی اور سلاطین یورپ اس کے نام سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ انہیں مسلمانوں کے خلیفہ کا لقب بھی حاصل ہو گیا تھا۔ پھر انحطاط کا دور آیا تو یورپی سلطنتیں اسے یورپ کا "مرد بیمار" کہنے لگیں لیکن اس مرد بیمار کو ختم نہ کر سکیں۔ ہندوستان کے ترک یا مغل سلاطین اپنے آپ کو عثمانی سلاطین کا ہمسر بلکہ ان سے برتر سمجھتے تھے کیونکہ ان کے مورث اعلیٰ تمور لنگ نے عثمانی سلطان بایزید یلدرم کو شکست دے کر گرفتار کر لیا تھا۔[1]

اس لئے دہلی کے ترک یا مغل سلاطین نے قسطنطنیہ کے عثمانیوں کی خلافت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں جنوبی ایشیا (برصغیر پاکستان و ہند) میں ترکان تیموری کی حکومت کا چراغ انگریزوں کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔[2] انگریزوں اور ان کے اتحادیوں نے پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴ء) میں سلطنت عثمانیہ پر بھی آخری وار کیا۔ ترکیہ خلافت و سلطنت بے شک ختم ہو گئی لیکن انگریزوں نے درّہ دانیال، گیلی پولی اور شط العرب میں ترکوں کے ہاتھوں جو ذلت آمیز شکستیں کھائیں وہ انہیں یاد رہیں گی۔ بہر حال وسیع سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر کے انگریزوں اور ان کے اتحادیوں نے آپس میں بانٹ لئے لیکن وہ اپنی ہزار کوششوں اور سازشوں

---

[1] یہ بھی تاریخ اسلام کا ایک اندوہناک باب ہے۔ بایزید یلدرم نے آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کا محاصرہ کر رکھا تھا کہ تیمور نے پیچھے سے اس کی سلطنت پر حملہ کر دیا اور اسے ویانا کا محاصرہ اٹھا کر تیمور کے مقابلے کے لئے آنا پڑا۔ اس طرح یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کی پیش رفت رک گئی۔ مؤلف

[2] یہ بھی ایک دردناک داستان ہے۔ جس میں انگریزوں کے پٹھو کتنے ہی جعفروں اور صادقوں نے کردار ادا کیا۔ اگرچہ اورنگ زیب کے بعد آنے والے مغل سلاطین بھی مورد الزام تھے۔ مولف

کے باوجود ترکانِ عثمانی کو ختم نہ کر سکے۔ سلطنت عثمانیہ کی راکھ سے ققنس کی مانند جدید ترکی دنیا کے صفحہ پر ابھرا۔

کچھ ایسی ہی کیفیت سلطنت عثمانیہ کی پیش رو بازنطینی (مشرقی رومی سلطنت) اور ایرانی سلطنتوں کی دکھائی دیتی ہے۔ اسلام سے پہلے یہ دونوں دنیا کی عظیم ترین اور طاقتور ترین سلطنتیں تھیں اور معلومہ دنیا کے اکثر ممالک ان کے زیرِ نگین تھے۔ ان دونوں میں ہمیشہ خونریز جنگیں ہوتی رہیں۔ جو خالصتاً ملک گیری کے لئے تھیں۔ کبھی ایک کا پلہ بھاری ہو جاتا کبھی دوسری کا۔ رومی مذہباً عیسائی تھے اور ایرانی مجوسی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام مکہ کے پر آشوب تبلیغی زمانے میں ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز نے مشرقی رومی سلطنت (بزنطہ) کو بری طرح شکست دی تھی اور رومیوں کو رگیدتا ہوا مصر تک پہنچ گیا تھا۔ وہ یروشلم سے وہ تاریخی صلیب بھی لے گیا جس پر عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی تھی۔ رومیوں کی اس شکست پر مشرکین مکہ نے خوب بغلیں بجائی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو طعنے دیئے تھے کہ خدا کے ماننے والوں نے آتش پرست ایرانیوں سے شکست کھائی۔ خدا کہاں تھا کہ اس نے اپنے ماننے والوں کی مدد نہ کی؟ مشرکین مکہ نے اس شکست و فتح کو اپنی اور مسلمانوں کی کشمکش پر منطبق کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ رومیوں کی طرح مسلمان بھی مشرکین کے ہاتھوں مغلوب ہوں گے۔ اس پر سورۂ روم نازل ہوئی اور اللہ نے اگلے چند سالوں (بضع سنین) میں رومیوں کی فتح کی بشارت سنا کر مسلمانوں کے حوصلے بلند کئے اور انہیں تسلی دی کہ جب رومی غالب آئیں گے تو مسلمان اس وقت دوہری خوشی منائیں گے۔[1]

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کے بعد بڑے اعتماد کے ساتھ مکہ کے ایک کافر ابی بن خلف سے شرط بدی کہ رومیوں کو شکست ہوئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ سو اونٹ اسے دیں گے اور اگر رومی فتح یاب ہوئے تو وہ ابوبکر کو سو اونٹ دے گا۔ چند ہی سال بعد رومی شہنشاہ ہرقل نے ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز کو ذلت آمیز اور عبرت ناک شکست دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شرط بدلنے والے مکی مشرک سے اونٹ وصول کر لئے۔ رومیوں کی فتح ایرانیوں کی شکست اور اسی سلسلے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا شرط جیتنا بڑی معنویت رکھتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ ایرانیوں کے مقابلے میں رومی اور کفار مکہ کے مقابلے میں مسلمان حق پر ہیں اور حق کامیاب ہو کر رہے گا۔ دونوں قدیم سلطنتیں ایک دوسرے کی حریف اور مد مقابل چلی آتی تھیں۔ ان کے زور و قوت میں انیس بیس کا فرق تھا۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب مسلمانوں سے ان دونوں سلطنتوں کی آویزش شروع ہوئی تو خدا کی نام لیوا (تثلیث پرست مگر بہر حال خدا کو ماننے والی) رومی سلطنت تو شام، فلسطین اور مصر کی قربانی دے کر بچ گئی اور مزید چند صدیوں تک باقی رہی لیکن ایران کی آتش پرست سلطنت کا نام و نشان تک مٹ گیا۔[2]

۱- دوہری خوشی یوں کہ جب رومیوں کی فتح کی خبر آئی تو اس وقت مسلمان غزوۂ بدر میں مشرکین مکہ کے خلاف فتح یاب ہوئے تھے۔ خوشی دوبالا ہوگئی۔ مولف

۲- موجودہ دور کی دو سپر پاورز میں کچھ ایسا ہی تقابل پایا جاتا ہے۔ دیکھئے تیسرا صدیقی عنصر کب ابھرتا اور سرگرم عمل ہوتا ہے۔ گنبد نیلوفری فرنگ بدلتا ہے کیا! مؤلف

یہ امر بھی معنی خیز ہے کہ بازنطینی شہنشاہ ہرقل اور ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز دونوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام قبول کرنے کے دعوتی خط لکھے تھے۔ ہرقل نے تعظیم کی اور چند تحائف بھیجے۔ اس موقع پر ابوسفیان بن حرب سے اس کا جو مکالمہ ہوا وہ تاریخوں میں ملتا ہے۔ مؤرخوں کا بھی یہ خیال ہے کہ وہ اسلام کی حقانیت کا قائل ہو گیا تھا۔ لیکن اپنے امراء سلطنت اور پادریوں کے دباؤ سے اسلام لانے سے باز رہا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ ایک نبی آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ بہرحال اگر یہ وہی نبی ہے تو اس کا دین اور اس کے پیرو قسطنطنیہ تک پہنچیں گے۔ اس کے برعکس ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز نے بڑی رعونت اور حقارت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا تھا اور بڑے غرور و تکبر سے کہا تھا کہ میری رعایا ہو کر مجھے ایسا خط لکھتا ہے! صرف یہی نہیں بلکہ یمن کے ایرانی گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ مدینہ کے مدعیٔ رسالت کو گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیج دو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب یمن کے گورنر کے آدمی پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ اپنے گورنر سے کہہ دو کہ خسرو پرویز تو قتل ہو گیا۔ تم ایمان لاؤ تو فلاح پاؤ گے۔ باذان نے اپنے آدمی دارالحکومت بھیج کر تصدیق کرائی اور مسلمان ہو گیا۔ کیونکہ مدینہ میں بیٹھ کر ایک نبی ہی سینکڑوں میل دور ایران کے دارالحکومت مدائن کے واقعہ کی خبر آناً فاناً دے سکتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یمن کا گورنر رہنے دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شہر براز گورنر ہوا۔ پھر فیروز ایرانی جس نے جھوٹے مدعی نبوت اسود عنسی کو ختم کیا۔ خسرو پرویز کی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی بعینہ جیسے اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پارہ پارہ کیا تھا۔ پھر مسلمانوں سے جنگوں میں بالکل ہی ختم ہو گئی۔ ایران اور اس کے ممالک محروسہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے روم و ایران سے آویزش کا آغاز اونٹوں کی شرط بدنے والے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا۔

برصغیر پاک و ہند کے ترک (مغل) شہنشاہوں میں سے اکبر نے اسلام سے منحرف ہو کر دین الٰہی ایجاد کیا۔ اس نے اور اس کے جانشین جہانگیر[1] نے سجدہ تعظیم کرانے پر اصرار کیا اور ظل اللہ کہلائے۔ غیر اہل کتاب ہندو عورتوں سے شادیاں کیں اور ان کی خاطر محلات شاہی میں مندر بنوائے۔ ترکان عثمانی نے ایسی کوئی بدعت نہیں کی۔ نہ سجدۂ تعظیمی نہ ظل اللہ بلکہ خادم حرمین شریفین کہلانا پسند کیا۔ مسلمان خواتین کے علاوہ انہوں نے شادیاں کیں تو اہل کتاب عیسائی عورتوں سے۔ دشمنوں کی یلغاروں اور پے در پے انقلابوں کے باوجود عثمان ترک بچ گئے لیکن ان سے اپنے آپ کو برتر سمجھنے والے ترکان تیموری ختم ہو گئے۔

روم و ایران سے چپقلش کا بیان شروع کرنے سے پہلے جملۂ معترضہ کے طور پر ادھر اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوا۔ اس تاریخی دور میں بقائے اقویٰ سے زیادہ بقائے اصلح کا اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ ورنہ بظاہر ہر لحاظ سے روم اور ایران کی سلطنتیں مدینہ کی اسلامی ریاست کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع اور طاقتور تھیں۔ صدہا سال کے جمع شدہ جنگی اور مالی ذرائع، ساز و سامان اور سیاسی تجربے انہیں حاصل تھے۔ ان کی قوت و شوکت سے بقیہ دنیا لرزہ

۱۔ بعد میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے اثر سے تائب ہو گیا تھا۔ مولف

برا اندام رہتی تھی۔ چند ہی سال پہلے ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز روم کو زبردست شکست دے چکا تھا۔ اور پھر بری طرح شکست کھا بھی چکا تھا۔ لیکن ان باہمی جنگوں کے باوجود دونوں سلطنتوں کی فوجی طاقت اور سیاسی قوت میں پہلا سا دم خم باقی تھا۔ دنیا کے وسیع و زرخیز خطے اور بیشتر قومیں انہی دونوں سلطنتوں کی عملداری میں تھیں۔ انہوں نے اپنے سرحدی علاقوں شام، فلسطین، عراق عرب، کالدیا وغیرہ میں آباد عیسائی اور بت پرست عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا نیز مرتدین کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ اندریں حالات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی طاقت سے خوفزدہ ہوئے بغیر دونوں سے بیک وقت نپٹ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ بے حد اہم بھی تھا اور خطرناک بھی۔ تاہم انہیں یقین کامل تھا کہ کفر و شرک کی پھونکیں تو کیا ان کی آندھیاں بھی اسلام کے چراغ کو بجھا نہیں سکتیں۔ اس چراغ کی روشنی کو ابھی دور دراز خطوں تک پہنچنا تھا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے اب یہ مقصد تھا کہ اسلامی ریاست کی سرحدات پر روم و ایران کی سلطنتوں کے باجگزار و حلیف عرب قبائل کو ان کے انتداب سے نکال کر اسلام کا حلقہ بگوش بنایا جائے۔ کوئی عرب قبیلہ یا علاقہ اسلام کی حدود سے باہر نہ رہے تا کہ اسلامی ریاست کی حدود اندرونی دشمنوں، غداروں اور جاسوسوں سے پاک ہو جائیں۔

جسمانی لحاظ سے یہ ضعیف و ناتواں اور عمر رسیدہ انسان بڑے ہی قوی اور مضبوط دل و دماغ کا مالک تھا۔ وہ اپنے خدا کی خاطر ساری دنیا سے خفا اور برسر جنگ ہو گیا۔ اس کی نگاہِ دوربین اسلام کے آنے والے سنہری دور کا نقشہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے آقا کے مشن کو ہر قیمت پر پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر تل گیا۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ اللہ نے جنت کے بدلے مومنین کی جانیں خرید لی ہیں۔ لہٰذا ایک مومن کے لئے اس سے بڑی کوئی تجارت اور سعادت نہیں ہو سکتی کہ موت کے بدلے اسے حیاتِ جاوداں مل جائے۔ وہی افراد اور قومیں برقرار ہوتی ہیں جو حق و صداقت کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے کا شیوہ اپناتی ہیں۔ انہی کو زندہ رہنے کا حق ملتا ہے اور دنیا کی قیادت انہی کے حصے میں آتی ہے۔ مسلمانوں کی کامیابی کا راز ایمانِ محکم، حق کے لئے سرفروشی، اخلاقِ عالیہ، عدل و مساوات، بے لوث اور اعلیٰ قیادت میں تھا۔

بابِ فتوحات کھلتا ہے

بازنطینی (مشرقی رومی) سلطنت کا اقتدار صدیوں سے شام و فلسطین پر قائم تھا۔ عرب کی شمالی سرحد اور ان بازنطینی صوبوں کے درمیان آباد عرب قبائل بنی غسان وغیرہ کی اکثریت عیسائیت قبول کر چکی تھی اور رومی تہذیب کو بھی اپنا چکی تھی۔ وہ اپنے علاقوں میں نیم خودمختار تھے۔ ان سے آگے بڑھ کر بازنطینیوں نے بے آب و گیاہ صحرائے عرب میں نفوذ کرنے اور اس پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش نہ کی تھی۔ ایرانی سلطنت کا رویہ اس کے برعکس تھا۔ ایرانیوں نے بار بار پورے عرب پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاپور ذوی الاکتاف تو یمن اور حجاز فتح کر کے مدینہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے عربوں پر سخت مظالم ڈھائے تھے۔ لیکن آزادی پسند عربوں کو جب بھی موقع ملتا۔ غلامی کا جؤا اتار پھینکتے تھے۔ نظری طور پر ایرانی عہد نبوی میں بھی مدینہ اور بقیہ حجاز کے لوگوں کو اپنی رعایا سمجھتے

تھے جیسا کہ نوشیرواں کے پوتے خسرو پرویز کے اس بڑے بول سے ظاہر ہے جو اس نے رسول اللہ ﷺ کا تبلیغی خط موصول ہونے پر بولا تھا کہ ''میری رعایا ہو کر مجھے ایسا خط لکھتا ہے!'' اس نے آنحضرت ﷺ کے ایلچی کو قتل کرا دیا تھا اور اپنے حاکم یمن کو حکم دیا تھا کہ خود حضور ﷺ کی گرفتار کر کے اس کے پاس مدائن بھیج دے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت نہ صرف عراقِ عرب، الجزیرہ، کالدیا کے عیسائی اور بت پرست عرب قبائل عملی طور پر ایرانی سلطنت کے باجگزار تھے بلکہ عرب کا زرخیز ترین صوبہ یمن بھی ایرانی عملداری میں تھا۔ حیرہ میں بنولخم کی حکومت ایرانی شہنشاہیت کی سرپرستی میں قائم تھی۔ بازنطینی اور ایرانی سلطنتیں اپنی ماتحت نیم آزاد عرب حکومتوں کو آپس میں برسرِ پیکار رکھتی تھیں اور اپنی باہمی جنگوں کے دوران میں بھی ان سے کام لیتی تھیں۔ ان کے علاوہ دونوں سلطنتوں کے علاقوں میں خانہ بدوش عرب قبائل بھی رہتے تھے اور ایسے قبائل بھی جنہوں نے اگرچہ متمدن شہری زندگی اختیار نہیں کی تھی لیکن زرخیز زمینوں کی دستیابی کی وجہ سے کاشتکاری کرنے لگے تھے۔ رومیوں کے مقابلے میں ایرانی حکومت اپنے عرب قبائل سے بہت زیادہ تحقیر و تشدد سے پیش آتی تھی۔

دنیا کی ان دو بڑی طاقتوں کے باہمی اختلافات اور عداوتیں اپنی جگہ لیکن اسلام کی نئی طاقت کو اپنے درمیان ابھرتے دیکھ کر اسے جلد سے جلد ختم کرنے کا ایک خاموش سمجھوتہ دونوں کے درمیان ہو گیا اور وہ اس کے لئے عملی تدابیر اختیار کرنے لگیں۔ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق کے مختلف علاقوں، قبیلوں اور شہروں کو فتح کرتے ہوئے اس کے انتہائے شمال کے شہر فراض تک پہنچے تو وہاں دونوں سلطنتوں کی سرحدیں ملتی تھیں۔ فرات کے مشرقی کنارے پر ایرانی اور مغربی کنارے پر رومی (بازنطینی) تھے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ایرانی اور رومی باہم متحد ہو گئے۔ لیکن پھر بھی شکست کھائی۔ آج بھی دنیا کی سپر طاقتیں روس اور امریکہ باہمی اختلافات کے باوجود مشترکہ مفادات کے لئے دوسروں کے خلاف متحد ہو جاتی ہیں۔

عراق کی فتح

ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز کے متعلق حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ جس طرح اس نے میرے خط کو پارہ پارہ کیا ہے۔ انشاء اللہ اس کی سلطنت بھی عنقریب اسی طرح پارہ پارہ ہو جائے گی۔ چنانچہ خسرو پرویز آپ ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اور آپ ﷺ نے اس کی خبر یمن کے ایرانی گورنر کے سفیروں کو دی انہوں نے جا کر گورنر کو بتایا، اس نے تیز رفتار ہرکارے بھیج کر مدائن سے اس کی تصدیق کرائی اور پھر وہ اور تمام ایرانی النسل باشندے جو یمن میں تھے، مسلمان ہو گئے تھے۔ تاہم حضور ﷺ کے نامۂ مبارک کی بے حرمتی اور آپ کے ایلچی کا قتل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یاد تھا اور وہ ایرانی سلطنت سے اس کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں حضرموت، مہرہ، عمان وغیرہ جنوبی علاقوں نیز جنوب مشرق میں خلیج فارس کے ساحل کے نزدیک بحرین اور یمامہ میں مرتدین کی ہزیمت اور سرکوبی نے ایرانی حکومت کو چوکنا بلکہ مشتعل کر دیا تھا کیونکہ اسلامی ریاست کی سرحدیں وہاں تک پہنچ گئی تھیں۔ جھوٹی نبیہ سجاح کی سرگرمیوں کے پس پشت بھی ایرانی حکومت کا ہاتھ تھا۔ سجاح

کے واقعہ نے ایران سے ملنے والی سرحدوں کو محفوظ کرنے کا خیال بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں پیدا کر دیا تھا لیکن فوجی کارروائی کا فوری سبب یہ ہوا کہ جب بحرین اور دارین کی بازیابی کے لئے مسلمان فوج مرتدین سے برسر پیکار تھی تو ایرانیوں نے اردگرد کے بدوی عرب قبائل کو شہ دے کر مسلمانوں کے خلاف کھڑا کر دیا تھا۔ مرتدین، منکرین زکوٰۃ وغیرہ کے خلاف جنگی کارروائیاں عرب کی حدود کے اندر ہوئی تھیں۔ اب حدود عرب سے باہر نکل کر بیرونی دشمنوں سے نپٹنے کا وقت آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ساز گار حالات بھی پیدا کر دیئے۔

شیرویہ اپنے باپ خسرو پرویز اور تمام بھائیوں کو قتل کر کے ایران کے تخت پر بیٹھا تھا لیکن اسے آٹھ ماہ سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوئی۔ اس کا جانشین کمسن بیٹا ایک درباری امیر کے ہاتھوں قتل ہوا۔ قتل اور جانشینی کا یہ چکر چند سال چلتا رہا اور ایرانی حکومت کمزور ہوتی گئی۔ آخر ایک شہزادی پوران دخت کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس دوران میں بھی ایرانی امرا کی باہمی چشمک و رقابت اور حصول اقتدار کے لئے سازشیں جاری رہیں۔

ان حالات میں نواحی علاقے کے عرب قبیلہ بنو بکر بن وائل کے ایک قابل اور مخلص مسلمان سردار مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے اپنے طور پر ایران کے حامی عیسائی اور بت پرست عرب قبائل کے خلاف جہاد شروع کر دیا اور ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں کے انسداد کے لئے ان کے تعاقب میں خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر کے دریائے فرات کے دہانے تک پہنچ گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ تک مثنیٰ کی سرگرمیوں کی اطلاعات پہنچیں۔ ایرانی سلطنت کا بھرپور مقابلہ اپنے محدود وسائل کے ساتھ مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے بس کی بات نہ تھی۔ اب ایرانی حکومت نے خود اپنی فوجیں ان کے مقابلے میں بھیجنی شروع کر دی تھیں اور انہیں عراق کے طاقتور ایرانی گورنر ہرمز کی بہت بڑی فوج کا مقابلہ درپیش تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر اور بعض روایات کے مطابق خود دربار خلافت میں حاضر ہو کر ایران کے سیاسی اور فوجی حالات اور عراق میں ایرانیوں کے زیر اقتدار رہنے والے عرب قبائل کے حالات سے مطلع کیا۔ مسلمانوں کی کامیابی کے روشن امکانات کی طرف بھی توجہ دلائی اور فوجی مدد مانگی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مدد بھیجنے کا وعدہ کیا۔ مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے واپس جا کر اپنے قبیلہ کے علاوہ بعض دوسرے حلیفوں کو بھی مسلمان کیا اور ایرانیوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ اس اثناء میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مرتدین کے خلاف جنگوں سے فارغ ہو چکے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں کچھ فوج کے ساتھ عراق جانے کا حکم دیا۔ یوں باقاعدہ طور پر ایران کی عظیم و قدیم سپر پاور کے خلاف جنگ کا آغاز ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد بیک وقت دوسری سپر پاور مشرقی رومی سلطنت سے بھی۔

فلپ کے۔ حتیٰ اپنی تاریخ عرب میں رقم طراز ہے۔

"اس وسیع و عظیم دنیا میں اس وقت کسی کو ایک لمحے بھر کے لئے بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ عرب کے یہ بے سروسامان، حقیر، اجڈ اور وحشی بدو اپنے صحراؤں سے نکل کر ان عظیم سلطنتوں سے نبرد آزما ہونے کی جرأت کر کے ان کی قوت و حشمت کی تحقیر کریں گے۔ اگر کوئی شخص ساتویں صدی عیسوی کے ثلث

اول میں یہ پیش گوئی کرنے کی جسارت کرتا کہ دس سال کے اندر اندر غیر معروف وگمنام جزیرہ نمائے عرب میں سے ایک انجانی اور ناگہانی قوت سر اٹھائے گی اور معلومہ دنیا کی دونوں سپر پاوروں سے ٹکر لے گی۔ ان میں سے ایک (ایرانی) قوت کو بالکل ختم کر کے اس کی وارث ہو جائے گی اور دوسری (بازنطینی) سلطنت کے بہترین صوبے اس سے چھین لے گی۔ تو دنیا کے لوگ اس پیشین گو کو پاگل قرار دے دیتے۔ لیکن ایسا ہو کر رہا۔"[1]

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عرب صحرانشینوں کی ذہنیت بدل دی۔ ان کے دلوں دماغوں کی کایا پلٹ دی۔ لا الہ الا اللہ کے کلمہ نے انہیں دنیا کے شہنشاہوں اور حکمرانوں کے رعب وداب اور قوت وصولت سے بے پروا کر دیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قیادت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ بادہ نشین عربوں کے نزدیک قیصر وکسریٰ کی اہمیت پر کاہ کے برابر بھی نہ رہی۔ فلپ حتی مزید لکھتا ہے کہ "پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب کی بنجر سرزمین جیسے کسی جادو سے عظیم ہیروؤں کا گہوارہ بن گئی ہو۔ کثرتِ تعداد اور عظمت کردار میں ان کے مشابہ افراد اور کہیں مشکل سے ملیں گے، عراق اور فارس میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، مصر میں عمرو رضی اللہ عنہ ابن العاص کی فوجی مہمات ایسی زبردست مہارت کے ساتھ انجام دی گئیں کہ جنگی تاریخ میں یہ مسلمان سپہ سالار نپولین، ہنی بال اور سکندر کے مد مقابل نظر آتے ہیں۔"[2]

ملک گیری ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقصد نہ تھا۔ ان کے پیش نظر اسلام کی حفاظت اور سربلندی تھی۔ اس کے لئے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا جانے پر تیار تھے۔ مثنیٰ رضی اللہ عنہ ایک دلیر، ہوشیار، قابل، دور اندیش اور ٹھنڈے دل و دماغ کے جرنیل تھے۔ لیکن وہ صحابہ میں سے نہ تھے۔[3] ان کے بارے میں اہل حجاز کو زیادہ معلوم نہ تھا۔ لہٰذا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مصلحت اور دور اندیشی کا تقاضا یہی سمجھا کہ مقامی کمان مثنیٰ کو اور مجموعی کمان خالد رضی اللہ عنہ کو سپرد کی جائے۔ انہیں ہدایت کر دی کہ ایرانی دہقانوں کے عرب مزارعوں سے کسی قسم کی بدسلوکی نہ کی جائے۔ انہیں زمینوں پر قابض رہنے دیا جائے اور ایرانیوں کے ظلم وتشدد سے نجات دلائی جائے۔ روانگی کے وقت خلیفہ نے خالد رضی اللہ عنہ کو مفصل ہدایات دیں۔

۱- ہسٹری آف عربز (تاریخ عرب) صفحہ ۱۴۲، ۱۹۵۳ء ایڈیشن

۲- ہسٹری آف عربز (تاریخ عرب)

۳- بعض روایات میں ان کے صحابی ہونے کا بھی ذکر آیا ہے۔ ایک دفعہ حج کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنی شیبان میں تبلیغ کے لئے گئے تھے۔ وہاں قبیلہ کے سردار مفروق اور دوسرے معززین بشمول مثنیٰ بن حارثہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات چیت ہوئی۔ ان لوگوں نے دعوت اسلام پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور مفروق نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "اے قریش بھائی! آپ کی بات میں نے سنی اور تصدیق کی۔ گویا اسلام لے آئے بہرحال مثنیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔ وہ اپنے قبیلے میں واپس چلے گئے۔ اہل حجاز ان کے بارے میں زیادہ نہ جانتے تھے۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول اور مولانا مودودی کا مضمون "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ہر پیرو کار سے بازی لے گئے" مؤلف

۱۲ ہجری میں جنگ عراق کا آغاز ہو گیا۔

مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آٹھ ہزار کا قبائلی لشکر تھا۔ دس ہزار جانبازوں کے ساتھ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے وہاں پہنچ کر فوج کی اعلیٰ کمان سنبھال لی۔ مثنیٰ ان کے وفادار نائب اور مشیر رہے۔ ایرانی دل بادلوں کے مقابلے میں یہ اٹھارہ ہزار فوج تعداد کے لحاظ سے کچھ نہ تھی۔ لیکن اللہ کثیر لشکروں کو قلیل لشکروں سے شکست دیتا چلا آیا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے خلیج فارس پر واقع سرحدی مقام ابلہ پہنچ کر عراق کے ایرانی گورنر ہرمز کو خط لکھا:

''اسلام قبول کر لو تو تمہارے لئے امن وسلامتی ہے یا تم اور تمہارے لوگ جزیہ ادا کریں اور ذمی بن کر رہیں۔ اگر تم نے انکار کیا تو تم اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے کو الزام نہ دے سکو گے۔ میں تمہاری طرف ایک ایسی قوم کو لے کر آیا ہوں جسے موت سے اتنی ہی محبت ہے جتنی تمہیں زندگی سے۔''

اس مختصر، عجیب اور تحکمانہ خط نے ہرمز کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے شہنشاہ ایران شیرویہ بن خسرو پرویز سے کمک کی درخواست کی لیکن کمک کا انتظار کئے بغیر ایک بڑی فوج اپنے طور پر جمع کر کے خالد رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ عرب کے فاقہ مست وحشی بدو جو باقاعدہ جنگی تربیت سے محروم ہیں اور تعداد میں بھی بہت کم ہیں، اس کی تربیت یافتہ بہتر ہتھیاروں سے مسلح اور تعداد میں کثیر فوج کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکیں گے جنگ حفیر لیکن حضیر کے میدان جنگ میں ہرمز انفرادی مبارزت طلبی میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا اور ایرانی فوج کے میمنہ اور میسرہ کے کمانڈر جو ایرانی شہزادے تھے، وہ بھی عام جنگ میں مارے گئے۔ ایرانی فوج شکست کھا کر بھاگ نکلی۔ اس جنگ کو غزوۂ ذات السلاسل (زنجیروں کی جنگ) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ایرانی فوجیوں نے اپنے آپ کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ لیا تھا تاکہ میدان جنگ سے بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ جب بھگدڑ پڑی تو یہ پابزنجیر ایرانی سپاہی بری طرح اور بڑی بیچارگی سے کٹ مرے۔ اس جنگ میں ایرانی فوج کا ایک ہاتھی بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور مہاوت سمیت مالِ غنیمت کے ہمراہ مدینہ بھیجا گیا جہاں مرد، عورتیں اور بچے اس عظیم الجثہ عجیب الخلقت جانور کو دیکھ کر حیران ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہے! اس سے پہلے انہوں نے روایات میں صرف ابرہہ کے ہاتھی (اصحاب الفیل) کا ذکر سن رکھا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسے مدینہ میں کسی کام کا نہ پا کر واپس عراق بھجوا دیا۔

اس فتح سے مسلمانوں کی ہمتیں اور حوصلے مزید بلند ہو گئے اور ایرانی قوت اپنے مقابلے میں ہیچ معلوم ہونے لگی۔ گربہ کشتن روز اول کے مصداق ایرانیوں پر رعب چھا گیا۔ چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کاشتکاروں سے کوئی تعرض نہیں کیا، ان کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ ہو گئیں۔ جزیہ کی معمولی رقم کے سوا اور کسی قسم کا تاوان یا ٹیکس ان سے وصول نہیں کیا۔ نہ مسلم فوج نے کسی قسم کی لوٹ مار یا تعدی کی، نہ گھر والوں اور عورتوں پر حملے کئے۔ آئندہ جنگوں میں بھی یہ پالیسی بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ عرب اور غیر عرب کاشتکاروں کے دونوں طبقے مسلمان فوجوں سے تعاون کرنے لگے۔

حفیر کی جنگ کے بعد مذار ولجہ، الیس، کسکر، امغیشیا وغیرہ فتح کر کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بنولخم کے صدر مقام مشہور تاریخی شہر حیرہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہل حیرہ نے ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ جزیہ پر صلح کر لی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے انہیں صلح نامہ لکھ دیا چونکہ اپنی قسم کا یہ پہلا معاہدہ تھا، اس کی بڑی تاریخی اہمیت اور معنویت ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

اہل حیرہ کو جزیہ پر امان دی جاتی ہے۔ وہ ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ ادا کریں گے۔ ہم اس کے معاوضہ میں ان کی حفاظت کریں گے اور اگر ان کی حفاظت نہ کر سکیں تو یہ رقم ان پر واجب نہ ہوگی۔ اگر وہ بد عہدی کریں تو ہم بری الذمہ ہیں۔ یہ جزیہ ان کے پادریوں اور راہبوں سے بھی لیا جائے گا۔ البتہ محتاجوں، اپاہجوں اور از کار رفتہ بوڑھوں سے وصول نہیں کیا جائے گا بلکہ ایسے افراد اور ان کے بچوں کو بیت المال سے روزینہ دیا جائے گا۔ یہ معاہدہ ربیع الاول ۱۲ھ میں لکھا گیا۔''

جزیہ کی مقدار چار درہم فی کس سالانہ تھی یعنی تقریباً ایک روپیہ، یہ معاہدہ آئندہ کے لئے ایک نظیر بن گیا۔ جزیہ کے علاوہ اہل حیرہ نے کچھ تحائف بھی پیش کئے جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مالِ غنیمت اور جزیہ کے ہمراہ خلیفہ کی خدمت میں بھیج دیئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اگر یہ تحائف جزیئے میں شامل ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ جزیئے میں شامل کر کے فالتو رقم اہل حیرہ کو لوٹا دو۔

کیا قدیم و جدید تاریخ حکمرانوں اور سپہ سالاروں میں سے کسی کا ایسا منصفانہ، بااصول اور بادیانت کردار پیش کر سکتی ہے؟ کیا کسی فاتح نے مفتوح سے کبھی ایسا سلوک کیا؟

خالد رضی اللہ عنہ کی فراخدلی اور حسن سلوک کو دیکھ کر حیرہ کے گردونواح کے باشندوں اور دہقانوں نے بھی بیس ہزار سالانہ جزیہ پر اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح جنوبی عراق پورے طور پر مسلمانوں کے زیر تسلط آ گیا۔

ادھر سے فراغت پا کر خالد رضی اللہ عنہ انبار اور عین التمر کی طرف متوجہ ہوئے اور دشمنوں کو شکست دی۔ مسلمانوں کے حسن اخلاق، خوش معاملگی، پابندئ عہد اور ایرانی امراو حکام کے مقابلے میں ان کی انصاف پروری، مساوات پسندی اور نرم روی سے متاثر ہو کر لوگ خود بخود اسلام کے حلقہ اطاعت میں آنے لگے۔ دیرناطف کے بطریق نے دریائے فرات کے کنارے واقع بانقیا اور بسمات کے قصبات کی اراضی کے لگان کی ادائیگی پر اطاعت قبول کر لی۔

اب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دومۃ الجندل کی طرف پیش قدمی کی یہ شہر بڑی سیاسی اور فوجی اہمیت کا حامل تھا یہاں ایرانی اور رومی سلطنتوں کی حدود ایک دوسرے سے قریب تھیں اور دونوں سلطنتوں کے مفادات وابستہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دومۃ الجندل کی اہمیت کا احساس تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے اسلامی مملکت کی حدود کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ایک فوجی دستہ دے کر بھیجا تھا اور وہاں کے رئیس نے اطاعت قبول کر کے اپنی بیٹی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے بیاہ دی تھی۔ لیکن پھر اطاعت سے منحرف ہو گیا اور دوسرے شامی قبائل سے مل کر اسلامی ریاست کے خلاف سازشیں کرنے لگا۔ تبوک کی مہم ۹ھ کے

موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو دومہ کی طرف بھیجا تھا اور وہ وہاں کے رئیس اکیدر بن عبدالمالک کندی کو گرفتار کر لائے تھے۔ اس نے دوبارہ اطاعت کا عہد کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف کر دیا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتنہ وفساد کے ایام میں اس نے پھر مدینہ کی اطاعت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا۔ عراق سے بنی کلب کے قبائل جودی بن ربیعہ کی سرداری میں اور شام سے بنی غسان جبلہ بن ایہم کی قیادت میں اکیدر کی مدد کے لئے جمع ہو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ کو دومہ کی مہم پر بھیجا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے، گھر گئے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے مدد مانگی۔ وہ اس وقت دومہ سے تین سو میل دور عین التمر میں تھے اور درمیان میں لق ودق بے آب وگیاہ صحرا حائل تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بڑی خاموشی اور تیزی سے یہ صبر آزما اور طویل سفر طے کر کے اچانک دومہ کی دیواروں کے سامنے جا نمودار ہوئے۔ سخت جنگ کے بعد اکیدر اور عراقی قبائل کا سردار جودی قتل ہوئے اور شہر فتح ہو گیا۔ جبلہ بن ایہم غسانی بھاگ نکلا۔

دومہ سے فارغ ہو کر حضرت خالد بن ولید نے عراق کے عرب قبائل بنی تغلب وغیرہ کی طرف توجہ کی جو دو ایرانی جرنیلوں زرمہر اور روزبہ کی زیر کمان حصید اور خنافس میں جمع ہو گئے تھے۔ عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ ہو گئے۔ قبائلی اور ایرانی افواج تہس نہس ہوئیں۔ دونوں ایرانی سپہ سالار بھی قتل ہوئے۔ پھر حضرت خالد نے بنی تغلب کی چاروں طرف پھیلی ہوئی بستیوں اور ان کے مراکز مضیح، زمل، بشر اور رضاب پر کامیاب شب خون مارے اور ان کی طاقت کو پوری طرح کچل دیا۔ خالد رضی اللہ عنہ کی ان کامیابیوں سے متاثر اور خائف ہو کر دوسرے قبائل نے سر اطاعت خم کرنے ہی میں خیریت سمجھی۔

جنگ فراض (ذی قعدہ ۱۲ھ۔ جنوری ۶۳۴ء)

ہزیمت خوردہ قبائل کے بعض عناصر اور کچھ دوسرے ویسے ہی دہشت زدہ ہو کر عراق کے انتہائی شمالی علاقوں کی طرف بھاگ گئے اور مسلمانوں کے خلاف سرگرمیاں شروع کر دیں۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ ان کے تعاقب میں شمالی عراق کے آخری مقام فراض تک پہنچ گئے جہاں شام، عراق اور الجزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں۔ فراض میں دریائے فرات کے مغربی کنارے سے رومیوں کی سرحد شروع ہو جاتی تھی جہاں ان کی فوجی چوکی موجود تھی۔ یہاں خالد رضی اللہ عنہ کے عقب میں ایرانی، سامنے رومی اور چاروں طرف بدوی عرب قبائل موجود تھے خالد رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں ان تینوں قوتوں نے اتحاد کر لیا اور ان کی مجموعی طاقت خالد رضی اللہ عنہ کی فوج سے کئی گنا زیادہ ہو گئی۔ سخت خونریز جنگ ہوئی۔ دشمنوں کی کثیر تعداد قتل ہوئی یا دریا میں ڈوب کر مر گئی۔ مؤرخین دشمن کے مقتولوں کی تعداد پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک بیان کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا تسلط عراق کے انتہائی شمال تک قائم ہو گیا۔ اب تک لڑی جانے والی جنگوں میں یہ سب سے زیادہ خونریز تھی۔ عراق میں حیرہ اور دوسرے اسلامی مقبوضات کو کوئی خطرہ نہ رہا۔ قبائل کی طاقت ٹوٹ گئی۔ ایرانی بھی عارضی طور پر دبک گئے اور رومیوں نے بھی پہلی بار مسلمانوں کی تلواروں کا ذائقہ چکھ لیا۔

محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں:

''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا منشا سارے عراق اور شام کو فتح کرنے کا نہ تھا۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان دونوں ملکوں کی سرحدوں پر جو عرب سے ملتی ہیں، امن وامان قائم ہو جائے اور ان اطراف سے ایرانی اور رومی عرب پر حملہ آور نہ ہو سکیں۔ لیکن اللہ کو یہی منظور تھا کہ یہ دونوں مملکتیں کاملاً مسلمانوں کے قبضے میں آجائیں۔ اس لئے اس نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ خالد رضی اللہ عنہ عراقی قبائل کو مطیع کرنے کی غرض سے انتہائی شمال تک چلے گئے اور اس طرح مسلمانوں کے لئے بالائی جانب سے شام پر حملہ کرنے کا راستہ کھل گیا۔ ایرانی سرحدات سے شام پر حملہ کرنے کا راستہ کھل جانا ایک ایسا معجزہ تھا جس کا خیال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی نہ آسکا۔''

دریائے فرات کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ جنوب میں ابلہ سے لے کر شمال میں فراض تک اسلامی اقتدار قائم ہو گیا۔ ایرانی حکومت نے یمن اور بحرین کی بازیابی کے لئے جو چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی، وہ اسے بہت مہنگی پڑی۔ یمن اور بحرین تو واپس کیا ملتے، عراق بھی ہاتھ سے گیا۔ اور اسے اپنا بچاؤ کرنا مشکل ہو گیا۔ پورا عراق گیارہ ماہ میں فتح ہو گیا۔

فراض کا معرکہ آخری معرکہ تھا جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عراق میں سر کیا۔ اس کے جلدی بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کے محاذ پر جانے کا حکم دیا کیونکہ وہاں کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی تھی۔ خلیفہ شام و فلسطین کے جہاد اور فتح کو عراق کی مہم پر اولیت دیتے تھے۔ فلسطین انبیاء اور بیت المقدس کی سرزمین تھی اور وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدم جا چکے تھے۔ خالد رضی اللہ عنہ اپنی مسلسل فتوحات سے اپنی بہادری اور سپہ سالاری کی دھاک بٹھا چکے تھے۔ ایران، عراق، شام اور فلسطین میں ان کی جنگی بصیرت اور معرکہ آرائیوں کا شہرہ ہو چکا تھا۔ دشمن ان کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے۔

خالد رضی اللہ عنہ کی شام کو روانگی کے بعد عراق کا محاذ وقتی طور پر سرد پڑ گیا۔ اور پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس محاذ پر نئے سرے سے حرکت و سرگرمی پیدا ہوئی۔ خالد رضی اللہ عنہ کی معرکہ آرائیوں کے طفیل ایک سال (۱۲ھ) کے اندر اندر پورا عراق عرب خلافت اسلامیہ کی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ یمن اور بحرین بھی ایرانی شہنشاہیت کی دست درازیوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے۔

خلیفہ کے حسب الحکم حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عراق کے محاذ کی کمان حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور آدھی فوج اپنے ساتھ لے کر عازم شام ہو گئے۔

اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ زندہ رہتے تو وہ شام و فلسطین کی فتح کے بعد دوبارہ خالد رضی اللہ عنہ کو عراق کے محاذ پر بھیج دیتے۔ لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور حالات بدل گئے۔ عراق و ایران کی فتح کی تکمیل کا سہرا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سر بندھا۔ تاہم شام و فلسطین کی جنگوں میں بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کن کردار ادا کیا تا

آ نکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول کر دیا۔

مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب

ایرانیوں (نیز رومیوں) کے خلاف مسلمانوں کی کامیابی کا بڑا سبب ان کا یہ یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں۔ ان کے سامنے ایک اعلیٰ آئیڈیل تھا، خدا کی کتاب میں فتح و نصرت کی جو بشارتیں انہیں دی گئی تھیں وہ ان پر سو فیصد یقین رکھتے تھے۔ قرآن مجید میں انہیں یہ نوید بھی دی گئی تھی کہ اگر ان کا ایمان کامل ہوگا تو ان کی قلیل تعداد دشمنوں کی کثیر تعداد پر غالب آئے گی۔ ایک مومن بیس کافروں پر بھاری ہوگا ورنہ اپنے سے دگنوں پر تو ضرور ہی غالب آئے گا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر ہجرت کے دوران میں تعاقب کرنے والے بدو سراقہ بن جعشم (جو بعد میں مسلمان ہوئے) سے کہا تھا کہ میں تمہارے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن دیکھتا ہوں۔[1]

جب غزوۂ احزاب کے موقع پر کفار کی دس ہزار فوج نے مدینہ پر چڑھائی کی اور مسلمانوں پر اس سے زیادہ سخت وقت پہلے نہیں آیا تھا، عین خندق کی کھدائی کے دوران میں جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہ نے بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجھے دکھایا گیا ہے کہ میری امت عنقریب عراق، ایران، شام اور فلسطین کو فتح کرے گی۔ یہ پیشین گوئیاں حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور ان کی فوج میں شامل بہت سے صحابہ کو یاد تھیں۔ اس لئے ان کو یقین کامل تھا کہ وہ فتح یاب ہوں گے۔ وہ ایک برسر حق فوج کی نفسی کیفیت کے ساتھ لڑے۔ کامیاب ہوئے تو غازی اور دشمنوں کے اموال و ممالک کے مالک مارے گئے تو شہید اور جنت کی نعمتوں کے حقدار، بانگ درا میں شامل نظم ''جنگ یرموک کا ایک واقعہ'' میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے سالار لشکر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی زبان سے اس شعر میں انہی پیشین گوئیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

مسلمانوں میں کامل اتحاد و یکجہتی اور انصاف و مساوات کا دور دورہ تھا۔ ان میں سے ہر ایک قرآن کے الفاظ میں اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی زندہ مثال تھا، وہ خدا کے آخری پیغام کے مبلغ تھے۔ ان کے دن گھوڑوں کی پشت پر جہاد فی سبیل اللہ میں اور راتیں قیام و رکوع و سجود میں اپنے خدا کے حضور میں گزرتی تھیں۔ وہ مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے عدل و مساوات کا سلوک کر کے ان کے دل جیت لیتے تھے۔ رومیوں اور ایرانیوں کی طرح انہیں حقیر و ذلیل نہیں سمجھتے تھے نہ ان پر ٹیکسوں کا بوجھ لاد کر ان کی کمر توڑتے تھے نہ ان کی بے حرمتی کرتے تھے۔ انسان کو بہر حال انسان سمجھتے تھے ان کے حسن سلوک سے لوگ خود بخود اسلام کی طرف مائل ہوتے تھے۔ اپنے دین پر قائم رہنے والوں کی جان و مال و آبرو کی بہت معمولی جزیہ کے عوض حفاظت کرتے تھے اور ان کی مذہبی

[1] حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ جب مدائن فتح ہوا تو مالِ غنیمت میں کسریٰ کے کنگن بھی آئے جو سراقہ رضی اللہ عنہ کو پہنائے گئے اور لوگوں کے سامنے عبرت کی تصویر کھینچ گئی۔

آزادی سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ رواداری ان کا اصول تھا دشمن فوجوں کے مقابلے میں وہ عیش وعشرت کی زندگی سے ناآشنا تھے۔ سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں کے قائل، ان کے حملے تندوتیز اوراچانک ہوتے تھے۔ وہ خیمہ وخرگاہ اور سامان تعیش سے بھاری بھرکم ہوکر میدان جنگ میں نہیں آتے تھے۔ ان کے سپہ سالار بھی عام فوجیوں کی سی زندگی گزارتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حملہ کی منصوبہ بندی بڑی دوراندیشی سے کی تھی۔ اور سالاران لشکر کو بڑی حکمت آمیز اور دوررس نتائج کی حامل انسانی اقدار سے مملو ہدایات دی تھیں۔

اس کے برعکس ایرانی دربار طوائف الملوکی کا شکار تھا، امرا اور شہزادے آپس میں لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف۔ اور تعیش کی زندگی کے عادی ہوچکے تھے۔ ایران کی جنگی مشینری بھاری بھرکم اور سست رفتار تھی جبکہ مسلمانوں کی نقل وحرکت برق رفتار۔ اس پر طرہ یہ کہ کافی عرصے تک ایرانی حکومت مسلمان حملہ آوروں کو محض لٹیروں کا گروہ خیال کرتی رہی کہ لوٹ مار کرکے اپنے ملک کو لوٹ جائیں گے۔ اس طرح مسلمانوں کو قدم جمانے اور اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کا موقع ملتا رہا۔ گویا غیب سے ان کی مدد ہوتی رہی۔ ورنہ یہی ایرانی دس پندرہ سال پہلے عظیم رومیوں کے دانت کھٹے کرچکے تھے۔

مسلمانوں اور ایرانیوں (نیز رومیوں) کی جنگ دراصل دو مختلف طرز ہائے زندگی کا تصادم تھا، مسلمان دین خداوندی اور اسلامی نظام حیات کے قیام اور اشاعت کے لئے اٹھے تھے جو عدل ومساوات پر مبنی تھا جبکہ ایرانی جبر و استحصال پر مبنی اپنی ہزار سالہ، مقدس شہنشاہیت کی حفاظت اور بقاء کے لئے شمشیر بکف تھے۔ لیکن ایرانی سلطنت اور شاہی خاندان کی بقا کی اپیل کسی گہری روحانی تحریک اور جذبہ سے محروم تھی۔ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ایرانی مسلمانوں کی روحانی واخلاقی قوتوں، اعلیٰ مقاصد، بلند تصورات اور پاکیزہ امنگوں کا صحیح اندازہ ہی نہ کرسکے۔ انہوں نے اس آویزش کو بھی دنیادارانہ آویزش سمجھا جس کا مقصد مال ودولت اور علاقے حاصل کرنا تھا جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، واقعات وحالات پر ایران کی گرفت کمزور اور مسلمانوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ جوں جوں وہ فتح پر فتح حاصل کرتے گئے ان کے جوش وخروش اور خوداعتمادی میں اضافہ اور اپنے مقاصد کی صداقت پر یقین محکم ہوتا گیا اور وہ تقدیر یزداں بنتے گئے مفتوح اقوام کو اپنے انسانی حقوق کا تحفظ انہی کے دامن میں نظر آیا۔

عراق کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام

خلیفہ کی ہدایت کے مطابق حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عراق سے ایرانیوں کو بے دخل کرنے کے بعد وہاں اپنا نظم ونسق قائم کیا۔ مختلف اضلاع اور پرگنوں میں اپنے عامل مقرر کئے، جزیہ اور خراج کی وصولی کے اقدامات کئے۔ کاشتکاروں اور زمینداروں کی حفاظت اپنے ذمے لی۔ ان سے زمین کے لگان کی ادائیگی کے معاہدے کئے۔ انہیں ان کی زمینوں پر برقرار اور قابض رکھا۔ شہری آبادیوں کے تحفظ کا بھی انتظام کیا۔ مسلمانوں کے انصاف، حسن سلوک، امانت ودیانت اور نرم رویئے کو دیکھ کر وہ لوگ بھی اپنے گھروں کو واپس آ گئے جو اس خوف

سے گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے کہ مسلمان لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے لئے آئے ہیں۔ وہ واپس آ کر پھر سے اپنے اپنے کاروبار، زراعت اور دوسرے مشاغل میں حسب سابق لگ گئے۔ ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دی گئی۔ حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ سے جو معاہدہ کیا تھا۔ اس کا ترجمہ گزشتہ صفحات میں درج کیا جا چکا ہے۔ عہد صدیقی کا یہ معاہدہ اور اسی نوع کے دوسرے معاہدے عہد فاروقی و عثمانی کے لئے نظیر بن گئے۔ جن کا مقصد مفتوحین پر جبر و تشدد اور اُن کے استحصال کی بجائے ان کی حفاظت، ان سے انسانیت نواز سلوک، قیام امن اور انہیں آبرومندانہ زندگی گزارنے کے قابل بنایا تھا۔ اس کے برعکس آج بھی فاتحین بدنصیب مفتوحین سے انسانیت سوز سلوک کرتے ہیں اور ان کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرتے ہیں۔ ان کی جان، مال، آبرو کچھ بھی تو خدا ناشناس فاتحین کے ہاتھوں محفوظ نہیں۔ گزشتہ سالوں میں روسی آمروں نے افغانستان میں جو کچھ کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے اور اسرائیل فلسطینی عربوں سے جو سلوک کر رہا ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے۔

شام و فلسطین کی مہم (۱۲-۱۳ھ)

صدیق اکبر کی نگاہ میں شام و فلسطین کی فوجی، سیاسی اور مذہبی اہمیت عراق کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ خود رسول اکرم ﷺ بھی اس ارضِ مبارک کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ بیت المقدس مسلمانوں کا قبلۂ اول تھا اور آپ ﷺ کے سفر آسمانی (معراج) کی اولیں منزل۔ آپ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ایک دن مسلمان اس بابرکت زمین کے وارث ہوں گے نیز قسطنطنیہ (قیصر روم کا دارالسلطنت جس کی قلمرو میں شام اور فلسطین شامل تھے) کی فتح کے لئے جہاد کرنے والے مسلمانوں کو جنت کی بشارت دی تھی۔ آپ ﷺ نے ہرقل قیصر روم کو اسلام کی دعوت دی تھی اور ۶ھ میں حضرت دحیہ کلبیؓ کو دعوت نامہ دے کر ہرقل کے پاس بھیجا تھا لیکن ہرقل مسلمان نہ ہوا۔ واپسی پر اثنائے راہ میں حضرت دحیہ کلبی کا مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔ آپ ﷺ کے دوسرے سفیر حضرت حارث بن عمروؓ جو شرجیل حاکم بصریٰ کے پاس دعوت نامہ لے کر گئے تھے شہید کر دیئے گئے۔ ان کا انتقام لینے کے لئے ۸ھ میں جنگ موتہ لڑی گئی۔ اور یوں پہلی دفعہ مسلمانوں اور رومیوں میں براہ راست تصادم ہوا۔ ویسے بھی رومی نئے دین اسلام کو اپنے مذہب عیسائیت کا حریف خیال کرتے تھے کیونکہ قرآن میں مروجہ عیسائی عقائد پر نکتہ چینی کر کے ان کا بطلان کیا گیا تھا۔ اس لئے ایرانیوں کی نسبت رومی اور شامی مسلمانوں کے زیادہ سخت دشمن تھے اور وہ حضور ﷺ کی حیات اقدس ہی میں اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے در پے ہو گئے تھے۔ سرزمین حجاز، مدینہ، خیبر نجران وغیرہ سے جو یہودی اور عیسائی ترک وطن کر کے شام اور فلسطین گئے۔ انہوں نے بھی رومیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ اپنے آخری ایام میں رومیوں کی طرف سے ہر وقت چوکنے رہتے تھے۔ ۹ھ میں اطلاعات پہنچیں کہ ہرقل شمالی سرحد پر فوجیں جمع کر رہا ہے اور مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے حملہ کا موقع دینے سے پہلے ہی آپ ﷺ تیس ہزار مسلمانوں کا لشکر جرار لے کر سرحدی مقام تبوک تشریف لے گئے۔ اتنا بڑا اسلامی لشکر اس سے پہلے کبھی جمع نہیں ہوا تھا۔ رومی جنگ موتہ میں

مسلمانوں کی سرفروشی اور جذبہ جہاد کا مشاہدہ کر چکے تھے جب تین ہزار مسلمان ایک لاکھ رومیوں سے بھڑ گئے تھے۔ تیس ہزار سرفروش مجاہدین کے اجتماع کو دیکھ کر ہرقل نے حملہ کا ارادہ ترک کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ عرصہ تبوک میں قیام کر کے واپس تشریف لے آئے تھے۔ لیکن شام کی طرف کی شمالی سرحد کے تحفظ کا خیال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ رہا۔

جنگ موتہ کے شہداء کا انتقام لینے اور دشمنوں کو مرعوب کرنے اور دبانے کے خیال سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی قیادت میں ایک لشکر سرحد شام کی طرف بھیجنے کا حکم دیا تھا اور تعمیل حکم کی سخت تاکید کی تھی۔ یہ لشکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو روانہ نہ ہو سکا لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلافت کی عنان سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہی کیا اور اکابر صحابہ کے مخالفانہ مشورہ کے باوجود لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کر دیا تھا جس کا مفصل ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اسامہ رضی اللہ عنہ کی مہم کامیاب رہی اور وہ شمالی سرحدوں پر اسلامی ریاست کا رعب و داب قائم کر کے واپس آئے۔ اگر اسامہ رضی اللہ عنہ کی مہم نہ گئی ہوتی تو عین ممکن تھا کہ مرتدین منکرین زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کے پیدا کردہ فتنہ و فساد سے فائدہ اٹھا کر رومی نوزائیدہ مسلم ریاست پر حملہ کر کے اسے ختم کرنے کی کوشش کرتے۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین وغیرہ کی سرکوبی کے لئے لشکر بھیجے تو شمالی سرحد کو فراموش نہیں کیا اور خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر دے کر ادھر روانہ کیا تاکہ تیماء میں ٹھہر کر سرحد کی نگرانی اور حفاظت کریں۔ ساتھ ہی تاکید کی کہ جب تک رومیوں اور ان کے حلیف شام و فلسطین کے نیم آزاد عیسائی عرب قبائل کی طرف سے چھیڑ چھاڑ کی پہل نہ ہو تب تک اپنی طرف سے ہرگز پہل نہ کریں۔ اپنی سرگرمیوں کو صرف دفاع تک محدود رکھیں اور گردونواح کے قبائل کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں۔ خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے ایک خاصا بڑا قبائلی لشکر جمع کر لیا۔ اس سے رومیوں کو تشویش پیدا ہوئی وہ پہلے ہی عراق میں مسلمانوں کی فتوحات سے متوحش ہو رہے تھے۔ خصوصاً فراض کے مقام پر جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے رومیوں، ایرانیوں اور عرب قبائل کے متحدہ عساکر کو شکست دے کر تباہ کر دیا تو روم کے حکمران طبقوں میں سخت ہلچل مچ گئی تھی۔ اب دوسرے خالد رضی اللہ عنہ (بن سعید) کی فوجوں کے اجتماع نے انہیں مزید مشوش اور مشتعل کر دیا۔ ہرقل نے شام کی سرحد پر آباد عرب قبائل بنو آکر، بنو بکر، بنو غسان، بنو عذرہ، بنو جذام وغیرہ کو تحریص و ترہیب سے مسلمانوں کے خلاف جنگ پر ابھارا۔ یہ قبائل رومیوں کی پہلی دفاعی لائن تھے، سرحد کے پار رومی افواج کا اجتماع بڑی تیزی سے ہونے لگا۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے دشمن پر حملہ کر کے اسے تتر بتر کر دیا۔ پھر پیش قدمی کرتے ہوئے بحر مردار کے مشرقی ساحل تک پہنچ گئے اور رومی جرنیل باہان کو شکست دی لیکن اپنے عقب کو محفوظ نہ رکھا۔ رومی جرنیل نے جنگی چال چل کر انہیں گھیرے میں لے لیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو انہوں نے خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو سخت تہدید آمیز خط لکھا کیونکہ موخر الذکر نے ان کے احکام کی خلاف ورزی کی تھی، پھر عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ اور ذوالکلاع رضی اللہ عنہ حمیری کو ان کی مدد کے لئے پہنچنے کا حکم دیا۔ وہ گھری ہوئی فوج کو نکال کر سرحد پر لے آئے اور مدینہ سے مزید کمک اور ہدایات کا انتظار کرنے لگے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رومیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے رضا کار مجاہدین طلب کئے کیونکہ کوئی باقاعدہ تنخواہ دار فوج تو تھی نہیں۔ جب رضا کاروں کی آمد شروع ہوگئی تو شام و فلسطین کی مہم کے لئے حسب ذیل چار لشکر

مرتب کئے اور ہر ایک کا ہدف اور منزل مقصود کا بھی تعین کر دیا:

۱- حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ...... حمص

۲- حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما...... دمشق

۳- حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ...... اردن

۴- حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ...... فلسطین

ان چاروں صوبوں کو فتح کرنے کے بعد ہر سالار کو اپنے اپنے مفتوحہ علاقے کی امارت یا گورنری سنبھالنا تھی۔

خلیفہ کی مزید ہدایت تھی کہ اگر جنگی حالات وضروریات کے تحت چاروں فوجوں کو کہیں اکٹھا ہونا پڑ جائے تو ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار اعلیٰ ہوں گے۔

فوجوں کو نصیحت

شام کی طرف فوجوں کو روانہ کرتے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فوجی سالاروں کو جو ہدایات دیں وہ تاریخ کے صفحات پر جنگ کے روشن اور رہنما اصولوں کی طرح ثبت ہیں۔ خلفائے راشدین کے عہد میں ان ہدایتوں اور اصولوں کی پوری طرح پابندی کی گئی۔ یہ وہ اصول ہیں جو قرآن وسنت کی روشنی میں رسولِ عربی رضی اللہ عنہ کے جانشینوں نے آج سے چودہ سو سال پہلے اپنی وحشی اور غیر مہذب فوجوں کے لئے وضع کئے کاش آج کی ''مہذب اور ترقی یافتہ'' مغربی اقوام اور ان کی سپر پاورز بھی ان پر عمل کرتیں۔ گزشتہ عالمی جنگوں میں ان کا ریکارڈ ہر لحاظ سے تاریک اور قابل مذمت رہا اور آج بھی ہے مؤرخ نے اپنی کتاب ''خلافت کا عروج وزوال'' کے ۱۹۱۴ء سے پہلے شائع ہونے والے ایڈیشن کے آخری باب میں لکھا تھا کہ دنیا میں اسلام نے جس قدر خونریزی کی ہے باقی دنیا نے مجموعی طور پر بھی اس کے برابر نہیں کی لیکن ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ میں مغربی اقوام نے جس خونریزی، بربریت اور تباہی سے پوری دنیا کو دوچار کیا اس نے خونریزی و ہلاکت کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ مات کر دیئے اور کتاب مذکور کا جو ایڈیشن اس جنگ کے بعد شائع ہوا اس میں سے اسلام کی خونریزی کے متعلق فقرات حذف کر دیئے گئے۔ مصنف اور ناشرین کو اپنی غلط بیانی پر خود ہی شرم آ گئی اور پھر دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹ء) نے تو خونریزی، ہلاکت، بربادی اور بہیمیت کے نئے ریکارڈ قائم کئے جو شاید تیسری عالمی جنگ میں سپر پاورز روس وامریکہ اور ان کے حلیف وحریف ہی ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے توڑیں گے۔ شاید اس کا آغاز ان کے کاشتہ و پروردہ اسرائیل کی جنگ بازی اور ہوس ملک گیری سے ہو۔ شاید بیگن کو امن کا نوبل پرائز حوصلہ افزائی کے طور پر ہی دیا گیا　ع

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد!

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دعاؤں اور نصیحتوں کے ساتھ فوجوں کو شام کی طرف روانہ کیا۔ گزشتہ صدی کا مشہور انگریز مؤرخ گبن رقم طراز ہے:

''جونہی فوجوں کی تعداد مکمل ہوگئی، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پہاڑی پر چڑھ کر مجاہدین ان کے گھوڑوں اور ہتھیاروں کا جائزہ لیا اور ان کی فتح و کامیابی کے لئے ایک عاجزانہ، پرخلوص اور پرسوز دعا مانگی۔ انہوں نے پہلے دن کے کوچ میں فوجوں کے ساتھ پیدل مشایعت کی۔ یہ دیکھ کر فوجی سالاروں کو شرم آئی اور انہوں نے بھی گھوڑوں سے اترنا چاہا لیکن خلیفہ نے انہیں یہ کہہ کر تسلی دی اور گھوڑوں سے اترنے سے منع کر دیا کہ اللہ کی راہ میں سوار اور پیدل ایک ہی درجہ رکھتے ہیں اور قابل قدر ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین نے کہا کہ ''یاد رکھو! خدا ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہیں دیکھتا ہے۔ موت کسی کو بھی آسکتی ہے۔ حشر و نشر یقینی ہے۔ جنت کی طلب کرو، ناانصافی اور ظلم و تشدد سے بچو۔ اپنے بھائیوں سے صلاح و مشورہ کرو اور اپنے ماتحت مجاہدوں کا اعتماد اور وفاداری برقرار رکھو۔ جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کرو تو مردانگی کا مظاہرہ کرو اور پیٹھ نہ پھیرنا۔ لیکن اپنی فتوحات کو عورتوں اور بچوں کے خون سے آلودہ نہ کرنا۔ کھجور کے درختوں کو نہ کاٹنا اور نہ اناج کے کھیتوں کو جلانا۔ دوسرے پھل دار درختوں کو بھی نہ کاٹنا۔ نہ مویشیوں کو نقصان پہنچانا سوائے اس کے کہ تم انہیں کھانے کے لئے ذبح کرو۔ جب عہد معاہدہ کرو تو اس کی پابندی کرو اور اپنے وعدے کا پاس کرو۔ جب تم آگے بڑھو گے تو تارک الدنیا مذہبی افراد پر تمہارا گزر ہوگا جو خانقاہوں میں رہتے ہوں گے اور اپنے طریقے سے خدا کی عبادت میں مشغول ہوں گے۔ ان سے تعرض نہ کرنا نہ انہیں قتل کرنا، نہ ان کی خانقاہوں کو تباہ کرنا۔''[1]

شام و فلسطین کی مہم پر جانے والے بعد کے فوجی سالاروں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما وغیرہ کو بھی اسی قسم کی ہدایات دیں جنہیں ولیم میور نے بھی اپنی تصنیف ''خلافت کا عروج وزوال'' میں دہرایا ہے۔ چونکہ یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو دنیا کے سب سے پرانے اور شام کے اہم ترین شہر دمشق کی فتح اور امارت پر تعینات کیا گیا تھا اور وہ دوسرے سالاروں کے مقابلے میں نسبتاً نو ایمان تھے اور بنی امیہ کے طاقتور قبیلے کے فرد اور سابق سردار مکہ ابوسفیان کے بیٹے تھے، اس لئے انہیں بطور خاص مزید نصائح کیں جن میں سے کچھ یہ ہیں جو ہمارے آج کل کے حکمرانوں کے لئے اقربا نوازی کے خلاف مشعل راہ ہوسکتی ہیں:

''اے یزید! تمہاری قرابتداریاں ہیں۔ شاید تم ان کو اپنی امارت سے فائدہ پہنچاؤ۔ درحقیقت یہی سب سے بڑا خطرہ ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی مسلمانوں کا حاکم مقرر ہوا اور ان کے کسی شخص کو بلا استحقاق رعائت کے طور پر افسر بنا دے، تو اس پر خدا کی لعنت ہو خدا اس کا کوئی عذر قبول نہیں کرے گا اور اس کو جہنم میں داخل کرے گا۔''

یہ تھے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جنگی (اور حکومتی پالیسی) کے رہنما اصول، انسانیت اور خدا ترسی سے معمور۔

---

[1] سلطنت روما کا انحطاط وزوال

Declineand Fall of the Roman Empire

اس وقت کی مشرق و مغرب کی دو عظیم ترین سلطنتوں......سپر پاورز......کی کثیر التعداد افواج اور اسلحہ و سامان کی فراوانی اور برتری کا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بخوبی علم تھا۔ وہ مسلم مجاہدین کی قلت تعداد اور جنگی ساز و سامان کی کمی سے بھی بے خبر نہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مرتدین، منکرین زکوٰۃ اور جھوٹے نبیوں کے پیروؤں سے مسلسل لڑکر مسلمان تھک چکے تھے۔ لیکن ان کے سامنے اسلام کی بقا کا سوال تھا۔ جنگ ناگزیر ہو گئی تھی۔ انہیں درپیش خطرات کا کما حقہ احساس تھا۔ لیکن نہ تو وہ گھبرائے نہ کسی پس و پیش میں مبتلا ہوئے۔ انہیں اپنے مقصد کی صداقت پر یقین تھا اور اللہ کی تائید و نصرت پر بھروسہ۔ شام کی مہم میں ایک ہزار مہاجر اور انصار صحابہ شامل تھے جن میں ایک سو بدری تھے یعنی اسلام کے اولیں غازی جن کی تائید و نصرت کے لئے اللہ نے فرشتے نازل کئے تھے اور ان کے صبر و عزیمت اور فتح و کامیابی پر قرآن نے یہ فرما کر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی کہ ''کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے اذن سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

رومیوں سے تصادم

قیصر روم ہرقل نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما اور شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے فوجی دستوں کے مقابلے میں الگ الگ فوجیں روانہ کیں تاکہ ہر ایک سے الگ الگ نپٹا جا سکے اور وہ اپنی قوت کو ایک جگہ مجتمع نہ کر سکیں۔ جنگی کارروائیوں کی نگرانی کے لئے وہ خود اپنے دوسرے دارالحکومت حمص میں آکر بیٹھ گیا، رومی افواج کی کثرت کو دیکھتے ہوئے مسلمان امرائے لشکر نے خلیفہ سے مزید کمک بھیجنے کی درخواست کی۔ چونکہ عراق فتح ہو چکا تھا اس لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو جلد از جلد عراق سے شام پہنچنے کی ہدایت کی۔ وہ راستے میں پڑنے والے شہر اور قلعے قراقیر، سویٰ، قصم، تدمر، مرج الراہط وغیرہ فتح کرتے ہوئے دس دن کے اندر بصریٰ کے سامنے جا نمودار ہوئے یہ وہی شہر تھا جس کے حکمران نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کو قتل کرا دیا تھا اور اب حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے اس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے سوا مسلمانوں کے سب لشکر یہاں جمع ہو گئے اور سب نے متفقہ طور پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اپنا سپہ سالار اعظم بنا لیا۔ سخت لڑائی کے بعد اہل بصریٰ نے شکست کھا کر جزیہ کی ادائیگی پر اطاعت قبول کر لی۔ شام کا یہ پہلا شہر ہے جو عہد صدیقی میں فتح ہوا۔

اجنادین کا معرکہ (۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳ھ......۳۱ جولائی ۶۳۴ء)[1]

بصریٰ کے بعد رومی افواج کا اجتماع اجنادین میں ہوا۔ جو یروشلم کے مشرق میں رملہ اور بیت جبرین کے درمیان ایک گاؤں تھا۔ مؤرخین کا اس امر میں اختلاف ہے کہ جنگ اجنادین پہلے لڑی گئی یا جنگ یرموک۔ چونکہ جنگ یرموک کے بعد ہرقل شام کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ کر قسطنطنیہ واپس چلا گیا تھا، اس لئے زیادہ قرین قیاس

---

[1] یہ ولیم میور اور مولانا شبلی کی روایت ہے۔ طبری کے مطابق جنگ اجنادین ۱۷ جمادی الاولیٰ کو پیش آئی جبکہ بلاذری ۱۸ جمادی الاولیٰ کے حق میں ہے بلکہ اس کی ایک دوسری روایت ۲ جمادی الاولیٰ کی بھی ہے۔ مؤلف

یہی ہے کہ اجنادین کا معرکہ پہلے پیش آیا جبکہ یرموک کا فیصلہ کن معرکہ عہد فاروقی میں وقوع میں آیا جس سے رومیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ اجنادین کی جنگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد کی پہلی اور آخری بڑی جنگ تھی جو رومیوں کے خلاف لڑی گئی۔ اس کے تقریباً تین ہفتہ بعد ان کا انتقال ہو گیا، شام فلسطین اور اردن کی قسمت کا فیصلہ عہد فاروقی میں دمشق اور یرموک کی فتوحات سے ہوا۔

بلاذری کی روایت کے مطابق اجنادین میں ایک لاکھ رومی فوج جمع ہوئی تھی جبکہ اسلامی افواج کی تعداد کل چالیس ہزار تھی۔ نظم وضبط، اجتماعی نقل وحرکت اور اسلحہ وسامان جنگ کے لحاظ سے رومی افواج عرب فوج کے مقابلے میں یقیناً برتر تھیں لیکن عرب شہسوار اپنے حملہ کی پھرتی اور سرعت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ جب تک دشمن ان کے اچانک اور تند وتیز حملہ سے سنبھلے وہ آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہوتے تھے۔

رومی سپہ سالار نے ''عرب لٹیروں'' کو کچھ دے دلا کر واپس بھیجنا چاہا کیونکہ ایرانیوں کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ بھوکے ننگے لوگ اپنے غریب ملک سے لوٹ مار کے لئے نکلے ہیں۔ وہ صدیوں کے غیر متمدن، جاہل، مفلس اور بے سروسامان صحرانشین عربوں سے کسی اعلیٰ مقصد کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو یہ پیشکش کی کہ اگر وہ اور ان کی فوج واپس چلے جائیں تو ہر سپاہی کو ایک دستار، ایک جوڑا کپڑے اور ایک طلائی دینار دیا جائے گا۔ سپہ سالار کو دس جوڑے کپڑے اور ایک سو طلائی دینار اور خلیفہ کو ایک سو جوڑے کپڑے اور ایک ہزار دینار۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہ پیشکش بڑی حقارت سے ٹھکرا دی اور کہا کہ ''رومی کتو! ہم تمہاری اس خیرات کو حقارت سے ٹھکراتے ہیں کیونکہ جلدی ہی ہم تمہارے مال و دولت، تمہارے کنبوں اور خود تمہاری ذاتوں کے مالک بن جائیں گے۔''

جنگ شروع ہونے سے پہلے رومی سپہ سالار نے اسلامی کیمپ اور فوج کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایک جاسوس بھیجا۔ اس نے ایک رات اور ایک دن اسلامی کیمپ میں گزارا اور پھر واپس جا کر یہ رپورٹ دی کہ ''مسلمان اپنی راتیں راہبوں کی طرح خدا کی عبادت اور قیام وسجود میں گزارتے ہیں اور دن گھوڑوں کی پیٹھ پر جنگ جو سواروں کی طرح۔ وہ نیکوکار اور انصاف پسند ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی زنا کا مرتکب ہو۔ خواہ وہ شہزادہ ہی کیوں نہ ہو، تو وہ اسے سنگسار کر دیں گے اور اگر وہ چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیں گے۔'' یہ سن کر سپہ سالار گھبرا گیا اور بولا کہ اگر تم نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے تو ایسے دشمن کا مقابلہ کرنے سے مرجانا بہتر ہے۔''

بہرحال بڑی ہولناک اور خونریز جنگ ہوئی۔ صرف چار سو مسلمان شہید ہوئے[1] جبکہ پچاس ہزار رومی خاک وخون میں مل گئے۔ رومی فوج کے بقیۃ السیف نے انطاکیہ، قیصریہ اور دمشق کی طرف بھاگ کر جان بچائی۔

طبری نے لکھا ہے کہ ہرقل بذاتہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے خلاف تھا لیکن امرائے سلطنت اور مذہبی پیشواؤں نے اسے مجبور کر دیا۔ اجنادین کے بعد وہ حمص سے انطاکیہ چلا گیا اور از سر نو فوجوں کو منظم اور مسلح کرنا

---

[1] یہ ''سلطنت روما کا عروج وزوال'' کے مصنف ایڈورڈ گبن کا بیان ہے۔ علامہ شبلی نے الفاروق میں مسلمان شہداء کی تعداد تین ہزار لکھی ہے۔ مؤلف

شروع کیا۔ اجنادین کی فتح کے بعد غزہ، جافہ، نابلس، عسقلان، رملہ، سدون وغیرہ آسانی سے فتح ہو گئے اور سارے جنوبی شام پر اسلام کا علم لہرانے لگا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بڑی خواہش شام، فلسطین اور اردن کو اسلامی ریاست کے زیر نگین لانے کی تھی لیکن اس کی تکمیل سے پہلے وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اجنادین کی فتح کی خبر انہیں وفات سے چوبیس دن پہلے مدینہ میں موصول ہوئی۔

اجنادین کی فتح میں بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا جو اس سے پہلے کسی جنگ میں دستیاب نہیں ہوا تھا۔ سونے چاندی کی سینکڑوں صلیبیں، قیمتی جواہرات، طلائی اور نقرئی زنجیریں بیش قیمت ملبوسات اور جنگی اسلحہ وسامان کے انبار کے انبار ہاتھ لگے جو آئندہ جنگوں میں مسلمانوں کے کام آئے۔ اجنادین سے فارغ ہو کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے دمشق کا محاصرہ کر لیا جس نے طول پکڑا اور فتح سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا ع

خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بود!

عراق کی صورتِ حال، مثنیٰ کی مدینہ میں حاضری

خلیفۂ اول کے حکم کے مطابق حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق سے شام روانہ ہوتے وقت حیرہ میں باقی ماندہ افواج کی کمان اور مفتوحہ علاقوں کا نظم و نسق حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ شیبانی کو سونپ گئے۔ مثنیٰ کے پاس مجاہدین کی ایک قلیل تعداد باقی رہ گئی تھی لیکن ان کے حوصلے بلند تھے۔ وہ ایرانی حکومت کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی محدود فوج کو بڑی سوجھ بوجھ سے دفاعی پوزیشنوں میں ایرانی دارالحکومت کے رخ پھیلا دیا۔ اس اثنا میں تخت ایران پر یکے بعد دیگرے مختلف شہزادے بیٹھے اور معزول ہوئے یا مارے گئے۔ آخر شہریران بن اردشیر کو اتفاق رائے سے شہنشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس نے داخلی نظم و نسق درست کرنے کے بعد مسلمانوں سے عراق واپس لینے کا تہیہ کیا۔ خالد رضی اللہ عنہ اور ان کی فوج کے چلے جانے کے بعد اس نے یہ سنہری موقع سمجھا۔ ہرمز نامی ایک تجربہ کار جرنیل کو دس ہزار فوج دے کر مسلمانوں کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ لیکن تاریخی شہر بابل کے کھنڈروں کے قریب مثنیٰ نے اسے شکست دی اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایرانی دارالحکومت مدائن کے دروازوں تک پہنچ گئے، لیکن مدائن فتح کرنے کے لئے مثنیٰ کے پاس کافی فوج نہ تھی۔ شاہ ایران مر گیا اور ایک ایرانی شہزادی آزرمی دخت تخت پر بیٹھی۔ ایرانیوں نے ایک بار پھر نئے جوش و خروش سے مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کو مفصل رپورٹ بھیجی اور لکھا کہ اس وقت ایرانیوں پر کاری ضرب لگانے کا اچھا موقع ہے۔ اگر مدینہ سے کمک بھیجی جا سکے تو فبہا ورنہ ارتداد سے تائب شدہ قبائل کو فوج میں بھرتی کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ وہ جہاد میں شرکت کے لئے بے تاب ہیں اور اس نازک وقت میں اسلام کے کام آسکتے ہیں۔ جب کافی دنوں تک مدینہ سے جواب نہ آیا اور ایرانیوں کی جنگی تیاریاں عروج پر پہنچ گئیں تو مثنیٰ رضی اللہ عنہ برق رفتاری سے مدینہ

پہنچے، وہاں انہوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بستر مرگ پر پایا۔ تاہم اس حالت میں بھی انہوں نے مثنیٰ کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں اور پھر حضرت عمر (جن کی نامزدگی کا اعلان کیا جاچکا تھا) کو بلا کر حسب ذیل یادگار وصیت کی۔

''عمر! میری بات غور سے سنو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ مجھے امید نہیں کہ میں شام تک زندہ رہ سکوں گا۔ میرے مرنے کے بعد تم کل کا دن ختم ہونے سے پہلے پہلے مثنیٰ کے ساتھ لوگوں کو جہاد پر روانہ کر دینا۔ تمہیں کوئی مصیبت دینی کام اور حکم الٰہی سے غافل نہ کرنے پائے۔ تم نے دیکھا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا کیا تھا؟ حالانکہ اس وقت مسلمان ایک بہت ہی بڑی ابتلا میں تھے، اگر میں اس وقت اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی بجا آوری میں دیر کرتا اور کمزوری دکھاتا تو نہ صرف مدینہ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی نذر ہو جاتا بلکہ اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ جب اہل شام پر فتح حاصل ہو جائے تو اہل عراق کو عراق واپس بھیج دینا کیونکہ وہی عراق کے کاموں کو خوب انجام دے سکتے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قریب المرگ خلیفہ اول کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں اور ان پر فوری عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ایک فوج مثنیٰ کے ہمراہ کر دی اور انہیں تائب شدہ مرتدین کو اسلامی لشکر میں شامل کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

جاں بحق تسلیم کرنے سے پہلے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلیفہ کی حیثیت سے ملت کے مفاد میں یہ آخری سرکاری کارروائی تھی، مرتے دم تک انہیں اسلام کا غلبہ اور مسلمانوں کا مفاد مدنظر رہے۔ مشرق و مغرب کی عظیم سلطنتوں سے جو ٹکر انہوں نے لی تھی، مرتے دم تک اس کی کامیابی کی فکر ان کے دل و دماغ پر حاوی رہی۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت اگرچہ بہت مختصر تھا لیکن اپنے کارناموں، فتوحات اور اثرات کے لحاظ سے بڑی بڑی قدیم اور مضبوط سلطنتوں سے بازی لے گیا۔ انہیں اس حقیقت کا ادراک حاصل تھا کہ ایمان ایک ایسی قوت ہے جس پر اس وقت تک کوئی طاقت غالب نہیں آسکتی جب تک مومن نفسانی خواہشات سے منزہ ہو کر محض حق و صداقت کی تبلیغ کے لئے اپنی زندگی وقف کئے رکھتا ہے۔

جمع قرآن

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک اہم کارنامہ بلکہ اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کے منتشر اجزا کو جمع کر کے کتابی صورت میں مرتب و مدون کیا اور مصحف کے طور پر آئندہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ قرآن مجید کو کتابی صورت میں جمع اور مدون کرنے کا خیال سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت آیا جب جنگ یمامہ میں تقریباً تین سو حفاظ صحابہ شہید ہو گئے۔ انہیں خوف پیدا ہوا کہ اگر اسی طرح حافظ قرآن صحابہ شہید ہونے لگے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن کے بعض حصے، سورتیں اور آیات ضائع ہو جائیں۔ انہوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنا اندیشہ ظاہر کیا اور قرآن کو کتابی صورت میں جمع کرنے کا مشورہ دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلسل اصرار سے معاملہ کی اہمیت

ان پر واضح ہوگئی اور انہوں نے حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی رہ چکے تھے اور جن کی دیانت وصداقت میں کسی کو شک نہ تھا، اس کام پر مامور کیا۔ قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم خداوندی سے مقرر کر دی تھی اور اس کے مطابق آپ صحابہ کو لکھواتے تھے اور وہ حفظ کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں مفصل روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام ہر سال رمضان کے مہینے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دفعہ قرآن سناتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری رمضان میں دو دفعہ سنایا چونکہ قرآن کا نزول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں مکمل ہو چکا تھا اور جبریل علیہ السلام نے آخری رمضان میں دو دفعہ سنایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی ترتیب بھی مکمل ہو چکی تھی۔ سورتوں کے نام بھی متعین کر دیئے گئے تھے اور جو آیات الگ الگ نازل ہوئی تھیں، حکم خداوندی کے مطابق ان کے مقام بھی مختلف سورتوں میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کر دیئے تھے، نیز ابتداء میں رمضان کی نماز تراویح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز با جماعت پڑھائی تھی ظاہر ہے کہ اس میں بھی سورتوں کی تلاوت ترتیب سے کی ہوگی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق سورتوں کو زبانی یاد کر لیا تھا اور جو لکھ سکتے تھے وہ کھالوں، ہڈیوں، لکڑیوں، پتھروں وغیرہ پر لکھ لیتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوزید رضی اللہ عنہ نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سن کر قرآن حفظ کر لیا تھا اور بہت سوں نے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سن کر یاد کر لیا تھا جو تعلیم کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کئے تھے۔ یہ حقیقت ہے جب سے قرآن وحی کی صورت میں نازل ہونا شروع ہوا تب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لکھوانے کا اہتمام کیا اور صحابہ کو یاد کرانے کا بھی۔ روایات میں متعدد کاتبان وحی کے نام ملتے ہیں۔ مختلف صحابہ مختلف اوقات میں کاتب وحی رہے اسلام لانے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اپنی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر گئے تو وہاں انہیں آیات قرآنی پر مشتمل چند اوراق پڑھنے کا موقع ملا جس سے متاثر ہو کر وہ مسلمان ہو گئے۔

یہ اسلام کے ابتدائی دور کی بات ہے اور ثابت کرتی ہے کہ قرآن کے اجزا ابتدا ہی سے لکھے جاتے تھے۔ البتہ تمام سورتیں مرتب مجموعہ کی صورت میں ایک جگہ موجود نہیں تھیں۔ مشہور صحابی عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے قرآن جمع کیا تھا اور اسے ایک رات میں ختم کرتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہدایت کی کہ سات دن میں ختم کیا کرو۔

سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیت ہی میں قرآن کو ذالک الکتاب، (یہ کتاب) کہا ہے۔ سورۂ کہف کی آیت ۲۷ میں واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک آیا ہے۔ اسی طرح متعدد دوسری سورتوں میں قرآن کے لئے کتاب کا لفظ آیا ہے اور کتاب ایک مرتب و مدون، ابواب وفصول میں منقسم تحریر ہی کو کہا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی دل نہیں مانتا کہ جو الٰہی کتاب دین اسلام کی جڑ بنیاد ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے غیر مرتب، غیر منظم اور منتشر حالت میں چھوڑ گئے ہوں۔ اور پھر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَنَحْنُ لَهُ لَحَافِظُونَ (ہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) حفاظت کے انتظام میں جمع و ترتیب بھی شامل ہے اور پھر یہ فرمان الٰہی کہ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً بھی ظاہر کرتا ہے کہ قرآن مکتوبی صورت میں موجود تھا اگرچہ اس کے اجزا منتشر

تھے۔

بہر حال حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنا مفوضہ کام بڑی محنت و دیانت سے سرانجام دیا۔ انہوں نے لکڑیوں، پتھروں، کھالوں، ہڈیوں، پتوں وغیرہ پر لکھے ہوئے قرآنی اجزا صحابہ سے حاصل کئے اور حفاظ سے بھی استفادہ کیا۔ ان کا محاسبہ اور پڑتال کرنے کو اکابر صحابہ موجود تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کی ہوئی ترتیب قائم رکھی اور قرآن کریم چمڑے کی کھالوں پر لکھ کر جمع کر دیا۔

محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں:

”زید رضی اللہ عنہ نے جس قدر محنت اور جاں فشانی سے کام کیا۔ موجودہ محققین میں سے کسی کو اس کا عشر عشیر بھی کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اعلان کر دیا تھا کہ جس شخص نے قرآن کریم حفظ کیا ہو یا اس کا کوئی حصہ لکھا ہو وہ زید کو اس کی اطلاع دے اور لکھا ہوا حصہ ان کے سامنے پیش کرے۔ چنانچہ زید رضی اللہ عنہ کے پاس ہڈیوں، پتوں، کھجور کے درخت کی چھالوں، چمڑوں اور پتھروں پر لکھی ہوئی آیات اور سورتیں کثیر تعداد میں جمع ہونے لگیں۔ جب آیات اور سورتوں کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام مکمل ہو گیا تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ان کی جانچ پڑتال شروع کی اور ترتیب کا کام شروع کیا۔ کوئی آیت اس وقت تک قبول نہ کرتے تھے جب تک اچھی طرح تحقیق نہ کر لیتے تھے کہ واقعی یہ آیت اسی طرح رسول اللہ پر نازل ہوئی تھی۔“

قرآن مجید جمع کرنے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جس انہماک، محنت اور احتیاط سے کام لیا اس نے آئندہ کے لئے کلام اللہ کو ہر قسم کی تحریفات سے محفوظ کر دیا۔ چنانچہ تمام منصف مزاج مستشرقین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ موجودہ قرآن بعینہ وہی قرآن ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ سر ولیم میور لکھتے ہیں:

”کوئی فقرہ کوئی جزو، کوئی لفظ قرآن میں ایسا نہیں سنا گیا جو جمع کرنے والوں نے چھوڑ دیا ہو اور کوئی لفظ ایسا نہیں سنا گیا جو اس مسلم مجموعہ میں شامل کر دیا گیا ہو۔ جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن کی طرح بارہ صدیوں (اب چودہ صدیوں، مؤلف) تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو احادیث میں جن میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی محفوظ رکھی گئی ہیں، ان کا پتہ چل جاتا۔“

حال ہی میں کمپیوٹر کی مدد سے امریکہ اور مصر میں قرآن کے الفاظ و آیات وغیرہ کے بارے میں جو ریسرچ کی گئی ہے اس سے بھی اس کا غیر محرف اور غیر متبدل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر کہیں کوئی حرف، کوئی لفظ بلکہ کسی لفظ کے ہجے بھی بدل گئے ہوتے تو قرآن کا اندرونی نظام تہ و بالا ہو گیا ہوتا۔ اس سلسلے میں مصری محققین اور فضلا اور ڈاکٹر راشد خلیفہ کا کتابچہ ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معجزہ“ (The Perpetual Miracle of Muhammad) محمد فواد الباقی کی تصنیف، المعجم المفہرس الالفاظ القرآن الحکیم اور ڈاکٹر عبد الرزاق نوفل کی ”اسلام دین و دنیا“ کا مطالعہ

دلچسپ اور بصیرت افروز ثابت ہوگا، نیز پاکستانی عالم محمد شفیع رانوی کی تصنیف ''عددی اعجاز القرآن'' بھی چشم کشائی کا کام کرے گی۔

علم طبیعیات کی جدید ترین تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اعداد کا ایک خاص آرڈر اور ان کی مخصوص ترتیب ہی کائنات کو وجود میں لانے کا سبب ہے۔ کمپیوٹری تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مادی کائنات کی مخصوص اندرونی نظم و ترتیب کی طرح خالق کائنات کی آخری کتاب قرآن حکیم کے حروف والفاظ وآیات کی کائنات میں بھی ایک داخلی ترتیب وتوازن اور ہم آہنگی کارفرما ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔

عہد حاضر کا نامور فرانسیسی سائنس داں، محقق اور ماہر طب ڈاکٹر ماریس بوکائی (Maurice Bucaille) اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس'' میں رقم طراز ہے:

> ''اگر بعد میں قرآنی متن میں کچھ تحریف یا ترمیم کی جاتی تو یہ بات بظاہر ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ یہ مبہم آیات (یعنی سائنسی موضوعات سے متعلق آیات جو قرآن میں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں) انسانی دستبرد سے محفوظ رہ سکتیں، متن میں ہلکی سی ترمیم بھی ان آیات میں پائے جانے والے باہمی ربط وضبط کو خود بخود تباہ کر دیتی اور ہم اس قابل نہ رہتے کہ جدید علم اور ان آیات کے درمیان مطابقت ثابت کر سکتے حالانکہ یہی ربط وضبط ان آیات کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ان آپس میں مربوط آیات و بیانات کی قرآنی متن میں موجودگی ایک غیر جانبدار مبصر کو قرآن کے مستند اور ترمیم وتحریف سے پاک صحیفۂ آسمانی ہونے کا قائل کر دیتی ہے۔''

اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے اسی مصحف صدیقی کی نقلیں کروا کر مختلف اسلامی ممالک میں بھیجی تھیں۔ اصل جامع القرآن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے مرتبہ مصحف کی اشاعت کی۔

یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ یہ مرتبہ نسخہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں دیا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں حالانکہ اگر چاہتے تو خود اپنی صاحب زادی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں بھی دے سکتے تھے لیکن شاید ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر رہنے کے لئے ایسا کیا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی علالت اور وفات

مشہور انگریز ناول نگار ٹامس ہارڈی نے اپنے ڈرامہ ''فرمانروا'' (Dynasts) میں لکھا ہے کہ ''بڑے آدمی شہاب ثاقب کی مانند ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کو روشنی سے معمور کرنے کے لئے اپنے آپ کو بھسم کر دیتے ہیں۔'' یہ قول بڑی حد تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر صادق آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ان کے لئے ان کی زندگی کا عظیم ترین صدمہ تھی۔ اور پھر اس نحیف الجثہ انسان کے کندھوں پر خلافت کا بار گراں آپڑا۔ جس نے اس ملول و غمزدہ انسان کی زندگی کے بقیہ سوا دو سال کو سراسر حرکت وعمل سے معمور کر دیا۔ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ امن وسکون کا

لمحہ نہ رہا ان کے دن اور راتیں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت اور بھلائی کے لئے وقف ہو گئیں۔ عنان خلافت سنبھالتے ہی انہیں مرتدین، مانعین زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت کے فتنوں اور شورشوں سے نپٹنا پڑا۔ ابھی ان سے فراغت پائی ہی تھی کہ ایران و روم کی سلطنتوں سے آویزش شروع ہو گئی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو چومکھی لڑائی لڑنا پڑی۔ ان حالات میں ان پر بہت زیادہ جسمانی، دماغی اور نفسیاتی دباؤ پڑا۔ وہ ہمیشہ یہ آرزو کرتے رہے کہ جلد سے جلد اپنے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر سے زیادہ عمر نہ پائیں۔

۷ جمادی الآخر ۱۳ھ پیر کے دن جب ہوا بہت ٹھنڈی تھی انہوں نے غسل کیا۔ سردی لگ گئی اور تیز بخار چڑھ گیا۔ بیماری کے خلاف دفاع کی خواہش تو تھی ہی نہیں، علاج کی طرف توجہ نہیں کی عیادت کو آنے والے صحابہ نے طبیب سے رجوع کا مشورہ دیا تو فرمایا کہ ''طبیب نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ وہ کہتا ہے میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔'' صحابہ سمجھ گئے کہ قضائے الٰہی پر راضی ہیں۔ اس لئے خاموش ہو گئے۔ بخار کی شدت اور نقاہت کی وجہ سے اس دوران میں نماز بھی نہ پڑھا سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز کی امامت کرتے رہے۔ پندرہ دن بیمار رہے اور ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ (۲۳ اگست ۶۳۴ء) کو پیر کا دن گزرنے کے بعد رات کی ابتدائی گھڑیوں میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پیر کے دن ہوئی تھی۔ اس لئے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بڑی آرزو تھی کہ ان کی وفات بھی پیر کے دن ہو اور وہ اسی دن دفن کئے جائیں۔ چنانچہ پیر اور منگل کی درمیانی رات کو اپنے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں اپنی صاحب زادی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں اس طرح دفن کئے گئے کہ ان کا سر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شانۂ مبارک کے برابر رکھا گیا۔ یوں رفیق غار، رفیق ہجرت اور رفیق بدر کو اپنے محبوب رہنما صلی اللہ علیہ وسلم کی ابدی رفاقت بھی نصیب ہو گئی۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

ہمت او کشت ملت را چو ابر
ثانی اسلام و غار و بدر و قبر!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھا تھا کہ تین چاند ان کے حجرے میں اترے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو وہ چپ رہے۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اور حجرۂ عائشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابدی آرام گاہ بنا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ''عائشہ! یہ ان تین چاندوں میں سے پہلا اور بہترین چاند ہے۔'' دوسرا چاند خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ثابت ہوئے اور تیسرا چاند حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔ مرتے وقت آپ کی زبان پر یہ دعا تھی۔ رب توفنی مسلما والحقنی بالصالحین (اے اللہ! مجھے مسلمان کی حیثیت سے موت دے اور اپنے صالح بندوں کے ساتھ ملا دے)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور ان کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے قبر میں اتارا۔

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم غیب یک دانائے راز آید بروں

جان بحق تسلیم کرنے سے پہلے وصیت کی کہ میرے بدن پر جو دو چادریں ہیں انہی کو دھو کر بطور کفن استعمال کیا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ابا جان! ہم اس قابل ہیں کہ آپ کو نئے کپڑے کا کفن دیں۔ فرمایا "میری بیٹی! زندہ انسان نئے کپڑوں کے زیادہ محتاج اور مستحق ہیں۔ عمدہ یا خراب کفن عزت یا ذلت کا باعث نہیں" چنانچہ انہی دو چادروں میں آپ کو کفنایا گیا۔

مدت خلافت

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو خلیفہ ہوئے۔ ۲۲ جمادی الاخر ۱۳ھ کو ان کا انتقال ہوا۔ لہٰذا مدتِ خلافت سن ہجری کے مطابق دو سال تین ماہ اور دس دن ہوئی۔ ابن سعد کے مطابق دو سال چھ ماہ اور دس دن، سیوطی کے بقول دو سال سات ماہ، سید امیر علی نے ڈھائی سال اور ولیم میوٗر نے سوا دو سال دی ہے۔ میوٗر کا اندازہ قریب ترین ہے۔ صحیح میعاد دو سال تین ماہ دس دن ہی بنتی ہے۔

عمر

وفات کے وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عمر ترسیٹھ برس تھی۔ یعنی وہی عمر جو ان کے آقائے نامدار محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پائی۔ اپنی ارضی زندگی کی میعاد میں بھی انہوں نے اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ خلفائے راشدین میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سوا باقی تینوں کا انتقال ترسیٹھ برس کی عمر میں ہوا اور چاروں میں سے صرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے طبعی موت پائی۔ اگرچہ چاروں خلفاء کے نام حرف ع[1] سے شروع ہوتے ہیں لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہوئے اور پکارے گئے۔ جو حرف الف سے شروع ہوتی ہے۔ بقیہ تینوں خلفا عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ اپنے اسمائے گرامی سے جانے پہچانے گئے اور تینوں شہید ہوئے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ ان کے بعد صرف چھ ماہ زندہ رہے اور عہد فاروقی میں ستانوے سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کی والدہ حضرت ام الخیر سلمیٰ رضی اللہ عنہا کی وفات پہلے ہو چکی تھی۔

چار پشتیں صحابی

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی چار پشتیں صحابی ہیں اور اس شرف میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں۔ ان کے اپنے علاوہ ان کے والد ابوقحافہ رضی اللہ عنہ، صاحب زادے عبداللہ رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور پوتے عتیق بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی شرف صحابیت سے بہرہ یاب ہوئے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذاتی اور خاندانی وصیتیں

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ علالت سے جانبر نہیں ہوں گے۔ دراصل ہونا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے اپنی علالت کے دوران میں انہوں نے اپنے ذاتی اور خلافتی معاملات کے متعلق ضروری

۱۔ حضرت ابوبکر کا اصل نام عبداللہ یا عتیق تھا۔ مولف

وصیتیں کر دیں تا کہ ضمیر میں کسی قسم کی خلش نہ رہے اور خدا اور بندوں کے ساتھ ان کا معاملہ صاف ہو جائے۔ ملت اسلامیہ کے بارے میں ان کی سب سے اہم اور اولین وصیت حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لئے نامزدگی کی سفارش تھی۔ اس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔ اپنی تکفین و تدفین اور حضرت مثنیٰ بن حارثہ کو فراہمی لشکر کے متعلق ان کی وصیتوں کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہاں ان کی چند ذاتی اور نجی وصیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بیت المال کے وظیفہ کی واپسی

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے دوران میں انتہائی مجبور کن حالات میں اکابر صحابہ کے پر اصرار مشورہ سے بیت المال سے وظیفہ لینا قبول کیا تھا کیونکہ خلافت کی ہمہ وقتی گرانبار ذمہ داریوں کی وجہ سے وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ اپنی روزی کمانے کے لئے اپنا تجارتی کاروبار جاری رکھ سکیں۔ لیکن ان کے دل میں متواتر یہ خلش رہی کہ انہیں اپنے اہل و عیال کے لئے مسلمانوں کے بیت المال سے کچھ نہیں لینا چاہئے تھا۔ بیماری کے دوران میں انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور دوسرے اعزہ کو بلا کر وصیت کی کہ بیت المال سے جو رقم انہوں نے بطور کفاف لی ہے اس کا حساب کر کے بیت المال کو لوٹا دی جائے اور اس غرض سے ان کی فلاں زمین فروخت کر دی جائے۔ نیز بیت المال کا جو ایک اونٹ، ایک غلام اور ایک چادران کے پاس ہے، ان کی وفات کے بعد نئے خلیفہ کو پہنچا دیئے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب یہ سب کچھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو وہ رو پڑے اور فرمایا ''اللہ ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحم کرے۔ انہوں نے یہ پسند نہ کیا کہ ان کی وفات کے بعد کسی شخص کو ان پر اعتراض کرنے کا موقع ملے۔ اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! آپ نے اپنے جانشین پر بہت سخت بوجھ ڈال دیا ہے۔''

کیا دنیا کی تاریخ میں کسی دوسرے حکمران کا یہ کردار نظر آتا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی بیت المال سے صرف بقدر کفاف رقم لی مگر لوٹائی نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چونکہ مالدار تھے۔ انہوں نے اپنی ذات کے لئے تو بیت المال سے کچھ نہیں لیا لیکن لوگوں کو غلط شکایت پیدا ہوئی جو ایک منصوبہ کے تحت پیدا کی گئی کہ وہ بیت المال سے اپنے رشتہ داروں کو نوازتے ہیں حالانکہ وہ اپنے ذاتی مال سے دیتے تھے۔ اور پھر خلفائے اربعہ کے بعد بنی امیہ[1] اور بنی عباس نے بیت المال کو اپنا ذاتی خزانہ بنالیا اور جیسے چاہا اپنی ذات اور اپنے عزیز و اقارب پر خرچ کیا اور اپنے منظور نظر لوگوں پر لٹایا۔ پھر کئی صدیوں بعد ہمیں اسلامی ہندوستان کی تاریخ میں دو صاحب تخت و تاج ہستیاں نظر آتی ہیں جو مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوجود شاہی خزانہ سے اپنی ذات پر کچھ خرچ نہیں کرتے تھے بلکہ قرآن مجید کے نسخے لکھ کر اور ٹوپیاں سی کر بیچتے تھے اور اس سے اپنا گزارہ کرتے تھے۔ یہ تھے خاندان غلاماں کے سلطان ناصر الدین محمود اور خاندان مغلیہ کے اورنگ زیب عالمگیر رحمہم اللہ۔

دنیا کے دوسرے ممالک و اقوام میں ہمیں ایسا کوئی حکمران دکھائی نہیں دیتا۔

۱۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (مؤلف)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے زمین کی واپسی

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے بہت عرصہ پہلے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کچھ زمین ہبہ کی تھی جس میں کھجور کے پھلدار درخت تھے۔ لیکن حضرت عائشہ نے ابھی اس پر اپنا قبضہ نہیں کیا تھا اور اس کی بافت نہیں اٹھائی تھی کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وقت آخر آ پہنچا۔ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ''اے میری پیاری بیٹی! مجھے یہ ہرگز پسند نہیں کہ میرے بعد تمہیں مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ میں تمہیں مرفہ الحال دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن انصاف اور قانون وراثت کا تقاضا یہ ہے کہ میں نے کھجور کے درختوں والی جو زمین تمہیں دی تھی اور جس پر اب تک نہ تم نے قبضہ کیا نہ اس سے کوئی استفادہ کیا، واپس کر دو تا کہ تم سب بہنوں اور بھائیوں میں قرآن کے احکام کے مطابق تقسیم کی جائے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ ''ابا جان، آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میری تو ایک ہی بہن (اسماء رضی اللہ عنہا) ہیں اور آپ بہنوں (بہ صیغہ جمع) کی بات کر رہے ہیں؟'' صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''تمہاری سوتیلی ماں حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت خارجہ رضی اللہ عنہ امید سے ہیں میرا خیال ہے کہ ان کے لڑکی پیدا ہوگی۔'' چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ام کلثوم پیدا ہوئیں۔

خمس کی وصیت

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مزید وصیت کی کہ میرے مال کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کرا دیا جائے پانچویں حصے (خمس) میں کسی رشتہ دار کا کوئی حق نہیں۔ یہ مال راہ خدا میں خرچ کیا جائے۔ اس وصیت سے ظاہر ہے کہ آپ نے یقیناً کچھ اثاثہ بطور ترکہ چھوڑا جو ورثا میں قابل تقسیم تھا ورنہ خمس کی وصیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانشینی کی وصیت

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وصیتوں میں سے اہم ترین وصیت اپنے جانشین کے متعلق تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد انتخاب خلیفہ کے سلسلے میں سقیفہ بنی ساعدہ میں جو کچھ پیش آیا تھا وہ انہیں اچھی طرح یاد تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کا اعادہ ہو۔ انہیں اپنے جانشین کے متعلق تشویش تھی اور وہ اپنی علالت کے دوران میں متواتر اس پر غور و خوض کرتے رہے تھے تا کہ ان کی وفات کے بعد پھر انصار و مہاجرین کے درمیان یا خود مہاجرین کے درمیان نزاع پیدا نہ ہو جائے۔ اختلافات کا سد باب کرنے کے لئے انہوں نے انتہائی نیک نیتی، اخلاص اور مسلمانوں کی خیر خواہی کو مدنظر رکھتے ہوئے سوچا کہ اپنی وفات سے پہلے اپنے جانشین کا تعین کر جائیں۔ اگرچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً ایسا نہیں کیا تھا۔ اس میں گہری حکمت و مصلحت کار فرما تھی تا کہ عامۃ المسلمین کے دلوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد شخص کے متعلق یہ خیال جاگزیں نہ ہو جائے کہ چونکہ اسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خلیفہ نامزد کیا ہے۔ اس لئے وہ بھی براہ راست اللہ سے احکام حاصل کرتا ہے لہٰذا خلیفۃ اللہ ہے اور انسانوں کے سامنے جوابدہ نہیں۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نزول وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ لوگوں کے دلوں سے کسی قسم کی ممکنہ

غلط فہمی دور کرنے کے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو خلیفۃ اللہ کی بجائے خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہلانا پسند کیا۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارے کنائے سے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو خلافت کا مستحق قرار دیا تھا لیکن آخری فیصلہ مسلمانوں کے اتفاق رائے پر چھوڑ دیا تھا۔

غور وخوض کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہی ایک ایسے شخص ہیں جو خلافت کی گرانبار ذمہ داریوں کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ لیکن انہوں نے مطلق العنان طریقے سے عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کر کے مسلمانوں کی گردنوں پر سوار کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اکابر صحابہ سے مشورے کئے اور ان کے اتفاق رائے کے بعد باقاعدہ اپنی وصیت لکھوائی۔ اور پھر اہل مدینہ (کہ وہی اس وقت ارباب حل وعقد تھے) کے سامنے اپنی تجویز پیش کی۔ وصیت پڑھ کر سنائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ان کا اجماع حاصل کیا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ کو الگ الگ بلا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "عمر رضی اللہ عنہ بہترین شخص ہیں لیکن ان کے مزاج میں سختی ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "عمر اس لئے سخت تھے کہ میں نرم تھا لیکن جب خلافت کی ذمہ داری خود ان پر پڑے گی تو ان کی سخت مزاجی کافی حد تک نرمی میں بدل جائے گی۔ اگر میں کسی پر ناراض ہوتا اور سختی سے پیش آتا تھا تو عمر رضی اللہ عنہ مجھے نرمی اختیار کرنے کا مشورہ دیتے تھے اور اگر میں نرمی برتتا تو وہ سختی اختیار کرتے۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "عمر رضی اللہ عنہ کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور وہ علم وفضل کے لحاظ سے ہم سے بہتر ہیں۔"

پھر انہوں نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور دیگر سرکردہ مہاجرین وانصار سے بھی مشورے کئے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ کے سوا سب نے اتفاق کیا۔ موخر الذکر نے کہا کہ "جب اللہ آپ سے عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کے متعلق پوچھے گا تو آپ کیا جواب دیں گے؟ آپ کی موجودگی میں وہ لوگوں سے جس طرح پیش آتے تھے وہ آپ کو معلوم ہے۔ آپ کے بعد جب وہ خود خلیفہ ہوں گے تو لوگوں پر کیا کیا سختیاں نہیں کریں گے؟"

یہ سن کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جلال آ گیا، بخار اور نقاہت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ "کیا تم مجھے اللہ کے غضب سے ڈراتے ہو؟ واللہ! جب میں اللہ کے دربار میں پیش ہوں گا تو عرض کروں گا کہ اے اللہ! میں نے تیرے بندوں پر تیرے سب سے بہتر بندے کو خلیفہ بنایا ہے۔ اور اے ابومحمد! (طلحہ) سنو، جو کچھ میں نے اس وقت کہا ہے دوسروں تک بھی پہنچا دینا۔" صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنی نیت کے خلوص اور فیصلہ کی اصابت پر کس قدر اعتماد تھا! اس سے پہلے وہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے مشیروں کو خلافت کے لئے مجوزہ نام کو صیغہ راز میں رکھنے کی ہدایت کرتے رہے تھے۔ لیکن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی باتوں سے انہیں ذہنی اذیت پہنچی اور انہوں نے وصیت نامہ لکھوانے سے پہلے ہی اپنے مجوزہ شخص کے نام کا اعلان کرنے کے لئے کہہ

دیا۔ دراصل ان کا فیصلہ خالصتاً اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی میں تھا۔ انہوں نے اپنے کسی بیٹے، عزیز یا ہم قبیلہ شخص کا نام تجویز نہیں کیا تھا بلکہ بنی عدی کے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا جن سے اسلامی اخوت کے سوا کوئی دوسری رشتہ داری نہ تھی۔

لیکن انہوں نے مدینہ کے عامتہ المسلمین کو بھی اعتماد میں لینا اور ان سے استصواب کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ وہ اپنے مکان کی بالکونی میں اس طرح گئے کہ ان کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بنت عمیس نے انہیں اپنے بازوؤں میں تھام رکھا تھا کیونکہ انتہائے ضعف کی وجہ سے وہ کھڑا ہونے یا چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ لوگ صحن مسجد میں جمع تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے یوں خطاب کیا۔

''اے مسلمانو! کیا تم ایسے شخص کو قبول کرو گے جسے میں اپنا جانشین تجویز کروں؟ خدا کی قسم! اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے میں نے انتہائی سوچ بچار اور صلاح مشورے سے کام لیا ہے اور کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے اپنے کسی رشتہ دار کو تجویز نہیں کیا بلکہ میں نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو تجویز کیا ہے۔''

لوگوں کو ابوبکر کے اخلاص، نیک نیتی اور خیر خواہی پر اعتماد تھا۔ اس لئے حاضرین نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ ''ہم نے آپ کی بات سن لی اور ہم ضرور اطاعت کریں گے۔''

مجمع کے جواب سے مطمئن ہو کر ابوبکر رضی اللہ عنہ بالکونی سے اترے اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو حسب ذیل وصیت نامہ لکھوایا تاکہ کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اب جب کہ میں ابوبکر بن ابی قحافہ اس منزل سے گزر رہا ہوں اور ان لمحات سے نبرد آزما ہوں جن میں کافر بھی ان باتوں پر یقین کرنے لگتے ہیں جن سے انہوں نے انکار کیا تھا اور عصیاں شعاروں پر بھی حقائق آشکار ہو جاتے ہیں اور حقائق جھٹلانے والے بھی آمادۂ تصدیق ہو جاتے ہیں۔ انہیں بھی سب کچھ نظر آنے لگتا ہے اور اب جبکہ میں دنیا سے جس سے اب میرا تعلق ختم ہو رہا ہے اخروی اور آخرت کی زندگی میں داخل ہوتے ہوئے اس سے پہلا عہد کر رہا ہوں (کیونکہ اس کے بعد میں دنیاوی امور میں مطلق مداخلت نہ کر سکوں گا۔ اور میری آخری زندگی شروع ہو جائے گی) میں اپنے بعد تمہارے لئے خطاب کے بیٹے عمر کو خلافت کے منصب کے لئے نامزد کرتا ہوں۔ تمہارا فرض ہے کہ عمر کی بات سنو اور ان کے احکام بجالاؤ۔ عمر کا نام پیش کرتے وقت میرے سامنے اللہ، رسول اللہ، اسلام، امت

۱- بعض روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وصیت نامہ پہلے لکھوایا اور مجمع سے استصواب بعد میں کیا۔ بلکہ یہاں تک بھی ہے کہ لکھواتے لکھواتے بے ہوش ہو گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے عمر رضی اللہ عنہ کا نام لکھ دیا۔ جب ہوش آیا اور لکھا ہوا پڑھوا کر سنا تو عمر رضی اللہ عنہ کا نام پا کر خوش ہو گئے۔ عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا شاید تمہیں خطرہ ہوا کہ نام لکھوانے سے پہلے میں مر ہی نہ جاؤں، مگر جو روایت راقم نے اوپر دی ہے وہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ مؤلف

اور خود اپنی اخروی بھلائی کا خیال ہے۔ جہاں تک میرا مشاہدہ، تجربہ اور قیاس ہے۔ عمر عدالت گستری کریں گے۔ لیکن خدانخواستہ اگر وہ خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد بدل گئے تو میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ عصیاں شعار اور خطا کار اپنے کیئے کی سزا بھی پاتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرے سامنے امت کا مفاد ہے۔ البتہ میں غیب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ جو لوگ بھی زیادتی اور ستم رانی سے کام لیں گے انہیں انجام کار اس کا بدلہ مل ہی جائے گا۔ میں تمہارے لئے اللہ کی مہربانیوں اور پرامن زندگی کا خواہاں ہوں۔"

ڈاکٹر طہٰ حسین کی رائے میں یہ "ایک قسم کی نامزدگی کی سفارش تھی۔ اس سے مسلمان پابند نہیں ہو گئے تھے کہ عمر رضی اللہ عنہ کو ضرور ہی خلیفہ تسلیم کر لیں اسلام میں خلافت کا مسئلہ بے حد اہم ہے۔ خواہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، وہ بطور خود اس سلسلہ میں کوئی آخری فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ یہ مسئلہ امت اور امت کے قائدین فکر کے حل کرنے کا ہوتا ہے۔ اس دور میں مہاجرین و انصار ہی ارباب حل و عقد اور اہل فکر و بصیرت تھے۔ انہوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سفارش اس لئے قبول کر لی کہ قوم کو آپ کی ذات پر اعتماد تھا۔[1] وہ آپ سے محبت کرتی تھی اور اسے اطمینان کامل تھا کہ آپ کی یہ سفارش خالصتاً دین اور ملت کے مفاد میں ہے۔ یہ سفارش پوری امت نے قبول کر لی۔ کسی نے انحراف نہیں کیا۔ مسلمانوں کو اس وقت مضبوط قیادت کی شدید ترین ضرورت تھی۔ ایک ایسے قوی الارادہ اور صاحب عزم انسان کی ضرورت تھی جو معاملات کو انتہا تک پہنچا سکے۔ ہر حال میں عدل و انصاف قائم کرے۔ صرف اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے نقطہ نگاہ سے امور کو انجام دے۔ اس قابل ہو کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی چھوڑی ہوئی مشکلات اور اہم مسائل کو حل کر کے رکھ دے۔ ارتداد کے قلع قمع کے بعد عربوں میں از سر نو رشد و ہدایت کی روح بیدار کرے۔ ابوبکری عہد کی فتوحات کی تکمیل کرے۔ نوزائیدہ مملکت کی تاسیس ان بنیادوں پر کرے جو ملت کے مزاج کو سازگار ہوں۔ مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کی نئی ذمہ داری بھی قبول کرے۔ اللہ کی کتاب ہدایت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کا نفاذ کرے۔ اسلامی معاشرہ میں داخل ہونے والی نئی امت کے لئے کبھی سختی کبھی نرمی استعمال کرے۔ عدل، انصاف، مساوات نافذ کرے اور اس میں ادنیٰ سی کمزوری نہ دکھائے۔ اور نہ ظلم وزیادتی روا رکھے۔ عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اس معیار پر پورا اترنے والا کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا۔[1]

طہٰ حسین کے بقول سب سے بڑی خدمت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص نے اسلام اور مسلمانوں کی سرانجام دی وہ وہی تھی جو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی آخری بیماری کے دوران میں انجام دی اور یہ عظیم خدمت آپ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کرنا تھا۔"[2]

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے۔

۱- جس طرح تحریک پاکستان کے دوران میں برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت نے قائداعظم محمد علی جناح کی دیانت و بصیرت اور ان کے فیصلوں پر کامل اعتماد کا اظہار کیا تھا اور اپنے سیاسی مستقبل کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ مؤلف

۱-۲- خلافت ابوبکر و عمر، مصنفہ طہٰ حسین، ترجمہ شاہ حسن عطا۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی۔ کراچی

"گزشتہ اور موجودہ تمام مسلمانان عالم کا یہ فتویٰ ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو امر خلافت سونپ کر دنیائے اسلام پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ قیامت تک اس کی مثال نہیں مل سکتی۔"[1]

صرف گزشتہ و موجودہ مسلمانان عالم ہی کا یہ فتویٰ نہیں بلکہ غیر مسلم مستشرقین بھی اس بارے میں متفق الرائے ہیں۔ میوّر، ایچ جی ویلز اور بعض دوسروں کے حوالے پہلے دیئے جا چکے ہیں۔ عہد فاروقی میں اسلام کو جو عروج اور غلبہ حاصل ہوا اور اسلامی مملکت کی حدود میں جو توسیع ہوئی انہیں دیکھتے ہوئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ فاروق اعظم کا انتخاب دراصل خدائی انتخاب تھا اور توفیق ایزدی سے ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کا ذریعہ بنے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ اسلام کے دو ایسے گل سرسبد ہیں کہ ان کے حسین و دلکش رنگ و بو کا نمونہ اور کہیں نہیں ملے گا اور انسانیت کا مشام جاں ان کے کردار کی خوشبوئے جاں پرور سے معطر ہوتا رہے گا۔

بے حد متعصب فرانسیسی مستشرق لامنس بھی یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں میں سب سے زیادہ عقلمند، سب سے زیادہ مدبر اور سب سے زیادہ وسیع النظر تھے۔"

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو نصائح

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عین انتقال کے دن مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ عراق کے محاذ سے مدینہ پہنچے تھے تاکہ ایرانیوں کے خلاف کمک حاصل کر سکیں۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اس عالم میں بھی ان کی باتیں سنیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ مثنیٰ کے لئے جلد سے جلد فوج کا بندوبست کیا جائے اور اس میں ان کی اپنی موت بھی حارج نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تعمیل کی۔ انتظامی امور کے متعلق ہدایات دینے کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافتی اخلاق کے بارے میں حسب ذیل نصیحت کی:

"اے عمر! اپنے کھلے اور چھپے ہر کام میں اللہ سے ڈرتے رہو کیونکہ وہ تمہارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے آخرت کے لئے کام کرو اور اپنے ہر عمل میں خدا کی رضا کو پیش نظر رکھو۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ جیسے وہ تمہاری اولاد ہیں۔ لوگوں کے راز نہ ٹٹولو۔ اور ان کے ظاہر پر ہی ان سے معاملہ کرو۔ اپنے آپ کو درست رکھو۔ تمہاری رعیت بھی درست رہے گی۔"

ازواج و اولاد

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چار شادیاں کیں، دو مکہ میں اور دو مدینہ میں چاروں سے اولاد ہوئی، تین لڑکے اور تین لڑکیاں، تقریباً سبھی نے اسلام کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔

۱- قتیلہ بنت عبدالعزیٰ

یہ بی بی اسلام نہیں لائی۔ اس لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے طلاق دیدی۔ حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ذات النطاقین اسی کے بطن سے تھے۔ ان دونوں نے ہجرت نبوی کے سلسلے میں بڑا کام

[1] "انسانیت موت کے دروازے پر" ص ۴۷

کیا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے غزواتِ نبوی میں حصہ لیا۔ آخر محاصرہ طائف کے دوران میں لڑتے ہوئے زخمی ہوئے۔ مدینہ واپس جا کر اسی زخم سے وفات پائی۔ حضرت اسماء کی شادی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ (یکے از عشرۂ مبشرہ) سے ہوئی۔ آپ کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اموی دور میں حجاز و عراق میں اپنی خلافت قائم کی۔ دوسرے بیٹے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما مدینہ کے چوٹی کے محدثین اور فقہا میں سے تھے۔

۲- حضرت ام رومان بنت عامر رضی اللہ عنہا

آپ رضی اللہ عنہا حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی والدہ تھیں ابتدائے اسلام ہی میں مسلمان ہوئیں۔ مدینہ میں انتقال ہوا۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے غزوات اسلامیہ میں بڑا کردار ادا کیا۔ آپ کے بیٹے عتیق رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے۔ مسیلمہ کذاب کے سالار لشکر محکم کو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہی نے جنگ یمامہ میں قتل کیا۔

۳- حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بنت عمیس

یہ پہلے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ ۶ ہجری میں وہ جنگ موتہ میں شہید ہو گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کیا۔ ان سے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اکبر کی وفات کے وقت محمد چار پانچ سال کے تھے۔ ان کی والدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نکاح کر لیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے بیٹوں کی طرح پرورش کی۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش میں انہوں نے حصہ لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دوران میں انہیں مصر کا گورنر مقرر کیا۔ وہاں مخالفین کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کے بیٹے عاصم بن محمد بہت بڑے فقیہ اور محدث ہوئے۔

۴- حضرت حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ

یہ انصار مدینہ کے قبیلہ خزرج سے تھیں۔ ان کے والد حضرت خارجہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مواخاۃ قائم کی تھی۔ حضرت حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد ان کی صاحبزادی ام کلثوم پیدا ہوئیں۔ وہ جوان ہو کر حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ (یکے از عشرہ مبشرہ) کے نکاح میں آئیں۔

اللہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسل کو خوب افزائش اور ترقی دی اور وہ مختلف ممالک میں پھیل گئی۔ برصغیر پاکستان و ہند میں ان کی معتد بہ تعداد موجود ہے اور صدیقی کہلاتی ہے۔

حلیہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گورے چٹے، دبلے پتلے، موزوں قامت تھے۔ بلند پیشانی، ستا ہوا چہرہ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، گھنگریالے بال، چہرے مہرے سے وجاہت ٹپکتی تھی۔ ہجرت کے وقت داڑھی تقریباً سفید ہو چکی تھی۔ مہندی اور کسم کا خضاب لگاتے تھے۔ فطرتاً کم گو تھے۔ آواز میں رقت اور دردمندی کا احساس ہوتا تھا۔ بات کرنے کا انداز سنجیدہ اور باوقار تھا۔

مہرِ خلافت

آپ کی انگوٹھی پر نعم القادر اللہ (اللہ ہی سب سے زیادہ قدرت وطاقت والا ہے) کندہ تھا۔

حکومت کا نظم ونسق

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے سوا دو سالہ عہد خلافت میں شروع سے آخر تک ہنگامی صورتحال سے دوچار رہے۔ اور پھر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور طرز عمل سے انحراف گوارا نہ تھا۔ اس لئے عہد نبوی کے انتظام میں کسی بڑے ردوبدل کی نہ تو ضرورت محسوس ہوئی نہ موقع ملا۔ وہ خلافت علیٰ منہاج نبوت کے قائل تھے۔ انہوں نے امور خلافت کی انجام دہی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طور طریقے کو پیش نظر رکھا۔ اہم معاملات میں مہاجرین و انصار میں سے اہل الرائے اور فقہائے صحابہ سے صلاح مشورہ کرتے تھے۔ نئے حالات میں بعض ناگزیر انتظامی اقدامات بھی کئے جو اسوۂ نبوی سے کسی طرح متصادم نہ تھے۔

مملکت کی صوبوں میں تقسیم

فتنوں اور شورشوں کا سدباب کر کے خلیفہ اول نے عرب کو مدینہ، مکہ طائف، صنعا، نجران، حضرموت، بحرین، عمان اور دومۃ الجندل کے صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا اور وہاں اپنے عمال مقرر کر دیئے تھے۔ عاملوں کے انتخاب میں بڑے حزم واحتیاط سے کام لیتے تھے۔ کسی عہدہ کے طالب کو کوئی عہدہ نہیں دیتے تھے۔ بلکہ اکثر ایسے اہل، دیانتدار اور کارگزار اصحاب کو چنتے تھے جو درسگاہ نبوی کے تربیت یافتہ تھے۔ اپنے بیٹوں، رشتہ داروں یا اپنے قبیلہ بنی تیم کے افراد کو کبھی کوئی عہدہ نہیں دیا۔ آپ کے صاحب زادے اسلامی افواج میں ایک معمولی مجاہد کی طرح شامل رہے۔ عاملوں کو روانہ کرتے وقت ان کے فرائض اور ذمہ داریاں اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیتے تھے اور مندرجہ ذیل قسم کی نصیحتیں کرتے تھے۔

جلوت وخلوت میں خدا کا خوف رکھو۔ جو خدا سے ڈرتا ہے وہ اس کے لئے ایسی سبیل اور اس کے رزق کا ایسا ذریعہ پیدا کر دیتا ہے جو کسی کے گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ جو خدا سے ڈرتا ہے وہ اس کے گناہ کو کم کر دیتا ہے اور اس کا اجر دوبالا کر دیتا ہے بے شک بندگان خدا کی خیر خواہی بہترین تقوٰی ہے تم خدا کی ایسی راہ میں ہو جس میں افراط وتفریط اور ایسی چیزوں سے غفلت کی گنجائش نہیں جس میں دین کا استحکام اور خلافت کی حفاظت مضمر ہے۔ اس لئے سستی اور تغافل کو راہ نہ دینا۔[1]

تاکید فرماتے کہ کسی مسلمان کو حقارت سے نہ دیکھو کیونکہ اللہ کے نزدیک گھٹیا سے گھٹیا مسلمان بھی صاحب عظمت ہے۔

قبائل کو اندرونی آزادی حاصل تھی۔ البتہ زکوٰۃ وصدقات کی وصولی عاملوں کے ذمہ تھی۔ جس کا

۱- تاریخ طبری جلد چہارم

معتد بہ حصہ قبائل کے حاجت مندوں میں مقامی طور پر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اور بقیہ مدینہ بھیج دیا جاتا تھا۔ عاملوں کا کام دینی احکام وفرائض کی بجا آوری کی نگرانی بھی تھا۔ اور دشمنان دین کے مقابلے میں خلیفہ کی طرف سے اعلان جہاد ہونے پر رضا کار مجاہدین کو اکٹھا اور منظم کرنا بھی۔

فوجی نظام اور ضابطۂ عمل

کوئی با قاعدہ منظم اور تنخواہ دار فوج نہ تھی۔ موقع وضرورت کے مطابق اعلانِ جہاد کر کے قبائل سے رضا کار مجاہد طلب کر لئے جاتے تھے۔ یہ کام عاملوں کے سپرد تھا۔ عام طور پر مجاہدین کو قبیلہ وار دستوں میں تقسیم کر کے ان پر انہی میں سے امیر مقرر کئے جاتے تھے اور ان کے اپنے اپنے جھنڈے ہوتے تھے۔ اگر جنگی ضرورت سے ان سب دستوں کو یکجا ہونا پڑے تو جس امیر لشکر کے علاقے میں اجتماع ہوتا وہی پوری فوج کا سپہ سالار اعلیٰ ہوتا۔

با قاعدہ تنخواہ کی بجائے مجاہدین کو مالِ غنیمت میں سے حصہ ملتا تھا۔ غنیمت کے چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ پانچواں حصہ (خمس) بیت المال کے لئے مدینہ بھیج دیا جاتا تھا۔ مجاہدین اپنے گھوڑے اور ہتھیار ساتھ لاتے تھے۔ جو ایسا نہ کر سکتے انہیں بیت المال سے مہیا کئے جاتے۔ امرائے لشکر کو مہمات پر روانہ کرتے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے وقتاً فوقتاً جو قیمتی نصیحتیں کیں اور صلح وجنگ کے جو سنہری اصول ان کے ذہن نشین کئے، ان کا حوالہ گزشتہ صفحات میں دیا جا چکا ہے۔ فوجی ضابطہ اخلاق کی ان سے بہتر اور جامع تعلیم آج بھی ممکن نہیں۔ گزشتہ دو عالمی جنگوں میں روس، امریکہ، جاپان اور یورپ کی ''مہذب'' طاقتوں نے جس قسم کی انسانیت سوز بربریت، بہیمیت اور اخلاق باختگی کے مظاہرے کئے تھے، وہ سب جانتے ہیں۔

خلیفہ کی طرف سے امرائے لشکر کو تاکید تھی کہ دشمن کے مقابلے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ہاتھ سے جانے نہ دیں اور شکست خوردہ، مغلوب، مقتول دشمن سے خلافِ انسانیت سلوک نہ کریں۔ ایک امیر لشکر نے ایک دفعہ فتح نامہ کے ساتھ شکست خوردہ دشمن فوج کے سپہ سالار کا سر کاٹ کر بھیج دیا۔ حضرت ابوبکر نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ امیر لشکر نے لکھا کہ ہمارے دشمن بھی ہمارے مقتولوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عام حکم جاری کر دیا کہ آئندہ کسی شکست خوردہ دشمن کا سر کاٹ کر نہ بھیجا جائے۔ مسلمانوں کو رومیوں اور ایرانیوں کے طرزِ عمل کی تقلید کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے قرآن وسنت کا اتباع کافی ہے۔

اسی طرح مہاجر بن امیہ رضی اللہ عنہ عامل یمن نے گانے والی دو عورتوں میں سے ایک کے ہاتھ کٹوا دیئے تھے اور دوسری کے سامنے کے دو دانت اکھڑوا دیئے تھے۔ کیونکہ ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار پڑھتی تھی۔ اور دوسری مسلمانوں کو برا بھلا کہتی تھی۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سخت برہم ہوئے اور مہاجر رضی اللہ عنہ کو تہدیداً لکھا کہ بے شک انبیاء کی ہجو اور ان پر سب وشتم بہت بڑا جرم ہے۔ اگر تم نے سزا دینے میں جلدی نہ کی ہوتی تو میں اس عورت کے قتل کا حکم دیتا کیونکہ اگر وہ مسلمان تھی تو انبیاء پر سب وشتم سے مرتد ہو گئی۔ اور اگر ذمیہ تھی تو اس نے عہد کی خلاف ورزی کی۔ دوسری عورت جو صرف مسلمانوں کو گالیاں دیتی تھی، دانت اکھڑوانے کی سزا کی مستحق نہ تھی۔

معمولی تنبیہ کافی تھی۔ اگر ذمیہ تھی تو جب ہم نے اس کے سب سے بڑے گناہ شرک سے درگزر کیا تو مسلمانوں کو برا بھلا کہنے کی کیا سزا ہو سکتی ہے؟ مثلہ سے بچو یہ نفرت انگیز گناہ ہے۔

مالی انتظام۔ تقسیم اموال میں مساوات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں غنیمت، خمس، فے، زکوٰۃ وغیرہ کے جو اموال آتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت سب کے سامنے مسجد میں بیٹھ کر تقسیم کر دیتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتوحات کی وجہ سے دوسری مدات کے علاوہ غنیمت اور جزیہ کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک بیت المال قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تاکہ تقسیم یا خرچ ہو جانے تک مال وہاں رکھا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے اکابر صحابہ کے مشورے سے ایک مکان اس کے لئے مختص کر دیا۔ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو جنہیں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امین الامت کا لقب دیا تھا، بیت المال کا مہتمم مقرر کیا۔ لیکن یہ بیت المال برائے نام ہی رہا کیونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ نقد و جنس آنے کے ساتھ ہی تقسیم کر دیا جائے۔ فوجی ضروریات کے لئے رقم نکال لی جاتی تھی جس سے ہتھیار اور اونٹ، گھوڑے خریدے جاتے تھے۔ آخری عہد میں ایک عمارت بھی تعمیر کرائی لیکن کوئی محافظ مقرر نہیں کیا، قفل لگا دینا کافی سمجھا۔ آپ کی وفات کے بعد جب بیت المال کھولا گیا تو صرف ایک درہم نکلا جسے دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔

تمام اموال مرد، عورت، آزاد، غلام، پرانے اور نئے مسلمانوں میں مساوات کی بنیاد پر تقسیم کئے جاتے تھے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ سابقون الاولون سے ترجیحی سلوک کیا جانا چاہئے۔ فرمایا کہ ان کی سبقت فی الایمان کا اجر انہیں خدا کے ہاں ملے گا۔ یہ دنیاوی مال ہے جس میں سب کا یکساں حق ہے۔

ولیم میور لکھتا ہے کہ "کسی قوم میں ریاست کی آمدنی اور فتوحات کے غنائم کو مساوات و اخوت کی بنا پر برابر برابر تقسیم کر دینا ایک ایسا منظر ہے جو بقیہ دنیا کی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا" ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پورے عہد خلافت میں تقریباً دو لاکھ دینار آئے جو سب کے سب تقسیم کر دیئے گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور العمل بھی یہی تھا کہ اموال کی تقسیم میں مساوات سے کام لیتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح عمل کیا۔ آج کی ترقی یافتہ اور مہذب دنیا میں بھی یہ عمل کہیں نہیں ملتا۔ خواہ سرمایہ دار ممالک ہوں یا کمیونسٹ۔

محکمہ عدالت

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو محکمہ عدالت کا سربراہ مقرر کیا تھا لیکن ان کے سوا دو سالہ عہد حکومت میں صرف دو مقدمے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوئے۔ لوگ جھگڑوں اور مقدمہ بازی سے نا آشنا تھے۔ باہم پیار سے ملتے تھے دستور محبت قائم تھا۔ جن معاملات یا مقدمات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خود فیصلہ کرنا پڑا ان میں کسی کی رو رعایت نہیں کی۔ شریعت کی روشنی میں فیصلہ دیا۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے نابالغ بیٹے عاصم کو اپنی مطلقہ بیوی سے اپنی تحویل میں لینا چاہا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف فیصلہ دیا اور بچے کو اس کی ماں کے

پاس رہنے دیا۔

محکمہ افتاء

چونکہ نئے نئے قبائل اور آبادیاں حلقہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور حالات کے اقتضا سے بعض نئے نئے فقہی مسائل بھی پیدا ہو رہے تھے، اس لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عام مسلمانوں کی سہولت اور رہنمائی کے لئے محکمہ افتاء قائم کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو فتویٰ دینے پر مامور کیا۔ کیونکہ یہ حضرات تفقہ فی الدین اور علم و اجتہاد کے لحاظ سے دوسروں سے ممتاز تھے۔ کسی دوسرے کو فتویٰ دینے کی اجازت نہ تھی۔

اشاعت اسلام

رسول اللہ کے نائب کی حیثیت سے خلیفہ کا اولین اور اہم ترین فریضہ دین کی حفاظت اور اشاعت تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس میں سعی بلیغ کی۔ فتنہ ارتداد کو ختم کیا۔ عراق و شام کی طرف جانے والی فوجوں کو تاکید کی تھی کہ دشمن کو سب سے پہلے اسلام پیش کریں کیونکہ اصل مقصد اشاعت اسلام ہے نہ کہ فتح ممالک۔ اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو ہمارے بھائی ہیں۔ ان میں اور ہم میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اگر وہ اسلام سے انکار کریں تو انہیں جزیہ ادا کرنے کو کہا جائے تاکہ فتنہ و فساد ختم ہو کر علاقے میں امن و امان قائم ہو جائے۔ اللہ کا قانون نافذ ہو جائے، خونریزی نہ ہو اور لوگوں کے جان و مال اور آبرو محفوظ رہیں۔ جہاد تو دفع شر کے لئے آخری چارہ کار ہے۔ جدید اصطلاح میں جنگ ختم کرنے کے لئے جنگ۔ چنانچہ نہ صرف عرب کا دس لاکھ مربع میل رقبہ مسلمانوں سے بھر گیا بلکہ عراق و شام کے قبائل، رومی عیسائی اور ایرانی مجوسی بھی دائرہ اسلام میں جوق در جوق داخل ہونے لگے۔

ذمیوں سے سلوک

ذمی وہ لوگ تھے جو اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر کے اپنے مذہب پر قائم رہے اور اسلامی حکومت نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے برعکس فوجی خدمت سے بری تھے اور زکوٰۃ بھی ان پر عائد نہ ہوتی تھی۔ اس لئے ان کے جان و مال اور دوسرے انسانی حقوق کی حفاظت کے بدلے ان سے ایک معمولی ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ جسے عرف عام میں جزیہ کہتے ہیں۔ اس کی مقدار صرف چار درہم فی کس سالانہ تھی اور یہ صرف بالغ، تندرست اور قابل کار افراد سے وصول کیا جاتا تھا۔ بوڑھے، اپاہج، نادار، محتاج اور بچے اس سے بری تھے۔ بلکہ معذوروں محتاجوں کو اسلامی بیت المال سے مدد معاش دی جاتی تھی۔ عراق اور شام کی فتوحات کے دوران میں متعدد قبائل اور آبادیاں جزیہ کی بنیاد پر اسلامی رعایا بن گئے ان سے جو معاہدے ہوئے ان میں اس قسم کی شقیں بھی رکھی گئیں۔

”ان کی خانقاہیں اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے اور نہ ان کا کوئی ایسا قصر گرایا جائے گا جس میں وہ ضرورت کے وقت دشمنوں کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہوں۔ ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہوگی

اور نہ تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں گے۔"

اسی طرح مجوسیوں کے آتش خانے اور صابیوں کے عبادت خانے بھی برقرار رکھے گئے۔ ان کی مذہبی آزادی میں دخل اندازی نہیں کی گئی۔

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ مسلمانوں نے اہل ذمہ کے حقوق کی حفاظت اور معاہدوں کی پابندی میں جس حزم واحتیاط اور فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ تفہیم القرآن (جلد سوم صفحہ ۶۱۴) میں لکھتے ہیں۔

"اسلامی نظام حکومت میں ذمیوں اور مسلمانوں کے درمیان قانونی حقوق میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام تر فرق صرف سیاسی حقوق میں ہے اور اس فرق کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک اصولی حکومت میں حکمراں جماعت صرف وہی ہو سکتی ہے جو حکومت کے بنیادی اصولوں کی حامی ہو۔ اس جماعت میں ہر وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جو اس کے اصولوں کو مان لے۔ اور ہر وہ شخص اس سے خارج ہو جاتا ہے جو ان اصولوں کا منکر ہو جائے۔"

عہد صدیقی پر مختصر تبصرہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اسلامی ریاست کے معمار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نفاذ اور استحکام کے لئے ان سے عظیم الشان کام لیا۔ شاعر غالب نے کہا ہے کہ ع شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما (شعر نے خود چاہا کہ ہمارا فن بنے!) اسی طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلافت کی خواہش نہیں کی بلکہ خود خلافت نے ان کی خواہش کی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت یہی تھی۔ وہ مسلمانوں کی رائے عامہ سے خلیفہ منتخب ہوئے اور آئندہ حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کا انتخاب بہترین انتخاب تھا۔ انہوں نے عدیم النظیر استقامت ایمانی اور بصیرت دینی سے کام لے کر کشتی اسلام کو فتنوں اور مشکلات کے دریائے بے پایاں اور طوفان موج افزا سے نکال کر محفوظ ساحل تک پہنچایا۔ اور مہیب خطروں میں گھری ہوئی نوزائیدہ اسلامی ریاست کو نہ صرف استحکام بخشا بلکہ اس کے حدود و ثغور کو بہت وسیع کر دیا اور اس غرض سے اپنے زمانے کی سپر پاور زروم وایران سے بیک وقت لڑائی مول لینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر وہ سب سے بھڑ گئے اور خالص اور مکمل اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں کسی سے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے سوا دو سال کی مختصر مدت میں وہ کچھ کر دکھایا جو کوئی دوسرا ایک طویل عرصے میں بھی نہ کر سکتا اور شاید مصائب اور مسائل کے ہجوم اور یلغار میں اپنے آپ کو کھو بیٹھتا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ "دنیا میں کوئی چیز انسانی شخصیت کو کسی عظیم آزمائش کے موقع پر اس کے عزم و ثبات سے زیادہ اجاگر کرنے والی نہیں ہوتی۔ بڑی شخصیت ظہور پذیر ہوتی ہی اس وقت ہے جب وہ مشکلات اور خطرات کو خاطر میں لائے بغیر ان سے ٹکر لیتی ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عظمت کی پرکھ اسی سے ہوتی ہے۔"

اسلام کی تاریخ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ دھرے کے کیل (Lynchpin) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو از

سرنو محکم بنیادوں پر قائم کیا اور دشمنوں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ ولیم میور کے بقول ''اگرچہ ان کا دور خلافت مختصر تھا لیکن خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد اسلام کسی اور شخص کا اتنا ممنونِ احسان نہیں جتنا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ان پر ایمان خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلوص وصداقت کی ایک مضبوط شہادت ہے۔.......... اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک جھوٹے مدعی نبوت کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا ہوتا تو وہ ایک ایسے شخص کو اپنا دوست اور معتقد کبھی نہ بنا سکتے جو نہ صرف ذہین، زیرک اور دانشمند تھا بلکہ اس کی ساری زندگی خلوص، سلامت روی اور اصول پسندی کا مظہر تھی۔''

آج بھی ایک مخلص مسلمان یہ سوچ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے کہ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وجود نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام کا دھارا کسی اور ہی طرف مڑ جاتا۔ انہوں نے آہنی عزم اور پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ مسلمانوں کی قیادت کی اور مرتدین، منکرین زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت کے فتنوں اور شورشوں کا قلع قمع کیا۔ حدودِ عرب سے باہر اسلام کی اشاعت وتبلیغ کا آغاز کیا۔

دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی شوکت اور سربلندی کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے اطاعت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم، یقین وایمان، روحانیت وعبادت، عزیمت، بصیرت، تدبر، سیاست، قیادت، معدلت، مساوات، بے نفسی و بے لوثی، سادگی اور پاکیزگی کا بلند ترین معیار پیش کیا اور اپنی شخصیت کو ملت کی حیات اجتماعی کے لئے مٹا دیا۔ اور خلیفہ کی حیثیت سے اپنے کردار وعمل سے ایک ایسا رفیع نمونہ پیش کیا کہ ان کے عالی مرتبہ جانشین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کہنا پڑا کہ ''ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد آنے نے ہمیں بہت تھکا دیا۔'' ایک دوسرے موقع پر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''اگر مسلمانوں کا ایمان ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ابوبکر کا دوسرے پلڑے میں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان بھاری نکلے گا۔'' اس کا ثبوت صحابہ کو بلکہ دنیا کو بارہا ملا مثلاً حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا لشکر روانہ کرتے وقت مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کا فیصلہ کرتے وقت نیز روم وایران کے خلاف جنگی کارروائی کا آغاز کرتے وقت اور پھر اپنی قوت ایمانی سے ان سب خطرناک مہمات میں کامیاب ہو کر۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ مملکت اسلامیہ کے سربراہ بنے لیکن شہنشاہ نہیں بنے۔ انہوں نے دنیا کے فرعونوں، قیصروں، خسروؤں، خاقانوں اور دوسرے آمروں کی روایات کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے رومی عیسائی شہنشاہ (قیاصرہ) اپنے آپ کو ''مقدس اور پارسا مطلق العنان فرمانروا (Divine and Piousdespot) لکھتے اور کہلاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہمارے مقدس منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔[1]

لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم قانون تھے۔ وہ خود بھی ان کے پابند تھے اور دوسروں سے بھی ان کی پابندی چاہتے تھے۔ اپنے آپ کو ملت اسلامیہ کا داعی اور اس کی خیر وفلاح کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ خلافت سے ان کی شان وطمطراق میں تو کیا اضافہ ہوتا، البتہ ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں۔ انہوں نے اپنے

1- Laws Originatein our divinemouth

آپ کو عام مسلمانوں سے اعلیٰ و برتر نہیں سمجھا۔ انہی میں مل کر انہی کی طرح رہے۔ انہوں نے دربار خلافت کو دربار رسالت کے نمونے پر سادہ اور ہر قسم کی دنیاوی شان و شوکت سے معرا رکھا۔ نہ کوئی حاجب نہ محافظ نہ نقیب نہ چوکیدار۔ سبھی لوگ بلا روک ٹوک ان کے پاس آ جا سکتے تھے اور اپنے مسائل، ضروریات اور شکایات پیش کر سکتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نزدیک خلافت اور خدمت باہم مترادف تھے۔ انہوں نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ دیا، اسے ان کی خلافت بلکہ پوری خلافت راشدہ کا منشور کہنا چاہئے۔ اس میں ان کی پالیسی کے تمام بنیادی اصول آ گئے ہیں۔ دنیا کے حکمرانوں، خاص کر مسلمان حکمرانوں کے لئے اس خطبہ کے دو تین فقرے پھر یہاں دہرانے کو جی چاہتا ہے۔

''اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجئے۔ اگر غلطی کروں تو مجھے سیدھا کر دیجئے۔''

''میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع رہوں اور اگر میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں۔''

''تمہارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق دلواؤں اور تم میں سے جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ (اور ان کے جانشین خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم) نے خلافت کو ملت کی امانت سمجھا اور اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کی روشنی میں کاروبار خلافت سرانجام دیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس امانت کا حق جس اخلاص اور بے لوثی سے ادا کیا۔ دنیا کے مدبر، سیاستدان اور مؤرخ اس پر انگشت بدنداں ہیں۔ مدینہ ایک وسیع و عظیم مثالی رفاہی مملکت کا صدر مقام بن گیا اور سید القوم خادم القوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی روشنی میں انہوں نے سیاسی، معاشی، معاشرتی آزادی اور مساوات عملاً قائم کی جب کہ عیسائی یورپ[1] نے پوپ اور بادشاہوں کے مذہبی اور سیاسی استبداد کے تلے پس کر اٹھارویں صدی عیسوی کے ربع آخر تک آزادی، اخوت اور مساوات کا کبھی خواب تک نہ دیکھا اور جب دیکھا تو وہ بھی تھوڑی مدت میں نپولین کے ہاتھوں خواب پریشاں ہو کر رہ گیا۔ لیکن اسلام نے الخلق عیال اللہ اور كُلُّ مُؤْمِنٌ اِخْوَةٌ کی جو تعلیم دی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اس کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

روم، ایران کی سلطنتوں میں اموال کا بہترین اور کثیر ترین حصہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے لئے ہوتا تھا۔ اور تمام سیاسی حقوق تو ہوتے ہی حکمرانوں کے لئے تھے۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حکومت کے وسائل آمدنی اور اسباب و اموال کو اخوت و مساوات کی بناء پر مرد، عورت، بچہ، لونڈی، غلام، سابق الایمان اور جدید الایمان سب میں بلا امتیاز مساوی طور پر تقسیم کیا اور ان کے انسانی حقوق میں کسی قسم کی تفریق روا نہ رکھی۔ ایک دفعہ کسی علاقے میں سونے کی کان نکلی۔ اس سے جو سونا برآمد ہوا وہ بھی سب مسلمانوں میں مساویانہ طریقے سے تقسیم کر دیا۔

ان کی اور ان کے کنبہ کی خورد و نوش اور بود و باش جیسی خلافت سے پہلے تھی۔ عہد خلافت میں بھی ویسی ہی رہی۔

---

[1] ہندوستان اور چین کا بھی یہی حال تھا۔

شاہانہ معیارِ زندگی کا تصور سرے سے ناپید تھا۔ ایک دفعہ ان کی بیوی نے حلوہ پکایا تو پوچھا کہ اس کے لئے پیسے کہاں سے آئے؟ بیوی نے کہا کہ وہ روزینے میں سے تھوڑا تھوڑا کر کے بچاتی رہی تھیں۔ فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روزینے میں سے اتنی رقم کم کی جا سکتی ہے۔ دوسروں کو حلوہ میسر نہیں تو میں بیت المال کے پیسے سے کیسے حلوہ کھا سکتا ہوں؟ روزینہ میں حلوہ کے لئے گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ چنانچہ بیت المال کے مہتمم سے کہہ کر رقم کم کرا دی۔ اور پھر وفات کے وقت تو وہ ساری رقم بیت المال کو لوٹا دی جو سوا دو سال کی مدتِ خلافت میں بطور روزینہ لی تھی۔

قائداعظم نے حصول پاکستان کی جدوجہد کے دوران میں قوم کو اتحاد، ایمان اور تنظیم کا نعرہ دیا اور اس کماری سے لنڈی کوتل تک اور سلہٹ سے کراچی تک مسلمانوں کو دشمنوں کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا۔ قائداعظم کو اس نعرہ کا تصور ابوبکر کی خلافت سے ملا۔ اگر وہ مسلمانوں میں ایمان، اتحاد اور تنظیم کی روح نہ پھونک دیتے تو اللہ ہی جانتا ہے کہ مرتدین، منکرین زکوٰۃ، جھوٹے مدعیانِ نبوت اور پھر قیصر و کسریٰ کی افواج قاہرہ کے ہاتھوں اسلام اور مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا۔

مشہور انگریزی مؤرخ ایڈورڈ گبن اپنی تصنیف ''سلطنت روما کا انحطاط و زوال'' میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یوں خراج تحسین پیش کرتا ہے۔

''ان (ابوبکر) کے سادہ و کفائت شعارانہ اقدامات ان کی پاکبازانہ سیرت اور عادات کا نتیجہ تھے ان کی سادگی دنیا کے بادشاہوں کی شان و شوکت کو آنکھیں دکھاتی تھی وہ ایک ہمہ گیر عبقریت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک ولی اللہ کی پاکبازی، ایک مدبر کی فہم و فراست اور کردار، ایک جرنیل کی ذہانت و اہلیت، ایک سپاہی کی حوصلہ مندی اور جرأت اور ایک لائق منتظم کی صلاحیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ان کی اسلام سے محکم اور ناقابل تغیر عقیدت و وابستگی، مستقل مزاجی اور ثابت قدمی نے عربوں کے کردار میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا۔ اور انہیں ایک متحدہ قوم بنا دیا۔ ان کی بصیرت اور دوراندیشی، جوشِ عمل، قوتِ حیات نے عربوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور اسلام کی مشہور زمانہ حیرت انگیز اور عظیم الشان فتوحات کی بنیاد رکھ دی اور وحشی عربوں کو دنیا کے فاتحین کی سطح پر لا کھڑا کیا۔''

اور یہ سب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا فیض تھا۔

دنیا کی تاریخ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک ایسی قد آور شخصیت ہیں کہ دوسرے اقوام و ممالک کی مشہور و معروف بلند و بالا شخصیتیں ان کے کندھوں تک بھی نہیں پہنچتیں۔ یہ وہی تھے جنہوں نے دنیا کو خلافت جیسے بینظیر نظام سے روشناس کرایا اور اسے ایک منارۂ نور کے طور پر اپنے پیچھے چھوڑ گئے جس کی طرف دنیا کی آنکھیں اٹھتی رہیں گی۔ مشہور ہندو رہنما گاندھی جی نے برصغیر کی آزادی کے وقت اپنے کانگرسی پیروؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہندوستان سو سال سے زائد عرصہ کی غلامی کے بعد آزادی حاصل کر رہے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں وہ اچھی حکومت اور غلطیوں سے مبرا انتظامیہ کے اصول و عمل سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے بہتر ہو گا کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مثالوں اور نمونوں کو اپنے پیش نظر

رکھیں کیونکہ پیغمبروں کے علاوہ دنیا نے ان دونوں سے بہتر انسانوں کے لیڈر پیدا نہیں کیے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک سچے درویش تھے اور خلافت کے منصب عالی پر فائز ہونے کے بعد بھی انہوں نے معمولی انسانوں کی طرح زندگی بسر کی اور اپنی بہترین صلاحیتوں سے اپنی ملت کی خدمت کرتے رہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حسب ذیل کارنامے ایسے عظیم الشان ہیں کہ تاریخ میں ان کے نام عزت واحترام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

۱- خلافت کا علیٰ منہاج نبوت قیام، تقویٰ، دینداری، عدل، مساوات اور سادگی کے قوام کے ساتھ۔

۲- فتنۂ ارتداد کا خاتمہ، جزیرۃ العرب میں اسلام کی بحالی اور اس کے بین الاقوامی غلبہ کی بنیاد۔

۳- جمع قرآن

۴- اپنے جانشین کے طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نامزدگی۔

گزشتہ چالیس برسوں سے ہماری زبانوں پر چلا آتا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے جو بے شمار قربانیوں کے بعد اسلام کی خاطر حاصل کی گئی اور یہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا۔ یعنی پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ۔ ۱۹۷۷ء کے بعد اس سلسلے میں بعض حوصلہ افزا اقدامات کیے بھی گئے ہیں اور مزید متوقع ہیں۔[1] اس سلسلے میں خلفائے راشدین خاص کر خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی اور خلیفہ کی حیثیت سے ان کے مختلف عملی اقدامات کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ انہوں نے حاکمیت الٰہیہ کو کس طرح عملاً نافذ کیا؟ قانون کی حکمرانی کے اسلامی تصور کی کیا تعبیر کی؟ اسلام کے پیدا کردہ غیر طبقاتی معاشرہ، میں انسان کے بنیادی حقوق کی کیا تعریف کی؟ سیاسی، معاشی اور سماجی عدل و مساوات کو کیسے عملی شکل دی؟ سربراہ مملکت کے حقوق وفرائض کا کیسے تعین کیا؟ اور اس کے محاسبہ اور جوابدہی کے کیا اصول وضع کیے؟ ان نکات کا مطالعہ ہمارے ارباب اقتدار کے لئے بے حد مفید اور بصیرت افروز ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کے بعد خلیفہ اول کے انتخاب کے بعد پہلا خطبۂ عام بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور حکمرانوں کے لئے اپنے اندر رہنمائی کا بڑا سامان رکھتا ہے۔

محمد حسین ہیکل نے ''ابوبکر......صدیق اکبر'' میں کیا خوب لکھا ہے:

''اس دور کا انسان جب پچھلے زمانے پر نظر دوڑائے گا تو اسے جنگ وجدال، قتل وغارت، خونریزی و سفاکی، عیاری و مکاری اور ظلم وتعدی کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آئے گا۔ وہ حیرت واستعجاب سے بنی نوع انسان کے ان کارناموں کو دیکھے گا جو انہوں نے شخصی مفاد اور ذاتی اقتدار کی خاطر انجام دیئے

---

[1] بدقسمتی سے ایک قلیل التعداد مغرب زدہ طبقہ کی طرف سے ایک باقاعدہ مہم چلائی جارہی ہے کہ پاکستان اسلام کے نفاذ کے لئے حاصل نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہ ایک اقتصادی ضرورت تھا اور ہندوؤں کے استیلا سے بچنے کے لئے صرف مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ خطۂ زمین حاصل کرنا مقصود تھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ گویا غیر اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے اپنی جان و مال و آبرو کی قربانیاں معاشی تحفظ کے لئے دیں اس کتاب کے صفحات اس موضوع پر طویل بحث کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگر ان حضرات کی بات سچ مان لی جائے تو یہ گویا قوم سے بہت بڑا فراڈ تھا۔ حالانکہ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان ایک معجزہ کے طور پر وجود میں آیا اور اللہ نے اس سے دنیا بھر میں احیاء ونفاذ اسلام کا کام لینا ہے۔ موجودہ نسل نہیں تو اس کے بعد آنے والی نسلیں ایسا کریں گی۔ مؤلف

اور یہ کارنامے انجام دیتے ہوئے انہوں نے اخوت ومحبت، عدل وانصاف اور رحمت وشفقت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر سنگدلی اور ناانصافی کو شعار بنالیا۔ اپنے آباؤ اجداد کی یہ کارستانیاں دیکھ کر اس کا دل بے اختیار ان پر نفرین بھیجنے کو چاہے گا۔ لیکن یکا یک اس کی نظر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نہایت مختصر مگر انتہائی درخشاں دور حکومت پر پڑے گی اور وہ مبہوت ہو کر پکار اٹھے گا:

اللہ کی ہزاروں رحمتیں اور برکتیں ہوں اس مقدس اور پاکباز انسان پر جس نے اپنی ساری عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور اسلام کی اشاعت میں صرف کردی۔ وہ ضعیف تھا لیکن دین کی راہ میں اس نے عدیم المثال استقامت کا ثبوت دیا۔ وہ غریب تھا لیکن اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں اپنا ایک ایک پیسہ خوشدلی سے خرچ کر دیا۔ اس کے راستے میں سنگ گراں حائل تھے مگر اس کے پائے استقلال میں خفیف سی بھی لغزش پیدا نہ ہوئی اور وہ اسلام کی کشتی کو خوفناک طوفانوں اور مہیب چٹانوں سے صحیح سلامت نکال کرلے گیا۔"

سیرتِ صدیقؓ 'بعد از نبی صلی اللہ علیہ وسلم بزرگ توئی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات مجموعہ محاسن تھی۔ ان کے بعض اوصاف ومحاسن کا ذکر گزشتہ صفحات میں مختلف مواقع پر کیا جا چکا ہے۔ وہ فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے کردار وگفتار میں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد اقوال کی روشنی میں امت مسلمہ کے سواد اعظم کا یہ ایمان ہے اور اس کا اعلان گزشتہ چودہ سو سال سے دنیا کے مختلف ممالک کی ہزاروں، لاکھوں مسجدوں کے منبروں سے ہر خطبۂ جمعہ میں ہوتا چلا آیا ہے کہ انبیاء کے بعد بہترین انسان ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ قبول اسلام سے پہلے بھی ان کی زندگی عرب معاشرے کے متداول معائب وذمائم سے پاک تھی۔ قبول اسلام کے بعد تو گویا سونا کٹھالی میں پڑ کر کندن ہو گیا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عظمت وبزرگی اور عظیم الشان کامیابی کا راز ان کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت وعقیدت اور ان کی اطاعت میں ہے۔ انہوں نے اپنا تن من دھن اللہ کی رضا جوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور مسلمانوں کی بہبود کے لئے وقف کر دیا۔

آزاد بالغ مردوں میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور کڑی سے کڑی مخالفت اور شدید سے شدید خطرات میں بھی ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ ولیم میور جیسا متعصب مستشرق بھی یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا کہ "ابوبکر رضی اللہ عنہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیروؤں میں سب سے زیادہ ثابت قدم اور مستقل مزاج رہے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیس سالہ عہد رسالت میں کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں ہوا جس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اہم کردار ادا نہ کیا ہو۔ ابتدائی اسلام کی تاریخ کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اخلاق محمدی اور تعلیمات اسلامی کا زندہ پیکر تھے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، کے مصنفین نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ (خلاصہ)

''ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) پر غیر متزلزل ایمان رکھتے تھے۔ واقعۂ معراج کی جس طرح انہوں نے فی الفور اور بلا ہچکچاہٹ تصدیق کی، اس سے وہ صدیق، کے لقب سے نوازے گئے جو ہمیشہ کے لئے ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا۔ وہ نہایت کریم النفس، حلیم الطبع اور بردبار تھے۔ تلاوت قرآن کے وقت ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور بے اختیار زار زار روتے تھے۔ احکام اسلام اور پیغمبر اسلام کی ہدایات کی روح کو فوراً اپنے اندر سمو لیتے تھے اور ان پر لفظاً و معناً عمل کرتے تھے۔ اسلام کی خاطر اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر وہ بڑی سے بڑی قربانی سے گریز نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مشکل اور خطرناک مواقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور ہر قسم کے مصائب اور مشکلات کا مقابلہ انتہائی صبر و تحمل اور جرأت و استقامت سے کیا۔ ان کی زندگی کا عظیم ترین موقع اور نقطۂ عروج اس وقت آیا جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کے وقت انہیں اپنے واحد رفیق ہجرت کے طور پر منتخب کیا۔ ان کی اس بے غرض اور جانفروشانہ خدمت کا انعام یہ ملا کہ قرآن میں انہیں، ثانی اثنین، (دو میں کا دوسرا) کے معزز لقب سے پکارا گیا اور وہ تاریخ اسلام میں لافانی ہو گئے۔ چونکہ وہ احکام قرآن اور اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک انچ بھی ہٹنا گوارا نہیں کرتے تھے اور ان کی زندگی اور کردار بے حد متقیانہ تھے۔ اس لئے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدس کا ایک سچا نمونہ بن گئے تھے اور ان صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی روح کو پورے طور پر اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کبھی کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالی، نہ کبھی کوئی ایسا فعل ان سے سرزد ہوا۔ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف پہنچی ہو۔ وہ ع بہ مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست! کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر وہ واحد شخص تھے جنہوں نے کامل اطمینان کا اظہار کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رکاب تھام لیں۔

محبت و اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قدرتی تقاضا یہ تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے گہرا قلبی تعلق تھا۔ باغ فدک کے معاملے میں عام روایت کے مطابق اختلاف کے باوجود ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے لطف و محبت کا سلوک کیا اور ان کی دلداری کی کوشش کی۔ فدک کی آمدنی اہل بیت کی ضروریات پر صرف کی۔ بارہا ایسا ہوا کہ گھر سے باہر نکلے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے صاحب زادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کھیلتے نظر آئے تو پیار سے انہیں اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ ابتدائے خلافت میں جب منبر نبوی پر خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''ہمارے ابا جان کے منبر سے اتر آیئے۔'' انہوں نے اتر کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو کندھے پر اٹھا لیا اور قطعاً برا نہ مانا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معذرت کی کہ بچے نے ایسی بات کہی۔ ہم نے اسے نہیں سکھایا۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے وقت ان سے عفو خواہ ہو کر ان کا آئینہ دل صاف کر دیا۔ پھر ان کی نماز جنازہ بھی پڑھائی۔ ایک دفعہ عراق سے ایک خوبصورت اور قیمتی عبا آئی آپ نے وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نذر کر دی۔

امہات المومنین کی راحت و آسائش اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حفظ ناموس کا خاص خیال رکھتے تھے اور انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دیتے تھے۔

جن لوگوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی وصیت فرمائی تھی یا جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاص لطف و کرم فرماتے تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کے بارے میں وصیت نبوی پر عمل کیا۔ اور ہمیشہ ان کی تعظیم و توقیر کو ملحوظ رکھا اور ان سے حسن سلوک سے پیش آتے رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کھلائی ام ایمن رضی اللہ عنہا کا خاص خیال رکھتے تھے اور اکثر ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی اپنی خلافت کے دوران میں ایسا کرتے رہے۔

مسلمانوں کے لئے ایثار اور ان کی نصرت و اعانت میں بے دریغ اپنی دولت لگانا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ساری عمر شیوہ رہا۔ انہوں نے بڑی بڑی نفسیاتی الجھنوں اور سیاسی آزمائشوں سے امت محمدیہ کو نکالا اور اس کی کامیاب فکری و عملی قیادت کی۔ وہ ملت کے حقیقی لیڈر تھے اور لوگ ان سے محبت کرتے تھے۔ ایسا ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ وہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام کو دوبارہ زندہ اور غالب کیا۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیائے اسلام پر سب سے زیادہ احسان ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک قصیدہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں کہا:

خیر البریہ اتقاھا واعدلھا　　　بعد النبی و اوفھا بما حملا

(یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام مخلوق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقویٰ اور عدل کے لحاظ سے بہتر تھے اور انہوں نے جو کچھ اٹھایا اسے پورا کر کے چھوڑا)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی تکلفات اور تعیّشات سے پاک تھی، ہمیشہ موٹا جھوٹا پہنتے اور عام مسلمانوں کی سی خوراک کھاتے تھے جو بیت المال سے بقدر کفاف مقرر تھی ذوالکلاع رضی اللہ عنہ حمیری یمن کے قدیم شاہی خاندان سے تھے مسلمان تھے۔ لیکن شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے۔ اپنے علاقے کے مرتدین کی سرکوبی کے بعد مدینہ آئے تو ان کی سج دھج دیکھنے کے لئے اہل مدینہ اُمڈ پڑے۔ لیکن وہ خود خلیفہ کو صرف دو سادہ چادروں میں ملبوس دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور بقیہ زندگی کے لئے وہی سادہ لباس اختیار کر لیا۔

سادگی۔ تواضع، نرم خوئی، عجز و انکسار، خدمت خلق، عدل و مساوات، بردباری، رقیق القلبی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ زُہد و ورع کا مجسم پیکر تھے۔ نمود و نمائش سے دور بھاگتے تھے۔ سادگی و خودداری کا یہ عالم تھا کہ اپنے تمام کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ اگر اونٹ پر سوار ہوتے اور اونٹ کی مہار گر جاتی تو خود نیچے اتر کر پکڑتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ انسانوں سے کوئی سوال نہ کروں۔ خود اپنے گھر میں جھاڑو دینے اور چولھے میں آگ جلانے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے۔

خلیفہ ہونے سے پہلے محلّہ کی بیواؤں، محتاجوں اور یتیموں کا خاص خیال رکھتے تھے، ان کی ضروریات کی دیکھ بھال کرتے، ان کی بکریاں چراتے اور ان کا دودھ دوھ دیتے تھے۔ جب خلیفہ ہوئے تو ایک یتیم لڑکی نے کہا کہ

''افسوس! اب ہماری بکریاں کون دوہے گا؟'' یہ سن کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''خدا کی قسم! خلافت مجھے خدمت خلق سے باز نہیں رکھ سکے گی۔'' ان کی خلافت کے زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک اندھی بڑھیا کی خبر گیری کیا کرتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ کوئی دوسرا شخص ان سے پہلے آ کر اس بڑھیا کے سارے کام کر جاتا۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ تاک میں بیٹھ گئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے اور بڑھیا کی ضروریات کی دیکھ بھال کر کے جانے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پکار اٹھے کہ ''میرا اندازہ صحیح نکلا۔ یہ تو آپ ہی ہیں میری جان کی قسم!''

آپ نفع رسانی اور خدمت خلق میں پیش پیش رہتے۔ بیماروں کی تیمارداری اور ضعیفوں ناتوانوں کی حاجت برآری کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کہ آج تم میں سے کون روزے سے ہے؟ آج کس نے جنازہ کی مشایعت کی؟ کس نے مسکین کو کھانا کھلایا؟ کس نے مریض کی عیادت کی؟ ان سب سوالوں کے جواب میں صرف ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے ایسا کیا ہے۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ایک دن میں یہ سب نیکیاں کی ہوں وہ یقیناً جنت میں جائے گا۔ ایک دوسرے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امت محمدیہ میں سے ابو بکر سب سے پہلے جنت میں جائیں گے۔

ایک دفعہ صدیق اکبر کے گرد صحابہ کا مجمع تھا۔ ایک صاحب آئے اور کہا کہ ''اے خلیفۂ رسول السلام علیکم'' ابو بکر نے فرمایا کہ مجھ اکیلے کو سلام کیوں؟ سب کو کیوں نہیں؟ عجز و انکسار اور تواضع میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ لوگ خلیفۂ رسول کی حیثیت سے تعظیم و توقیر کرتے تو انہیں تکلیف ہوتی فرماتے کہ مجھے لوگوں نے بہت بڑھا دیا ہے۔ خلیفہ بننے کے بعد جب پہلی دفعہ حج کے لئے گئے تو لوگوں نے ان کے برابر پہلو بہ پہلو یا آگے چلنے کی بجائے ازراہ احترام ان کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ یہ روش انہیں پسند نہ آئی اور لوگوں کو منتشر ہو جانے اور الگ الگ چلنے کے لئے کہا۔

امارت، دنیا طلبی اور جاہ پسندی سے نفرت کرتے تھے۔ تقویٰ اور اکل حلال کا اس قدر اہتمام تھا کہ ایک دفعہ ان کے غلام نے کھانے کی کوئی چیز دی جو اسے فال گوئی کے عوض ملی تھی۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے لاعلمی میں کھالی لیکن جب اس کی حقیقت معلوم ہوئی تو حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دی۔ فرمایا کرتے جو جسم اکل حرام سے پرورش پاتا ہے، جہنم اس کا بدترین مسکن ہے۔

رحم دلی اور صلہ رحمی میں ممتاز تھے، آپ کے ایک عزیز بدری صحابی حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ تھے جو تنگی معاش میں مبتلا تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ان سے صلہ رحمی کا برتاؤ کرتے اور ان کی باقاعدہ مدد معاش مقرر کر رکھی تھی۔ لیکن جب منافقوں کی پھیلائی ہوئی افواہوں سے متاثر ہو کر وہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اتہام لگانے والوں میں شامل ہو گئے تو قدرتاً حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو رنج ہوا اور انہوں نے مسطح رضی اللہ عنہ کی مالی امداد بند کر دی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت نازل فرمائی اور نیز اشارۃً فرمایا کہ جو مسلمان اپنے مالی لحاظ سے کمزور اور اعزہ و اقارب کی مدد کرتے تھے انہیں چاہئے کہ اس مدد سے دست کش نہ ہوں۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پھر سے حضرت مسطح کو مالی امداد دینا شروع کر دی۔ اس طرح حکم الٰہی کی تعمیل میں بڑے ضبط نفس، بردباری اور فراخ حوصلگی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے عزیزوں سے ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آتے رہے۔

اپنے صدقات وخیرات کو ہمیشہ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور کبھی کسی پر احسان نہیں جتاتے تھے اور نہ اس کا دوسروں میں ڈھنڈورہ پیٹتے تھے۔ ہمارے زمانے میں جو ''مہذبانہ اور ترقی پسندانہ'' رسم چلی ہے کہ عطیہ و صدقہ دینے والا دیتے وقت بڑے اہتمام سے فوٹو گرافروں اور اخباری رپورٹروں کو بلاتا ہے اور پھر اس کے عطیہ یا صدقہ دیتے وقت کے فوٹو اور خبریں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں، بھلا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اس کے ساتھیوں کے خواب و خیال میں یہ باتیں کاہے کو آسکتی تھیں۔ فی سبیل اللہ دینے والے کو اپنی اشتہار بازی کا شوق نہیں ہوتا، ایسے عطیے اور صدقے اور کچھ بھی ہوں فی سبیل اللہ تو نہیں ہو سکتے۔

وفات کے وقت بھی وصیت کی کہ ان کے مال کا پانچواں حصہ فقرا ومساکین میں تقسیم کیا جائے۔

جن مسلمان غلاموں، لونڈیوں کو اپنا مال خرچ کر کے فی سبیل اللہ آزاد کرایا، بعد کی زندگی میں انہیں کبھی جتایا تک نہیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشی کو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آزاد کرایا تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا خصوصی مؤذن مقرر کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انہوں نے کبھی اذان نہ دینے کی قسم کھالی۔ ایک دفعہ مسجد نبوی میں حضرت ابوبکر کے ساتھ دوسرے صحابہ کا مجمع تھا۔ بلال رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہو رہا تھا کہ اذان کا وقت ہو گیا۔ صحابہ کے اصرار پر انہوں نے بلال رضی اللہ عنہ سے اذان دینے کو کہا وہ بگڑ گئے اور کہا کہ ''اے ابوبکر! کیا تم مجھے اذان کا حکم اس لئے دیتے ہو کہ تم نے مجھے غلامی سے آزاد کرایا تھا؟ یا اس لئے کہ تم خلیفہ ہو؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے احساس ندامت کے ساتھ جواب دیا کہ ''اے بلال! یہ حکم نہ تھا بلکہ درخواست تھی۔'' بہرحال بلال رضی اللہ عنہ نے اذان نہ دی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کی حیثیت سے نہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے رویئے کو برا مانا نہ انہیں کچھ کہا۔ بلال رضی اللہ عنہ سے ان کا رویہ مساویانہ ومشفقانہ ہی رہا۔

نظم ونسق حکومت کی مصروفیات کے باوجود زہد وعبادت کی یہ کیفیت تھی کہ راتیں قیام وسجود میں اور دن روزوں میں گزارتے تھے۔ نماز کی حالت میں چوب خشک نظر آتے۔ رقت وگریہ سے ہچکی بندھ جاتی۔ حافظ قرآن تھے۔ تلاوت کرتے وقت آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور دیکھنے سننے والے بے حد متاثر ہوتے۔ دنیا کا ذرہ ذرہ ان کے لئے اپنے اندر سامان عبرت رکھتا تھا۔ سبز درختوں کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے کاش میں درخت ہوتا کہ آخرت کے خطروں اور جوابدہی سے بچا رہتا۔ چڑیوں کو چہچہاتے دیکھتے تو آہ سرد کھینچتے اور کہتے چڑیو تم خوش قسمت ہو کہ دنیا میں چرتی چگتی اور درختوں کی شاخوں پر بیٹھی ہو۔ تمہیں قیامت کے محاسبہ کا کوئی خطرہ نہیں۔ کاش میں بھی تمہاری طرح ہوتا۔''

قرآن فہمی میں ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام اصحابہ سے ممتاز تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نماز کی امامت وہ شخص کرے جو قرآن کا سب سے زیادہ عالم ہو۔ اپنے مرض الموت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو نماز پڑھانے کا حکم دیا اور خود بھی ان کی امامت میں نماز پڑھی۔ یہ اس امر کا اظہار تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ دوسروں سے قرآن کے زیادہ عالم ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملت کی امامت اور خلافت کے مستحق۔ بعض دفعہ سورتیں یا آیتیں نازل ہوئیں تو صحابہ میں سے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نے صحیح اور باطنی مفہوم سمجھا۔ مثلاً سورہ نصر اور تکمیل دین کی آیت (الیوم اکملت

لکم ......) جن کے نزول پر صحابہ خوش ہوئے لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ رو دیئے کیونکہ وہ سمجھ گئے کہ تکمیل دین کے بعد اب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا وقت آ گیا۔ وہ ایسے معانی اخذ کر لیتے جن کی طرف دوسرے صحابہ کا ذہن منتقل نہ ہوتا۔

روایت حدیث میں بے حد محتاط تھے۔ اکثر دوسروں کی بھی حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ لوگ حدیث رسول کو قرآن کی آیات سے خلط ملط نہ کر دیں۔ اور وضع حدیث کا چکر نہ چل پڑے۔ اگر کوئی شخص کوئی حدیث بیان کرتا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دوسرے صحابہ سے اس کی تائیدی شہادت طلب کرتے۔ تصدیق ہونے پر قبول کرتے۔ ایک بالغ آزاد مرد مسلمان کی حیثیت سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و معیت سب سے زیادہ نصیب ہوئی۔ ان کے ایمان لانے کے بعد شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح یا شام کو مکہ میں ان کے ہاں تشریف نہ لائے ہوں۔ مجمعوں، مجلسوں اور سفروں میں بھی وہ اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہتے تھے، تعلیمات دین کے جو یا افراد اور وفد آتے تھے تو بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ موجود ہوتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنتے تھے۔ اس لئے انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا سب سے زیادہ علم ہونا چاہئے۔ لیکن ان سے صرف ایک سو بیس احادیث مروی ہیں جن میں بعض بہت اہم ہیں۔ مثلاً پیغمبر کی جائے دفن اور میراث کے متعلق۔ نیز ادائے نماز کے طریقہ کی تفصیل اور زکوٰۃ کی شرح کے متعلق احادیث۔ قلت روایت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد وہ صرف سوا دو سال زندہ رہے اور یہ زمانہ بھی مرتدین، مانعینِ زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت کی سرکوبی اور روم و ایران کی سلطنتوں سے آویزش میں گزرا۔ اور پھر اس بالکل ابتدائی عہد میں روایت حدیث کی کوئی اشد ضرورت بھی پیش نہیں آئی کیونکہ ان کے ہم عصر خود صحابہ تھے اور ارشاداتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف۔ تذکرۃ الحفاظ، میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا لیکن پھر اسے اس خوف سے تلف کر دیا کہ مبادا کوئی غیر معتبر حدیث شامل ہو گئی ہو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک جامع کمالات ہستی تھے۔ حقیقی مومن کی شان میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خوبصورت اور پیارا مصرعہ ہے ع

آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن!

ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کا بدرجہ اتم مصداق تھے۔ وہ اسرار شریعت اور روح دین کے سب سے زیادہ محرم تھے۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ میں انہیں بڑی بصیرت حاصل تھی۔ فقہ کے بعض مشکل مسائل بھی انہوں نے حل کئے۔ بڑے فصیح اور خوش کلام تھے۔ تقریر، مختصر، جامع اور موثر کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسجد نبوی اور سقیفہ بنی ساعدہ میں جو تقریریں انہوں نے کیں وہ تاریخ ساز ثابت ہوئیں اور انہوں نے واقعات کا رخ موڑ دیا۔

تعبیر خواب اور علم الانساب کے بھی ماہر تھے۔ اکثر خوابوں کی بہت صحیح اور موزوں تعبیر بیان کرتے۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنے خواب بیان کیا کروں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا شمار ان علمائے انساب میں ہوتا تھا جو سارے عرب میں منتخب مانے جاتے تھے۔ ہجرت سے پہلے بہت سے قبیلوں میں وہ اپنی نسب دانی کی مہارت کی وجہ سے بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔

اسلام کی اشاعت میں بھی ان کا یہ علم مفید ثابت ہوا۔

تصوف

عملی اسلامی تصوف کا آغاز خود رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ہو چکا تھا، تصوف کیا ہے؟ تزکیہ نفس کا دوسرا نام۔ صحابہ کے لئے دین کے دشمنوں کے خلاف جنگ جہاد اکبر تھا، دن کو گھوڑوں کی پشت پر اور رات کو جائے نماز پر۔ ذکر و فکر ان کے ہاں تھا لیکن مزاج خانقاہی نہ تھا۔ ان کی زندگیاں تزکیہ نفس کا عملی نمونہ تھیں۔ ان میں ایسے بھی تھے جنہیں روحانی اشغال سے خصوصی لگاؤ تھا۔ رسمی تصوف کے علمی اصول و قواعد اور عملی تکلفات بعد کی پیداوار ہیں جن سے تصوف ایک فن بن گیا۔ تصوف کے مختلف سلسلے چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقش بندیہ، شاذلیہ، شطاریہ وغیرہ کئی صدی بعد منظم کئے گئے۔ عموماً نقش بندیہ سلسلے کا بانی خواجہ بہاء الدین نقش بند کو تصور کیا جاتا ہے لیکن شجروں میں اس کا آغاز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کیا جاتا ہے برصغیر میں اسے خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے متعارف کرایا اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی سے اسے قبولیت اور اشاعت حاصل ہوئی۔ اس میں احکام شریعت کی پابندی پر سخت زور دیا جاتا ہے اور غیر شرعی امور اور بدعات سے سخت پرہیز کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تزکیۂ قلب کے لئے کلمہ توحید کا ذکر کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی راہ تصوف کے امام ہیں۔ اہل تصوف کی بنیادی خصوصیات مثلاً توکل علی اللہ، تدین، تقویٰ، حزم و احتیاط، عجز و انکسار، خلق خدا پر شفقت و ترحم، رضا بہ قضا وغیرہ آپ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ صوفیا کے بقول ابوبکر رضی اللہ عنہ رنمیات الکبریٰ کے بلند مقام پر فائز تھے اور ان کی نسبت ابراہیمی تھی۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو 'اواہ' (بہت زیادہ آہیں بھرنے والا) کہا گیا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی صحابہ اسی نام سے پکارتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دن کو کاروبار خلافت کی انجام دہی میں مصروف رہتے اور راتیں رکوع و سجود میں گزار دیتے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات پر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا خطبہ

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بہترین خراج تحسین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پیش کیا۔ ان کی وفات پر عم زاد و داماد رسول ﷺ نے جو فصیح و بلیغ اور جامع تقریر فرمائی، اسے مؤرخوں نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعض اہم نکات کے اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ قارئین دیکھیں گے کہ ان میں سیرت صدیقی کے محاسن و فضائل کی روح کھنچ کر آ گئی ہے:

> ''اے ابوبکر! اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ واللہ آپ تمام امت میں سب سے پہلے ایمان لائے اور سب سے زیادہ ایمان کو اپنا خلق بنایا۔ آپ کا ایمان سب سے زیادہ خالص اور یقین سب سے زیادہ استوار تھا۔ آپ سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والے، نبی ﷺ کی حفاظت کرنے والے، معتمد علیہ سب سے بڑھ کر اسلام کے نفع رساں اور خدمت گزار تھے، خلق و فضل و سیرت و صحبت میں آنحضرت ﷺ سے آپ کو سب سے زیادہ نسبت حاصل تھی۔ خدا آپ کو اسلام اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی

طرف سے جزائے خیر دے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بمنزلہ سمع و بصر کے تھے۔ آپ نے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی جب لوگوں نے تکذیب کی اور اس وقت غم خواری کی جب اوروں نے بخل کیا۔ جب لوگ نصرت وحمایت سے رکے رہے آپ نے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ سختی میں آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین رفاقت کی۔ آپ دو میں سے ایک تھے اور غار میں رفیق اور وہ شخص جس پر اللہ نے سکینہ (تسکین قلب) نازل فرمائی، آپ کو خدا نے اپنی کتاب میں صدیق فرمایا اور آپ کی شان میں والذی جآء بالصدق ...... فرمایا[1]۔ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ رضی اللہ عنہ ہیں۔ بخدا آپ اسلام کا قلعہ تھے اور کفار کو ذلیل کرنے والے۔ نہ آپ کی حجت میں غلطی ہوئی اور نہ آپ کی بصیرت میں ضعف آیا۔ جبن آپ کو چھو کر بھی نہیں گیا۔ آپ پہاڑ کی مثل مضبوط تھے جسے نہ تند ہوائیں ہلا سکتی ہیں اور نہ اکھاڑنے والے اکھاڑ سکتے ہیں۔ آپ نے بہترین خلافت کی اور امر الٰہی کی وہ حفاظت کی جو کسی نبی کے خلیفہ نے نہیں کی تھی۔ آپ بلا نزاع وتفرقہ خلیفہ، برحق تھے۔ آپ کا کلام سب سے زیادہ باوقار، باصواب اور بلیغ ہوتا۔ واللہ آپ اہل دین کے سردار تھے۔ آپ نے فضائل کی بازی جیت لی۔ آپ ایسے ہی تھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ ضعیف البدن، قوی الایمان، منکسر المزاج، اللہ کے ہاں آپ عالی مرتب تھے۔ زمین پر بزرگ اور مومنوں میں افضل تھے۔ آپ کے سامنے کوئی بیجا طمع اور ناجائز خواہش نہ کر سکتا تھا، آپ کے نزدیک کمزور قوی اور قوی کمزور تھا یہاں تک کہ قوی سے لے کر کمزور کو اس کا حق دلایا جائے۔ آپ کافروں کے لئے بارشِ عذاب اور آتش سوزاں تھے۔ اور مومنوں کے لئے انس ورحمت و پناہ، آپ کی شان حق، راستی اور نرمی تھی۔ آپ کے حکم میں حلم تھا اور حزم۔ رائے میں دانائی اور عزم۔ آپ نے باطل کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ راہ صاف، مشکل آسان اور فتنہ وفساد کی آگ ٹھنڈی کر دی۔ اسلام اور مسلمان مضبوط ہو گئے۔ واللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی وفات سے بڑھ کر مسلمانوں پر کبھی کوئی مصیبت نہیں پڑے گی۔''[2]

خدا آپ کو آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا دے اور ہمیں آپ کے اجر سے محروم نہ کرے اور آپ کے بعد ہم

---

[1] اس آیت میں اشارہ ہے وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۳۳:۳۹) ترجمہ: ''اس شخص کے حالات پر غور کرو جو تمہارے پاس صدق ویقین سے بھرپور باتیں لے کر آیا ہے اور اسے بھی دیکھو جو ان باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔'' جاء بالصدق سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور صدق سے ابوبکر رضی اللہ عنہ مولف

[2] اشہر المشاہیر الاسلام حصہ اول ص ۱۳۸۔

حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم نے اپنی تصنیف ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ میں محب طبری کے ریاض النضرہ سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طویل خطبے کا مکمل عربی متن اور اردو ترجمہ دیا ہے۔ (مؤلف)

کو گمراہ نہ کرے۔"

لوگوں نے حضرت علی کا خطبہ بڑی خاموشی سے سنا اور پھر سب باآواز بلند روئے۔ پھر بیک زبان ہو کر کہا کہ "اے رسول اللہ کے قرابتدار! آپ نے سچ فرمایا"

حرفِ آخر

مولانا سید ابوالحسن ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور مکان وزماں کی تبدیلیوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں ایک تو یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل واکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو ہر کشمکش اور تبدیلی کا باآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل ومشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ دوسرے اس نے ذمہ لیا ہے (اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے۔ اس دین میں ایسے اشخاص پیدا کرنے کی جو صلاحیت وطاقت ہے اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا۔ اور یہ امت تاریخ عالم میں جیسی مردم خیز ثابت ہوئی ہے دنیا کی قوموں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ انتظام خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت وقوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور زہر کو جس تریاق کی ضرورت تھی وہ اس امت کو عطا ہوا۔

شروع ہی سے اسلام کے قلب وجگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرے مذاہب جنہوں نے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی اس سے کم درجہ کے حملوں کی تاب نہ لا سکے اور انہوں نے اپنی ہستی کو گم کر دیا۔ لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد سب سے پہلے ایسے بطل عظیم جو اسلام کو سٹیج پر نمودار ہوئے وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت مسلمہ سب سے زیادہ انہی کی مرہون احسان ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پیغمبروں کے سوا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑے کسی انسان پر سورج طلوع وغروب نہیں ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا تتمہ وتکملہ تھا۔ اور عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا دور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور کا تتمہ وتکملہ۔ رضی اللہ عنہما۔

بارك الله في مساعي المصنف و الناشر والمصحح

اللهم اجعلنا مع الذين انعمت عليهم۔ آمين۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ

(فاروقِ اعظم)

حکمرانے بود و سامانے نداشت
دست او جز تیغ و قرآنے نداشت

(اقبال)

(۲)

جہانگیری بہ خاک ما سر شتند
امامت در جبین ما نوشتند
درون خویش بنگر آں جہاں را
کہ تخمش در دل فاروق رضی اللہ عنہ کشتند

(۳)

نگاہے وام کن از چشم فاروق رضی اللہ عنہ
قدم بیباک نہ در عالم نو

(اقبال)

قوم کا سردار قوم کا خادم

''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر ابن خطاب ہوتا'' (رسول اکرم ﷺ)

''اگر دنیا کا علم ترازو کے ایک پلڑے میں اور عمر رضی اللہ عنہ کا دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو عمر رضی اللہ عنہ کا پلڑا بھاری ہوگا'' (عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ)

''عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر سکینہ بولتا ہے وہ قوی و امین ہیں'' (حضرت علی رضی اللہ عنہ)

''ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ تاریخ اسلام کی دو شاہکار شخصیتیں ہیں'' (ایچ۔جی۔ویلز)

سرد و تاریک رات، نواح مدینہ میں ایک خیمہ!

ایک افسردہ و محزوں عورت نے چولھے پر ہنڈیا چڑھا رکھی ہے۔ اس کے گرد چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بلبلا رہے ہیں۔ وہ انہیں چمکارتی بہلاتی ہے لیکن وہ برابر روئے جا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک پیوند لگے کپڑوں میں ملبوس، گوری رنگت کا گیم و شحیم، دراز قامت، باوقار اور پر رعب شخص اچانک نمودار ہوتا ہے اور خیمہ کے دروازے سے ملامت کے لہجے میں عورت سے کہتا ہے۔

''تو اچھی ماں ہے کہ بچوں کو رلا رہی ہے؟''

''یہ کئی وقتوں کے بھوکے ہیں''......عورت افسردہ لہجے میں جواب دیتی ہے۔

''یہ ہنڈیا میں کیا پکا رہی ہے؟ جلدی سے پکا کر انہیں کھلا کیوں نہیں دیتی؟''

''یہ تو صرف پانی ہے جو ان کو بہلانے کے لئے ہنڈیا میں ڈال دیا ہے۔ رو دھو کر سو جائیں گے تو اتار دوں گی۔''

شدتِ تاثر سے نو وارد کے چہرے پر شکنیں سی پڑ جاتی ہیں جیسے ابھی رو دے گا اور اس کے سارے جسم میں ایک لرزش سی دوڑ جاتی ہے۔ وہ تیز اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا شہر کو لوٹتا ہے۔ آٹا، گوشت، گھی، کھجوریں اور رسد کا دوسرا ضروری سامان بوری میں ڈال کر اپنے خادم سے کہتا ہے کہ میری پیٹھ پر لاد دو۔ خادم کہتا ہے کہ میں اٹھا لے چلتا ہوں۔ وہ شخص جواب دیتا ہے کہ ''قیامت کے دن تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے'' پھر وہ خورد و نوش کا تمام سامان اپنی پیٹھ پر اٹھائے تقریباً میل بھر کا سفر طے کر کے اسی عورت کے خیمے تک پہنچتا ہے۔ اور سارا سامان اس کے آگے ڈھیر کر کے کہتا ہے کہ جلدی سے بچوں کو پکا کر کھلاؤ۔ عورت ہنڈیا میں گوشت چڑھاتی ہے اور پھر آٹا گوندھ کر

روٹیاں پکاتی ہے۔ وہ شخص چولھا پھونکتا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں کھانا تیار ہو جاتا ہے۔ بچے خوب پیٹ بھر کر کھاتے ہیں اور پھر خوشی سے اچھلنے کودنے لگتے ہیں۔ اس شخص کے چہرے پر اطمینان و مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے اور عورت جذبۂ تشکر میں ڈوب کر کہتی ہے کہ ''اے اجنبی! خدا تجھے جزائے خیر دے اور اپنی رحمتوں سے نوازے۔ خلیفہ ہونے کے لائق تو ہے نہ کہ عمر ابن خطاب۔''

منظر بدلتا ہے

دارالخلافہ مدینہ کے باہر ایک قافلہ اترا ہوا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ تھکے ماندے اہل قافلہ کی اکثریت محو خواب ہے۔ وہی مذکورہ بالا شخص قافلے کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے ادھر ادھر گشت کر رہا ہے۔ اثنائے گشت میں ایک خیمے سے ایک شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ وہ شخص فوراً ادھر متوجہ ہوتا ہے اور بچے کی ماں کو تاکید کرتا ہے کہ اسے بہلائے اور چپ کرائے۔ اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے کچھ دیر بعد جب دوبارہ گشت کرتا ہوا وہاں آتا ہے تو بچہ بدستور رو رہا ہوتا ہے یہ دیکھ کر وہ قدرے غصے کے ساتھ عورت سے کہتا ہے۔

''تو بڑی بے رحم ماں ہے کہ بچے کو رلائے جا رہی ہے اور چپ نہیں کراتی!''

عورت جواب دیتی ہے۔

''اے شخص اپنی راہ لے اور مجھے بار بار پریشان نہ کر۔ میں اس کا دودھ چھڑانا چاہتی ہوں۔ اس لئے یہ ضد کرتا اور روتا ہے۔''

''ابھی تو یہ ایک سال کا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ تو دودھ چھڑانے میں جلدی کیوں کرتی ہے؟''

''اس لئے کہ خلیفہ کا حکم ہے کہ بچے کا وظیفہ دودھ چھڑانے کے بعد مقرر کیا جائے گا جب کہ ہم ضرورت مند ہیں۔ اس لئے میں اس کا وقت سے پہلے دودھ چھڑانا چاہتی ہوں تاکہ وظیفہ مل سکے۔''

''اس ننھی جان پر ظلم نہ کر۔ اسے دودھ پلا۔ کل انشاء اللہ اس کا وظیفہ لگ جائے گا۔''

شخص مذکور پر رقت اور کپکپی طاری ہے اور وہ یہ الفاظ بڑی نرمی اور ملاطفت سے تسلی کے انداز میں کہتا ہے۔ پھر یہ سوچتا ہوا شہر کو لوٹ جاتا ہے کہ خدا جانے اس حکم سے کہ وظیفہ دودھ چھڑانے کے بعد دیا جائے گا، کتنی ننھی جانوں پر ظلم ہو رہا ہوگا!

صبح کو یہی شخص مسجد نبوی میں مسلمانوں کو فجر کی نماز اس حالت میں پڑھاتا ہے کہ شدتِ گریہ سے گلا رندھ گیا ہے اور مقتدی اس کی قرأت کو نہیں سمجھ پائے۔

نماز پڑھا چکنے کے بعد اپنے آپ نیز مجمع سے کہتا ہے۔''

''عمر کی خرابی ہے اس نے مسلمانوں کے کتنے معصوم بچے قتل کر دیئے۔''

ساری اسلامی مملکت میں یہ حکم عام جاری ہو جاتا ہے کہ جس دن کوئی بچہ پیدا ہوگا، اسی دن سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے گا۔ دودھ چھڑانے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

منظر ایک دفعہ پھر بدلتا ہے

یہی بلند و بالا اور باوقار شخص اپنے موٹے جھوٹے پیوند لگے لباس میں اونٹ پر سوار چند ساتھیوں کے ہمراہ شام سے مدینہ کو آ رہا ہے۔ اثنائے سفر میں ایک خیمہ میں ایک بہت عمر رسیدہ عورت نظر آتی ہے۔ شخص مذکور سواری سے اتر کر اس ضعیفہ کے پاس جاتا ہے اور دونوں میں یوں گفتگو ہوتی ہے۔

''بڑی بی! کچھ خلیفہ کا حال معلوم ہے؟''

''سنا ہے کہ شام سے روانہ ہو چکا ہے لیکن خدا اسے غارت کرے۔ آج تک مجھے اس کے ہاں سے ایک حبہ بھی نہیں ملا۔''

''تو اتنی دور رہتی ہے۔ خلیفہ کو تیرا حال کیونکر معلوم ہو سکتا ہے؟''

''اگر اسے میرا اور دوسری رعایا کا حال معلوم نہیں ہو سکتا تو وہ خلافت کے لائق نہیں۔''

شخص مذکور پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑتی ہیں۔ وہ قریبی گاؤں میں جاتا اور وہاں سے کھانے پینے، پہننے وغیرہ کی ضروری چیزیں لا کر بڑھیا کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اور اپنے سامنے اسے کھلاتا پلاتا ہے۔ بڑھیا خوش ہو کر دعا دیتی اور کہتی ہے کہ ''مسلمانوں کا خلیفہ تجھ کو ہونا چاہئے نہ کہ عمر بن خطاب کو، جس نے آج تک میری خبر نہ لی۔''

ایک اور منظر!

ایک اور موقع پر یہی شخص حسب معمول رات کے وقت مدینہ کے باہر گشت کر رہا ہے۔ دیکھتا ہے کہ ایک بدو اپنے خیمے کے دروازے پر بیٹھا سر جھکائے تنکوں سے زمین کرید رہا ہے۔ جیسے کسی اتھاہ فکر میں ڈوبا ہوا ہو۔ خیمے سے کسی عورت کے رونے اور کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔

''یہ کون رو رہا ہے؟ اسے کیا تکلیف ہے؟'' وہ شخص پوچھتا ہے۔

''میری بیوی دردزہ میں مبتلا ہے۔ لیکن کوئی دایہ موجود نہیں''...... بدو جواب دیتا ہے وہ شخص اپنے گھر آتا ہے اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر مع ضروری سامان کے بدو کے ہاں جاتا ہے اور اس کی اجازت سے اپنی بیوی کو خیمہ کے اندر بھیجتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے رونے کی آواز آتی ہے۔

''امیر المومنین! اپنے دوست کو لڑکے کی پیدائش کی مبارکباد دیجئے۔'' اندر سے اس کی بیوی پکارتی ہے۔

امیر المومنین کا لفظ سن کر بدو گھبرا جاتا اور ادب و احترام کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''امیر المومنین! آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ آپ شہر سے کسی پیشہ ور دایہ کا بندوبست کر دیتے۔ اپنی حرم کو کیوں تکلیف دی؟''

''کوئی خیال نہ کرو۔ کل میرے پاس مسجد نبوی میں آنا۔ تمہارے بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے گا۔'' وہ شخص بدو کو تسلی دیتا ہے۔

یہ پیوند لگے کپڑوں میں ملبوس، بلند و بالا اور باوقار شخص کون ہے جو راتوں کو گھر سے نکل کر غریبوں، حاجت

مندوں اور مصیبت زدوں کی دیکھ بھال کرتا، ان کی ضرورت میں ان کے کام آتا، ان کی تکالیف پر روتا اور اپنا فرض سمجھ کر ان کا ازالہ کرتا ہے، کسی پر کوئی احسان نہیں رکھتا، نہ کسی قسم کی رعونت، رعب و داب اور احساس برتری کا مظاہرہ کرتا ہے؟ یہ ہیں ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے جانشین اسلام کے دوسرے خلیفۂ راشد عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب جنہیں تاریخ نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نام سے یاد رکھا ہے۔ جنہوں نے اپنے ہادی و آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو لفظاً ومعناً صحیح ثابت کر دکھایا کہ سید القوم خادمھم (قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے)۔ ان کے عظیم وحسین کردار کو دیکھ کر ایک غیر مسلم مغربی مصنف کو کہنا پڑا کہ عمر رضی اللہ عنہ سر سے پاؤں تک انسانیت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔''

کون فاروق اعظم؟

وہ جس نے حق اور باطل، کھوٹے اور کھرے کو الگ کر دکھایا، جس نے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں زلزلے ڈال دیئے۔ دنیا کو ان کے جور و استبداد سے نجات دلائی۔ اور تاریخ انسانی کے صفحات میں امن، عدل، مساوات اور اخوت کے روشن اور بے نظیر باب کا اضافہ کیا۔ وہ قیصر و کسریٰ کے خزانے لوگوں میں بانٹتا تھا لیکن اس کے اپنے کرتے اور تہمد میں درجنوں پیوند لگے ہوتے تھے اور بغیر کسی محافظ کے مسجد کے ننگے فرش پر اینٹ کا تکیہ بنا کر سو رہتا تھا۔ اور خدم وحشم کے بغیر عام مسلمانوں کی طرح رہتا تھا۔ لیکن رعب و داب کا یہ عالم تھا کہ سینکڑوں میل دور بیٹھے مصر، کوفہ، بصرہ اور دوسرے صوبوں کے گورنر ویسے ہی کانپتے رہتے تھے۔ جیسے دار الخلافہ مدینہ کے عوام وخواص اس کے احتساب سے خائف رہتے تھے۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے امت مسلمہ پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ اسلام کی توسیع واشاعت و مسلمانوں کی جہانبانی اور کشور کشائی کا راز اسی انتخاب میں مضمر تھا اور اسی انتخاب میں اسلامی حکومت کی وسعتیں پوشیدہ تھیں۔ یہ انتخاب سیاست عالم کا بے حد اہم واقعہ تھا۔

خاندان، پیدائش اور اسلام سے پہلے کی مکی زندگی

خلیفۂ ثانی عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب کا تعلق قریش کے ایک چھوٹے قبیلہ بنو عدی سے تھا۔ ان کے باپ کا نام خطاب اور دادا کا نفیل تھا۔ عشرۂ مبشرہ میں سے ان کا نسب سب سے بعد میں آٹھویں پشت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔ انہیں ماں اور باپ دونوں طرف سے خاندانی وجاہت اور امتیاز حاصل تھا۔ ان کی والدہ حنتمہ قریش کے طاقتور اور معزز قبیلہ بنی مخزوم کے ہشام بن مغیرہ کی بیٹی تھیں۔ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی چچا زاد بہن۔ ابو جہل ان کا ماموں تھا۔ ان کے والد خطاب انساب عرب کے ماہر تھے اور مکہ کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ بنو عدی کو مکہ کی شہری ریاست میں سفارت اور فصل مقدمات کے صیغے تفویض تھے۔ اپنے وقت پر یہ منصب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملا۔ قریش کو کسی دوسرے قبیلے سے کوئی معاملہ طے کرنا ہوتا تو وہ سفارت کے فرائض سرانجام دیتے۔ منافرت کے قضیوں میں بھی وہی ثالث ہوا کرتے، ایسے نزاعات، معاملات اور مقدمات کو نپٹانے کے لئے سوجھ بوجھ، دقت نظر، معاملہ فہمی، دقیقہ سنجی اور مردم شناسی کے علاوہ فصاحت اور قوت تقریر کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ

جو ہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خاندان میں پائے جاتے تھے اور انہیں ورثہ میں ملے۔

خطاب کے چچازاد بھائی زید بن عمرو اپنے زمانے کے موحدین میں سے تھے اور اپنے آپ کو دین ابراہیمی کے پیرو کہتے اور خدائے واحد کی پرستش کی تلقین کرتے تھے۔ انہوں نے بت پرستی ترک کر کے بتوں کا ذبیحہ کھانا چھوڑ دیا تھا۔ زید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا سے اٹھ گئے لیکن ان کے صاحب زادے سعید بن زید رضی اللہ عنہ ایمان لائے اور عشرۂ مبشرہ میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت خطاب کی شادی ان سے ہوئی تھی اور بالآخر انہیں کے گھر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقدیر دگرگوں ہوئی۔ اور وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر کے فاروق اعظم بننے کے لئے کارکنان قضا وقدر نے پہلے سے سازگار حالات پیدا کرنے شروع کر دیئے تھے۔ پہلے خاندان میں زید کے ذریعے توحید کا پرچار ہوا پھر سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت خطاب کے ذریعے اسلام نے اپنا قدم جمایا۔

پیدائش

مؤرخین کی اکثریت کی رائے کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ واقعہ فیل کے تیرہ سال بعد یعنی ہجرت نبوی سے چالیس سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئے جو تقریباً ۵۸۲ سن عیسوی ہوتا ہے۔ بعثت نبوی کے وقت وہ عمر کے ستائیسویں سال میں تھے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق حضرت عمر کی پیدائش پر بہت خوشی منائی گئی۔ حالانکہ ان سے پہلے بھی خطاب کے ہاں بیٹے پیدا ہو چکے تھے۔

لڑکپن اور جوانی

جب حضرت عمر ذرا سیانے ہوئے تو خطاب نے اہل مکہ کے عام دستور کے مطابق انہیں اونٹ چرانے پر لگا دیا۔ مکہ معظمہ سے تقریباً دس میل دور ضجنان کے میدان میں وہ سارا سارا دن اونٹ چرایا کرتے اور تھک کر ذرا دم لینے کو بیٹھ جاتے تو خطاب پٹائی کرتے، اپنی خلافت کے زمانے میں جب ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہاں سے گزر ہوا تو سخت عبرت ہوئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پوچھنے پر رفقائے سفر سے فرمایا کہ "اللہ اکبر! میرے لئے یہ بڑا عبرت کا مقام ہے۔ ایک وقت تھا کہ میں نمدے کا کرتہ پہن کر انتہائی شدت کی گرمی میں یہاں اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور اگر تھک کر بیٹھ جاتا یا کوئی ذرا سی کوتاہی کرتا تو میرا باپ مجھے بری طرح پیٹتا تھا اور آج یہ عالم ہے کہ اللہ کے سوا میرے اوپر کوئی حاکم نہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب عنان خلافت ہاتھ میں لی تو اپنے ایک ابتدائی خطبہ میں قبائل عرب اور ان کے کنٹرول کرنے کا ذکر اونٹوں کے حوالے ہی سے کیا۔ فرمایا کہ "عرب ایک منہ زور اونٹ کی مانند ہیں۔ اس کا انحصار شتربان پر ہے کہ وہ اسے کدھر لے جاتا ہے۔ رب کعبہ کی قسم! میں تمہیں شتربان ہی کی طرح صحیح راہ پر چلاؤں گا۔"

جب عمر رضی اللہ عنہ شباب کی حدود میں داخل ہوئے تو ایک بلند و بالا، قوی الجثہ، شہ زور اور سرخ و سفید جوان رعنا کی صورت میں لوگوں کے سامنے آئے۔ جب کسی مجمع میں کھڑے ہوتے تو سب سے قد آور شخصیت کے طور پر نمایاں

نظر آتے۔ دوسروں کے قد ان کے شانوں تک ہی پہنچ پاتے۔ متداول علوم وفنون مثلاً سپہ گری، شہسواری، کشتی، پہلوانی، خطابت اور نسب دانی میں کمال حاصل کیا۔ نوشت وخواند بھی سیکھی۔ مدینہ پہنچ کر عبرانی میں بھی درک حاصل کیا چنانچہ تورات پڑھ لیتے تھے، پورے عرب میں عکاظ کا سالانہ میلہ بڑی اہمیت اور شہرت رکھتا تھا۔ یہ میلہ جبل عرفات کے قریب منعقد ہوتا تھا۔ تجارتی کاروبار کے علاوہ وہاں عرب کے دور دراز گوشوں سے ہر قسم کے اہل فن جمع ہو کر اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے تھے۔ قبول اسلام سے پہلے حضرت عمر وہاں کشتی اور شہسواری کے مقابلوں میں اکثر حصہ لیتے اور جیتتے رہے۔ ان کامیابیوں سے نوجوان عمر کی شہرت عرب قبائل میں پھیل گئی۔ وہ آخر دم تک گھوڑے پر اچھل کر سوار ہوتے رہے اور اس طرح جم کر بیٹھتے تھے کہ گھوڑے کا جزو بدن معلوم ہوتے تھے۔ عکاظ میں عرب کے مشہور شعرا اور خطبا بھی اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ کی اخاذ طبیعت نے ان سے بھی خوب استفادہ کیا اور ان میں شاعری اور خطابت کا عمدہ مذاق پیدا ہو گیا۔ انہیں مشہور شعرا کے بہت سے چیدہ چیدہ اشعار یاد تھے۔ شعر کی پرکھ خوب کرتے تھے۔ اسی طرح خطابت کے حسن وقبح سے بھی خوب واقف تھے۔

شرفائے عرب میں نوشت وخواند کو قدرے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جیسے لکھنا پڑھنا ان کے شایان شان نہ ہو لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے آغاز شباب ہی میں نوشت وخواند سیکھ لی تھی۔ وہ مکہ کے ان سترہ آدمیوں میں شامل تھے جو بعثت نبوی کے وقت لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

شادی، معاش اور دوسری ذمہ داریاں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پہلی شادی مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت مظعون سے ہوئی۔ بعد میں اور شادیاں بھی کیں جن سے متعدد بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔ شادی کے بعد فکر معاش دامن گیر ہوئی تو دوسرے شرفائے قریش کی طرح تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ تجارت کے سلسلے میں انہوں نے شام عراق یمن وغیرہ کے سفر کیے۔ چونکہ قوت مشاہدہ بہت تیز تھی اس لئے ان سفروں سے انہوں نے کسب معاش کے علاوہ بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ اور ان ممالک کے جغرافیائی، سیاسی، سماجی، معاشی حالات سے گہری واقفیت حاصل کی اور وہاں کے سرکردہ اور صاحب دانش لوگوں سے بھی ملے اور ان سے استفادہ کیا۔ (بعد ازاں اپنی خلافت کے دوران میں شام وعراق کی جنگوں میں اس واقفیت سے انہوں نے پورا پورا کام لیا اور مدینہ میں بیٹھ کر اپنے سالاران لشکر کو مفصل ہدایات دیتے رہے) اس طرح ان کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہو گیا۔ لوگ ان کی جوانمردی، خود اعتمادی، بلند نظری، عالی حوصلگی، معاملہ فہمی، دور اندیشی، تجربہ کاری، خودداری، غیرت مندی، اصول پسندی، نسب دانی اور قوت تقریر سے متاثر ہوتے تھے۔ قریش نے انہیں جوہر قابل پا کر سفارت کے منصب پر فائز کر دیا۔ قبائل میں جب کوئی پرخطر معاملہ پیش آتا تو انہی کو سفیر بنا کر بھیجتے۔ یہ بڑی اہمیت، نزاکت اور ذمہ داری کا منصب تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ اپنی قابلیت اور خوش تدبیری سے بین القبائلی تنازعات کو سلجھا کر امن وآشتی کا ماحول پیدا کر دیتے۔ سفیر کے لئے ٹھنڈے دل ودماغ کا ہونا بہت ضروری ہے لیکن یہ بات عجیب

معلوم ہوتی ہے کہ اپنی فطری تندخوئی اور شعلہ مزاجی کے باوجود عمر قریش کے کامیاب سفیر تھے اور کسی کو ان سے کبھی شکایت پیدا نہ ہوئی۔

قبولِ اسلام

آمد آں یارے کہ مامی خواستیم!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں نوجوان عمر رضی اللہ عنہ کو مذہب خصوصاً قریش کے مذہب شرک و بت پرستی سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ لیکن قریش کے دین اور معاشرے میں کسی انقلابی تبدیلی کے خواہاں بھی نہ تھے۔ بلکہ رائج الوقت معاشرتی نظام کی برقراری کے حامی تھے۔ اپنے عزیز زید بن عمرو کے برعکس انہوں نے کبھی مذہب، خدا، عاقبت وغیرہ کے متعلق سوچا تک نہ تھا، مروجہ زندگی جیسی کہ تھی، وہ ایک خوش باش نوجوان کی طرح اس پر مطمئن تھے۔ لیکن قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ عمر بن خطاب کا نام دنیا کے عظیم ترین انسانوں کی فہرست میں لکھا جا چکا تھا۔ اللہ نے ان سے اپنی دنیا کی امامت کا کام لینا تھا، ان کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا، وہ عمر عزیز کے ستائیسویں سال میں تھے کہ

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی صلی اللہ علیہ وسلم
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

کے مصداق ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائے توحید بلند ہوئی اور مکہ کی منجمد اور پتھریلی فضا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ لات، عزیٰ، ہبل اور دوسرے بتوں اور جعلی خداؤں کی خدائی پر ضرب کاری لگی۔ لا الہ الا اللہ کی کفر توڑ صدا سے قریش کے مفادات اور پیشوائیت پر براہ راست زد پڑی۔ اور وہ بوکھلا اٹھے۔ خاص کر بڑے قبائل بنو امیہ، بنو مخزوم وغیرہ نے اسلام کے پیغام کو اپنے اقتدار کے لئے بہت بڑا خطرہ سمجھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ بنو ہاشم کے ایک فرد نے نبوت کا دعویٰ کر کے اپنے قبیلہ کے لئے امتیاز، تفوق، پیشوائی اور سرداری حاصل کرنے کا ایک طریقہ وضع کیا ہے۔ اس لئے وہ شدید مخالفت پر تل گئے۔ حضرت عمر کا قبیلہ بنو عدی بڑے قبیلوں میں سے نہ تھا۔ اسلام کی آمد سے اس کے مادی مفادات براہ راست کچھ ایسے متاثر بھی نہ ہوتے تھے، تاہم عمر کو مروجہ نظام سے سفارت کا منصب حاصل تھا اور وہ اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے اس نظام اور معاشرے میں کسی تبدیلی کے حق میں نہ تھے۔ اسلام نے قریش میں جو اختلاف و افتراق پیدا کر دیا تھا عمر اسے سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس لئے جب بڑے قبیلوں کے سرداروں نے اسلام کی مخالفت شروع کی اور کمزور اور بے سہارا مسلمانوں کو دبانا اور ستانا شروع کیا تا کہ وہ اسلام سے منحرف ہو جائیں تو عمر بھی سرداران قریش کی دیکھا دیکھی مسلمانوں کے درپے آزار ہو گئے۔

اکا دکا مسلمان جو بھی چڑھ جاتا اسے مارنے پیٹنے سے باز نہ رہتے۔ ان کے اپنے خاندان کی ایک لونڈی لبینہ رضی اللہ عنہا مسلمان ہو گئی تھیں۔ ان بیچاری کو اس قدر مارتے کہ وہ لہولہان ہو جاتیں۔ جب مارتے مارتے تھک جاتے تو رک جاتے اور کہتے یہ نہ سمجھو کہ میں نے تمہیں رحم کھا کر چھوڑ دیا ہے۔ ذرا دم لے لوں تو پھر ماروں گا۔ لبینہ

رضی اللہ عنہا بڑے صبر و استقلال سے تشدد اور مار پیٹ برداشت کرتی رہیں۔ آخر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لبینہ رضی اللہ عنہا کو خرید کر آزاد کر دیا۔

عمر کو اس کمزور اور بے بس لونڈی کے صبر و استقلال اور ایمان محکم پر ضرور حیرت ہوئی ہوگی اور وہ سوچتے ہوں گے آخر اس نئے عقیدے اور دین میں ایسی کیا بات ہے جس نے معاشرے کے اس کمزور اور نچلے طبقے کو ایسا لوہا لاٹھ بنا دیا ہے کہ کسی بھی قسم کے جبر و تشدد اور ایذا رسانی سے ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی اور نئے دین پر ایمان متزلزل نہیں ہوتا! نہ عمر نہ قریش کا کوئی دوسرا سردار کسی بھی مسلمان کو دھونس، تشدد یا لالچ سے اسلام سے برگشتہ کر سکا۔ یہ نشہ کسی ترشی سے اترنے والا نہ تھا۔ اور پھر یکے بعد دیگرے ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے عمر کے موروثی عقائد کی بنیادیں ہلا دیں اور ان کے لئے شرح صدر کا کام کیا۔

۱- ایک دن عمر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے کے ارادے سے نکلے۔ دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں مصروف نماز ہیں اور سورۂ الحاقہ کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ عمر پیچھے کھڑے ہو کر سننے لگے۔ قرآن کے زور بیان، فصاحت و بلاغت پر انہیں بہت تعجب ہوا۔ خیال آیا کہ یہ شخص واقعی شاعر ہے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں۔ لیکن فوراً ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا (ترجمہ) ''یہ ایک رسول کریم کا قول ہے۔ کسی شاعر کا قول نہیں تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔'' (آیات ۴۰-۴۱) عمر نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ شخص شاعر نہیں تو پھر کاہن ہے۔ اسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے (ترجمہ) ''اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے'' (آیات ۴۲-۴۳) یہ سن کر عمر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کے انداز فکر میں تبدیلی آنے لگی۔

۲- پھر قریش کے ظلم و تشدد کے نتیجہ میں ۵ نبوی میں ہجرت حبشہ کا واقعہ پیش آیا۔ ہجرت کرنے والوں میں عمر رضی اللہ عنہ کی قریبی رشتہ دار حضرت لیلیٰ بنت حثمہ رضی اللہ عنہا اور ان کا شوہر حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ ہجرت کے ارادہ سے اپنا سامان باندھ رہی تھیں اور ان کے شوہر کچھ ضروری چیزیں خریدنے بازار گئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے پھرتے پھراتے عمر رضی اللہ عنہ آ گئے۔ وہ اپنے کفر و شرک پر قائم تھے اور مسلمانوں کو ایذا رسانی میں پیش پیش۔

خود حضرت لیلیٰ بنت حثمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ قرابتداری کے باوجود عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اذیتیں اٹھا چکے تھے۔ مگر اس دن عمر ان کے گھر میں داخل ہو کر خاموشی سے حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا کو سامان باندھتے دیکھتے رہے۔ آخر کہا: ''عبداللہ کی ماں! کیا جا رہی ہو؟'' انہوں نے جواب دیا کہ ہاں، خدا کی قسم! تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا اور ہم پر ظلم کیا۔ خدا کی زمین وسیع ہے کہیں نکل جائیں گے۔ جہاں وہ ہمارے لئے اس مصیبت سے بچنے کی کوئی راہ نکال دے۔'' خلاف توقع عمر رضی اللہ عنہ کے چہرے پر رقت سی طاری ہوگئی اور انہوں نے غمگین لہجے میں کہا کہ ''اللہ تمہارے ساتھ ہو۔'' پھر وہ سست قدموں سے چلے گئے۔ حضرت عامر رضی اللہ عنہ جب گھر لوٹے تو حضرت لیلیٰ نے کہا ''عبداللہ کے ابا!! ابھی ابھی عمر یہاں سے ہو کر گیا ہے۔ کاش تم یہاں ہوتے اور ہمارے حال پر اس کا رنج و رقت دیکھتے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے گا۔'' عامر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عمر اور ایمان؟

خطاب کا گدھا ایمان لے آئے تو لے آئے مگر خطاب کے بیٹے سے یہ امید نہیں۔'' بہر حال مسلمانوں کو اپنے جدی پشتی گھربار چھوڑ کر حبشہ جاتے دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ کے دل پر چوٹ لگی اور وہ سوچنے لگے کہ آخر اس نئے دین میں کیا بات ہے جو اس کے پیروؤں کو ظلم وتشدد برداشت کرنے اور اپنا گھربار تک چھوڑ کر غیر ملک میں جلاوطنی کی زندگی بخوشی اختیار کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے؟ پھر انہیں غصہ بھی آتا کہ یہ نیا دین مکی معاشرے کو تہ و بالا کئے دیتا ہے۔ وہ ایک ذہنی کشمکش میں گرفتار ہو گئے۔

۳- آخر اپنی جوشیلی طبیعت اور جاہلی عصبیت کے تحت یہ فیصلہ کر لیا کہ اس نئے دین کے بانی محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ کر کے قریش اور دوسرے قبائل عرب کو نئی گمراہی اور بے دینی، سے بچایا جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ چنانچہ شمشیر برہنہ ہاتھ میں لے کر نکلے۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ راستے میں حضرت نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہو گئی۔ جو قبیلہ بنو عدی ہی کے سرکردہ اور باثر افراد میں سے تھے اور در پردہ مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ کے تیور دیکھ کر پوچھا ''عمر کدھر کا ارادہ ہے؟''

''محمد کا کام تمام کرنے جا رہا ہوں۔ وہ ہمارے دین اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ اس نے قریش میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور ہم سب کو بے وقوف سمجھتا ہے۔''

''عمر! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ محمد کے قتل کے بعد بنی ہاشم تمہیں جیتا رہنے دیں گے تو تم سخت غلطی پر ہو۔ پہلے اپنے گھر کی خبر لو کہ تمہاری بہن فاطمہ اور اس کا شوہر سعید بن زید جو تمہارا عمزاد بھی ہے دونوں محمد کا دین قبول کر چکے ہیں۔''

یہ سن کر عمر کے غیظ وغضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین خود ان کے اپنے خاندان میں بھی نقب لگا چکا تھا۔ وہ یہ سوچ کر کہ پہلے بہن اور بہنوئی کو ٹھیک کرلوں۔ پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ٹنٹا چکاؤں گا، سیدھے بہن کے ہاں پہنچے۔ اندر سے کسی قرأت کی آواز آ رہی تھی، غصے سے دروازہ دھڑ ادھڑ پیٹا اور آواز دی۔ عمر کی آواز پہچان کر اہل خانہ پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ مشہور صحابی حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو سورہ طٰہٰ پڑھا رہے تھے۔ حضرت عمر کی آمد پر وہ چھپ گئے اور فاطمہ نے صحیفہ قرآنی کو چھپا دیا پھر دروازہ کھولا۔ عمر قرأت کی آواز سن چکے تھے۔ انہوں نے اندر جاتے ہی بہن اور بہنوئی سے پوچھا کہ ''تم لوگ کیا پڑھ رہے تھے؟'' انہوں نے کچھ بھی نہیں، کہہ کر ٹالنا چاہا۔ اس پر عمر دھاڑے کہ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ تم دونوں نے اپنے آبائی دین سے منہ موڑ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین اختیار کر لیا ہے۔ یہ بات ناقابل برداشت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ پر پل پڑے اور انہیں بری طرح زدوکوب کیا۔ انہیں زمین پر گرا کر ان کے سینے پر چڑھ بیٹھے۔ شوہر کو پٹتے دیکھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آگے بڑھ کر انہیں بچانا چاہا تو عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھی مارا۔ وہ زخمی ہو گئیں، سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ اس پر ایک زخمی شیرنی کی طرح انہوں نے چیلنج کی پوزیشن اختیار کر لی اور جوش و جذبہ سے کہا کہ ''ہاں، ہم نے اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کر لیا ہے۔ اب ہم اسے ہرگز ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ تم جو جی چاہے کرو۔'' بہن کا خون بہتے دیکھ کر اور ان کا دلیرانہ جواب سن کر عمر کو

ندامت بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئے اور طبیعت میں نرمی آ گئی۔ بہن سے کہا کہ ''مجھے وہ چیز دکھاؤ جو تم لوگ پڑھ رہے تھے تاکہ معلوم ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ماننے والوں کو کیا تعلیم دیتے ہیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسے نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔'' بہن نے کہا کہ پہلے تم غسل کر کے پاک ہو جاؤ تو پھر اس صحیفے کو چھو سکتے اور پڑھ سکتے ہو۔ عمر نے ایک فرمانبردار بچے کی طرح اٹھ کر غسل کیا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اجزائے قرآنی پڑھنے کو دیئے جو سورہ طٰہٰ اور بعض دوسری سورتوں کی آیات پر مشتمل تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ پڑھے لکھے آدمی تھے اور شعراء کا کلام انہیں بہت یاد تھا۔ لیکن خدا کا کلام اپنی فصاحت و بلاغت، لفظی و معنوی خوبیوں اور اثر خیزی میں اس سے بدرجہا بڑھ کر تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے صحیفہ ہاتھ میں لے کر کھولا تو سورۃ حدید[1] کی یہ آیت سامنے آئی۔

بے اختیار پکار اٹھے: واہ وا! کیسا عمدہ، پاکیزہ اور بلند پایہ کلام ہے! عمر کی زبان سے یہ استعجابی جملہ سن کر حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ اپنی چھپنے کی جگہ سے نکل کر عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے آگئے اور کہا ''اے عمر! مجھے امید ہے کہ اللہ نے تمہارے بارے میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول کر لی کیونکہ میں نے کل ہی انہیں یہ فرماتے سنا کہ ''اے اللہ! عمرو بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطاب کے ذریعے اپنے دین کی مدد فرما۔'' اب عمر رضی اللہ عنہ کا دل پورے طور پر مائل بہ ایمان ہو گیا۔ لوہا گرم ہو چکا تھا، چوٹ لگانے کی ضرورت تھی۔ زمین تیار ہو چکی تھی، اب تخم ریزی کی دیر تھی۔ درِ توحید و رسالت پر پہنچنے کا آخری مرحلہ آ گیا تھا۔ انہوں نے خباب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پتہ بتاؤ یا ان کے پاس لے چلو تاکہ میں بھی ان کا دین قبول کر لوں۔'' خباب رضی اللہ عنہ نے کوہ صفا کے دامن میں واقعہ دارارقم رضی اللہ عنہ کا پتہ بتا دیا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کا مرکز بنا رکھا تھا، عمر رضی اللہ عنہ سیدھے دارارقم پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا صحابہ میں سے کسی نے دروازہ کی جھری سے جھانک کر دیکھا کہ عمر رضی اللہ عنہ شمشیر بدست کھڑے ہیں، پلٹ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ ''آنے دو۔ اللہ کو عمر کے ساتھ خیر منظور ہوگی تو وہ اسلام لائیں گے اور اگر کسی دوسرے ارادے سے آئے ہیں تو انہی کی تلوار سے ان کا سر قلم کر دیا جائے گا۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے دروازہ کھول دیا گیا۔ عمر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بڑھے، ان کے دامن کو زور سے کھینچا اور فرمایا کہ ''عمر! کس نیت سے آئے ہو؟ کیا تم باز نہ آؤ گے جب تک اللہ تم پر کوئی سخت آفت نہ نازل کر دے؟''

عمر رضی اللہ عنہ نے بڑی عاجزی سے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ایمان لانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول برحق ہیں۔'' یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بے اختیار اللہ اکبر نکلا اور موجود صحابہ جان گئے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ سب نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا کہ مکہ کی پہاڑیاں گونج اٹھیں وہ شخص جسے دنیا کی تاریخ میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بن کر ابھرنا تھا، اسلام کی دہلیز پر اپنا سر خم کر چکا تھا۔ یہ اہم واقعہ ۶ نبوی میں رونما ہوا۔

---

[1] بعض روایات میں سورہ طٰہٰ اور بعض میں سورہ حدید کا ذکر آیا ہے۔ مؤلف

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (۵۷:۱)

عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے ہی سے اسلام مکہ میں ظاہر ہوا ورنہ اس سے پہلے تبلیغ و عبادت خفیہ طور پر کی جاتی تھی۔

قبولِ اسلام کے وقت عمر

محمد ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ذی الحجہ سنہ ٦ نبوی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر چھبیس سال تھی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھی اس کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ ان سے پہلے بہ اختلافِ روایات چالیس یا چالیس سے کچھ اوپر مرد، عورتیں یا چالیس مرد اور دس عورتیں یا پینتالیس مرد اور گیارہ عورتیں اسلام قبول کر چکی تھیں۔ لیکن چونکہ اب تک دعوت و تبلیغ کا کام خفیہ ہوتا رہا تھا اور بہت سوں نے ابھی اپنا اسلام پوشیدہ رکھا تھا۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ کل تعداد زیادہ ہوگی۔ سنہ ٦ نبوی میں دوسرے ہجرت حبشہ واقع ہو چکی تھی جس میں ایک سو تین مسلمان مرد اور عورتیں شامل تھے۔[1] یمن سے جو پچاس سے زائد مسلمان حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قیادت میں حبشہ گئے وہ مزید برآں تھے۔ مسلمانوں کی یہی روز افزوں تعداد تھی اور مکی معاشرے پر اس کے اثرات جس سے جھنجھلا کر عمر رضی اللہ عنہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے درپے ہوئے تھے۔ اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را!!!

لیکن مولانا شبلی نے ''الفاروق'' میں لکھا ہے کہ قبولِ اسلام کے وقت (سنہ ٦ نبوی۔ ٦١٥ء) حضرت عمر تینتیس سال کے تھے اور ہجرت مدینہ کے وقت تقریباً چالیس سال کے۔ محمد حسین ہیکل نے ''حیاتِ محمد'' میں قبولِ اسلام کے وقت حضرت عمر کی عمر پینتیس سال لکھی ہے۔ شاہ معین احمد ندوی تاریخ اسلام (جلد اول) میں اسی کی تائید کرتے ہیں۔ غلام احمد پرویز نے شاہکارِ رسالت، میں بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دس سال چھوٹے تھے جو صحیح نہیں کیونکہ اس حساب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عمر قبول اسلام کے وقت چھتیس سال ہوتی ہے اور وفات کے وقت چھیاسٹھ سال جو کسی روایت میں نہیں ملتی۔ راقم کے نزدیک مولانا شبلی کا بیان قابل ترجیح ہے۔

قبولِ اسلام کے بعد

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبولِ اسلام کے بعد اپنی پرجوش طبیعت اور دبنگ شخصیت کے تقاضا کے ماتحت اسلام کا کھلم کھلا اظہار کرنا اور کفار کی مخالفت اور موجودگی میں مسجد حرام میں نماز پڑھنا چاہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بے شک ہم حق پر ہیں۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! جب ہم حق پر ہیں تو اپنا دین کیوں چھپائیں؟'' جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اے عمر! اس وقت ہماری تعداد کم ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہم کن حالات سے گزر رہے ہیں؟'' عمر رضی اللہ عنہ نے پھر عرض کیا کہ ''اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے، میں کوئی ایسی مجلس نہ

[1] سیرت سرورِ عالم جلد دوم باب ٩ صفحات ٥٨١ تا ٥٨٦ از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

چھوڑوں گا جہاں میں پہلے کفر کے ساتھ بیٹھا تھا اور اب اسلام کے ساتھ نہ بیٹھوں۔''

پھر ایسا ہوا کہ چالیس صحابہ کا قافلہ عمر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بیت اللہ شریف میں پہنچا اور وہاں سب نے علانیہ نماز ادا کی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے قریش کے مجمع میں اعلان کیا کہ ''میں مسلمان ہو گیا ہوں اور اپنے ہادی و رہنما اور دینی بھائیوں کے ساتھ یہاں نماز پڑھنے آیا ہوں اور آئندہ بھی ہم یہاں نماز پڑھیں گے۔ جسے اپنے بچوں کو یتیم اور بیوی کو بیوہ کرنا پسند ہو وہ مقابلے پر آجائے۔'' قریش کو اس سے شدید دھچکا لگا۔ کچھ چپقلش ہوئی مگر وہ مسلمانوں کو بیت اللہ شریف میں نماز پڑھنے سے نہ روک سکے۔

ظہور اسلام کے چھ سال بعد مسلمانوں نے پہلی بار حرم شریف میں آزادانہ نماز ادا کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''ہم بیت اللہ کے گرد نماز نہ پڑھ سکتے تھے جب تک کہ عمر رضی اللہ عنہ اسلام نہ لے آئے۔'' انہی سے ایک اور روایت بخاری میں ہے کہ ''عمر کے مسلمان ہونے کے بعد ہم برابر زور آور ہی ہوتے گئے۔''

خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ابن ہشام نے اپنی سیرت میں یہ روایت درج کی ہے کہ جس روز انہوں نے اسلام قبول کیا، اسی رات انہیں خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن ابوجہل کو اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع دینی چاہئے۔ چنانچہ جا کر ابوجہل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے انہیں خوش آمدید کہا اور پوچھا کہ ''بھانجے! کیسے آئے؟'' عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ''ماموں! میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کر لیا ہے۔'' ابوجہل یہ سن کر سخت مایوس اور برانگیختہ ہوا اور یہ کہہ کر دروازہ بند کر لیا کہ ''برا ہو تیرا اور اس چیز کا جو تو لے کر آیا ہے۔''

عمر کے اسلام سے بڑھ کر مشرکین مکہ کو کسی دوسرے کے اسلام سے تکلیف نہیں پہنچی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے سے اسلام اور مکہ کے مٹھی بھر مسلمانوں کو تقویت پہنچی۔ انہوں نے لڑ بھڑ کر بیت الحرام میں نماز پڑھنے کا حق منوا لیا حالانکہ پہلے مسلمان پہاڑیوں میں چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے تھے۔ کفار کی صفوں میں ایک زلزلہ سا پیدا ہو گیا۔ عمر رضی اللہ عنہ کچھ تو طبعاً انتہا پسند واقع ہوئے تھے، کچھ جوانی کا جوش اور کچھ قبول اسلام کا نیا نیا جذبہ ان میں کارفرما تھا۔ اس لئے وہ پہلے جس شد و مد سے اسلام اور مسلمانوں کے مخالف تھے، اب اسی شد و مد سے اسلام اور مسلمانوں کے حامی و مددگار اور کفار کے مخالف ہو گئے، اب مخالفین اسلام سے ان کی جھڑپیں ہونے لگیں۔ انہوں نے ہمیشہ بڑی جرأت، خود اعتمادی اور غیرت اسلامی کا مظاہرہ کیا۔ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جب عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو اسلام کھل کر سامنے آ گیا اور اس کی دعوت علانیہ دی جانے لگی۔ ہم کعبہ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھتے اور بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لیتے اور دریدہ دہنی سے پیش آنے والے کو منہ توڑ جواب دیتے تھے۔'' اس کا ایک مثبت اثر قریش کے عام آدمیوں پر بھی پڑا اور اسلام کی دعوت تیزی سے پھیلنے لگی۔ وہ کمزور اور ڈھلمل یقین لوگ جو قریش کے ظلم و ستم کے خوف سے اسلام قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے، اب علانیہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

اپنے عزم و استقلال، دینی حمیت، انتظامی قابلیت اور اصابت رائے کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ روز بروز جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر اور نگاہ نبوت میں معتبر ہوتے چلے گئے۔ یہ اسی قربت اور اسی اعتبار کا عظیم

الشان اثر تھا جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام کو خدمت نبوی، عہد صدیقی اور اسلام کی زندگی میں قوت و انصاف اور رحمت و احسان کا مجموعی نشان اور ان کے اپنے دور خلافت کو اسلامی سلطنت بلکہ انسانی تہذیب کی تاریخ کا سب سے بڑا اور زرّیں تریں دور بنا دیا۔

فاروق

کفار قریش کے مقابلے میں عزیمت و پامردی اور اسلام کی حمایت و غیرت کے مظاہرے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ کو فاروق کا لقب عطا کیا کیونکہ انہوں نے مکہ میں حق اور باطل کو ایک دوسرے سے الگ اور نمایاں کر دیا۔

ہجرت اور مدنی زندگی

سنہ ۱۳ نبوی میں جب مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مل گئی تو وہ ایک ایک دو دو کر کے خاموشی سے مدینہ جانے لگے تاکہ قریش کو پتہ نہ چلے اور وہ مزاحم نہ ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ خاموشی سے عازم مدینہ ہو گئے لیکن خاموشی سے چوری چھپے جانا حضرت عمر کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ انہوں نے بیس آدمیوں کے ہمراہ علی الاعلان ہجرت کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ "میں نہیں جانتا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سوا کسی مسلمان نے علانیہ مکہ سے ہجرت کی ہو۔ چنانچہ جب وہ ہجرت کرنے لگے تو تلوار گلے میں ڈالی، کمان کندھے پر رکھی، تیر مٹھی میں لئے، ایک چھوٹا سا ڈنڈا جس کے نیچے تیر کا سا پھل لگا تھا، کمر سے باندھا اور کعبہ کی طرف چل پڑے۔ کعبہ اس وقت قریش سے بھرا ہوا تھا۔ پہلے عمر رضی اللہ عنہ نے نہایت سکون و اطمینان سے کعبے کے سات طواف کئے پھر نماز پڑھی۔ اس کے بعد قریش کی ایک ایک ٹولی کے پاس یہ کہتے ہوئے گئے: "کالا منہ ہو تمہارا! اللہ تمہیں جیسوں کو مغلوب و ذلیل کرتا ہے۔ جو کوئی اپنی ماں کو ماتم کناں، اپنے بیٹے کو یتیم اور بیوی کو بیوہ بنانا چاہے، وہ اس وادی کے پیچھے مجھ سے دو دو ہاتھ کر لے۔ میں مدینہ جا رہا ہوں۔ جس میں ہمت ہو مجھے روک لے۔" کفار آپ سے الجھے نہیں۔

مؤاخاۃ

ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں مسلمانوں میں مؤاخاۃ قائم کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا تھا۔ مدینہ پہنچ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبا (مدینہ سے دو تین میل باہر) میں حضرت رفاعہ بن عبدالمنذر انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام کیا۔ بعد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار میں باہمی مواخاۃ قائم کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنو سالم کے سردار حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ[1] کا بھائی بنایا۔ بعض روایات میں حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن عفرا رضی اللہ عنہ کے

---

[1] بڑے بلند مرتبہ صحابی تھے۔ بدر، احد اور خندق کے غزوات میں شریک ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس ہی میں نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں وفات پائی۔ مؤلف

نام بھی آتے ہیں۔لیکن پہلی روایت صحیح ہے۔

مدنی زندگی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول بالکل درست ہے کہ ''عمر رضی اللہ عنہ کا مدینہ جانا اسلام کے لئے زبردست اعانت ثابت ہوا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ عرصہ قباہی میں قیام کیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ میں ایک قطعہ زمین عطا فرمایا تو اس پر مکان تعمیر کر کے وہاں منتقل ہو گئے۔اور روز وشب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے اور مشوروں میں شامل ہونے لگے۔اپنا تجارتی کاروبار بھی مقامی طور پر شروع کر دیا۔

مدینہ میں جب مسلمانوں کی جمعیت قائم ہوگئی تو پنجوقتہ نماز با جماعت، نماز جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا قیام عمل میں آیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ نمازیوں کو بلانے کے لئے اذان کا طریقہ انہی کی رائے کے مطابق اختیار کیا گیا۔[1] چنانچہ گزشتہ چودہ سو سال سے دنیا بھر کی لاکھوں مسجدوں کے مینار سے دن میں پانچ مرتبہ اذان کی صدا بلند ہوتی چلی آرہی ہے اور انشاء اللہ قیامت تک بلند ہوتی رہے گی۔اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اذان کے علاوہ بعض اور اہم مواقع بھی آئے کہ جو کچھ عمر رضی اللہ عنہ نے سوچا وحی خداوندی نے اس کی تائید و تصدیق کر دی۔ مثلاً قریش کے اسیرانِ بدر کا معاملہ، پردے کا حکم، شراب کی ممانعت وغیرہ۔اور غالباً ایسے ہی مواقع اور معاملات تھے جن کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ ہوتا'' اور یہ کہ عمر ناطق بالصواب ہے۔حق اس کی زبان پر جاری ہے۔

مدینہ میں جب اسلامی معاشرہ قائم ہوگیا، یہودیوں کے ساتھ معاہدہ اور قریش سے حالت جنگ قائم ہوگئی تو ان حالات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صلاحیتیں نمایاں ہونے لگیں اور وہ اپنی اصابت رائے، نظم و تدبر، سیاسی سوجھ بوجھ، اسلامی غیرت واخلاص، جرأت و بیباکی اور عزم محکم کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشوروں میں قریب سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ان کی اصابت رائے سے متاثر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میں ان کے خلاف نہ کروں گا۔وہ دینی کاموں میں میرے لئے کان اور آنکھ کی طرح

---

[1] ایک انصاری صحابی حضرت عبداللہ بن زید کا ذکر بھی اس سلسلے میں آتا ہے۔دونوں حضرات نے بیک وقت خواب میں اذان کے الفاظ سنے تھے۔گویا اذان کے الہامی الفاظ پر دو بزرگ صحابیوں کی شہادت ثبت ہوئی۔مؤلف

ہیں۔ نیز ایک دفعہ یہ بھی فرمایا کہ "میرے دو آسمانی وزیر ہیں جبرئیل اور میکائیل اور دو زمینی وزیر ہیں ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ"

ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ کی عورتوں سے بیعت لینے پر مقرر کیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد وہاں کی عورتوں سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عمر رضی اللہ عنہ نے بیعت لی۔

غزواتِ نبوی میں شرکت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام غزوات نبوی میں سرگرم شرکت کی اور اکثر نمایاں کردار ادا کیا۔ یہاں صرف بعض اہم واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن کا عمر رضی اللہ عنہ سے خصوصی تعلق ہے۔

غزوۂ بدر (۱۷ رمضان ۲ ہجری......۱۶ مارچ ۶۲۴ء)

حق و باطل کے اس اولین معرکہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کافر ماموں عاصی بن ہشام بن مغیرہ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا جو قریش کا ایک معزز سردار تھا۔ انہوں نے قرآنی الفاظ اشداء علی الکفار کو حرف بحرف سچ کر دکھایا۔ اسلام کے مقابلے میں رشتہ داری کو پس پشت ڈال دیا۔ اس معرکے میں قبیلہ بنی عدی اور اس کے حلفاء کے بارہ آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ لشکر اسلامی میں شامل ہو کر کفار کے خلاف جنگ آزما ہوئے۔ بنی عدی کا ایک بھی آدمی قریش کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑا۔ اس معرکے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام مہجع رضی اللہ عنہ سب سے پہلے شہادت سے سرفراز ہوئے۔ قریش کے ستر جنگ جو جن میں بڑے بڑے معزز سردار بھی شامل تھے۔ گرفتار ہو کر مدینہ آئے۔ سوال پیدا ہوا کہ ان سے کیا سلوک کیا جائے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "یارسول اللہ! یہ اللہ کے دشمن ہیں۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جھٹلایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے نکالا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑے۔ یہ گمراہی کے سردار اور کفر کے امام ہیں۔ ان کے قتل سے اسلام کو سربلندی حاصل ہوگی اور اہل شرک ذلیل ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے رشتہ دار کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔" لیکن جب رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! یہ جنگی قیدی ہمارے اعزہ واقارب میں سے ہیں۔ ان پر رحم کیا جائے اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے اکثر یا ان کی اولادیں مسلمان ہو جائیں اور اسلام کے لئے تقویت کا باعث بنیں۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مشورہ پسند کیا۔ اس موقع پر قرآن کی جو آیت نازل ہوئی اس سے متبادر ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ بہتر تھا۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ (۸:۶۷)

(ترجمہ: کسی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ خوب خونریزی نہ کرلے)

قیاس کہتا ہے کہ اگر قریش کے یہ ستر قیدی قتل کر دیئے جاتے تو شاید غزوۂ احد کی اگلے سال نوبت نہ آتی۔

غزوۂ احد (۷ شوال ۳ھ......۲۱ مارچ ۶۲۵ء)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حال میں غزوۂ احد اور دوسرے غزوات نبوی کے ضروری حالات و واقعات مختصراً لکھے جا چکے ہیں۔ یہاں صرف عمر رضی اللہ عنہ کے کردار کے سلسلے میں اس قدر لکھنا کافی ہے کہ جب درے پر تعینات مسلمان تیر اندازوں نے غلطی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور غنیمت لوٹنے والوں میں شامل ہو گئے تو درہ کو خالی پا کر قریش کے گھوڑ سوار دستہ نے مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دیا اور ابتدائی فتح تقریباً ہزیمت میں تبدیل ہو گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر گڑھے میں گر گئے اور دشمنوں نے مشہور کر دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس افواہ سے مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ان میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بھی اس افواہ کا سخت ردعمل ہوا اور وہ ہتھیار پھینک کر بیٹھ گئے کہ اب لڑنا بیکار ہے اور رونے لگے۔ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو گہری قلبی وابستگی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی افواہ نے مایوسی دسراسیمگی کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ جیسے حواس اور قوائے عمل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔[1]

بہرحال میدان جنگ سے ہٹے نہیں اور جب یہ پتہ چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ و سلامت ہیں تو فوراً خدمت اقدس میں پہنچ کر مصروف عمل و پیکار ہو گئے۔ ابن ہشام اور طبری کے بیانات کے مطابق جب مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت حارث بن صمہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اور پھر ہوتے ہوتے تیس جاں نثار صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے۔ خالد بن ولید جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے اور قریش کے گھوڑ سوار دستہ کے سالار تھے، وہ حملہ کی نیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چند مہاجرین و انصار کو ساتھ لے کر حملہ کیا اور انہیں...... وہاں سے پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ ابوسفیان سالار قریش نے قریب پہنچ کر پکارا ''کیا تم لوگوں میں محمد ہیں؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دینے سے منع کر دیا۔ پھر اس نے پوچھا ''کیا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ یہاں ہیں؟'' جواب نہ ملنے پر خود ہی کہنے لگا کہ ضرور یہ سب مارے گئے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضبط نہ کر سکے اور کہا کہ ''اے دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں۔'' ابوسفیان نے کہا اعل ہبل (ہبل بت کی جے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم جواب دو کہ اللہ اعلیٰ و اجل (اللہ ہی بزرگ و برتر ہے)

ابوسفیان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھنے کے ساتھ عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی پوچھا اس سے ظاہر ہے کہ قریش مکہ کی نظر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمانوں میں تیسرے اہم آدمی عمر رضی اللہ عنہ تھے۔

بلاذری کی یہ روایت غلط ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ احد کے دن میدانِ جنگ سے بھاگ گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے پہلوان، شہسوار، دلیر، باحوصلہ اور غیرت مند مسلمان سے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے تلوار

---

[1] آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ ۱۱ھ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو بھی عمر رضی اللہ عنہ کی طبیعت پر اسی قسم کا ردعمل ہوا۔ مؤلف

پھینک کر بیٹھ جانے سے بلاذری کو غلط فہمی ہوئی۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا زمرۂ امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں

اسی سال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں اور انہیں ام المومنین ہونے اور عمر رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خسر ہونے کا شرف حاصل ہوا صحابہ میں سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد عمر رضی اللہ عنہ حضور کے دوسرے خسر ہوئے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ جنگ احد میں زخم لگنے کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے۔ عہد صدیقی میں جب مصحف قرآنی کی جمع وتدوین ہوئی تو مرتبہ نسخہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہی کی تحویل میں رکھا گیا۔

غزوۂ خندق (شوال ۵ھ......۶۲۷ء)

اس جنگ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے گرد دفاعی خندق کھدوائی اور خندق کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اکابر صحابہ کو متعین کر دیا تاکہ دشمن کو ادھر سے روکیں۔ جس حصہ پر حضرت عمر تعینات تھے۔ وہاں آج بھی ایک مسجد موجود ہے جسے مسجد عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ مدینہ جانے والے حجاج مسجد عمر رضی اللہ عنہ کی بھی زیارت کرتے ہیں۔

غزوۂ خندق میں مسلمانوں کا پڑاؤ جبل سلع پر تھا۔ وہاں ایک کتبہ پایا جاتا ہے جو بظاہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا ہے۔

بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ (۶ھ......۶۲۸ء)

اس کا قدرے مفصل ذکر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں کیا جا چکا ہے۔ ۶ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو صحابہ کے ہمراہ عمرہ کی نیت سے عازم مکہ ہوئے۔ چونکہ نیت پر امن عمرہ کی تھی، اس لئے ابتداءً کوئی ہتھیار ساتھ نہیں لئے۔ لیکن مدینہ سے چھ میل باہر ذوالحلیفہ پہنچ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوی میں عرض کیا کہ احتیاطاً ہتھیار ساتھ لے لینے چاہئیں کیونکہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانوں کو نہتے دیکھ کر قریش کا ردعمل کیا ہو۔ ہمیں کسی بھی ناگہانی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کیا اور مدینہ سے تلواریں منگوالیں۔ مکہ کچھ دور رہ گیا تو اطلاع ملی کہ قریش نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت جنگ وجدال کی نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بطور سفیر قریش کے پاس بھیجنا چاہا۔ وہ اسلام سے پہلے قریش کے سفارتی امور سرانجام دیا کرتے تھے۔ اب انہوں نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! مکہ میں میرے خاندان کا کوئی فرد موجود نہیں۔ اور قریش میری جان کے دشمن ہیں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بھیجیں تو زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ ان کے عزیز واقارب وہاں موجود ہیں، انہیں وہاں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تفصیل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں دی جا چکی ہے۔ حضرت عثمان کے قتل کر دیئے جانے کی افواہ مشہور ہوئی تو ان کا بدلہ لینے کے لئے بیعت رضوان منعقد ہوئی جس میں حضرت

عمر رضی اللہ عنہ اوران کے صاحب زادے شریک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بیعت رضوان میں شامل تمام صحابہ کو اپنی خوشنودی کا سرٹیفکیٹ دیا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

(ترجمہ: اللہ تعالیٰ مومنین سے راضی ہوا جب وہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔)

آخر قریش کے سفیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ردوکد کے بعد معاہدۂ صلح طے پا گیا۔

صلح نامہ کی شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بہت سے دوسرے مسلمانوں کو ناگوار گزریں۔ کسی دوسرے کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی لیکن عمر رضی اللہ عنہ اپنی اسلامی غیرت وحمیت کو دبا نہ سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال و جواب کیے کہ جب ہم حق پر ہیں تو قریش سے دب کر صلح کیوں کریں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور اس کے حکم کے خلاف نہیں کرتا اور وہ مجھے کبھی ناکام نہیں ہونے دے گا۔'' تو سر تسلیم و رضا خم کر دیا۔ دوسرے سرکردہ صحابہؓ کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی معاہدۂ صلح پر دستخط کیے۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال وجواب کرنے کا انہیں ہمیشہ افسوس رہا۔

واپسی کے سفر کے دوران میں سورۂ فتح نازل ہوئی (جس کی ایک آیت کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے) جس میں اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو ''فتح مبین'' قرار دیا (اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا بے شک ہم نے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو واضح فتح عطا کی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بطور خاص سنایا۔ سورہ کی آخری آیات جو محمد رسول اللہ والذین معه سے شروع ہو کر اجرا عظیما پر ختم ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جان نثاران محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی اور اخروی فلاح کا سرٹیفکیٹ نیز ان کی حب دین اور جذبۂ اخلاص کا خداوند کی طرف سے اعتراف اور اس پر تحسین تھیں۔ اس سے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ آئندہ واقعات نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین ثابت کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی غلط جسارت پر سخت ندامت ہوئی۔ انہوں نے نفل نمازیں پڑھ پڑھ کر عجز والحاح سے دعائیں مانگیں، اللہ سے بخشش چاہی، روزے رکھے اور غلام آزاد کئے۔ آخری وقت تک انہیں پچھتاوا رہا ایک مخلص مومن کا یہی کردار وشعار ہونا چاہیے۔

سچ تو یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ کی ایک تلوار تھے، جسے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جب چاہتے تھے بے نیام فرماتے تھے اور جب چاہتے تھے نیام میں رکھ لیتے تھے۔ مدینہ میں عمر رضی اللہ عنہ نے قولاً وفعلاً اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا انتہائی خیر خواہ ثابت کر دیا۔

غزوۂ خیبر (۷ھ......۶۲۹ء)

خیبر مدینہ سے شام کو جاتے ہوئے تقریباً سات منزل دور ہے۔ یہودی قبائل بنو قینقاع اور بنو نضیر مدینہ سے

نکل کر خیبر میں آباد ہو گئے تھے۔ وہاں ان کے متعدد مضبوط قلعے تھے اور انہوں نے اپنی سازشیں شروع کر دی تھیں۔ وہ قریش اور دوسرے عرب قبائل بنو اسد، بنو عظفان وغیرہ کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے اور حملہ پر اکساتے تھے اور اپنی طرف سے مالی اور فوجی مدد پیش کرتے تھے۔ مجبور ہو کر حضور اکرم ﷺ نے ۱۶۰۰ اصحابہ کے ساتھ خیبر کی طرف پیش قدمی کی جہاں بیس ہزار مسلح اور جنگ جو یہودی موجود تھے۔ اکثر قلعے فتح ہو گئے۔ یہودی سردار مرحب کا قلعہ قاموص فتح ہونے میں نہ آتا تھا۔ ایک دن آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سردار لشکر بنا کر بھیجا مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ پھر متواتر دو دن مسلمان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں حملہ کرتے رہے لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر قلعہ فتح ہوا اور مرحب مارا گیا۔

اسلام میں پہلا وقف

خیبر کی مفتوحہ اراضی میں سے ایک قطعہ زمین جسے ثمغ کہتے تھے، حضور ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا۔ انہوں نے اسے راہِ خدا میں وقف کر دیا۔ اسلام میں یہ سب سے پہلا وقف تھا۔ اس کی آمدنی فقرائے ذوی القربیٰ، غلاموں، مسافروں، مہمانوں پر خرچ کے لئے مخصوص کر دی گئی۔

فتح مکہ (۱۰ رمضان ۸ھ یکم جنوری ۶۳۰ء)

اگرچہ معاہدۂ حدیبیہ دس سال کے لئے ہوا تھا لیکن دو ہی سال کے بعد قریش اور ان کے حلیف بنو بکر نے اس کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ کے مقتولوں کا خون بہا دینے سے انکار کر دیا۔ معاہدہ فسخ ہو گیا۔ حضور ﷺ دس ہزار قدوسیوں کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوئے اور مکہ سے کچھ دور باہر مر الظہران میں خیمہ زن ہوئے۔ خیمہ گاہ سے الاؤ کی روشنی دیکھ کر ابوسفیان بن حرب تحقیق حال کے لئے مکہ سے نکلا، راستہ میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی جو رسول اللہ ﷺ سے مل کر آپ ﷺ ہی کے سفید خچر پر سوار ہو کر مکہ کی طرف واپس آرہے تھے تاکہ قریش کو صورت حال کی نزاکت سے مطلع کر کے انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ انہوں نے ابوسفیان سے کہا کہ میرے ساتھ چلے آؤ تاکہ میں تمہیں رسول اللہ ﷺ سے امان دلوا دوں۔ ابوسفیان خچر پر ان کے پیچھے بیٹھ گیا اور انہوں نے خچر کو مکہ کی بجائے خیمہ گاہ کی طرف موڑ دیا، ابھی حضور ﷺ کے خیمہ سے کچھ دور تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھ لیا اور کہا کہ کفر کا سردار اب خود ہی ہمارے قبضے میں آگیا، جانے نہ پائے، تلوار لے کر اس پر جھپٹے لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ جلدی سے ابوسفیان کو لے کر حضور ﷺ کے خیمہ میں داخل ہو گئے اور جناب رحمت للعالمین ﷺ سے آپ ﷺ کے اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن کے لئے پناہ حاصل کر لی۔ عمر رضی اللہ عنہ بھی پیچھے پیچھے بارگاہ رسالت میں پہنچے اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مدتوں کے بعد اس دشمن اسلام پر قابو ملا ہے، اجازت دیجئے کہ اس کی گردن مار دوں۔" حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "اے عمر! اگر ابوسفیان عبد مناف کے خاندان سے نہ ہوتا اور تمہارے قبیلے کا آدمی ہوتا تو تم اس طرح اس کی جان کے خواہاں نہ ہوتے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "خدا کی قسم! میرا باپ خطاب اگر اسلام لاتا تو مجھے

اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی اس وقت ہوئی تھی جب آپ اسلام لائے تھے۔'' بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کو عفو و درگزر سے نوازا۔ مکہ پرامن طریقے سے فتح ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اہل مکہ سے بیعت لینے کے لئے کوہ صفا پر تشریف فرما ہوئے۔ مردوں سے خود بیعت لی لیکن عورتوں سے بیعت لینے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مامور کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ کے لئے یہ بھی ایک بڑا اعزاز ہے، کعبہ کی تصویریں مٹانے کے لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ کو مامور کیا۔

غزوۂ حنین (شوال ۸ھ.....فروری ۶۳۰ء)

یہ غزوۂ فتح مکہ کے تقریباً ایک ماہ بعد مکہ سے نو دس میل دور وادیٔ حنین میں پیش آیا۔ ابتداء میں یہاں بھی غزوہ احد کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ پہلے دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ مسلمان مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے۔ یہ دیکھ کر بنو ہوازن نے پلٹ کر تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور مسلمانوں کی اکثریت منتشر ہوگئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، عباس رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور چند دیگر مہاجرین و انصار ثابت قدم رہے۔ البتہ یہاں کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی افواہ نہیں اڑائی ورنہ خدا جانے ثابت قدم رہنے والوں پر کیا ردعمل ہوتا، آخر بھاگتے مسلمانوں کو ہوش آیا اور وہ غیرت کھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے پلٹے اور جنگ کا پانسہ ان کے حق میں پلٹ گیا۔

تبوک کی مہم (رجب ۹ھ.....ستمبر ۶۳۰ء)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حالات کا آغاز ہم نے واقعۂ تبوک کے ذکر سے کیا تھا اور اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حوالہ بھی آ گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر اپنا آدھا مال و اسباب لا کر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تبوک گئے۔ لیکن جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

واقعہ ایلاء

اسی سال ایلاء کا واقعہ پیش آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً ایک ماہ کے لئے ازواجِ مطہرات سے علیحدگی اختیار کر لی۔ صحابہ میں افواہ پھیل گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام بیویوں کو طلاق دے دی، سبھی دم بخود تھے۔ کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہمت کر کے حاضری کی اجازت مانگی۔ ابتدا میں اجازت نہ ملی تو اونچی آواز سے پکار کر کہا کہ ''یارسول اللہ! میں حفصہ رضی اللہ عنہا کی سفارش کرنے نہیں آیا، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں تو میں ابھی جا کر اس کی گردن اڑا دوں۔'' اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر بلا لیا اور فرمایا کہ طلاق کی افواہ غلط ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جا کر صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتایا تو سب کو اطمینان ہوا۔

اس موقع پر یہ دیکھ کر کھجور کی چٹائی پر لیٹنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر اس کے نشان پڑ گئے ہیں، عمر رضی اللہ عنہ آبدیدہ ہوگئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ''قیصر و کسریٰ تو آرام دہ نرم و گداز مخملیں گدوں پر لیٹتے اور عیش کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین و دنیا کے سردار ہیں، کھجور کی کھردری چٹائی پر استراحت فرماتے ہیں، حکم فرمائیں تو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عمدہ فرش تیار کرایا جائے۔'' حضور نے فرمایا کہ ''اے عمر! اس دنیا کی زندگی عارضی اور چندروزہ ہے، جیسے مسافر کسی سرراہ واقع درخت کے نیچے تھوڑی دیر کے لئے آرام کرے اور پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔ اصل اور پائیدار زندگی آخرت کی ہے اور آخرت کا عیش ہی ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔''

حجتہ الوداع (۱۰.....۶۳۲ء)

ہجرت کے دسویں سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا اور آخری حج کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔

غرضیکہ ہجرت کے بعد کوئی غزوہ، کوئی دوسرا اہم واقعہ نہیں ہوا۔ جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نہ رہے ہوں۔

واقعۂ قرطاس

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں اس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں قلم دوات اور کاغذ لانے کا حکم دیا تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''اس وقت رسول اللہ کو تکلیف ہے۔ ہمارے پاس اللہ کی کتاب قرآن موجود ہے، وہ ہمارے لئے کافی ہے۔'' اس پر جب صحابہ کی موافق اور مخالف آوازیں بلند ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''چلے جاؤ، تمہیں نبی کے سامنے جھگڑنا نہیں چاہئے۔'' اس بناء پر ایک گروہ عمر رضی اللہ عنہ کو موردِ طعن قرار دیتا ہے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین دن زندہ رہے، اگر وحی خداوندی کے مطابق کوئی ضروری حکم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور لکھواتے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں لکھوایا اور آج تک معلوم نہ ہوسکا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت میں کیا لکھوانا چاہتے تھے۔ قیاس آرائیوں کی اور بات ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے صدق واخلاص سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون واقف تھا؟ اگر عمر رضی اللہ عنہ نے غلط بات کہی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے رد کر کے اپنے حکم کی تعمیل کراتے۔ آخر عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت تک کسی قسم کا اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ اپنی رائے کو دوسرے صحابہ پر بھی مسلط کر دیتے۔ اس واقعہ کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ اس وقت ان کی عمر بمشکل تیرہ چودہ سال تھی اور وہ موقع پر موجود بھی نہ تھے۔ اغلب ہے کہ ان سے واقعہ کی بعض ضروری جزئیات نظرانداز ہوگئیں۔ یہ بھی اغلب ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا یقین ہی نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مرض سے جانبر نہ ہوں گے۔ سوچا ہوگا کہ صحت یابی کے بعد حکم لکھوالیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا جو وحشت انگیز اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ہوا اس کا مختصر ذکر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں کیا جاچکا ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر گہری عقیدت اور محبت تھی۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوت بھی ہوسکتے ہیں۔ تلوار لے کر لوگوں کو دھمکاتے رہے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ

---

[1] الفاروق از شبلی نعمانی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے اس کا سر قلم کر دوں گا تا آنکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تقریر اور آیات قرآنی کو سن کر ہوش میں آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس فانی دنیا سے رحلت کا یقین آیا اور پھر شدت صدمہ وغم سے مٹی کے تودے کی طرح ڈھیر ہو گئے، لیکن کچھ ہی دیر بعد جب اطلاع ملی کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر اپنے میں سے خلیفہ منتخب کرنا چاہتے ہیں تو موقع کی نزاکت کو بھانپ کر فوراً اپنے حواس بجا کئے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں وہاں پہنچ کر سب سے پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی[1] اور ملت کو بے حد خطرناک بحران سے بچا لیا۔

عہد صدیقی میں

خلیفہ بنتے ہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جن عظیم الشان مسائل کا سامنا کرنا پڑا، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بھرپور تعاون کیا اور ان کے دست راست بنے رہے اور ہمیشہ انہیں مخلصانہ اور دوراندیشانہ مشورے دیتے رہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عدالت کا محکمہ ان کے سپرد کر دیا تھا کیونکہ انہیں عمر رضی اللہ عنہ کی انصاف پروری، غیر جانبداری، بصیرت، فراست اور تفقہ فی الدین پر اعتماد تھا۔ عہد صدیقی میں ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بار بار اصرار کر کے اور دلائل دے کر خلیفۂ اول کو جمع قرآن کی فوری ضرورت اور اہمیت کا قائل کیا۔ اس طرح مصحف کی تدوین عمل میں آئی۔

خلافت کے لئے نامزدگی

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حالات میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ کس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتخاب بطور خلیفۂ ثانی عمل میں آیا اور کس طرح انہوں نے ملت اسلامیہ پر احسان عظیم کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کسی کو اپنے بعد خلافت کے لئے واضح طور پر نامزد نہیں کیا تھا۔ دین مکمل ہو چکا تھا اور وحی کا سلسلہ بند۔ اب خلفاء کو مسلمانوں کی دینی و اخلاقی نگہداشت اور سیاسی شیرازہ بندی کا کام کرنا تھا اور دین حق کو اطراف و اکناف عالم میں پھیلانا تھا۔ خلیفہ کا انتخاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے جمہوری مزاج پر چھوڑ دیا۔ شاید ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کو یہ خیال نہ گزرے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی خداوندی کے مطابق خلیفہ نامزد کیا ہے یعنی وہ خلیفۃ اللہ ہے، اس سے فکر و عمل میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں، ابو بکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہنگامی صورت حال میں اہل مدینہ کے اتفاق رائے سے ہوا، لیکن ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے درپیش حالات کی روشنی میں اجتہاد سے کام لے کر عمر رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا۔ اکابر صحابہ سے مشورہ کیا معترضین کے اعتراضات کا جواب دے کر انہیں مطمئن کیا۔ اور پھر عامۃ المسلمین کی منظوری مجمع عام میں حاصل کی۔ قریب المرگ خلیفہ کی وصیت اور عمر رضی اللہ عنہ کی نامزدگی سے ان کا متفق ہونا کسی صریح قرآنی حکم کی اطاعت میں نہ تھا بلکہ اس لئے تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ کی سی قد آور شخصیت کوئی دوسری موجود نہ تھی اور یہ فیصلہ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے وقت ہی ہو گیا تھا کہ خلیفہ انصار میں سے نہیں ہو سکتا نہ دوسرے عرب قبائل سے۔ اسے لامحالہ کعبہ کے متولی قبیلہ قریش میں سے ہونا چاہئے۔

---

[1] بعض روایات کے مطابق حضرت بشیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے بیعت کی۔ مؤلف

قریش میں سے بنو ہاشم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قرابت قریبہ کی وجہ سے خیال کرتے تھے کہ خلافت ان کا حق ہے مگر مہاجرین وانصار نے جمہوری عمل کو اپنایا۔ عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کرتے وقت بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو ذہن میں رکھا۔ اپنے وقت پر عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی اصول پر عمل کیا۔ اپنے بیٹے اور رشتہ داروں کو خلافت کی امیدواری سے ہی قاطبۃً خارج کر دیا اور مجلس شوریٰ کو اپنا جانشین منتخب کرنے کا اختیار دیا، ان کا مشہور مقولہ ہے کہ مشاورت کے بغیر خلافت ممکن نہیں ہوسکتی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ کا اجماع ہوا۔ جیسا کہ علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے ''صحابہ کا اجماع کسی نوع سے کبھی بھی غلطی و گمراہی پر ناممکن ہے یعنی اجماعی طور پر صحابہ سے کبھی بھی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔'' خیر یہ جملہ معترضہ تھا سب لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور ان کے معاون و مددگار بن گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ ان سے بھرپور تعاون کیا اور اپنے قیمتی مشورے دیتے رہے بلکہ باہمی مؤدن و یگانگت اس قدر بڑھی کہ باہم رشتۂ مصاہرت قائم ہوگیا۔ ایک موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ''قوی امین'' کہا[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے بنی ہاشم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نامزدگی کے مقابلے میں اپنے استحقاقِ خلافت کا سوال نہیں اٹھایا بلکہ سب نے خوشدلی سے بیعت کرلی۔

دورِ خلافت

۲۴ جمادی الآخر ۱۳ھ تا ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ

۲۳ - اگست ۶۳۴ء تا نومبر ۶۴۴ء

خطبۂ خلافت

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوچکی تو انہوں نے منبر نبوی پر چڑھ کر خطبہ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اوپر کے زینے پر بیٹھ کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اوپر کے زینے سے نیچے والے زینے پر بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں کے احترام کے خیال سے تیسرے یعنی سب سے نچلے زینے پر بیٹھے۔

انہوں نے مسجد نبوی میں صحابہ اور دوسرے مسلمانوں کے مجمع عام سے اس طرح خطاب کیا:

''لوگو! میں تمہی میں سے ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسول اللہ کی حکم عدولی گوارا ہوسکتی تو میں ہرگز یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگ میری سختی سے ڈرتے اور میری دوستی سے لرزہ

---

[1] یہ سورۃ یوسف کے الفاظ ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر کے سامنے انتظامِ سلطنت کو حسن وخوبی سے چلانے کے لئے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے اپنے بارے میں کہے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کا مصداق ٹھہرایا، یہ ایک بہت بڑا خراجِ تحسین ہے۔ مؤلف

براندام رہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عمر اس وقت بھی ہم پر سختی کرتا رہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ہمارے سروں پر تھا، پھر اس وقت بھی ہمارے ساتھ سختی سے پیش آتا رہا جب ہمارے اور اس کے درمیان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حائل تھے لیکن اب کیا ہوگا جب کہ تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں؟ جو کوئی بھی ایسی باتیں کہتا ہے وہ ٹھیک ہی کہتا ہے، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر و باریاب رہنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کا شرف حاصل تھا، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع و فرمانبردار اور ادنیٰ چاکر تھا اور کوئی نہ تھا جو نرمی اور رحمدلی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچ سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے "وہ مومنین کے لئے رافت و رحمت کا سرچشمہ ہیں" بارگاہ رسالت میں میری حیثیت ایک برہنہ شمشیر کی سی تھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے، مجھے نیام میں فرما لیتے اور جب چاہتے اذن کار عطا فرماتے۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسی طرح رہا یہاں تک کہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد فرما لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخر وقت تک مجھ سے خوش رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس سعادت پر مجھے فخر ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کی زمام کار ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سپرد کی گئی جن کے تحمل، کرم اور نرمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور میں ان کا بھی اطاعت کیش، مددگار و رفیق رہا، اپنی سختی کو ان کی نرمی میں سمو دیتا۔ میں ایک برہنہ شمشیر تھا، جسے وہ نیام میں کر لیتے یا اپنا کام کرنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے میں اسی طرح ان کے ساتھ بھی رہا یہاں تک کہ اللہ ذوالجلال نے انہیں ہم سے جدا کر دیا۔ وہ دم واپسیں تک مجھ سے خوش رہے...... اور...... اے لوگو! اب تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے شانوں پر رکھ دی گئی ہے دراصل یہ میری تمہارے ذریعے اور تمہاری میری ذریعے سے آزمائش ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری سختی اب نرمی میں بدل گئی ہے، لیکن ان لوگوں کے لئے بدستور قائم ہے جو مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں، رہے وہ لوگ جو امن و سلامتی سے رہتے اور جرأت ایمانی رکھتے ہیں، سو ان کے لئے میں سب سے زیادہ نرم ہوں، اگر کوئی کسی پر ظلم یا کسی کے ساتھ زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر نہ ٹکا دوں اور دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں نہ رکھ دوں تا آنکہ وہ حق کے سامنے سرانداز ہو جائے۔

لوگو! مجھ پر تمہارے چند حقوق ہیں جو میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرو۔ مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے۔ مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور اس غنیمت میں سے جو اللہ تعالیٰ تمہیں عطا کرے کوئی چیز ناحق نہ لوں۔ مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ (انشاء اللہ) میں تمہارے عطیات و وظائف میں اضافہ اور تمہاری سرحدوں کو مضبوط کر دوں۔ اور مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں۔

تمہیں گھر واپس آنے سے نہ روکے رکھوں اور جب تم جنگ پر جاؤ تو ایک باپ کی طرح تمہارے اہل وعیال کی نگہداری کروں۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو، مجھ سے درگزر کرکے میرا ہاتھ بٹاؤ، نیکی کے احکامات کی تعمیل کرانے اور برائی سے روکنے میں میری مدد کرو اور تمہاری جو خدمات اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرو۔ میں تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر رہا ہوں۔''[۱]

کتنے جامع اور بلیغ ہیں اس خطبہ کے الفاظ و معانی! خلافت فاروقی کا یہ منشور دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری الفاظ میں لکھا جائے گا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے پر اپنے ابتدائی خطبہ میں جس خلافتی پالیسی کا واضح اعلان کیا تھا، عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں اس پالیسی کو صحیح خطوط پر مزید آگے بڑھانے اور اللہ اور مسلمانوں کے سامنے کامل طور پر اپنے جوابدہ ہونے کا برملا اعلان کیا اور واضح کر دیا کہ خلیفہ کی حیثیت ایک جابر آمر کی نہیں بلکہ وہ قرآن وسنت کے مطابق عمل کرنے اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کا پابند ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان اس سے جواب طلبی کرسکتا ہے، اس خطبے سے ان لوگوں کے شکوک وشبہات دور ہو گئے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت گیر طبیعت سے خائف تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نہ صرف اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا سکھایا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی اور خود ان کے حقوق کو عملاً تسلیم کیا آج کل کے آمروں نیز جمہوریت پسند سیاستدانوں کی طرح انہیں خوشکن وعدوں اور دلکش خوابوں پر نہیں ٹرخایا۔ ان کے قول وفعل میں کسی قسم کا تضاد نہ تھا۔

ولیم میور اور محمد حسین ہیکل نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک خطبہ کے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں جو غالباً اسی دن فجر کی نماز کے بعد کہے گئے جس دن ظہر کی نماز سے پہلے مندرجہ بالا خطبہ دیا گیا:

''عرب کی مثال ایک نکیل پڑے اونٹ کی سی ہے جو اپنے ساربان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اب یہ ساربان کا کام ہے کہ وہ اسے کس طرف لے جاتا ہے۔ رب کعبہ کی قسم! میں انہیں راہِ راست پر لا کے چھوڑوں گا۔''

مرتدین، منکرین زکوٰۃ وغیرہ کے گزشتہ پرفتن واقعات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ گویا ایک عزم بالجزم کا اظہار تھا اور انتباہ عام تا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد پھر کسی کے دماغ میں خناس نہ سمانے پائے۔

فتوحاتِ فاروقی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایرانی و بازنطینی (مشرقی رومی) سلطنتوں سے کشمکش حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ورثہ میں ملی۔ عہد صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت مسلمانوں نے عراق عرب کا بیشتر حصہ فتح کرلیا تھا۔ اور شامی محاذ پر اجنادین کی جنگ میں رومیوں کو شکست دے کر دنیا کے قدیم ترین شہر دمشق کا محاصرہ کرلیا تھا، اتنے

[۱] عمر فاروق اعظم از محمد حسین ہیکل اور محسن اعظم ومحسنین از فقیر سید وحید الدین باختلاف الفاظ (مؤلف)

میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے پیش رو کی تاکیدی وصیت کے مطابق اولیں فرصت میں محاذ عراق کے کمانڈر حضرت مثنیٰ بن حارثہ کے لئے مجاہدین کا لشکر تیار کرنے کے لئے ضروری اقدامات کئے۔

عراق وایران

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عراقی مہم کی اہمیت کا پورا پورا احساس تھا، انہوں نے اپنے عمال کو رضا کار بھیجنے کے لئے لکھا اور اس میں سہولت پیدا کرنے کے لئے دوسرا کام یہ کیا کہ عہد نبوی کے غزوات اور عہد صدیقی میں مرتدین، منکرین زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف جنگوں میں جو عرب لونڈی غلام بنائے گئے تھے یا زمانہ جاہلیت سے غلام چلے آتے تھے انہیں ایک اعلان عام کے ذریعے آزاد کر دیا کہ کسی عرب کو غلام نہیں بنایا جا سکتا اور سب کو ان کے لواحقین اور قبائل میں واپس بھیج دیا، اس کا بہت خوشگوار ردعمل ہوا۔ آزاد شدہ غلاموں اور ارتداد سے تائب شدہ قبیلوں کو جہاد میں شرکت کی اجازت دے دی گئی، حالانکہ خلیفۂ اول نے بطور سزا یا از راہ احتیاط ان کے خلاف پابندی لگادی تھی، اگرچہ وہ جہاد میں شریک ہو کر دشمنان اسلام کے خلاف لڑنے اور مالِ غنیمت میں حصہ لینے کے لئے بے تاب تھے۔

عربوں پر سلطنت ایران کی صدہا سالہ عظمت وشوکت وقوت کا رعب چھایا ہوا تھا۔ اس لئے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مثنیٰ کے لئے رضا کار مجاہدین (کیونکہ کوئی باقاعدہ تنخواہ دار فوج تو تھی نہیں) کی فراہمی کے لئے مدینہ میں موجود حضرات کے سامنے خطبہ دیا اور انہیں جہاد پر ابھارا تو ابتدا میں کسی نے اپنے آپ کو اس کے لئے پیش نہ کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلسل چار دن تک پر جوش خطبے دیتے رہے۔ حضرت مثنیٰ نے ایک پر جوش اور موثر تقریر میں حاضرین کو بتایا کہ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ایرانی فوجوں سے نبرد آزما ہو کر ان کا کس بل دیکھ چکے ہیں اور انہیں بارہا شکست دے چکے ہیں، اللہ کے حکم سے ایک مسلمان مجاہد دس ایرانیوں پر بھاری ہے، ایرانی سلطنت انتشار اور تفرقے کا شکار ہے، اس کی قوت مضمحل ہو چکی ہے، ایرانی امراء کی باہمی رقابت اور کشمکش[1] نے ہمارے لئے سازگار حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ ایرانیوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہم نے ایرانی سلطنت کے بہترین حصے پر قبضہ کر رکھا ہے جو ان سے لڑ کر اور انہیں شکست دے کر چھینا ہے۔ آخر قبیلہ ثقیف کے ایک سردار ابو عبید جو صحابی نہ تھے، کھڑے ہوئے اور کہا کہ اس کام کے لئے میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں، اس سے دوسروں کی بھی ہمت بندھی اور تقریباً ایک ہزار رضا کار مجاہدین نے اپنی خدمات پیش کر دیں ان میں صحابہ بھی شامل تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ کسی تجربہ کار اور سرکردہ صحابی کو سپہ سالار بنایا جائے مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ صحابہ کا شرف وامتیاز اسلام لانے میں سبقت کرنے اور دینی خدمات میں پیش پیش رہنے سے تھا۔ اس موقع پر وہ سبقت کرنے کی

---

[1] بعد کے ادوار میں جب مسلمانوں میں باہمی رقابتیں، نا اتفاقیاں اور آویزشیں پیدا ہوئیں تو ان کا بھی منگولوں وغیرہ کے ہاتھوں وہی انجام ہوا، اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہوتی۔ مؤلف

بجائے پیچھے رہ گئے۔ لہٰذا لشکر کی امارت کے لئے وہ غیر صحابی فائق ہو گیا جس نے اپنے دین کی مدافعت اور قبول دعوت میں ان پر سبقت کی اور جہاد کے لئے آمادگی ظاہر کی۔

اگر چہ حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ آزمودہ جنگ جو اور فن حرب کے ماہر نہ تھے لیکن ان کے خلوص اور جذبۂ ایثار کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوسروں کے احتجاج کے باوجود انہیں لشکر کا سپہ سالار مقرر کر دیا تاکہ دوسروں کو سبق حاصل ہو تاہم لشکر میں شامل صحابہ کی دلجوئی کے لئے انہیں ہدایت کی کہ اہم امور میں صحابہ سے مشورہ کرتے رہیں اور ان کی بات توجہ سے سنیں، جنگی اقدامات میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔

مثنیٰ اپنی کمانڈ پر واپس حیرہ روانہ ہو گئے، ابو عبید کا لشکر ان کے تقریباً ایک ماہ بعد روانہ ہوا جب مجاہدین کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی تھی، راستے میں مختلف قبائل کے رضا کار لشکر میں شامل ہونے لگے اور تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔

اس اثناء میں ایرانی اپنے تمام اندرونی اختلافات دور کر کے نئے سرے سے متحد اور منظم ہو چکے تھے۔ عراق کے بیشتر اضلاع میں مسلمانوں کے خلاف بغاوت برپا ہو گئی تھی۔ دربار ایران کی طرف سے نرسی اور جابان دو تجربہ کار جرنیلوں کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج مثنیٰ سے نپٹنے کے لئے بھیجی گئی۔ چونکہ مثنیٰ کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی، اس لئے وہ مقابلہ کرنے کی بجائے اپنی فوج کے ساتھ حیرہ سے خفان منتقل ہو گئے جو صحرا کی سرحد پر واقع تھا اور وہاں سے عرب کی طرف پسپائی ہو سکتی تھی اور کمک بھی آسانی سے پہنچ سکتی تھی۔ بہر حال وہ ایرانی سیاست اور افواج کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ابو عبید نے اپنے لشکر سمیت وہاں پہنچ کر پوری اسلامی فوج کی کمان سنبھال لی۔ مثنیٰ نے انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

نمارق، سقاطیہ، بارسماء

۱۳ھ (اکتوبر ۶۳۴ء)

ابو عبید اور مثنیٰ کے متحدہ لشکر نے جو ایرانیوں کے مقابلے میں بہت کم تھا، یکے بعد دیگرے نمارق، سقاطیہ اور بارسماء کے مقامات پر ایرانی افواج کو شکست دی اور بہت سامان غنیمت حاصل کیا۔

ایرانی جرنیل جابان کی گرفتاری اور رہائی کا واقعہ:

جنگ نمارق میں ایرانی جرنیل جابان کو ایک مسلمان مجاہد نے گرفتار کر لیا جو اسے پہچانتا نہ تھا۔ جابان نے اس سے کہا میں بوڑھا آدمی تمہارے کسی کام کا نہیں مجھ سے دو نوجوان غلام لے لو اور مجھے چھوڑ دو۔ گرفتار کنندہ مسلمان مان گیا۔ لیکن دوسروں نے جابان کو پہچان لیا اور سالار لشکر ابو عبید کو بتایا کہ یہ ایرانی سپہ سالار ہے اسے ہرگز نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اسے قتل کر دینا چاہئے لیکن ابو عبید نے جواب دیا کہ یہ سپہ سالار ہے یا عام سپاہی، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، ایک مسلمان اسے امان دے چکا ہے، اب اس کا قتل جائز نہیں۔ ہم بد عہدی نہیں کر سکتے، یہ تھا مسلمانوں کا پاس عہد کہ ایک اہم دشمن شخصیت پر قابو پا کر بھی اسے چھوڑ دیا۔

پُرتکلف دعوت:

ابوعبید نے اپنے فوجی دستے عراق کے مختلف اضلاع میں پھیلا دیئے، باغی جاگیرداروں نے دوبارہ اطاعت اختیار کرلی۔ انہوں نے ابوعبید کے لئے ایک پرتکلف دعوت کا انتظام کیا لیکن چونکہ یہ سارے مسلمان لشکر کے لئے نہ تھی اس لئے انہوں نے کہا کہ ''جب تک سب مسلمانوں کو ایسا کھانا نہیں ملتا، میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا'' چنانچہ سارے لشکر کے لئے دعوت کا انتظام کیا گیا۔ ایرانیوں کو اس اسلامی مساوات پر یقیناً حیرت ہوئی ہوگی۔

واقعہ جسر (رمضان ۱۳ھ......اکتوبر ۶۳۴ء)

پیہم شکستوں کے بعد ایران کے وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف رستم نے ایک مشہور اور شجاع جرنیل بہمن جادویہ کو بڑی تیاری اور ساز و سامان کے ساتھ مقابلے کے لئے بھیجا۔ ایران کا قدیم اور مقدس جھنڈا درفش کاویانی بھی ساتھ کر دیا، دونوں فوجوں کے بیچ میں دریا حائل تھا۔ بہمن نے ابوعبید کو پیغام بھیجا کہ یا تو ہمیں دریا پار کر کے اپنی طرف آنے دو یا تم خود دریا پار کر کے ہماری طرف آجاؤ۔

ابوعبید نے جوشِ جہاد میں دریا پار کرنے کا فیصلہ کر لیا اگرچہ مثنیٰ اور دوسرے تجربہ کار مسلمان امرائے لشکر نے مخالفت کی۔ دریا کے پار فوجی نقل و حرکت کے لئے جگہ موزوں نہ تھی اور مسلمانوں کے دریا پار کرتے ہی ایرانیوں نے حملہ کر دیا۔ ابھی وہ ٹھیک سے صف بندی بھی نہ کر پائے تھے۔ مزید برآں ایرانی فوج کے ساتھ جنگی ہاتھیوں کا دستہ تھا۔ جن سے عرب گھوڑے بدکتے تھے۔ اس سے پہلے مسلمانوں اور ان کے گھوڑوں کو کبھی ہاتھیوں سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ بہت سے مسلمان مجاہد گھوڑوں سے اتر کر ہاتھیوں کی طرف بڑھے اور ہودوں کو الٹ دیا۔ مہاوت اور فیل نشیں جنگ جو زمین پر آرہے۔ مگر ایک سفید ہاتھی جو سب سے بڑا اور ہاتھیوں کے دستے کا لیڈر تھا، قابو میں نہ آتا تھا، ابوعبید گھوڑا چھوڑ کر پیدل ہو گئے اور تلوار کے وار سے اس کی سونڈ کاٹ دی، مگر ہاتھی نے غضب ناک ہو کر ابوعبید کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا جنگی تربیت یافتہ ہاتھیوں نے مسلمانوں کی صفوں میں تباہی مچا دی، ابوعبیدہ کی شہادت سے ان میں ابتری پھیل گئی، فرار ہونے کی کوشش میں کئی ہزار مسلمان دریا میں ڈوب گئے۔ کیونکہ پسپائی کو روکنے کے لئے کسی مسلمان نے دریا کا پل توڑ ڈالا تھا۔ آخر مثنیٰ نے کمان سنبھالی اور ایرانی پیش قدمی کو روکا۔ بچی کھچی فوج دریا عبور کر گئی صرف تین ہزار مجاہد زندہ بچے۔

میدانِ جنگ سے بھاگنے والے شرم کے مارے چھپتے پھرتے تھے اور کسی کو اپنا منہ نہ دکھاتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جس کا پتہ چلتا اسے جا کر تسلی دیتے اور آئندہ کے لئے ہمت بندھاتے۔ بہر حال انہیں اس واقعہ کا سخت رنج تھا اور غصہ بھی۔ انہوں نے قبائل سے رضا کار طلب کئے۔ بڑے بڑے جتھے مدینہ میں جمع ہو گئے۔ حتیٰ کہ نمر اور تغلب کے عیسائی قبائل بھی اپنی عربی عصبیت کے جوش میں ایرانیوں کے مقابلے کے لئے لشکر اسلام میں پہنچ گئے۔ جب ایک بڑی فوج تیار ہو گئی تو خلیفہ نے اسے عراق کے محاذ جنگ پر روانہ کر دیا۔ مثنیٰ نے بھی اس اثنا میں سرحدی قبائل کی مدد سے اپنے طور پر ایک فوج تیار کر لی تھی اور وہ ایرانیوں کے مقابلے پر کمربستہ تھے اور

دریائے فرات کے کنارے بویب[1] کے مقام پر خیمہ زن تھے، وہیں آکر امدادی فوجیں ان کے ساتھ مل گئیں۔

جنگ بویب (رمضان ۱۳ھ...... نومبر ۶۳۴ء)

ایرانی فوج جو شاہی رسالہ کے بارہ ہزار چیدہ شہسواروں پر مشتمل تھی، مہران کی سپہ سالاری میں آکر مقابل ہوئی حضرت مثنیٰ نے فوج کو بڑی ہوشیاری، مہارت اور بہادری سے لڑایا۔ جنگ جسر میں جن مسلمانوں نے راہ فرار اختیار کی تھی، وہ نہایت دلیری سے لڑے اور تقریباً سب نے شہادت سے سرخرو ہو کر اپنے داغ بدنامی ورسوائی دھوڈالے۔ مثنیٰ کی اپنی مثال سب کے لئے قابل تقلید تھی، جب ان کے بھائی مسعود مہلک زخم کھا کر گرے تو بھی مثنیٰ نے تیغ زنی سے ہاتھ نہیں روکا۔ اور یہ سوچ کر مبادا مسعود کی شہادت سے مسلمانوں کو رنج وافسوس ہو اور ان کی جنگی کوشش میں کوئی ڈھیل آئے انہوں نے للکار کر کہا کہ ''مسلمانو! میرے بھائی کے گرنے کی پروانہ کرنا، تمہارے بہترین آدمی یونہی گرتے ہیں تمہارے نیزے اور تلواریں چلتی رہیں اور تمہارے علم جھکنے نہ پائیں۔'' خود مسعود نے گرتے وقت کہا کہ ''مسلمانو! میرے مرنے سے بددل نہ ہونا'' پھر یوں ہوا کہ قبیلہ تغلب کے ایک عیسائی نوجوان نے ایرانی سپہ سالار مہران کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا[2] ایرانی بدحواس اور دل شکستہ ہو کر بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے فرات کا پل توڑ دیا اور بھاگتے ہوئے ایرانیوں کو تہ تیغ کیا، جو قتل ہونے سے بچ گئے وہ دریا میں ڈوب کر مر گئے، معرکہ جسر کا یہ بھرپور جواب تھا، اس کے بعد مسلمان سارے عراق پر چھا گئے اور دشمن کا ایرانی دارالحکومت مدائن کے دروازوں تک تعاقب کیا۔ ایرانیوں کے دل بیٹھ گئے، ان کا اقتدار ضعیف ہو گیا اور ان کا زور ٹوٹ گیا۔ بے شمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور عراق دوبارہ ان کے قبضے میں آگیا، ولیم میور نے صحیح لکھا ہے کہ مثنیٰ دنیا کے عظیم جرنیلوں میں سے تھے۔ فتح کے بعد مثنیٰ نے اپنے اہل لشکر سے کہا کہ ''میں نے جاہلیت اور اسلام دونوں میں ایرانیوں سے جنگ کی ہے خدا کی قسم! جاہلیت میں ایک سو عجمی ایک ہزار عربوں پر بھاری ہوتے تھے، لیکن اسلام اور ایمان کی یہ برکت ہے کہ اب ایک سو عرب ایک ہزار ایرانیوں پر بھاری ہیں۔ اللہ نے ایرانیوں کا رعب زائل اور ان کا مکر باطل کر دیا۔'' افسوس کہ یہ عظیم جرنیل اس عظیم فتح کے تھوڑا عرصہ بعد جنگ قادسیہ سے پہلے فوت ہو گیا۔ جنگ جسر اور جنگ بویب میں جو زخم لگے تھے وہ ٹھیک سے مندمل نہ ہو سکے، کھل گئے اور کاری ثابت ہوئے۔

جنگِ قادسیہ (رمضان ۱۴ھ...... نومبر ۶۳۵ء)

بویب کی جنگ کے بعد مسلمان مدائن کے دروازوں پر دستک دے چکے تھے، اس لئے ایرانی دربار نے صورت حال کا بڑی احتیاط سے جائزہ لیا۔ امرائے دربار نے اپنے تمام اختلافات دور کر دیئے، ملکہ پوران دخت کو

---

[1] بعد میں اسی مقام سے چند میل کے فاصلے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے فاتح قادسیہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کوفہ کا شہر آباد کیا۔ مؤلف

[2] یہ طبری کی روایت ہے۔ بلاذری نے جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ اور منذر بن حسان ضبی کے نام دیئے ہیں لیکن طبری کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ مؤلف

معزول کر کے ساسانی خاندان کے آخری اکیس سالہ نوجوان شہزادے یزدگرد کو تخت پر بٹھایا گیا اور مسلمانوں کے خلاف ایک لشکر جرار تیار کیا گیا، حکومت ایران کے دباؤ سے مفتوحہ عراق میں پھر سے بغاوت پھیل گئی۔ مثنیٰ کے پاس بہت تھوڑی فوج رہ گئی تھی۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کمک کی درخواست کی۔ خلیفہ نے قبائل سے مجاہدین طلب کئے تقریباً بیس ہزار مجاہدین مدینہ میں جمع ہو گئے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو بڑے بلند مرتبہ صحابی اور عشرۂ مبشرہ میں سے تھے، نیز بڑے قدر انداز اور شجاع تھے اور غزوات نبوی میں شجاعت اور جاں نثاری کے جوہر دکھا چکے تھے، امیر لشکر مقرر کئے گئے۔

عجیب واقعہ

جہاد قادسیہ میں شرکت کے ارادہ سے قبیلہ سکون اور قبیلہ کندہ کے چار سو آدمی حصین بن نمیر السکونی اور معاویہ بن خدیج کندی کی معیت میں مدینہ سے گزرے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے، ان میں کچھ لوگ معاویہ بن خدیج کے ساتھ دلم سباط کے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بے رخی برتی اور فرمایا کہ مجھے ان کے بارے میں تردد ہے۔ میرے دل میں کسی عرب جماعت سے ایسی ناگواری پیدا نہیں ہوئی جیسی کہ ان لوگوں سے ہوئی ہے۔ تاہم انہیں جانے دیا۔ بعد کے واقعات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس وجدانی نفرت، ناگواری اور تشویش کو درست ثابت کر دیا، ان لوگوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل سودان بن حمران تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتل خالد بن ملجم تھا۔ معاویہ بن خدیج تھا جس نے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا، کچھ اور لوگ تھے جو قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ کی مہمانداری کرتے تھے اور حصین بن نمیر تھا جس نے یزید کی فوج کے سالار کی حیثیت سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں مکہ کا محاصرہ کر کے کعبہ شریف پر منجنیقوں سے آگ اور پتھروں کی بارش کی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ہدایات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے تجارتی سفروں کے دوران میں سارے عراق کی دیکھ بھال کر چکے تھے اور اس کے جغرافیائی حالات سے خوب واقف تھے۔ واقعہ جسر کی وجہ سے وہ بہت محتاط ہو چکے تھے اور انہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سپہ سالارانہ اوصاف کا پہلے تجربہ اور مشاہدہ بھی نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے لشکر کی نقل و حرکت، نظم و ترتیب، مورچہ بندی، مدینہ سے عراق تک منازل کے تعین کا کام اپنے ہاتھ میں رکھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ ہر منزل اور مرحلہ کا مکمل نقشہ انہیں بھیجتے رہیں اور پھر حسب ذیل ہدایات دیں جن کی اہمیت آج بھی تر و تازہ ہے:

> "اے سعد بن بنی وہیب! تم کو خدا کے معاملے میں اس کا گھمنڈ نہ ہونا چاہئے کہ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ماموں اور صحابی کہا جاتا ہے کیونکہ خدائے عزوجل برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو نیکی سے مٹاتا ہے خدا اور بندے کے درمیان اطاعت کے سوا اور کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تمام انسان خواہ شریف ہوں خواہ کمینے خدا کے ہاں برابر ہیں، خدا ان کا پالنے والا ہے، وہ اس کے بندے ہیں عبادت کے

ذریعے سے کم وبیش درجات حاصل کرتے ہیں، اوراطاعت کے ذریعے اسے اس کی بارگاہ سے سب کچھ پاتے ہیں پس تم وہی طریق کار اختیار کرو جو تم نے رسول اللہ کو ابتدائے بعثت سے لے کر وصال تک کرتے ہوئے دیکھا ہے اس طریقے کو مضبوطی سے پکڑو، وہی طریقہ سب سے بہتر ہے میں تم کو یہی نصیحت کرتا ہوں کہ اگر تم نے اس کو ترک کیا اوراس سے روگردانی کی تو تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اورتم خسارہ اٹھاؤ گے۔

تم کو ایک نہایت شدید اور ناگوار صورت حال کا مقابلہ کرنا ہے جس سے بجز حق پرستی چھٹکارا ناممکن ہے تم خود کو اور اپنے ساتھیوں کو نیکی کا خوگر کرو۔ یاد رکھو ہر عادت کی ایک بنیاد ہے، نیکی کی بنیاد صبر ہے تم کو جب کوئی دقت یا مصیبت پیش آئے تو اس پر صبر کرنا اس سے تم کو خشیت الٰہی حاصل ہوگی۔ یاد رکھو خشیت الٰہی دو چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، ایک خدا کی اطاعت، دوسرے معصیت سے اجتناب، جو شخص اس کی اطاعت کرتا ہے بغض دنیا اور حب آخرت سے کرتا ہے اور جو شخص اس کی نافرمانی کرتا ہے وہ حب دنیا اور بغض آخرت سے کرتا ہے۔ قلوب حقائق کے مخزن ہیں۔ حقائق کو اللہ پیدا کرتا ہے، ان میں سے بعض پوشیدہ بعض آشکارا۔ جب آشکارا ہوتے ہیں تو اس کے دل سے حکمت کی باتیں زبان کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہیں اور لوگ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، محبوب خلائق بننے سے روگردانی نہ کرو کیونکہ انبیائے کرام نے بھی اس کی تمنا کی ہے، جب خدا کسی بندے کو محبوب بناتا ہے تو لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا کر دیتا ہے اور جب کسی سے بغض کرتا ہے تو لوگوں کے دلوں میں اس کا بغض پیدا کر دیتا ہے، تم خدا کے نزدیک اپنا وہی مرتبہ سمجھو جو تم کو ان لوگوں میں حاصل ہے جو تمہارے شریک کار ہیں۔''

پھر عام مجاہدین سے یوں خطاب کیا:

''اللہ نے تم کو ضرب المثل بنایا ہے اور تمہاری باتیں بیان کی ہیں تاکہ ان کے ذریعے سے دلوں کو زندہ کرے، دل سینوں میں مردہ ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں زندہ کرتا ہے، عدل کی چند نشانیاں اور بشارتیں ہیں۔ نشانیاں یہ ہیں، حیا، سخاوت، وقار اور نرمی، اس کی بشارت رحمت ہے، عدل کا دروازہ عبرت ہے اور اس کی کنجی زُہد ہے، عبرت یہ ہے کہ دوسروں کی موت کو یاد کر کے اپنی موت کا خیال کرنا اور اچھے اعمال پیش کر کے اس کی تیاری کرنا، زُہد یہ ہے کہ دوسروں سے اپنا حق لینا اور ہر صاحب حق کا حق اس کو پہنچا دینا اور اس کے لئے کوئی لین دین نہ کرنا، جو شخص بقدر کفائت پر قناعت نہیں کرتا وہ کسی چیز سے سیر نہیں ہوتا۔ تم اپنی شکایات میرے سامنے پیش کرو یا ان لوگوں کے سامنے پیش کرو جو مجھے پہنچا دیں، میں بلاتردد حقدار کو اس کا حق دلاؤں گا۔''

مثنیٰ رضی اللہ عنہ اپنے آٹھ ہزار مجاہدین کے ساتھ مقام ذی قار میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے منتظر تھے، لیکن ان کے

وہاں پہنچنے سے پہلے انتقال کر گئے، مثنیٰ کے بھائی معنیٰ حضرت سعد سے آ کر ملے اور مثنیٰ کے ضروری مشورے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے گوش گزار کئے، پھر حضرت عمر کی ہدایات پہنچیں کہ قادسیہ میں خیمہ زن ہوں اور وہاں اپنے مورچے اس طرح قائم کریں کہ سامنے عراق کی زمین اور پشت پر عرب کے پہاڑ ہوں تا کہ فتح ہو تو بلا روک ٹوک آگے بڑھتے چلے جائیں اور اگر خدانخواستہ دوسری صورت پیش آئے تو پیچھے ہٹ کر پہاڑوں کی اوٹ میں آجائیں۔

یزدگرد کے دربار میں اسلامی سفیر

خلیفہ کا حکم تھا کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے اتمام حجت اور دعوت اسلام کے لئے اسلامی سفیر دربار ایران میں بھیجے جائیں چنانچہ یزدگرد کے پاس ایسے چودہ سربرآوردہ افراد پر مشتمل سفارت بھیجی گئی جو قد و قامت، شکل و صورت، رعب و داب، جرات و شجاعت، جنگی مہارت، عقل و تدبیر، فہم و فراست اور حزم و سیاست میں سارے عرب میں ممتاز تھے، انہوں نے یزدگرد سے بڑی بے باکی سے کہا:

۱- تم اسلام قبول کر لو تو ہمارے بھائی ہو گے۔ ہمارے تمہارے حقوق برابر۔ ہم واپس چلے جائیں گے۔

۲- اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو جزیہ دینا قبول کر کے اسلام کی حفاظت اور پناہ میں آجاؤ اور امن و امان سے رہو، زمین میں فتنہ و فساد نہ پھیلاؤ، تمہاری حکومت برقرار رہے گی۔

۳- اگر جزیہ دینا منظور نہیں تو پھر تلوار ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔

یہ سن کر یزدگرد بے حد مشتعل ہو گیا۔ غضبناکی کے عالم میں اس نے سفراء سے بڑی حقارت آمیز گفتگو کی اور کہا کہ ”تمام دنیا میں تم سے زیادہ ذلیل اور بدبخت کوئی قوم نہ تھی۔ تم جب کبھی ہم سے سرکشی کرتے تھے تو سرحد کے زمینداروں کو حکم بھیج دیا جاتا تھا اور وہ تمہارے بل نکال دیتے تھے، اگر ایلچیوں کا قتل جائز ہوتا تو تم میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ جاتا۔“ [۱]

پھر اس نے مٹی سے بھرا ہوا ٹوکرا منگایا اور کہا کہ ”تم میں سے جو سب سے معزز ہو وہ اسے اپنے سر پہ اٹھا لے اور یہاں سے نکل جاؤ۔ اپنے سردار سے جا کر کہہ دو کہ میں تمہاری سرکوبی کے لئے رستم کو بھیج رہا ہوں، وہ تم سب کو قادسیہ کی کھائی میں دفن کر دے گا۔ پھر میں اس کو تمہارے ملک میں بھیج کر تم کو ایسا مزا چکھاؤں گا کہ تم شاپور کو بھول

---

[۱] ایران کے ”قومی شاعر“ فردوسی نے شاہنامہ، میں یزدگرد کا جواب اپنے اشعار میں اس قدر جوش و خروش اور غضبناکی سے قلم بند کیا ہے کہ جیسے اس نے خود یزدگرد کا جامہ پہن لیا ہو۔

زشیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسیدست کار
کہ تخت کیاں را کند آرزو
تفو برتو اے چرخ گرداں تفو!

ترجمہ: اونٹنیوں کا دودھ پی کر اور گوہ کا گوشت کھا کھا کر اب عربوں کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ ایرانی تخت و تاج کی آرزو کرنے لگے ہیں، اے گردش روزگار تجھ پر تف ہے۔

جاؤ گے۔"

عاصم بن عمرو نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹوکرا اٹھا لیا اور سب گھوڑے دوڑاتے ہوئے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس قادسیہ پہنچ گئے۔ اور کہا کہ "اے سعد رضی اللہ عنہ! مبارک ہو، دشمن نے اپنی زمین خود ہمیں دے دی۔"

اس کے بعد ایرانی سپہ سالار اعظم رستم کی درخواست پر یکے بعد دیگرے دو سفارتیں اس کے پاس بھیجی گئیں مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ایرانی نہ تو اسلام قبول کرنے پر تیار ہوئے نہ جزیہ دینے پر، فیصلہ تلوار پر رہا۔
رستم نے اسلامی فتوحات کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق، نیکی وتقویٰ، دیانت و صیانت، نظم وضبط اور عدل ومساوات کو دیکھ اور سن کر عجیب حسرت حیرت اور تاسف کے انداز میں کہا تھا کہ "اکل عمر کبدی یعلم الکلاب الاداب" (عمر رضی اللہ عنہ میرا کلیجہ کھا گیا کہ اس نے وحشیوں کو تہذیب وآداب کا نمونہ بنا دیا۔) [۱]

قادسیہ اس زمانے میں عراق عرب کا مشہور شہر تھا اور ایرانی دار الحکومت مدائن سے تقریباً چالیس میل دور تھا۔
اس مرحلے پر مسلمانوں کا ایرانی دار الحکومت کے اس قدر نزدیک پہنچ جانا ہی فی نفسہ ان کی فتح مندی کا شگون تھا......
اس کے نزدیک ایک وسیع میدان کا انتخاب مسلمان فوج کے لئے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔

درفش کاویانی اڑاتا ہوا رستم آگے بڑھا۔ تقریباً سوا لاکھ ایرانی فوج کا مقابلہ تیس ہزار مسلمانوں سے تھا، ایران نے اس موقع پر زیادہ سے زیادہ فوج ہر قسم کے اسلحہ وسامان جنگ سے لیس اپنے بہترین جرنیل کی سرکردگی میں میدان میں اتاری تھی تاکہ عرب طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دے، لیکن اخلاقی اور ایمانی برتری مسلمانوں کو حاصل تھی، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عراق النسا کی شدید تکلیف تھی اور وہ گھوڑے پر سوار ہونا تو کجا عام نقل وحرکت سے بھی معذور تھے۔ انہوں نے خالد بن عرفطہ کو اپنا نائب سپہ سالار مقرر کیا اور خود میدان جنگ کے کنارے واقع ایک پرانے محل کی چھت پر تکیوں کے سہارے بیٹھ گئے اور معرکہ کارزار کی بدلتی، بگڑتی، سنبھلتی صورت حال کے مطابق مناسب ہدایات پرچوں پر لکھ کر اور گولیاں بنا کر خالد بن عرفطہ کی طرف پھینکتے جاتے تھے اور وہ حسب ہدایت موقع بموقع ضروری کارروائی کرتے تھے۔ میدان جنگ میں یہ طریق کار غالباً دنیا میں پہلی دفعہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا جو ترقی کرتے کرتے آج کل ٹیلیگرام، ٹیلی فون اور وائرلیس کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوج کے ساتھ طبیبوں کے علاوہ شاعر، خطیب اور قاری بھی بھیجے تھے۔ انہوں نے رجزیہ اشعار، پرجوش خطبوں اور برمحل آیات قرآنی (خاص کر سورہ انفال) کی تلاوت سے مجاہدین کو جذبہ جہاد وسرفروشی سے سرشار کر دیا۔

ظہر کی نماز کے بعد جنگ شروع ہوئی جو تین دن اور ایک رات مسلسل جاری رہی۔ ایرانیوں کے چیدہ چیدہ بہادر اور جنگ جو سالار حضرت قعقاع بن عمرو، عمرو بن معدیکرب، طلیحہ بن خویلد اسدی، زہرہ بن حویہ وغیرہ مسلمان بہادروں کے ہاتھوں مبارزت طلبی میں مارے گئے۔ جنگ جسر کے فاتح بہمن جادویہ کو قعقاع رضی اللہ عنہ نے

---

[۱] تزکیہ نفس، صفحہ ۳۰۲ مصنفہ مولانا امین احسن اصلاحی

قتل کیا۔ عام ایرانی فوج پر اس کا بھی نفسیاتی اثر پڑا، تاہم ایرانی فوج اور اس کے افسر بڑی بے جگری سے لڑے۔ اس سے پہلے نہ تو کبھی تیس ہزار مسلمان فوج کسی ایک معرکے میں میدان میں اتری تھی اور نہ ایرانی یا کوئی دوسری مخالف فوج سوا لاکھ کی تعداد میں ان کے مقابلے میں آئی تھی اور نہ لگاتار تین دن اور ایک رات کوئی جنگ جاری رہی تھی، اپنی قسم کی یہ پہلی خونریز، ہلاکت خیز اور دو قوموں یا دینوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ تھی۔ ایرانیوں کے سدھائے ہوئے خوفناک گرانڈیل ہاتھیوں نے بڑی تباہی مچائی لیکن آخر کار جانباز مجاہدوں نے نیزوں سے ان کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ تلواروں سے سونڈیں کاٹ دیں اور تیروں کی بوچھاڑ سے فیلبانوں کو قتل کر کے ہودے الٹ دیئے، نتیجہ یہ کہ وہ پورس کے روایتی ہاتھیوں کی طرح اپنی ہی فوج کو روندتے ہوئے میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ ایرانی سپہ سالار رستم خود بھی بڑی بہادری سے لڑا لیکن آخر فرار ہونے کی کوشش میں ایک مسلمان مجاہد ہلال بن علقمہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔[1] رستم کے قتل کے بعد ایرانی بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس جنگ میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اتنی بڑی تعداد اس جنگ سے پہلے کسی جنگ میں شہید نہیں ہوئی تھی۔ اس کے برعکس تقریباً تیس ہزار ایرانی میدانِ جنگ میں مارے گئے اور اتنے ہی فرار کے وقت دریا میں ڈوب کر مر گئے یا چھپن، بچنے کی کوشش میں ایک دو دو کر کے تعاقب کرنے والے مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

اس جنگ میں مسلم خواتین نے بھی بھرپور کردار ادا کیا، وہ مسلمان زخمیوں کو پانی پلاتیں، اور ان کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور قبریں کھود کھود کر شہیدوں کو دفن کرتی تھیں، دشمن کے زخمیوں کو اپنے ڈنڈوں سے آخری اور مہلک ضرب لگاتی تھیں، مسلمان بچوں نے بھی اس کام میں ان کی مدد کی۔ یہ زیادہ تر صحرا نشیں اور خانہ بدوش قبائل کی خواتین تھیں جو اپنے مردوں کے ساتھ آئی تھیں۔

مالِ غنیمت میں سے سوار کے حصے میں چھ چھ ہزار اور پیدل کے حصے میں دو دو ہزار درہم آئے، غیر معمولی کارنامے سرانجام دینے والوں کو خلیفہ کے حکم سے پانچ پانچ سو درہم مزید دیئے گئے اور خصوصی تحائف بھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے خمس بھی مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا۔ رستم کے قاتل ہلال بن علقمہ کو رستم کا بیش قیمتی لباس اپنے

---

[1] مسلمان سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے عملاً اس جنگ میں حصہ نہیں لیا نہ شمشیر زنی کی نہ نیزہ بازی نہ تیر اندازی کیونکہ وہ معذور تھے لیکن فردوسی کی ایرانی عصبیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایرانی سپہ سالار رستم مسلمان سپہ سالار سعد رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کمتر درجے کے مجاہد کے ہاتھوں مارا جائے چنانچہ شاہنامہ میں رستم اور سعد رضی اللہ عنہ کی دوبدو جنگ و مبارزت کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ رستم حضرت سعد کے تیر بے خطا سے مارا گیا (حضرت سعد رضی اللہ عنہ ماہر تیر انداز تھے)

ستوں کرد چپ را و خم کرد راست		خروش از خم چرخ چاچی گزاشت
برآمد خروشے بکر دار رعد		زیک سوئے رستم زیک سوئے سعد
چو دیدار رستم بخوں تیرہ گشت		جوانمرد تازی برو چیرہ گشت

گویا دونوں سالاروں میں گھمسان کا رن پڑا۔ مؤلف

پاس رکھنے کی اجازت دی گئی جس کی قیمت تقریباً ستر ہزار درہم تھی، ایرانی فتح وظفر کا روایتی نشان درفش کاویانی بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اس پر جڑے ہوئے جواہرات کی قیمت تقریباً ایک لاکھ درہم تھی۔

اسلامی، ایرانی اور مغربی مؤرخین نے جنگ قادسیہ کے حالات وواقعات اور شجاعانہ کارناموں کا ذکر خون گرما دینے والی تفصیل سے کیا ہے یہ ایک بے حد اہم اور فیصلہ کن جنگ تھی، پوری سلطنت ایران کی فتح کا دیباچہ، یہ جنگ انسانیت کی تاریخ پر ہنی بال، سکندر، چنگیز خاں، تیمور لنگ اور نپولین کی معرکہ آرائیوں بلکہ ان تمام جنگوں سے زیادہ اثر انداز ہوئی جو آج تک دنیا میں لڑی گئیں اور جن کا انسانی تہذیب وتمدن کو نئے راستے پر ڈالنے میں بڑا ہاتھ ہے، یہ ہوس ملک گیری اور حرص مال ومنال کے لئے تاخت تازی نہ تھی، اس کا مقصد گلتے سڑتے تہذیب و تمدن کا آپریشن تھا تاکہ دنیا سے شر وفساد کی بنیادیں ڈھادی جائیں اور اصلاح اور نیکی، عدل اور مساوات کا دور دورہ ہو۔

قادسیہ کی شکست فاش نے ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور ایرانی قوت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی، بعینہ جیسے سکندر یونانی کے ہاتھوں ایک ہزار سال پہلے دارا کی شکست سے کیانی سلطنت کا خاتمہ ہوا تھا، اب مسلمانوں کے ہاتھوں ساسانی سلطنت ختم ہو رہی تھی اور آخری ساسانی تاجدار نوشتہ دیوار پڑھ کر بھی ہوش میں آنے سے انکار کر رہا تھا سکندر جسے اعظم (The Great) کہا جاتا ہے۔ نے دارا کو قتل کرنے اور ایرانی دارالسلطنت کو نذر آتش کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا، نیز اس نے مفتوحہ ایران کو اپنے جرنیلوں میں تقسیم کر دیا لیکن مسلمانوں کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا وہ یزدگرد کی سلطنت اور شہنشاہی برقرار رکھنے پر تیار تھے، لیکن اللہ کی مصلحت کچھ اور تھی اگر نوجوان، متکبر اور خودسر یزدگرد ذرا بھی دور اندیشی سے کام لیتا تو اسلام قبول کر کے یا جزیہ دینے کا اقرار کر کے اپنی سلطنت وحکومت کو بچا سکتا تھا لیکن اس کا اور اس کے امراء کا ذہن بادیہ نشیں عربوں کو اپنا برتر یا ہم سر ماننے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ اور نہ نئے دین اسلام کی انقلابی تعلیمات، عدل ومساوات کی حقیقت کو سمجھ سکا۔ چنانچہ قادسیہ کی شکست کے بعد بھی یزدگرد نے لڑائیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور ہر دفعہ شکست کھا کر آگے بھاگ گیا۔ حتیٰ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں ذلت و غربت کی موت مارا گیا۔ مشیت خداوندی یہی تھی کہ ہزار سالہ ساسانی سلطنت جو اپنی اخلاقی قوت کھو چکی تھی، عرب کے شتربانوں کے ہاتھوں عبرت ناک طریقے پر ختم ہو جائے اور نوشیروان عادل کا مدائن اور قصر ابیض اپنی زبان حال سے یہ کہتے نظر آئیں۔

ما بارگہ دادیم ایں رفت ستم بر ما
برقصر ستم گاراں آیا چہ رود خذ لاں!

(ہم تو عدل وانصاف کی بارگاہ تھے ہم پر بھی افتاد پڑی، ظالموں کے محلوں پر کیا بیتی ہوگی؟)

ایک دوسرے فارسی شاعر نے دنیاوی جاہ وحشمت کی ناپائداری سے عبرت آموزی کے لئے قصر کسریٰ کا حوالہ یوں دیا ہے۔

پردہ داری می کند بر قصر کسریٰ عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

(نوشیرواں کے محل پر مکڑیوں نے جالے بن رکھے ہیں اور افراسیاب کے گنبد شاہی پر الو بولتے ہیں)

لیکن یزدگرد سے پہلے اس کے باپ خسرو پرویز بن نوشیرواں کے عہد ہی میں عدل وانصاف ظلم وتشدد میں بدل چکے تھے۔ جنگ قادسیہ سے پندرہ ہی سال پہلے اس نے بازنطینی سلطنت کو بری طرح رگیدا تھا اور شام، فلسطین، مصر وغیرہ بازنطینی صوبے چھین لئے تھے۔ اب اس کے آخری بیٹے سے ایرانی سلطنت چھینی جا رہی تھی بلکہ وہ خود چھنوا رہا تھا۔ جب برے دن آتے ہیں تو عقل ماری جاتی ہے اور ہر قدم غلط اٹھتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق خسرو پرویز کی عظیم سلطنت کے پرزے اڑنے لگے تھے۔

قادسیہ کا قاصد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خطبہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی آنکھیں قادسیہ کے محاذ جنگ کی طرف لگی رہتی تھیں۔ وہ روزانہ نماز فجر کے بعد شہر سے باہر نکل جاتے اور قاصد کی راہ دیکھتے۔ ایک دن ایک شتر سوار آتا دکھائی دیا۔ خلیفہ کے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ سعد رضی اللہ عنہ کا قاصد ہے اور فتح کی خوشخبری لے کر آیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قاصد کے اونٹ کے ساتھ ساتھ دوڑتے جاتے تھے اور قادسیہ کے حالات پوچھتے جاتے تھے۔ اسی حالت میں شہر میں داخل ہوئے تو جو شخص بھی راہ میں ملتا انہیں امیر المومنین کہہ کر خطاب کرتا۔ تب قاصد کو معلوم ہوا کہ یہ تو خلیفۂ وقت ہیں جو اس کے اونٹ کے ساتھ دوڑتے چلے آ رہے ہیں، وہ گھبرا گیا اور شرمسار ہوا اور عرض کیا کہ ''امیر المومنین! آپ نے مجھے بتا کیوں نہ دیا تاکہ مجھ سے یہ گستاخی اور بے ادبی سرزد نہ ہوتی'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''کوئی بات نہیں، تم اپنا بیان جاری رکھو۔'' اسی عالم میں مسجد نبوی میں پہنچے، لوگ قاصد کی آمد کی اطلاع پا کر مسجد میں جمع ہو گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا خط پڑھ کر سنایا اور ایک مختصر مگر پراثر تقریر کی:

> ''میری خواہش ہے کہ میں لوگوں کی تمام ضروریات پوری کر دوں تاکہ ہم سب برابر ہو جائیں۔ مسلمانو! میں بادشاہ نہیں میں خدا کا غلام ہوں، البتہ بار خلافت میرے سر پر رکھا گیا ہے، اگر میں اس طرح تمہارا کام کروں کہ تم چین سے گھروں میں سوؤ تو میری سعادت ہے، اور اگر میری خواہش یہ ہو کہ تم میرے دروازے پر حاضری دو تو یہ میری بدبختی ہے۔ اس وقت مجھے خوشی کم ہو گی اور غم زیادہ میں تم کو تعلیم دینا چاہتا ہوں لیکن قول سے نہیں بلکہ عمل سے۔''

کیا کسی سکندر اعظم، کسی اٹیلا، کسی چنگیز خاں، کسی ہلاکو، کسی تیمور لنگ، کسی نپولین نے ایسی عظیم فتح پر ایسی عظیم انکساری، خدا کی غلامی اور احساس ذمہ داری کا برملا اظہار کیا؟ تاریخ کے صفحات خاموش ہیں۔

بابل، کوثی اور بہرہ شیر (۱۵ھ......۶۳۶ء)

قادسیہ میں تقریباً دو ماہ قیام کرنے کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بابل کی طرف پیش قدمی کی وہاں جمع شدہ ایرانی فوج کو شکست دے کر منتشر کر دیا، پھر ایرانی دارالسلطنت مدائن کی طرف بڑھے، کوثی کی فتح کے بعد بہرہ شیر (مغربی مدائن) کا محاصرہ کر لیا جو کئی ماہ جاری رہا، وہاں کسریٰ کے خوفناک شیر نے ہاشم بن عتبہ پر حملہ کیا اور تلوار کے ایک ہی وار میں دو ٹکڑے ہوا۔ آخر ایرانیوں نے شہر خالی کر دیا۔ نواحی علاقوں کے مرزبانوں، دہقانوں نے اطاعت قبول کر لی اور سب کو امن دے دیا گیا، شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا کسی کو لونڈی غلام نہیں بنایا گیا۔ سعد رضی اللہ عنہ نے مدائن خاص کا رخ کیا۔

مدائن کی فتح (صفر ۱۶ھ...... مارچ ۶۳۷ء)......دجلہ میں گھوڑے دوڑا دیئے

مدائن مدینہ کا تثنیہ ہے مطلب ہے دو شہر...... دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر آباد شہر کو بہرہ شیر اور مشرقی کنارے پر آباد شہر کو خاص مدائن کہا جاتا تھا۔ اصل پایہ تخت وہی تھا ان دونوں شہروں کے پرانے نام سلوقیہ اور ایک اور شہر کا تھے۔ دجلہ پر پل تعمیر کر کے دونوں کو ملا دیا گیا تھا۔ اس لئے عرب اسے مدائن (دو شہر) کہتے تھے۔ مسلمانوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے ایرانیوں نے دریائے دجلہ کا خوبصورت اور عظیم پل جلا ڈالا جو بہرہ شیر (مدائن مغربی) کو مدائن (مشرقی) سے ملاتا تھا، قرب وجوار کے دوسرے پل بھی توڑ دیئے اور گھاٹ پر سے کشتیاں بھی ہٹالیں، دریائے دجلہ کی طغیانی شباب پر تھی، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دریا کے کنارے پہنچ کر قدرے توقف کیا، صورت حال کا جائزہ لیا، دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے پھر حسبنا اللہ ونعم الوکیل کہہ کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ سپہ سالار کی دیکھا دیکھی تمام مجاہدین نے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے، وہ دریا میں اس طرح باہم اطمینان سے باتیں کرتے ہوئے چل رہے تھے جیسے زمین پر چل رہے ہوں۔ کسی جانی و مالی نقصان کے بغیر پوری فوج بڑے اطمینان سے دریا کے پار پہنچ گئی، گھاٹ پر تعینات ایرانی فوجی دستے یہ منظر حیرت واستعجاب سے دیکھ رہے تھے، ان کی آنکھوں کو یقین نہ آیا کہ طوفانی دریا کو گھوڑوں پر بیٹھ کر عبور کرنے والے انسان ہیں، ان کی اکثریت دیواں آمدند دیواں آمدند[1] (جن آگئے جن آگئے) کہتی ہوئی بھاگ گئی، صرف خرزاد نامی ایک افسر نے معمولی سا مقابلہ کیا ایرانی

[1] دنیا کی تاریخ میں یہ حیرت انگیز اور بے مثال واقعہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب افریقہ فتح ہوا اور مسلمان فوج بحر اوقیانوس کے کنارے پہنچ گئی تو سپہ سالار حضرت عقبی بن نافع نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا تھا اور کہا تھا کہ اے اللہ! اب یہاں زمین کی حد ختم ہو گئی ورنہ میں تیرے دین کی خاطر آگے بڑھتا جاتا، اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

گئے گزرے زمانے میں بھی جب کسی مسلمان حکومت سے مدد نہ پا کر جلال الدین خوارزم شاہ بالآخر چنگیز خان کی فوجوں سے شکست کھا کر ہندوستان کی طرف بھاگا اور دو سو فٹ اونچی چٹان سے دریائے سندھ میں گھوڑے سمیت چھلانگ لگا دی تو چنگیز خاں اور اس کی فوج کو تعاقب کی جرأت نہ ہوئی۔ چنگیز خاں نے بے اختیار کہا کہ آفرین ہے اس ماں پر جس نے ایسا بیٹا جنا۔ مؤلف

شہنشاہ یزدگرد اپنے اہل وعیال اور خزانوں کو لے کر حلوان بھاگ گیا، ایرانی امراء ورؤسا اور آبادی کی اکثریت بھی شہر کو خیرباد کہہ گئی، اسلامی افواج مدائن کسریٰ میں فاتحانہ شان سے داخل ہوگئیں۔ جو لوگ وہاں رہ گئے تھے، انہیں امان دی گئی۔ ایوان کسریٰ کو مسجد میں تبدیل کردیا گیا، اب وہ کبھی دوبارہ تخت گاہ کسریٰ نہ بنے گا۔

اگرچہ یزدگرد جو خزانے اور قیمتی مال واسباب لے جاسکتا تھا، لے گیا تھا، پھر بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو کسریٰ کے خزانوں سے تیس ارب روپے کے مساوی زر نقد ملا۔ بیش قیمت دوسرا سامان، جواہرات، زرکار ملبوسات، جواہرات سے مزین زرہیں، تلواریں، طلائی ظروف، عدیم المثال نوادرات، عجائبات اور نایاب تاریخی یادگاریں، سونے، چاندی کے اونٹ، گھوڑے وغیرہ مستزاد تھے۔ خمس کے ساتھ تاریخی نوادر خلیفہ کی خدمت میں روانہ کیے گئے۔ ان میں نوشیرواں کے شاہی ملبوسات، زیورات اور مشہور زمانہ تخت بہار بھی تھا۔ اہل مدینہ کی کثرت رائے تخت بہار کو محفوظ رکھنے کے حق میں تھی لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زور دیا کہ اسے بھی ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کردیا جائے۔ چنانچہ حکومت ایران اور خاندان ساسان کی طرح تخت بہار کو بھی خزاں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تخت بہار کا جو ٹکڑا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا وہ بیس ہزار درہم میں فروخت ہوا جو آج کے حساب سے تقریباً ایک لاکھ روپے ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق نوشیرواں کے کنگن سراقہ بن جعشم رضی اللہ عنہ کو پہنائے گئے اور اس کے مختلف زرکار ملبوسات اور تاج زرنگار محلم کو دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور ساتھ ہی عبرت کا سماں پیدا ہو گیا۔

غنیمت اور نوادر کی کثرت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر رقت طاری ہوگئی۔ انہوں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر بڑے پرسوز لہجے میں کہا "اے اللہ! تو نے یہ سب کچھ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیا حالانکہ وہ تجھے مجھ سے زیادہ عزیز تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی اس سے محروم رکھا حالانکہ وہ بھی تجھے مجھ سے زیادہ عزیز تھے۔ لیکن اب یہ انعامات تو نے مجھے ارزانی فرمائے ہیں بارالہا! میں پناہ مانگتا ہوں کہیں یہ میری آزمائش تو نہیں کی جارہی؟" فتوحات کے اس نقطۂ عروج پر بھی وہ اپنے خالق ومالک کو نہیں بھولے نہ اپنی بندگی وبے چارگی کو۔ وہ مسلمان فوج کی بے مثال دیانت سے بھی متاثر ہوئے کہ ایسی بیش قیمت چیزیں بلاکم وکاست لاکر پیش کردیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "امیر المومنین! جب آپ بددیانتی سے بچتے ہیں تو رعایا بھی بچتی ہے۔"

یہ انگریزی مثل درست ہے کہ کرپشن اوپر سے شروع ہوتی ہے اور عربی کہاوت کے مطابق عوام اپنے حکمرانوں کے دین پر چلتے ہیں۔ شیخ سعدی کہتے ہیں کہ اگر بادشاہ نیم بیضہ بھی ظلم وزبردستی سے لے لے تو اس کے لشکری ہزاروں مرغ ہڑپ کر جاتے ہیں۔

ہر مجاہد کے حصے میں بارہ بارہ ہزار درہم آئے۔ شجاعت وجانبازی کے نمایاں کارنامے سرانجام دینے والوں کو مزید انعامات دیے گئے۔

اگر یزدگرد مدائن سے نکلنے کے بعد جنگی کارروائیوں سے باز آجاتا اور مقبوضہ اسلامی علاقوں میں شورشیں اور

بغاوتیں نہ کرواتا رہتا تو مسلمان مدائن سے آگے نہ بڑھتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو مزید پیش قدمی کی اجازت نہیں دے رکھی تھی۔ مؤخر الذکر کو ہر پیش قدمی کے لئے وجہ بیان کر کے اجازت لینی پڑتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ''کاش ہمارے اور ایرانیوں کے درمیان آگ کا دریا حائل ہوتا۔ نہ ہم ان کی طرف بڑھ سکتے نہ وہ ہماری طرف۔'' فلسطین، شام، مصر، طرابلس (لیبیا) مسلمانوں کے قبضے میں آجانے کے بعد قیصر روم نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور دربار خلافت سے باقاعدہ خط و کتابت اور تحائف کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ عہد فاروقی میں مسلمانوں نے بازنطینی علاقوں پر اس کے بعد جارحانہ پیش قدمی نہیں کی۔ لیکن نوجوان، ناتجربہ کار اور متکبر یزدگرد نے حالات سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ وہ ایک جگہ سے شکست کھا کر بھاگتا اور دوسری جگہ لشکر آرائی کرنے لگتا۔

جنگ جلولا (ذی قعدہ ۱۶ ہجری...... دسمبر ۶۳۷ء)

مدائن کی فتح کے نو ماہ بعد وہاں سے جانب شمال تقریباً سو میل دور جلولا کے مقام پر سخت خونریز معرکہ پیش آیا اور یہ مستحکم قلعہ فتح ہو گیا۔ تین کروڑ کا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

خمس کو دیکھ کر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ رو پڑے

جب مالِ غنیمت کا خمس مدینہ پہنچا تو درہم و دینار اور لعل جواہر کے انبار دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ لوگوں نے کہا کہ ''امیر المومنین! یہ تو خوشی اور شکر کا موقع ہے نہ کہ رونے کا! فرمایا ''میں اس لئے روتا ہوں کہ جہاں دولت آتی ہے وہاں رشک و حسد بھی ساتھ چلے آتے ہیں اور پھر قوم کا وقار اٹھ جاتا ہے۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد کے واقعات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اندیشے کو درست ثابت کر دیا۔

جلولا عراق کا آخری سرحدی مقام تھا۔ خلیفۂ ثانی اس سے آگے خالص عجمی آبادی کے علاقوں میں نہیں بڑھنا چاہتے تھے۔ وہ فتح ممالک کے مقابلے میں مسلمانوں کی جانوں کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ لیکن حالات و واقعات نے مزید پیش قدمیوں پر مجبور کر دیا۔

حلوان، ابلہ، شط العرب، تکریت، جزیرہ وغیرہ۔ بصرہ کی بنیاد

چنانچہ جلولا کے بعد حلوان کی فتح سے عراق کی فتح مکمل ہو گئی۔ یزدگرد رے کی طرف بھاگ گیا۔ پھر ابلہ کو از سرنو فتح کیا گیا۔ شط العرب کا ڈیلٹائی علاقہ، نیز خوزستان اور فارس کے سرحدی علاقے فتح ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے مشہور صحابی اور فاتح ابلہ و شط العرب حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے شہر بصرہ کی بنیاد ڈالی جس نے آگے چل کر ابلہ کی جگہ لے لی۔ تکریت میں دشمن کی فوجوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ حضرت عمر کی اجازت سے حملہ کر کے دشمن کی بہت بڑی فوج کو تباہ کر کے قلعہ فتح کر لیا گیا۔ کچھ توقف کے بعد حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ نے جزیرہ[1] کا

[1] فرات اور دجلہ کے درمیانی شمالی علاقے کو جزیرہ کہا جاتا تھا۔ اس کی شمالی سرحد بازنطینی مقبوضات سے مل جاتی تھی اور جنوبی سرحد عراق سے مؤلف۔

علاقہ فتح کیا جس میں رقہ، حران ہیت، نصیبین، میافارقین، سمساط، سروج اور قرقیسیا وغیرہ شہر اور قلعے شامل تھے۔ سبھی جگہ اسلام یا جزیہ قبول کرنے والوں کو امان دی گئی۔ متعدد ایرانی مرزبانوں اور رؤسا نے اسلام قبول کر لیا۔

یزدگرد حلوان سے نکل کر رے[1] اور پھر مرو پہنچ گیا۔ عراق عرب اور جزیرہ مسلمانوں کے قبضے میں تھے لیکن وسیع ایرانی سلطنت جو فارس، خوزستان، طبرستان، خراسان، آذربائی جان، آرمینیہ، کرمان، سیستان، مکران وغیرہ وسیع صوبوں پر مشتمل تھی، جوں کی توں برقرار تھی اور یزدگرد کا حکم وحشم بھی وہاں برقرار تھا۔ اب بھی ایرانی رعایا اسے خدا کی طرف سے مقرر کردہ شہنشاہ سمجھتی تھی اور اس کے شاہی خاندان کو تقدیس کا درجہ حاصل تھا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف برابر اشتعال انگیزی اور شورش آفرینی میں مشغول تھا اور حملہ کے لئے فوجیں جمع کر رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ، بصرہ اور موصل کی مستقل چھاؤنیاں قائم کر دیں تاکہ یزدگرد اور اہل ایران کے حملوں سے نپٹا جا سکے۔

خوزستان[2] (۱۶-۱۷ ہجری...... ۶۳۷-۶۳۸ء)

ایرانی صوبہ خوزستان کی سرحد بصرہ کی چھاؤنی سے ملتی تھی۔ اس کے شہر اہواز اور رام ہرمز بصرہ سے زیادہ دور نہ تھے۔ اہواز کا مرزبان[3] ہرمزان بہت طاقتور تھا۔ اس نے اسلامی مقبوضات پر حملے شروع کر دیئے۔ سخت جنگ کے بعد اسے حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے شکست دی اور وہ مشرق کی طرف بھاگ گیا۔ اہواز پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ پھر سوس اور رام ہرمز بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ ہرمزان بھاگ کر اہواز سے پچاس میل دور شوستر میں قلعہ بند ہو گیا اور مسلمان کے خلاف جنگی تیاریاں کرنے لگا۔ بصرہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے شوستر پر حملہ کیا۔ سخت کشت وخون کے بعد ہرمزان نے اس شرط پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا کہ خود خلیفہ اس کی قسمت کا فیصلہ کریں۔ چنانچہ مالِ غنیمت کے خمس کے ساتھ اسے مدینہ روانہ کر دیا گیا۔

ہرمزان کا واقعہ

ہرمزان۔ سابق مرزبان یا شاہ خوزستان اپنے بیش قیمت شاہانہ لباس پر دیبا کی قبا زیب تن کئے، سر پر تاج مرصع، ہاتھوں میں جڑاؤ طلائی کنگن پہنے اور خالص سونے کا عصا جس میں یاقوت اور موتی جڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں لئے اپنے متبعین کے ساتھ بڑی شان وشوکت سے مدینہ میں داخل ہوا اور خلیفۂ وقت کے بارے میں پوچھا۔ بہت سے لوگ اسے دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ خلیفہ مسجد میں ہیں۔ جب وہ وہاں پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد کے فرش خاک پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ عمر رضی اللہ عنہ جس کے رعب وجلال سے روم اور ایران کی

---

[1] ایران کا موجودہ دارالحکومت تہران اسی کے کھنڈرات کے قریب آباد ہوا۔ رے میں بڑے بڑے مسلمان حکما، علما، فضلا، مفسر وغیرہ پیدا ہوئے جو رازی کہلائے۔ مثلاً امام فخر الدین رازی، زکریا رازی وغیرہ۔ مؤلف

[2] عراق عرب اور فارس کے درمیان واقع علاقے کو خوزستان کہا جاتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا شہر اہواز تھا جو آج کل تیل کے کارخانوں کی وجہ سے بہت اہمیت اور شہرت حاصل کر چکا ہے۔

[3] مرزبان ایرانی شہنشاہ کے تحت اپنے صوبے کے تقریباً خود مختار بادشاہ ہوتے تھے ضرورت کے وقت فوج وغیرہ سے شہنشاہ کی مدد کرتے تھے۔ مؤلف

سلطنتیں لرزہ براندام رہتی تھیں۔ اسے پیوند لگے موٹے جھوٹے کپڑوں کے ساتھ مسجد کے گرد آلود فرش پر بغیر کسی محافظ و حاجب کے دیکھ کر ہرمزان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے شہنشاہ یزدگرد اور خود اپنی شان و شوکت اور جاہ و طمطراق کا درہ بدست عمر رضی اللہ عنہ کی سادہ و غریبانہ وضع قطع سے مقابلہ کیا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ شخص جو اس کے سامنے فرش خاک پر بیٹھا ہے اور کوئی محافظ، خدمت گار وغیرہ بھی اس کے پاس نہیں، چہ جائیکہ وہ کوئی قصر شاہی اور پرشکوہ دربار رکھتا ہو، فی الواقع خلیفہ ہے جس کے حکم کے ماتحت خالد رضی اللہ عنہ، مثنیٰ رضی اللہ عنہ، سعد رضی اللہ عنہ، ہاشم رضی اللہ عنہ، قعقاع رضی اللہ عنہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ وغیرہ ایران کی ہزار سالہ عظیم الشان سلطنت کو پارہ پارہ کئے دیتے ہیں اور رومیوں کو بھی جنگل کے خرگوشوں، گیدڑوں کی طرح مار مار کر بھگا رہے ہیں۔ ایک دہشت سی اس پر طاری ہو گئی۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا۔ تاہم اس نے اپنے حواس کو برقرار رکھا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اس شخص کو پیغمبر ہونا چاہئے اور اگر یہ پیغمبر نہیں تو اس کا عمل ضرور پیغمبروں جیسا ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کے زرّیں تاج، زرق برق لباس اور بیش قیمت زیورات پر ایک اچٹتی سی بے پروایانہ نظر ڈالی اور حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ ''یہ دنیائے دوں کی دلفریبیاں ہیں۔'' پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ مرغ زرّیں پروبال ہرمزان ہے تو سخت برافروختہ ہوئے کیونکہ وہ مسلمانوں سے بار بار بدعہدی کر چکا تھا۔ اور شوستر کی جنگ میں دو بلند مرتبہ صحابی اس کے ہاتھوں شہید ہو چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اسے قتل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ فرمایا:......

''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تجھے اور تیرے جیسوں کو ذلیل کیا۔ کیا تیرے پاس اپنی بار بار کی بدعہدی کا کوئی جواز ہے؟''

ہرمزان نے ایسے ظاہر کیا جیسے وہ بہت پیاسا ہے اور پیاس کے مارے بول بھی نہیں سکتا۔ اس نے پینے کے لئے پانی مانگا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اسے پانی پلایا جائے۔

ہرمزان نے کانپتے ہوئے کہا

''اے خلیفہ! میں ڈرتا ہوں کہ پانی پینے کے دوران میں قتل کر دیا جاؤں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی سادگی اور خلوص سے فرمایا:

''جب تک تو پانی نہیں پی لیتا۔ تجھے قتل نہیں کیا جائے گا۔''

ہرمزان نے پانی زمین پر گرا دیا اور کہا

''میں پانی نہیں پیوؤں گا۔ اس لئے آپ اپنے قول کے مطابق مجھے قتل نہیں کر سکتے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ شکست خوردہ ایرانی مرزبان کی چالاکی پر ٹپٹا گئے اور کہا

''تو نے مجھے دھوکا دیا تاہم تیرے کرتوتوں کی وجہ سے نہ میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں اور نہ قتل کر سکتا ہوں۔''

''اے خلیفہ! میں مسلمان ہونے کا ارادہ کر کے چلا تھا لیکن میں قتل کے خوف سے نہیں بلکہ اپنی آزادانہ مرضی سے مسلمان ہونا چاہتا تھا تاکہ مجھے جان بچانے کے لئے اسلام لانے والا منافق نہ سمجھا

جائے۔ اب چونکہ میری جان محفوظ ہوگئی میں اپنی خوشی سے مسلمان ہوتا ہوں۔''

ہرمزان مسلمان ہوگیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کے اسلام لانے سے خوشی ہوئی۔ وہ اور اس کے ساتھی مدینہ میں مقیم ہوگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا دو ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ وہ اس پر اعتماد کرنے لگے اور اکثر فارس کی مہمات کے سلسلے میں اس سے مشورہ لیتے تھے۔ ہرمزان کی گرفتاری، مدینہ آمد اور ایمان لانے کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ آگے چل کر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کی سازش کا مرکز بن گیا۔ بہرحال شان فاروقی یہ تھی کہ ہرمزان جیسا شخص بھی جب مغلوب اور گرفتار ہو کر مدینہ آیا تو نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ اس کی سابق حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

سوس، رامہرمز، تستر وغیرہ اہم شہر فتح ہوگئے۔

جندی سابور کا واقعہ......غلام کی امان

شوستر کے مسلمانوں نے جندی سابور کا محاصرہ کر لیا جو خوزستان کا آخری شہر تھا، کچھ عرصہ بعد ایک دن اچانک اہل شہر نے دروازے کھول دیئے اور اطمینان و دل جمعی سے معمول کے مطابق اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے۔ مسلمانوں کو تعجب ہوا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے ایک غلام نے جو وہیں کا اصلی باشندہ تھا۔ جزیہ ادا کرنے کی شرط پر اہل شہر کو خفیہ طور پر اپنی طرف سے امان نامہ لکھ دیا تھا اسلامی فوج کے سپہ سالار حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے غلام کی امان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن اہل شہر کے اصرار پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے استصواب کیا۔ انہوں نے لکھا کہ مسلمانوں کے مسلمان غلام نے جسے امان دے دی، وہ تمام مسلمانوں کی طرف سے امان سمجھی جائے، چنانچہ اہل شہر ذمی قرار دے دیئے گئے۔ اس سے قبل ابوعبید ثقفی رحمۃ اللہ علیہ کے وقت بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اللہ! اللہ! ایک وہ زمانہ تھا کہ غلام کی دی ہوئی امان کو خلیفۂ وقت تسلیم کرتا تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ سربراہان مملکت اپنے کئے ہوئے معاہدوں کا پاس نہیں کرتے۔

جنگ نہاوند (۲۱ھ......۶۴۲ء)

یزدگرد نے ایرانی صوبہ خراسان کے شہر مرو کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا۔ خوزستان ہاتھ سے نکل جانے اور ہرمزان کے گرفتار ہو جانے سے وہ رنج و غصہ سے بھر گیا۔ اس کے حکم سے تمام چھوٹے بڑے دہقان، مرزبان اور جاگیردار اپنی اپنی فوجیں لے کر پہنچ گئے۔ کرمان، مکران، سیستان اور سندھ تک ہلچل مچ گئی اور وہاں سے بھاری کمک پہنچ گئی۔ ڈیڑھ لاکھ سے زائد فوج جمع ہوگئی جس کا سپہ سالار مشہور ایرانی جرنیل فیروزان (مردان شاہ) تھا جو قادسیہ میں بھی مسلمانوں کے خلاف لڑ چکا تھا۔ مسلمانوں سے آخری فیصلہ کن جنگ کے لئے اس فوج نے نہاوند کا رخ کیا۔ کوفہ کے گورنر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کو صورت حال سے مطلع کیا۔ موقع کی نزاکت اور اہمیت کے پیش نظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ نے مشورہ دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود سالار لشکر بن کر جائیں۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف مشورہ دیا اور فرمایا کہ ''اگر شام، بصرہ وغیرہ سے فوجیں ہٹالی گئیں تو وہاں

زیادہ سے زیادہ دشمن کے قبضہ کا اندیشہ ہوسکتا ہے لیکن اگر آپ نے مدینہ سے نکل کر عجم کا رخ کیا تو اندرون عرب شورش وبغاوت بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ہوئی تھی، اور پھر اہل عجم بھی یہ جان کر کہ آپ عرب کے سربراہ ہیں اپنا سارا زور قوت آپ کو ختم کرنے پر صرف کردیں گے۔ خدانخواستہ اگر آپ کو کچھ ہوگیا تو حالات سراسر بگڑ جائیں گے۔ آپ مدینہ ہی میں رہیں اور یہاں سے مجاہدین بھیجنے کے علاوہ شام، یمن، کوفہ، بصرہ وغیرہ سے ایک ایک تہائی فوج نہاوند کے محاذ پر بہ سرعت تمام بھیجنے کے احکام متعلقہ حکام کے نام جاری کردیجئے اور عرب کی چکی کو حرکت دیتے رہیے۔''[1]

کوہ الوند (البرز) کے دامن میں ایرانیوں اور مسلمانوں کی آخری بڑی اور فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ تیس ہزار مسلمان مجاہدین کے سپہ سالار حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ تھے۔ قادسیہ کی لڑائی کے سوا ایرانیوں سے عہد خلافت میں ایسی خونریز اور مہیب جنگ کوئی اور نہیں ہوئی۔ طرفین جی توڑ کر لڑے۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ خون کا سیلاب بہنے لگا۔ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کا گھوڑا پھسلا اور وہ خود بھی گرے، تاہم لڑتے رہے اور شدید زخمی ہوگئے۔ ان کے بھائی حضرت نعیم بن مقرن رضی اللہ عنہ نے جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کی امتیازی کلاہ اور قبا پہن کر انہیں کے گھوڑے پر سوار ہوکر فوج کی کمان کرنے لگے۔ سب یہی سمجھے کہ خود نعمان رضی اللہ عنہ کمان کررہے ہیں۔ نعمان رضی اللہ عنہ نے ہدایت کردی کہ اگر میں مر بھی جاؤں تو کوئی شخص لڑائی چھوڑ کر میری طرف متوجہ نہ ہو۔ اتفاق سے ایک مجاہد قریب سے گزرا۔ دیکھا تو کچھ سانس باقی تھی۔ گھوڑے سے اتر کر ان کے پاس بیٹھنا چاہا مگر ان کا حکم یاد آ گیا۔ اسی طرح چھوڑ کر چلا گیا۔ فتح کے بعد معقل نامی ایک مجاہد ان کے سرہانے پہنچا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ پوچھا کیا انجام ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ خدا کا شکر ادا کرکے کہا کہ فوراً خلیفہ کو اطلاع دو۔ اور پھر ان کی روح جنت کی طرف پرواز کرگئی۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را! اللہ، اللہ! یہ عزم واستقلال یہ صبر وثبات، یہ جذبۂ ایمان وایثار کہ ہر چھوٹے بڑے کے دل ودماغ میں ایک ہی دھن سمائی ہوئی تھی کہ اللہ کے دین کا ہر قیمت پر بول بالا کیا جائے۔ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی!

نہاوند کے مستحکم قلعہ نے مسلمانوں کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فتح کی خوشخبری پاکر خوش ہوئے لیکن حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر بے اختیار رو پڑے اور دیر تک سر پر ہاتھ رکھ کر روتے رہے۔ دیکھنے والوں کے لئے ان کی رقیق القلبی کا یہ مظاہرہ ایک نئی چیز تھی۔

نہاوند کی فتح کو ''فتح الفتوح'' کہا جاتا ہے۔ جو حیثیت عراق عرب کی فتح میں قادسیہ کے معرکہ کو حاصل تھی۔ وہی حیثیت فارس اور عراق عجم کی فتح میں جنگ نہاوند کو حاصل ہوگئی۔ ایرانیوں کی اصل قوت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی اور ایشیا کے ایک بہت بڑے خطے کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا۔ یزدگرد کی زندگی تک بعد میں بھی لڑائیاں ہوتی رہیں لیکن اتنے بڑے پیمانے پر پھر کبھی ایرانی مقابلے پر نہ آسکے۔ قادسیہ، جلولا اور نہاوند تین بڑے اور فیصلہ کن معرکے تھے۔

---

[1] عمر فاروق اعظم از محمد حسین ہیکل۔ الفاروق (شبلی) تاریخ اسلام حصہ اول (شاہ معین الدین احمد ندوی) نہج البلاغہ (اردو ترجمہ نیرنگ فصاحت از سید ذاکر حسین اثنا عشری)

ایرانی قوت کے انہدام کے تین مرحلے!

کاشتکاروں کو جزیہ اور خراج کی ادائیگی پر زمینوں پر بحال رکھا گیا۔ انہیں زراعت کے لئے سہولتیں دی گئیں۔ ذرائع آبپاشی کو ترقی دی گئی لوگوں کی مذہبی آزادی برقرار رکھی گئی متروکہ شاہی زمینیں اور بھگوڑے ایرانی امراء کی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ اوران پر عشر عائد کیا گیا۔ جو ایرانی اپنی مرضی سے مسلمان ہوئے انہیں عرب مسلمانوں کے برابر حقوق دیئے گئے۔

ایران پر حملۂ عام (۲۱ ہجری......۶۴۲ء)

عراق عرب، خوزستان اور عراق عجم مسلمانوں کے زیر نگیں آچکے تھے مگر جونہی موقع ملتا یزدگرد اور اس کے امراء کی انگیخت پر ان علاقوں کے باشندے بغاوت کر دیتے۔ مفتوحہ علاقے کئی بار مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلے اور کئی بار فتح کرنے پڑے۔ مثلاً قادسیہ کی جنگ سے ہرمزان جان بچا کر بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ بار بار مسلمانوں کے مقابلے پر آتا اور شکست کھا کر جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کرتا رہا۔ آخر جب وہ گرفتار کر کے مدینہ بھیجا گیا تو اسے اور مالِ غنیمت لے جانے والے وفد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور احنف بن قیس رضی اللہ عنہ شامل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ ایرانی بار بار بدعہدی کر کے ہمارے خلاف بغاوت کرتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم لوگ ذمیوں سے بدسلوکی اور ناانصافی کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ امیر المومنین! یہ بات نہیں۔ ہم ان سے عدل و دیانت کا سلوک کرتے ہیں جیسا کہ اسلام کا اور آپ کا حکم ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ آپ کا حکم ہے کہ ہم پیش قدمی کر کے ایران کے اندرونی علاقوں پر حملہ آور نہ ہوں۔ ہر شکست کے بعد ایرانی بادشاہ اندرونی علاقوں کی طرف بھاگ جاتا ہے۔ جب تک وہ اہل ایران میں موجود ہے۔ وہ انہیں بغاوت پر اکساتا رہے گا اور بار بار اطاعت قبول کر کے بار بار بغاوت کرتے رہیں گے۔ جب تک ایرانی اپنے بادشاہ سے بالکل مایوس نہیں ہو جائیں گے۔ فتنہ و بغاوت کی آگ سرد نہیں پڑے گی۔ آپ پیش قدمی پر سے پابندی ہٹالیں تو ہم یزدگرد کو مملکت ایران سے نکال دیں گے یا اس کا خاتمہ کر دیں گے۔ جب بانس نہیں رہے گا تو بانسری بھی نہیں بجے گی۔

نومسلم ہرمزان نے بھی ان خیالات کی تائید کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بادل ناخواستہ ایران پر عام فوج کشی کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے ایران کے مختلف حصوں کے لئے الگ الگ فوجیں تیار کیں اور ان کے الگ الگ سپہ سالار مقرر کئے۔ اس وقت یزدگرد خراسان میں مقیم تھا۔ احنف بن قیس کو خراسان کی مہم پر مقرر کیا گیا۔ وہ ایک صاحب تدبیر اور بہادر جرنیل تھے۔ مجاشع بن مسعود کو اردشیر اور سابور، عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو اصطخر، ساریہ بن زنیم رضی اللہ عنہ کو افسا، سہیل بن عدی رضی اللہ عنہ کو کرمان، عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ کو سیستان، حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مکران اور عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ کو آذربائیجان کی مہم سپرد کی گئی۔ بعض مخصوص مقامات کے لئے بھی الگ الگ افسر مقرر کئے گئے۔ کوفہ ان تمام جنگی مہمات کا مرکز ٹھہرا۔ بصرہ سے بھی کمک طلب کی گئی۔ سالاران لشکر اپنے اپنے اہداف کی طرف روانہ ہو

گئے کہیں کم کہیں شدید مزاحمت پیش آئی۔ یکے بعد دیگرے اصفہان، ہمدان، (بغاوت کے بعد از سر نو) قزوین، زنجان رے، طبرستان، آذربائیجان، آرمینیہ، فارس، خراسان، کرمان، سیستان، مکران کے وسیع علاقے فتح ہو گئے بلکہ مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں ان سے بھی آگے سنی گئیں۔ بلاذری کی روایت کے مطابق عہد فاروقی ہی میں مسلمانوں کے قدم سندھ کے تاریخی شہر دبیل اور تھانہ تک (بمبئی کے نزدیک) پہنچ گئے۔ ان فتوحات کے دوران میں شاذ و نادر ہی کسی کو لونڈی غلام بنایا گیا، اگر ایسا ہوا بھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے انہیں آزاد کر دیا گیا۔ معاہدوں میں اکثر اس قسم کی شرائط لکھی گئیں:

> ''تم میں سے جس کسی سے ہم کوئی مدد لیں گے یہی اس کا جزیہ ہوگا۔ اس سے اور کچھ وصول نہیں کیا جائے گا۔''[1]

اس سے جزیہ کی اصل حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ آرمینیہ کے گورنر شہر براز نے فوجی امداد دینے کا وعدہ کیا تو اسے بھی جزیہ معاف کر دیا گیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم

آرمینیہ کی فتح کے بعد جب مسلم سپہ سالار حضرت عبدالرحمٰن بن ربیعہ رضی اللہ عنہ نے ترکوں کی مملکت خزر کی طرف پیش قدمی کی تو شہر براز کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے کہا کہ ''ہم تو یہی غنیمت سمجھتے ہیں کہ ترک ہمیں باب ہی میں رہنے دیں اور ہماری طرف چڑھ کرنہ آئیں۔'' حضرت عبدالرحمٰن نے جواب دیا کہ ''ہم ان کے گھروں میں گھسے بغیر دم نہیں لیں گے۔ خدا کی قسم! ہمارے ساتھ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہمارا امیر ہمیں اجازت دے تو میں ان کو لے کر روم پہنچ جاؤں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں جو بڑے خلوص کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکلے ہیں یہ سدا عزت و احترام کے مرکز و مرجع رہیں گے۔ اور فتح و نصرت ان کے قدم چومتی رہے گی۔'' یہ تھے صحابہ کرام سورہ الصف کی آیت ۴ کے مصداق۔ ''اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔'' لیکن ابھی انہوں نے بیضا[2] فتح کیا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا اور حضرت عبدالرحمٰن واپس ہو گئے۔ عہد عثمانی میں انہوں نے اس علاقہ پر دوبارہ حملہ کیا اور فتح یاب ہوئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ:- غذا میں عامتہ المسلمین کے ساتھ مساوات

آذربائیجان بحیرہ خزر (کاسپین) کے مغرب میں ایران کا انتہائی شمال مغربی صوبہ جس کا ایک بڑا حصہ اب روس کے قبضے میں ہے کے فاتح حضرت عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ مدینہ آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے ساتھ کھانے پر بٹھایا۔ جو کی روکھی سوکھی روٹی، زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک ایران و روم کو رعشۂ سیماب دینے والے

---

[1] ملاحظہ ہو معاہدۂ جرجان (طبرستان)۔ تاریخ طبری۔ اسی طرح دوسرے شہروں اور صوبوں کے متعلق معاہدے تاریخ میں موجود ہیں جن میں مذہبی آزادی کے علاوہ جان و مال و عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دی گئی ہے۔ مؤلف

[2] مشہور مفسر قرآن علامہ بیضاوی کا مولد

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دستر خوان پر پیش کیا گیا۔ عتبہ رضی اللہ عنہ کے حلق سے لقمہ نہ اترا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں کھایا جاتا تو نہ کھاؤ۔ انہوں نے کہا ''امیر المومنین! اللہ نے اب فراخی عطا کی ہے۔ آپ اپنا معیار خوراک بہتر کیوں نہیں بناتے؟ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت ہر شخص کو کم سے کم جو کی روٹی مل رہی ہے۔ میں گیہوں کی روٹی اس دن کھاؤں گا جب ہر شخص کو گیہوں کی روٹی ملنے لگے گی۔ بلاذری کے مطابق انہی عتبہ بن فرقد نے آذربائی جان سے آپ کو بہت سی مٹھائی بھیجی۔ آپ نے لانے والے سے پوچھا۔ کیا یہ چیز تمام مجاہدین نے سیر ہو کر کھالی ہے۔ اس نے جواب دیا نہیں یہ صرف آپ کے لئے ہے۔ اس پر آپ نے عتبہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ''یہ نہ تیری کوشش اور مشقت کا پھل ہے نہ تیری ماں کی کوشش و مشقت کا نہ تیرے باپ کی کوشش و مشقت کا۔ ہم ایسی کوئی چیز نہیں کھاتے جو تمام مسلمانوں کو میسر نہ ہو۔''

ساریہ رضی اللہ عنہ کی مہم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت

زمانۂ قدیم سے ایرانی تہذیب و ثقافت و تمدن و مذہب کے مرکز صوبہ فارس[1] کی فتح کے لئے نامزد کئے جانے والے سپہ سالاروں میں ایک حضرت ساریہ بن زنیم رضی اللہ عنہ کنانی بھی تھے۔ ان کی مہم کے دوران میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ معرکہ کارزار گرم تھا اور اس سے سینکڑوں میل دور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ میں برسر منبر خطبہ دے رہے تھے۔ خطبہ کے دوران میں اچانک انہوں نے یہ الفاظ کہے۔ ''ساریہ! پہاڑ کی طرف، پہاڑ کی طرف۔'' لوگوں کے پوچھنے پر بتایا کہ ''مجھے میدان جنگ کا نقشہ نظر آیا۔ میں نے دیکھا کہ ساریہ رضی اللہ عنہ اور اس کا لشکر کھلے میدان میں ہیں۔ کثیر التعداد دشمن ساریہ رضی اللہ عنہ اور اس کے لشکر کو گھیرے میں لینا چاہتا ہے۔ ساریہ اور اس کے لشکر کا بچاؤ اس میں ہے کہ وہ قریبی پہاڑ کی طرف ہٹ جائیں اور اسے اپنی پشت پر رکھیں۔ اس طرح دشمن صرف سامنے سے حملہ آور ہو سکے گا اور اللہ مسلمانوں کو کامیابی دے گا۔ اللہ کی فوجیں ہوتی ہیں۔ شائد ان میں سے کوئی میری بات ساریہ رضی اللہ عنہ تک پہنچا دے۔''[2] ساریہ رضی اللہ عنہ نے میدان جنگ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ سنے، پہاڑ کی طرف ہٹ آئے اور دشمن پر فتح یاب ہوئے۔

مولانا شبلی نے الفاروق میں جہاں بعض معرکوں کے ایسے ضمنی واقعات بیان کئے ہیں، اسے نظر انداز کر گئے ہیں۔ محمد حسین ہیکل کو اس کی صداقت میں شبہ ہے۔ غلام محمد پرویز اسے ایک وضعی روایت قرار دیتا ہے۔ اس کو راقم اہل مغرب کی سیاسی برتری کے تحت احساس کمتری کا رویہ کہتا ہے۔ ریڈیو نے آوازوں اور ٹیلی ویژن نے آوازوں کے ساتھ صورتوں اور حرکتوں کو بھی محفوظ کر دیا ہے اور پھر ٹیلی پیتھی (انتقال افکار) سے آج کون واقف نہیں۔ زمانۂ

---

[1] فارس دراصل پارس کا معرب ہے۔ پارس یا فارس سے اکثر پوری سلطنت ایران مراد لی جاتی تھی۔ فارسی زبان اسی صوبے سے منسوب ہے۔ جو ایرانی اپنے ملک سے نکل کر برصغیر ہندو پاکستان میں آکر آباد ہوئے وہ بھی پارسی کہلائے۔ مشہور صحابی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو بھی فارسی کہتے تھے اور آج تک یہ لاحقہ ان کے نام کا جزو ہے۔ اہل مغرب بھی پرشیا (فارس) سے سارا ایران مراد لیتے تھے۔ رضا شاہ پہلوی اول نے اپنے ملک کا سرکاری نام ایران قرار دیا۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ اور متعدد مشاہیر کا تعلق اسی صوبے سے تھا۔ (مؤلف)

[2] تاریخ طبری

حال کے بعض لوگوں نے اپنے ایسے تجربے بیان کیے ہیں اور راقم کے بھی ذاتی علم میں ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے سے یہ بحث طول پکڑ جائے گی۔ روس اور امریکہ تو اب جنگی مقاصد کے لئے ٹیلی پیتھی کے ذریعے دشمنوں کے دل و دماغ پر کنٹرول حاصل کرنے اور ان کے خیالات کو جاننے اور بدلنے کے لئے کامیاب سائنسی تجربے کر رہے ہیں اور وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں ان کی کوششوں کی جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں۔ اگر منظم اور سائنسی طریقے سے ایسا ممکن ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے انتقال افکار و اصوات کے امکانات بیکراں فضا میں رکھے ہیں۔ چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل و دماغ ہمیشہ محاذِ جنگ کی طرف لگے رہتے تھے اس لئے یہ عین ممکن ہے کہ شدت احساس کے باعث میدانِ جنگ کا نقشہ ان کے سامنے آ گیا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہبط وحی تھے۔ انہوں نے غزوۂ موتہ میں مسلمان سپہ سالاروں کی یکے بعد دیگرے شہادت کی خبر مسجد نبوی میں بیٹھے مسلمانوں کو دیدی تھی۔ ہندوؤں کی مہا بھارت اگرچہ دیو مالائی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ تاہم اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ کوروؤں کے اندھے باپ کوان کا گورو سنجے میدان جنگ کی خبریں گھر بیٹھے یوں سناتا تھا جیسے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آ رہے ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو خیر وہ عظیم ہستی ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہوتا۔'' آج بھی بہت سے معمولی انسانوں کو ایسے تجربات ہوتے ہیں کہ اچانک حجابات نظروں سے اٹھ گئے اور دور کے واقعات سامنے آ گئے۔ ایسے لوگوں میں سے دو ذمہ دار افسروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔

یزدگرد ترکستان میں

۲۳ ہجری فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی زندگی کا آخری سال تھا۔ اس سال کے دوران میں سلطنت ایران کے دور دراز صوبے کرمان، سیستان، مکران اور خراسان یکے بعد دیگرے فتح ہوتے چلے گئے۔ خاقان ترکستان ابتدا میں یزدگرد کی مدد کو آیا لیکن مسلمانوں کے حالات سن کر اور واقعات کا مشاہدہ کر کے نیز یہ دیکھ کر کہ وہ اس کے اپنے ملک پر حملہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے، واپس چلا گیا، اور یزدگرد کو مسلمانوں سے صلح کر لینے کا مشورہ دیا لیکن مسلمانوں سے صلح کرنے کی بجائے اس نے ایران کا شاہی خزانہ اور جواہرات لے کر خاقان کے ساتھ جانے کا ارادہ کیا۔ ایرانی امراء اس کے حق میں نہ تھے بلکہ وہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے صلح کر لی جائے۔ جب یزدگرد نہ مانا تو انہوں نے خزانہ چھین لیا اور یزدگرد خالی ہاتھ ترکستان کی طرف نکل گیا۔ ایرانی امراء نے حضرت احنف بن قیس سے صلح کر کے خزانہ ان کے حوالے کر دیا۔ جزیہ کی ادائیگی یا جنگی خدمت صلح کی شرط ٹھہری۔ کسی کو لونڈی غلام نہیں بنایا گیا۔ مذہبی آزادی برقرار رکھی گئی۔ کسانوں کو زمینوں پر متصرف رکھا گیا۔ اور عدل و مساوات کا اصول رائج کیا گیا۔ یزدگرد سلطنت ایران کی حدود سے نکل گیا اور خاقان کے پاس فرغانہ چلا گیا۔ تاہم گاہے گاہے سرحد کے پار ایرانیوں کو بغاوت پر اکساتا رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں اپنی ہی سابق رعایا کے ایک فرد کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ سکندر یونانی کا مدِ مقابل ایرانی شہنشاہ دارا ثانی اپنے ہی ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یزدگرد بھی

اپنی ہی رعایا کے ایک فرد کے ہاتھوں قتل ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقریر

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو احنف بن قیس کا فتح نامہ پہنچا تو انہوں نے مسجد نبوی میں مسلمانوں کو جمع کر کے فتح نامہ پڑھ کر سنایا اور پھر ایک مختصر اور موثر تقریر کی:-

''مسلمانو! آج مجوسیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب ان کے ملک کی چپہ بھر زمین بھی ان کے قبضہ میں نہیں رہی اور وہ مسلمانوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کے قابل نہیں رہے اللہ نے ان کی زمین، ان کے ملک اور ان کی دولت کا تمہیں وارث بنایا ہے تاکہ تمہاری آزمائش کرے، اس لئے تم اپنی حالت نہ بدلو اور راست کرداری پر ثابت قدم رہو ورنہ اللہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔ مجھے اس امت کے لئے خود اس امت کے لوگوں سے خوف معلوم ہوتا ہے۔'' [1]

سات سال میں بیشتر ایران فرات سے جیحوں تک عہد فاروقی میں فتح ہو گیا۔

فتح ایران پر ایرانیوں کا ردِ عمل

ایران کی فتح کا آغاز خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیشتر ایرانی صوبے مملکت اسلامیہ کا حصہ بن گئے۔ ایرانی شہنشاہ یزدگرد ایران سے فرار ہو گیا، عہد عثانی میں تسخیر ایران کا عمل تکمیل کو پہنچ گیا اور یزدگرد اپنی ہی رعایا کے ایک فرد کے ہاتھوں مارا گیا۔ آل ساسان کا کوئی فرد تخت ایران کا دعویدار باقی نہ رہا۔ اسلامی فوجوں کو خصوصی تاکید تھی اور اس پر سختی سے عمل کیا گیا کہ مفتوحین سے عدل و انصاف کا سلوک کیا جائے، کسی کو زبردستی مسلمان نہ بنایا جائے، کسانوں کو ان کی زمینوں پر بحال رکھا جائے، کسی کی مقبوضہ اراضی، جائیداد وغیرہ نہ چھینی جائے، لوگوں کے گھروں میں زبردستی نہ گھسا جائے، ان کی مذہبی آزادی برقرار رکھی جائے، انہیں ان کے اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے اور مذہبی رسومات بجالانے سے نہ روکا جائے، فاتح فوج کے افراد کو ایرانیوں سے قیمتاً زمینیں خریدنے کی بھی ممانعت کر دی گئی تاکہ کسی قسم کی زبردستی یا دباؤ کا شائبہ تک پیدا نہ ہو۔ صرف شاہی زمینیں اپنے تصرف میں لی گئیں یا وہ زمینیں جو آتش کدوں وغیرہ کی ملکیت تھیں اور موبدان انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے یا بڑے بڑے مرزبان، دہقان اور زمیندار چھوڑ کر چلے گئے، بھاگنے والوں کو بھی واپس آکر اپنی زمینوں، مکانوں وغیرہ پر قابض ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ زمینوں کی پیمائش وغیرہ کرا کر ان کی آمدنی کا منصفانہ اندازہ کر کے خراج عائد کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام میں خراج کے مخترع تھے۔ مسلمان لشکری ایرانیوں کی زیر کاشت زمینوں سے گزرتے ہوئے بھی کتراتے تھے مبادا ان کے گھوڑے یا اونٹ ان سے کچھ چر لیں، ایسے بعض واقعات کے معاوضے بھی دیئے گئے۔ عام قابل کار لوگوں پر معمولی جزیہ عائد کیا گیا، زمینوں کا خراج اس کے علاوہ تھا، جن لوگوں نے اسلامی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں کے دشمنوں کے خلاف لڑنا

[1] افسوس کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ مولف

پسند کیا، انہیں جزیہ کی ادائیگی سے بری قرار دے دیا گیا۔ جو اپنی خوشی سے بلا جبر و اکراہ مسلمان ہو گئے، وہ حقوق و فرائض میں دوسرے مسلمانوں کے مساوی ٹھہرے اور ان میں سے جو اہل نصاب پائے گئے وہ جزیہ کی بجائے زکوٰۃ کی ادائیگی کے مکلف ٹھہرے، اس طرح ایک نئے اور خوشحال اسلامی معاشرے کی داغ بیل ایران میں پڑی جو عدل و مساوات پر مبنی تھا۔

عدل و مساوات پر مبنی اس نرم، فیاضانہ اور غیر متعصبانہ سلوک کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے کسان اور عوام بلکہ دہقان اور مرزبان بھی جو بھاگ گئے تھے واپس آ گئے اور اکثریت نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا، مجوسیت، عیسائیت وغیرہ پر قائم رہنے والوں سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، مشرق و مغرب کے منصف مزاج مؤرخین متفق ہیں کہ فتح کے بعد نئے حکمرانوں نے جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا اور محض اپنے دین کو بچانے یا کسی بدسلوکی سے بچنے کے لئے ایرانیوں (پارسیوں) نے ترک وطن ہرگز نہیں کیا۔ خود برصغیر پاک و ہند میں پائے جانے والے پارسی اس کے معترف ہیں۔

جسٹس سید امیر علی، روح اسلام میں لکھتے ہیں:

> ''ایرانیوں کا مجموعی طور پر مسلمان ہو جانا بسا اوقات اسلام کے عدم رواداری کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن تعصب میں اتنی کور چشمی ہوتی ہے کہ اس کے زیر اثر اہل علم بھی ان حالات کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے تحت مسلمان ایران میں داخل ہوئے۔ مذہبی زندگی کا ایک شمہ بھی ایرانیوں میں باقی نہ تھا۔ عوام الناس ایک ایسی خرابی کی چکی میں پسے جا رہے تھے جس سے بڑی خرابی کسی ملک کو لاحق نہیں ہو سکتی، یعنی مذہبی اجارہ داریوں کی ایک رزائل میں مبتلا جماعت اور ایک فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی اقلیتی حکومت مزدک و مانی کے پھیلائے ہوئے کفر نے معاشرے کے سارے جوڑ بند ڈھیلے کر دیئے تھے، کسریٰ نوشیرواں نے قومی شیرازے کے بکھر جانے کو صرف تھوڑی مدت کے لئے ملتوی کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب مسلمان قاعدہ قانون اور امن و امان کے نقیب بن کر ایران میں داخل ہوئے تو ان کے داخل ہوتے ہی سارے ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا اور ایران ہمیشہ کے لئے دائرہ اسلام میں آ گیا۔''[1]

نومسلم ایرانی نو آباد چھاؤنیوں کوفہ، بصرہ وغیرہ میں بھی آباد ہوئے اور عرب خاندانوں کے موالی بن کر ان سے اتحاد و اخوت کے رشتے قائم کر لئے، عرب فاتحین نے ایران کی اہل کتاب عورتوں یا ان میں سے جو مسلمان ہو گئیں، سے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے مساویانہ حیثیت سے شادی بیاہ کئے اور ان کی اولادوں کو عرب عورتوں کی اولادوں کے مساوی حقوق و مراتب ملے۔ نصف صدی سے بھی کم مدت میں خالص ایرانی النسل مسلمان اور ان کی اولادیں اسلامی معاشرے اور سیاست و تمدن میں اہم کردار ادا کرنے کے قابل ہو گئے۔ ایران کی مردم خیز زمین نے اسلامی علوم و فنون کے ماہر، مفسر، محدث، فقیہ، مؤرخ، مفکر، فلسفی، دانشور، شاعر ادیب، طبیب اور سائنس داں

---

[1] انگریزی تصنیف ''سپرٹ آف اسلام'' کا ترجمہ روح اسلام صفحہ ۳۵۱-۳۵۲

پیدا کرنے شروع کر دیئے جن کی بلند پایہ تصنیفات کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا، وسطی ایشیا، افغانستان، پاکستان اور بھارت میں اسلام زیادہ تر ایرانیوں کی وساطت سے پہنچا اور اس پر عجمیت کی خاصی چھاپ لگی۔ تیسرے واسطے سے ابلاغ عقائد و تصورات میں کہیں دانستہ کہیں نادانستہ ایسا ہونا قدرتی امر ہے۔ مروجہ تصوف تو کلیتہً ایران ہی کی دین ہے۔ یہ دراصل صفائے باطن اور تزکیہ نفس کا عمل تھا جو خلفائے راشدین، صحابہ اور دوسرے عرب مسلمانوں میں بدرجہ اتم موجود تھا لیکن ایرانیوں نے اسے ایک رسمیات میں ڈوبے ہوئے پیچیدہ فن کی صورت دے دی اور طرح طرح کے نظریات، اصول و قواعد وضع کئے جن میں کہیں کہیں اسلام کے سادہ اور کھرے اصولوں سے مغائرت پائی جاتی ہے اور جو اپنی اصل میں قدیم ایرانی رسوم و عقائد پر مبنی ہیں۔ پاکستان اور بھارت میں زیادہ تر یہی عجمی تصوف رائج ہے۔ اس کے اکثر سلسلوں کا آغاز حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کیا جاتا ہے جس کی اصلیت تحقیق طلب ہے۔ بعض مصنفوں نے اس تصوف کو بھی ایک سوچی سمجھی عجمی سازش کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔ بعض نام نہاد ایرانی صوفیوں نے تصوف کے رنگ میں قدیم ایرانی تصورات و نظریات کی تبلیغ کی۔

یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہر قسم کے حقوق و مراعات کے حصول کے باوجود ایرانیوں کا ایک عنصر ذہنی طور پر اسلامی قبضہ کے خلاف ہی رہا اور ایران کی ہزار سالہ مقدس شہنشاہیت کے عقیدہ سے اپنے دل و دماغ کے دامن کو چھڑا نہ سکا۔ اس نے اسلام قبول کیا لیکن عرب سیادت کو دل سے قبول نہیں کیا اور خلافت راشدہ کے زمانے ہی سے اسلامی قبضہ و اقتدار کے خلاف خفیہ اور علانیہ سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ اور ان کی شہادت، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جنگ جمل اور ان کے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جنگوں کے پس پردہ ایرانی سازشیوں کے خفیہ ہاتھ حرکت کرتے معلوم ہوتے ہیں حتیٰ کہ ہلاکو کے ہاتھوں بغداد اور خلافت عباسیہ کی تباہی میں بھی انہوں نے بھرپور کردار ادا کیا۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی بجائے کوفہ کو دارالخلافہ بنا لیا تو ایرانیوں نے ایک گہری سازش کے تحت اپنی وفاداریاں بظاہر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وابستہ کر لیں۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وجہ سے عرب خلافت کا مرکز بالآخر حجاز کے شہر مدینہ کی بجائے سابقہ ایرانی سلطنت کی سرزمین پر نو آباد شہر کوفہ میں منتقل ہونے سے خلافت ایرانیوں کے گھر میں چلی آئی ہے۔ نیز یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد اور داماد ہونے کی وجہ سے اسلام کے ''شاہی خاندان'' سے ہیں اور پھر ان کے یقین کے مطابق ایرانی شہنشاہ یزدگرد کی بیٹی شہر بانو[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دوسرے صاحب زادے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حبالہ عقد میں آ کر خلیفۂ وقت کی بہو بن گئیں، اس طرح ایرانی شہنشاہیت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد[2] میں منتقل ہو گئی، ایرانی اپنے شہنشاہ کو خدا کا

[1] متعدد مصنفین نے ان کا نام سلافہ اور انہیں سندھی النسل لکھا ہے۔ مؤلف

[2] حضرت علی کی شہادت کے بعد ان کے بڑے صاحب زادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ صرف چھ ماہ کے لئے خلیفہ رہے پھر حضرت معاویہ کے حق میں دستبردار ہو گئے، ایرانیوں نے انہیں لاچاری سے یا مصلحتاً حضرت علی کے بعد دوسرا امام تسلیم کیا۔ ان کے بعد امامت مستقلاً ''یزدگرد کے داماد'' حضرت امام حسین کے خاندان میں منتقل کر دی۔ مؤلف

بیٹا اور مقدس بادشاہ سمجھتے تھے۔ اسے پیر و مرشد لکھتے تھے، اس کی ذات کے گرد عظمت و تقدس کا ہالہ ہوتا تھا۔ ایرانی اس کے احکام کی بلا چون و چرا تعمیل کو نہ صرف فرمانبرداری و وفاداری کا تقاضا بلکہ اپنی اخروی نجات کا باعث سمجھتے تھے، حکومت پشت در پشت صرف شاہی خاندان کا حق تھی۔ ایرانی شاہی خاندان ختم ہو گیا تو ایرانیوں نے بوجوہ ایرانی شہنشاہیت کا تقدس خاندان علی رضی اللہ عنہ میں منتقل کر دیا۔ منتخب خلافت کے مقابلے میں پشتینی و خاندانی امامت کا اعتقاد پھیلایا گیا۔ ابتدائی سیاسی اختلافات کو بڑی چابک دستی سے کٹر مذہبی اختلافات میں تبدیل کیا گیا اور رفتہ رفتہ ایک الگ مذہبی فرقہ کی بنیاد ڈال دی گئی اور مرور ایام کے ساتھ یہ فرقہ بھی متعدد فرقوں میں بٹ گیا۔

یہ تفریق در تفریق اور تقسیم در تقسیم ایرانی ذہن کا کارنامہ تھا۔ یوں عربوں سے ایران فتح کرنے کا انتقام لیا گیا، بعض ایرانی دانشوروں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ موجودہ دور کے ایک معروف ایرانی مؤرخ حسین کاظم زادہ اپنی تصنیف ''تجلیات روح ایران درادوار تاریخی'' میں صاف لکھتے ہیں (ترجمہ):

''جس دن سے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم کی جانب سے ایران فتح کیا اور اس پر غلبہ پایا، ایرانی اپنے دل میں کینہ و انتقام کا جذبہ پالتے رہے، کینہ و انتقام کا یہ جذبہ متعدد مواقع پر ظاہر ہوتا رہا تا آنکہ فرقہ شیعہ کی بنیاد پڑ جانے سے یہ کلیتہً بے نقاب ہو گیا۔ ارباب علم و اطلاع اس حقیقت کو بخوبی جانتے اور مانتے ہیں کہ شیعیت کی بنیاد و ظہور میں اعتقادی مسائل اور نظری اور نقلی اختلافات کے علاوہ ایک سیاسی مسئلہ کو بھی دخل تھا۔ ایرانی اس بات کو نہ کبھی بھول سکتے تھے نہ قبول اور معاف کر سکتے تھے کہ مٹھی بھر ننگے پاؤں پھرنے والے بادیہ نشیں عربوں نے ان کی مملکت پر قبضہ کر لیا، اس قدیم مملکت کے خزانوں کو لوٹ کر غارت کر دیا اور ہزاروں بے گناہ انسانوں کو قتل کر ڈالا۔'' [1]

آگے چل کر یہی مصنف مزید لکھتا اور ایرانی رویئے کا بھانڈہ پھوڑ دیتا ہے:

''ہمارے دانشور بزرگوں کو نہ تو بنو فاطمہ سے عشق تھا، نہ خاندان بنو امیہ سے دشمنی، ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح عرب حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے اور اپنی عظمت و حکومت بحال ہو جائے، چونکہ ہاشمی خلافت حضرت علی کے بعد ختم ہو گئی اور اموی خالص عربی حکومت دنیائے اسلام کی مرکزی حکومت تسلیم کر لی گئی اور اس طرح عرب عجم پر بری طرح مسلط ہو گیا، لہٰذا ہمارے لئے واحد چارہ کار

---

[1] یہ اور اگلا اقتباس غلام احمد پرویز کی تصنیف، شاہکار رسالت، کے حوالے سے لئے گئے ہیں۔ اصل فارسی عبارت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ عجیب بات ہے کہ سکندر یونانی کے ہاتھوں ایرانی سلطنت کی جو تباہی و بربادی ہوئی، جس طرح قدیم ایرانی دارالسلطنت اصطخر کو نذر آتش اور پر امن شہری آبادیوں کو بے دریغ حوالۂ تیغ کیا گیا ایرانیوں نے اسے تو فراموش کر دیا مگر عربوں نے فتح ایران کے بعد ایران میں نئی صحت مند روحانیت، تہذیب، تمدن، عدل، مساوات، انسان دوستی کا بول بالا کیا، نہ دارالحکومت کو جلایا، نہ لوٹ مار کی، نہ مقابلہ پر نہ آنے والوں کو قتل کیا، نہ عورتوں، بچوں پر ہاتھ اٹھایا، یہ سب کچھ ایرانیوں کو گراں گزرا۔ حالانکہ سکندر کے برعکس عربوں نے بامر مجبوری فوج کشی کی۔ اصل بات یہ ہے کہ سکندر کو بادشاہ سمجھ کر اس کی آوردہ ہلاکت و بربادی پر ایرانیوں نے صبر کر لیا۔ لیکن برہنہ پا بادیہ نشیں عربوں کی فاتحانہ جسارت کو بھلا نہ سکے۔ مؤلف

یہی تھا کہ ہم ہاشمیوں کا ساتھ دے کر ان کو ابھارتے، ہمارے بزرگوں نے یہی کچھ کیا۔''

اور تو اور ڈاکٹر علی شریعتی جیسا شخص بھی جسے ایران کے موجودہ ''اسلامی انقلاب'' کا فکری معمار اور بہت بڑا دانشور سمجھا جاتا ہے، اپنے اس تعصب کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی کتاب ''کمزوروں، بے بسوں کے نام''¹ میں اس نے نام لئے بغیر خلفائے ثلاثہ کو ظالم، قاتل، غاصب، لٹیرے، ایران کو تباہ کرنے والے اور کیا کیا کچھ نہیں کہا۔ اپنے کتابچوں ''بنیش تاریخی شیعہ'' اور ''عقیدہ'' میں بھی خلافت کو ''استبداد و استثمار'' کہتا ہے، لیکن ہمارے ''غیر متعصب اور غیر جانبدار دانشور'' علی شریعتی کو بغیر پڑھے اس کے مدح خوان ہیں۔

ایک ایرانی شاعر نے ایرانی شہنشاہیت کے خاتمہ کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنے غیظ و غضب کا یوں اظہار کیا ہے اور اقرار کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ سے کینہ علی رضی اللہ عنہ سے خلافت چھین لینے کی بنا پر نہیں بلکہ ایرانی سلطنت کو ختم کرنے کی بناء پر ہے۔

بشکست عمر رضی اللہ عنہ پشت ہژبران عجم را
برباد فنا داد رگ و ریشۂ جم را
ایں عربدہ بر غصبِ خلافت ز علی رضی اللہ عنہ نیست
با آلِ عمر رضی اللہ عنہ کینہ قدیم است عجم را

ایک دوسرے شاعر نے کہا کہ مجھے اپنی ''عمر'' پر شرمساری اور پشیمانی ہے کہ اس کے ہجے بھی وہی ہیں جو نام عمر رضی اللہ عنہ کے! اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا!

ایران نے اسلام کے لئے بیک وقت عظیم محبؔ اور عظیم دشمن پیدا کئے، مشہور جرمن مسلم علامہ محمد اسد (اصل نام لیوپولڈ ویز) نے اپنی مشہور سوانح عمری ''روڈ ٹو مکہ'' میں لکھا ہے کہ ایران میں محرم کے موقع پر امام حسین رضی اللہ عنہ کا ماتم نہیں ہوتا بلکہ یہ دراصل ایران کی ساسانی سلطنت کے خاتمہ کا ماتم ہوتا ہے۔

بازنطینیوں سے جنگ

شام، فلسطین، اردن اور مصر کی فتح،

دمشق (رجب ۱۴ھ...... مارچ ۶۳۵ء)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مسلمانوں نے بصریٰ اور اجنادین فتح کر لئے تھے اور دمشق کا محاصرہ جاری تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ابتدائی عہد میں دمشق فتح ہو گیا، اہل شہر کو امان دے دی گئی، دنیا کا سب سے پرانا شہر...... شہروں کی ملکہ...... رومی تسلط سے نکل کر ہمیشہ کے لئے اسلامی جھنڈے

¹ To The Dawn tradden People

مجھے اس کے اقتباسات پڑھنے کا موقع ملا۔ اصل فارسی نسخہ نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن دوسرے فارسی کتابچہ ''عقیدہ'' میں بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں۔ مؤلف

تلے آ گیا۔ نہ کسی کو لونڈی غلام بنایا گیا نہ کوئی مالِ غنیمت حاصل کیا گیا۔ عبادت گاہوں کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا۔ فاتحین نے اس بات کی بھی ضمانت دی کہ اہل شہر میں سے کسی کا مکان زبردستی چھینا نہیں جائے گا نہ منہدم کیا جائے گا۔ عیسائیوں کے ساتھ یہودی بھی اس امان نامہ میں شامل تھے۔

اردن کی فتح۔فحل کا معرکہ (ذی قعدہ ۱۴ھ...... جولائی ۶۳۵ء)

اردن کے دفاع کے لئے تقریباً چالیس ہزار رومی افواج بیسان میں جمع ہوئیں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو دمشق کی امارت پر چھوڑ کر فوج کے ساتھ رومیوں کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ جھیل طبریہ کے قریب فحل کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ رومی سپہ سالار کی درخواست پر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو صلح کے مذاکرات کے لئے بھیجا انہوں نے رومی جرنیل کے سامنے یوں تقریر کی:

> ''اگر تم اسلام قبول کرلو تو ہمارے بھائی ہو۔ پھر ہمارے تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اسلام نہیں لاتے تو جزیہ دو، امن سے رہو، ہم تمہارے ملک اور حکومت سے تعرض نہیں کریں گے۔ اگر اس سے بھی انکار ہو تو پھر ہمارے تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ ہم تمہاری کثرت سے ہرگز خائف نہیں، اللہ کے حکم سے ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹی جماعت اپنے سے بڑی جماعت پر غالب آتی ہے، تمہارے شہنشاہ کو تمہاری جان و مال پر اختیار ہے۔ وہ آمر مطلق ہے جو چاہے کرے۔ اس سے کوئی محاسبہ نہیں کرسکتا، لیکن ہم نے جسے اپنا خلیفہ بنا رکھا ہے، اسے ہم سے کسی بات میں ترجیح حاصل نہیں۔ ہم سب کی طرح وہ بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا پابند ہے۔ اگر وہ زنا کرے تو اسے درے لگائے جائیں، چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے وہ ہم سے اونچا ہو کر نہ تخت پر بیٹھتا ہے نہ پردے میں، اس کا کوئی حاجب اور دربان نہیں، وہ اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا، مال و دولت میں اس کو ہم پر ترجیح نہیں، اسے بھی بیت المال سے اتنا ہی حصہ ملتا ہے جتنا ایک عام مسلمان کو۔''

رومی یہ تقریر سن کر حیرت زدہ رہ گئے، پھر کہا کہ ''ہم تمہیں بلقا کا ضلع اور اردن کا وہ حصہ جو تمہارے ملک سے متصل ہے، دیئے دیتے ہیں تم ہماری سرزمین چھوڑ کر ایران کی طرف چلے جاؤ، وہاں تمہارے لئے کامیابی کا زیادہ موقع ہے کیونکہ وہاں کی حکومت انتشار اور بدنظمی کا شکار ہے۔''

سفارت ناکام رہی اس کے بعد رومیوں نے سالار اعلیٰ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے بالمشافہ بات چیت کرنا چاہی۔ جب رومی قاصد اسلامی لشکر میں پہنچا تو سپہ سالار کے متعلق دریافت کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بڑے جاہ و حشم اور شان و شوکت سے رہتا ہوگا۔ لیکن اسے کہیں کسی شان و طمطراق کے آثار دکھائی نہ دیئے۔ پوچھنے پر لوگوں نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا جو دوسروں کے ساتھ زمین پر بیٹھے اپنے ہاتھوں میں تیروں کو الٹ پلٹ رہے تھے،

رومی سفیر کو حیرت بھی ہوئی اور صدمہ بھی کیونکہ یہ منظر اس کے لئے سراسر غیر متوقع تھا۔ بہر حال وہ سنبھلا اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہم آپ کی فوج کو دو دو اشرفیاں فی کس دیں گے آپ یہاں سے واپس چلے جائیں، اس پیشکش کا جواب ایک حقارت آمیز انکار کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟ دوسرے دن گھمسان کا رن پڑا۔ رومیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ جان توڑ کر لڑے مگر آخر شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے، اس معرکے نے اردن کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ خلیفہ کے حکم سے باشندوں کو ذمی قرار دے دیا گیا اور زمین زمینداروں اور کاشتکاروں کے قبضے میں رہنے دی گئی۔

اردن کے باقی شہر اور علاقے آسانی سے فتح ہو گئے۔ رعایا کو ذمی قرار دے کر اس کے جان و مال، املاک، زمین، مکان، گرجے اور دوسری عبادت گاہیں محفوظ کر دی گئیں۔

حمص وغیرہ کی فتح (۱۴ھ......۶۳۵ء)

حمص شام کی ایک اہم ڈویژن یا ذیلی صوبہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حمص کی مہم خصوصی طور پر حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے سپرد کی تھی۔ حمص کی فتح کے بعد انہیں وہاں کا گورنر ہونا تھا۔ دمشق سے فارغ ہو کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ادھر توجہ کی۔ بعلبک، حماۃ شیرز اور معرۃ النعمان وغیرہ شہر اور قلعے فتح کر کے حمص کا محاصرہ کر لیا، قیصر کی جانب سے کمک سے مایوس ہو کر اہل شہر نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔ اس کے بعد لاذقیہ کا مضبوط و مستحکم شہر بھی فتح ہو گیا، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حمص میں مقیم ہو گئے، خالد رضی اللہ عنہ دمشق اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اردن چلے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سال مزید پیش قدمی سے روک دیا تھا۔

یرموک کی فیصلہ کن جنگ (رجب ۱۵ھ......اگست ۶۳۶ء)

بازنطینی شہنشاہ ہرقل ان دنوں شام کے شہر انطاکیہ میں مقیم تھا جو قسطنطنیہ کے بعد سلطنت کے مشرقی صوبوں کے انتظام کے لئے اس کا دوسرا دارالسلطنت تھا۔ دمشق، حمص وغیرہ شہروں سے رومی بھاگ کر ہرقل کے پاس انطاکیہ پہنچے اور فریاد کی کہ ''مسلمانوں نے سارے شام کو روند ڈالا ہے، ہم بے گھر اور غیر محفوظ ہو گئے، ہماری مدد کی جائے۔'' ہرقل مسلمانوں کی تیز رفتار پیش قدمی اور مسلسل فتوحات سے دل شکستہ ہو کر قسطنطنیہ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا اپنے دل میں وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے مشن کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتی خط اس تک پہنچا تو اس نے ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ سے، جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے بارے میں پوچھا تھا اور پھر کہا تھا کہ ''مجھے معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ عرب کی سرزمین سے اٹھے گا۔ بہر حال اگر یہ وہی پیغمبر ہے تو اس کے پیروؤں کے قدم یہاں تک پہنچیں گے۔'' وہ مسلمان ہو جاتا لیکن اپنے امرائے دربار اور پادریوں کا مخالفانہ رویہ دیکھ کر جاہ و حکومت کے لالچ میں خاموش ہو گیا تھا۔ بہر حال اسے یقین تھا کہ اب اس کی فوجوں کا مقابلہ ایران کے مجوسیوں سے نہ تھا، جنہیں وہ چند سال پہلے شکست فاش دے چکا تھا بلکہ ایک نئی ابھرتی ہوئی حق پرست طاقت سے تھا جس کے مقابلے میں اس

کی قوت وشوکت ٹھہر نہ سکے گی۔ پھر بھی مفتوحہ شہروں اور علاقوں کے عیسائیوں کی فریاد سن کر قیصر کی غیرت وحمیت کی باسی کڑھی میں ابال آ گیا، اس نے فریادیوں سے پوچھا ''کیا وجہ ہے کہ عرب تمہیں برابر دباتے بھگاتے چلے آتے ہیں حالانکہ تعداد، اسلحہ، سامان، جنگی تربیت اور زور وقوت میں وہ تم سے کمتر اور فروتر ہیں؟'' اس پر سب خاموش رہے۔ آخر ایک جہاندیدہ اور عمر رسیدہ شخص نے جرأت سے کام لے کر جواب دیا کہ ''عربوں کے اخلاق ہمارے اخلاق سے بہتر ہیں۔ وہ رات کو عبادت کرتے اور دن کو روزے رکھتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، آپس میں مساوات اور اخوت کا سلوک کرتے ہیں، ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں، اس کے برعکس ہم شراب پیتے اور بدکاری کرتے ہیں، قول وقرار کی پابندی نہیں کرتے، دوسروں پر ظلم کرتے ہیں، بدعہدی اور ناانصافی ہمارا شعار ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے عربوں کے ہر کام میں جوش واستقلال پایا جاتا ہے جبکہ ہمارا ہر کام ہمت واستقلال سے خالی ہوتا ہے۔'' قیصر نے دل میں شرمساری محسوس کی اور فریادیوں کا ہجوم دیکھ کر مسلمانوں کے خلاف ایک بھرپور اور آخری کوشش کرنے کا عزم کر لیا۔ تمام ممالک محروسہ میں احکام بھیج دیئے کہ ہر قسم کے اسلحہ وسامان سے لیس زیادہ سے زیادہ فوجیں جلد سے جلد انطاکیہ پہنچ جائیں، تھوڑے ہی عرصے میں انطاکیہ میں بازنطینی فوجوں کا ٹڈی دل اُمڈ آیا۔

ذمیوں کو شہر سے نکالنے کی مخالفت

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو دشمن کی فوجی تیاریوں کی اطلاع ملی تو انہوں نے دوسرے امرائے لشکر سے مشورہ کیا اور کہا کہ ''اس نازک موقع پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم عورتوں اور بچوں کو حمص میں رکھیں اور ذمیوں کو شہر سے نکال دیں تاکہ ہماری غیر حاضری میں ان کی طرف سے ہماری عورتوں اور بچوں کو کوئی خطرہ نہ رہے، پھر ہم خود شہر سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کریں۔'' اس پر حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا اور کہا کہ ''اے امیر! آپ کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ ذمیوں کو شہر سے نکال دیں یہ بدعہدی ہوگی کیونکہ ہم نے اہل شہر کو اس شرط پر امان دی ہے کہ وہ شہر میں امن واطمینان سے رہیں۔'' ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کی غلطی کا اعتراف کیا اور حمص چھوڑ کر دمشق جانے کا فیصلہ کیا جہاں خالد رضی اللہ عنہ اور یزید رضی اللہ عنہ موجود تھے اور عرب کی سرحد بھی قریب تھی، کمک نسبتاً زیادہ آسانی اور تیز رفتاری سے پہنچ سکتی تھی۔

جزیہ کی واپسی

اس فیصلہ کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کئی لاکھ کی رقم جو حمص کے عیسائیوں اور یہودیوں سے بطور جزیہ وصول کی تھی، انہیں یہ کہہ کر واپس کر دی کہ ''جزیہ حفاظت کا معاوضہ ہے، سردست ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔ اس لئے یہ رقم تمہیں واپس دی جاتی ہے'' اس کا اثر یہ ہوا کہ عیسائی رعایا رو رو کر کہتی تھی کہ دنیا ایسے ہی انصاف سے قائم ہے خدا تم کو جلد واپس لائے، یہودیوں نے کہا کہ ''تورات کی قسم! جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔''

حمص کے علاوہ دوسرے مفتوحہ شہروں اور علاقوں سے وصول شدہ جزیہ بھی واپس کر دیا گیا۔

دنیا کی تاریخ میں یہ ایک عدیم المثال واقعہ ہے، قیصر و کسریٰ کی رعایا نہ صرف مقررہ، نامنصفانہ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی بلکہ حکمرانوں کے جبر و استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی بھی عادی ہو چکی تھی۔ اہل حمص اور دوسرے مفتوحہ شہروں کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ ''وحشی عرب لٹیرے'' جزیہ کی بھاری رقوم اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے یوں ان کے سامنے پھینک دیں گے جیسے کوئی تلخ و ناگوار لقمہ اگل دیا جاتا ہے ان ''عرب لٹیروں'' کے بعد مشرق و مغرب کے ممالک یورپ امریکہ، روس، جاپان وغیرہ نے بہت ''ترقی'' کی ہے لیکن ان کے چودہ سو سال بعد اور دو عالمی جنگوں میں ان طاقتور، مہذب اور ترقی یافتہ قوموں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں اور ان کی بستیوں پر جو ہلاکت و بربادی نازل ہوئی، ان کی جانیں، جائیدادیں آبروئیں جس طرح لٹیں، خود ان، مہذب اور ترقی یافتہ قوموں کے مؤرخوں نے اسے تاریخ کے صفحات پر درج کر دیا ہے۔

رومیوں کے ڈر سے مسلمانوں کا حمص خالی کر کے دمشق چلا آنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پسند نہ آیا۔ انہوں نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ''فتح و شکست کا انحصار فوج کی کثرت یا قلت پر نہیں۔ اصل چیز نصرت خداوندی ہے، تاہم سعید بن عامر کو تمہاری مدد کے لئے بھیج رہا ہوں۔''[1]

تمام مسلمان فوجیں اپنے اپنے سالاروں کے ماتحت دمشق اور دوسرے مقامات سے کوچ کر کے یرموک میں جمع ہو گئیں۔ رومی افواج واقوا صہ کی وادی میں خیمہ زن تھیں جو دریا سے گھری ہوئی تھی مسلمانوں نے اس تنگ گھاٹی پر قبضہ کر لیا اور دشمن ایک طرح سے وہاں محصور ہو کر رہ گیا، اس کے دو طرف پہاڑ تھے اور پشت پر دریائے یرموک اپنی دانست میں رومی سپہ سالار نے اس پوزیشن کو بہت محفوظ اور مستحکم سمجھا لیکن یہ پوزیشن رومی افواج کے لئے موت کا پنجرہ بن گئی، اس کے لئے باہر نکلنے اور حملہ کرنے کی ایک ہی راہ تھی جس پر مسلمان قابض ہو گئے۔

رومی جرنیل نے مصالحت کے لئے مذاکرات کرنا چاہے اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے اپنا سفیر بھیجنے کی درخواست کی، جرجہ (جارج) نامی رومی افسر جو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس اپنے سپہ سالار کا پیغام لے کر آیا، مسلمانوں کو کندھے سے کندھا ملائے خضوع و خشوع اور سکون و وقار سے نماز پڑھتے دیکھ کر بہت متاثر ہوا، سپہ سالار اور سپاہی کا بلا امتیاز ایک ہی صف میں اپنے خدا کے حضور کھڑے ہونا ایک ایسا منظر تھا جو اس نے عیسائی فوجوں تو کیا عیسائی گرجوں میں بھی نہ دیکھا تھا، اس نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ معلوم کرنا چاہا، انہوں نے قرآنی آیات پڑھ کر سنائیں، مترجم نے ان کا مطلب بتایا تو جرجہ بے اختیار پکار اٹھا ''بے شک عیسیٰ علیہ السلام کے یہی اوصاف ہیں اور بے شک تمہارا پیغمبر سچا ہے۔'' چنانچہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔[2] وہ اپنے لشکر میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ کل جو ہمارا سفیر جائے گا اس کے ساتھ آجانا تاکہ رومیوں کو بدعہدی کا گمان نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر مسلمانوں میں سے کوئی رومیوں کے پاس جا کر واپس نہ آتا

---

[1] سعید بن عامر رضی اللہ عنہ ایک ہزار مجاہدین کے ساتھ روانہ ہوئے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے جنگ یرموک کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہو گیا۔ مؤلف

[2] دوسری روایت یہ ہے کہ جرجہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر میدان جنگ میں سوال و جواب کے بعد مسلمان ہوا اور پھر اسی دن لشکر اسلام میں شامل ہو کر اپنے ہم قوم رومیوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ (مؤلف)

چاہتا تو وہ اسے کبھی واپس نہ بھیجتے۔ دوسرے دن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سفیر بن کر رومی لشکر میں گئے۔ رومی سپہ سالار کے ساتھ طویل گفتگو ہوئی۔ اس نے ترغیب و ترہیب سے کام لینا چاہا، قیصر کی شان و شوکت اور سلطنت کی وسعت و طاقت کا ذکر کیا۔ عربوں کی بے مائگی، جہالت اور بدویت پر طعن کیا، بالآخر تان اس پر توڑی کہ "اگر تم لوگ واپس چلے جاؤ تو ہم تم سے نہ صرف درگزر کریں گے بلکہ انعام کے طور پر سپہ سالار کو دس ہزار دینار افسروں کو ہزار ہزار دینار دینار اور عام سپاہیوں کو سو سو دینار دیں گے اور ملبوسات بھی" خالد رضی اللہ عنہ نے یہ پیشکش پائے استحقار سے ٹھکرا دی اور کہا کہ جو "اسلام لائے وہ ہمارا بھائی ہے، جو اسلام نہ لائے لیکن جزیہ دینا قبول کرے اس کے ہم حامی اور محافظ ہیں، جسے دونوں سے انکار ہو اس کے لئے تلوار ہے۔" مذاکرات ناکام ہو گئے۔ خالد رضی اللہ عنہ واپس چلے آئے۔

اگلے دن گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمانوں کی تعداد کم و بیش چالیس ہزار تھی اس میں ایک سو بدری صحابہ اور ایک ہزار عام صحابہ شامل تھے، رومیوں کی تعداد دو لاکھ سے زائد تھی، جنگ یرموک کے واقعات کی تفصیل سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی، اس دن تمام سرداروں نے اتفاق رائے سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو پوری فوج کا سالار اعلیٰ بنا لیا، انہوں نے مسلمان فوج کو بالکل نئے طریقے سے منظم کیا دونوں فوجیں پوری قوت اور بے جگری سے لڑیں۔ دریائے یرموک دریائے خون میں تبدیل ہو گیا۔ آخر میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا، تقریباً ایک لاکھ سے زائد رومی مارے گئے، [1] باقی بھاگ نکلے، تین ہزار مسلمان شہید ہوئے جب ہرقل کو انطاکیہ میں شکست کی خبر پہنچی تو وہ شام سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو گیا اور اسی وقت قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو گیا، شہر سے باہر نکل کر اس نے ہرے بھرے کھیتوں، باغوں، نخلستانوں اور سبزہ زاروں پر بڑی حسرت سے ایک آخری نگاہ ڈالی اور کہا:

"اے شام! اے میری سلطنت کے حسین صوبے! ہمیشہ کے لئے الوداع۔ اب تو میرا نہیں میرے دشمن کا ہے۔"

معرکۂ یرموک میں رومیوں کی طاقت پر کاری ضرب لگی جس سے وہ پھر کبھی سنبھل نہ سکے۔ شام میں رومی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

اجنادین، دمشق، فحل اور یرموک کے واقعات سے رومی مورال کی شکست و ریخت انتہا کو پہنچ گئی اور مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ قنسرین، حلب انطاکیہ[2] جیسے اہم اور بڑے شہر یکے بعد دیگرے فتح ہوتے چلے گئے۔ رومیوں

---

[1] بحوالہ طبری اور رازی، لیکن بلاذری کے مطابق ستر ہزار رومی تہ تیغ ہوئے۔ مؤلف

[2] انطاکیہ کی فتح کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدائن اور یروشلم (بیت المقدس) کی فتح کے برابر اہمیت دیتے تھے۔ یہ وہ شہر تھا جس نے سینٹ پیٹر کی تبلیغ سے متاثر ہو کر سب سے پہلے عیسائیت اختیار کی تھی اور یہیں انجیل برناباس کو مروج کیا گیا تھا (یہ وہ انجیل ہے جو دراصل صحیح ترین انجیل ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت کے متعلق اس کے بیانات قرآن مجید کے بیانات سے متفق ہیں اور اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی واضح پیشین گوئی موجود ہے۔) انطاکیہ مذہبی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کے علاوہ قیصر کا دوسرا پایۂ تخت تھا اور قسطنطنیہ کی ہمسری کرتا تھا۔ جغرافیائی، جنگی، سیاسی لحاظ سے بھی اس کی بڑی اہمیت تھی۔ مؤلف

اور مقامی عیسائیوں کی شہری آبادی کے علاوہ گردونواح کے کھلے میدانی علاقوں میں جو عرب قبائل آباد تھے، انہوں نے اسلام قبول کرلیا عیسائی آبادیاں خود آگے بڑھ بڑھ کر امن وصلح کی درخواستیں کرنے لگیں، تھوڑے ہی عرصے میں جنگ وجدال کے بغیر بوقا، جومہ، سرمین، توزی، قورس، تل عزاز، دلوک، عیان، منبع، مرعش وغیرہ اسلام کے زیر نگیں آ گئے، بیروت اور اس کے گردونواح کے سرحدی قلعے بھی فتح ہو گئے، بالس، قاصرین، عسقلان، رملہ، عکہ، یافہ، صیدا وغیرہ بھی مملکت اسلامیہ کا حصہ بن گئے۔

جبلہ بن ایہم غسانی کا واقعہ

یہ شخص شام کے نیم آزاد عرب قبیلہ بنی غسان کا آخری بادشاہ اور ہرقل کا وفادار حلیف تھا، وہ رومیوں کی حمایت میں مسلمانوں کے خلاف لڑا، پھر رومیوں کی تابڑ توڑ شکستوں اور شام کے اکثر قبائل کے قبول اسلام سے متاثر ہو کر اپنے قبیلے اور حکومت کو بچانے کے لئے مسلمان ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ بھیج دیا۔ وہ لطف ومہربانی سے پیش آئے۔ حج کا زمانہ آیا تو وہ ان کے ساتھ حج کے لئے مکہ گیا، طواف کعبہ کے دوران میں اس کی چادر پر ایک مسلمان کا پاؤں پڑ گیا، جبلہ نے اپنے رئیسانہ غضب وغرور کے ساتھ اس مسلمان کو تھپڑ مار دیا۔ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت کی۔ استفسار پر جبلہ نے اقرار کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "یا تو اس شکایت کنندہ کو راضی کرلو ورنہ تھپڑ کے بدلے تھپڑ کھاؤ۔" جبلہ نے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک معمولی آدمی مجھ ایسے بادشاہ کو تھپڑ مارے؟ ہم تو ایسوں کو قتل بھی کرا دیتے ہیں تو ہم سے کوئی مواخذہ نہیں کرسکتا" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اسلام نے معمولی آدمی اور بادشاہ میں مساوات قائم کر کے انہیں ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے، اسلامی انصاف کی نگاہ میں دونوں برابر ہیں۔ برتری اور فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔" جبلہ نے غور کرنے کے لئے ایک رات کی مہلت مانگی اور پھر راتوں رات اپنے ساتھیوں سمیت قسطنطنیہ کی طرف یہ کہہ کر فرار ہو گیا کہ "جس دین میں ایک عام آدمی اور بادشاہ میں کوئی فرق نہ ہو، میں اس میں نہیں رہ سکتا۔" قسطنطنیہ جا کر وہ دوبارہ عیسائی ہو گیا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی پروا نہ کی، وہ ایک بادشاہ کی مجروح انانیت کی خاطر عدل، انصاف اور مساوات کا خون نہ کر سکتے تھے۔

فلسطین۔ بیت المقدس (۱۶ھ......۶۳۷ء)

فلسطین کی فتح اور امارت کے لئے حضرت عمرو بن العاص نامزد کئے گئے تھے، انہوں نے نابلس، لدا[۱]، عمواس، بیت جبرین وغیرہ فتح کر لئے، لیکن فلسطین کے سب سے اہم اور مقدس شہر ایلیا (بیت المقدس، یروشلم) ...... یہودیوں اور عیسائیوں کے قبلہ نیز مسلمانوں کے قبلۂ اول کی فتح ابھی باقی تھی، یرموک کی فیصلہ کن جنگ کے بعد جب رومیوں کی طرف سے خطرہ نہ رہا تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس کا محاصرہ کرلیا، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور

---

[۱] آج کل یہ شہر اسرائیل کا سب سے بڑا جنگی ہوائی اڈہ ہے، دجال کے متعلق احادیث میں بھی اس کا ذکر ہے کہ وہ یہیں قتل کیا جائے گا۔ مؤلف

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی اپنی مہمات سے فارغ ہو کر وہاں پہنچ گئے، یہ دیکھ کر محصورین کی قوت مقاومت جواب دے گئی، انہوں نے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی درخواست کی لیکن شرط یہ رکھی کہ خلیفۂ وقت خود آ کر ان سے عہد اطاعت لیں اور صلح نامہ پر دستخط کریں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس کی اہمیت اور تقدس سے بخوبی آگاہ تھے، اس لئے انہوں نے جدال و قتال سے اس کے تقدس کو مجروح کرنا پسند نہ کیا، جب سیدھے ہاتھوں گھی نکل رہا تھا تو انگلی ٹیڑھی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے ذہن میں یہ خیال بھی ہو گا کہ وہاں جا کر مجاہدین ان کے سالاروں، مفتوحہ علاقوں اور مفتوحین کی حالت دیکھیں، ان کے حالات، ضروریات، مشکلات، وغیرہ معلوم کریں اور ان کا ازالہ کریں، مجاہدین کے حوصلے بڑھائیں، رعایا کی شکایات اور مسائل سے واقف ہوں اور نظم و نسق کو صحیح خطوط پر استوار کریں۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا قائم مقام بنایا اور رجب ۱۶ھ میں چند مہاجرین و انصار کو ساتھ لے کر جابیہ روانہ ہو گئے، عمر رضی اللہ عنہ جن سے روم و ایران کی سلطنتیں لرزہ براندام تھیں اور ان کے صدیوں کے مملوکہ صوبے اور اضلاع ایک ایک کر کے ان سے کٹ کر مملکت اسلامیہ میں شامل ہوتے جا رہے تھے، اس ہیئت کذائی سے جابیہ پہنچے کہ لاؤ لشکر، خدم و حشم، نوبت و نقارہ اور جاہ و طمطراق کا کوئی ساز و سامان ساتھ نہ تھا، معمولی سے گھوڑے پر سوار، سادہ اور پیوند لگے کپڑوں میں ملبوس، بیت المقدس کے عیسائی اکابر کا وفد اس سراپا سادگی عظیم شخصیت کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ مسلمان امرائے لشکر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما وغیرہ زرق برق ریشمی قباؤں میں ملبوس تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھ کر خفگی سے کنکریاں ماریں اور فرمایا کہ تم نے اتنی جلدی عرب کی سادگی کو چھوڑ کر عجمی تکلفات کو اپنا لیا؟ لیکن انہوں نے بتایا کہ دن رات رومیوں سے سابقہ پڑتا ہے جو پر تکلف اور قیمتی لباسوں میں ہوتے ہیں اور پھر عرب کے مقابلے میں یہاں حریر و دیبا سستے بھی ہیں، اپنے حصے کے مالِ غنیمت سے ان کا خریدنا مشکل نہیں، اس لئے یہ لباس دشمنوں کو ظاہری طور پر مرعوب کرنے کے لئے پہنتے ہیں۔ تاہم زیر لباس ہتھیار باندھے ہوتے ہیں تاکہ دشمن سے ہر آن نپٹا جا سکے۔ فرمایا اگر ہتھیار بند ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

بیت المقدس کے عیسائی نمائندے جابیہ ہی میں آ گئے تھے۔ وہیں معاہدہ صلح لکھا گیا اور اس پر متعدد اکابر صحابہ نے بھی دستخط کئے، معاہدہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

> "یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے ایلیا کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لئے ہے۔ نہ ان کے گرجوں میں سکونت کی جائے گی نہ ان کو یا ان کے احاطے کو نقصان پہنچایا جائے گا، نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ ایلیا میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے[1]

---

[1] یہ شرط عیسائی اکثریت کی خواہش پر رکھی گئی تھی۔ حالات زمانہ کا انقلاب اور ستم ظریفی دیکھئے کہ ۱۹۶۷ء سے اسی ایلیا بالفاظ دیگر یروشلم یا بیت المقدس پر یہودی ریاست اسرائیل کا غاصبانہ قبضہ ہے بلکہ اب اسے اپنا دار الحکومت بنا لیا ہے اور وہاں یہودی دندناتے ہیں۔ انہوں نے مسجد اقصیٰ کو آگ لگا کر نقصان پہنچایا اور ہیکل سلیمانی کے کھنڈر اور بنیادیں تلاش کرنے کے بہانے سے مسجد عمر رضی اللہ عنہ کی بنیادیں کھودنے کے درپے ہیں۔ مؤلف

ایلیا والوں پر فرض ہے کہ وہ اور شہروں کی طرح جزیہ دیں اور یونانیوں (بازنطینیوں) کو اپنے ہاں سے نکال دیں۔ ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا، اس کی جان و مال کی اس وقت تک حفاظت کی جائے گی جب تک کہ وہ جائے پناہ پر نہ پہنچ جائے اور ان میں سے جو ایلیا ہی میں سکونت اختیار کرنا چاہئے، اس کے لئے بھی امن ہے، اس کو ایلیا والوں کی طرح جزیہ دینا ہوگا، ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنی جان و مال لے کر یونانیوں کے ساتھ نکل جانا چاہے وہ بھی اور ان کے گرجے اور صلیب مامون ہیں تا آنکہ وہ اپنی جائے پناہ تک نہ پہنچ جائیں، اس تحریر پر خدا، رسول ﷺ خلفا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے بشرطیکہ یہ لوگ مقرر جزیہ ادا کرتے رہیں۔''

اس زمانے کے حالات، فوجی اور سیاسی مصلحتوں اور غیر مسلموں سے از روئے اسلام عادلانہ سلوک کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مفتوح قوم کے لئے ان سے بہتر شرائط صلح قیاس میں بھی نہیں آسکتیں، روم و ایران کے قیصر و کسریٰ تو مفتوحہ اقوام سے خواہ وہ ان کی ہم مذہب ہی ہوں، غلاموں سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے، مفتوحین کے سرے سے کوئی حقوق ہی نہ تھے۔ مفتوحہ اقوام سے جو فراخدلانہ سلوک عمر رضی اللہ عنہ نے کیا، اس کی کہیں مثال نہیں ملتی، ان کے بعد صرف سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس فراخدلانہ سلوک کا مظاہرہ بیت المقدس کی فتح پر کیا حالانکہ اس سے پہلے ۱۰۹۹ء میں عیسائی صلیبیوں نے یروشلم کو فتح کرکے وہاں مسلمان مردوں، بچوں، بوڑھوں، عورتوں کا جس طرح بے دریغ خون بہایا، جان و مال اور آبرو لوٹی اس کا اعتراف خود یورپی مؤرخین نے کیا ہے حتیٰ کہ وہاں صرف مسجد عمر رضی اللہ عنہ (وہی عمر رضی اللہ عنہ جس نے اہل یروشلم کو کامل امان دی اور ان کے گرجوں اور صلیبوں کو بھی برقرار رکھا اور ان کے سب سے بڑے گرجے میں اس لئے نماز پڑھنے سے انکار کردیا کہ بعد میں مسلمان اسے مسجد نہ بنالیں) میں پناہ لینے والے ستر ہزار مسلمان ذبح کردیئے گئے اور صلیبیوں کے گھوڑوں کی لگاموں تک ان کے خون کا سیلاب پہنچ گیا۔ اس بربریت و بہیمیت کے برعکس صلاح الدین نے سب کو امان دی اور انسانیت افروز سلوک کیا۔

یروشلم کی فتح پر مولانا ابوالکلام آزاد کے تاثرات

مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، جلد دوم میں سورہ مریم کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب یروشلم فتح ہوا تو سورۂ مریم میں قرآنی پیشین گوئی کے مطابق عیسائیوں کے لئے یوم فتح یوم الحسرت تھا، ان کے لئے بڑی ہی حسرت و مایوسی کا باعث، سورۂ مریم کے نزول پر ابھی پچیس برس بھی نہیں گزرے تھے کہ تمام عیسائی دنیا یہ سن کر ششدر رہ گئی کہ مسیحیت کا صدر مقام اور قبلہ و مرکز اچانک اس کے ہاتھوں سے نکل کر ایک نئی قوم کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے، مشہور مؤرخ گبن کے لفظوں میں، تمام مسیحی دنیا پر سکتہ کی حالت طاری ہوگئی کیونکہ مسیحیت کی اس سب سے بڑی توہین کو نہ تو مذہب کا کوئی متوقع معجزہ روک سکا نہ بازنطینی شہنشاہ کا لشکر جرار۔ پھر یہ

صرف بیت المقدس ہی کی فتح نہ تھی، تمام ایشیا اور افریقہ میں مسیحی فرمانروائی کا خاتمہ تھا۔"

متفرق کارروائیاں

بیت المقدس کے عیسائیوں کے معاملات سے فارغ ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمان افسروں اور مجاہدوں سے بات چیت میں کئی دن صرف کئے۔ ان سے حالات و واقعات سنے، صلاح مشورے کئے، مفتوحہ علاقوں اور شہروں کے نظم و نسق وغیرہ کے لئے ضروری احکام جاری کئے۔ مجاہدین کی فلاح و بہبود کے لئے امرائے لشکر کو ہدایات دیں۔

مجاہدین کے لئے سرکاری کھانا

ایک دن مؤذن رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے شکایت کی کہ مسلمان افسر خود تو پرندوں کا گوشت اور میدے کی روٹی کھاتے ہیں لیکن عام مسلمانوں کو معمولی کھانا مشکل سے میسر آتا ہے۔ افسروں نے بتایا کہ شام و فلسطین میں اشیائے خوردنی بہت سستی ہیں۔ جتنی قیمت پر حجاز میں روٹی اور کھجور ملتی ہے، یہاں اسی قیمت پر پرندوں کا گوشت اور میدہ ملتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ افسروں کو پرندوں کا گوشت اور میدہ کی روٹی کھانے سے تو منع نہ کر سکے کیونکہ وہ اپنے خرچ سے کھاتے تھے۔ لیکن حکم دے دیا کہ غنیمت اور تنخواہ کے علاوہ ہر سپاہی کا کھانا بھی سرکاری طور پر مقرر کر دیا جائے۔

اذان بلالی رضی اللہ عنہ

ایک دن متعدد اکابر صحابہ اور امرائے لشکر حضرت عمر کے پاس جمع تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ نماز کا وقت ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان دینے کی درخواست کی۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں مذکور ہوا ایک دفعہ بلال رضی اللہ عنہ نے ان کی درخواست پر اذان دینے سے انکار کر دیا تھا۔[1] لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست پر کہا کہ "میں عزم کر چکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لئے اذان نہ دوں گا۔ لیکن آج اور صرف آج آپ کا ارشاد بجا لاؤں گا۔" چنانچہ بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دینا شروع کی۔ صحابہ کی آنکھوں کے سامنے عہد نبوی کا منظر آ گیا۔ سب پر رقت طاری ہو گئی اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔[1]

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس صلی اللہ علیہ وسلم کا   خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس صلی اللہ علیہ وسلم کا!

---

[1] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جب بلال رضی اللہ عنہ اذان دیا کرتے تھے تو اشھد ان محمد رسول اللہ کہتے وقت انگلی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب اشارہ کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مشار الیہ آنکھوں کے سامنے نہ رہا۔ اشارہ کس کی طرف کرتے؟ اس لئے اذان نہ دینے کا عہد کر لیا۔ چونکہ عہد صدیقی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا صدمہ ابھی تازہ تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی درخواست رد کر دی میور اور ہیکل کے مطابق حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے یہ آخری اذان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری سفر شام کے موقع پر دی جب وہ طاعون عمواس کے بعد وہاں تشریف لے گئے تھے۔ مؤلف

مسجد کی تعمیر

بیت المقدس سے واپس روانگی سے بیشتر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وہاں ایک مسجد کی تعمیر کا خیال آیا تا کہ مسلمان عیسائیوں کے گرجوں میں مداخلت نہ کریں اور اپنی مسجد میں نماز پڑھا کریں۔ صخرہ[1] کی جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ مقام اسریٰ ہونے کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صخرہ کا بہت احترام کیا۔ رومیوں نے وہاں کوڑے کرکٹ کے انبار لگا دیئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود اپنے ہاتھوں سے وہاں سے کوڑا اٹھا اٹھا کر پھینکا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا اور ساری گندگی ہٹا کر جگہ کو پاک صاف کر دیا اور آئندہ کے لئے اسے اپنی حفاظت و نگرانی میں لے لیا تا کہ وہاں کوئی غلاظت نہ پھینک سکے اور اس کی بے حرمتی نہ ہو پھر وہاں مسجد تعمیر کرائی گئی۔ یہی مسجد عمر رضی اللہ عنہ ہے جس کی تعمیر بار بار ہوتی رہی ہے اور اب اسرائیلی حکومت اس کی تخریب کے درپے ہے۔

۱۹ھ میں قیساریہ کی فتح کے بعد شام، فلسطین، اردن پورے طور پر مملکت اسلامیہ کا حصہ بن گئے اور ۱۹۴۸ء تک رہے تا آنکہ انگریزوں، امریکیوں اور روسیوں نے ایک عظیم اور گھناؤنی سازش کے تحت انبیا کی اس سرزمین کے قلب میں اسرائیل کا خنجر پیوست کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سفر ہائے شام و فلسطین

علامہ طبری کے بیان کے مطابق اس سفر کے بعد بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین دفعہ شام و فلسطین کا سفر کیا۔ ان میں ایک سفر تو وہ تھا جب آپ اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی اونٹ پر باری باری سواری کرتے ہوئے اس شان سے بیت المقدس پہنچے کہ غلام اونٹ پر سوار تھا اور آپ اس کی مہار پکڑے ہوئے تھے۔ آخری دفعہ اس وقت گئے جب عمو اس کے مقام پر اسلامی لشکر میں طاعون کی وبا پھوٹ رہی تھی۔ آپ نے سالار لشکر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لشکر سمیت وہاں سے نکل جانے کو کہا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ آپ مقام سرغ سے مدینہ واپس آ گئے۔ چوتھی مرتبہ گدھے پر سوار ہو کر وہاں پہنچے اور وبائے عمو اس میں فوت ہو جانے والے مجاہدین کے پسماندگان کے لئے انتظامات کیے۔

حمص کی بغاوت، جزیرہ کی فتح۔ نیز ایشیائے کوچک

۱۷ھ میں شام اور عراق کے درمیان جزیرہ کے عیسائیوں کی سازش اور مدد سے قیصر نے حمص اور دوسرے

---

[1] ہیکل سلیمانی کے قریب صخرۂ یعقوب واقع تھا۔ جو یہودیوں کے نزدیک بے حد مقدس مقام تھا اور یہودی ادھر کا رخ کر کے عبادت کرتے تھے۔ لیکن رومی اقتدار کے دوران میں وہاں کوڑا کرکٹ اور گندگی پھینکی جاتی تھی یہیں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج آسمانی پر تشریف لے گئے تھے۔ بعد میں عبدالملک بن مروان نے اس پر ایک شاندار گنبد تعمیر کرایا جو آج بھی قبۃ الصخرہ کے نام سے موجود ہے اور اسرائیلی اس کے درپے انہدام ہیں وائے ہماری کمزوری و مجبوری!

دما دم قبۃ الصخرہ سے یہ آواز آتی ہے
جو تھے تیغ و سناں والے ہیں اب آہ و فغاں والے

مؤلف

قریبی مفتوحہ علاقوں میں بغاوت کرائی اور بری اور بحری فوجیں بھیجیں تیس ہزار اہل جزیرہ بھی مسلمانوں کے خلاف صف آرائی کے لئے پہنچ گئے۔حمص کو شدید خطرہ پیدا ہو گیا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صورت حال سے مطلع کیا۔انہوں نے کوفہ کے گورنر اور سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو جلد سے جلد کمک بھیجنے کو لکھا۔عراقی فوجوں کی روانگی کی اطلاع پا کر اہل جزیرہ اپنے گھروں کو لوٹ گئے ہرقل کی فوجوں نے شکست فاش کھائی۔اس کے بعد پھر کبھی قیصر اور اس کی فوجوں کو شام و فلسطین کا رخ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔عراقی فوجوں نے تکریت،رقہ،دان،نصیبین،قرقیسیا،زوزان،عین الوروت،رہا میافارقین،سمیاط،حصن،راس عین ماردین، موصل،مروج وغیرہ فتح کر لئے۔سارے کا سارا جزیرہ مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا۔مسلمانوں کے شامی اور عراقی مفتوحہ علاقوں کی حدیں آپس میں مل گئیں۔حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ نے سیلیشیا کا علاقہ اس کے صدر مقام طرطوس سمیت فتح کر لیا اور بحیرہ اسود تک پہنچ گئے۔ایشیائے کوچک میں رومیوں کے لئے عیاض کا نام ایک ہوا بن گیا۔

مصر کی فتح (۲۰ھ......۶۴۱ء)

مشہور رومی جرنیل ارطبون (یا اطربون) بیت المقدس سے فرار ہو کر مصر چلا گیا تھا۔وہاں اس نے بڑی طاقت فراہم کر لی تھی۔اندیشہ تھا کہ ہرقل کے اشارے پر وہ شام و فلسطین پر حملہ نہ کر دے۔فلسطین کے امیر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قبول اسلام سے پہلے تجارت کے سلسلے میں مصر کا سفر کر چکے تھے۔وہاں کی زرخیزی،شادابی، تمول کے متعلق بہت کچھ جانتے تھے۔انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مصر کی قبطی آبادی رومی حکمرانوں کو ان کے جبر و تشدد، استحصالی پالیسی اور مذہبی اختلاف کی وجہ سے پسند نہیں کرتی۔عربوں خاص کر قریش کو مصر سے جذباتی لگاؤ بھی تھا۔ حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ کا تعلق سرزمین مصر سے تھا۔اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا بھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے حضرت ابراہیم کی والدہ تھیں،مصری نژاد تھیں اور مصر کے قبطی حاکم مقوقس نے انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجا تھا۔اندریں حالات طاعون عمواس کے موقع پر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ شام کا سفر کیا تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے انہیں مصر کی فتح کی طرف توجہ دلائی۔اور کہا کہ اگر قحط اور طاعون کی ہلاکت خیزیوں کے بعد مسلمانوں نے اب تک کے مفتوحہ علاقوں پر قناعت کر لی تو دشمن یہ سمجھیں گے کہ مسلمان کمزور ہو گئے ہیں اور یہ گمان انہیں حملے پر اکسائے گا۔پیش قدمی دفاع کا بہترین طریقہ ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام و عراق کی عرب آبادیوں سے آگے نہیں بڑھنا چاہتے تھے۔تاہم عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی باتوں سے متاثر ہو کر انہیں مصر کی طرف پیش قدمی کرنے کی اجازت دے دی۔اور وہ محض اپنی چار ہزار فوج کے ساتھ مصر کی طرف چل پڑے۔جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ واپس پہنچے تو اکابر صحابہ نے مصر کی مہم کی مخالفت کی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو امتناعی خط لکھا جو انہوں نے دانستہ مصر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد کھول کر پڑھا۔قاصد سے کہا کہ امیر المومنین سے کہنا کہ ہم حدود مصر میں داخل ہو چکے ہیں۔اب

یہاں سے لوٹنا جنگی اور سیاسی دونوں لحاظ سے ہمارے لئے مضر ہوگا۔ دشمن خیال کرے گا کہ ہم ڈر کر پسپا ہو گئے اور وہ ہم پر حملہ کرنے میں شیر ہو جائے گا۔ ناچار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ اور حضرت زبیر بن العوام کو دس ہزار مجاہدین کے ساتھ عمرو رضی اللہ عنہ کی مدد کے لئے روانہ کیا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یکے بعد دیگرے رومی جرنیلوں ارطبون اور تھیوڈور کو شکست دی۔ عریش، فرما، عین شمس (ہیلیو پولس) مصر (ممفس) بیلون، اسکندریہ (رومی و یونانی تہذیب و تمدن کا مرکز اور مصر کا دارالحکومت) اشمونین، اخمیم، سعید مصر، تینس، دمیاط، نونہ، شرطا وغیرہ فتح کر لئے مصر کے اصلی باشندوں قبطیوں نے جابر اور استحصال پسند رومیوں کے مقابلے میں عام طور پر مسلمانوں سے تعاون کیا۔

۶۴۱ء کے موسم خزاں میں پورا ملک مصر قیصر قسطنطنیہ کے ہاتھوں سے نکل کر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے قبضے میں آ گیا۔

فسطاط

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بالائی مصر میں شہر مصر (مفس) کے گرد کھلے میدان میں اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ وہاں ان کے خیمہ کے گرد ایک بڑا شہر آباد ہو گیا۔ جو ان کے خیمہ کی نسبت سے فسطاط کہلایا (عربی میں خیمہ کو فسطاط کہتے ہیں) آئندہ چل کر صدیوں تک یہ شہر مصر کا دارالحکومت رہا۔ پھر اس کے نزدیک قاہرہ کا جدید شہر آباد ہوا جسے فسطاط ہی کا پھیلاؤ کہنا چاہئے۔ فسطاط میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ایک مرکزی جامع مسجد کی بنیاد رکھی جو آج بھی انہی کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ کا قاصد...... جہانگیری سے ہے دشوارتر کار جہانبانی!

جب اسکندریہ فتح ہو گیا تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ کو فتح کی خوشخبری کے ساتھ مدینہ بھیجا۔ وہ دوپہر کے وقت وہاں پہنچے اور یہ سوچ کر کہ اس وقت امیرالمومنین آرام کر رہے ہوں گے، مسجد نبوی میں چلے گئے۔ اتفاق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی لونڈی ادھر آ نکلی اور معاویہ رضی اللہ عنہ کو نو وارد مسافر سمجھ کر ان سے سوال و جواب کئے۔ جب معلوم ہوا کہ اسکندریہ سے آئے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جا کر اطلاع دی۔ انہوں نے اسی وقت معاویہ کو بلا بھیجا اور پوچھا کہ سیدھے میرے پاس کیوں نہیں چلے آئے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میرا خیال تھا کہ گرمی کی اس شدید دوپہر میں آپ آرام کر رہے ہوں گے۔ اس لئے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”میرے بھائی! تمہارا خیال درست نہیں۔ اگر میں دن کو سوؤں گا تو خلافت کا بار کون اٹھائے گا؟“ بہر حال آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور روغن زیتون کے ساتھ معمولی روٹی خود بھی کھائی اور معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ کو بھی کھلائی۔ دنیا کے سب سے بڑے حکمران کے ہاں کھانے کو یہی کچھ تھا۔

مصری جنگی قیدیوں سے سلوک

مصر کی جنگوں کے دوران میں ہزاروں رومی اور قبطی جنگی قیدی بنائے گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے استفسار کے جواب میں لکھا کہ اگر چاہیں تو وہ لوگ مسلمان ہو جائیں، چاہیں تو اپنے مذہب پر قائم رہیں۔ قبول اسلام کی صورت میں ان کو دوسرے مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ دوسری صورت میں جزیہ دینا ہوگا۔ بہر حال انہیں آزاد کر دیا جائے اور لونڈی غلام نہ بنایا جائے۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے قیدیوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا ان کے عیسائی سرداروں کو بھی جمع کیا اور خلیفہ کا حکم پڑھ کر سنایا اور انہیں کہا کہ اپنے ضمیر کی آزادی سے کام لے کر جو فیصلہ چاہیں کر لیں۔ جب کوئی قیدی اسلام کا اظہار کرتا تو موجود مسلمان مجاہدین اور ان کے سردار اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے۔ جب کوئی عیسائیت پر قائم رہنے کا اعلان کرتا تو عیسائی مبارکباد کا غل مچاتے اور مسلمانوں کے شدت غم سے آنسو نکل آتے۔ دنیا میں ایسا نظارہ اس سے پہلے کسی آنکھ نے کاہے کو دیکھا ہو گا۔

مصری اراضی

مصری فلاحین کو ان کی زمینوں پر برقرار رکھا گیا اور غیر مسلموں پر خراج عائد کر دیا گیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے مصری اراضی مجاہدین میں تقسیم کرنے پر زور دیا مگر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے زیر حکم ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

نیل کی دلہن

مسلمانوں کی فتح مصر سے پہلے وہاں یہ رواج تھا کہ ہر سال ایک خوبصورت دوشیزہ کو خوب پہنا سجا کر دریائے نیل میں پھینک دیتے تھے۔ ان کے اعتقاد کے مطابق دوشیزہ کی بھینٹ پانے کے بعد نیل میں طغیانی آتی تھی۔ جس پر زمینوں کی سیرابی، غلہ کی پیداوار اور ملک کی خوشحالی کا انحصار تھا۔ اسلامی فتح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے یہ قبیح اور انسانیت سوز رواج بند کر دیا گیا۔ دوشیزہ کی بجائے دریائے نیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک رقعہ اس مضمون کا ڈالا گیا کہ "اے نیل! اگر تجھ میں اللہ کے حکم سے طغیانی آتی ہے تو ہم اللہ ہی سے التجا کرتے ہیں کہ طغیانی آتی رہے اور تیرا پانی زمینوں کو سیراب کرتا رہے اور اگر تو ماضی میں اپنی مرضی سے چڑھاؤ پر آتا رہا ہے تو ایسا کرنا بند کر دے۔" چنانچہ دوشیزہ کی قربانی بند کرنے کے باوجود بھی دریا کی طغیانی بند نہ ہوئی اور زمینیں حسب دستور سیراب ہوتی رہیں۔

محمد حسین ہیکل غالباً اپنی حد سے بڑھی ہوئی مصریت کی بنا پر زندہ لڑکی کو ہر سال دریائے نیل کی بھینٹ چڑھانے کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صرف ایک قد آدم بت بنا کر دریا میں ڈالا جاتا تھا۔ لیکن بے جان چیز کا دریا میں ڈالنا بے معنی معلوم ہوتا ہے اور اس کو روکنے کے لئے خلیفہ کے احکام ضروری نہ تھے۔ ولیم میور کا رجحان اسی طرف ہے کہ زندہ لڑکی دریا میں ڈالی جاتی تھی اور لین کا حوالہ دیتے ہیں۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم سے یہ سنگدلانہ اور توہم پرستانہ رسم ختم کر دی گئی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی صدیوں (شاید عبیدیوں کے عہد) میں یہ رسم ایک بت کی صورت میں پھر سے زندہ کر دی گئی۔ ڈاکٹر محمد حمید لکھتے ہیں کہ "راقم مقالہ (ڈاکٹر محمد حمید اللہ) نے ۱۹۳۹ء میں قاہرہ میں دیکھا تھا کہ لڑکی کی قربانی اب بھی باقی ہے۔ البتہ

زندہ انسان کی جگہ وہ ایک مصنوعی بت ہوتی ہے۔اور بڑے اہتمام سے اس کو ڈبونے کی عید شم النسیم منائی جاتی ہے۔مگر یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ رواج کب سے شروع ہوا۔"

اسکندریہ کا کتب خانہ

مستشرقین نے یہ غلط فہمی بڑے اہتمام سے پھیلائی ہے کہ اسکندریہ کا عظیم الشان کتب خانہ فتح کے وقت مسلمانوں نے جلا دیا۔ یہ سراسر بے بنیاد الزام ہے اور تو اور خود سرولیم میور جیسے متعصب مستشرق نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا شبلی نے اس الزام کے رد میں ایک مدلل اور مفصل مقالہ لکھا ہے۔ محمد حسین ہیکل نے "عمر فاروق اعظم" میں اس کا ابطال کیا ہے۔ جسٹس سید امیر علی نے بھی "مختصر تاریخ عرب" میں اسے جھوٹ کا پلندہ قرار دیا ہے۔

اسکندریہ کا کتب خانہ جلانے کی کہانی بعد کی من گھڑت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے روشن خیال، فراخدل، بردبار، بے تعصب اور ذمیوں کے ہمدرد خلیفہ سے یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ان کی املاک (کتب خانہ) کو جلا دینے کا حکم دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتب خانے کا بڑا حصہ جولیس سیزر کے محاصرے کے دوران میں تباہ ہوا اور باقی ماندہ چوتھی صدی عیسوی میں رومی شہنشاہ تھیوڈوسیس کے عہد میں برباد ہوا وہ ایک پر جوش عیسائی حکمران تھا اور غیر عیسائیوں کی تصانیف سے نفرت کرتا تھا۔ اس کے حکم سے اس عظیم الشان کتب خانے کے باقیات کو نذر آتش کر دیا گیا۔

طرابلس کی فتح

مصر کو زیر نگیں لانے کے بعد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر کے مغرب کی طرف افریقیہ (شمالی افریقہ) کا رخ کیا اور برقہ کا محاصرہ کرلیا۔ باشندوں نے جزیہ کی ادائیگی پر اطاعت قبول کرلی۔ اہل زدیلہ نے بھی یہی کیا۔ اس کے بعد طرابلس (موجودہ لیبیا) پر چڑھائی کی۔ ایک معمولی سی جنگ کے بعد وہ بھی فتح ہوگیا۔ فتوحات فاروقی کی حد یہاں ختم ہوجاتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے مکان کی تعمیر

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے لئے مصر کے دارالحکومت میں ایک مکان تعمیر کرایا۔ آپ کو اطلاع ملی تو سختی سے لکھا کہ یہ بے جا اسراف ہے۔ میرے مصر میں آکر قیام کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ اسے دوسرے سرکاری مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

فتوحاتِ فاروقی پر تبصرہ

واکر نے لکھا ہے کہ "ابتدائی عرب (مسلمان) فاتح ان پڑھ اور خانہ بدوش ہونے کی بناء پر بے شک وحشی سمجھے جاسکتے ہیں لیکن وہ وحشی اپنی جنگوں میں دنیا کی مہذب ترین قوموں سے بھی زیادہ مہذب ثابت ہوئے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری ایام میں صورت حال یہ تھی کہ ایران کی ہزار سالہ پرانی ساسانی سلطنت خانہ بدوش عرب مسلمانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک چکی اور بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ عراق عرب، عراق عجم، فارس، خوزستان، آذربائیجان، سیستان، طبرستان، خراسان، کرمان، مکران، الجزیرہ، آرمینیہ وغیرہ مملکت اسلامیہ کا حصہ بن گئے۔ دوسری طرف رومی (بازنطینی) سلطنت کے زرخیز ترین اور سرسبز و شاداب صوبے شام، فلسطین، اردن مصر نیز طرابلس اس سے ہمیشہ کے لئے کٹ کر اسلام کے زیر نگیں آ گئے اور اسلامی مملکت کی حدود سندھ کی سرحد سے لے کر طرابلس الغرب تک پھیل گئیں۔ دس بارہ سال کے اندر مملکت اسلامیہ دنیا کی سب سے بڑی مملکت بن گئی۔ تقریباً گیارہ لاکھ مربع میل علاقہ عہد فاروقی میں فتح ہوا۔ اور یوں ہوا کہ نہ تو بخت نصر، سکندر یونانی، اٹیلا، رومیوں، ایرانیوں، چنگیز خاں، نپولین اور بیسویں صدی کے جرمنوں، روسیوں، فرانسیسیوں، اطالویوں، جاپانیوں کی طرح شہر، دیہات اور کھیت برباد اور نذر آتش کئے گئے، نہ مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں کا قتل عام کیا گیا نہ امریکیوں کی طرح ایٹم بم گرا کر شہروں اور انسانوں کو جرم بے گناہی میں صفحۂ ہستی سے مٹایا گیا، نہ انہیں بلا وجہ لونڈی غلام بنایا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں اتحادیوں (انگریزوں، فرانسیسیوں، روسیوں، امریکنوں) نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ وہ جرمنی جاپان وغیرہ محوری طاقتوں کے خلاف اس لئے برسر جنگ ہیں کہ آئندہ ہمیشہ کے لئے جنگ کا خاتمہ کر دیا جائے یعنی ان کے دعویٰ کے مطابق وہ جنگ ختم کرنے کے لئے جنگ کر رہے تھے۔ حالانکہ درحقیقت وہ اپنے مقبوضات، نوآبادیات، تجارتی مفادات اور کمزور و پسماندہ ممالک پر اپنی چودھراہٹ برقرار رکھنے کے لئے جنگ میں کودے تھے اور ان نام نہاد مہذب، متمدن اور ترقی یافتہ اقوام نے اس قدر خونریزی کی اور تباہی و بربادی مچائی کہ تاریخ انسانی کی تمام گزشتہ جنگوں کے ریکارڈ مات کر دیئے۔ جنگی قیدیوں کے علاوہ لاکھوں پرامن شہریوں کو پکڑ پکڑ کر اجتماعی بیگار کیمپوں (Concentration Camps) معدنی کانوں، برفیلے اور ریگستانی علاقوں میں اذیت اور بیگار کی زندگی گزارنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لئے دھکیل دیا۔ بے شمار مرد، عورتیں، بچے وہاں سخت تکلیف اور کس مپرسی اور فاقہ زدگی کی حالت میں مرکھپ گئے۔ یا گیس چیمبروں میں بڑی سنگدلی اور بیدردی سے ہلاک کئے گئے۔ عیسائی یورپی ممالک کی انیسویں صدی تک کی باہمی جنگوں اور امریکہ کے یورپی آبادکاروں کی وہاں کے بے گناہ اصل باشندوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے والی جنگوں سے قطع نظر کر کے صرف موجودہ صدی کی دو عالمی جنگوں کے ریکارڈ دیکھئے جو یورپ کی عیسائی اقوام نے چھیڑیں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے جن کا پیغام یہ تھا کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو اپنا دوسرا گال بھی اس کے سامنے پیش کر دے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اقوام یورپ و امریکہ کی چھیڑی ہوئی پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں کم سے کم تین کروڑ فوجی اور غیر فوجی افراد ہلاک ہوئے۔ ہلاک شدگان میں جوان، بوڑھے، بچے، عورتیں سب بلا تمیز شامل تھے زخمی اور ہمیشہ کے لئے معذور اور اپاہج ہونے والوں کی تعداد بھی کروڑوں تک پہنچتی ہے۔

دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) میں کم سے کم ایک کروڑ تریپن لاکھ ہر قسم کے انسان ہلاک ہوئے۔

اور کروڑوں زخمی اور اپاہج۔ اس کے مقابلے میں خلافت راشدہ کے دوران میں ہونے والی تمام جنگوں میں تقریباً چار لاکھ آدمی مارے گئے۔

یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے مفتوح قوموں کو لونڈی غلام بنایا جو بے بنیاد ہے ایسا بہت کم ہوا اور وہ بھی مجبور کن حالات میں۔ قرآن وحدیث غلامی کے مؤید نہیں بلکہ غلاموں کی آزادی کو کار ثواب قرار دیتے ہیں۔ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے کہ مصر کی فتح اور نہاوند کی فتح کے وقت نیز متعدد دوسری فتوحات کے موقع پر کسی کو غلام نہیں بنایا گیا اور جنہیں بامر مجبوری غلام بنایا بھی گیا ان سے انسانیت نواز سلوک کیا گیا اور انہیں حقوق دیئے گئے۔ جن میں مکاتبت کا حق بھی شامل تھا۔ اس کے برعکس یورپ اور امریکہ میں عام غلاموں اور زرعی غلاموں (serfs) سے جو ظالمانہ سلوک روا رکھا جاتا تھا، اس کے ذکر سے کتابیں کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ''مہذب'' یورپی اقوام لاکھوں کی تعداد میں سادہ لوح اور کمزور حبشیوں کو پکڑ پکڑ کر امریکہ لے جاتی رہیں اور اپنی نو آبادیوں میں ان سے نہایت ظالمانہ طریقے سے کام لیتی رہیں۔ ان کے کوئی حقوق نہ تھے۔ ان کی عورتوں کی عزت لوٹی جاسکتی تھی، انہیں بے دریغ قتل کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ انگلستان کے ڈکٹیٹر کرامویل کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی خود ہزاروں انگریز مرد عورت، نو آباد امریکیوں کے ہاتھ بطور غلام فروخت کیے گئے۔ پھر جب امریکی صدر ابراہام لنکن نے انسداد غلامی کا قانون پاس کیا اور غلاموں کو آزاد کیا تو امریکہ میں زبردست خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ امریکہ کے آزاد شدہ غلاموں کی اولاد موجودہ نیگرو یا کالے اب بھی مساوی اور باعزت سلوک کے مستحق نہیں سمجھتے تھے۔

قاری اندازہ کرسکتا ہے کہ کس کے افسانوں سے بوئے خوں آتی ہے؟ مسلمانوں نے محض جوع الارض اور استحصال اقوام کی خاطر جنگ نہیں کی بلکہ امن کی خاطر اور دنیا سے فتنہ وفساد کو مٹانے کی خاطر جنگ کی۔ ان کا پیغام یہی رہا کہ مسلمان ہو جاؤ تو ہمارے بھائی ہو اور ہمارے تمہارے حقوق وفرائض یکساں۔ مسلمان نہیں ہوتے تو جزیہ دینا قبول کر کے ہمارے زیر حفاظت آجاؤ اور اللہ کی زمین پر فتنہ وفساد نہ پھیلاؤ، نہ زیردستوں اور کمزوروں پر ظلم کرو، امن وآشتی سے رہو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے۔ تو پھر ہمارے تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ تسخیر ممالک اس پیغام کی ضمنی پیداوار تھی۔ عورتیں، بچے، بوڑھے اور تارک الدنیا لوگ ان کی تلواروں کی زد سے باہر تھے۔ نہ انہوں نے کھیتیاں جلائیں نہ درخت نہ مویشی ہلاک کیے۔ اپنے معاہدوں کا ہمیشہ پاس کیا۔ مفتوحین کی مذہبی آزادی اور انسانی حقوق کا احترام کیا۔ ان کی عبادت گاہوں سے کوئی بھی تعرض نہیں کیا۔ عدل وانصاف کے معاملے میں انہیں اپنی سطح پر رکھا۔ ان کی نظر میں ایک ذمی کا خون بھی اتنا ہی رنگین اور قابل احترام تھا جتنا فاتح قوم کے کسی مسلمان فرد کا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مقتول ذمی کے قصاص کے بدلے میں اس کے قاتل مسلمان کو مقتول کے وارث کے حوالے کر دیا تھا جس نے اسے قصاص میں قتل کر دیا۔ عہد فاروقی کی فتوحات کی تیز رفتاری اور وسعت میں مجاہدین کی اصول پرستی، انصاف پسندی، خدا خوفی اور اعلیٰ عملی اخلاق کو بھی اتنا ہی دخل تھا جتنا ان کے جذبۂ جہاد وشہادت کو۔ مفتوحین کا یہ شب وروز کا مشاہدہ تھا کہ فاتحین میں باہمی اخوت اور مساوات کارفرما ہے۔ ان میں اعلیٰ وادنیٰ کا

امتیاز نہیں۔ سب کے حقوق وفرائض یکساں ہیں۔

اس مشاہدے نے مفتوح اقوام کے عوام کو خاص کر متاثر کیا۔ اور وہ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تاکیدی حکم تھا کہ مفتوحہ علاقوں کے کاشتکاروں سے تعرض نہ کیا جائے، انہیں ان کی زمینوں پر برقرار رکھا جائے۔ رومیوں اور ایرانیوں کے رواج کے برعکس انہیں مالکانہ حقوق دیئے جائیں۔ مجاہدین میں سے کوئی ان سے قیمتاً بھی زمین خرید نہیں سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آبادیوں کی اکثریت نے بغیر کسی دباؤ کے اپنی رضا ورغبت سے اسلام قبول کرلیا اور ان کے عرب مسلمانوں سے شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ عربی زبان کا رواج عام ہوگیا بلکہ ایران کے سوا دوسرے مفتوحہ ممالک میں علاقائی زبانوں کی جگہ بھی عربی نے لے لی۔ ایران میں بھی عربی زبان کے بڑے بڑے عالم اور فاضل پیدا ہوئے۔

مستشرقین نے یہی بین بجائی ہے کہ مسلمانوں سے آویزش کے وقت روم و ایران کی سلطنتیں روبہ زوال ہو چکی تھیں۔ نظم ونسق کو گھن لگ چکا تھا اندرونی سازشیں اور امرائے سلطنت کی باہمی رقابتیں زوروں پر تھیں۔ حکام سلطنت اور جاگیردار رعایا پر جبر وظلم کرتے تھے۔ فرقہ وارانہ مذہبی اختلافات بھی موجود تھے۔ ان دونوں سلطنتوں کی باہمی جنگوں نے بھی انہیں کمزور کر دیا تھا۔ دراصل یہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی بات ہے۔ مستشرقین اسلامی فتوحات کی حیرت انگیز برق رفتاری اور سیلابی کیفیت کی اہمیت کو گھٹا کر پیش کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ فتوحات اسلام اور مسلمانوں کی کسی خوبی اور اندرونی قوت کی بناء پر نہیں تھیں بلکہ روم اور ایران کی اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے تھیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت وتائید مسلمانوں کے شامل حال کی جس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ روم و ایران کی متحارب سلطنتوں کے زور قوت کے قلعوں میں اندرونی دراڑیں پیدا کردیں۔ لیکن یہ پوری صداقت نہیں۔ روم اور ایران کی سلطنتوں کی وسعت، قوت، وسائل، سروسامان کی فراوانی، بہتر اور متنوع جنگی اسلحہ، منظم اور تربیت یافتہ کثیر التعداد افواج کے مقابلے میں مسلمانوں کے مادی، فوجی اور جنگی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے اور پھر رومیوں ایرانیوں کو اپنے ممالک کے اندر اپنے محفوظ ومضبوط قلعوں اور مورچوں میں بیٹھ کر مسلمانوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ہمیشہ ان سے تگنی، چوگنی، پانچ گنی فوج آتی رہی۔ نفسیاتی، روحانی اور اخلاقی قوت کے سوا انہیں مسلمانوں کے مقابلے میں ہر طرح کی برتری حاصل تھی۔ مسلمانوں کی کامیابی کا بڑا سبب ان کا اعلیٰ اخلاق، جذبۂ اشاعت دین، جوش جہاد اور جذبۂ شہادت تھا۔ خدا کی راہ میں غازی یا شہید ہونا ایک ایسا عقیدہ اور تصور تھا جس کی رومیوں اور ایرانیوں کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ قرآن کا پیغام ساری انسانیت کے لئے تھا۔ اس کے حامل اولین مسلمانوں کا ایمان تھا کہ خدا کے اس آخری پیغام کو ساری دنیا تک پہنچانا اور خود کو اس کی تعلیمات کا مجسم عملی نمونہ بن کر دکھانا ان کا فرض ہے۔ راہ کی مشکلات کی انہیں پرواہ نہ تھی، قیصر وکسریٰ تو کیا وہ جنات کی افواج اور سمندر کی امواج سے بھی لڑ جاتے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے۔

شہادت ہے مطلوب ومقصود مومن   نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذت آشنائی
کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں، نظر میں، اذان سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں
کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو — ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

مسلمانوں مجاہد دن کو شہسوار اور راتوں کو عابد شب زندہ دار تھے۔ رومیوں، ایرانیوں کے حاکمانہ جبر و تشدد کے برعکس مفتوحین سے ان کا سلوک نرم اور عادلانہ تھا۔ مفتوح رعایا ان کی گرویدہ ہو جاتی تھی۔[1] ایسے واقعات کا ذکر فتوحات کے بیان میں کیا جا چکا ہے۔ یرموک میں جب رومی افواج کا زبردست اجتماع ہوا اور مسلمانوں کو ان سے نپٹنے کے لئے حمص اور بعض دوسرے شہر خالی کرنے پڑے تو وصول شدہ جزیہ اہل شہر کو واپس کر دیا۔ یہ دیکھ کر عیسائی اور یہودی رعایا روتی تھی۔ عیسائی دعا مانگتے تھے کہ ''خدا تم کو پھر اس ملک میں واپس لائے۔'' یہودیوں نے تورات ہاتھوں میں لے کر قسم کھائی کہ ''ہمارے جیتے جی قیصر اب یہاں نہیں آ سکتا۔'' ایک دوسرے موقع پر مسلمانوں کے عدل و انصاف کو دیکھ کر کہا کہ ''زمین و آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں۔''

شام و عراق میں آباد عیسائی اور مشرک عرب قبائل کو ابتدائی معرکوں کے بعد احساس ہوا کہ غیر نسل کے جابر رومی اور ایرانی حکمرانوں سے اپنے ہم نسل عرب مسلمان بہرحال بہتر ہیں کہ اچھے سلوک سے پیش آتے ہیں اور ان کے گاڑھے پسینے کی زرعی اور دوسری کمائی کا بیشتر حصہ چھین کر ان کا استحصال نہیں کرتے بلکہ ایک بہت معمولی ٹیکس (جزیہ) ان کے قابل کار مردوں سے وصول کرتے ہیں اور اگر ان کے ساتھ ہو کر ان کے دشمنوں سے لڑیں تو وہ بھی معاف کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے ان میں سے بہت سے برضا و رغبت مسلمان ہو گئے۔ مصر میں قبطیوں کا بھی یہی حال رہا۔ باقی ماندہ اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے مسلمانوں کے اتحادی بن گئے۔ ان کے مذہبی اور انسانی حقوق میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی۔ البتہ عراق عجم اور ایران کے دوسرے صوبوں میں جہاں کی رعایا خالص ایرانی النسل تھی اور اپنے شہنشاہ کو آسمانی تقدس کا حامل سمجھتی تھی اور جہاں مرکزی حکومت کے ماتحت بڑے بڑے جاگیردار اور اضلاع اور صوبوں کے مالک رئیس اور چھوٹے بادشاہ موجود تھے، وہاں سخت مقابلے ہوئے لیکن یزدگرد کے ترکستان بھاگ جانے اور بالآخر مارے جانے کے بعد وہاں کی رعایا بھی مطیع و منقاد ہو گئی۔ رئیسوں، جاگیرداروں، مرزبانوں، بادشاہوں نے اسلام قبول کر کے یا جزیہ دے کر اپنی ریاستیں بچالیں اور اسلامی اصول امن عامہ اور انصاف عامہ سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لیا۔ انگریز مستشرق آر۔ اے۔ کب اپنی کتاب ''محمڈن ازم'' (صفحہ ۴) میں لکھتا ہے:

''ان فتوحات کی رفتار کی تیزی سے کہیں زیادہ حیرت انگیز وہ نظم و ضبط تھا جو ان میں ملحوظ رکھا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان جنگوں کے دوران میں تھوڑی بہت تخریب بھی ہوئی لیکن بحیثیت مجموعی ان عربوں

---

[1] ۱۹۶۵ء کی پاک۔ بھارت جنگ میں بھی پاکستانی افواج نے بھارت کے مفتوحہ علاقوں کی آبادی سے اسلامی اصول جنگ پر مبنی نہایت عمدہ سلوک کیا جس کا اعتراف دشمنوں اور غیر جانبدار غیر ملکی صحافیوں نے بھی کیا۔ مؤلف

نے اپنے پیچھے کھنڈرات کے آثار چھوڑنے کے بجائے مفتوحہ قوموں اور ان کے تمدن کے امتزاج کے لئے نئی نئی شاہراہیں تعمیر کیں۔ وہ نظام جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ورثا (خلفاء) کو ترکہ میں دیا تھا، اس نے ان بدوی لشکروں کے سیلاب کو قوانین وضوابط کے ساحلوں میں محصور رکھ کر جریدۂ عالم پر اپنی قدر و قیمت ثبت کردی۔ ان فتوحات کی رو سے اسلام بیرونی دنیا سے لوٹ مار کی خاطر تباہی مچانے والے جھکڑ کی شکل میں متعارف نہیں ہوا بلکہ ایک ایسی اخلاقی قوت کی شکل میں متعارف ہوا جس کے احترام میں مفتوحہ اقوام کے قلوب جھک گئے اور اس نے ایک ایسا نظریۂ حیات پیش کیا جس کی حریف نہ مشرقی روم کی عیسائیت ہوسکی نہ ایران کی مجوسیت۔''

اسلامی فوج کے لئے رہنما اصول خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ابتداء ہی سے مقرر کردیئے تھے۔ پوری خلافت راشدہ کے دوران میں ان پر عمل کیا گیا۔ صرف مقابلے میں آنے والوں سے جنگ وقتال کی اجازت تھی۔ دشمن سے بدعہدی اور فریب کاری نہیں کی جاسکتی تھی، دشمن کا مثلہ کرنے کی بھی سخت ممانعت تھی۔ پھل دار درخت، کھیت اور مویشی محض انتقاماً برباد نہیں کئے جاسکتے تھے۔ دنیا میں کوئی ایسا فاتح دکھائی نہیں دیتا جس نے اس حزم واحتیاط، اصول وضوابط اور اخلاقی پابندیوں کے ساتھ جنگیں لڑیں اور فتوحات حاصل کی ہوں اور مفتوحہ ممالک ہمیشہ کے لئے اس کی سلطنت کا حصہ بن گئے ہوں۔ دنیا کی تاریخ میں کسی ایسے فاتح کا پتہ نہیں ملتا جو بیک وقت کشور کشائی، حسن انتظام، اعلیٰ تدبر، عدل، خدا ترسی، تقویٰ اور بردباری کا جامع ہو۔ سکندر اعظم، اٹیلا، چنگیز خاں، نپولین، تیمور، نادر شاہ وغیرہ بہ نفس نفیس اپنی فوجوں کی کمان کرتے اور انہیں لڑاتے تھے جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ میں رہتے ہوئے سینکڑوں ہزاروں کوس دور وسیع محاذوں پر فوجوں کو لڑاتے رہے اور ہر محاذ کے بدلتے ہوئے حالات سے پوری طرح باخبر رہتے رہے۔ جدید عہد کی جنگوں میں ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ ومواصلات اور اسباب نقل وحمل نے ایسا کرنا آسان بنا دیا ہے لیکن آج سے چودہ سو برس پہلے یہ آسان کام نہ تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شام وعراق میں لڑنے والی فوجوں کے سپہ سالاروں کو نقل وحرکت، پیش قدمی، دشمن سے مذاکرات، میدان جنگ میں لشکر آرائی وغیرہ کے متعلق برابر مفصل ہدایات بھیجتے رہتے تھے۔ جنگ قادسیہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کی ساری منصوبہ بندی شروع سے آخر تک انہوں نے خود کی تھی حتیٰ کہ مختلف پڑاؤ اور میدان جنگ کے نقشے بھی خود تیار کئے تھے۔ برق رفتار پرچہ نویسوں اور قاصدوں کے ذریعے محاذ کے سالاروں سے اپنا رابطہ قائم رکھتے۔ سپہ سالاروں کے ماتحت سالاروں کا انتخاب بھی خود کرتے اور ان کا انتخاب کبھی غلط ثابت نہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ فاروق اعظم ایک فوجی اور انتظامی جینئس تھے۔

فتوحات کی وسعت

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساڑھے دس سالہ دور خلافت میں مملکت اسلامیہ کے حدود جزیرہ نمائے عرب کے باہر مصر وطرابلس سے مکران تک پھیل گئے۔ عراق عرب، شام، فلسطین، اردن، مصر، جزیرہ، خوزستان، عراق عجم،

آرمینیہ، آذربائیجان، فارس، طبرستان، سیستان، کرمان، خراسان اور مکران مدینہ کی حکومت کے زیر نگین آ گئے۔ اگر بلاذری کی روایت کو درست مانا جائے تو عہد فاروقی ہی میں مسلمان مجاہدین کے قدم سندھ کے دیبل اور ہندوستان کے ساحل مالا بار کے مقام تھانہ تک پہنچ گئے۔ گیارہ لاکھ مربع میل رقبہ آپ کے عہد میں فتح ہوا۔ آپ کے عہد کی مملکت اسلامیہ کا کل رقبہ بائیس لاکھ اکاون ہزار اور تیس (۲۲۵۱۰۳۰) مربع میل ہوتا ہے جو بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، برما اور سری لنکا کے مجموعی رقبہ سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ اتنا وسیع رقبہ کسی دوسرے فرمانروا فاتح نے اپنے دس سالہ عہد حکومت میں فتح نہیں کیا اور وہ بھی اس طرح کہ صدیوں تک کے لئے اس کی مملکت کا حصہ بن گیا ہو۔ ایک یورپی مؤرخ نے لکھا ہے کہ ''اگر عمر رضی اللہ عنہ چند سال اور زندہ رہتے تو دو تہائی کرۂ ارض مسلمانوں کے زیر نگیں ہوتا۔ جہاں کہیں اسلام پہنچا۔ تمام آبادیاں مسلمان ہو گئیں۔ اس وقت کی مہذب دنیا کو اسلام کے آستانے پر جھکنے کے سوا چارۂ کار ہی نہ تھا۔''

فاروقی فتوحات کے اثرات

عالمی سطح پر فاروقی عہد کی فتوحات کا سب سے بڑا اثر تو یہ ہوا کہ قیصر و کسریٰ کی تقدس مآب ہمہ جہت شہنشاہی کی بجائے اللہ کی حاکمیت کا اعلیٰ تصور اجاگر ہوا۔ اور عام انسان میں اپنے حقوق کا شعور بیدار ہوا۔ رنگ و نسل کا امتیاز ختم ہو کر کم سے کم اسلام کے مفتوحہ ممالک کی حد تک عملاً عالمگیر انسانی برادری اور مساوات قائم ہوئی۔ بعد میں اس سے غیر مسلم مالک بھی کم و بیش متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اسلامی فتوحات کا سیلاب خود عربوں پر بھی اثر انداز ہوا اور ان کے مفتوحہ ممالک و اقوام پر بھی۔ ابتدائی مسلمانوں نے روم و ایران کی متمدن اقوام سے تہذیب، تمدن اور حضارت کے بہت سے طور طریقے سیکھے، مفتوح اقوام کے علوم و فنون سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ انہیں از سر نو زندہ اور مدون کیا اور دور دور تک پھیلایا۔ بدویت کی سادگی کی جگہ ان میں شہری زندگی کی نفاست پیدا ہوئی۔ ان کے گھروں میں رومی، شامی، مصری، ایرانی خواتین کے داخلے سے گھریلو معاشرت اور اولاد کی تعلیم و تربیت اور اندازِ فکر بھی متاثر ہوئے۔

> ''عربوں کا اپنے جزیرہ کو چھوڑ کر باہر نکلنا، متفرق ممالک میں پھیلنا، قیصر و کسریٰ کی حکومتوں پر قابض ہونا، مختلف قوموں اور نسلوں سے اختلاط، متفرق تہذیبوں اور ذہنیتوں سے تاثر فتوحات ہی کا نتیجہ تھا۔ عراق جو ایک قدیم تمدن کا حامل تھا، بڑی بڑی قوموں اور مختلف عقیدوں کا مرکز رہ چکا تھا، یہاں انہوں نے کوفہ و بصرہ آباد کئے۔ انہوں نے ایران کو زیر نگیں کیا جو ان دو حکومتوں میں سے ایک تھا جنہوں نے قدیم دنیا پر اس زمانہ میں نہ صرف فرمانروائی کی تھی بلکہ اس کی فکر و عقل پر اثر انداز بھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے شام کو فتح کیا جہاں اس وقت رومی تہذیب اور عیسائی مذہب کا دور دورہ تھا اور جہاں پہلے سے فینیقی، کنانی مصری، یونانی اور غسانی اپنے آداب و اطوار، اعتقادات اور طرز حکومت کے نمایاں آثار باقی چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے مصر فتح کیا جو تمدن و فنون کا گہوارہ اور یونانی و رومی

تہذیبوں کا سنگھم تھا اور جہاں مشرقی و مغربی فلسفے آ کر مل گئے تھے۔ انہوں نے مغرب میں جبل الطارق[1] تک اور ماوراء النہر میں کاشغر[2] تک کے علاقے فتح کر لئے تھے۔ ان تمام مفتوحہ ممالک کے باشندے سامی، حامی اور آریہ نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف سماوی وارضی مذاہب پر عمل پیرا تھے۔ وہ فارسی، قبطی، سریانی، یونانی، عبرانی، لاطینی زبانیں بولتے تھے۔ عربوں نے ایک طرف تو اپنی فتوحات سے ان اقوام کو مادی (اور سیاسی) طور پر سرنگوں کیا اور زبان و مذہب کی طاقت سے ان پر ادبی و روحانی غلبہ حاصل کیا۔ دوسری طرف وہ خود عقلی و نسلی اعتبار سے ان کے زیر اثر آ گئے۔ بود و باش اور شادی بیاہ کے تعلقات سے ان کے تمدن، ذہنیت اور نسل کو اپنانے لگے۔ اس باہمی امتزاج کا نتیجہ علوم شرقیہ، فنون ادبیہ اور تمدن اسلامی کی شکل میں پیدا ہوا جس نے روئے زمین کو اپنے احاطہ میں لے لیا اور جدید انسان کی ترقی کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔''[3]

مسلمان ''خدائے لم یزال کا دست قدرت تو، زباں تو ہے'' کا مصداق بن گئے مفتوحہ ممالک میں عربی زبان تمام مروج زبانوں پر غالب آ گئی۔ قدیم رسم الخط کی جگہ عربی رسم الخط نے لے لی۔ عربی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی زبان بن گئی۔ قرآن مجید کی تفسیریں، احادیث کے مجموعے اور فقہ کی کتابیں اکثر غیر عرب علماء اسلام نے عربی میں مرتب کیں مفتوحہ ممالک میں ایک نئی اور اصلح تہذیب، نئی ثقافت اور نئی طرز فکر نے جنم لیا جسے بحیثیت مجموعی اسلامی تمدن کہا جا سکتا ہے۔ اسلامی ممالک کی ایک دولت مشترکہ وجود میں آئی جس میں نقل و حرکت اور تلاش روزگار کے لئے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان ملک میں اجنبی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ مراکش کے شہر طنجہ سے چل کر سیاح ابن بطوطہ محمد تغلق کے دارالحکومت دہلی کا قاضی القضاۃ ہو سکتا تھا۔ سندھ کا مولوی محمد حیات حرمین شریفین میں مسند درس و تدریس کا صدر نشیں ہو سکتا تھا۔ ایران و توران سے بے شمار لوگ آ کر ہندوستان کی مغل حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو سکتے تھے۔ کسی ڈومیسائل سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہ تھی۔ ذمیوں کو بھی تمام مسلم ممالک میں آزادی سے رہنے، گھومنے پھرنے، ملازمت کاروبار کرنے اور اسلامی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کی عام اجازت تھی، جوزف ہل اپنی تصنیف ''عرب تہذیب'' میں لکھتا ہے:

''ایرانی، بازنطینی اور مصر کے قبطی ایک ناقابل علاج جمود کا شکار ہو چکے تھے اور اس قابل ہی نہ رہے تھے کہ اپنی جدوجہد کے ذریعے وہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکتے، عربوں کے ساتھ ربط و ضبط نے انہیں

---

[1] جبل الطارق تک مسلمانوں کے قدم عہد فاروقی کے بعد پہنچے۔ یہاں عمومی ذکر ہے۔ مؤلف

[2] کاشغر آج کل چینی حکومت کے زیر تسلط ہے۔ صوبہ سنکیانگ کا صدر مقام ہے۔ پاکستان کی چین کے ساتھ تجارت کاشغر کے ذریعے ہونے لگی ہے۔ یہ شاہراہ ریشم کا چینی سرا ہے۔ اقبال نے اس شعر میں اس کے اسلامی شہر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ مؤلف

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

[3] تاریخ ادب عربی مصنفہ استاذ احمد حسن زیات اردو ترجمہ از عبدالرحمٰن سورتی ص ۱۵۸ تا ۱۵۹

اس جمود سے نجات دی اور ایک تازہ جذبہ علم و دانش کے لئے بیدار کر دیا۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں یہ ایک بہت بڑا واقعہ ہے اور عربوں کے مشن کی اہمیت کا نا قابل تردید ثبوت .... عربوں نے اپنے ملک کے علاوہ مفتوحہ علاقوں میں بھی علوم و فنون کی نئی نئی درس گاہیں کھولیں۔ اس کی مثال نہ عہد قدیم کی تاریخ پیش کر سکتی ہے اور نہ ابتدائی دور کی عیسائیت"

رومیوں اور ایرانیوں کے جور، ناانصافی اور استحصال کے بارگراں کے تلے دبی ہوئی اقوام کے لئے علم و تہذیب کے حصول کے مواقع بہت کم تھے۔ لہٰذا ان کے لئے عہد فاروقی کی فتوحات بہت خوش آئند تھیں۔ مفتوحین نے مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھا۔ پروفیسر واکر "بین الاقوامی قانون کی تاریخ" میں لکھتے ہیں:

"انسانی معاشرہ کی تاریخ میں ایسا بارہا ہوا کہ قوموں نے حملہ کیا اور قابض ہو گئیں، لیکن عجیب بات ہے کہ جرمنوں، تاتاریوں وغیرہ وحشیوں کے برعکس جب عرب کے ریگستان سے وہاں کے وحشی بدو (خلافت راشدہ کے دوران میں) اچانک سیلاب کی صورت میں باہر ابل پڑے تو ان کی فتوحات کی شان دوسری وحشی قوموں کی فتوحات سے بالکل نرالی تھی۔ ان وحشی بدوؤں میں ابتداء ہی سے ان کی مفتوحہ اقوام و ممالک سے کہیں زیادہ تہذیب اور اخلاق حسنہ دکھائی دیتے ہیں۔"[1]

ایک متعصب رومن کیتھولک پادری نے "کلیسا کی تاریخ و جغرافیہ کا قاموس" میں مسلمانوں کے انصاف اور بے تعصبی کی شہادت یوں دی ہے:

"مسلمان عربوں کو یعقوبی عیسائیوں نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسلمانوں کی سب سے اہم جدت، جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خودمختار وحدت قرار دیا جائے اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدارات عطا کئے جائیں۔"[2]

متفرق واقعات اور اقدامات

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صرف جنگیں ہی نہیں ہوئیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہوا اور کئی دوسرے اہم واقعات بھی پیش آئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری سے معزولی، طاعون عمواس، قحط عرب، سن ہجری اور سکہ کا اجراء مسجد نبوی اور حرم کعبہ کی توسیع و تعمیر، مردم شماری، غیر مسلموں کا عرب سے اخراج، دیوان کا قیام، فوجی نظام، بندوبست اراضی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی (۱۷ ہجری)

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کے متعلق روایات میں اختلاف اور کنفیوژن پایا جاتا ہے۔ وہ بلند مرتبہ صحابی

۱؎ (A History of Law of Nations) جلد اول، صفحہ ۷۳ تاریخ قانون اقوام

۲؎ بحوالہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مضمون "قرآنی تصور مملکت"

اور عظیم الشان جرنیل تھے۔ انہوں نے کسی معرکے میں شکست نہیں کھائی۔ عہد صدیقی میں مرتدین، منکرین زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت کے فتنوں اور شورشوں کا قلع قمع کرنے، عراق کی فتوحات اور ایرانیوں پر مسلمانوں کی دھاک اور رعب جمانے نیز شام فتح کرنے میں ان کی بہادری اور جنگی مہارت کو بڑا دخل تھا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں ایک جنگی جینیئس کی حیثیت سے اپنے آپ کو نمایاں کر چکے تھے۔ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سیف اللہ کا خطاب دیا تھا۔ عہد صدیقی میں مرتدین کے خلاف جہاد میں ان سے بعض غلطیاں سرزد ہوئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی پر زور دیا لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ جس تلوار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کے خلاف برہنہ کیا ہے میں اسے نیام میں نہیں ڈال سکتا۔ تاہم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو تہدید آمیز خط لکھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد ان سے مالِ غنیمت کی حساب طلبی کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ''مجھے اپنا کام کرنے دیجئے ورنہ پھر آپ جانیں اور آپ کا کام، میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے ایسا ہی کرتا ہوں۔ اب اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جواباً لکھا کہ ''تم اسی شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف اور مالِ غنیمت کا حساب باقاعدگی سے بھیجتے رہو۔'' خالد رضی اللہ عنہ نے اس شرط کو منظور نہیں کیا۔ وہ اپنی شجاعت، جنگی مہارت اور داد و دہش کی وجہ سے مجاہدین میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ مجاہدین ان کی موجودگی اور ان کی تلوار کو فتح وظفر کا نشان سمجھنے لگے تھے اور دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہوتا جا رہا تھا کہ اسلامی فتوحات خالد رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور مہارت کا ثمرہ ہیں۔ ان تمام باتوں اور خالد رضی اللہ عنہ کے قدرے مطلق العنان رویہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوا کہ کوئی اندرونی فتنہ کھڑا نہ ہو جائے اور خود خالد رضی اللہ عنہ اسلام، خلافت اور مسلمانوں کے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔ لہٰذا جنگ یرموک کے بعد پہلے انہیں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے ماتحت کر دیا پھر بعض دوسرے واقعات کی بناء پر انہیں کلیتہً کمان سے معزول کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی فتوحات کسی فرد واحد کی ہمت و شجاعت کا نتیجہ نہیں بلکہ تائید و نصرت خداوندی کا نتیجہ ہیں کیونکہ اس نے اپنی کتاب مقدس میں یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے دین کو تمام جھوٹے دینوں پر غالب کر کے رہے گا۔ کافروں اور مشرکوں کی پھونکیں اس چراغ کو نہ بجھا سکیں گی۔ خالد رضی اللہ عنہ نے معزولی کا حکم سن کر صرف سمعنا واطعنا کہا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف صوبوں کے عمال کو لکھ بھیجا کہ خالد رضی اللہ عنہ کو کسی ناراضی یا خیانت کی بناء پر معزول نہیں کیا گیا بلکہ اس لئے کہ لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ لہٰذا انہیں معزول کرنا مناسب معلوم ہوا تا کہ لوگ سمجھ لیں کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ ولیم میور جیسا متعصب مؤرخ بھی لکھتا ہے کہ ''اس معاملے میں پنہاں اغراض و مقاصد یا محرکات تلاش کرنے کی ضرورت نہیں جن سے متاثر ہو کر عمر رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ کی جگہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا ہو۔ ذاتی ناپسندیدگی کے تحت یہ اقدام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عمر رضی اللہ عنہ کی شان اس سے بہت بلند تر تھی۔ لیکن وہ بیت المال کے روپے کے انتظام اور صرف میں بے حد محتاط واقع ہوئے تھے۔''[1] حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے دل میں ان کی اتنی وقعت اور عزت تھی کہ انہوں نے اپنی وصیت کے

---

[1] خلافت کا عروج و زوال

نفاذ کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کو نامزد کیا جو باہمی اعتماد کا واضح ثبوت ہے۔

خالد رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فاتح قادسیہ اور بانی کوفہ کو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو بھی کوفہ کی امارت سے معزول کر دیا تھا اور مثنیٰ بن حارثہ کو بھی سپہ سالاری سے ہٹا کر نائب سالار بنا دیا تھا۔ یہ انتظامی تبدیلیاں تھیں۔

عرب میں قحط (۱۸ھ)

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پانچویں سال عرب میں شدید قحط پڑا، خشک سالی اور قحط نے انسانوں اور حیوانوں کو بری طرح متاثر کیا۔ بدوی قبائل نے فاقہ کشی سے مجبور ہو کر دارالخلافہ مدینہ کا رخ کیا، انسانوں اور حیوانوں کی بدحالی کو دیکھ کر خلیفہ پر خواب وخور حرام ہو گیا۔ انہوں نے خلق خدا کو قحط کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے دن رات ایک کر دیا اور اپنے اور اہل وعیال پر گھی، دودھ، شہد اور دوسری عمدہ اشیاء کا استعمال اس وقت تک ممنوع قرار دے لیا جب تک کہ یہ چیزیں دوسرے مسلمانوں کو بھی میسر نہیں آتیں، ایک دفعہ ان کے خادم نے بھاری قیمت دے کر دودھ اور گھی سے بھرے ہوئے دو مشکیزے خریدے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ میں یہ نفیس ولذیذ چیزیں کیسے کھا سکتا ہوں جبکہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں اور وہ دودھ اور گھی عام لوگوں میں بانٹ دیا۔ چاہتے تو اپنے لئے عیش وراحت اور خوش بسری کے سامان بہم پہنچا سکتے تھے جیسا کہ دنیا کے اہل اقتدار آج تک کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ

”مجھے لوگوں کی تکلیف کا احساس کیونکر ہو سکتا ہے جب تک میں خود ان کی مصیبت میں شریک نہ ہوں۔“

دیکھنے والے ان کی حالت دیکھ کر کہتے کہ اگر قحط دور نہ ہوا تو عمر رضی اللہ عنہ کو رعایا کا غم ہلاک کر دے گا، سرخ وسفید رنگت سیاہ پڑ گئی تھی۔ وہ عام لوگوں کی طرح رہ کر اور کھا پی کر ان کی تکلیف کا احساس اپنے اندر بیدار رکھنا چاہتے تھے، ایک دفعہ اپنے ایک کمسن لڑکے کے ہاتھ میں خربوزہ دیکھا تو یہ کہہ کر چھین لیا کہ دوسروں کو تو روٹی کا ٹکڑا میسر نہیں اور عمر کی اولاد خربوزے کھاتی ہے۔ ایک دوسرے موقع پر ایک ننھی بچی کو دیکھا جو بہت کمزور اور مریل تھی اور بڑی مشکل سے لڑھکتی، گرتی پڑتی جا رہی تھی، پوچھا یہ بچی کون ہے اور اسے کیا ہوا ہے؟ آپ کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو خود بھی جلیل القدر صحابی تھے، نے بتایا کہ ”یہ میری بیٹی اور آپ کی پوتی ہے بھوک اور فاقے نے اس کی یہ حالت کر دی ہے۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر پہلے خاموش ہو گئے، پھر فرمایا کہ میں آل عمر کے روزینوں میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ اکثر روتے اور گڑگڑا کر دعائیں مانگتے کہ باری تعالیٰ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو میری خطاؤں کی وجہ سے ہلاک نہ کرنا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام، فلسطین اور عراق میں اپنے گورنروں کو تاکیدی احکام بھیجے کہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ غلہ بھیجیں، چنانچہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنے اپنے صوبوں سے ہزارہا اونٹ غلے، آٹے اور دوسری اشیائے خوردنی و پوشیدنی سے لدے ہوئے بھیجے، فلسطین سے جہازوں کے ذریعے بھی ہزاروں من آٹا آیا، مدینہ کے اردگرد جو بدوی قبائل جمع ہو

گئے تھے، ان میں اور اہل مدینہ میں روزانہ کھانا تقسیم کیا جاتا تھا غلہ آنے پر غلہ تقسیم کیا گیا اور جن ہزاروں اونٹوں پر لدا ہوا غلہ آیا تھا، ان میں سے بیس اونٹ روزانہ ذبح کر کے گوشت پکا کر بانٹا جاتا تھا، کپڑے، کمبل وغیرہ بھی تقسیم کئے گئے، دس ہزار افراد ایک وقت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دستر خوان پر کھانا کھاتے تھے، آٹا، گوشت، کھجوریں، سالن، مریضوں، عورتوں، بچوں میں تقسیم کئے جاتے، جو خلیفہ کے دستر خوان پر نہ کھا سکتے، ان کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہ تھی، یہ انتظام موجودہ زمانے کے راشننگ سسٹم سے بدرجہا بہتر تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیویوں یا لڑکوں کے گھروں میں کھانا کھانے کی بجائے عام لوگوں کے ساتھ صرف رات کو لنگر کا کھانا کھاتے تھے فرمایا کرتے کہ اگر فرات کے کنارے ایک اونٹ یا بکری کا بچہ بھی بھوکا مر گیا تو عمر رضی اللہ عنہ سے جواب طلبی ہوگی۔ ایسا معاشی وحکومتی احساس ذمہ داری دنیا کی تاریخ کو اول سے آخر تک پڑھ جانے پر بھی کسی دوسری صاحب اقتدار ہستی کے ہاں نہ ملے گا۔

فرمایا کرتے کہ ہم بیت المال سے مسلمانوں کو کھلاتے رہیں گے۔ اور جب دیکھیں گے کہ بیت المال خالی ہو گیا تو محتاجوں کو حسب حیثیت دولت مندوں کے گھروں میں داخل کر دیں گے۔ اس طرح کسی مسلمان کو بھوکا نہیں رہنے دیں گے، روس اور چین کی اشتراکی حکومتیں بھی ایسا نہ کر سکیں، ان کے شکمی مساوات کے بلند بانگ دعوے جھوٹے ثابت ہوئے، جیسا کہ الیگزینڈر رسولژے نتسین نے لکھا ہے[1] آج بھی روس کی سڑکوں پر عورتیں پتھر، روڑی کوٹتی نظر آتی ہیں جبکہ حکومتی طبقہ کو ہر طرح کا عیش میسر ہے اور معاشی مساوات محض ایک ڈھکوسلہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کے دوران میں زکوٰۃ کی وصولی موقوف کر دی تھی اور چوری کا ارتکاب کرنے والوں کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دینا بھی روک دی تھی حالانکہ یہ قرآن مجید کی عائد کردہ سزا ہے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا استدلال یہ تھا کہ زمانۂ قحط میں جو چوری کرے گا وہ بھوکوں مرنے سے بچنے کے لئے کرے گا اور جان بچانے کے لئے تو مردار کھانے کی بھی اجازت ہے۔

جب خشک سالی اور قحط نے طول پکڑا تو آپ صحابہ اور دوسرے اہل مدینہ اور قبائل کو ساتھ لے کر نماز استسقاء کے لئے باہر نکلے اور اللہ تعالیٰ سے بڑی عاجزی اور خشوع وخضوع سے رو رو کر بارش کی دعا مانگی، داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ ابھی لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس نہیں پہنچے تھے کہ بادل امنڈ آئے اور موسلا دھار بارش نے جل تھل کر دیئے۔ انسانوں اور حیوانوں کے لئے زمین سے غلہ اور گھاس وغیرہ پیدا ہونے کی امید بندھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ایک بدوی قبیلے کے پاس جا کر ضرورت کے مطابق کچھ مزید عرصے کے لئے غلہ، کپڑے اور جانوروں کے لئے خشک چارہ وغیرہ دے کر انہیں اپنے اپنے علاقوں کی طرف رخصت کیا۔

یہ تھا سربراہ حکومت کا احساس ذمہ داری! آج بھی قحط پڑتے ہیں۔ سیلاب اور زلزلے آتے ہیں۔ ریلیف فنڈ قائم ہوتے ہیں، غیر ملکی امداد بھی آتی ہے لیکن کتنے حقیقی متاثرہ افراد تک یہ امداد پہنچتی ہے؟ اکثر کارندے یہ امداد خورد برد کر کے اپنے گھر بھر لیتے ہیں غیر ملکی امداد کے دودھ، گھی کے ڈبے، کمبل وغیرہ کراچی، لاہور، راولپنڈی اور

[1] ''روسی رہنماؤں کے نام خط''

پشاور ایسے شہروں کے بازاروں میں فروخت ہوتے ہیں اور مستحقین تک نہیں پہنچ پاتے، ایک مرکزی محکمہ کے ایک ریٹائرڈ ڈرائیور نے راقم السطور کو بتایا کہ وہ معزز حکام (جن میں ایک سابق وزیراعظم بھی شامل ہیں) کی سوشل ورک کرنے والی بیگمات سے دودھ اور گھی کے ڈبے اور دوسری اشیاء سستی خرید کر بازار میں مہنگے داموں بیچتا رہا ہے جو امریکہ اور دوسرے ممالک سے آفت زدہ پاکستانیوں کے لئے امداد کی مد میں آیا کرتی تھیں، حکومت کے زکوٰۃ فنڈ کی تقسیم میں بھی ایسی بے قاعدگیاں عام ہیں۔

قحط کی مصیبت کا ایک اچھا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی علاقوں کے ساتھ مستقل آمدورفت اور کاروباری تعلقات قائم ہو گئے، مدتوں شام، فلسطین اور مصر سے حجاز کی منڈیوں میں غلہ اور دوسرے سامان زیست فراہم کئے جاتے رہے۔

طاعون عمواس (۱۸ھ)

ابھی قحط کی ہولناکیوں سے نجات نہیں ملی تھی کہ شام و فلسطین میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی اور مصر و عراق تک اس کے اثرات پہنچ گئے۔ اس کا آغاز فلسطین کے شہر عمواس سے ہوا۔ حملہ بڑا سریع اور شدید تھا، حمص، دمشق وغیرہ مقامات پر متعین مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں اس کا نشانہ بنے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت بے چین اور فکرمند ہو گئے۔ چند صحابہ کو ساتھ لے کر عازم شام ہوئے تاکہ وبا کی روک تھام کے لئے کوئی تدبیر اور انتظام کریں۔ تبوک کے قریب سرغ کے سرحدی مقام تک پہنچے تھے کہ ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما اور شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ امرائے لشکر نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور بتایا کہ وبا کی شدت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سوچ میں پڑ گئے کہ آگے جائیں یا نہ جائیں، مہاجرین و انصار سے رائے طلب کی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان کی کہ جہاں وبا پھیلی ہو وہاں مت جاؤ اور اگر تم پہلے سے کسی ایسی جگہ پر ہو جہاں وبا پھوٹ پڑے تو وہاں سے بھاگو نہیں۔ چنانچہ مدینہ کو واپسی ہی قرین صواب قرار پائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان کر دیا "کہ میں مدینہ واپس جا رہا ہوں، سب لوگ میرے ساتھ واپس چلیں۔" حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جو بڑے تن بہ تقدیر بزرگ تھے، کہنے لگے کہ "اے عمر! اللہ کی تقدیر سے بھاگتے ہو؟" فاروق اعظم نے ان کے طیش وطنز آمیز جملے کو نظرانداز کرتے ہوئے صرف یہ بلیغ جملہ کہا کہ "ہاں! میں اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر ہی کی طرف بھاگتا ہوں"، لیکن مدینہ پہنچ کر انہیں شام و فلسطین کے محاذ پر موجود بزرگ صحابہ اور دوسرے مجاہدین کے خیال نے مضطرب رکھا۔ انہوں نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے آپ کی یہاں فوری ضرورت ہے۔ یہ خط ملتے ہی چند روز کے لئے چلے آئیں۔ وہ مطلب سمجھ گئے اور جواب لکھا کہ "میں اسلامی لشکر میں ہوں میں اس وقت تک اپنے ساتھی مجاہدین سے جدا ہونا نہیں چاہتا تاوقتیکہ اللہ میرے اور ان کے متعلق اپنا حکم صادر نہ کر دے، مجھے لشکر ہی میں رہنے دیجئے، میں اپنی جان بچانے کے لئے یہاں سے نہیں ٹل سکتا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر رونے لگے۔ حاضرین نے پوچھا کیا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا؟ آپ نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا کہ "نہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہو جائے گا" پھر آپ نے انہیں لکھا کہ "اگر آپ نہیں

آتے تو کم سے کم فوج کو موجودہ نشیبی اور مرطوب جگہ سے ہٹا کر کسی بلند اور پر فضا مقام پر لے جائیں' چنانچہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ فوج کے ساتھ جابیہ منتقل ہو گئے جو آب و ہوا کی عمدگی اور صحت افزائی کے لئے شہرت رکھتا تھا، لیکن ان پر طاعون کے جراثیم کا اثر ہو چکا تھا، جابیہ پہنچ کر جاں بحق ہو گئے، ان کے جانشیں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحب زادے بھی انتقال کر گئے۔ ان کے جانشیں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنے پیشروؤں کی طرح کٹر تقدیر پرست نہ تھے، وہ مسلمانوں کو حوران کے پہاڑوں پر لے گئے، آخر وبا کا زور گھٹتے گھٹتے ختم ہو گیا، لیکن فوج کے پہاڑوں پر جانے سے پہلے تقریباً پچیس ہزار مسلمان طاعون کی نذر ہو گئے جن میں ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما، حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ، سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ، عتبہ بن سہیل رضی اللہ عنہ وغیرہ عظیم المرتبہ اصحاب شامل تھے۔ یہاں پہنچ کر خیال آتا ہے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمراہی سرغ ہی سے مدینہ واپس نہ آجاتے اور طاعون کے زور کے دوران میں متاثرہ علاقے میں چلے جاتے تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی وبا کی زد میں آجاتے اور تاریخ کا رخ بدل جاتا یا کم سے کم ان میں سے بعض طاعون کے جراثیم اپنے ساتھ لے کر مدینہ آتے اور حجاز اور بقیہ عرب بھی اس سے محفوظ نہ رہتا پھر جو نتیجہ ہوتا اس کے خیال سے بھی خوف آتا ہے۔

بہر حال اسلامی فتوحات کا رواں دواں سیلاب یک لخت عارضی طور پر تھم گیا۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر عمل کر کے فوج کو فوری طور متاثرہ مقامات سے بروقت دور ہٹا لیا گیا ہوتا تو شاید اللہ کے یہ پچیس ہزار سپاہی جو نصف دنیا کو فتح کرنے کے لئے کافی تھے، طاعون سے یوں مفتوح نہ ہوتے، اس بلائے بے درماں، اس ہلاکت خیز وبا نے ہزاروں عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر دیا۔ مرنے والوں کے اموال و اسباب کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ رہا۔ لاوارث عورتوں، بچوں کی نگہداشت کے علاوہ وراثت کے مسائل بھی پیدا ہو گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سفر شام

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اندوہ دلسوزی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود بہت سے صحابہ کو ہمراہ لے کر شام روانہ ہو گئے۔ ایلہ پہنچ کر دو دن وہاں ٹھہرے حالات و واقعات معلوم کئے۔ آپ کا گاڑھے کا کرتہ پھٹ گیا تھا اور میلا بھی ہو گیا تھا وہ ایلہ کے پادری کو مرمت کرنے اور دھونے کے لئے دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے پیوند لگائے اور دھویا۔ ساتھ ہی عمدہ کپڑے کا بنا ہوا ایک نیا کرتہ بھی اپنی طرف سے پیش کیا۔ فاروق اعظم نے پادری کا کرتہ شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا اور اپنا پرانا اور پیوند لگا کرتہ یہ کہہ کر پہن لیا کہ اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے۔ ایلہ سے روانہ ہو کر جابیہ، دمشق، حمص اور شام کے دوسرے اضلاع کا دورہ کیا۔ ہر جگہ دو دو چار چار دن ٹھہر کر مجاہدین، ان کے امراء اور عمال حکومت سے ملاقاتیں کیں اور حالات معلوم کئے، حسب موقع و ضرورت مناسب انتظامات کئے۔ اہل فوج کی تنخواہیں تقسیم کیں، غذا کی تقسیم کا انتظام کیا۔ وبا میں فوت ہونے والوں کے وارثوں کو ان کی میراث دلائی، بیواؤں، یتیموں کی غور و پرداخت کا بندوبست کیا، مجاہدین اور متوفیان کے پسماندگان کی دلجوئی کی۔ جو فوجی اور دوسری انتظامی اسامیاں خالی ہو گئی تھیں

ان پر نئے عہدہ دار تعینات کئے۔ یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما جو دمشق کے گورنر تھے اور طاعون سے فوت ہو گئے تھے، ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات تک اسی عہدہ پر رہے۔ دفاعی استحکامات کی خاطر اہم سرحدی مقامات پر چھاؤنیاں قائم کیں ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر مدینہ واپس روانہ ہوئے۔ جابیہ پہنچ کر جلسہ عام میں ایک خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

لوگو!

’’میں تم لوگوں پر والی بنایا گیا ہوں۔ تمہارے جو معاملات میرے سپرد کئے گئے ہیں۔ انشاء اللہ میں انہیں ٹھیک ٹھیک سرانجام دوں گا۔ ہم نے اموالِ غنیمت، عطیئے اور فرودگاہیں تم میں برابر برابر تقسیم کی ہیں اور تمہارے حقوق تم کو پہنچائے ہیں۔ چنانچہ تمہارے لئے فوجیں مرتب کی ہیں اور تمہاری راحت و آسائش کے اسباب فراہم کئے ہیں۔ ہم نے تمہیں آباد کیا ہے۔ مالِ غنیمت اور جہاد کے انعامات سے تمہیں آسودہ اور خوشحال بنایا ہے۔ تمہارے لئے رزق وعطا کا حکم دیا ہے۔ پس اگر کوئی ایسی بات جانتا ہو جس پر عمل ہونا چاہئے تو وہ ہمیں بتائے۔ انشاء اللہ ہم اس پر عمل کریں گے۔‘‘

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ارادہ عراق کا دورہ کرنے کا بھی تھا لیکن حالات اس طرح پیدا ہوتے گئے کہ ان کا یہ ارادہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا۔ بہرحال دارالخلافہ مدینہ سے باہر مملکت اسلامیہ کے رفاہی اور انتظامی دورے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے خلیفہ، راشد نے نہیں کئے۔

غیر مسلموں کا عرب سے اخراج (۱۵ھ)

مہبط وحی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر آخرت کے وقت فرمایا تھا کہ سرزمین عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔[1] صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنے مختصر اور ہنگامہ خیز دور میں ادھر متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی ابتداءً روم و ایران سے نپٹنے میں بے حد مصروف رہے۔ عرب سے مشرکین کا خاتمہ ہو چکا تھا، اسلام کو دین غالب کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی لیکن نجران میں عیسائی اور خیبر اور فدک میں یہودی بحیثیت متعہدین موجود تھے اور شاید غیر متناہی عرصہ تک رہتے لیکن یہ دونوں گروہ اپنی اپنی جگہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور جنگی تیاریوں میں مصروف پائے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے خلاف کارروائی کرنی پڑی اور ان دونوں گروہوں کو عرب بدر کر دیا۔ یہودیوں کے اخراج سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی غیر منقولہ جائیدادوں کی قیمت کا اندازہ لگوایا اور بیت المال سے ادائیگی کر دی۔ انہیں اپنا تمام منقولہ مال واسباب، اونٹ، گھوڑے، مویشی، ہتھیار وغیرہ ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی اور شام میں انہیں آباد ہونے کی سہولتیں مہیا کیں۔ نجران کے

---

[1] قیام پاکستان کے وقت اگر ہم نے منظم طریقے سے اس مملکت خداداد کی حد تک اس فرمودۂ رسول پر عمل کیا ہوتا تو بنگلہ دیش بننے کی نوبت نہ آتی۔ اور بقیہ پاکستان میں یورپ اور امریکہ کے مادی وسائل کی مدد سے عیسائی پادریوں کو عیسائیت کی بھرپور اور کھلم کھلا تبلیغ سے پسماندہ گروہوں کو عیسائی بنانے کا موقع نہ ملتا۔ مؤلف

عیسائیوں کو عراق و شام کی طرف جانے کا حکم دیا۔ آبادکاری اور کھیتی باڑی کے لئے انہیں متبادل زمینیں دیں۔ متعلقہ عمال کو حکم دیا کہ دو سال تک ان سے جزیہ نہ لیا جائے، ان کی شکایات کا ازالہ کیا جائے اور مدد کی جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں نجران کے عیسائیوں نے جو عراق کی طرف متبادل مقامات پر آباد کئے گئے تھے، آنجناب رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ انہیں نجران واپس جانے کی اجازت دی جائے۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ درست تھا اور میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا۔ یوں عرب کی سرزمین قدیم عیسائیوں اور یہودیوں سے یکسر پاک ہوگئی۔ لیکن فتوحات اسلامی کے نتیجہ میں دوسرے ممالک کے عیسائیوں یہودیوں اور مجوسیوں کا لونڈی، غلام وغیرہ کی حیثیت سے داخلہ شروع ہوگیا حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دل سے اس کے خلاف تھے۔ بہر حال ان کے قدم اسلام کے مقدس ترین شہروں مکہ اور مدینہ تک پہنچ گئے۔ ابولولو فیروز اور جفینہ وغیرہ انہی لوگوں میں سے تھے جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کی سازش کی اور پھر عجمی غلاموں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ و بغاوت میں حصہ لیا۔ بعد میں بھی غیر مسلم عناصر مسلمان ممالک اور حکومتوں کے خلاف تخریبی کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے میں وہاں کی ہندو اقلیت کا بڑا ہاتھ تھا۔

سن ہجری کا اجراء (۱۶ھ)

اسلام سے پہلے عرب میں کوئی مرکزی حکومت قائم ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ماہ و سال کے شمار اور واقعات کی تعیین کے لئے کوئی مستقل سن رائج نہ تھا۔ کبھی عرب جاہلیت کی بڑی اور مشہور جنگوں سے ماہ و سال کا حساب لگایا جاتا تھا اور کبھی عام الفیل سے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نہ صرف سارا عرب بلکہ شام، فلسطین، مصر، عراق، فارس وغیرہ خلافت کے زیرنگیں آگئے۔ گورنروں، سپہ سالاروں، غیر مسلم حکمرانوں سے اکثر ماہ و سال کی تعیین کے ساتھ خط و کتابت کی ضرورت پیش آنے لگی۔ حساب کتاب، وصولیوں، ادائیگیوں کا معاملہ خاص کر اہم تھا۔ تاریخ مہینے اور سال کے تعین کا متقاضی۔ ایک ہنڈی کی ادائیگی پر صرف شعبان کا مہینہ درج تھا، تاریخ اور سال کا پتہ نہ چلتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آئندہ کے لئے اس کنفیوژن کو دور کرنے کا ارادہ کیا۔ صحابہ سے مشورہ کیا۔ ہرمزان نے ایرانی کیلنڈر کے متعلق بتایا جس میں تاریخ، مہینہ اور سال کا ذکر ہوتا تھا۔ رومیوں میں بھی ایسا ہی دستور تھا۔ ہجرت نبوی اسلام کی تاریخ میں اہم ترین واقعہ تھا۔ اسی سے اسلامی کیلنڈر کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہجرت کا واقعہ ربیع الاول میں پیش آیا تھا لیکن چونکہ تمام قبائل عربی سال کا پہلا مہینہ محرم کو گردانتے تھے اس لئے دو مہینے آٹھ دن پیچھے ہٹ کر شروع محرم سے اسلامی سن کا اجراء کیا گیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ بھی ایک بڑا اہم کارنامہ ہے جو حساب کتاب، خط و کتابت کو درست رکھنے کے علاوہ تاریخ و وقائع کو ماہ و سال کی تعیین کے ساتھ محفوظ رکھنے کا باعث بنا اور جس نے واقعہ ہجرت کی یاد اور معنویت کو بھی لوگوں کے اذہان و قلوب میں مرتسم کر دیا اور جاہلیت کے آثار کی بیخ کنی کر دی۔ چونکہ اسلامی عبادات روزہ اور حج کا تعلق قمری مہینوں سے ہے۔ اس لئے بھی ہجری قمری تقویم اسلامی معاشرے کے مزاج کے عین مطابق ٹھہری۔

مستشرق کیتانی (Caetani) اس پر تعجب کرتا ہے کہ سن عیسوی کا اجراء حضرت عیسیٰ کے سات آٹھ سو سال بعد شارلمین کے زمانے میں ہوا جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند ہی سال بعد یہ کام کر لیا۔

حکومت کا نظم ونسق

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مملکت اسلامیہ بائیس لاکھ مربع میل سے زائد رقبے پر محیط تھی۔ انہوں نے حکومت کے مختلف شعبوں اور محکموں کو الگ الگ کر کے منظم کیا اور چن چن کر قابل اور دیانتدار عمال حکومت مقرر کئے انہوں نے روم وایران کی حکومتوں کے نظم ونسق کا مطالعہ کیا۔ وسیع مسلم ریاست کی انتظامی ضروریات کا جائزہ لیا اور انتظامیہ مشینری کو سائنٹفک خطوط پر تشکیل دیا۔

انہوں نے ممالک اسلامیہ کو حسب ذیل گیارہ صوبوں میں تقسیم کیا۔

۱.....مکہ ۲.....مدینہ ۳.....شام ۴.....جزیرہ ۵.....فلسطین ۶.....مصر ۷.....بصرہ ۸.....کوفہ ۹.....خراسان ۱۰.....فارس ۱۱.....آذربائیجان

ہر صوبے میں گورنر[۱] کے علاوہ سیکرٹری[۲]، ملٹری سیکرٹری[۳]، کلکٹر[۴]، پولیس چیف[۵]، سیکرٹری فنانس[۶] اور چیف جسٹس[۷] ہوتے تھے۔ کلکٹر (صاحب الخراج) اور سیکرٹری فنانس (افسر بیت المال) براہ راست خلیفہ کو جواب دہ ہوتے تھے۔ قاضی اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتا تھا اور قرآن وسنت کی روشنی میں فیصلے صادر کرتا تھا، گورنر سالار فوج بھی ہوتا تھا۔ بعض دفعہ الگ فوجی سالار بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ جو گورنر کے ماتحت نہیں ہوتا تھا۔ ان سب میں گہرا تعاون وتعامل ضروری تھا۔ گورنر کا اپنا خاصا بڑا مستقل عملہ ہوتا تھا جسے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقرر کر کے بھیجتے تھے۔ اضلاع اور ڈویژنوں میں بھی انتظامی حکام، افسر خزانہ، قاضی وغیرہ ہوتے تھے جنہیں گورنر مقرر کرتا تھا۔ ان کے علاوہ خلیفہ کے اپنے خصوصی وقائع نگار بھی ہوتے تھے جو صوبوں کی خبریں خفیہ طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجتے تھے اور وہ ذرا ذرا سے حالات وواقعات سے باخبر رہتے تھے۔ مؤرخ مسعودی نے مروج الذہب، میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات اس جملے سے شروع کئے کہ ''ان میں جو اوصاف تھے وہ ان کے تمام افسروں اور عہدہ داروں میں پھیل گئے تھے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بقول چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود قوی الامین تھے، اس لئے ان کے عمال میں بھی یہ رنگ پیدا ہو گیا۔ وہ بڑے مردم شناس تھے اور عمال حکومت کا انتخاب بڑی حزم واحتیاط سے کرتے تھے۔ جس منصب کے لئے جس قسم کی اہلیت وقابلیت کی ضرورت ہوتی تھی اس قسم کی اہلیت کے مالک آدمی کا انتخاب کرتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ عہدے کے لئے کیمسٹری کے ماہر کی ضرورت ہو لیکن فزکس کا آدمی اس پر فائز کر دیا جائے یا اس کے برعکس۔ یا ایک ماہر زراعت کی ضرورت ہو لیکن ایک ماہر کیمیا کو منتخب کر لیا جائے۔ یا ماہر طب کی جگہ خالی

(۱ تا ۷) اس زمانے میں یہ عہدے بالترتیب امیر یا عامل، والی، کاتب، کاتب دیوان، صاحب الخراج، صاحب احداث، صاحب بیت المال اور قاضی کہلاتے تھے۔ مؤلف

ہواور تاریخ کے پی ایچ ڈی کو اس پر لگا دیا جائے علیٰ ہذا القیاس۔ انتخاب میں اکابر صحابہ سے بھی مشورہ کرتے تھے اور سخت چھان بین سے کام لیتے تھے۔ منصب پر فائز کرنے کے بعد عمال پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ انہیں دنیا میں ملوث ہونے، خیانت، رشوت وغیرہ سے بچانے کے لئے ان کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر کرتے۔ گورنروں کی تنخواہیں پانچ پانچ ہزار درہم سالانہ ہوتی تھیں۔ مالِ غنیمت سے الگ حصہ ملتا تھا۔

عمال کے فرائض اور ان کا محاسبہ

عامل کے تقرر نامہ میں اس کے اختیارات اور فرائض لکھ دیئے جاتے تھے اور وہ اپنے مقام تعیناتی پر پہنچ کر لوگوں کے مجمع عام میں خلیفہ کا حکم نامہ پڑھ کر سناتا تھا تاکہ لوگ اس کے اختیارات وفرائض سے آگاہ ہو جائیں۔ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی یا اختیارات سے تجاوز کی صورت میں خلیفہ کو اطلاع دی جاتی تھی اور عامل کا محاسبہ کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ جب بعض عمال کے خلاف شکایات موصول ہوئیں تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مجمع عام میں خطبہ دیا اور عاملوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا۔

> ''یاد رکھو میں نے تم لوگوں کو امیر اور سخت گیر مقرر کر کے نہیں بھیجا بلکہ امام بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگ تمہاری تقلید کریں۔ تم مسلمانوں کے حقوق ادا کرو۔ ان کو زدوکوب نہ کرو کہ وہ ذلیل ہوں۔ ان کی بیجا تعریف نہ کرو کہ وہ غلطی میں پڑیں۔ ان کے لئے اپنے دروازے بند نہ رکھو کہ زبردست کمزوروں کو کھا جائیں ان سے کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو کہ یہ ان پر ظلم کرنا ہے۔''

وہ عاملوں پر اچھی طرح واضح کر دیتے تھے کہ ''میں تمہیں امت محمدیہ پر اس لئے عامل مقرر نہیں کر رہا ہوں کہ تم ان کے بالوں اور ان کی کھالوں کے مالک بن جاؤ بلکہ تمہیں اس لئے مقرر کرتا ہوں کہ تم نماز قائم کرو۔ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور عدل کے ساتھ ان کے حقوق تقسیم کرو۔''[1] عمال کو حکم تھا کہ سب کو ایک نظر سے دیکھو، قریب و بعید میں کوئی فرق نہ کرو، رشوت لینے، حکومت میں ذاتی اغراض کو شامل کرنے اور غصہ میں لوگوں کو ستانے سے بچو ورنہ تم سے مواخذہ کیا جائے گا۔ وہ مملکت کے کونے کونے میں عدل و مساوات قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے خود کو اللہ کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے یعنی اگر ان کے کسی عامل نے کسی دور دراز مقام پر بھی کسی شخص پر ظلم کیا تو گویا خود انہوں نے اس شخص پر ظلم کیا۔ ایک دفعہ لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر میں نے اپنے علم کے مطابق بہترین آدمی کو تم پر عامل مقرر کر کے اسے عدل و انصاف کرنے کا حکم دے دیا تو میں نے اپنا فرض ادا کر دیا؟ نہیں، جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ میرے حکم پر عمل بھی کیا جا رہا ہے، میرا فرض پورا نہیں ہوا۔''

عوام...... مسلمان ہوں یا ذمی...... کو عام اجازت تھی کہ عاملوں کے خلاف شکایات براہ راست بلا جھجک دربار خلافت میں پیش کریں۔ تحقیقات کے بعد ان کا ازالہ کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ مختلف صوبوں کے عاملوں کی

---

[1] کتاب الخراج از امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ

موجودگی میں لوگوں سے فرمایا کہ ''میں نے اپنے عاملوں کو اس لئے بھیجا ہے کہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ سکھائیں۔ جس شخص کے ساتھ اس کے خلاف عمل کیا گیا ہو، وہ میرے پاس شکایت لائے، خدا کی قسم میں اس کا بدلہ لوں گا۔'' چنانچہ اگر کوئی عامل قصوروار پایا جاتا تو اسے کھلے بندوں سب کے سامنے سزا دی جاتی یا منصب سے برطرف کر دیا جاتا۔ حج کے موقع پر تمام عمال کا مکہ میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ حج کے بعد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اعلان کرا دیتے تھے کہ اگر کسی کو کسی عامل کے خلاف شکایت ہو تو پیش کرے۔ چنانچہ اگر کسی عامل نے کسی شخص سے کوئی ناانصافی یا زیادتی کی ہوتی تو اس کا تدارک سب کے سامنے اس کھلی کچہری میں کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جو مصر کے فاتح اور گورنر تھے اور بلند مرتبہ صحابی تھے، ان کے خلاف ایک شخص نے شکایت کی کہ اسے بغیر کسی قصور کے سو کوڑے مارے ہیں۔ تصدیق ہو جانے پر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ اٹھ اور تو بھی ابن العاص کے سو کوڑے لگا کر اپنا بدلہ لے لے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے احتجاج کیا کہ اس سے عمال کے مورال پر برا اثر پڑے گا اور عوام ان پر دلیر ہو جائیں گے۔ اگر کوئی عامل تادیب کی غرض سے کسی کو مارے تو کیا آپ اس سے بدلہ لیں گے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں! میں اس سے بدلہ لوں گا۔ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات سے بدلہ لیتے دیکھا ہے۔ اللہ نے تو ان لوگوں کو ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا کیا تھا، تم نے کب سے انہیں غلام بنا لیا؟ آخر ابن العاص نے شکایت کنندہ کو ہر کوڑے کے عوض دو دو دینار دے کر اسے راضی کیا اور اپنی کھال بچائی۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکثر اپنے حکام کو تذکیر و تنبیہ کرتے رہتے تھے کہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو یاد رکھیں اور کجروی سے بچیں۔ ایک دفعہ عمال سے فرمایا:

''اے حکومت کے ذمہ دارو! سربراہ کی نرمی اور بردباری سے زیادہ نفع بخش اور خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور کوئی چیز نہیں، اسی طرح سربراہ کی ناسمجھی اور جذباتیت اور بے سوچے سمجھے کام کرنے سے زیادہ نقصان دہ اور ناپسندیدہ کوئی دوسری نادانی نہیں ہے ایک حاکم کی عیش مزاجی سے زیادہ اللہ کو کسی کی عیش مزاجی اور جہالت ناپسند نہیں ہے۔''

بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا:

''خوش قسمت ہے وہ حاکم جس کی رعایا خوشحال ہو اور بدقسمت ہے وہ حاکم جس کی رعایا بدحال ہو۔ تم اپنے آپ کو کجروی سے بچاؤ تاکہ تمہارے ماتحت کجروی اختیار نہ کریں۔''

فرمایا کرتے تھے کہ عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے پیشوا اور حاکم سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک حاکم اللہ کی راہ میں چلتا رہتا ہے، رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہتی ہے لیکن جہاں اس نے پاؤں پھیلائے رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔ اگر کوئی حاکم کسی پر ظلم و ستم کرے اور اس کی اطلاع مجھ کو پہنچ جائے۔ پھر بھی میں اس حاکم کے خلاف تادیبی کارروائی نہ کروں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خود میں نے اس

[1] بعض روایات میں یہ واقعہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد کی طرف منسوب ہے کہ اس نے اپنے باپ کی امارت و سیادت کے زعم میں مدعی کے ناحق کوڑے مارے تھے اور خلیفہ رضی اللہ عنہ ثانی نے اسے کوڑے لگوائے۔ مؤلف

شخص پر ظلم کیا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ برائی اور کرپشن کا آغاز طبقہ حکام سے شروع ہوتا ہے۔

عمال سے عہد

ہر عہدہ دار سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا[1] باریک کپڑے نہ پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا، دروازے پر دربان نہ رکھے گا اور اہل حاجت کے لئے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے گا۔

یہ اس لئے تھا کہ حکام مغرور اور عیش پسند نہ ہونے پائیں اور عوام سے ان کا براہ راست رابطہ قائم رہے اور ان کی شکایات کا ازالہ فوری طور پر ہوتا رہے۔ کاش مملکت اسلامیہ پاکستان کے اعلیٰ حکام بھی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ان احکام پر عمل کرتے!

حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ جیسے فوجی سپہ سالار، فاتح اور عامل کے خلاف شکایت آئی کہ وہ باریک اور بیش قیمت لباس پہنتے ہیں، ایک عالی شان محل میں ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے ہیں اور دروازے پر دربان مقرر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں بلایا، رپورٹ کی تصدیق کی اور پھر کمبل کا موٹا اور کھردرا لباس پہنوا کر انہیں بکریاں چرانے کا حکم دیا۔ عیاض رضی اللہ عنہ حکم بجالائے مگر بار بار کہتے تھے کہ اس سے تو مر جانا بہتر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بکریاں چرانے سے تمہیں عار کیوں ہے؟ تمہارے باپ کا نام غنم اسی لئے تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتا تھا۔ عیاض رضی اللہ عنہ نے آئندہ کے لئے توبہ کی۔ اسی طرح قادسیہ اور مدائن کے فاتح، کوفہ کے بانی اور گورنر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے خلاف شکایت آئی کہ انہوں نے اپنے محل کے سامنے ڈیوڑھی بنوالی ہے جس سے لوگوں کا ان سے ملنا مشکل ہو گیا ہے۔ تصدیق ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ڈیوڑھی کو آگ لگوادی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مدینہ واپس بلا لیا۔

اسی طرح بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے خلاف شکایات آئیں تو ان کا فوراً ازالہ کیا گیا۔

اپنے ایک گورنر کو حسب ذیل خط لکھا:

''لوگوں کو اپنے حاکموں سے نفرت ہوتی ہے میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں اور تم اندھی باتوں، پرانی کدورتوں اور دنیا کی خواہشوں کا نشانہ بنیں۔ حدود الٰہی کو قائم رکھو اگرچہ دن بھر میں ایک گھڑی ہی کیوں نہ ہو۔ جب بھی ایسے کوئی دو معاملے پیش آئیں جن میں سے ایک اللہ کے لئے ہو اور دوسرا دنیا کے لئے تو آخرت کو دنیا پر ترجیح دو کیونکہ دنیا ختم ہو جانے والی اور آخرت باقی رہنے والی ہے۔ خدا سے ڈرتے رہو اور فاسقوں کو ڈراتے رہو۔ جب بھی قبائلی فساد بھڑکے اور کوئی ''یا آل فلاں''[2] کہہ کر پکارے تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کی آواز ہے۔ ایسے لوگوں کی

---

[1] ترکی گھوڑے قیمتی اور شوخ وشنگ ہوتے تھے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آج کل کے گورنروں اور سیکرٹریوں وغیرہ کو صدر مملکت کی طرف سے حکم دیا جائے کہ وہ قیمتی اور شاندار کاروں میں سوار نہ ہوں۔ حال ہی میں وفاقی حکومت نے وزیروں اور سیکرٹریوں وغیرہ اعلیٰ حکام کو قیمتی اور بڑی کاروں کے استعمال کی ممانعت کر دی ہے۔ مؤلف

[2] یعنی اے فلاں خاندان والو! عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کسی ایک قبیلے کے کسی شخص کا جھگڑا کسی دوسرے قبیلے کے شخص سے ہوتا، تو وہ قبائلی تعصب کے ماتحت اپنے قبیلوں کو اس طرح آواز دے کر پکارتے تھے اور دونوں کے حمایتی جمع ہو جاتے اور باہم لڑائی شروع ہو جاتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد بیجا قبائلی تعصب کی بیخ کنی تھا۔ پاکستان میں علاقائی، صوبائی اور قومیتی تعصبات اس کی مثال ہیں۔ مؤلف

تلوار سے خبر لو حتیٰ کہ وہ اللہ کی طرف اور امام کی طرف رجوع ہو جائیں۔ مجھے یہ اطلاع پہنچی ہے کہ قبیلہ ضبہ یا آل ضبہ، کہہ کر پکارتا ہے۔ میری یہ تحریر پہنچتے ہی انہیں سخت سزائیں دو تا کہ اگر وہ سمجھ نہیں سکتے تو کم سے کم ڈر ہی جائیں۔

مسلمان مریضوں کی عیادت کرو، ان کے جنازوں میں شرکت کرو، اپنا دروازہ کھلا رکھو اور ان کے کام خود انجام دو کیونکہ تم ان ہی میں کے ایک فرد ہو، البتہ اللہ نے تم پر بار گراں لاد دیا ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے ایسا کپڑا، کھانا اور سواریاں رکھتے ہیں جو عام مسلمانوں کو میسر نہیں۔ بندۂ خدا! بچ کے رہو۔ کہیں تم اس جانور کی طرح نہ ہو جانا جس کا گزر ایک شاداب وادی سے ہوا۔ سوائے پرخوری اور موٹاپے کے اس کا کوئی مقصد نہ رہا حالانکہ اس کی موت کا سبب اس کا موٹاپا ہی تو ہے۔ اچھی طرح یاد رکھو، حاکم کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ جب حکمران بگڑ جاتے ہیں تو عوام بھی بگڑ جاتے ہیں۔ بدبخت ترین ہے وہ انسان جس کی وجہ سے اس کی رعیت بدبخت ہو جائے۔" (امام ابن جوزی) کتنی بیش قیمت ہیں یہ نصائح! مسلمان حکام آج بھی انہیں لائحہ عمل بنا کر اسلام کے گزشتہ سنہری دور کو آواز دے سکتے ہیں۔

اثاثوں کی فہرست اور پڑتال

تعیناتی پر روانگی کے وقت عامل کے اثاثوں کی مکمل فہرست تیار کرا کر دارالخلافہ میں محفوظ رکھ لی جاتی تھی۔ اگر تعیناتی کے دوران میں عامل کے اثاثوں میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا تو اس سے مواخذہ کیا جاتا اور فاضل مال و اسباب اس سے لے کر بیت المال میں داخل کر دیا جاتا۔ تاریخ میں ایسے متعدد واقعات ملتے ہیں اور تو اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے بلند مرتبہ صحابی اور فاتح جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ماموں زاد بھائی بھی تھے۔ اس محاسبہ سے نہ بچ سکے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ صحابی کو بھی حساب دینا پڑا۔ پاکستان میں بھی حکومت کے اعلیٰ افسروں سے سال بسال اثاثوں کے گوشوارے طلب کیے جاتے ہیں لیکن یہ محض ایک رسمی کارروائی ہوتی ہے۔ نہ ان کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے نہ کسی کے خلاف کبھی کوئی محاسبہ یا تادیبی کارروائی کی جاتی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد سیاسی لیڈروں سے بھی اثاثوں کے گوشوارے طلب کیے گئے تھے۔ جس سے بعض بلکہ اکثر سیاسی لیڈروں کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا۔ لیکن انہوں نے کئی کئی دفعہ کے ردوبدل کے بعد آخر اپنے گوشوارے داخل کرائے۔ کسی کے خلاف کوئی کارروائی سننے میں نہ آئی۔ بہتیروں نے اپنی جائیدادیں قابل اعتماد عزیزوں، رشتہ داروں کے نام منتقل کر دیں۔ اور بالواسطہ فروخت وغیرہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ عاملوں کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت گیری کی وجہ سے وہ ہمیشہ چوکنا اور محتاط رہتے تھے اور ایسا محسوس کرتے تھے جیسے مدینہ میں بیٹھے ہوئے خلیفہ کی آنکھیں ہر وقت ان پر لگی ہوئی ہوں۔ دور دراز مقامات پر بیٹھے ہوئے عمال ہیبت فاروقی سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ کا درہ دوسروں کی تلوار سے زیادہ خوفناک تھا۔ وہ عاملوں کی معمولی لغزشوں پر بھی سخت گرفت کرتے تھے۔ اگر کسی عامل کے متعلق یہ ثابت ہو

جاتا کہ وہ بیمار کی عیادت نہیں کرتا یا کمزور کو اس کے دربار میں رسائی نہیں ملتی تو اسے معزول کر دیتے۔ انہوں نے صحیح معنی میں بیوروکریسی کو لگام دے رکھی تھی، زندگی کے آخری ایام میں تمام صوبوں کا احتسابی دورہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ فرماتے تھے کہ اگر میں زندہ رہا تو ہر شہر میں دو دو ماہ رہ کر دیکھوں گا کہ گورنر کس طرح کام کرتے ہیں اور ان کے کاموں سے رعایا کس حد تک مطمئن اور آسودہ ہے لیکن موت نے مہلت نہ دی۔

نظام عدالت

عدلیہ انتظامیہ سے بھی زیادہ اہم ہے۔ قرآن نے قیام عدل کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے کہ اپنے بیگانے، دوست، دشمن، مسلمان اور ذمی سبھی سے عدل وانصاف کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے اپنے پیروؤں کے قلوب میں عدل پسندی کو راسخ کر دیا تھا۔ عہد صدیقی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ محکمہ انصاف کے سربراہ رہے تھے لیکن بہت ہی کم مقدمات فیصلہ کے لئے آپ کے پاس آئے۔ عہد صدیقی عہد نبوی سے متصل تھا اور مسلمانوں میں باہمی مقدمہ بازی شروع نہیں ہوئی تھی وہ مسلسل دشمنوں ہی کے خلاف نبرد آزما رہے۔ جب عمر رضی اللہ عنہ خود خلیفہ ہوئے تو مملکت کے پھیل جانے اور دور دراز علاقوں میں مختلف اقوام کے حلقہ بگوشِ اسلام ہو جانے کی وجہ سے انہوں نے محکمہ عدل کو نئے سرے سے مستقل بنیادوں پر منظم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ صوبائی حکومتوں کے مراکز کے علاوہ اضلاع میں بھی قاضی مقرر کئے تاکہ لوگوں کو انصاف آسانی سے میسر آسکے۔ قانون کی بالاتری پر زور دیا۔ عدالت کی نظر میں خلیفہ، گورنر اور عام مسلمان برابر ٹھہرے۔ قضاۃ کے تقرر میں بھی اسی جوہر شناسی اور حزم واحتیاط سے کام لیا جس سے گورنروں اور دوسرے عمال کے انتخاب میں کام لیتے تھے۔ قاضیوں کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں تاکہ انہیں کسی قسم کا لالچ پیدا نہ ہو۔ کسی قاضی کو تجارتی کاروبار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ تقرر کے بعد قاضی اپنے فیصلے کرنے میں بالکل آزاد ہوتے تھے۔ قضا کا انتظامیہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔[1] قاضیوں کے تقرر میں ان کے علم وتقویٰ، دیانت، دیانت اور قوت فیصلہ کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ قاضیوں کو حکم تھا کہ کسی صورت میں بھی گورنروں کی ماتحتی اور دباؤ قبول نہ کریں۔ قرآن مجید کے مطابق فیصلے کریں۔ اگر کسی معاملہ میں قرآن مجید سے رہنمائی نہ ملے تو حدیث کی طرف رجوع کریں۔ اگر حدیث سے بھی روشنی نہ ملے تو اجماع سے۔ آخری صورت میں اپنے اجتہاد سے کام لیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعض دفعہ قاضیوں کا امتحان بھی لیتے تھے۔ قضا کے اصول وآئین کے متعلق حسب ذیل ہدایت نامہ بصرہ کے قاضی (پھر گورنر) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بھجوایا:

''قضا ایک ضروری فرض ہے، جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہو تو اس کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھو اور جب صحیح فیصلے پر پہنچ جاؤ تو اسے نافذ کر دو کیونکہ زبانی فیصلہ بے سود ہے تاوقتیکہ اسے عملاً نافذ نہ کیا جائے۔ لوگوں کو اپنے حضور میں، اپنی مجلس میں، اپنے انصاف میں برابر رکھو۔ مدعی اور مدعا علیہ کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرو تاکہ کمزور انصاف سے مایوس نہ ہو۔ اور معزز آدمی کو رعایت کی امید

---

[1] بدقسمتی سے ہم چالیس برس گزرنے پر بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں عدالتوں کو انتظامیہ سے الگ نہیں کر سکے۔ (مؤلف)

پیدا نہ ہو۔ جو شخص دعویٰ کرے اس پر بارِ ثبوت ہے اور جو انکار کرے اس پر قسم ہے۔ صلح جائز ہے مگر وہ صلح جس سے حرام، حلال اور حلال حرام نہ ہونے پائے۔ کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا تو آج غور کے بعد اگر حق اس کے خلاف نظر آئے تو اس سے رجوع کر سکتے ہو اس لئے کہ حق ازلی ہے۔ اس کی طرف رجوع کرنا غلطی پر اڑے رہنے سے بہتر ہے۔ جس مسئلہ میں شبہ ہو اور قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر بار بار غور کرو۔ جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لئے ایک میعاد مقرر کر دو۔ اگر وہ ثبوت دے تو اس کا حق دلاؤ ورنہ مقدمہ خارج۔ ان اشخاص کے سوا جنہیں حد کی سزا میں درے لگائے گئے ہوں یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا وِلا اور وراثت میں مشکوک ہوں، سب مسلمان ثقہ ہیں۔ تمہاری اندرونی حالت کو اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس نے تمہاری ذمہ داری کو دلیلوں اور قسموں کے ذریعے تم سے ہٹا دیا ہے۔ خبردار! جھگڑنے والوں کی وجہ سے تمہارے اندر کسی قسم کی خفگی، اکتاہٹ یا چڑچڑا پن پیدا نہ ہونے پائے۔ نہ جھگڑا فیصلہ کرتے وقت کج خلقی و برگشتگی ظاہر ہو۔ کیونکہ حق کی جگہوں پر حق سے کام لینے کا اللہ بڑا اجر دیتا ہے اور اس کا نتیجہ اچھا ہوتا ہے جس کی نیت درست ہو اور وہ اپنے نفس کا بھلا چاہے تو خدا اسے لوگوں سے بے نیاز کر دیتا ہے اور جو شخص اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کے باوجود لوگوں سے اوپری اور بناوٹی اخلاق سے پیش آتا ہے تو اللہ اس کو ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔ اس کے لئے اللہ کے رزق و رحمت کی امید نہ رکھو۔"[1]

اسی قسم کے رہنما اصول کوفہ کے قاضی شریح کو بھی لکھ بھیجے تھے آپ چاہتے تھے کہ عدلیہ مطلقاً آزاد ہو اور کتاب و سنت کے سوا کسی چیز سے متاثر نہ ہو اور کسی قسم کا خارجی دباؤ قبول نہ کرے۔ اگر ان رہنما اصولوں کی روح کو سمجھ کر ان پر عمل کیا جائے تو انصاف کی موجودہ گرانی، اس کے حصول میں تاخیر، شہادتوں میں گڑبڑ اور وکیلوں کے چکر ختم ہو سکتے ہیں۔ رشوتوں، سفارشوں اور انتظامیہ کے دباؤ کا بھی خاتمہ ہو سکتا ہے اور سب کو انصاف آسانی سے میسر آ سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ (اور دوسرے خلفائے راشدین بھی) اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے اپنے مقرر کردہ قاضی ان کے خلاف فیصلے دینے میں بھی ویسے ہی آزاد اور بے باک تھے جیسے عام شہریوں کے مقابلے میں۔ چنانچہ مدینہ میں شریح نے ایک گھوڑے کے معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف فیصلہ دیا۔ انہوں نے فیصلہ خوش دلی سے تسلیم کیا اور شریح سے ناراض ہونے یا معتوب قرار دینے کی بجائے انہیں کوفہ جیسے اہم شہر کا قاضی مقرر کر دیا۔ جہاں وہ آپ کی شہادت کے بعد بھی عرصہ دراز تک قاضی کے عہدہ پر رہے۔

اس طرح ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مدینہ کے قاضی حضرت زید بن ثابت

---

[1] "الفاروق" (شبلی)، "عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ" (محمد حسین ہیکل)

"تاریخ ادب عربی" (احمد حسن زیات)

انصاری رضی اللہ عنہ کی عدالت میں مدعا علیہ اور مدعی کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ زید رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلیفۂ وقت کی حیثیت سے تعظیم کی اور انہیں اپنی جگہ بٹھانا چاہا مگر وہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھے حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے دعویٰ پیش کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انکار کیا۔ قاعدے کی رو سے قاضی (زید رضی اللہ عنہ) کو ان سے قسم لینی چاہئے تھی مگر انہوں نے اس میں تامل کیا اور ابی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ امیر المومنین کو اس سے معاف رکھو۔ لیکن خلیفۂ وقت (عمر رضی اللہ عنہ) نے مدعا علیہ کی حیثیت سے خود رضا کارانہ طور پر قسم اٹھائی اور زید رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''تم قاضی ہونے کے قابل نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ عمر رضی اللہ عنہ اور ایک عام مسلمان تمہارے نزدیک برابر نہ ہو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ انصاف کا حصول آسان اور ارزاں ہو اور فریقین مقدمہ کے ساتھ غیر جانبدارانہ اور مساویانہ سلوک کیا جائے۔ دو چار دن میں مقدموں کا فیصلہ کر دیا جاتا تھا۔ مقدمے مہینوں اور سالوں لٹکے نہیں رہتے تھے۔ حصولِ انصاف میں وہ دقت اور ذلت پیش نہیں آتی تھی جو آج کل معمول بن گئی ہے۔ اور عدالت کا رخ کرنے کی بجائے صبر کر کے گھر میں بیٹھ رہنا بہتر معلوم ہوتا ہے رشوتوں اور سفارشوں کا بھی چلن نہ تھا۔ اسلامی تاریخ میں بنی امیہ کے عہد سے پہلے کسی قاضی کے رشوت لینے یا بے انصافی کرنے کا پتہ نہیں چلتا۔ مسجدیں عدالتوں کا کام دیتی تھیں جہاں مدعی اور مدعا علیہ کی رسائی بڑی آسان تھی۔ کوئی چپڑاسی، دربان یا محرر وغیرہ روک ٹوک کرنے یا مقدمہ کی مسل کو دبا کر بیٹھنے اور نذرانہ طلب کرنے والا نہ تھا، فریقین مقدمہ کو کسی قسم کا خرچ کرنا نہیں پڑتا تھا، قاضیوں کو یہ بھی تاکید تھی کہ جب کوئی غریب اور ادنیٰ شخص فریق مقدمہ بن کر آئے تو اس سے نرمی اور کشادہ روئی سے پیش آئیں تاکہ اس پر کسی قسم کی گھبراہٹ اور خوف طاری نہ ہو۔

خلیفہ کی حیثیت مملکت اسلامیہ کے چیف جسٹس کی بھی تھی۔ بعض مقدمات خود ان کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ یا ان کی اہمیت اور نوعیت کے پیش نظر یا صوبائی عدالتوں کے فیصلوں پر عدم اطمینان کی وجہ سے وہ خود اپنے ہاں طلب کر لیتے تھے۔ خلیفہ کے ایوانِ عدالت میں ادنیٰ و اعلیٰ، اپنے پرائے سب برابر تھے۔ جرم ثابت ہونے پر بڑے سے بڑے آدمی کے خلاف علی الاعلان سزا نافذ کی جاتی تھی۔ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی کسی قسم کی رعایت نہیں برتتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن ابوشحمہ کو نشہ آور نبیذ پینے پر کوڑوں کی سزا دی۔ اپنے برادر نسبتی قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کو بھی شراب نوشی کے جرم میں کوڑے لگوائے۔

بعض خصوصی نوعیت کے مقدمات میں ماہرین فن کی شہادت بھی لی جاتی تھی جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلی دفعہ رواج دیا۔ آج دنیا کی عدالتوں میں اس کا چلن ہے۔

ذمیوں کی اپنی عدالتیں تھیں جو انہی کے قانون کے مطابق فیصلے کرتیں۔ اگر کسی مسلمان اور ذمی کے درمیان یا کسی عیسائی اور یہودی یا مجوسی کے درمیان جھگڑا ہوتا تو قاضی کی طرف رجوع کیا جاتا۔ ایک ہی مذہب یا فرقہ کے غیر مسلم فریقین بھی اپنی مرضی سے قاضی کی عدالت کی طرف رجوع کر سکتے تھے۔ جہاں ان کا فیصلہ اسلامی قانون کے مطابق کیا جاتا۔ ایک دفعہ کسی مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ مقتول کے وارث نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس دعویٰ دائر کیا۔ جرم ثابت ہو جانے پر آپ نے قاتل مسلمان کو مقتول کے وارث کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے

قصاص میں قتل کر دے۔

فوجی نظام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جتنی جنگیں ہوئیں ان میں تمام مسلمان نفیر عام کے جواب میں رضا کارانہ طور پر شامل ہوتے رہے اگر کوئی مالِ غنیمت ہاتھ آتا تو اس میں سے انہیں حصہ ملتا۔ شہادت کی صورت میں پسماندگان کے لئے کوئی معاوضہ نہ تھا۔ عہد فاروقی میں جب روم وایران سے جنگوں کا سلسلہ طویل ہوتا گیا اور بار بار مجاہدین کی طلبی اور فراہمی میں دقت اور تاخیر ہونے لگی تو ۱۵ھ میں اکابر صحابہ کے مشورے سے فوج کا صیغہ باقاعدہ طور پر منظم ومرتب کیا گیا۔ مہاجرین وانصار سے شروع کر کے تمام مسلمانوں کو مجاہد فی سبیل اللہ قرار دے کران کے نام رجسٹر میں درج کر لئے گئے اور ان کی تنخواہیں مقرر کر دی گئیں۔ علامہ شبلی اور ڈاکٹر محمد حمید کے مطابق فوجی رجسٹروں سے غیر مسلم خارج نہ تھے۔ بڑی تنخواہ پانے والے متعدد ایرانی مجوسیوں کا نام بھی ملتا ہے۔ ایسے غیر مسلم جزیہ سے بری تھے۔ مجاہدین کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک ہمہ وقتی جو باقاعدہ فوج کے سپاہی تھے۔ ان کے بیوی بچوں اور غلاموں کو بھی وظیفے ملتے تھے۔ دوسرے مطوعہ یا رضا کار جو ضرورت کے وقت طلب کر لئے جاتے تھے۔ انہیں باقاعدہ فوجیوں کے مقابلے میں کم تنخواہ ملتی تھی۔ اہل فوج کو تنخواہ کے علاوہ بھتہ، رسد اور وردی بھی دی جاتی تھی۔ بے سروسامان سپاہیوں کو اسلحہ اور سواری کے جانور بھی دیئے جاتے تھے اور کھانا بھی۔ تجربہ کی روشنی میں رسد کا ایک باقاعدہ محکمہ قائم کر دیا گیا۔ عام مجاہدین کی تنخواہ کم سے کم دوسو درہم سے تین سو درہم سالانہ تھی۔ جب کہ افسروں کی تنخواہیں سات ہزار درہم سے دس ہزار درہم سالانہ تک تھیں۔ ہر لشکر کے ساتھ ایک افسر خزانہ، ایک محاسب، ایک قاضی اور متعدد طبیب، جراح قاری، جاسوس اور پرچہ نویس ہوتے تھے۔ ہر دس مجاہدین کے دستہ پر ایک عریف ہوتا تھا جو ان کی تنخواہیں خزانہ سے وصول کر کے ان میں تقسیم کرتا تھا۔ اس کا التزام تھا کہ ہر مجاہد کو چار ماہ بعد چھٹی ضرور دی جائے تاکہ وہ اپنے گھر جا کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزار سکے۔ امرائے لشکر کو تاکید تھی کہ مجاہدین سے اچھا سلوک کریں۔ تقریباً دس لاکھ مسلح فوج ہر وقت موجود رہتی تھی۔ اس میں ہر سال تیس ہزار مجاہدین کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ مفتوحہ اقوام کے ذمی بھی اپنی مرضی سے فوج میں شامل ہو سکتے تھے۔ اندریں صورت انہیں جزیہ معاف ہو جاتا تھا۔

مدینہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، مصر، دمشق، حمص، اردن وغیرہ بڑے بڑے فوجی مراکز تھے۔ جہاں چار چار ہزار گھوڑے ہر وقت ضروری ساز وسامان کے ساتھ تیار رہتے تھے۔ کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط کے شہر تو عہد فاروقی میں بسائے ہی فوجی چھاؤنیوں کے طور پر گئے تھے۔ عراق، ایشیائے کوچک، شام، فارس میں بھی جابجا فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئی تھیں۔ ایرانی سرحد پر ہونے کی وجہ سے کوفہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ وہاں چالیس ہزار مجاہد موجود رہتے تھے۔ فوج سے متعلق جملہ کاغذات، ریکارڈ وغیرہ انہیں چھاؤنیوں میں رکھے جاتے تھے۔ فوجی گھوڑوں اور اونٹوں کے لئے وسیع چراگاہوں کا انتظام تھا۔ مجاہدین کے رہنے کے لئے بارکوں کا انتظام تھا۔ فوجیوں

کے لئے شہسواری، تیراندازی، تیراکی اور برہنہ پا دوڑنے کی مشق ضروری تھی۔ یہ بھی ضروری تھا کہ گھوڑے پر رکاب کے سہارے کے بغیر سوار ہوں۔ نرم و ملائم لباس نہ پہنیں۔ دھوپ کھانا نہ چھوڑیں اور حمام میں نہ نہائیں۔

پرچہ نویسوں کے ذریعے فوج کی ایک ایک بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک بڑی باقاعدگی اور سرعت سے پہنچ جاتی تھی اور وہ ضروری اقدامات کرتے تھے۔ مدینہ میں بیٹھے ہوئے وہ جملہ افواجِ اسلامی کے سپریم کمانڈر تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فوجی نظام اپنے زمانے کا عمدہ ترین اور موثر ترین نظام تھا۔ ان کی فوج اپنے نظم وضبط اور پابندیٔ اخلاق کے لحاظ سے دنیا کی بہترین فوج تھی۔

دیوان......دفتر رجسٹریشن......وظائف

علامہ ابن جریر طبری کے بقول ۱۵ھ میں اور محمد ابن سعد کے بقول ۲۰ھ میں مرتب ہوا غالباً طبری کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ ۱۵ھ میں فتوحات کا مال بکثرت آنے لگا تھا اور جنگی محاذ ایران و بازنطہ کے ساتھ کھل گئے تھے۔ قابل جنگ افراد کی ضرورت روز افزوں تھی۔ ان کی اور ان کے اہل وعیال کی مردم شماری ضروری تھی تاکہ ان کے روزینے مقرر کئے جائیں اور وہ بے فکر ہوکر فوجی خدمات انجام دے سکیں۔ ہر مسلمان اسلامی فوج کا سپاہی تھا۔ چنانچہ مختلف درجوں کے افراد کے مراتب اور خدمات کا لحاظ کرکے ان کے وظائف کا تعین کیا گیا اور سب کے کوائف معہ رقم وظیفہ رجسٹر میں درج کئے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت مخرمہ بن نوفل رضی اللہ عنہ اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کو اس کام پر مقرر کیا اور حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان بنو ہاشم سے شروع کرو اور درجہ بدرجہ جس قدر نزدیکی یا دوری لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رکھتے ہیں۔ اسی ترتیب سے ان کے نام لکھو۔ خلفائے راشدین میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نسب سب سے آخر میں جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب سے ان کا اور ان کے اہل قبیلہ کے نام رجسٹر میں درج کئے گئے۔ عام اصول یہ اختیار کیا گیا کہ سب سے مقدم وہ جنہوں نے پہلے اسلام قبول کیا اور اس کی خاطر تکلیفیں اٹھائیں، پھر وہ جنہوں نے اسلام کی راہ میں دولت خرچ کی، پھر عام حاجت مند۔ اس طرح ایک فلاحی مملکت کی بنیاد پڑی اور ساتھ ہی ایک دینی اشرافیہ کی بھی۔ ایک عام خوشحالی پیدا ہوئی، لوگوں کو سکون و اطمینان نصیب ہوا۔

سب سے زیادہ وظیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا مقرر کیا گیا یعنی بارہ ہزار درہم سالانہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت

صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کا چھ ہزار درہم سالانہ اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن (بشمول حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا) کا بارہ بارہ ہزار درہم سالانہ۔

دوسرے لوگوں کے وظائف حسب ذیل مقرر کئے گئے:

شرکائے بدر.................. پانچ ہزار درہم سالانہ

مہاجرین حبشہ و شرکائے احد.......... چار ہزار درہم سالانہ

فتح مکہ سے پہلے مدینہ ہجرت کرنے .... تین ہزار درہم سالانہ
والے
فتح مکہ کے موقع پر ایمان لانے .... دو ہزار درہم سالانہ
والے قادسیہ اور یرموک کے مجاہدین .... دو ہزار درہم سالانہ
اہل یمن .... چار سو درہم سالانہ
قادسیہ اور یرموک کے بعد کے
مجاہدین .... تین سو درہم سالانہ
بلا امتیاز مراتب .... دو سو درہم سالانہ

فوجی افسروں کی تنخواہیں سات ہزار سے دس ہزار درہم سالانہ مقرر کی گئیں۔ جن لوگوں کا جو وظیفہ مقرر ہوا وہی ان کے غلاموں کا بھی مقرر کیا گیا۔

نومولود بچوں کے لئے سو درہم سالانہ مقرر کیا گیا جو عمر کے ساتھ بڑھتا رہتا تھا۔ لاوارث بچوں کا وظیفہ بھی سو درہم تھا۔ ان کی رضاعت اور نفقہ کا بیت المال کفیل ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر سال ان بچوں کو خود دیکھتے تھے تاکہ معلوم ہو کہ ان کے ولی ان کی اچھی طرح غور و پرداخت کر رہے ہیں۔

مہاجرین اور انصار کی بیویوں کا وظیفہ دو سو سے چار سو درہم تک اور بدری صحابہ کے بیٹوں کا وظیفہ دو ہزار درہم مقرر ہوا۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا وظیفہ چار ہزار درہم مقرر کیا گیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے احتجاج کیا کہ ''اسامہ کے لئے چار ہزار اور میرے لئے تین ہزار کیوں؟ حالانکہ میں ان غزوات میں شریک رہا ہوں جن میں اسامہ شریک نہیں ہوئے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ کو اس لئے زیادہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھ سے اور تیرے باپ سے اس کو اور اس کے باپ [1] کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔'' حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کمسن بچے تھے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کی وجہ سے ان کو ان کے والد بزرگوار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے برابر پانچ پانچ ہزار درہم سالانہ کا وظیفہ دیا۔

آخر میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''خدا کی قسم! اگر اس کے بعد بھی کچھ بچا تو جبل صنعا (یمن) کا چرواہا بھی اپنے گھر بیٹھے اس مال میں سے اپنا حصہ پائے گا۔''

نیز ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ ''خدا کی قسم! اگر اللہ نے مجھے سلامت رکھا تو عراق کی بیواؤں کو اس حالت میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ہرگز کسی کی دست نگر نہ ہوں۔''

یہ بھی فرمایا کہ اگر مال کی کثرت ہوئی تو ہر شخص کو چار ہزار درہم وظیفہ دوں گا۔ ایک ہزار سفر کے لئے، ایک

---

[1] حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور غلاموں میں سب سے پہلے مسلمان۔ واحد صحابی جن کا ذکر قرآن مجید (سورۂ احزاب) میں نام لے کر کیا گیا ہے۔ جنگ موتہ میں اسلامی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ مؤلف

ہزار اسلحہ کے لئے، ایک ہزار گھوڑے کے لئے اور ایک ہزار اہل وعیال کے لئے۔

وظائف کو حق داروں تک پہنچانے کا خاص انتظام کیا۔ وظائف کے رجسٹر شہروں، قبیلوں کے حاکموں اور سرداروں کے پاس رہتے تھے۔ بعض دفعہ مدینہ کے نواحی قبائل میں بہ نفس نفیس جا کر تقسیم کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ وظیفوں کی پس انداز رقم سے لوگوں کو بکریاں وغیرہ خریدنے کا مشورہ بھی دیتے تھے۔ لوگ گلہ بانی اور تجارت وغیرہ میں سرمایہ کاری کرنے لگے۔ اس سے ان لوگوں کی دولت خوب بڑھی جو ہزاروں درہم کا وظیفہ پاتے تھے۔ اپنے آخری ایام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو محسوس کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تقسیم اموال کی مساوات والی پالیسی زیادہ بہتر اور درست تھی۔ فرمایا:

''خدا کی قسم! اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا۔ تو آخری آدمی کو پہلے آدمی سے اور سب سے پست آدمی کو سب سے بلند آدمی سے ملا دوں گا'' لیکن اگلا سال آنے سے پہلے ہی آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ نوآباد شہروں خاص کر کوفہ، بصرہ اور فسطاط میں قریش اور غیر قریش کے امتیاز وتفریق نے سر اٹھانا شروع کر دیا کیونکہ قریش وانصار اولین مسلمان تھے۔ وظائف، عطایا اور مناصب میں انہیں ترجیح ملی تو دوسرے عرب قبائل حسد کرنے لگے۔ بہرحال یہ نظام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد تک قائم رہا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شیر خوار بچوں کے وظائف بند کر دیئے۔ عبدالملک بن مروان نے وظائف میں مزید کمی کی۔ عباسی خلیفہ معتصم باللہ نے فوجی دفتر سے سب عربوں کے نام نکال دیئے۔ اہل عجم پر کلی انحصار کیا۔ گویا عرب حکومت وخلافت سے بے دخل ہو گئے۔

صیغۂ محاصل وخراج...... مفتوحہ اراضی کا بندوبست

اسلام سے پہلے عرب میں کوئی مرکزی تنظیم اور حکومت نہ تھی۔ اس لئے محاصل وخراج کی وصولی اور ادائیگی، جمع وخرچ کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نوزائیدہ اسلامی مملکت کی آمدنی کا انحصار زیادہ تر مالِ غنیمت کے خمس اور زکوٰۃ وصدقات پر تھا۔ خیبر کی مفتوحہ اراضیٔ سے کچھ بٹائی کا مال بھی آنے لگا تھا اور عہد صدیقی میں کچھ جزیہ بھی یہ تمام اموال آنے کے ساتھ ہی بحصہ برابر تقسیم کر دیئے جاتے تھے لیکن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں روم وایران کی فتوحات سے ذرائع آمدنی میں بے حد وسعت پیدا ہو گئی۔ اس لئے خصوصی بیت المال تعمیر کرایا گیا تاکہ جو اموال تقسیم سے بچ رہیں وہ فوجی اور دوسری ملی ضروریات پر خرچ کرنے کے لئے جمع رکھے جائیں۔ آمدنی کا ایک نیا اور بڑا ذریعہ خراج تھا جو غیر مسلم مالکان اراضی اور دخیل کاروں سے وصول کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خراج ومحاصل کا نہایت وسیع اور باقاعدہ بندوبست کیا جو عرب میں ایک نئی چیز تھی۔ عراق، ایران، مصر، شام، فلسطین وغیرہ کی مفتوحہ زمینیں ان کے قدیم غیر مسلم مالکوں ہی کے پاس رہنے دی گئیں اور ان کی زرخیزی کے لحاظ سے خراج عائد کر دیا گیا مسلمان مجاہدین اور بہت سے سرکردہ اصحاب نے مطالبہ کیا کہ مفتوحہ زمینیں فاتح افواج میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس مسئلہ پر بڑا اختلاف پیدا ہوا اور طویل مباحثے ہوئے۔

حضرت عمر کی رائے تھی کہ زمینیں حکومت کی ملکیت قرار دی جائیں تا کہ آئندہ نسلیں بھی ان سے مستفید ہوتی رہیں اور حکومت کے لئے بھی ایک مستقل ذریعہ آمدنی موجود رہے۔ کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متعدد تقریریں کیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے آپ کے نقطۂ نظر کی تائید کی جب کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ وغیرہ نے مخالفت کی۔

جب بزرگ صحابہ کی خصوصی مجلس مشاورت میں اتفاق رائے نہ ہو سکا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عام مجلس مشاورت منعقد کی جس میں انصار مدینہ کو بطور خاص بلایا گیا کیونکہ زراعت پیشہ ہونے کی وجہ سے وہ مہاجرین کے مقابلے میں اراضی کے معاملات کا وسیع تجربہ رکھتے تھے اور انہیں بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ اس مجلس عام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑی مدلل اور پرزور تقریر کی جو ان کی دور اندیشی، جمہوریت نوازی اور عدل و مساوات پسندی پر شاہد ہے۔ فرمایا:

''میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ جس بار امانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا ہے، اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق ہے میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ میری مرضی کا اتباع کریں اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ حق کا معیار آپ کی رائے ہے نہ میری۔ حق کا معیار اللہ کی کتاب ہے۔

آپ نے میرے ان دوستوں کی آوازیں سنی ہوں گی جو اس بات میں میری مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاید میں ان کی حق تلفی کرنا چاہتا ہوں حالانکہ میرے نزدیک کسی فرد کی بھی حق تلفی کرنا جائز نہیں۔ میں بڑا شقی ہوں گا اگر ظلم کر کے کوئی ایسی چیز جو فی الواقع ان کی ہو، انہیں نہ دوں اور کسی دوسرے کو دے دوں، مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کسریٰ کی سرزمین کے بعد اب کوئی علاقہ فتح ہونے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایرانیوں کے مال، ان کی زمینیں اور ان کے کسان ہمارے قبضے میں دے دیئے ہیں۔ ہماری فوجوں نے جو غنائم حاصل کئے تھے وہ تو میں خمس نکال کر ان میں تقسیم کر چکا ہوں، اب سوال زمین کا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے بلکہ اسے موجودہ کاشتکاروں کے پاس رہنے دیا جائے۔ اور زمینوں پر خراج اور کسانوں پر جزیہ لگا دیا جائے تا کہ یہ آمدنی اجتماعی مفاد کے کام میں لائی جا سکے اور اس کے ذریعے فوج کے اخراجات نیز موجودہ اور آئندہ نسلوں کی پرورش کا سامان مہیا کیا جائے۔ کیا مفتوحہ ممالک سرحدوں کی حفاظت کے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ رہ سکیں گے؟ آخر جزیرہ، بصرہ، کوفہ، عراق، شام اور مصر وغیرہ کے بڑے شہروں میں فوجوں کو چھاؤنیاں بنانی پڑیں گی۔ ان کا خرچ کہاں سے پورا کیا جائے گا؟

''مجھے قرآن مجید کی سورۂ حشر (۵۹) کی آیات ۷ تا ۱۰ سے اس بارے میں رہنمائی ملی ہے۔ اللہ نے صاف فرما دیا

ہے کہ فے کے مال میں مہاجرین وانصار (بغیر اس کے کہ وہ شریک جنگ تھے یا نہیں) کے علاوہ ان کے بعد آنے والوں (والذین جاء وا من بعد هم۔ آیہ ۱۰) کا بھی حق ہے۔'' ۱؎

اس قرآنی حوالے اور استدلال کو سن کر مخالفین نے بھی سر تسلیم خم کر دیئے۔ چنانچہ یہ طے پا گیا کہ مفتوحہ اراضی کی ملت اسلامیہ بحیثیت مجموعی مالک ہے۔ ان زمینوں پر پہلے سے کام کرنے والے کاشتکار برقرار رہیں گے اور اسلامی حکومت کو ایک مقررہ لگان ادا کرتے رہیں گے۔ نسلاً بعد نسل یہ کاشتکارانہ حقوق ان کی میراث میں منتقل ہوتے رہیں گے اور وہ ان حقوق کو فروخت بھی کر سکیں گے مگر زمین کی اصل مالک ملت اسلامیہ ہوگی۔

اس فیصلے کی رو سے حسب ذیل زمینیں اجتماعی ملکیت اور خراجی قرار دی گئیں۔

۱- جو صلح کے نتیجے میں اسلامی حکومت کے قبضے میں آئیں۔

۲- جن کے مالک انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

۳- جن کے مالک مارے گئے اور کوئی مالک باقی نہ رہا۔

۴- جو پہلے سے کسی کے قبضے میں نہ تھیں۔

۵- جو پہلے سے لوگوں کے قبضے میں تھیں مگر ان کے سابق مالکوں کو برقرار رکھ کر ان پر جزیہ وخراج عائد کر دیا گیا۔

۶- سابق حکمران خاندانوں کی جاگیریں

۷- سابق حکومتوں کی املاک ۸- جنگلات

ان سب کو فے قرار دے دیا گیا۔ اور آمدنی مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کے لئے وقف کر دی گئی۔ ۲؎ دوسرے مفتوحہ علاقوں میں بھی یہ اصول اپنایا گیا۔

یہ بڑا اہم فیصلہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی فراست اور دور اندیشی سے محسوس کیا کہ اگر ہزاروں لاکھوں

۱؎ تفہیم القرآن جلد ۵ از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۴۰۱-۳۹۹ نیز شاہکار رسالت از غلام احمد پرویز ۳۸۵-۸۶

۲؎ سورہ حشر (۵۹) کی آیات ۷ تا ۱۰ کا ترجمہ

''جو کچھ بھی اللہ ان بستیوں سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور رشتہ داروں اور یتامی اور مساکین اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔ جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔ اللہ سے ڈرو۔ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (نیز وہ مال) ان غریب مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور جائیدادوں سے نکال باہر کئے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہی راست باز لوگ ہیں۔ (اور وہ ان لوگوں کے لئے بھی ہے) جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دار الہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں (اور وہ ان لوگوں کے لئے بھی ہے) جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان کے لئے کوئی بغض نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔''

۱- بحوالہ تفہیم القرآن جلد پنجم تفسیر سورۂ حشر (۵۹)

مربع میل کے وسیع زرعی علاقے اسلامی افواج کو دے دیئے گئے تو ایک طرف تو دولت و جائیداد معدودے چند افراد اور خاندانوں کے ہاتھوں میں محدود ہو جائے گی جو سورۂ حشر کی روح کے خلاف ہے، دوسرے حکومت کی ضروریات صرف خمس، جزیہ اور زکوٰۃ سے پوری نہیں ہوسکیں گی۔ نیز مجاہدین کی توجہ جہاد سے ہٹ جائے گی۔ ان کی متحدہ قوت منتشر ہو جائے گی اور وہ جہاد کی بجائے زراعت کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ مزید برآں مفتوحین کی استمالت قلوب بھی مدنظر تھی جن کی اکثریت مرور ایام کے ساتھ مسلمان ہوگئی۔

اراضی کی پیمائش، لگان کی تعین

خراج مقرر کرنے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی تمام اراضی کی بڑی احتیاط اور اہتمام سے پیمائش کرائی۔ اس کے لئے دیانتدار ماہرین کو مقرر کیا۔ زمینوں کی حیثیت اور پیداوار کے لحاظ سے لگان کی مختلف شرحیں دو درہم سے لے کر دس درہم فی جریب سالانہ مقرر کی گئیں۔ خراج کی وصولی میں بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ ثقہ اشخاص کی شہادت سے اس کا پورا اطمینان کر لیا جاتا تھا کہ کسی پر ظلم و زیادتی سے کچھ وصول نہیں کیا گیا۔ اس احتیاط اور نرمی کے باوجود عراق کے خراج کی جو مقدار نوشیروانی عہد سے آٹھ کروڑ درہم سالانہ چلی آتی تھی وہ بڑھ کر دس کروڑ بیس لاکھ درہم سالانہ ہوگئی یعنی ستائیس فیصد اضافہ ہوا۔ عہد فاروقی کے بعد عراق سے پھر کبھی اتنا خراج وصول نہیں ہوا۔

دوسرے مفتوحہ ممالک میں نئے سرے سے بندوبست اراضی کرنے کی نوبت نہیں آئی بلکہ قدیم جابرانہ اور استحصالی طریقوں کی اصلاح کر کے انہیں نرم اور منصفانہ بنایا گیا۔ جاگیردارانہ نظام ختم کر کے زمینیں ملک کے اصلی باشندوں اور کاشتکاروں کے قبضہ میں دے دی گئیں۔ مسلمان مجاہدین کو زمین زدہ ہونے سے روکنا وقت کی ضرورت تھی۔ فاتح قوم کے افراد زمینیں سہولت سے اور سستی خرید سکتے تھے مگر اس سے ان کے روابط مفتوحین مالکوں سے مکدر ہونے کا اندیشہ تھا اور مؤخر الذکر میں بیکاری بڑھ جاتی اور زبردستی استحصال کے واقعات بھی ہوسکتے تھے۔ مجاہدین کی جہاد اور جفاکشی کی زندگی بھی متاثر ہوتی۔ لہٰذا خلیفہ ثانی نے حکم جاری کر دیا کہ کوئی مسلمان فوجی ذمی سے زمین نہیں خرید سکتا نہ کاشت کاری کر سکتا ہے۔ ایک مسلمان عرب نے ایک دفعہ مصر میں زراعت کر لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بلا کر سخت مواخذہ کیا اور فرمایا کہ تجھ کو ایسی سزا دوں گا کہ اوروں کو عبرت ہو۔ زمین کی آبادکاری اور ترقی کے لئے یہ قانون بنایا کہ جو شخص کسی غیر آباد زمین کو آباد کرے گا وہ اس کی ہو جائے گی۔ اس طرح بہت سی افتادہ زمینیں آباد ہوگئیں۔

عشر

مسلمان کاشتکاروں سے حکومت عشر یعنی زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ وصول کرتی تھی۔ [1]

۱- ۱۹۸۳ء کی فصل خریف سے مارشل لاء حکومت نے پاکستان میں عشر کا نظام رائج کر دیا ہے۔ اس سے پہلے اسی حکومت نے نظام زکوٰۃ نافذ کر دیا تھا ستم ظریفی اور دینی بے حسی ملاحظہ ہو کہ بہت سے مالداروں اور زمینداروں نے زکوٰۃ اور عشر کی ادائیگی سے بچنے کے لئے اپنے شیعہ ہونے کا اندراج سرکاری کاغذات میں کرایا ہے کیونکہ شیعہ حضرات کو زکوٰۃ اور عشر سے بری قرار دیا گیا ہے۔ مؤلف

دیگر محاصل

غیر مسلم رعایا سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا جو ایک بہت ہی ہلکا ٹیکس اور جان و مال کے تحفظ کا بدلہ تھا۔ بچے، بوڑھے عورتیں معذور، نادار اور مذہبی رہنما اس سے مستثنیٰ تھے۔ مسلم افواج میں شامل ہو کر دشمنوں کے خلاف لڑنے والے ذمی بھی جزیہ سے بری تھے۔ بلکہ مسلم فوجیوں کی طرح تنخواہ پاتے تھے۔ بوڑھوں، کمزوروں، اپاہجوں ناداروں کی بیت المال سے مدد کی جاتی تھی۔

عہد فاروقی میں فتوحات کی وجہ سے مالِ غنیمت کے خمس میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ خراج، عشر، جزیہ، زکوٰۃ، خمس سب مل کر فلاحی مملکت کے قیام میں ممد ثابت ہوئے۔ غیر ملکی غیر مسلم تاجروں سے ان کے مال پر عشور (۱۰ فیصد) وصول کیا جاتا تھا۔ کیونکہ مسلمان تاجروں کے مال پر غیر مسلم حکومتیں یہ ٹیکس وصول کرتی تھیں۔ بعد میں مملکت اسلامیہ کے ذمی اور مسلمان تاجروں سے بھی بالترتیب پانچ فیصد اور اڑھائی فی صد شرح سے وصول کیا جانے لگا۔

بیت المال

اموال کی کثرت کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں مرکزی بیت المال کے علاوہ صوبوں میں بھی بیت المال قائم کیے اور ان کے لئے وسیع اور مضبوط عمارتیں بنوائیں اور نہایت قابل اور دیانتدار خزانچی مقرر کئے۔

نظام آب پاشی

عہد فاروقی میں زراعت کی ترقی اور پینے کا پانی فراہم کرنے کے لئے متعدد نہریں کھدوائی گئیں۔ مثلاً مصر کی ننانوے میل لمبی نہر جو (نہر امیر المومنین) کہلاتی تھی۔ اس کے ذریعے دریائے نیل کو بحیرۂ قلزم سے ملا دیا گیا۔ اس سے تجارت کو بہت فروغ ہوا اور عراق کی نہر سعد، نہر موسیٰ اور نہر معقل۔ نیز دریاؤں کے سیلابی اور برساتی پانی کو ذخیرہ کرنے کے لئے بند تعمیر کئے گئے اور تالاب بنوائے گئے تاکہ زرعی آب پاشی میں سہولت ہو۔ ایک بڑا محکمہ ان کاموں کے لئے قائم کیا گیا۔

پولیس، احتساب کے محکمے اور جیل خانے

امن عامہ اور اخلاق عامہ کے قیام اور نگرانی کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پولیس اور احتساب کے محکمے قائم کئے۔ جرائم کی روک تھام اور لوگوں کے جان و مال کا تحفظ پولیس کے سربراہ (صاحب الاحداث) کی ذمہ داری تھی محکمہ احتساب کا کام ظاہری اخلاق عامہ کی نگرانی تھا۔ مثلاً شراب علانیہ نہ بکے نہ پی جائے، دکاندار ناپ تول میں دھوکا نہ دیں، ترازو باٹ، گز وغیرہ صحیح ہوں، جانوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ لادا جائے نہ طاقت سے بڑھ کر کام لیا جائے۔ تہ بازاری اور تجاوزات کی روک تھام کی جائے وغیرہ وغیرہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے عرب میں جیل خانے موجود نہ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے مکہ میں صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کا مکان خرید کر اسے جیل خانہ بنایا۔ پھر دوسرے بڑے شہروں اور اضلاع میں بھی جیل خانے تعمیر کرائے۔ زیر تفتیش ملزموں اور تعزیری مجرموں کو جیلوں میں رکھا جانے لگا۔

محکمہ افتاء

عدالتوں اور قاضیوں کا مملکت گیر نظام قائم کرنے کے علاوہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے محکمہ افتاء بھی قائم کیا جس کا کاروبار عدالت سے گہرا تعلق ہے۔ ہر کس و ناکس کو فتویٰ دینے کی اجازت نہ تھی۔ ذہین، متدین اور قرآن و سنت سے پوری طرح باخبر حضرات فتویٰ دینے پر مقرر کیے گئے مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ عدالتوں کو مفتیوں کے فتاویٰ کو پیش نظر رکھنا پڑتا تھا۔ اسلامی ممالک میں دارالافتاء آج بھی قائم ہیں لیکن عدالتوں میں مغربی قانون کے رواج کی وجہ سے مفتیوں کے فتاویٰ کی وہ اہمیت اور حیثیت نہیں۔ پاکستان میں قاضی عدالتوں کا نظام زیر غور ہے۔ اس کے قیام سے شاید دارالافتاء پھر سے فعال اور معتبر ہو جائیں۔

فقہ و اجتہاد

عہد فاروقی میں مختلف ملکوں اور قوموں کے حلقۂ اسلام میں داخل ہونے اور اسلامی تمدن کی ترقی سے سینکڑوں نئے مسائل پیدا ہوئے جن کے لئے قرآن و سنت میں واضح اور دوٹوک احکام نہیں ملتے تھے۔ اس لئے قرآن و سنت کو بنیاد بنا کر نئے مسائل کے حل کے لئے اجتہاد کی ضرورت پیش آئی اور علم فقہ وجود میں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے مسائل پر خود بھی غور کرتے تھے اور اکابر صحابہ کے مجمع میں بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ کیا جاتا تھا، مختلف فیہ مسائل کے حل کے لئے اجماع صحابہ جس کثرت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا پھر کبھی نہ ہوا۔ عمال حکومت کو فقہی احکام لکھوا کر بھجوائے جاتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمال کے تقرر میں ان کے تفقہ فی الدین کا خاص خیال رکھتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ میں عمال کو اس لئے بھیجتا ہوں کہ وہ لوگوں کو شرعی مسائل اور احکام بتائیں۔ مستقل تنخواہ دار فقہا اور معلم بھی مقرر کیے، آپ خود بہت بڑے فقیہ تھے۔ آپ کے فقہی فتاویٰ ''فقہ عمر رضی اللہ عنہ'' نامی کتاب میں مدون کیے گئے ہیں۔ آپ کے عہد میں کوفہ کی جامع مسجد میں صرف فقہ کی تعلیم کے لئے ایک سو حلقے ایک سو اساتذہ کے گرد ہوتے تھے۔ فقہ اسلامی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی مرہون احسان ہے۔ انہوں نے فقہ میں وہ اصول و نظریات مقرر کیے جن کو بعد میں آنے والوں نے اپنا مدار عمل بنایا۔ علامہ اقبال کے بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کا پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب و دماغ تھے۔

شعبۂ تعلیم

چونکہ اسلام کا اصل مقصد انسانوں کو خدائے واحد کی پرستش اور مکارم اخلاق کی دعوت دینا اور عبادات و معاملات اور حقوق و فرائض کی صحیح روح پیدا کرنا تھا، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بچوں اور بالغوں کی تعلیم کے لئے مکتب قائم کیے۔ قرآن مجید کی تعلیم کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ حدیث کی تحقیق و تفحص، تعلیم، حفاظت اور اشاعت کا بھی عمدہ انتظام تھا۔ تنخواہ دار معلم نوشت و خواند بھی سکھاتے تھے عہد فاروقی میں ہزاروں افراد پڑھنے لکھنے کے

قابل ہو گئے۔ احکام شریعت پر مشتمل سورتوں مثلاً بقرہ، نساء، مائدہ، حج اور نور کا یاد کرنا سب کے لئے لازمی قرار دیا۔ طلبائے قرآن کے لئے وظائف مقرر کئے۔ اس طرح نو مسلم صحرائی، دیہاتی اور شہری آبادیاں احکام قرآن سے بخوبی واقف ہو گئیں۔ ہزاروں حفاظ بھی پیدا ہو گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بجا فرمایا ہے کہ "قرآن پڑھنے والے مسلمانوں پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا احسان عظیم ہے۔" وہ مسائل و احکام پر مشتمل احادیث کو من وعن لفظ بہ لفظ نقل کروا کر اپنے عمال کو بھجواتے تھے۔ مضبوط شہادت کے بغیر کسی روایت کو قبول نہ کرتے تھے۔ آپ نے عبادات، معاملات اور اخلاق یعنی نظام اسلام کے عملی پہلوؤں سے متعلق احادیث پر زیادہ توجہ دی۔ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ستر مرفوع احادیث مروی ہیں اور صحیح تسلیم کی جاتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف اسی قدر احادیث جانتے تھے۔

اشاعتِ اسلام

خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اولین کام اسلام کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ اگر اسلامی افواج ساری دنیا بھی فتح کر لیتیں لیکن مفتوح کافر و مشرک ہی رہتے اور اعلیٰ اخلاق پر مبنی ایک نیا صحت مند معاشرہ ظہور میں نہ آتا تو یہ فتوحات بھی سکندر، چنگیز خاں اور نپولین کی فتوحات سے بہتر نہ ہوتیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دنیاوی غلبے سے کہیں زیادہ دینی و اخلاقی غلبے کی فکر رہتی تھی۔ انہوں نے قرآنی حکم لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (دین کے معاملے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں) کو مدنظر رکھا۔ مفتوحین میں سے جو افراد، گروہ اور قومیں مشرف بہ اسلام ہوئیں انہوں نے اسلام کی دینی و دنیاوی برکتوں کی حامل سیدھی سادی اخلاقی و روحانی تعلیم اور اس کے علمبرداروں کے اعلیٰ اخلاق سے متاثر ہو کر ایسا کیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب اپنے عیسائی غلام کو دعوتِ اسلام دی اور اس نے انکار کر دیا تو آپ مندرجہ بالا قرآنی آیت پڑھ کر خاموش ہو گئے اور اسے آزاد بھی کر دیا۔ تبلیغ اور جنگ کے اصول خود قرآن حکیم نے مقرر کر دیئے:

(۱) تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۲:۱۹۰)

(۲) تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا کسی پر دست درازی روا نہیں۔ (۲:۱۹۳)

قرآن نے یہ بھی تاکید کی کہ لڑنے سے پہلے کفار کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ یہی تبلیغ اسیران جنگ کو بھی کی جائے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شیخین رضی اللہ عنہما جب دشمن سے لڑنے کو فوجیں بھیجتے تھے تو سپہ سالاروں کو تاکید کرتے تھے کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے اسلام کی خوبیاں بیان کر کے دشمن کو قبول اسلام کی دعوت دی جائے۔ اگر وہ دعوت قبول کر لے تو بہتر ورنہ اسے جزیہ دینے کے لئے کہا جائے تاکہ اس پر اسلام کی بالادستی قائم ہو جائے اور وہ اسلامی حکومت کی حفاظت میں آ جائے اور فتنہ و فساد اور بدامنی پھیلانے سے باز رہے۔ اگر وہ ان دونوں پیشکشوں میں

سے کوئی بھی قبول نہ کرے تو پھر آخری صورت میں اس سے جنگ کی جائے۔ مخالفین کا یہ کہنا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، ایک پرانا اور گھسا پٹا الزام ہے جس کی مدلل اور مسکت تردید بارہا کی جا چکی ہے، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جنگ قادسیہ کے بعد شہنشاہ ایران یزدگرد کا شاہی رسالہ جو چار ہزار جنگ آزمودہ بہادر سپاہیوں پر مشتمل تھا اور جس کا سالار سیاہ نامی ایک بہادر جرنیل تھا، برضا ورغبت مسلمان ہو گیا۔ سیابجہ، زط (جٹ) دیالمہ اور اندغار وغیرہ قبائل واقوام بھی اپنی خوشی سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بہت سے ایرانی زمیندار، دہقان، مرزبان وغیرہ اپنے متوسلین سمیت اسلام کی آغوش میں آ گئے، شام، اردن، مصر، فلسطین وغیرہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ شطا نامی مصر کا ایک بہت بڑا رئیس اور جاگیردار مسلمانوں کے محض حالات واوصاف سن کر ہی اپنے دو ہزار متبعین سمیت مسلمان ہو گیا۔ بلہیب (مصر) کی پوری آبادی مسلمان ہو گئی۔ خود نو آباد شہر فسطاط میں نومسلم مصریوں کے کئی محلے آباد ہو گئے۔ کوفہ و بصرہ میں بھی نومسلم عجمی بکثرت آباد ہوئے مصر کی فتح کے سلسلے میں پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ہزاروں جنگی قیدیوں کے بارے میں حضرت عمر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو حکم بھیجا تھا کہ انہیں اسلام قبول کرنے یا اپنے مذہب پر قائم رہنے کا اختیار دیا جائے اور بہرحال آزاد کر دیا جائے۔ عراق، شام، فلسطین میں آباد عرب قبائل معمولی تبلیغی کوششوں سے مسلمان ہو گئے۔

یہ مثالیں بر سبیل تذکرہ پیش کی گئیں۔ عہد فاروقی میں اسلام بڑی سرعت سے پھیلا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نو مسلموں کے لئے قرآن اور ارکان اسلام کی تعلیم کا بہت اچھا انتظام کیا۔ ان میں صحیح اسلامی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ جو ممالک ان کے عہد میں فتح ہوئے، ان کی بیشتر آبادیاں اپنی رضا ورغبت سے مسلمان ہو گئیں اور آج بھی ہیں اور انہیں وہی حقوق ومراعات حاصل ہو گئیں جو عرب مسلمانوں کو حاصل تھیں۔ انہیں دوسرے درجے کے شہری نہیں بنایا گیا جیسا کہ یورپی اقوام نے گزشتہ دو ڈھائی سو سال کے اپنے غلبہ واستیلا کے دوران میں کیا آج بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ نام نہاد عیسائیت کے مبلغ مشنری ادارے آج کل اسلامی ممالک میں دھڑلے سے اپنے مالی وسائل کے بل بوتے پر مسلمان جہلا وغربا کو اپنے دام تزویر میں پھانس کر مرتد کر کے عیسائی بنانے میں لگے ہوئے ہیں اور اسلام جو دنیا میں سب سے بڑا تبلیغی مذہب ہے اپنی یہ حیثیت کھوتا جا رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کو دی جانے والی مالی امداد کو مشنری امداد کے ساتھ مشروط کر دیتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی حکومتوں، خاص کر پاکستان کی اسلامی حکومت کی طرف سے دین متین کی تبلیغ واشاعت کا باقاعدہ نظام قائم کیا جائے اور عیسائی مشنریوں اور دوسروں کو پاکستان اور دوسرے مسلمان ممالک میں اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ سے روک دیا جائے۔ ایک طرف تو ہم اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف غیر مذاہب کے مبلغوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ طرح طرح کے لالچ دے کر مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں کو مرتد کر کے اپنے دین میں شامل کر لیں۔ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے جو نافذ نہیں کی جا رہی۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت پاکستانی علاقوں خاص کر پنجاب میں اچھوت اقوام چوہڑے، سانسی

بورے وغیرہ مسلمان ہونا چاہتے تھے بلکہ بہت سے ہندو اور سکھ بھی۔ لیکن صوبائی حکومت نے انہیں مسلمان ہونے سے اس لئے روک دیا کہ بھارت مخالفانہ پراپیگنڈا کر کے دنیا کو یہ تاثر دے گا کہ پاکستان نے غیر مسلموں کو زبردستی مسلمان بنانا شروع کر دیا ہے۔ اس سے عیسائی مشنریوں نے فائدہ اٹھایا اور فراخدلانہ مالی امداد کا لالچ دے کر انہیں عیسائی بنا لیا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں اب پاکستان میں عیسائیوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی ہے[1]۔ انگریزی حکومت کے دوران عیسائی مشنری جو کام نہ کر سکے آزاد مملکت اسلامیہ پاکستان میں وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ گرجوں اور مشن سکولوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

تعمیرات اور متفرق رفاہی اقدامات

مملکت کی بڑھتی اور بدلتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے متعدد تعمیری اقدامات کئے جو ان کی عبقری بصیرت اور اپنے وقت کے بہترین ترقی یافتہ دل و دماغ کی شہادت دیتے ہیں۔

نئے شہر اور چھاؤنیاں

سرحدوں کی حفاظت کے لئے متعدد فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں اور فوجی ضروریات کے تحت نئے شہر آباد کئے گئے۔ مثلاً کوفہ، بصرہ اور موصل عراق میں، فسطاط اور جیزہ مصر میں۔ آگے چل کر ان شہروں خاص کر کوفہ، بصرہ اور فسطاط نے اسلامی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا اور عالمگیر شہرت حاصل کی۔ بہت سی سیاسی، مذہبی، علمی، ادبی، معاشی، روحانی تحریکوں نے انہی شہروں میں جنم لیا۔

بصرہ

اس کی بنیاد ۱۴ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے ڈالی۔ یہ قدیم ایرانی بندرگاہ ابلہ کے قریب دریائے دجلہ سے تقریباً دس میل دور آباد کیا گیا تاکہ فارس اور ہندوستان کے بحری حملوں کی مدافعت کی جا سکے۔ علوم عربیت، لغت، علم، نحو، عروض، موسیقی کی بنیاد یہیں پڑی۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا جیسی بزرگ ہستیاں یہیں کی خاک سے اٹھیں۔ آج کل عراق کی تیل کی صنعت اور برآمد کا یہ سب سے بڑا مرکز ہے۔

کوفہ

یہ شہر خلیفہ کے حکم سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ۱۷ھ میں دریائے فرات سے ڈیڑھ دو میل ہٹ کر آباد کیا۔ اس کے نقشے اور تعمیر کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفصل ہدایات بھیجی تھیں۔ اس شہر نے عہد فاروقی ہی میں

[1] ۱۹۴۷ء میں خود عیسائی ذرائع معلومات کے مطابق پاکستان کی عیسائی آبادی کل اسی ۸۰ ہزار تھی۔ ۱۹۵۱ء میں چار لاکھ چونتیس ہزار یعنی تقریباً چھ گنا ہو گئی۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق عیسائی آبادی تیرہ لاکھ دس ہزار چار سو چھبیس ہو گئی۔ عیسائی رہنماؤں کے دعوے کے مطابق اب ستر لاکھ تک پہنچ گئی ہے یہ دعویٰ بظاہر غلط ہے۔ تاہم اضافہ ضرور ہوا ہے۔ پندرہ بیس لاکھ بھی ہو تو بھی اسی ہزار سے بڑھ کر یہ تعداد ہمارے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ رع۔ لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل! مؤلف

اس قدر ترقی کی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے راس الاسلام، کہا کرتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے یہ شہر عرب کی طاقت کا اصل منبع بن گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اسے دارالخلافہ قرار دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش اور بغاوت کا اصل اڈہ یہی شہر تھا۔ فقہ حنفی کی بنیاد اسی شہر میں پڑی تھی۔ یہاں سے خراسان اور دوسرے سابق ایرانی مقبوضات پر کنٹرول کیا جاتا تھا۔ عہد عباسیہ میں بغداد نے اس کی اہمیت کو ختم کر دیا۔

فسطاط

اس شہر کی بنیاد ۲۱ھ میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے قصر الشمع کے مقام پر رکھی کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسکندریہ کو دارالحکومت بنانے کی اجازت نہ دی تھی وجہ یہ کہ وہاں سے مدینہ کے راستے میں دریا حائل ہوتا تھا۔ اس شہر نے بھی بہت ترقی کی مدتوں مصری سلاطین کا دارالحکومت اور تہذیب وتمدن کا مرکز رہا تا آنکہ کچھ دور نو آباد قاہرہ نے اس کی جگہ لے لی۔

موصل

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت ہرثمہ بن عرفجہ نے یہ شہر آباد کیا۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں اسے دنیا کے تین بڑے اور مشہور شہروں میں شمار کیا ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں اس کی بڑی اہمیت تھی اور آج بھی ہے۔ یہ مشرق ومغرب کی گزرگاہ تھا۔

مساجد اور دیگر عمارات وغیرہ

شہروں، چھاؤنیوں، نہروں، تالابوں، دارالامارتوں، بیت المالوں، دفتروں، قید خانوں اور مہمان سراؤں کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تقریباً چار ہزار مسجدیں مختلف علاقوں اور شہروں میں تعمیر کی گئیں یعنی چار سو مساجد سالانہ، مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ تک ہر منزل پر چوکیاں، سرائیں اور چشمے تعمیر کرائے گئے۔

حرم کعبہ کی توسیع

حاجیوں اور زائروں کی روز افزوں تعداد کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حرم شریف کی عمارت میں توسیع کرائی اور چار دیواری تعمیر کرا کر اسے عام آبادی سے الگ کر دیا۔ نیز مصر کے عمدہ قباطی کپڑے کا غلاف کعبہ پر چڑھایا۔ چار دیواری پر راتوں کو چراغ جلانے کا اہتمام کیا۔

مسجد نبوی کی توسیع

مدینہ کی آبادی بڑھ جانے سے مسجد نبوی میں توسیع کرائی۔ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے حجروں کو چھوڑ کر مسجد سے متصل تمام مکانات خرید کر مسجد میں شامل کر دیئے۔ عم رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے اپنا مکان بیچنے سے انکار کر دیا۔ قاضی شہر نے بھی فتویٰ دیدیا کہ انہیں مکان بیچنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔ لیکن اپنا حق قانوناً تسلیم کرانے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا مکان توسیع مسجد کے لئے مفت دے دیا۔

مسجد میں پہلے صرف کنکریوں کا فرش تھا۔ نمازیوں کے کپڑے اور چہرے گرد آلود ہو جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چٹائی کا فرش بچھوایا، چراغ اور خوشبو جلانے کا بھی اہتمام کیا جو پہلے نہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ خدا عمر رضی اللہ عنہ کی قبر کو روشن کرے جس نے ہماری مسجدوں کو روشن کیا۔

اس زمانے میں اور صدیوں تک بعد میں مسجدیں دینی، روحانی، علمی، ادبی، تہذیبی، سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھیں۔ ادائے نماز اور تعلیم و تعلم کے علاوہ اہم ملکی و ملی امور کے لئے لوگوں کے اجتماع مساجد ہی میں ہوتے تھے۔ اب یہ عالم ہے کہ ہمارے بڑے شہروں میں مسجدیں صرف نماز کے اوقات میں کھولی جاتی ہیں اور پھر تالے لگا دیئے جاتے ہیں۔[1]

مردم شماری

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے مختلف قوموں اور قبیلوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے لئے عرب اور دوسرے ممالک محروسہ میں مردشماری کرائی اور اس کے کاغذات بڑے اہتمام سے محفوظ رکھے گئے۔ فان کریمر نے لکھا ہے کہ "یوں تو مردم شماری قدیم ایشیائی سلطنتوں میں بھی کی جاتی تھی اور سلطنت روما میں بھی، لیکن اس سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ کوئی فرد حکومت کے ٹیکس سے بچنے نہ پائے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو مردم شماری کرائی اس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی فرد اپنے اس حق سے محروم نہ رہنے پائے جو از روئے اسلام مملکت کے ذمے واجب تھا۔" ویسے ضمناً اس سے جزیہ اور زکوٰۃ کی تشخیص میں بھی مدد ملی۔

سکہ کا اجراء

اسلام میں سکہ سازی کے موجد و مخترع بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ ابتدا میں روم و ایران کے پرانے سکے جاری رہنے دیئے گئے۔ ۱۸ھ میں ایران کے چاندی کے درہم سے مشابہ اسلامی درہم جاری کئے گئے جن میں سے بعض پر الحمد للہ بعض پر لا الٰہ الا اللہ وحدہ اور بعض پر محمد رسول اللہ کندہ کیا گیا۔ رعایا کو بھی اجازت تھی کہ سونا چاندی لا کر اور اجرت ادا کر کے دارالضرب سے سکے ڈھلوا لے۔ عہد فاروقی کے کچھ سکے آج بھی مغربی عجائب خانوں میں موجود ہیں۔

انسداد بے رحمی جانوراں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں سب سے پہلے جانوروں پر رحم کرنے، ان کی طاقت کے مطابق ان سے کام لینے اور ان کو پیٹ بھر چارہ، دانہ دینے کی ہدایات اپنے پیروؤں کو دیں اور اپنے عمل سے مثالیں قائم کیں۔ حضرت

---

[1] راقم السطور کے استاذ محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر، سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور نے یہ واقعہ سنایا کہ وہ ایران کی مشہور و معروف مسجد شاہ (اصفہان) دیکھنے گئے تو وہاں تالہ پڑا تھا۔ محافظ سے پوچھا کیا مسجد میں نماز نہیں پڑھی جاتی؟ اس نے انہیں عجیب نظروں سے دیکھا اور کہا کہ "بابا نماز چیست، روزہ چیست؟ دیوانہ شدہ ای؟ (یعنی نماز روزہ کیا ہوتے ہیں؟ پاگل تو نہیں ہو گئے؟) معلوم ہوا کہ مسجد صرف سیاحوں کے لئے کھولی جاتی ہے۔ یہ خمینی کے دور سے پہلے کی بات ہے۔ اب شاید حالات بدل گئے ہوں۔ مؤلف

عمر رضی اللہ عنہ کی ہدایت تھی کہ جانوروں کو ان کے منہ پر نہ مارو، نہ طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ لادو۔ انہوں نے جانوروں کو خصی کرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ سلام بن منیع التمیمی نے احنف بن قیس سے روایت کی ہے کہ "ہم امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک زبردست فتح کی خوشخبری لے کر حاضر ہوئے، وہ ہمارے ساتھ ہماری فرودگاہ پر آئے اور سیدھے وہاں گئے جہاں ہم نے اپنے گھوڑے وغیرہ باندھے تھے۔

انہوں نے سواری کے جانوروں کو بغور دیکھا اور قدرے مکدر ہو کر ہم سے فرمایا کہ "ان بے زبان جانوروں سے یہ برتاؤ کرتے وقت تمہیں اللہ سے ذرا خوف نہ آیا؟ آخر ان کا بھی تم پر حق ہے۔ ان کو آزاد چھوڑ دیا ہوتا تاکہ یہ کھلے میدانوں میں گھوم پھر کر چر چگ لیتے۔"[۱] مہذب اور ترقی یافتہ مغربی ممالک نے اب جانوروں پر بے رحمی کے انسداد کے لئے ادارے قائم کئے ہیں، ان کی تقلید میں پاکستان، بھارت وغیرہ ترقی پذیر ممالک میں بھی ایسی سوسائٹیاں قائم کی گئی ہیں[۲] اس طرح کچھ لوگوں کو روزگار ضرور فراہم ہوا ہے۔ لیکن جانوروں سے بے رحمانہ سلوک میں کوئی کمی نہیں آئی، امیر گھرانوں کے پالتو کتوں اور بلیوں کی اور بات ہے۔ بوڑھے، بیمار، مریل، ازکار رفتہ گھوڑے، گدھے، سڑکوں، گلیوں، محلوں میں بھوکے، پیاسے، لنگڑاتے، گرتے پڑتے مارے مارے پھرتے زندگی کی آخری سانسیں اور ٹانگیں گھسیٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ کام کے اونٹوں، گھوڑوں، بیلوں وغیرہ پر بھی بے رحمی سے چابک اور سونٹے برسائے جاتے ہیں اور انہیں نیم گرسنہ رکھا جاتا ہے۔

ذمیوں کے حقوق

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اہل ذمہ (غیر مسلم رعایا) کا بہت خیال رہتا تھا حتیٰ کہ جب غیر مسلم ابولولو فیروز کے ہاتھوں زخمی ہوئے اور بچنے کی امید نہ رہی تو اپنے جانشین کو یہ تاکیدی وصیت کی کہ ذمیوں سے حسن سلوک سے پیش آئے اور ان کے حقوق ادا کرے۔

خلافت فاروقی میں جو ممالک فتح ہوئے اور وہاں کی آبادیوں نے اپنے مذہب پر قائم رہ کر اطاعت قبول کر لی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے بنیادی حقوق جان و مال، عزت و آبرو اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی اور انہیں مملکت اسلامیہ کے باعزت شہری بنا دیا حالانکہ اس سے پیشتر روم و ایران کی حکومتیں اپنی رعایا سے، خواہ وہ ان کی ہم مذہب اور ہم قومی ہی کیوں نہ ہو، نہایت جابرانہ اور ذلت آمیز سلوک کرتی تھیں۔ رعایا کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہ تھی۔ ان کی جان و مال، عزت و آبرو بھی محفوظ نہ تھے۔ ان کا انتہائی بے دردی سے استحصال کیا جاتا تھا۔ غلاموں اور عام رعایا میں برائے نام فرق تھا۔ رعایا کے کاشتکاروں کو زمینوں پر کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے۔ بڑے بڑے دہقان، مرزبان، جاگیردار کاشتکاروں کو بکاؤ مال سمجھتے تھے۔ جب زمین ایک زمیندار، جاگیردار سے دوسرے کو منتقل ہوتی تھی تو کاشتکار بھی ساتھ ہی منتقل ہو جاتے تھے جیسے وہ زمین منقولہ کا ایک حصہ ہوں۔ ان کی کوئی

---

۱ امام ابن الجوزی

۲ (Society for Prevention of Cruelty tl Animals)

مختصراً (SPCA) سوسائٹی برائے انسداد بے رحمی جانوراں

آواز نہ تھی۔ انہیں زمین کی پیداوار سے پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کو بھی بمشکل میسر آتا تھا۔ پیداوار کا بیشتر حصہ زمیندار لے جاتے تھے۔ خاص کر ایران میں عیسائی اقلیت اور بازنطینی سلطنت میں یہودیوں کی حالت ناگفتہ بہ اور قابل رحم تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ ممالک کی ذمی رعایا کو انسانی حقوق عطا کئے اور ان کی عزت نفس بحال کی۔ مفتوحہ اقوام سے وقتاً فوقتاً جو معاہدے کئے گئے وہ اس پر شاہد ہیں۔ ایلیا (بیت المقدس یا یروشلم) کی فتح کے وقت جو معاہدہ کیا گیا اور جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہ نفس نفیس کیا، اس کا ترجمہ ایلیا کی فتح کے ضمن میں دیا جا چکا ہے۔ اسی قسم کے معاہدے دوسرے مفتوحہ شہروں، علاقوں اور قوموں سے کئے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذمیوں کے جان و مال اور مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ وغیرہ میں کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھا۔

ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر ڈالا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے قاتل کو مقتول کے وارث کے حوالے کر دیا گیا اس نے اسے قصاص میں قتل کر دیا۔ ذمیوں کی زمینیں ان کے قبضے میں رہنے دی گئیں بلکہ اگر وہ پہلے بے اختیار اور حقوق مالکانہ سے محروم کاشتکار اور مزارع تھے تو انہیں مالک بنا دیا گیا۔ یہاں تک احتیاط برتی گئی کہ ان سے زمینیں قیمتاً خریدنا بھی عرب مسلمانوں کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مسلمان ذمیوں کے کھیتوں سے بھی کترا کر گزرتے تھے تاکہ ان کے گھوڑے، اونٹ، خچر کھیتوں سے کچھ چر نہ لیں۔ جب شام کے ایک کاشتکار نے خلیفہ سے شکایت کی کہ اسلامی فوج نے اس کے کھیتوں کو پامال کر دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہرجانہ کے طور پر اسے دس ہزار روپے بیت المال سے دلوائے۔ حکام کو تاکید تھی کہ ذمیوں سے کسی قسم کی زیادتی اور ناانصافی نہ ہونے پائے۔ ایک ذمی تاجر عین اس وقت دوہری چنگی کے مطالبہ کے خلاف شکایت کی جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حرم کعبہ میں منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ انہوں نے خطبہ روک کر شکایت سنی اور فرمایا کہ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر خطبہ جاری رکھا۔ تاجر نے خیال کیا کہ خلیفہ نے سنی ان سنی کر دی۔ مایوس ہو کر جب واپس سرحدی چنگی پر پہنچا تاکہ دوہری چنگی دے کر اپنا مال چھڑا لے، تو معلوم ہوا کہ خلیفہ کا حکم دوہری چنگی کے خلاف پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ اس سے دوہری چنگی وصول نہ کی گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا برتاؤ ذمیوں سے عدل و احسان کا تھا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنے مقالہ "قرآنی تصور مملکت"[1] میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی زمانے میں ایک نسطوری پادری نے اپنے جو تاثرات قلمبند کئے، وہ اتفاق سے محفوظ رہ گئے ہیں، وہ لکھتا ہے:

> "یہ طائی (یعنی عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت دی ہے ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں۔ لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسر پیکار نہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں کو جاگیریں

[1] بحوالہ "قرآنی تصور مملکت" مطبوعہ ماہنامہ، معارف (اعظم گڑھ) دسمبر۔ ۱۹۴۱ء۔ بعد میں مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد، دکن (بھارت) نے اسے مصنف موصوف کے بعض دوسرے اہم مقالات کے ساتھ یکجا کر کے کتابی صورت میں بھی شائع کیا۔ مؤلف

عطا کرتے ہیں۔"

قادری اسمعانی اور مستشرق دخوجے کے حوالے گزشتہ صفحات میں دیئے جا چکے ہیں۔

اور تو اور نور نبوت سے مستنیر خلافت راشدہ کے صدیوں بعد کے دنیا دارانہ دور کے متعلق بھی روسی مستشرق پروفیسر بارتولد لکھتا ہے:

"حروب صلیبیہ کے زمانے میں ایک روسی مؤرخ کلیسا کے مطابق پادری اور عوام سب ہی کی خواہش تھی کہ مسلمانوں کا جوا ان کے کندھوں پر واپس آ جائے بہ نسبت اس کے کہ لاطینیوں کا تسلط برقرار رہے۔"

ذمیوں سے حسن سلوک کی چند روشن مثالیں ملاحظہ ہوں:

یہودی کی زمین واپس کر دی

شام میں مسلمانوں کو مسجد کی تعمیر کے لئے زمین درکار تھی۔ ایک یہودی کے پاس سفید قطعہ زمین تھا لیکن اس نے بیچنے سے انکار کر دیا۔ مسلمانوں نے زبردستی قبضہ کر کے مسجد بنا لی۔ یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ ان کے حکم پر مسجد ڈھا کر زمین یہودی کو واپس کر دی گئی۔ اس پر یہودی نے اپنا مکان بنا لیا۔

ایک لبنانی عیسائی پروفیسر شکری قرواحی نے ۱۹۳۳ء میں لکھا کہ یہ "بیت الیہودی" اب تک موجود ہے۔

ذمی کا روزینہ

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایک بوڑھے ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا۔ وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ میں ضعیف و کمزور ہوں اور روزی کمانے سے معذور۔ لیکن مجھ پر جزیہ عائد کیا گیا ہے۔ میرے پاس ادائیگی کے لئے کچھ نہیں۔ اس لئے بھیک مانگ رہا ہوں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر رقت طاری ہو گئی۔ آیت قرآنی اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاکِیْنَ (صدقات تو فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں) پڑھی اور فرمایا کہ فقرا تو مسلمانوں میں سے ہیں اور مساکین سے مراد غیر مسلم محتاج ہیں اور یہ شخص ان مسکینوں کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ انصاف نہیں کہ ان کی جوانی اور طاقت سے تو ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے اور کمزوری کی حالت میں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں۔ پھر اسے اپنے ساتھ لے گئے، کھانا کھلایا اور کچھ نقد دیا اور آئندہ کے لئے بیت المال سے روزینہ مقرر کر دیا۔

شام کے ذمی

اسی طرح شام کے سفر میں ایک جگہ دیکھا کہ ذمیوں پر سختی کی جا رہی ہے وجہ پوچھنے پر آپ کو بتایا گیا کہ انہوں نے جزیہ ادا نہیں کیا۔ پوچھا، کیوں ادا نہیں کیا؟ ذمیوں نے ناداری کا عذر پیش کیا۔ فرمایا، انہیں چھوڑ دو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ لوگوں کو تکلیف نہ دو۔ جو لوگ دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں، اللہ انہیں قیامت میں عذاب دے گا۔

حمص کے ذمیوں کا جزیہ واپس

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب یرموک میں جمع شدہ رومی افواج کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو حمص خالی کرنا پڑا تو مسلمان سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے اہل شہر سے وصول کردہ جزیہ کی رقم یہ کہہ کر واپس کردی تھی کہ جزیہ حفاظتی ٹیکس ہے۔ اس وقت ہم اہل شہر کی حفاظت کرنے کے قابل نہیں۔ یہودی، عیسائی اہل شہر روتے تھے اور مسلمانوں کی فتح اور واپسی کی دعائیں مانگتے تھے۔ یہی اصول تمام فاروقی فتوحات اور مفتوحین کے معاملے میں کارفرما رہا۔ اگر کوئی ذمی برضا و رغبت فوجی خدمت انجام دیتا تھا تو جزیہ معاف کردیا جاتا تھا۔ اسے مجاہدین کے حقوق حاصل ہوجاتے تھے اور اسے غنیمت میں حصہ ملتا تھا۔ دیوان میں فوجی خدمت انجام دینے والے اور معذور، بے سہارا ذمیوں کے نام بھی تھے۔ حیرہ کے معاہدۂ فتح میں یہ لکھ دیا گیا تھا کہ اگر کوئی بوڑھا ذمی کام کرنے سے معذور ہوجائے یا اس پر کوئی آفت آئے یا دولت مندی کے بعد غریب ہوجائے اور اس کے اہل مذہب اسے خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ معاف کردیا جائے گا اور اسے اور اس کی اولاد کو بیت المال سے خرچ دیا جائے گا۔ غیر مسلم رعایا مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں کم ٹیکس ادا کرتی تھی اور ان کی زمینوں کی مال گزاری کے تعین کے لئے ہر سال ہر صوبے سے وہاں کے ٹیکس گزاروں کے دس دس آدمیوں کا وفد مدینے بلایا جاتا تھا اور ان سے قسم لی جاتی تھی کہ مال گزاری کی وصولی میں ان پر سختی تو نہیں کی گئی۔ مصر کی اراضی کے متعلق مقوقس سے مشورے لئے۔ شام کی فتح کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو آپ نے لکھا کہ ''مسلمانوں کو منع کرنا کہ ذمیوں پر ظلم نہ کرنے پائیں نہ ان کا مال بے وجہ کھائیں اور جس قدر شرطیں تم نے ان سے کی ہیں سب پوری کرو۔''

شام کے شہر عربسوس کے عیسائیوں کو ان کی متواتر بدعہدیوں اور بغاوتوں کی بناء پر جلاوطن کیا گیا تو ان کی املاک کی دگنی قیمت دی گئی۔ ملکی حقوق میں ذمیوں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہ رہا، ذمیوں کو اپنے مقدمے اپنی عدالتوں میں لے جانے کی اجازت تھی۔ تاریخ یہ نشاندہی کرنے سے قاصر ہے کہ کسی دوسرے فاتح نے مفتوح و مغلوب قوم سے ایسا عادلانہ، مشفقانہ اور فیاضانہ سلوک کیا ہو اور اس کی عزت نفس کی حفاظت کی ہو۔ اس کے برعکس آج بھی تہذیب و سیاست و تمدن و قانون کے عروج کی بیسویں صدی میں متعدد مہذب اور ترقی یافتہ ممالک مثلاً سوویت یونین، بھارت، برما، تھائی لینڈ، فلپائن، یوگوسلاویہ، البانیہ، چیکوسلاویہ اور پولینڈ میں مسلمان اقلیتیں اپنے بنیادی انسانی، تہذیبی اور مذہبی حقوق سے محروم ہیں۔

غلامی

روم و ایران کی سلطنتوں اور خود عرب میں بھی ظہور اسلام سے پہلے غلامی کا رواج تھا۔ غلاموں سے نہایت بہیمانہ اور انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کے آقا ان کی زندگی اور موت کے مالک ہوتے تھے۔ اسلام نے غلامی کو کم کرنے کی کوشش کی اور گردنیں چھڑانے کو خدا کی خوشنودی کا باعث قرار دیا۔ غلاموں کو حقوق دیئے اور ان کے مالکوں کو تاکید کی کہ جیسا خود کھائیں پہنیں ویسا ہی انہیں کھلائیں پہنائیں اور ان کی طاقت سے زیادہ

کام نہ لیں۔ اگر غلام مکاتبت کے ذریعے آزادی حاصل کرنا چاہے تو انکار نہ کیا جائے زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مد غلاموں کی رہائی کی بھی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عام اصول بنا دیا کہ عرب غلام نہیں بنائے جا سکتے جو پہلے سے غلام چلے آتے تھے ان سب کی رہائی کا حکم دے دیا۔ جنگی قیدیوں کو بھی عام طور پر رہا کر دیا گیا۔ مصر اور نہاوند کی فتوحات کے سلسلے میں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ جہاں حالات کی مجبوری سے غلامی کا رواج باقی رہا وہاں بھی غلاموں کے حقوق کی نگہداشت اور حسن سلوک کا ایسا انتظام کیا کہ غلام اور آزاد میں برائے نام فرق رہ گیا۔ آپ کا ذاتی غلام عیسائی تھا۔ اس سے مساویانہ سلوک کرتے تھے۔ شام کے سفر میں آپ اور غلام ایک ہی اونٹ پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ جب یروشلم کے قریب پہنچے اور لوگ استقبال کو آئے تو غلام اونٹ پر سوار تھا اور آپ اونٹ کی مہار پکڑے چل رہے تھے۔ ابولولو نے آپ سے دھمکی آمیز اور گستاخانہ گفتگو کی۔ آپ نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ آپ کے نزدیک غلاموں کے تقویٰ اور اہلیت کی یہ قدر تھی کہ کہا کرتے تھے کہ اگر ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کا غلام اسلم رضی اللہ عنہ (ایرانی النسل) زندہ ہوتا تو میں بلا کھٹکے اسے خلافت کے لئے نامزد کر دیتا۔ آپ نے غلاموں سے مذہبی، معاشی، معاشرتی اور فوجی مساوات برتنے کے احکام جاری کیے۔ غلاموں کے وظیفے ان کے مالکوں کے برابر مقرر کیے۔ لشکر مجاہدین میں شامل بعض دفعہ کسی غلام نے دشمن کو امان دے دی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم سے وہ امان تمام مسلمانوں کی طرف سے تسلیم کی گئی۔ ع۔ عبد مسلم کمتر از احرار نیست۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمال کے متعلق یہ بھی دریافت کرتے رہتے کہ غلاموں کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہے۔ اگر معلوم ہو جاتا کہ کوئی عامل غلاموں کی عیادت کو نہیں جاتا تو اس سے باز پرس کرتے اور معزول کر دیتے۔ آپ انسانوں کی آزادی اور شرف و مساوات کا نہایت بلند اور ترقی یافتہ تصور رکھتے تھے۔ اکثر غلاموں کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے اور حاضرین کو سنا کر کہتے کہ ان لوگوں پر اللہ کی لعنت ہو جو غلاموں کے ساتھ کھانا کھانے میں عار سمجھتے ہیں۔

معاشرتی اور معاشی مسئلہ کا حل

یونانی فلسفی افلاطون کے زمانے سے آج تک یورپ اور امریکہ کے فلسفی اور دانشور مثالی حکومت اور مثالی معاشرے کے خواب دیکھتے اور اس کے نقشے بناتے چلے آئے ہیں اور اب تک ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا بلکہ تعبیرات کی کثرت سے پریشان ہو کر رہ گیا ہے۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ یوٹوپیا (مثالی مملکت) کے مصنف ٹامس مور کو تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ افلاطون کی جمہوریت بھی کیے از مکالمات فلاطون کے طور پر باقی ہے جسے ایک ایسے تصور پرست شاعر کا ناقابل عمل خوابگوں منصوبہ ہی کہہ سکتے ہیں جس نے اپنی مزعومہ مثالی مملکت سے شعرا کو دیس نکالا دیدیا۔ انقلاب فرانس کے دانشوروں، روسو، والتیئر وغیرہ نے زبانی جمع خرچ تو بہت کیا مگر نپولین کی آمریت نے ان کے آزادی، اخوت اور مساوات کے خواب کو ایک ہولناک تعبیر میں منتشکل کیا۔ انگلستان میں کسانوں اور غریبوں نے بیرنوں (Barons) اور دوسرے جاگیرداروں کے پنجہ آہنیں سے آزاد ہونے کے لئے تحریک چلائی اور نعرے لگائے کہ "جب آدم ہل چلاتا تھا اور حوا چرخہ کاتتی تھی تو پھر دوسرا کون شریف اور معزز ہو سکتا

ہے؟"[1] لگر حکومت، معاشرے اور معاش پر امیروں اور جاگیرداروں کا اقتدار بدستور قائم رہا۔ کارل مارکس نے اشتراکیت کی انجیل "سرمایہ" (داس کیپتال) بڑے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ پیش کی اور دنیا بھر کے مزدوروں کو پرولتاری جنت ارضی کے خواب دکھائے۔ لیکن جب روس نے مارکس کی تعلیم پر ایمان لاکر اسے عملی جامہ پہنایا تو کسان مزدور اور نچلے طبقے پہلے سے بھی بدتر اور مہیب تر دوزخ میں گر گئے اور جو تھوڑے بہت انسانی حقوق انہیں حاصل تھے ان سے بھی محروم کر دیئے گئے۔ انہیں مشینوں، گھوڑوں، گدھوں کی سطح پر گرا دیا گیا۔ وہ کسی دنیاوی جائیداد کے مالک تو کیا اپنی روح اور ضمیر کے مالک بھی نہ رہے۔ اسی طرح جرمنی کے جبار ہٹلر اور اٹلی کے آمر مطلق مسولینی نے بھی اپنے ہاں عوام کو بہت سبز باغ دکھائے لیکن اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد انہوں نے بھی انسانوں کو ڈھور ڈنگر سمجھ لیا، ان کی سوچوں پر پہرے بٹھا دیئے، ان کے ضمیروں، جانوں، مالوں کو اپنی متاع متصرفہ کے طور پر استعمال کیا۔ کسی کو ان کے جبر کے سامنے دم مارنے کا یارانہ رہا، پھر ان آمروں نے دوسرے اقوام وممالک پر بھی اپنی آمریت کو مسلط کرنا چاہا۔ نتیجہ دوسری عالمی جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہٹلر، مسولینی، سٹالن اور ان کے ساتھیوں نے مذہب، اخلاق انسانیت، تہذیب اور شرافت کے اصولوں کو تلانجلی دیدی مسلح فوجوں کے علاوہ نہتے اور پر امن شہریوں کو لاکھوں کی تعداد میں آتش وآہن کا نشانہ بنایا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، بھی ان کی ہلاکت آفرینیوں سے نہ بچ سکے۔ کروڑوں انسان موت کی تاریک وادیوں میں دھکیل دیئے گئے، جو بچ رہے وہ مردوں سے بدتر ہو گئے۔ آبادیاں اور کھیت تباہ ہو گئے۔ بے شمار بندگان خدا فاقوں سے اور قیدی کیمپوں، گیس چیمبروں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر سخت اذیت سے مر گئے جن کا نہ کہیں جنازہ اٹھا نہ کہیں مزار بنا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے ہنستے بستے شہر جمہوریت نواز امریکیوں کے جوہری بموں سے صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے گئے۔ لاکھوں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے جن کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ بے شمار جسمانی طور پر اپاہج اور مسخ ہو کر رہ گئے۔ یہ تھا مغربی جمہوریت اور اشتراکیت کا کارنامہ...... چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر کروڑوں انسانوں کی ہلاکت، شہروں، قریوں اور کھیتوں کی تباہی کے باوجود اصل مسئلہ وہیں کا وہیں رہا یعنی عدل ومساوات، روٹی کپڑے، مکان، ضمیر، مذہب، انسان کے جینے کا حق اور انسانیت کی بنیادی اقدار کی بحالی اور تحفظ کا مسئلہ جو سپر پاوروں کی اپنی اپنی اغراض کے سیلاب میں ڈوب کر رہ گیا۔ اشتراکیت نواز روس اور سرمایہ پرست امریکہ میں دنیا کے زیادہ سے زیادہ ملکوں کو اپنے زیر اثر واقتدار لانے اور اپنا حاشیہ بردار بنانے کی بے حد خطرناک دوڑ جاری ہے۔ دنیا ایک تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ایٹمی جنگ کا آتش فشاں کسی وقت بھی پھٹ کر ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ امن دو جنگوں کے درمیان عارضی وقفہ بن کر رہ گیا ہے۔ سپر پاورز امن کی باتیں کرتی اور جنگ کی گھاتیں لگاتی ہیں۔ اربوں ڈالر اور روبل اسلحہ سازی پر خرچ کئے جا رہے ہیں جبکہ دنیا کے کروڑوں عوام کو پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا نصیب نہیں۔

یہ ثمرہ ہے لادینی سیاست اور معاشرے کا۔ انسان نے خدا، مذہب، اعلیٰ اخلاقی اصولوں اور روحانی اقدار

---

[1] کسانوں کی بغاوت میں ان کا یہ عام نعرہ تھا:

(When Adam delved and Eve span Who was there a gentleman?)

سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے۔ جب کشتی بے لنگر و بے بادباں ہو جائے تو ہواؤں کا رخ اور موجوں کے تھپیڑے جدھر بھی چاہیں اسے لے جا سکتے بلکہ سمندر کی تہ میں بھی بھیج سکتے ہیں۔

مغربی ممالک میں فلاحی مملکت کا بہت غلغلہ ہے بلکہ فلاحی مملکت سے بھی آگے بڑھ کر قدم رکھنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ ان سب کی اساس شکم پر ہے۔ نام نہاد فلاحی مملکتوں میں اعلیٰ روحانی اقدار سے بیگانگی کی وجہ سے اخلاقی اور معاشرتی بے راہ روی عام ہو گئی ہے۔ جسم کی فلاح کی کوشش نے روح کو تباہ کر دیا ہے۔ چاند ستاروں پر اپنے اپنے فوجی اڈے قائم کر کے ''سٹار وارز'' کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ کوئی پوچھے

تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی؟

عام انسانوں کی عظیم اکثریت آج بھی فکرِ معاش میں سرگرداں ہے۔ معاشرہ درہم برہم ہو رہا ہے۔ ہر قسم کے جرائم کی فراوانی ہے۔ یہ نتیجہ ہے علم کے جسم پر اطلاق کا کہ وہ انسانی زندگی کے لئے ایک اژدہا بن کر اسے نگل جانے کو ہے۔ مغربی معاشرہ اور تہذیب اپنے خنجر سے خودکشی کرنے کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اگر تیسری عالمی جنگ کی ہلاکت خیزیوں سے کچھ لوگ بچ رہے ہیں تو وہ قبل تاریخ کی معاشرت کی طرف لوٹ جائیں گے۔

دراصل انسانی ذہن خواہ وہ ایک انسان کا ہو یا بہت سے انسانوں کا اور خواہ وہ کتنے ہی بڑے نابغے ہوں، ایک ایسا دائمی نظام وضع کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا جو تمام انسانوں، تمام زمانوں اور تمام ملکوں کے لئے یکساں سازگار، خوش آئند اور مفید ہو۔ انسانی منصوبے چند سالوں یا چند عشروں سے زائد عرصے تک کامیابی سے نہیں چل سکتے۔ ان میں اصلاح و ترمیم، تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اور دوسرے ملکوں کے پنجسالہ ترقیاتی منصوبوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ پانچ سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی ان میں ردوبدل کی ضرورت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمارا منہ چڑانے لگتی ہے۔ مستقل بنیادوں پر منصوبہ سازی، خواہ وہ نظام حکومت کی ہو یا معاش و معاشرت کی، کے لئے تائید ایزدی اور وحی خداوندی کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ انسان کا خالق ہی اس کی فطرت کے تقاضوں کے لحاظ سے اس کی ضروریات کی صحیح تکمیل و تسکین کے لئے دائمی اقدار اور قواعد مقرر کر سکتا ہے۔ فانی انسان کے منصوبے بھی فانی ہوتے ہیں اور خدائے حی و قیوم کے منصوبے بھی زندہ و پائندہ[1] انسانی دماغوں کی ساختہ پرداختہ جمہوریت، اشتراکیت، اشتمالیت، نازیت، فضویت یا کوئی

[1] راقم پر یہ حقیقت حج کے موقع پر خوب واضح ہوئی، ہر مسلمان جانتا ہے کہ فریضہ حج کی تکمیل میدان عرفات میں حاضری سے ہوتی ہے خواہ صبح سے شام تک ہو یا چند گھنٹوں یا چند منٹوں کے لئے۔ مکہ میں عرفات ہی وہ جگہ ہے جہاں لاکھوں حاجی بیک وقت جمع ہو سکتے ہیں۔ گزشتہ چودہ سو سال سے جمع ہوتے آئے ہیں اور جانے کتنے ہزاروں، لاکھوں سال تک ہوتے رہیں گے۔ مکہ میں ایسی کوئی دوسری جگہ نہیں جہاں حاجیوں کی سال بسال بڑھتی ہوئی تعداد بیک وقت جمع ہو سکے۔ نہ حرم کعبہ میں، نہ منیٰ میں نہ کہیں اور۔ آج سے چودہ صدیاں پیشتر کسی بڑے سے بڑے نابغہ انسان کا دماغ یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ حج کی تکمیل کے لئے موزوں ترین جگہ عرفات کا میدان ہے جو بیت اللہ شریف سے کئی میل دور واقع ہے اور جہاں قیام قیامت سے پہلے تک لاکھوں، کروڑوں حاجی بیک وقت سما سکتے ہیں۔ انسانی دماغ تو قدرتاً یہ سوچتا ہے کہ حج کی تکمیل حرم کعبہ میں ہونی چاہئے اور یہ سوچ کر یہ منصوبہ آج سے بہت پہلے ناکام ہو گیا ہوتا کیونکہ حرمِ کعبہ میں انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کا سمانا ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ خدائے لم یزل کا ابدی اور غیر متبدل منصوبہ ہے۔ اکیلا یہ منصوبہ ہی اسلام کی حقانیت اور اس کے خدائی مذہب ہونے کے ثبوت کے طور پر کافی ہے۔

اورائیت (ازم) انسان کا بیڑا پار نہیں لگا سکتی۔ انسان محض شکم ہی نہیں۔ مغربی دانشور اور مفکرین اپنے خود ساختہ سیاسی اور معاشی نظاموں سے مایوس ہو چکے ہیں۔ دراصل مغربی جمہوریت اور روسی وچینی اشتراکیت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ جمہوریت میں بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا۔ اشتراکیت میں نہ گنتے ہیں نہ تولتے ہیں بس ہانکتے ہیں۔ دھونس، دھاندلی، جوڑ توڑ اور سازش سے جس ہاتھ میں اقتدار کا جام آ جاتا ہے اسی کے لئے بادۂ جان فزا ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا کی بہترین اسی اسی کاروں اور قیصر وکسریٰ کے قصر ہائے شاہی سے بھی زیادہ عالی شان محلوں کا مالک بن جاتا ہے۔[1] ایک ایسا آمر مطلق جس کے اختیارات کی کوئی انتہا نہیں۔ اشتراکیت دنیا کے مزدوروں کو ایک ہو جانے کی پرفریب دعوت دے کران کی زنجیروں کے حلقے اور کس دیتی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ''مسلمان'' ادیب اور دانشور لینن اور سٹالن جیسے سنگدل اور چنگیز و ہلاکو سے بڑھ کر خونریز اشخاص کو ''عظیم باپ''، ''مقدس'' اور ''نیک ترین انسان'' لکھتے ہیں اور پھر حج بھی کر آتے ہیں۔ آگے کیا لکھوں۔ خدا قبول کرے۔

دراصل نشۂ اقتدار ہے ہی ایسی شے کہ انسان بہک جاتا ہے۔

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک!

مغرب کے جمہوری نظام کے ساز کہن میں بھی نوائے قیصری کے سوا کچھ نہیں۔

اگر تاج کئی جمہور پوشد ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
ہوس اندر دل آدم نمیرد ہماں آتش میان مرزغن ہست
عروسِ اقتدارِ سحر فن را ہماں پیچاکِ زلف پرشکن ہست
نماند نازِ شیریں بے خریدار اگر خسرو نباشد کوہکن ہست''

---

[1] سوویت یونین کے ایک سربراہ آنجہانی لیونڈ بریژنیف کے پاس اسی بیش قیمت کاریں تھیں جو مختلف ممالک کے سربراہوں نے اسے سرکاری دوروں کے مواقع پر پیش کیں۔ یہ کاریں مملکت کا مالک ہونی چاہئیں تھیں۔ لیکن بریژنیف صاحب نے انہیں اپنی ذاتی ملکیت بنا لیا۔ انہی صاحب کے متعلق ''مسیح اور کارل مارکس کے بغیر'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ جب بریژنیف نے ماسکو کے باہر ایک عالی شان اور خوبصورت محل اپنے لئے بنوایا تو دنیا کے مختلف ممالک سے بہترین سروسامان حاصل کر کے اسے آراستہ کیا۔ پھر اپنے آبائی گاؤں سے اپنی بوڑھی ماں کو بلوایا اور اسے اپنے محل کی سیر کرائی۔ اس کے بعد جب ماں بیٹا کھانا کھانے بیٹھے تو بریژنیف نے کہا

''اماں کیا خیال ہے؟ کیا یہ محل آپ کے بیٹے کے لئے ٹھیک ہے؟''

ماں نے جواب دیا۔

''ہاں بیٹا! یہ محل بہت شاندار، خوبصورت اور آراستہ ہے لیکن میں سوچتی ہوں کہ اگر یہاں کمونسٹ آ گئے تو کیا ہوگا؟''

مشہور نوبل انعام یافتہ روسی ادیب لوژے تسنین (جسے آزاد خیالی کی وجہ سے روس سے نکال دیا گیا) نے روسی رہنماؤں کے نام ایک طویل خط میں روس کے صاحب اقتدار لیڈروں کے فکر وعمل کے تضاد اور عیش کوشی اور عوام کی حالت زار کی خوب قلعی کھولی ہے۔ ان غریبوں کے نام نہاد بہی خواہوں اور روسی پرولتاریت کے سربراہوں کی زندگی کا خلفائے راشدین تو کیا ان کے فوراً بعد آنے والوں کی زندگیوں ہی سے مقابلہ ومواز نہ کر دیکھئے۔ اسلامی نظام کی برتری واضح ہو جائے گی۔ مؤلف

''عالم''نو کے مصنف لارڈ اسنل نے اس خرابی کی وجہ یہ بتائی ہے:

''حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو نوع انسان کا خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوشمند نہیں ہوتے۔''

اسنل کی بات سو فی صد تو درست نہیں کیونکہ انسانوں اور ان کے فکر و خیال، عقل و فہم اور کردار و عمل میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے لیکن ان کے فکر و کردار مبرا عن الخطا نہیں ہوتے نہ ان میں کوئی دوامی خصوصیت ہوتی ہے نشہ قوت اپنی جگہ، ان میں سے بہت سے خیر خواہ خلق ہو کر بھی غلطیاں کرتے ہیں جن کا خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑتا ہے اور لطف یہ کہ یہ سب کچھ کیا بھی عوام کے نام پر جاتا ہے۔

اس کا علاج اسلام نے یہ تجویز کیا ہے کہ عوام کو طاقت کا سر چشمہ سمجھنے کی بجائے خالق کائنات کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کیا جائے۔ ان الحکم الا اللہ (حاکمیت صرف اللہ کی ہے) کو مان کر انسان اس کے نائب اور خلیفہ کی حیثیت سے اسی کے دیئے ہوئے بنیادی قوانین کے فریم ورک کے اندر رہ کر حکومت کا کاروبار چلائے۔ قانون سازِ حقیقی خدا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا جس نے زمین کو بنایا اور اس پر انسان کو آباد کیا۔ جس طرح انسان اپنی مصنوعات کے اصول کا روضع کرتا ہے اور اگر ان اصولوں کے خلاف ان مصنوعات سے کام لینے اور انہیں چلانے کی کوشش کی جائے تو وہ ٹوٹ پھوٹ جائیں گی اور کام نہیں کریں گی بلکہ بعض دفعہ خود انسان کے لئے نقصان اور خطرہ جان کا باعث بھی بن سکتی ہیں۔ اسی طرح اپنے خالق کے قوانین کی خلاف ورزی کر کے انسان فلاح پانے کی توقع نہیں کر سکتا۔ جسمانی صحت کے لئے بھی اصولوں پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح انسانی معاشرہ کی صحت و درستی کا دارومدار قوانین خداوندی کی پیروی میں مضمر ہے۔ خدا نے اپنی آخری کتاب قرآن مجید میں انسان کو وہ ابدی اور غیر متغیر اصول دے دیئے ہیں جن پر عمل کر کے انفرادی اور اجتماعی فلاح حاصل کی جا سکتی ہے اور صالح انسانوں پر مبنی ایک صالح معاشرہ وجود میں لایا جا سکتا ہے۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی خداوندی کی روشنی میں ایک ایسے نظام مملکت و معاشرہ کی بنیاد ڈالی۔ پھر ان کے پہلے دو خلفاء......ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ خاص کر عمر رضی اللہ عنہ...... نے اسے دنیا کے ایک بڑے حصے پر پھیلی ہوئی وسیع و عریض مملکت اسلامیہ میں عملاً نافذ کر کے دکھایا جس میں نے کوئی فغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں،۔ عدل و انصاف پر مبنی ایک صالح معاشرہ وجود میں آیا دنیا میں پہلی بار ایک حقیقی فلاحی ریاست قائم ہوئی۔ جس میں تن کے علاوہ من کی فلاح کا بھی اہتمام کیا گیا۔ ہر کہ و مہ کی بنیادی ضروریات روٹی کپڑے اور مکان کی تکمیل کی ضمانت دی گئی۔

خلیفہ اور ایک عام انسان کے حقوق و فرائض میں کوئی فرق نہ رہا بلکہ عوام مطمئن ہو کر سوتے تھے اور خلیفہ اپنے فرائض حکومت کو صحیح طور پر سرانجام دینے کے لئے احساس کے بوجھ تلے دبا ہوا راتوں کو بھی جاگتا اور گشت کر کے لوگوں کے حالات اور ضروریات معلوم کرتا اور ان کی تکالیف کا تدارک کرتا تھا۔ امیر، غریب، مسلم، ذمی سب کے

لئے یکساں انصاف کا انتظام کیا کیونکہ اسلامی نظام کی بنیاد ہی عدل و مساوات پر ہے۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، ہر قسم کا عدل و مساوات۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں زندہ رہ گیا تو ایک چرواہے کو بھی اس سے پہلے کہ اس کا چہرہ اپنے مقررہ عطیے کے نہ ملنے سے سرخ ہو جائے اس کا حق بیت المال سے مل جایا کرے گا اور سب سے نیچے درجے والے کو سب سے بڑے درجے والے سے ملا دوں گا۔

یہ احساسِ ذمہ داری صحیح اور فلاحی حکمرانی کی روح ہے۔ خواہ اس کا ظاہری ڈھانچہ آج کل کی اصطلاح میں صدارتی ہو یا پارلیمانی یا کچھ اور۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ اپنے بندوں کو اگر ہم نے زمین پر حکومت عطا کی تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے (سورہ حج آیت ۴۱) یعنی ایک صالح اور خوشحال معاشرہ وجود میں لانے کی سعی کریں گے۔ ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ ''اچھی حکومت اسے کہنا چاہئے جس میں تمام افراد کی حفاظت ہو، کسی کو کسی سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ ہو، باہمی معاملات میں خوشگواری ہو اور افراد کے فیصلے عدل کی رو سے کئے جا سکیں۔''

اسلام کی مثالی مملکت جو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں اپنی پوری برکتوں کے ساتھ نقطۂ عروج پر پہنچی، اس سے بھی آگے جاتی اور لوگوں کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا ذمہ لیتی اور انہیں ترقی و خوشحالی کے یکساں مواقع فراہم کرتی ہے۔ آزاد اور غلام، عرب اور غیر عرب، امیر اور غریب میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی۔ چشم فلک نے یہ پہلی دفعہ دیکھا کہ ایک وسیع و عریض مملکت کا ہر فرد حکومت کا وظیفہ خوار ہے اور حکومت اس کی ضروریات اور فلاح و بہبود کی ذمہ دار ہے۔ بچہ کے یوم پیدائش سے اس کا روزینہ مقرر ہو جاتا ہے اور عمر کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ لاوارث بچوں کے بھی سو سو درہم وظیفے مقرر ہوئے جوان کے ولی یا سرپرست وصول کر کے جمع رکھتے تھے۔ ایسے بچوں کی دودھ پلائی اور غذا کے لئے بیت المال سے الگ رقم ملتی تھی۔ جب لاوارث بچے بڑے ہو جاتے تو عام مسلمانوں کے بچوں کی طرح ان کے وظائف میں بھی اضافہ ہو جاتا۔

لاوارث بچوں کے لئے یہ انتظام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک ایسی فلاحی جدت اور روشن کارنامہ ہے کہ زمانہ حال کی ''متمدن، مہذب اور ترقی یافتہ'' حکومتیں بھی اس معیار تک پہنچنے سے قاصر رہی ہیں۔ اب بعض ممالک میں لاوارث بچوں کے لئے ایس او ایس گاؤں (S.O.S. Village) قائم کئے جا رہے ہیں جن کا آغاز ایک شخص نے نجی طور پر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وقتاً فوقتاً خود جا کر لاوارث بچوں کو دیکھتے اور اپنا اطمینان کرتے تھے کہ ان کی دیکھ بھال ٹھیک طور پر کی جا رہی ہے اور ان کے وظائف کا حساب رکھا جا رہا ہے۔ زکوٰۃ، جزیہ، خراج، عشر و عشور وصول کر کے اجتماعی ملی ضروریات پر خرچ کرنے کے علاوہ مستحقین میں تقسیم کئے جاتے۔ حاجت مندی اور تنگ دستی کے انفرادی کیس جب خلیفہ کے نوٹس میں آتے تو بے چین ہو جاتے اور کسی ماتحت کے سپرد کرنے کی بجائے بذات خود ان کی حاجت روائی کرتے۔ اگر کوئی حاجت مند آپ کو راہ چلتے روک لیتا یا روک لیتی تو اس کی بات توجہ سے سنتے اور جب تک اس کی حاجت برآری نہ کر دیتے وہاں سے آگے نہ بڑھتے۔ اسلامی حکومت کا سربراہ خلیفہ وہی کچھ کھاتا پیتا تھا جو عوام کو میسر آتا تھا۔ عمال کو تاکید تھی کہ عوام کے ساتھ گہرا رابطہ رکھیں ان کے حالات و ضروریات سے

نہ صرف باخبر رہیں بلکہ پوری بھی کریں۔اس بات کا سخت اہتمام تھا کہ مملکت میں کوئی شخص، مسلمان ہو یا ذمی، بھوکا ننگا نہ رہنے پائے۔[1]

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیواؤں اور یتیموں کا خاص خیال رکھتے تھے اور ان کی ضروریات اپنے ہاتھوں سے پوری کرتے تھے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک حد تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی ایسا ہوتا رہا۔لیکن یہ آج سے چودہ سو سال پہلے کے اس دور کی باتیں ہیں جسے بدقسمتی سے ہم مسلمانوں ہی کے بعض بزعم خویش مہذب اور ترقی یافتہ حضرات پسماندگی کا دور خیال کرتے ہیں اور اس کے احیاء کی باتیں کرنے والوں کو تنگ نظر، جاہل، قدامت پرست اور ابلہانِ مسجد کہتے ہیں۔ذرا زمانہ حال کے ایک مسلمان ملک کی حکومت اور علما کی روشن خیالی کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے جو ۳۰ نومبر ۱۹۸۴ء کے روزنامہ جسارت (کراچی) میں ایک مراکشی خاتون نادیہ یاسین نے بیان کیا ہے:

مراکش کا ایک ٹیلیوژن پروگرام خصوصی طور پر عورتوں کے لئے دکھایا جاتا تھا۔اس میں علماء کا ایک بورڈ خواتین کے سوالات کا جواب دیتا تھا۔ایک دفعہ میں یہ پروگرام سن رہی تھی کہ ایک عورت نے علماء کے بورڈ سے پوچھا کہ میرا خاوند مر گیا ہے۔میرے چھ بچے ہیں لیکن میرا کوئی ذریعہ روزگار نہیں ہے کیا میں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے اپنا جسم فروخت کر سکتی ہوں؟

بورڈ کے ایک عالم نے کہا: اضطراب کے عالم میں تمہارے لئے یہ جائز ہے۔امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا۔استغفر اللہ! مراکشی حکومت اولمپکس کی دوڑ میں اول آنے والی ایک مراکشی عورت پر تو انعام واکرام کی بارش کر سکتی ہے مگر ایک بے سہارا بیوہ کو جسم فروخت کر کے پیٹ پالنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔کیا یہ بیوہ اور اس کے یتیم بچے عہد فاروقی میں بے یارو مددگار رہ سکتے تھے؟ مولف

قرضِ حسنہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال کا ایک شعبہ رعایا کے افراد کو غیر پیدا آور (Non Productive) ضروریات کے لئے قرضِ حسنہ دینے کے لئے مختص کر دیا تھا۔ایسے مقروضوں کو صرف اصل رقم واپس کرنا ہوتی تھی۔البتہ اگر کوئی تاجر قرض لے کر کاروبار کرتا تو اس سے نفع کا نصف وصول کیا جاتا۔خسارے کی صورت میں اسے صرف اصل کی واپسی کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔اس طرح مضاربہ و مشارکہ کی راہ کھلی جسے صدیوں کے بعد اب پھر پاکستان میں زندہ کیا جا رہا ہے۔

غرضیکہ فوجیوں، شہریوں، غلاموں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں کے روزینے اور تنخواہیں مقرر کرنے، قرض حسنہ دینے، مالِ غنیمت اور زکوٰۃ و صدقات کو منصفانہ طریقے سے مستحقین میں تقسیم کرنے اور کاروانی راستوں پر سرکاری پراویژن سٹور کھلوانے نیز جگہ جگہ مہمان خانے قائم کرنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رعایا کا معاشی مسئلہ حل کر دیا۔

---

[1] مملکت اور شہری، مصنفہ جے۔ڈی میوٹ

(The State and the Citizens by J.D.Mabiut)

ایک دفعہ منبر پر فرمایا کہ "میں نے ہر شخص کے لئے دو مد گیہوں اور دو قسط سرکہ مقرر کیا ہے۔" ایک شخص نے پوچھا کیا غلام کے لئے بھی؟ فرمایا، ہاں غلام کے لئے بھی۔ لیکن وہ یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ ہٹے کٹے مفت خوروں کی قوم پیدا کریں۔ سخت تاکید تھی کہ ہر شخص کام کرے۔

کسی شخص کو خوشحال دیکھتے تو پوچھتے کہ یہ کوئی پیشہ بھی کرتا ہے یا نہیں؟ اگر لوگ کہتے کہ نہیں، تو فرماتے کہ یہ شخص میری نظروں سے گر گیا۔ کہا کرتے کہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے ذلیل پیشہ بھی بہتر ہے۔

مختصراً یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک فعال، خوشحال، مطمئن آزاد اور خوش اخلاق معاشرہ پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کی جس کی بنیاد خوف خدا، تقویٰ، مساوات اور اخوت پر تھی، جس میں سب کے حقوق یکساں تھے۔ کوئی کسی کا استحصال نہیں کر سکتا تھا۔ آپ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ معاشرہ کے کچھ لوگ تو خوشحال و مرفہ الحال ہوں لیکن باقی قوم غربت و نکبت کا شکار ہو اور بھوکی مرے۔ چند لوگ تو ہر طرح کے آرام و راحت کی زندگی گزاریں اور ملت کی اکثریت تنگ دستی و بے سروسامانی کی حالت میں اپنے شب و روز بسر کرے۔ آپ کے نزدیک خلیفہ صوبوں کے گورنر اور سالاران افواج بھی عام رعایا جیسے افراد تھے اور ان پر بھی قانون کا اطلاق اسی طرح ہوتا تھا جس طرح باقی لوگوں پر۔ مسلم معاشرے کے افراد کی حیثیت سے انہیں کوئی خصوصی مراعات حاصل نہ تھیں بلکہ وہ ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

کے مصداق تھے، ہر وقت محاسبہ کی زد میں، کرپشن اور سفارش کا تصور ہی ناپید تھا لوگ مجمع عام میں خلیفہ اور ان کے عمال حکومت پر اعتراض کر کے جواب طلبی کر سکتے تھے۔ لوگوں کو تنقید اور اظہار رائے کی پوری آزادی تھی۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر ہم تمہارے جائز اعتراضات کو سن کر اپنی اصلاح نہ کریں تو ہم کسی کام کے نہیں۔ آپ لوگوں کو بار بار یاد دلاتے رہتے کہ آپ کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور لوگوں کو آپ سے کیا توقعات رکھنی چاہئیں جو پوری نہ ہوں تو آپ پر گرفت کریں۔ اپنے حق کی بات کرتے ہوئے کہتے کہ مجھے کھانے پہننے کے لئے بیت المال سے صرف اسی قدر لینے کا حق ہے جس میں ایک عام شخص کی گزر اوقات ہو سکے۔ آپ نے ایک صحت مند، خوشحال اور مطمئن معاشرہ پیدا کرنے کے لئے شبانہ روز کامیاب کوشش کی۔ آپ کی مساعی سے دنیا میں حقیقی جمہوری اور فلاحی مملکت پہلی دفعہ وجود میں آئی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین "الفتنۃ الکبریٰ" میں لکھتے ہیں:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ سوشلسٹ تحریک کے علمبردار تھے نہ کمیونسٹ تحریک کے لیڈر۔ انہوں نے سرمایہ داری اور دولت مندی کی اجازت دی جس طرح قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے۔ مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ سماجی انصاف ملکیت کو باطل اور سرمایہ داری کو حرام کئے بغیر بھی قائم کیا جا سکتا ہے جس کے لئے آج بعض جمہوریتیں کوشاں ہیں اور چاہتی ہیں کہ مالکوں کی ملکیت اور دولت مندوں کی سرمایہ داری کے باوجود سماجی انصاف عملی طور پر پیش کر دیں۔"[1]

---

[1] اردو ترجمہ "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تاریخ اور سیاست کی روشنی میں" ص ۱۳۵ از عبدالحمید نعمانی

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے آخری ایام میں فرمایا کرتے تھے کہ ''جو کچھ میں نے آخر میں کیا وہ پہلے کرتا تو دولت مندوں سے ان کی بیکار پڑی ہوئی دولت لے لیتا اور محتاجوں میں بانٹ دیتا۔'' بہرحال انہوں نے اس سلسلے میں چند بڑے قدم اٹھائے اور لوگوں نے ان کی برکات بھی مشاہدہ کیں جو بیسویں صدی کی ''خادم عوام'' حکومتوں کے لئے عدل و مساوات پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کے لئے آج بھی چراغ راہ ہیں۔

ایک مغربی مصنف کے بقول ایک مثالی حکومت مملکت کے باشندوں کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حکومت نہ صرف اس لحاظ سے مثالی تھی کہ افراد ملت کی مادی ضروریات زندگی کی فراہمی کی ذمہ دار تھی، ان کی معاش اور معیشت کا ہر طرح خیال رکھتی تھی بلکہ ان کی روحانی، اخلاقی اور معاشرتی ضروریات سے بھی غافل نہ تھی۔ اسلام کا بنیادی مقصد ایک صالح معاشرے کا قیام ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اچھے اور مبنی بر عدل و مساوات معاشرے کے قیام کے لئے بھرپور کوشش کی۔

عدل و مساوات

ایک مثالی معاشرے کی روح عدل و مساوات ہوتے ہیں۔ نوع انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی فرمانروا اپنے ہم مذہبوں اور دوسروں سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی سی رواداری، انسانیت نوازی، عدل اور مساوات کا ثبوت نہیں دے سکا۔ کسی مملکت کے نظم و نسق کی خوبی کا صحیح معیار یہ نہیں کہ انتظامیہ کو عوام پر جابرانہ کنٹرول حاصل ہو، حکمران طبقہ من مانی کرتا رہے اور مملکت میں قبرستان کا سا امن اور خاموشی رہے۔ وہ زبانیں کھولیں تو حکمران کے قصیدے پڑھنے اور زندہ باد کے نعرے لگانے کے لئے۔ ان کے ہاتھ پاؤں حرکت میں آئیں تو اس کا استقبال کرنے اور اس کی گزرگاہ پر دو رویہ صفیں باندھ کر ہاتھ اور جھنڈیاں ہلا ہلا کر اور پھول نچھاور کر کے سلام کرنے اور جان و مال کی دعائیں دینے کے لئے۔ آمروں اور جابروں کا یہی انداز حکومت رہا ہے۔ ان کے نزدیک رعایا کے افراد انسان نہیں ہوتے جن سے انسانی شفقت، عدل اور مساوات کا سلوک کیا جائے۔ بدقسمتی سے آج کی بزعم خویش مہذب اور ترقی یافتہ اقوام جو اپنے آپ کو پسماندہ اقوام کا لیڈر سمجھتی ہیں، کا طرز عمل بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ظاہری شکل و صورت میں البتہ کچھ فرق آ گیا ہے۔ کمزور اور پسماندہ اقوام کا استحصال بدستور جاری ہے۔ بلکہ پہلے سے شدید تر ہو گیا ہے۔ کمیونسٹ روس ہو یا سرمایہ دار امریکہ، راہیں جدا جدا سہی لیکن ان کی منزل ایک ہی ہے، کمزور اقوام کا استحصال اور ان کے مادی وسائل کی اجارہ داری۔

اس کے برعکس اسلام نے مظلوم انسانیت کو آزادی، عدل اور مساوات کا عملی سبق دیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء نے قرآن کے سیاسی، معاشی، سماجی اصولوں پر عمل کر کے اہل عالم کے سامنے ایک روشن اور قابل تقلید نمونہ پیش کیا یعنی حکومت الٰہیہ کا نمونہ جو عہد فاروقی میں اپنی ترقی یافتہ صورت میں ظاہر ہوا۔

عہد فاروقی کے انتظامی ڈھانچہ کی اصل روح رعایا کے ساتھ عدل و مساوات برتنے اس کی فلاح و بہبود کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے اور شرف انسانی کو بحال کرنے میں مضمر تھی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ایوان عدالت میں ا

وغریب، ادنیٰ واعلیٰ، اپنے، پرائے، مسلم اور ذمی سب برابر تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دنیائے انسانیت کو عدل و انصاف اور مساوات کی سچی برکتوں سے بہرہ ور کیا اور لوگوں کو ان کے صدیوں کے کھوئے ہوئے بنیادی حقوق عطا کئے۔ ان کی عزت نفس بحال کی اور فرمایا کہ انسان ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے اہتمام سے وقتاً فوقتاً مجمعوں میں تقریریں کر کے لوگوں کو یاد دلاتے رہتے تھے کہ وہ قیصر و کسریٰ کی طرح کوئی مطلق العنان حکمران نہیں ہیں۔ بلکہ خدا اور عوام کے سامنے جوابدہ ہیں اور معاشی اور سماجی حقوق میں انہیں دوسروں پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ وہی کچھ کھاتے پہنتے جو دوسروں کو نصیب ہوتا۔ حصول انصاف کے لئے فریق ثانی کے ساتھ خود قاضی کی عدالت میں حاضر ہوتے اور اپنے اور فریق ثانی کے درمیان کسی امتیاز کے روادار نہ تھے۔ قاضی مقدمہ کا فیصلہ آپ کے خلاف کرتا تو اسے خوشدلی سے قبول کرتے۔ عدالت میں حاضر ہونے اور مقدمہ کا فیصلہ اپنے خلاف ہو جانے کو اپنے لئے کسر شان نہیں سمجھتے تھے۔ عمال کو تاکید تھی کہ اپنے اور رعایا کے درمیان کوئی امتیاز پیدا نہ کریں، نہ رعایا پر بیجا سختی کریں، نہ انہیں ماریں پیٹیں کیونکہ اس سے ان کی تذلیل ہوتی ہے۔

عمال لوگوں کی کھالیں ادھیڑنے اور ان پر ظلم کرنے کے لئے نہیں تھے بلکہ دین کے نظام اور اس کے بلند مقاصد سے باخبر کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی ترویج و اشاعت کے لئے تھے۔ عمال کو تاکید تھی کہ لوگوں کے حقوق غصب نہ کریں اور نہ اپنے آپ کو رعایا سے الگ تھلگ رکھیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ گورنر کوفہ کے مکان کی ڈیوڑھی کو اس لئے آگ لگوا دی کہ وہ گورنر اور رعایا کے درمیان حائل ہوتی تھی۔ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فسطاط کی جامع مسجد میں منبر بنوایا تا کہ اس پر چڑھ کر خطبہ دیا کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ملی تو انہیں لکھا کہ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تم اوپر بیٹھو اور مسلمان نیچے؟ انہیں یہ پسند نہ تھا کہ کوئی شخص ان کی یا کسی دوسرے کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو یا احتراماً مشایعت کرے۔ فرمایا کرتے کہ اس قسم کی تعظیم متبوع کے لئے فتنہ اور تابع کے لئے ذلت ہے۔ جبلہ بن ایہم شاہ غسان کا واقعہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ اپنے زعم امارت میں اسلامی عدل و مساوات کو برداشت نہ کر سکا اور مرتد ہو کر قسطنطنیہ بھاگ گیا۔

خلیفہ نے اپنے ذاتی کردار اور سیاسی عمل اور نمونے سے عوام میں حریت و آزادی اور عدل و مساوات پسندی کی روح پھونک دی اور اللہ کے سوا انہیں کسی کا خوف نہ رہا۔ لوگ خلیفہ کو برسر منبر اور مجمع عام میں ٹوک دیا کرتے اور ان پر اعتراض کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صبر و تحمل سے جواب دیتے اور اپنی پوزیشن واضح کرتے۔ ایک دفعہ کسی اعتراض کرنے والے کو لوگوں نے روکا تو خلیفہ نے فرمایا کہ اسے کہنے دو اگر یہ لوگ نہ کہیں تو کسی کام کے نہیں اور اگر میں نہ سنوں تو میں کسی کام کا نہیں اور ع۔ یہ سب فیض تھا ایک امی لقب کا صلی اللہ علیہ وسلم

دراصل روٹی، کپڑے اور مکان سے بھی بنیادی طور پر زیادہ اہم آزادی اظہار و عمل عدل اور مساوات ہوتے ہیں۔ روٹی کپڑا وغیرہ ان کی ضمنی پیداوار۔

شہادت

۲۶ ذی الحجہ ۲۳ ہجری

ذی الحجہ ۲۳ ہجری (۶۴۴ء) کے آخری ایام تھے اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کا گیارہواں سال۔ وہ حسب معمول اب کے بھی خود امیر الحج بن کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ فریضہ حج کی ادائیگی کے علاوہ وہاں مختلف صوبوں کے گورنروں اور دوسرے عمالِ حکومت کی کانفرنس بھی منعقد کی۔ ان سے حالات و مسائل پر تبادلہ خیال اور عوام کی شکایات کا ازالہ کیا۔ منیٰ سے واپس ہوئے تو الابطح میں اپنا اونٹ بٹھایا۔ سنگریزے جمع کر کے ایک چبوترہ سا بنایا اور اس پر اپنی چادر ڈال کر چت لیٹ گئے۔ پھر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے فرمایا کہ ''اے اللہ! میری عمر زیادہ ہوگئی، ہڈیاں کمزور ہوگئیں، قوت کم ہوگئی، رعیت پھیل گئی۔ بغیر عاجز ہوئے اور بغیر نشانہ ملامت بنے اب تو مجھے اپنے پاس اٹھا لے۔'' اللہ نے اپنے مخلص، بے نفس اور دیانتدار بندے کی دعا سن لی۔ اس بندے کی جگہ کوئی دنیادار حکمران ہوتا تو طوالت عمر اور طوالت حکومت کی دعا مانگتا۔

خطبہ

حج سے واپسی پر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں بائیس ذی الحجہ کو جمعہ کے دن خطبہ دیا اور فرمایا ''میں نے خواب دیکھا ہے کہ ایک سرخ مرغ نے مجھے دو ٹھونگیں ماریں۔ اس کی تعبیر میں نے یہ سمجھی کہ کوئی عجمی مجھے عنقریب قتل کر دے گا۔ اس طرح اللہ شہادت کو یہاں مدینہ میں میرے پاس ہنکا کر لے آئے گا۔ اے لوگو! تم پر احکام فرض کر دیئے گئے۔ تمہارے لئے قانون حیات مرتب کر دیا گیا اور تمہیں ایک کھلے اور سیدھے راستے پر ڈال دیا گیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ تم لوگوں کو ادھر اُدھر بھٹکا دو۔ اے اللہ! میں تمام شہروں کے حکام پر تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں صرف اس لئے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو دین اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم دیں۔ ان سے عدل و انصاف کے ساتھ پیش آئیں ان میں غنیمت تقسیم کر دیں اور ان کے معاملے میں کوئی مشکل درپیش ہو تو میرے سامنے پیش کریں۔''

یہ ایک ایسے شخص کی الوداعی تقریر تھی جو اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت کے قدموں کی آہٹ سن رہا ہو۔ جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا کہ ''عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مرتدین عرب دوبارہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ لیکن اہل کتاب عرب عیسائیوں اور یہودیوں پر انہیں توجہ کرنے کی مہلت نہ ملی۔ وہ اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے عرب میں موجود رہے۔ عہد فاروقی میں انہیں عرب سے باہر شام و عراق میں آباد کر دیا گیا۔ لیکن روم و ایران کی فتوحات کے نتیجے میں عیسائی اور مجوسی متحاربین غلام بن کر مدینہ پہنچنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ پسند نہ تھا لیکن جہاد سے واپس آنے والے مجاہدین اپنے ساتھ ایسے لونڈی غلام مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں لے آئے اور رفتہ رفتہ ان کی ایک اچھی خاصی جمعیت پیدا ہوگئی۔ ان عجمیوں میں سب سے نمایاں

شخصیت سابق گورنر اہواز ہرمزان کی تھی جو مسلمان ہو کر مدینہ میں مقیم تھا اور ایرانیت کے ناطے سے عجمیوں کا مرجع۔ یہ عجمی غلام آپس میں ملتے جلتے، اپنی سابقہ اور موجودہ حالت کا مقابلہ کرتے، اسلام کے غلبہ اور فتوحات پر کڑھتے اور باہم صلاح مشورہ کرتے۔ چونکہ ان کی غلامی اور ان کے وطنوں کی مغلوبی کا باعث فاروقی فتوحات تھیں، اس لئے ان میں سے اکثر کے دلوں میں فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے خلاف غم وغصہ کے جذبات پائے جاتے تھے۔ ان کا یہ غم وغصہ بالآخر خلیفہ ثانی کی شہادت کا باعث بن گیا۔

ایران کے آخری فیصلہ کن معرکہ نہاوند میں ایک ایرانی الاصل شخص فیروز (جو مدینہ آ کر کنیت کے اضافہ سے ابولؤلؤ فیروز کہلایا) گرفتار ہو کر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی غلامی میں آیا۔ وہ ایک ماہر فنکار اور ہنرمند تھا۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اسے اس شرط پر آزادی سے اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ انہیں اپنی کمائی میں سے دو درہم روزانہ ادا کرے گا۔ لیکن یہ ادائیگی اسے گراں گزرتی تھی۔ اس نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی اور مقررہ رقم کم کرنے کی درخواست کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابولؤلو سے پوچھا:

"مغیرہ تم سے کتنی رقم وصول کرتے ہیں؟"

دو درہم روزانہ

تم کیا کام کرنا جانتے ہو؟

آہنگری، نجاری، نقاشی

تمہارے ان ہنرمندانہ پیشوں کو دیکھتے ہوئے دو درہم روزانہ زیادہ نہیں معلوم ہوتے۔ فیروز جانے کے لئے مڑا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "میں نے سنا ہے کہ تم ہوا چکیاں بھی بناتے ہو۔ میرے لئے بھی ایک چکی بنا دو، میں قیمت ادا کر دوں گا۔"

ابولؤلو نے جواب دیا:

"میں آپ کے لئے ایسی چکی بناؤں گا کہ دنیا دیکھے گی اور مشرق ومغرب میں اس کی شہرت ہوگی۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حاضرین سے فرمایا کہ "اس نوجوان نے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے۔"

یہ گفتگو ۲۵ ذی الحجہ کو منگل کے دن ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اگرچہ ابولؤلو سے وعدہ نہیں کیا لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق اس کے مالک حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روزانہ رقم کم کرنے کی سفارش کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گستاخی اور کھلی دھمکی کے باوجود ابولؤلو کو کچھ نہیں کہا۔ اسلام ارتکاب جرم سے پہلے سزا دینے یا امتناعی کارروائی کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی اصول کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ جانتے ہوئے کہ ابن ملجم ان کے قتل کے درپے ہے اس پر کوئی گرفت نہ کی۔ اگر روم وایران کے قیصر وکسریٰ کے سامنے کوئی غلام یا رعایا کا کوئی فرد یا کوئی معزز درباری بھی ایسا دھمکی آمیز اور گستاخانہ رویہ اختیار کرتا تو گدی سے اس کی زبان کھینچ لی جاتی۔ اس کی

زندہ کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھر دیا جاتا اور اسے دوسروں کے لئے عبرت بنا دیا جاتا بلکہ اس کے اہل خانہ کو بھی نہ بخشا جاتا۔ قدیم مطلق العنان شہنشاہوں کو چھوڑیئے، آج کل کے نام نہاد جمہوریت نواز حکمرانوں کے سامنے بھی کوئی ایسی گستاخی کا مرتکب ہوتو اسے کم سے کم امتناعی نظر بندی کی نذر کر دیا جائے اور اگر کسی آمر مطلق کے سامنے ایسی بات کہے، کسی جلسہ میں ایسی تقریر کرنے یا اخبارات ورسائل میں لکھنے کی جرأت کرے تو اس کا انجام سائبیریا کے کوئلے کی کانوں میں ہوگا۔[1] یا مقدمہ چلائے اور صفائی کا موقع دیئے بغیر کسی جیل کی کال کوٹھڑی یا پاگل خانے میں مرکھپ جائے گا اور اگر مرا نہیں اور کسی وقت جیل سے باہر آ گیا تو مردوں سے بدتر ہوگا۔ جسمانی وذہنی تعذیب سہتے سہتے اندھا، بہرہ، لولا، لنگڑا ہو چکا ہوگا یا اس کے قوائے ذہنی ہمیشہ کے لئے مفلوج ہو چکے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پالتو غنڈوں سے سرراہ حملہ کرا کے یا گھر سے اغوا کر کے قتل کرا دیا جائے اور قاتلوں کا کبھی پتہ نہ چلے۔ یا نام نہاد پولیس مقابلہ میں مارا جائے لیکن عہد فاروقی بلکہ پوری خلافت راشدہ میں اس قسم کے آمرانہ، جابرانہ اور وحشیانہ ہتھکنڈوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابولؤلو کے آخری جملے کو دھمکی تو سمجھا لیکن ارتکاب جرم سے پہلے اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔

۲۶ ذی الحجہ کو منہ اندھیرے حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں نماز فجر کی امامت کے لئے کھڑے ہوئے اور ابھی تکبیر ہی کہی تھی کہ ابولؤلو نمازیوں کی صفوں کو چیرتا ہوا نکلا اور دودھاری خنجر سے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ پر چھ وار کئے۔ ایک ناف کے نیچے پڑا اور آنتیں کٹ گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابولؤلو کا خنجر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے سینے کو نہیں بلکہ کائنات کے سینے کو چیر گیا۔ خلیفہ ثانی کے عین پیچھے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کھڑے تھے۔ آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ آگے کر دیا اور خود زخم کے صدمہ سے فرش مسجد پر گر گئے اور فرمایا کہ ''ایک کتے نے مجھے قتل کر دیا، اسے پکڑو۔'' حضرت ابن عوف نے دو مختصر ترین سورتوں عصر اور کوثر کی تلاوت کے ساتھ لوگوں کو اس حالت میں نماز پڑھائی کہ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے اور نمازی مضطرب اور بدحواس تھے۔

بعض نے خنجر بدست قاتل کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ دائیں بائیں دودھاری خنجر چلاتا نمازیوں کو زخمی کرتا، صفیں چیرتا نکلنے لگا۔ اس نے تیرہ مسلمانوں کو زخمی کیا جن میں سے نو جاں بحق ہو گئے۔ آخر ایک مسلمان نے اپنی موٹی چادر اس پر ڈال دی اور اسے قابو کر لیا۔ یہ دیکھ کر فیروز نے اسی خنجر سے خودکشی کر لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر غشی طاری ہو گئی لوگ انہیں اٹھا کر گھر لائے۔ اس حادثہ فاجعہ کی خبر سارے شہر میں آناً فاناً پھیل گئی۔ اہل مدینہ غمگین

[1] دو درہم ۱۹۴۷ء سے قبل کے سات آنوں (اس وقت روپے کے سولہ آنے ہوتے تھے) کے برابر ہوتے ہیں۔ موجودہ گرانی کے دور میں آج کل کے چھ سات روپوں کے برابر ہوں گے۔ جب کہ ایک غیر ہنر مند مزدور بھی پینتیس چالیس روپے روزانہ کماتا ہے۔ ابولؤلو کا سا ہنر مند تو کہیں زیادہ کماتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی ابولؤلو کم سے کم پانچ چھ درہم روزانہ تو کما ہی لیتا ہوگا۔ غلاموں کو آزادانہ کمانے کی یہ آزادی بھی اسلام ہی نے دی ورنہ روم وایران میں غلاموں کے جان ومال سب کچھ ان کے آقاؤں کی ملکیت ہوتے تھے اور وہ بصد مشکل انہیں پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کو دیتے تھے۔ دیکھا جائے تو ابولؤلو ایک ناشکرا اور کینہ پرور شخص تھا اور غالباً عجمی سازشیوں کا آلہ کار۔ مؤلف

دلوں اور نمناک آنکھوں کے ساتھ کاشانۂ فاروقی کے باہر جمع ہونے لگے۔ سرکردہ صحابہ دریافت حال کے لئے اندر گئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ہوش آیا تو سب سے پہلے پوچھا۔

''کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟''

''جی ہاں''...... حاضرین نے جواب دیا۔

''جس نے نماز چھوڑی وہ مسلمان نہیں''...... زخمی خلیفہ نے مزید فرمایا اور مزید پوچھا ''مجھ پر حملہ کس نے کیا؟''

جب معلوم ہوا کہ حملہ آور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا ایرانی النسل غلام ابولؤلو فیروز تھا تو فرمایا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ میرا قاتل کوئی ایسا شخص نہیں جو اسلام کا دعویدار ہو۔''

پھر فرمایا:

''لوگ چاہا کرتے تھے کہ مدینہ میں کفار (غلاموں، لونڈیوں) کی کثرت ہو، یہ اس کا نتیجہ ہے۔''

طبیب آیا اس نے کھجور کا شیرہ پلایا جو خون رنگ ہو کر ناف کے نیچے کے زخم سے نکل گیا۔ طبیب نے کہا کہ امیر المومنین! اللہ کو یاد کیجئے۔ یعنی موت یقینی ہے جو وصیت وغیرہ کرنا ہو کر لیجئے۔ لوگ رونے لگے تو فرمایا کہ ''ہم پر آنسو نہ بہاؤ، رونے والے یہاں سے چلے جائیں کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں سنا کہ رشتہ داروں کے رونے سے میت کو عذاب ہوتا ہے؟'' فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بستر مرگ پر بھی شعائر دین کی پابندی کا اس قدر خیال تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے ادائے نماز کا پوچھا اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی اطاعت میں لوگوں کو رونے دھونے سے منع کیا۔ نیز جب یہ معلوم ہوا کہ قاتل غیر مسلم عجمی غلام ہے تو اللہ کا شکر ادا کیا کیونکہ اس کے مسلمان ہونے کی صورت میں ملت میں افتراق پیدا ہونے اور کسی پس پردہ سازش کا اندیشہ تھا۔ اگرچہ غیر مسلموں کی سازش کا پھر بھی قوی شبہ رہ جاتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں بھی یہ شبہ گزرا کہ شاید ان کے قاتل کی سازش کی گئی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو ان کے پاس سب سے پہلے پہنچنے والوں میں تھے، کو باہر لوگوں کے پاس بھیجا کہ جا کر معلوم کریں کہ آپ پر حملہ لوگوں کے مشورہ سے تو نہیں کیا گیا۔ پوچھنے پر سب یک زبان ہو کر چلائے کہ معاذ اللہ! ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔ واللہ! ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ آپ کی عمر میں اضافہ کرے۔ غیر مسلموں کی امکانی سازش کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال نہ گیا اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا۔ شاید ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ دار الخلافہ میں خلیفہ کے خلاف بھی عجمی سازش ہو سکتی ہے۔

آخری وصیتیں

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نامور صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آپ کے سرہانے بیٹھے تھے۔ ان سے پوچھا مجھ پر کتنا قرض ہے؟ انہوں نے چھیاسی ہزار درہم بتایا۔ فرمایا، اگر آل عمر کا مال اس کے لئے کافی ہو تو

۱- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبیلہ

اس مال سے ادا کر دینا اور اگر ان کا مال کافی نہ ہو تو بنی عدی سے مانگنا۔ اگر وہ بھی کافی نہ ہو تو قریش سے مانگنا۔ ان کے علاوہ کسی اور کو تکلیف نہ دینا۔[۱]

نیز فرمایا کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ عمر رضی اللہ عنہ سلام عرض کرتا ہے عمر ہی کہنا امیر المومنین نہ کہنا۔ کیونکہ میں آج ان کا امیر نہیں ہوں۔ سلام کے بعد کہنا کہ عمر آپ سے اجازت چاہتا ہے کہ اسے اپنے دونوں صاحبوں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ) کے پہلو مین دفن کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پہنچے تو وہ رو رہی تھیں۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سلام اور پیغام پہنچایا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "اس جگہ کو میں اپنے لئے محفوظ رکھنا چاہتی تھی لیکن آج میں عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے اوپر ترجیح دوں گی۔" حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے واپس آ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجازت دے دی ہے۔ فرمایا "یہی میری سب سے بڑی آرزو تھی۔ اس خوابگاہ سے اہم تر میرے نزدیک کوئی چیز نہ تھی۔

اے میرے بیٹے! جب میں مر جاؤں تو میرا تابوت اٹھا کر عائشہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر لے جانا اور ایک دفعہ پھر اجازت مانگنا کیونکہ ہوسکتا ہے میرے جیتے جی مجھے ہنوز امیر المومنین سمجھ کر شرم ولحاظ سے اجازت دے دی ہو اگر وہ دوبارہ اجازت دے دیں تو مجھے اندر لے جانا۔ اگر اجازت نہ دیں تو مجھے عام مسلمانوں کے قبرستان (جنت البقیع) میں دفن کر دینا۔"

جانشینی کا مسئلہ...... انتخابی کمیٹی

جب طبیب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جانبر ہونے سے مایوسی ظاہر کی تو سر کردہ صحابہ کو آپ کے جانشین کے متعلق فکر ہوئی کیونکہ یہ سب سے اہم اور اولیں کام سرانجام دینے کا تھا تاکہ کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ یاد تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ پھر ایسی ہی صورت حال پیدا ہو۔ اپنی زندگی میں وہ اس معاملے پر اکثر غور کرتے رہے تھے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو میں انہیں نامزد کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتا کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اس امت کے امین ہیں۔ میں یہ امانت انہیں بلا کھٹکے سپرد کر دیتا۔

یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے حضرت سالم رضی اللہ عنہ مولیٰ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا تھا۔ کیونکہ ان کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "سالم رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ سے بہت محبت کرتے ہیں" یہ دونوں بزرگ وفات پا چکے تھے۔ زندہ حضرات میں سے آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بہتر خیال کرتے تھے لیکن ڈرتے تھے کہ ان کا قریش کے دو بڑے قبیلوں سے تعلق ہے کہیں وہ اپنے اپنے قبیلوں کے افراد کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط نہ کر دیں۔ زخم مہلک تھا اور اب مزید سوچنے کی مہلت نہ تھی۔

---

[۱] یہ قرضہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رہائشی مکان جو باب السلام اور باب الرحمت کے درمیان واقع تھا بیچ کر ادا کر دیا گیا۔ چونکہ اس سے قرض ادا کیا گیا تھا۔ اس لئے عرصے تک دار القضا کے نام سے مشہور رہا۔ مؤلف

آپ کے آخری حج کے موقع پر ایک شخص نے کہا تھا کہ ''عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا جس طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اچانک بیعت کی گئی تھی اور وہ کامیاب ہوگئی۔'' یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو مدینہ واپس پہنچ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہنگامی انتخاب کے مخصوص حالات اور نارمل طریق انتخاب کے بارے میں آپ نے ایک طویل اور پرزور تقریر کی اور سقیفہ بنی ساعدہ میں جن مخصوص حالات میں آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کر کے اچانک ان کی بیعت کرلی۔ اس کا پس منظر بیان کیا اور فرمایا کہ ''اگر میں ایسا نہ کرتا اور خلیفہ کے انتخاب کے بغیر ہم لوگ منتشر ہو جاتے تو اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کوئی غلط فیصلہ کر بیٹھتے اور ہمارے لئے اس پر راضی ہونا بھی مشکل اور اسے بدلنا بھی مشکل ہوتا۔ اس طرح ملت میں انتشار و تشتت کی راہ کھل جاتی۔ لہٰذا اس اچانک بیعت کو آئندہ کے لئے نظیر نہیں بنایا جاسکتا۔ تم میں ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسی بلند مرتبہ، ہردلعزیز اور غیر متنازعہ شخصیت کا آدمی اور کون ہے؟ اب کوئی شخص اگر مسلمانوں کے باہمی مشورے کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا تو وہ اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی دونوں اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کردیں گے۔''

لہٰذا اب جب کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے اور کسی شخص واحد کے بارے میں کسی آخری فیصلے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ انہوں نے ملت اسلامیہ کے سامنے کسی خاص شخص کی سفارش اپنی جانشینی کے لئے کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس بارے میں انہیں خدا اور خلقت کے سامنے اپنی ذمہ داری کا شدید احساس تھا۔ نئے خلیفہ کا انتخاب وقت کا اہم ترین مسئلہ تھا۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے صحابہ آپ سے بار بار درخواست بلکہ تقاضا کرتے تھے کہ اس معاملہ کو اپنی صوابدید کے مطابق خود ہی طے کرجائیں۔ انہیں آپ کے اخلاص، ملت کی خیر خواہی، دوراندیشی اور اصابت رائے پر اعتماد تھا۔ لیکن اپنے جانشین کے انتخاب کی ذمہ داری کا بوجھ تنہا اپنے سر لینا انہیں گوارا نہ ہوا۔ بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کر دیں۔ آپ نے خفگی سے فرمایا کہ جو شخص اپنی بیوی کو ڈھب سے طلاق بھی نہ دے سکتا ہو وہ خلافت کی ذمہ داری کا اہل کیسے ہوسکتا ہے؟ یہی کافی ہے کہ بنی عدی میں سے عمر ابن خطاب نے ساڑھے دس سال تک یہ بارگراں اٹھائے رکھا۔ وہی اللہ کے محاسبے اور مسئولیت سے چھوٹ جائے تو غنیمت ہے۔

غور و فکر کے بعد آپ نے حسب ذیل چھ سابق الایمان اور مقتدر صحابہ پر مشتمل ایک مجلس مشاورت یا انتخابی کمیٹی قائم کردی کہ اپنے میں سے یا اہل بدر واحد میں سے کسی کو کثرت رائے سے خلیفہ منتخب کرلیں۔

۱- حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

۲- حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ

۳- حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ

۴- حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ

---

۱ حضرت سالم رضی اللہ عنہ ایرانی الاصل تھے اور غلام رہ چکے تھے قریشی نہ تھے اس سے ظاہر ہے کہ رنگ و نسل و قومیت سے قطع نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں ان کے تقویٰ اور دینداری کی اہمیت تھی۔ مؤلف

۵- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

۶- حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

یہ وہ بزرگ صحابہ تھے جو ظہورِ اسلام کے بعد مکہ میں سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں تھے جنہوں نے کفار کی سختیاں برداشت کیں، تن من دھن سے اسلام کی خدمت کی کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر آواز پر لبیک اور سمعنا واطعنا کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیاتِ اقدس کے آخری لمحے تک ان سے خوش رہے اور زندگی ہی میں انہیں جنت کی بشارت دی۔ یعنی یہ حضرات عشرۂ مبشرہ کے باقیات الصالحات تھے۔ اگرچہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ بھی انہی کے زمرے میں آتے تھے۔ لیکن ان سے اپنی قرابت قریبہ کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں انتخابی کمیٹی میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ نیز غالباً اس موقع پر وہ شام میں مصروف جہاد تھے، اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو مجلس مشاورت کا ایک مبصر یا اعزازی رکن مقرر کر دیا۔ وہ مشوروں میں شریک ہو سکتے تھے لیکن کسی امیدوار کے حق میں ووٹ نہیں دے سکتے تھے۔

ارکان مجلس سے فرمایا کہ اگر تین ووٹ ایک طرف اور تین دوسری طرف ہوں تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو حکم بنایا جائے۔ اگر اس کا فیصلہ ناقابل قبول ہو تو جس کی طرف عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہوں، اس کا ساتھ دیا جائے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ اگر سعد رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوں تو وہ اس کے مستحق ہیں۔ میں نے انہیں کوفہ کی امارت سے ان کی کسی کمزوری یا خیانت کی وجہ سے نہیں ہٹایا تھا۔ اگر کوئی دوسرا منتخب ہو تو اسے چاہئے کہ سعد رضی اللہ عنہ کو اپنے مشوروں میں شامل رکھے۔

غرضیکہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری وقت میں بھی مکمل غیر جانبداری، بے لوثی اور بے تعصبی سے کام لیا اور صرف ملی مصالح کو ملحوظ رکھا اور اپنے جانشین کا انتخاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد علیہ اکابر کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

انہوں نے انتخابی مجلس کی محض نامزدگی پر اکتفا کی بلکہ سخت تاکید کر دی کہ ان کی وفات کے بعد تین دن کے اندر نئے خلیفہ کا انتخاب لازماً ہو جانا چاہئے۔ تاکہ کسی اختلاف کو ابھرنے، سازش کو پنپنے یا فتنہ کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔ مشہور صحابی حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا کہ انتخابی کمیٹی کے چھوں ارکان باہمی صلاح مشورہ کے لئے جس گھر میں اکٹھے ہوں تم اس کا دروازہ بند کر دینا اور خود اپنے قبیلے کے پچاس انصار کو لے کر دروازے پر کھڑے ہو جانا۔ کسی کو گھر کے اندر نہ جانے دینا۔ اگر تین دن کے اندر یہ لوگ کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں تو بہتر ورنہ سب کی گردنیں اڑا دینا۔ اگر کوئی شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر امیر بنے تو اسے قتل کر دینا۔ تین دن تک صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں گے۔

اپنے جانشین کے لئے وصیتیں

انتخابی کمیٹی کے لئے ہدایات دینے کے بعد اپنے جانشین کے لئے حسب ذیل وصیتیں کیں۔

۱- دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے اہل قبیلہ سے کوئی ترجیحی سلوک نہ کرے۔

۲- اللہ سے ڈرے، مہاجرین اولین کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ اور ان کا احترام ملحوظ رکھے۔

۳- انصار سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ ان کے حقوق کا بہت خیال رکھے۔ انہوں نے اپنے شہر (مدینہ) کو دارالاسلام بننے کے لئے پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی مدد کی۔ مہاجرین کو پناہ دی اور اسلام کی خاطر قربانیاں دیں۔ ان کے نیکوں کی قدر کی جائے اور بروں سے درگزر کیا جائے۔

۴- اعراب (اہل بادیہ) سے بھی بھلائی سے پیش آئے کیونکہ یہی لوگ عرب کے اصل اور اسلام کا مادہ ہیں۔ ان کے اہل استطاعت سے مال لے کر ان کے فقرا کو دیا جائے۔

۵- وہ اہل عرب جو دوسرے شہروں میں جا کر آباد ہو گئے ہیں ان سے بھی بھلائی کرے کیونکہ وہ اسلام کے مددگار ہیں۔ ان سے کوئی اچھی چیز ان کی مرضی کے بغیر نہ لی جائے۔

۶- اہل ذمہ کے حقوق کا خاص خیال رکھے۔ ان سے جو عہد و قرار ہے اسے پورا کرے۔ ان کے دشمنوں سے لڑا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔

۷- میرے مقرر کردہ عمال کو ایک سال تک برقرار رکھا جائے۔

۸- مزید فرمایا کہ ”اے لوگو! میں تمہیں کتاب اللہ پر عمل کرنے کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ تم لوگ جب تک اس کی پیروی کرو گے گمراہ نہ ہو گے۔

۹- عرب کے قیدیوں، غلاموں میں سے جو نماز پڑھتا ہو اور میری وفات کو پائے وہ آزاد ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا خراج تحسین

جب سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے تھے، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنا زیادہ وقت انہی کے سرہانے گزارتے تھے ایک شخص نے کہا ”خدا کی قسم! مجھے امید ہے کہ آگ آپ کے جسم کو کبھی مس نہ کرے گی۔“ اس پر آپ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں اور فرمایا کہ ”میرے بھائی! اس معاملے میں تمہارا علم بہت کم ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو زمین کے سارے خزانے آنے والی آزمائش سے بچنے کے لئے نچھاور کر دیتا۔“ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ”خدا کی قسم! مجھے امید ہے کہ آپ کو اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھنا پڑے گا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گزر نہ ہو یعنی موت کا ذائقہ ہر شخص کو چکھنا ہے) کیونکہ جہاں تک ہم جانتے ہیں آپ امیر المومنین، امین المومنین اور سید المومنین ہیں۔ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرماتے ہیں اور حصے برابر تقسیم کرتے ہیں۔ واللہ آپ کا سلام تھا تو نصرت تھی، امامت تھی تو فتح تھی آپ کی امارت نے روئے زمین کو عدل سے بھر دیا۔ آپ نے امانت کا حق ادا کر دیا۔“

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا ”اے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما! کیا تم میرے لئے اس کی گواہی دو گے؟“ ابن عباس رضی اللہ عنہما! میرے لئے اس کی شہادت دینا۔ انہوں نے کہا ”ہاں! میں شہادت دوں گا۔“

دیکھا آپ نے؟ اپنے وقت کا ایک بہترین اور عظیم ترین انسان جب اپنے پروردگار کی ملاقات کے لئے موت کے دروازے سے گزرنے لگا تو اس کے خیالات اور احساسات کیا تھے؟ اس نے کیا سوچا، کیا کہا اور لوگوں کو کس حالت میں چھوڑا؟ اسے سب سے زیادہ فکر ملت اسلامیہ کی تھی اور اس کے بعد اہل ذمہ اور اپنے اخروی انجام کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق اس مرنے والے انسان کی نیکیاں آسمان کے ستاروں اور قبیلہ بنی کلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ تھیں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جنت کی بشارت دی تھی لیکن اسے دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے حسن عمل اور ان گنت نیکیوں پر کوئی غرہ نہ تھا بلکہ اپنی بخشش کے لئے فکر مند تھا۔

وفات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اہل خانہ کو تاکید فرمائی کہ ان کی تجہیز و تکفین سادگی سے عمل میں لائی جائے، انہیں مشک سے غسل نہ دیا جائے بلکہ پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا جائے۔ کفن معمولی کپڑے کا ہو۔ ''اگر اللہ کے نزدیک مجھ میں کوئی بھلائی ہوگی تو وہ اسے اچھے لباس سے بدل دے گا اور اگر میں اس کے برعکس ہوا تو وہ بھی مجھ سے چھین لے گا۔ قبر بھی معمولی ہونی چاہئے۔ عورتیں جنازے کے ساتھ نہ چلیں اور میرے لئے وہ باتیں نہ کہی جائیں جو مجھ میں نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اللہ مجھے تم سب سے زیادہ جانتا ہے۔ میرا جنازہ لے کر تیز قدموں سے چلنا کیونکہ اگر اللہ کے نزدیک مجھ میں کوئی بھلائی ہے تو تم مجھے اس جگہ جلدی پہنچا دو گے جو میرے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر میں اس کے برعکس ہوں تو تم اپنے کندھوں سے وہ برائی جلدی اتار پھینکو گے جو تم اٹھائے ہوئے ہو گے۔''

''افسوس ہے مجھ پر اور میری ماں پر اگر اللہ نے معاف نہ کیا۔''

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ فقرہ دہراتے رہے حتیٰ کہ آپ کی روح اپنے خالق حقیقی کی طرف پرواز کر گئی۔

جنازہ اٹھایا گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پہلے مسلمانوں پر کبھی کوئی مصیبت آئی ہی نہیں تھی۔ سارا مدینہ سوگوار تھا، ایک کہرام اور آہ و بکا کا شور برپا تھا۔ اپنے وقت کی دنیا کا سب سے بڑا اور عادل حکمران اور برگزیدہ انسان ملت اسلامیہ کو سراسیمہ و ششدر چھوڑ کر زندگی اور موت کے خالق کی بارگاہ میں پہنچ گیا تھا۔

راویوں کی اکثریت کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ ہجری کو بدھ کے دن زخمی ہوئے، تین دن زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ یکم محرم ۲۴ ہجری کو اتوار کے دن دفنائے گئے۔ ان کے زخمی ہونے کے بعد ان کے حکم سے حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ رومی مسلمانوں کو نماز پڑھاتے رہے تھے۔[1] انہی نے نماز جنازہ پڑھائی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے قبر میں اتارا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ مبارک کے برابر رکھا گیا تھا۔ حضرت عمر رحمۃ اللہ علیہ کا سر شانہ صدیق رضی اللہ عنہ کے برابر رکھا گیا۔

---

[1] حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اسلام سے پہلے غلام رہے تھے۔ کیا شان ہے کہ اسلام نے انہیں مسلمانوں کا امام بنا دیا!

یوں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خواب کا تیسرا چاندان کے گھر میں اتر گیا[1]

عَاشُوْا بلَا فَرَقَۃٍ تلثتھم وَاجْتَمَعُوْا فِی الْمَمَاتِ اِذْ قَبَرُوْا!

(وہ تینوں زندگی میں بھی جدا نہیں ہوئے اور موت کے بعد پھر قبر میں اکٹھے ہو گئے)

میؤر جیسا متعصب مستشرق بھی ایک احساس دردمندی کے ساتھ یہ لکھے بغیر نہ رہ سکا کہ ''اگر ایک مسلم مؤرخ عمر رضی اللہ عنہ جیسے طاقتور، بے لوث، کھرے اور مخلص خلیفہ کو الوداع کہتے ہوئے آہ سرد کھینچے تو بالکل بجا ہوگا۔''

عمر اور مدت خلافت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عمر کے بارے میں متعدد اور مختلف روایات ہیں۔ اکثریت کی رائے کے مطابق عمر شریف تریسٹھ برس ہوئی۔ اگر ابن سعد اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مطابق ۶ بعثت نبوی میں قبول اسلام کے وقت ان کی عمر چھبیس سال تسلیم کی جائے تو وفات کے وقت عمر پچپن چھپن سال ہوگی۔ لیکن اگر دوسری روایات کے مطابق قبول اسلام کے وقت ان کا سن تینتیس سال مانا جائے تو تریسٹھ سال کی عمر پائی۔ قیاس کہتا ہے کہ پچپن سال کی عمر میں وہ اپنے آخری حج کے موقع پر دعا مانگتے ہوئے یہ نہ کہتے کہ ''اے اللہ! میری عمر زیادہ ہوگئی، ہڈیاں نرم اور کمزور ہوگئیں، قوت کم ہوگئی۔'' یہ الفاظ تریسٹھ سال کی عمر ہی میں ان کی زبان سے نکلے ہوں گے۔

طبری نے ساٹھ سال کو زیادہ معتبر قرار دیا ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دس سال، پانچ ماہ اور اکیس دن خلافت کا بارگراں اپنے سر پر اٹھائے رکھا۔ لیکن ان کے کارناموں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے ان دس سالوں میں دس صدیاں سمٹ آئی ہوں۔ دنیا کے بڑے بڑے حکمران اور خلفا مجموعی حیثیت سے بھی وہ کچھ نہ کر سکے جو اکیلے عمر رضی اللہ عنہ نے دس سال کی مختصر مدت میں کر دکھایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم کی آراء

طبقات ابن سعد میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غسل اور کفن دے دیا گیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ تشریف لائے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرے سے چادر ہٹائی اور فرمایا ''اے ابوحفص! اللہ آپ پر رحم کرے۔ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہیں کہ میں اس کے نامہ اعمال کے ساتھ اللہ سے ملنا پسند کروں۔'' (یعنی آپ کا نامہ اعمال اتنا اچھا ہے)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اے عمر رضی اللہ عنہ! تم بہترین اسلامی بھائی تھے۔ تم حق میں سخی تھے اور باطل میں بخیل۔ تم پاک نظر تھے، عالی ظرف تھے۔ نہ مدح کرنے والے تھے نہ غیبت کرنے والے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''عمر رضی اللہ عنہ اسلام کے لئے ایک مضبوط قلعہ تھے کہ لوگ اس میں

---

[1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس کے آخری ایام میں خواب دیکھا تھا کہ تین چاند ان کے گھر کے آنگن میں اترے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سنایا تو وہ خاموش ہو گئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا میں دفن کیا گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا ''بیٹی! یہ پہلا اور بہترین چاند ہے جو تمہارے گھر میں اترا ہے۔ دوسرے چاند خود ابوبکر رضی اللہ عنہ اور تیسرے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوئے۔'' مؤلف

داخل ہوتے تھے لیکن اس سے نکلتے نہ تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ کی وفات سے اس قلعے میں دراڑ پڑ گئی واللہ اگر میں جان لیتا کہ عمر رضی اللہ عنہ کسی کتے سے محبت کرتے تھے تو میں بھی اس سے ضرور محبت کرتا۔ عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا بجائے خود ایک فتح و نصرت تھا۔ آپ کا مدینہ جانا اسلام کے لئے زبردست اعانت ثابت ہوا۔ آپ کا دور خلافت امت کے لئے رحمت تھا۔''

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''اہل عرب کا کوئی گھر، خواہ وہ شہر میں ہو یا دیہات میں ایسا نہیں جس میں عمر رضی اللہ عنہ کے قتل سے نقص نہ داخل ہو گیا ہو۔''

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''میں عمر رضی اللہ عنہ پر نہیں بلکہ خود اسلام پر روتا ہوں جس میں عمر رضی اللہ عنہ کی موت نے ایسا رخنہ ڈال دیا ہے جو قیامت تک پر نہیں ہوگا۔''

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام کی مثال آنے والے آدمی کی تھی جو برابر آنے میں مشغول ہو۔ عمر رضی اللہ عنہ قتل کر دیئے گئے تو اسلام جانے والے شخص کی مانند ہو گیا کہ جیسے جیسے فاصلہ بڑھتا ہے وہ گھٹتا جاتا ہے۔''

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''وہ کون سے گھر والے ہیں جنہوں نے عمر رضی اللہ عنہ کا فرق محسوس نہ کیا ہو؟ اگر ایسے کوئی ہوں تو وہ برے گھر والے ہیں۔''

کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کسی سازش کا نتیجہ تھی؟

قرائن سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کے پیچھے مدینہ میں رہنے والے غیر مسلموں کی سازش کارفرما تھی اور بظاہر ابولؤلو فیروز کی ذاتی رنجش اس کا فوری محرک بنی۔ اگر وہ زندہ گرفتار کر لیا جاتا اور عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جوش انتقام میں قصاص کا معاملہ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہرمزان اور جفینہ کو قتل نہ کر دیتے، تو اصل حالات سے پردہ کشائی کا امکان تھا۔ اور شاید عہد عثمانی میں سر اٹھانے والے فتنوں اور سازشوں کا بھی اسی مرحلے پر سدباب ہو جاتا، لیکن قاتل نے خودکشی کر لی اور ممکنہ سازش کے تمام سرغنوں اور شرکا کے ناموں اور کاموں سے دنیا واقف نہ ہو سکی۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پہلی کامیاب سازش تھی۔ بعینہٖ جس طرح مملکت اسلامیہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خاں کے قاتل سید اکبر کو موقع پر ہی ہلاک کر دیا گیا اور دنیا کو یہ تاثر دیا گیا کہ یہ ایک سرپھرے جنونی کا ذاتی فعل تھا۔ سید اکبر کی موت سے لیاقت علی خاں کے قتل کے اصل ذمہ دار بے نقاب نہ ہو سکے۔ بہرحال سازش کی نشاندہی حسب ذیل آثار و قرائن سے ہوتی ہے:

۱۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب وہ خنجر دیکھا جو فیروز نے حملہ کے لئے استعمال کیا تھا تو انہیں تعجب ہوا اور فرمایا کہ ''یہ تو وہی خنجر ہے جو کل میں نے ہرمزان اور جفینہ[۱] کے پاس دیکھا تھا۔ جب میں نے ان سے

[۱] ایک عیسائی جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا رضاعی بھائی تھا اور وہ اسے حیرہ سے اپنے ساتھ مدینہ لائے تھے تاکہ مسلمانوں کے بچوں کو نوشت و خواند کی تعلیم دیا کرے۔ مؤلف

پوچھا کہ تم اس خنجر کو کیا کرو گے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس سے گوشت کاٹیں گے کیونکہ ہم گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتے۔'' ہرمزان اور جفینہ کا بیان معنی خیز تھا۔ خاص کر ہرمزان کا جو مسلمان ہو چکا تھا۔ اسے تو گوشت کو ہاتھ لگانے میں کوئی عذر مانع نہ ہو سکتا تھا۔ گوشت سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گوشت یعنی قتل بھی مراد ہو سکتی ہے۔

۲۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ ''میں دفعتہً فیروز، جفینہ اور ہرمزان کے پاس سے گزرا، وہ چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بھاگے اور ایک خنجر ان کے درمیان گر پڑا جس کے دو پھل تھے اور دستہ بیچ میں تھا۔ دیکھو وہ خنجر کیسا ہے جس سے عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا ہے۔'' لوگوں نے دیکھا تو وہی خنجر نکلا۔

ان دو محترم اور معتبر صحابہ کی گواہی سے ظاہر ہے کہ جس خنجر سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا گیا وہ ہرمزان اور جفینہ کے پاس تھا اور انہوں نے فیروز کو دیا اور یہ اس رات کا واقعہ ہے جس کی صبح کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا گیا۔ لہٰذا غالب قیاس یہی ہے کہ قتل عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے سازش کارفرما تھی جس کے اہم اور نمایاں کردار ہرمزان، جفینہ اور فیروز تھے[1] یہ بھی ممکن ہے کہ مدینہ میں رہنے والے دوسرے ایرانی یا ان قوموں کے افراد بھی شامل ہوں جن پر دور فاروقی میں مسلمانوں نے غلبہ پایا تھا اور وہ غلام بن کر مدینہ آئے تھے۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ایرانی اور رومی سلطنتوں کے حکمرانوں نے مدینہ میں موجود اپنے ہم قوموں کو الگ الگ اس سازش پر اکسایا ہو اور پھر وہ مشترکہ مقصد کے لئے متحد ہو گئے ہوں۔ غیر مسلموں کا مدینہ اور مکہ میں داخلہ بہت بعد میں ممنوع قرار دیا گیا۔ ہرمزان مسلمان ہو چکا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا بیش قیمت وظیفہ مقرر کر دیا تھا لیکن شاید اہواز کی حکومت کی یاد اور ایرانی عصبیت ابھی اس کے دل و دماغ سے محو نہیں ہوئی تھی۔

جفینہ عیسائی تھا اور سابق ایرانی علاقہ محروسہ حیرہ کا باشندہ۔ فیروز مجوسی یا ایرانی النسل عیسائی تھا اور ایران سے گرفتار ہو کر آنے والے غلاموں کی حالت پر کھلم کھلا کڑھا کرتا اور اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا کرتا تھا۔ بہرحال تینوں ایرانی الاصل تھے۔ ہرمزان اور جفینہ مدینہ کے آزاد باشندے تھے جبکہ فیروز غلام تھا۔ آزادوں نے غلام کو آلہ کار بنایا؟

۳۔ مزید برآں یہ کہ کعب احبار جو ایک یہودی عالم تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلام لائے تھے، انہوں نے حملہ سے تین دن پہلے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ ''امیر المومنین! آپ کی زندگی کے تین دن باقی رہ گئے ہیں۔'' جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پیشین گوئی کی وجہ پوچھی تو جواب دیا کہ تورات میں آپ کا حلیہ اور صفات ملتی ہیں۔ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی غالباً اس لئے کہ وہ کتب یہود کے حوالوں کو افسانہ و افسوں سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کعب نے تورات کے بیان کا محض بہانہ کیا، دراصل انہیں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خلاف کی جانے والی سازش کا علم ہو چکا تھا لیکن بعض ذاتی مصلحتوں

---

[1] اگرچہ اس کی توجیہہ پھر بھی نہیں ہوتی کہ اگر یہ سازشی ٹولہ تھا تو کسی گھر کے اندر چھپ کر سازش تیار کرنے کی بجائے خنجر لے کر سرراہ کیوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے؟ جبکہ ایسی حالت میں دیکھے جانے بلکہ پکڑے جانے کا امکان تھا؟ شاید اس لئے کہ ان دنوں مسلمانوں کو اپنے آپ پر حد سے زیادہ باہمی اعتماد تھا اور کسی ایسی سازش کے وقوع کا خیال ان کے ذہنوں میں نہ آ سکتا تھا۔ مؤلف

کی بناپر وہ کھل کر بتانا اور سازشیوں کے نام لینا پسند نہ کرتے تھے۔ دوسرے دن کعب نے پھر آ کر یاددہانی کرائی کہ ''امیر المومنین! ایک دن گزر گیا۔ اب آپ کی زندگی کے صرف دو دن باقی رہ گئے ہیں۔'' اگلے دن پھر آ کر کہا کہ ''اب آپ کی زندگی بس کل صبح تک ہے اور اگلی صبح کو فیروز نے ان پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ تعجب ہے کہ کسی کو کعب پر شک نہ گزرا، نہ کسی نے اس پر جرح کی خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے زیرک اور محتاط انسان نے متواتر تین دن تک دہرائی جانے والی تنبیہ کی تحقیقات کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابولؤلو فیروز ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت لے کر گیا تھا تاکہ ارتکاب قتل کے لئے کوئی فوری اشتعال انگیز بہانہ بنا سکے۔

۴- محمد ابن سعد نے ''طبقات'' میں جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی زبانی لکھا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ اپنے آخری حج کے موقع پر جبل عرفات پر کھڑے تھے کہ ایک شخص کو یا خلیفہ! یا خلیفہ! پکارتے سنا۔ ایک شخص نے اسے کہا کہ خدا تیری زبان بند کرے۔ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ جبیر رضی اللہ عنہ نے دوسرے شخص سے کہا کہ اس پکارنے والے کو گالی نہ دو۔ دوسرے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ عقبہ پر کھڑے رمی جمار کر رہے تھے کہ اچانک ایک کنکری حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر آ کر لگی اور ان کا سر پھٹ گیا۔ جبیر رضی اللہ عنہ نے سنا کہ پہاڑ پر سے کوئی کہہ رہا ہے کہ ''رب کعبہ کی قسم! مجھے خبر دی گئی ہے کہ اس سال کے بعد اس موقف میں عمر رضی اللہ عنہ کبھی کھڑے نہیں ہوں گے۔'' اور یہ وہی شخص تھا جو ایک دن پہلے پہلے چیخ چیخ کر یا خلیفہ، یا خلیفہ کہہ رہا تھا، کیا یہ پکارنے والا سازش کے راز سے واقف تھا اور اسے رعب فاروقی کی وجہ سے اتنی جرأت نہ ہوئی کہ بالمشافہ سازش کی نقاب کشائی کرتا؟ اس وقت لوگوں نے اسے محض کوئی فال گیر سمجھا اور کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔ بعد کے مورخین نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے لیکن کسی نے سنجیدگی سے اس پر غور کر کے سازش کی کڑیاں ملانے کی کوشش نہیں کی۔

۵- اسی طرح ابن سعد نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت کی ہے کہ ''عمر رضی اللہ عنہ کے آخری حج میں امہات المومنین رضی اللہ عنہن ان کے ہمراہ تھیں۔ جب ہم عرفہ سے پلٹے تو میں محصب[1] سے گزری۔ وہاں میں نے ایک شخص کو اپنی سواری پر یہ کہتے سنا کہ ''امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟'' دوسرے شخص نے جواب دیا کہ ''یہ رہے امیر المومنین!'' یہ سن کر اس پہلے شخص نے اپنا اونٹ بٹھایا اور ترنم سے چند اشعار پڑھے (جن کا ترجمہ حسب ذیل ہے)

اے امام! تجھ پر سلام ہو اور اللہ کا ہاتھ اس پھیلی ہوئی زمین میں برکت دے۔

پھر جو دوڑے گا یا شتر مرغ کے بازوؤں پر سوار ہوگا۔ تم نے جو کچھ کل بھیجا اسے آگے جاتا ہوا پائے گا۔

تم نے تمام امور پورے کر دیئے۔ اس کے بعد تم نے اس حالت میں چھوڑ دیا کہ وہ کلیاں ہیں جو اس طرح اپنے غلاف میں ہیں کہ چٹکی نہیں ہیں۔

اور پھر وہ سوار دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسروں نے سمجھا کہ وہ کوئی جن تھا، بھلا

---

[1] منیٰ اور مکہ کے درمیان ایک مقام

جن کو اونٹ پر سوار ہو کر وہاں آ کر ایسے شعر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وقت پورا ہو جانے کی پیشین گوئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنوں کے خلیفہ نہ تھے۔

مندرجہ بالا واقعات سے ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک سازش پرورش پا رہی تھی اور بعض لوگوں کو اس کے متعلق کچھ اڑتی سی خبریں مل رہی تھیں۔ وہ یا تو اس کے نتائج سے بے پروا تھے، یا سازشیوں سے خائف یا ان کے ہمدرد تھے، یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رعب وجلال سے اس قدر خائف تھے کہ کھل کر بتانے کا انہیں حوصلہ نہ ہوا، اشاروں، کنایوں میں باتیں کرتے رہے اور دشمنان اسلام اپنا وار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں رہتے ہوئے شہادت کی آرزو تھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیشین گوئی کی تھی، وہ پوری ہو گئی۔

اگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت فی الواقع کسی منظم سازش کا نتیجہ تھی تو یہ عالم اسلام میں پہلی سازش تھی جس نے آئندہ کے لئے خود مسلمانوں میں سازشوں کے دروازے کھول دیئے اور خلافت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سازش کا دوسرا مرحلہ تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تیسرا مرحلہ

حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی انتقامی کارروائی

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی گواہی سے یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ سے پہلے کی رات کو ابولؤلو فیروز، ہرمزان اور جفینہ آپس میں کھسر پھسر کرتے ہوئے دیکھے گئے اور ان کے پاس وہی خنجر تھا جس سے امیر المومنین رضی اللہ عنہ پر اگلی صبح کو فیروز نے قاتلانہ حملہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اہل وعیال تک بھی یہ بات پہنچ گئی تھی لیکن ان کی زندگی میں سب خاموش رہے کہ شاید آپ جانبر ہو جائیں اور حملہ آور کے متعلق خود فیصلہ کریں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے عبید اللہ رضی اللہ عنہ[1] انتقام اور قصاص کے جوش میں تلوار لے کر نکل کھڑے ہوئے اور اپنے زعم میں فیروز کے سازشی رفقا ہرمزان اور جفینہ کو قتل کر دیا۔ اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فیروز کی کمسن لڑکی کو بھی نہ چھوڑا جو اسلام کی دعویدار تھی۔ عبید اللہ کا ارادہ مدینہ میں پائے جانے والے تمام غیر مسلموں کو قتل کر دینے کا تھا۔ اس سے ایک عام کھلبلی مچ گئی۔ ابھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جانشین کا فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی ہاتھا پائی ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے کہا۔ ''خدا تمہیں غارت کرے۔ تم نے ایک ایسے شخص (ہرمزان) کو قتل کر دیا جو نماز پڑھتا تھا (یعنی مسلمان تھا) ایک کمسن بچی کو قتل کر دیا جو اسلام کی دعویدار تھی اور ایک

---

[1] ان کی والدہ کا نام ام کلثوم بنت جرول تھا۔ چونکہ وہ اسلام نہیں لائیں اور مکہ میں رہ گئیں۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح جاتا رہا۔ عبید اللہ رضی اللہ عنہ مشہور بہادر اور پہلوان تھے۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہرمزان، جفینہ وغیرہ کے قصاص میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت عبید اللہ کے قتل کا مشورہ دیا تھا، اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد وہ دمشق چلے گئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑے اور جنگ صفین میں مارے گئے۔ مؤلف

ایسے شخص (جفینہ) کی گردن ماردی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری میں تھا۔'' صورت حال نہایت نازک ہوگئی۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا۔ آخر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بڑی حکمت عملی سے عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی تلوار ان سے لے لی اور عبید اللہ کو گرفتار کرلیا گیا تا کہ ہونے والا خلیفہ ان کے مقدمہ کا فیصلہ کرے۔

حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی کارروائی جاہلی حمیت اور انتقام خواہی پر مبنی تھی اور قصاص اور دیت کے اسلامی اصولوں کے خلاف تھی۔ مقتول کے قصاص وغیرہ کے متعلق خلیفۂ وقت ہی فیصلہ کرسکتا تھا۔ بہر حال یہ افسوسناک واقعہ ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب ہونے کے بعد سب سے پہلے عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے مقدمہ کا فیصلہ کرنا پڑا جس سے بعض لوگ مطمئن نہ ہوئے۔ محمد حسین ہیکل اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے لکھا ہے کہ خلیفہ بننے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کے بیٹے کو بلا کر کہا کہ ''یہ (عبید اللہ) تیرے باپ کا قاتل ہے۔ اسے لے جا اور قصاص میں قتل کردے'' مگر اس نے کہا کہ میں اللہ اور مسلمانوں کے لئے قصاص سے درگزر کرتا ہوں۔ اس سے لوگ اتنے خوش ہوئے کہ اسے اپنے ہاتھوں اور سروں پر اٹھا کر اس کے گھر پہنچایا۔ مزید تفصیل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات میں آئے گی۔

اسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ عمر رضی اللہ عنہ جو عہد صدیقی میں مالک بن نویرہ جیسے مشکوک الایمان شخص کے اسلام وارتداد کی جنگ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل پر نہایت خفا ہوئے تھے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر زور دیتے رہے تھے کہ خالد رضی اللہ عنہ کو لشکر کی کمان سے معزول کر کے ان کے خلاف کارروائی کریں، خود ان کی شہادت پر ان کے صاحب زادے نے ذاتی انتقام کے جوش میں بظاہر دو مسلمانوں اور ایک ذمی کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ اگر ہرمزان اور جفینہ قتل نہ کئے گئے ہوتے اور انہیں گرفتار کر کے تفتیش کی گئی ہوتی تو ممکن تھا کہ سازش کا حال کھل جاتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ازواج واولاد

محمد بن سعد نے ''طبقات'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پوتے سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عورتوں سے نکاح جنسی خواہشات کی وجہ سے نہیں بلکہ اولاد کی طلب سے لئے کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں متعدد شادیاں کیں جن سے نو بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ آج ہماری مغربی تعلیم وتہذیب سے آراستہ خواتین یہ چاہتی ہیں کہ نہ تو مرد دوسری شادی کرے اور نہ وہ خود بچے پیدا کرنے کے حق میں ہیں۔ اگر کوئی بچہ پیدا کر بھی لیں تو اسے اپنا دودھ بھی پلانا نہیں چاہتیں۔

۱- ام کلثوم بنت جرول، یہ بنو خزاعہ میں سے تھیں۔ اسلام نہیں لائیں اور مکہ میں رہ گئیں۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح ٹوٹ گیا ان سے عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور زید اصغر پیدا ہوئے۔ عبید اللہ کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔

زینب رضی اللہ عنہا بنت مظعون۔ سب سے پہلی بیوی تھیں یہ بزرگ صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ تھیں اسلام لانے کے بعد مکہ میں فوت ہوئیں ان سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ، ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا اور عبدالرحمٰن پیدا ہوئے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے غزوات نبوی میں سرگرم حصہ لینے کے علاوہ عہد صدیقی و فاروقی میں بھی سرفروشانہ کارنامے سرانجام دیئے۔ وہ نہایت ثقہ راوی حدیث شمار ہوتے ہیں۔ ان سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ بنی امیہ بھی ان کا احترام کرتے رہے۔ طویل عمر پا کر حجاج کے زمانے میں وفات پائی۔ بڑے حق گو تھے۔ ان کے مرتبہ کی وجہ سے حجاج کھلم کھلا تو ان کے خلاف کچھ نہ کر سکا۔ زہر آلود نیزے کی انی سے ان کے پاؤں پر معمولی سا زخم لگوا دیا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

قریبتہ بنت ابی امیہ مخزومی۔ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں۔ اسلام نہ لائیں۔ ۶ ھ میں طلاق دے دی۔

جمیلہ بنت ثابت بن ابی الافلح۔ یہ انصار مدینہ کے قبیلہ اوس سے تھیں۔ ان سے عاصم پیدا ہوئے جو نہایت پاکیزہ نفس اور عالم و فاضل تھے اور فقہائے مدینہ میں شمار ہوتے تھے۔ انہی عاصم کی بیٹی حضرت عمر بن عبدالعزیز کی والدہ تھیں۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ ہو کر بنی امیہ سے ان کی زبردستی کی ہتھیائی ہوئی جاگیریں، جائیدادیں وغیرہ واپس لے لیں تو انہوں نے آپس میں طنزاً کہا کہ "اور کرو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے خاندان میں شادیاں!"

عاتکہ بنت زید رضی اللہ عنہا۔ یہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ (یکے از عشرہ مبشرہ) کی ہمشیرہ تھیں اور اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کزن بھی ہوتی تھیں۔ ان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عیاض پیدا ہوئے۔ حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ان کا پرسوز مرثیہ کہا جس کے اشعار آج بھی محفوظ ہیں۔

حضرت ام کلثوم بنت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ ان سے خاندانِ نبوت سے شرفِ قرابت پیدا کرنے کے لئے نکاح کیا تھا۔ اور چالیس ہزار درہم مہر مقرر کیا تھا اتنا بھاری مہر کسی دوسری زوجہ کے لئے نہ تھا۔ یہ نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باہمی حسن تعلقات پر شاہد ہے۔ حضرت ام کلثوم سے زید اکبر اور رقیہ پیدا ہوئے۔ زید کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

طبری نے لکھا ہے کہ زید ایک دفعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دربار میں گئے۔ وہاں معاویہ رضی اللہ عنہ کے معزز سردار بسر بن ابی ارطاط نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں سب و شتم سے کام لیا۔ اس پر زید نے لاٹھی سے بسر کا سر پھاڑ دیا۔ بسر نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ انہوں نے زید سے باز پرس کی تو زید نے کہا کہ اگر یہ پھر اسی طرح زبان چلائے گا تو میں پھر اپنی لاٹھی چلاؤں گا۔ یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بسر سے کہا کہ تم نے ان کے نانا (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کو برا بھلا کہا۔ اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔

ام حکیم بنت ہشام بن مغیرہ مخزومی رضی اللہ عنہا۔ ان سے ایک بیٹی فاطمہ پیدا ہوئی۔ آپ کے صاحب زادے عبدالرحمٰن اوسط کی والدہ لہیہ آپ کی سب سے چھوٹی صاحب زادی زینب کی والدہ فکیہہ اور عبدالرحمٰن اصغر

کی والدہ سکینہ ام ولد تھیں بعض اولادیں آپ کی زندگی ہی میں فوت ہوگئیں۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ، عبید اللہ رضی اللہ عنہ، عاصم رضی اللہ عنہ اور حفصہ رضی اللہ عنہا (ام المومنین) زیادہ مشہور ہوئے اور انہوں نے تاریخی کردار ادا کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کی ازواج کے سلسلے میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر یاد آ گیا۔

حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن
کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن

بیٹے پر حد جاری کی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اولاد سے بے جالاڈ پیار کے قائل نہ تھے۔ عامتہ المسلمین کے مقابلے میں ان سے کسی قسم کا ترجیحی سلوک روا نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار جب انہوں نے لوگوں کو کسی بات سے روکنا چاہا تو اپنے اہل وعیال کے پاس گئے اور فرمایا کہ

''میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جسے میں نے کسی کام سے روکا ہو اور پھر اس نے وہی کام کیا ہو سوائے اس شخص کے جسے سزا دینے میں مجھ سے کمزوری ظاہر ہوئی ہو۔

اے عمر کے گھرانے والو! اگر تم احکام کی خلاف ورزی کرو گے تو میں تمہیں دگنی سزا دوں گا کیونکہ لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی رہتی ہیں۔''

ان کے صاحب زادے عبدالرحمٰن ابوشحمہ نے مصر کے جہاد کے دوران میں نشہ آور نبیذ پی۔ پھر خود ہی حاکم مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ کر اقرار کیا اور اصرار کیا کہ ان پر حد جاری کی جائے۔ عمرو رضی اللہ عنہ انہیں اپنے ساتھ گھر لائے اور ہلکے کوڑے لگائے۔ حالانکہ سزا برسر عام دی جانی چاہئے تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع پہنچ گئی انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو سخت تہدیدی خط لکھا اور عبدالرحمٰن کو مدینہ بلا کر اپنی موجودگی میں دوبارہ کوڑے لگوائے اور قید کر دیا۔ وہ پہلے ہی بیمار اور کمزور تھے۔ دوسری حد کی تاب نہ لا سکے۔ چند روز بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔

یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتان وہم و گماں، لا الہ الا اللہ!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حلیہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے دراز قامت اور خوبصورت تھے۔ کسی بھی مجمع میں کھڑے ہوں وہ لوگوں میں سب سے سر برآوردہ اور نمایاں دکھائی دیتے تھے۔ رنگت سرخ وسفید تھی۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے، کندھوں میں آگے کی جانب خفیف سا جھکاؤ، بازوؤں پر بالوں کی کثرت، جسم خوب بھرا ہوا تھا۔ چندیا کے بال جھڑ گئے تھے۔ داڑھی اور مونچھیں گھنی تھیں جب غصے میں ہوتے تو مونچھوں کو تاؤ دینے لگتے۔ مہندی کا خضاب لگاتے تھے۔ پاؤں پھیلا کر چلتے تھے۔ آخر عمر تک رکاب کا سہارا لینے کی بجائے گھوڑے پر ہمیشہ کود کر سوار ہوتے تھے۔ عام الرمادہ میں عام

لوگوں کی طرح خراب غذا کھانے سے رنگت سنولا گئی تھی، سادہ لباس پہنتے تھے۔ زمانہ خلافت میں اکثر پیوند لگا لباس آپ کے جسم پر دیکھا جاتا تھا خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ آپ کے تہمت میں چودہ پیوند لگے ہوئے دیکھے جن میں سے ایک چمڑے کا تھا، اسی حالت میں ہاتھ میں درہ لئے مدینہ کے بازاروں میں گھوم رہے تھے انہی کا بیان ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سوا صحابہ میں سے کوئی ایسا نہیں جس نے خز[1] نہ پہنا ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی سادہ بودوباش اور اعلیٰ فکر وخیال کی بہترین مثال تھی۔ عاش حمیداً مات حمیداً

خلافت فاروقی پر تبصرہ

حکمرانے بودو ساما نے نداشت
دست او جز تیغ و قرآنے نداشت

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا اور اصل کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے دینی شوروی بنیادوں پر ایسا آئین حکومت وضع کیا اور عادلانہ نظام قائم کیا جو مسلمانوں کی جملہ سعادتوں اور ترقیوں کا ضامن تھا۔

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ مومن مخلص کی قوت، بہادر وجانباز مجاہد فی سبیل اللہ کی الوالعزمی، جہاندیدہ بزرگ کی تجربہ کاری، فطری قابلیت رکھنے والے ہوشیار شخص کی زیرکی وفطانت کے ساتھ تخت خلافت پر متمکن ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں کو زیرنگیں کرلیا۔ انہوں نے اپنی انفرادی صلاحیتوں سے عرب کی اس وادی غیر ذی زرع کے اندر رہ کروہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو بڑی بڑی حکومتوں اور مجلسوں کے لئے بھی انتہائی دشوار تھے۔ گورنروں کا تقرر، ججوں کا انتخاب، فوجی افسروں کا چناؤ، لشکروں کی تربیت وتنظیم، فوجی نقل وحرکت کے احکام، کمک بھیجنا، نقشے بنانا، شہروں کی حدیں کھینچنا، قانون سازی، تقسیم مالِ غنیمت، حدود وتعزیرات کا اجرا وغیرہ الغرض یہ تمام خدمات آپ اپنی صوابدید، اصابت رائے، تیزی ذہن، دور بینی وعزیمت سے انجام دیتے رہے۔ ان جلیل القدر خدمات کے ساتھ آپ خاک نشین تھے۔ عوام کے ساتھ مل جل کر رہتے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی خلافت کا زمانہ آج تک عدل وامن اور انتظام کے لحاظ سے دنیا کا اعلیٰ ترین مثالی دور مانا گیا ہے۔[2] رعایا کو ایک ایسی شریفانہ، پرامن، مطمئن اور بامقصد زندگی گزارنے کا موقع ملا جس کی ماضی اور حال میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ اپنی ذمہ داری، جوابدہی اور محاسبہ نفس کا جو احساس ان میں تھا کسی دوسرے حکمران میں نظر نہیں آتا ان کے عہد میں زمین اللہ کے نور سے معمور ہوگئی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ساڑھے دس سالہ دور خلافت اگرچہ دنیا کی ہزار ہا سالہ تاریخ میں بظاہر ایک بہت ہی مختصر سا وقفہ ہے۔ لیکن اس تاریخ میں کشور کشائی، سیاست، حکومت، جمہوریت، اخوت، مساوات، آزادی، عدل اور فلاح انسانی کا یہ درخشاں ترین باب ہے۔ قوموں اور ملکوں کے لئے روشنی کا منبع اور ایک بہترین آئیڈیل۔

---

[1] ایک قیمتی کپڑا جو اون اور ریشم ملا کر تیار کیا جاتا تھا۔ مؤلف

[2] تاریخ ادب عربی از استاد احمد حسن زیات مترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اسے ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز خیال کرتے ہیں۔حرکت وعمل، نیکی وسعادت سے مملو یہ ایک ایسا سنہری دور تھا جس کا سو فیصد اعادہ خود اسلام کی تاریخ میں بھی نہ ہو سکا۔اصل بات یہ ہے کہ جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دعائے خلیل اور نوید مسیحا کا نتیجہ تھی، اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب کا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بن کر تاریخ کی سٹیج پر نمودار ہونا دعا و نگاہِ محمدی کا فیضان تھا۔ورنہ خطاب کا یہ بیٹا زیادہ سے زیادہ عکاظ کا چیمپئن پہلوان اور شہسوار ہوتا اور موت کے بعد لوگوں کے ذہن اسے قطعاً فراموش کر دیتے لیکن رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبعوث کرنے والے سے دعا کی تھی کہ ''یا اللہ! عمر بن ہشام یا عمر بن الخطاب میں سے کسی ایک سے اسلام کو تقویت بخش۔''

مکہ میں یہ دو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسے نظر آتے تھے جو پر جوش، فعال اور متحرک تھے، کچھ کرنے کے اہل، مشیت الٰہی نے موخر الذکر (عمر بن الخطاب) کو دعائے نبوی کا مصداق بنانے کے لئے چن لیا۔اور اول الذکر اپنی اسلام دشمن حرکات کی وجہ سے تاریخ میں ابوجہل ہو کر رہ گیا۔

''فتوحات کی کثرت، محاصل کی فراوانی، انتظامات کی خوبی جور وظلم کے انسداد، عدل وانصاف اور امن و امان کے قیام، ملک کی خوشحالی اور رعایا کی فارغ البالی وغیرہ ان تمام خوبیوں کے لحاظ سے جو کسی حکومت یا فرمانروا کے لئے طغرائے امتیاز ہو سکتی ہیں، دنیا کا کوئی حکمران فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔''[1]

''بلاشبہ، سکندر چنگیز اور تیمور نے ایک عالم کو زیرنگیں کیا لیکن اسی کے ساتھ اس کو زیر وزبر بھی کر ڈالا۔وہ صرف جہانگیر تھے جہاندار نہ تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جس احتیاط اور قوانین کی پابندی کے ساتھ ایران وروم فتح ہوئے۔اس احتیاط کے ساتھ دنیا کا کوئی حکمران زمین کا ایک چپہ بھی فتح نہ کر سکا۔چنگیز وتیمور وغیرہ طوفان کی طرح ایک عالم پر چھا گئے۔لیکن جب یہ طوفان تھما تو انسانی لاشوں کے انبار اور تباہ شدہ کھنڈروں کے علاوہ اور کوئی شے نظر نہیں آتی تھی۔وہ جن جن ملکوں سے گزرے انہیں ویرانہ بنا دیا۔اس کے برعکس عہد فاروقی میں خون ناحق کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پایا ملکوں کا تباہ کرنا تو بڑی بات ہے۔ہرے بھرے کھیتوں اور شاداب درختوں تک کو نہ کاٹنے، بوڑھوں، بچوں عورتوں پر تلوار اٹھانے کی سخت ممانعت تھی۔پھر مسلمانوں نے جس ملک میں قدم رکھا اپنے عدل وانصاف اور حسن اخلاق سے اس کے باشندوں کو ایسا گرویدہ بنا لیا کہ وہ اپنی قوم کے مقابلے میں ان کے معاون ومددگار بن گئے۔انہوں نے قوموں کے دل ودماغ کو مسخر کر لیا اور بہت سی مفتوح قوموں نے ان کا مذہب بھی قبول کر لیا۔اس کا نتیجہ ہے کہ اس زمانے میں جو ملک فتح ہوئے وہ سب کے سب مسلمان اور آج تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔''[2]

حقیقت یہ ہے کہ عہد فاروقی کی فتوحات کو دیکھ کر مؤرخ پر حیرت کا عالم طاری ہو جاتا ہے کہ کس طرح قلیل

---

[1] تاریخ اسلام جلد اول از شاہ معین الدین احمد ندوی

[2] ایضاً۔البتہ ۱۹۴۸ء سے مشرق وسطیٰ کے دل (فلسطین) میں برطانیہ، امریکہ اور روس نے مل کر اسرائیل کا خنجر گاڑ دیا ہے اور وسطی ایشیا خراسان وآذربائیجان کے علاقے روس نے ہتھیا لئے ہیں۔مؤلف

التعداد اور بے سروسامان عرب کے شتر بانوں نے دنیا کی دوسب سے بڑی طاقتور سلطنتوں سے مقابلہ کیا اور بعض دفعہ ان کی متحدہ طاقت سے بھی پنجہ آزمائی کی۔ اور دس سال کے مختصر عرصے میں تیونس سے ترکستان و مکران تک دور دراز ممالک کو ہمیشہ کے لئے اسلامی ممالک کی فہرست میں شامل کر دیا۔ وجہ؟ نظم و نسق میں عدل، رعایا پروری، مذہبی آزادی اور ذمی رعایا کو ان کے اندرونی معاملات میں انتہائی خودمختاری دینا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمہ گیر عبقریت کی مثال دنیا کے حکمرانوں میں نہ ان سے پہلے ملتی ہے نہ بعد میں۔ وہ فتوحات کے خواہش مند نہ تھے بلکہ خود فتوحات نے ان کی خواہش کی۔ جیسے عرب کے اردگرد کا ہر ملک اور علاقہ پکار رہا ہو کہ اے عمر رضی اللہ عنہ! اور مجھے فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر اور میرے باشندوں کو قیصر و کسریٰ کے استبداد سے نجات دلا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمسایہ سلطنتوں کے خلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ کاش! ہمارے اور ایرانیوں، رومیوں کے درمیان آگ کے دریا حائل ہوتے تاکہ نہ وہ ہماری طرف آسکتے نہ ہم ان کی طرف جاسکتے! لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایسے حالات و واقعات پیدا ہوتے چلے گئے کہ مسلمانوں کے قدم بادل ناخواستہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقصد محض کشور کشائی نہ تھا بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں عدل و مساوات پر مبنی ایک خدا پرستانہ فلاحی نظام حکومت قائم کرنا تھا جو خدا کے بندوں کے لئے پاکیزہ معیشت، معاشرت اور جملہ سعادتوں اور ترقیوں کا ضامن ہو۔ انہوں نے دنیا کو ایک ایسا مثالی نظام حکومت دیا جس کی مثال اس سے پہلے کہیں روئے زمین پر موجود نہ تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت الٰہیہ کے نظام کا جو نقشہ تیار کیا تھا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس میں رنگ بھر کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ان رنگوں کی دلآویزی آج تک دنیا کو محو حیرت کئے ہوئے ہے۔ یہ شورائی نظام کا عملی نقشہ تھا۔

شورائی نظام

اللہ نے اپنی کتاب مقدس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ ''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اپنے ساتھیوں سے معاملات دنیا میں مشورہ کیا کیجے (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ سورہ آل عمران) نیز سورہ الشوریٰ میں اہل ایمان کی تعریف کرتے ہوئے ان کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی کہ ''وہ اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں'' (وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ۔ آیہ ۳۸)

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق نیز اذان کے متعلق مشورے تاریخی ریکارڈ میں موجود ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیروں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سب سے مقدم تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے فرمایا کرتے تھے کہ ''خدا کی قسم! اگر تم دونوں کسی مسئلے پر متفق ہو جاتے ہو تو میں تمہارے مشورے سے کبھی نہیں ہٹتا۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے سوا دو سالہ دور خلافت میں تمام اہم معاملات میں اہل الرائے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں باقاعدہ مجلس شوریٰ قائم کی جو

سابق الایمان، اہل الرائے مہاجرین و انصار پر مشتمل تھی۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ جب کوئی بہت اہم اور نازک مسئلہ درپیش ہوتا تو مدینہ کے مہاجرین و انصار کے مجمع عام میں پیش کیا جاتا تھا اور کھلی بحث وتمحیص کے بعد اتفاق رائے یا کم سے کم کثرت رائے سے فیصلہ کیا جاتا تھا۔ مثلاً عراق کی فتح کے لئے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا انتخاب، عراق کی مفتوحہ اراضی کا بندوبست وغیرہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ لَا خِلَافَتہ اِلَّا عَنْ مَشْوَرَۃ۔ یعنی باہمی صلاح مشورہ کے بغیر خلافت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن چونکہ آخری ذمہ داری خلیفہ کی تھی۔ اس لئے بعض دفعہ خلیفہ اپنی صوابدید سے بھی فیصلہ کر لیتا تھا۔ ڈاکٹر طہٰ حسین لکھتے ہیں کہ ''میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کچھ اور وفا کرتی تو بلاشبہ آپ مسلمانوں کے لئے شوریٰ کا ایک ایسا نظام تیار کر جاتے جو باقی رہتا اور مسلمانوں کو فساد و اختلاف اور حاکموں کے ظلم و تکبر سے بچاتا۔''[1]

آگے چل کر مزید لکھتے ہی کہ ''فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان یکتا اور یگانہ افراد میں سے ہیں جو انسانیت کو شاذ و نادر ہی نصیب ہوتے ہیں۔ ایسے افراد بعد میں آنے والوں کو تھکا دیتے ہیں اور سخت مشکلات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔''[2]

اس شورائی نظام کے لئے پہلے سے کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کا نظام مستبدانہ اور آمرانہ تھا۔ البتہ عرب کا قبائلی نظام ایک ابتدائی ڈھانچے کے طور پر موجود تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل سے اس ڈھانچے میں ترمیم کر کے اس کے رہنما اصول قرآنی احکام کی روشنی میں متعین کئے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہی کے نقوش پا کی پیروی کر کے اس کی ایک ارتقائی صورت پیدا کر دی اور شوریٰ کو اپنی حکومت کی بنیاد قرار دیا۔ اگرچہ یہ مشورت اہل مدینہ تک محدود رہی کیونکہ تمام اکابر صحابہ وہیں جمع تھے اور عام ذرائع ابلاغ آج کی طرح ترقی یافتہ نہ تھے کہ عام استصواب و مشورت ہو سکے۔

عمر ابوالنصر نے لکھا ہے کہ ''آپ کی یہ عادت تھی کہ عام مسائل کے متعلق مسجد میں لوگوں سے استفسار فرماتے تھے۔ اس کے بعد اپنی اور کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے مجلس شوریٰ میں پیش کرتے تھے۔ اس مجلس شوریٰ میں جو رائے پاس ہو جاتی تھی اسی پر عمل درآمد کیا جاتا تھا۔ اس طریقہ کا نتیجہ تھا کہ آپ کے تمام کام ان سب آرا کا نچوڑ ہوتے تھے۔ جو ملک کے اہل فہم و دانش طبقہ کی طرف سے آپ کو دی جاتی تھیں اور سلطنت کا نظام اس خوبی سے چل رہا تھا کہ آپ کے علاوہ اور کسی خلیفہ یا بادشاہ کے عہد میں نہیں چلا۔'' غیر ملکی باشندوں اور ذمی غیر مسلموں کی آرا سے بھی استفادہ کرنے سے احتراز نہ تھا لیکن انہیں شریک حکومت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اہل شوریٰ نہایت آزادی و بیباکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے اور خلیفہ ان کی آراء کو پورا پورا وزن دیتے تھے۔ لیکن ''چونکہ آخری رائے خلیفہ کی ہوتی تھی ہر معاملے میں قول فیصل اسی کی بات سمجھی جاتی تھی اس لئے حکومت کی تمام سیاسی ذمہ داریاں بھی اسی کو اٹھانا

---

[1] اس باہمی مشورے کی اہمیت کے پیش نظر پوری سورۃ کا نام ہی الشوریٰ قرار دیا گیا اگرچہ اور مضامین واحکام بھی اس میں ہیں۔ مؤلف

[2] الفتنۃ الکبریٰ (اردو ترجمہ)

پڑتی تھیں۔ چنانچہ سارا اقتدار خلیفہ ہی کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ وہ کتاب وسنت کی حدود میں رہ کر قانون بناتا اور نافذ کرتا تھا۔ وہی قاضی بھی ہوتا تھا اور کمانڈر انچیف بھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام ذمہ داریاں بطریق احسن اٹھائیں اور تاریخ نے ان کے نام کو بقائے دوام بخش کر اس کے گرد عظمت وجلال کا ایک تابناک ہالہ بنا دیا'' [1]

حج کے موقع پر آپ صوبائی گورنروں اور فوجی سپہ سالاروں سے بھی مشورہ کرتے تھے جو حکما اکٹھے ہو جاتے تھے۔ عام حجاج کی باتیں اور مشورے بھی آپ توجہ سے سنا کرتے تھے حتیٰ کہ عورتوں کے مشوروں پر بھی کان دھرتے تھے۔ صائب مشورہ کہیں سے اور کسی سے بھی ملے اسے قبول کرنے میں پس وپیش نہیں کرتے تھے۔ لیکن بہر حال آخری فیصلہ خود خلیفہ کا ہوتا تھا۔ خلافت راشدہ میں خاص کر ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ''اپنی پارٹی'' کا موجودہ سیاسی تصور نہ تھا۔ قرآن کی رو سے تمام مسلمان ایک ہی پارٹی یعنی حزب اللہ تھے۔ نہ مختلف سیاسی پارٹیاں تھیں نہ ان کے مختلف اور متضاد سیاسی پروگرام اور اغراض ومقاصد۔ تمام مسلمانوں کا منشور کتاب وسنت تھا۔

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی وفا کرتی تو عین ممکن ہے کہ وہ اصول شورائیت کو انتہائی ترقی یافتہ صورت دے دیتے اور مشورہ طلبی اور مشورہ دہی کو تمام مسلمانوں تک پھیلا دیتے۔ اگرچہ اس زمانے میں آج کل کے تیز رفتار ذرائع ابلاغ ومواصلات اور وسائل حمل ونقل موجود نہ تھے کہ بیک وقت پوری مملکت کے عوام وخواص سے استصواب رائے کیا جا سکتا لیکن وہ اس کی کوشش ضرور کرتے اور کامیابی کی کوئی راہ نکال لیتے۔

تاہم یہ شورائیت آج کل کی نام نہاد جمہوریت بھی نہ تھی جس میں بندوں کو تولنے کی بجائے صرف گنا کرتے ہیں۔ ایک بدکردار شخص اپنی دولت، دھونس، دھاندلی فریب وعیاری اور پراپیگنڈا کے بل بوتے پر عوام کالانعام کے ووٹوں سے انتخاب جیت سکتا ہے، ملک کا وزیر اعظم یا صدر بھی بن سکتا ہے اور پارلیمان میں اپنی پارٹی کی اکثریت، اگرچہ بحیثیت مجموعی کل ووٹوں کا ۲۵ فی صد ہی حاصل کیے ہوں، کے زعم میں ملک وقوم کو جس غلط یا صحیح راستے پر چاہے چلا سکتا ہے اور قانون وضع اور نافذ کر سکتا ہے۔

منتخب وزیر اعظم یا صدر بن کر وہ خصوصی حقوق ومراعات کا اہل ہوتا ہے۔ اپنی پارٹی کے ارکان اور حامیوں کو جیسے چاہے نوازتا ہے۔ حزب اختلاف (اگرچہ اس کے اور حکومتی پارٹی کے ارکان کی تعداد میں دو چار ہی کا فرق کیوں نہ ہو اور حزب اختلاف نے مجموعی ووٹ مقابلتاً زیادہ ہی کیوں نہ حاصل کیے ہوں) کی ایک نہیں سنی جاتی۔ اخباروں اور دوسرے ذرائع ابلاغ پر پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ اسی کے گن گائیں آزادی ضمیر، آزادی رائے، مساوات، حریت، انصاف اور انسانی حقوق کا جنازہ نکال دیا جاتا ہے۔ سیاسی اغوا قتل عام ہو جاتے ہیں۔ مخالفوں پر جھوٹے مقدمے چلا کر انہیں زندان وسلاسل کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وسیع وعریض سلطنت اسلامیہ کا سربراہ اور اپنے وقت کی دنیا کا سب سے بڑا حکمران ہونے کے باوجود اپنے آپ کو عامۃ المسلمین سے برتر نہیں سمجھتے تھے۔ ہر معاملے میں عدل ومساوات کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ اپنے لئے بھی وہی کچھ چاہتے تھے جو دوسروں کے لئے چاہتے تھے۔ انہیں کوئی خصوصی اور استثنائی حقوق و

---

[1] عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ از محمد حسین ہیکل ...... اردو ترجمہ از حبیب اشعر صفحہ ۵۸۷

مراعات حاصل نہ تھے۔ انہوں نے لوگوں کی زبانوں کو لگام بھی نہیں دی تھیں۔ اظہار رائے کی مکمل آزادی تھی۔ معمولی سے معمولی شخص خلیفہ کو برسر عام ٹوک سکتا اور اس پر اعتراض کر کے جواب طلبی کر سکتا تھا۔ اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں ایک دفعہ مجلس شوریٰ کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

''میں نے آپ لوگوں کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا بوجھ ڈالا گیا ہے اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی میں کا ایک فرد ہوں اور آج آپ ہی وہ لوگ ہیں جو حق کا اقرار کرنے والے ہیں آپ میں سے جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے اور جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات لوگوں کے اچھی طرح ذہن نشین کر دی تھی کہ ان پر خلیفہ کی اطاعت اسی وقت تک واجب ہے جب تک وہ قرآن وسنت کی سیدھی راہ پر چلے۔ خلافت سربراہ حکومت اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک قسم کا معاہدہ ہے اور طرفین اس کے پابند۔

ایسے نظام میں لوگ خود آگے بڑھ کر مناصب حکومت طلب نہیں کرتے، نہ حکمران یا خلیفہ کے مقرر کردہ فوجی سپہ سالار حکومت پر قبضہ کر کے مارشل لاء نافذ کرتے ہیں۔ ایسی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اپنی قوم کے معتمد علیہ ہوتے ہیں۔ اسلام ہر قسم کی آمریت خواہ وہ سیاسی ہو یا فوجی یا مذہبی کے خلاف ہے۔ تقویٰ کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ اس کی مثال کانٹے دار جھاڑیوں کے بیچوں بیچ تنگ راستے سے کانٹوں سے اپنا جسم ولباس بچا کر گزر جانے کی ہے۔ اسلامی نظام حکومت میں یہی تقویٰ کارفرما ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عملاً ایسا کر کے دکھا دیا۔ وہ لوگوں کے جسموں پر ہی نہیں ان کے دلوں پر بھی حکومت کرتے تھے۔ ابن خلدون کا قول ہے کہ ''جو حکومت عوام کے دلوں پر حکومت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اسے باقی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ سربراہ مملکت کو قوم کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہونا چاہئے اور اسے ان کے مفادات کے کسٹوڈین کی حیثیت سے کام کرنا چاہئے۔

ایک مغربی دانشور رابرٹ برفو (Robert Briffault) کے بقول ''نشہ اقتدار وہ بلا ہے جس سے انسانی قلب کی ہر حرکت الٹی ہو جاتی ہے، ہر شے ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ ہر نقطہ نگاہ باطل ہو جاتا ہے، ہر فیصلہ میں ذاتی رجحانات کی رنگ آمیزی ہو جاتی ہے۔ ہر معاملہ میں تعصب دخیل ہو جاتا ہے۔ تمام ذہنی سکے فریب کی ٹکسال میں ڈھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ پر فریب اقتدار دل ودماغ پر مستولی ہو جاتا ہے۔''[1]

خلافتی جمہوریت ہی وہ جمہوریت ہے جس کا غیر شعوری طور پر برفو آرزومند ہے اور مغرب کے دوسرے سیاسی مفکرین بھی۔ اس میں ہر انسان کے پاس اتنی قوت ہوتی تھی اور پھر بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اختیارات کی غلط روی کو فوراً روک دے۔ تمام افراد کی حفاظت ہو، کسی کو کسی سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ ہو، باہمی معاملات میں خوشگواری ہو اور افراد کے تنازعات کے فیصلے عدل کی رو سے کئے جائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمام افراد مملکت کی بنیادی

[1] تشکیل انسانیت (The Making of Humanity) بحوالہ ''شاہکار رسالت''

ضروریات روٹی، کپڑے، مکان کی کفیل ہو۔ یہ ہے ایک اچھی حکومت کا آئیڈیل، خلافت فاروقی جس کا روشن نمونہ تھی۔ یہ شورائی حکومت تھی۔

وحدت اقوام

عہد فاروقی میں جو متعدد غیر عرب قومیں مفتوح ہو کر مملکت اسلام میں داخل ہوئیں اور جو مختلف اور متضاد عناصر کا مجموعہ تھیں رنگ، نسل، مذہب، زبان، معاشرت، معیشت، تہذیب وتمدن کے لحاظ سے باہم میل نہ کھاتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان میں ایک ہم آہنگی اور وحدت پیدا کر دی جسے دنیا کی پہلی اقوام متحدہ کہنا چاہئے اور یہ اس لئے ممکن ہو سکا کہ اسلام عدل، احسان، مساوات اور بے تعصبی کی تعلیم دیتا ہے۔ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ فضیلت کی بنیاد صرف اور صرف تقویٰ ہے۔ عدل فاروقی نے سب کو اپنی اپنی جگہ مطمئن کر دیا اور وہ مملکت متحدہ اسلامیہ وجود میں آئی جس کا بھولا بسرا خواب مسلمانان عالم کو موجودہ صدی میں پھر سے سید جمال الدین افغانی اور علامہ محمد اقبال نے یاد دلانے کی کوشش کی۔

بتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی[1]

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے غیر مسلم مقالہ نویس کا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ خراج تحسین ملاحظہ ہو!

"یہ حقیقت یقیناً بڑی تعجب خیز ہے کہ مکہ کے ایک سیدھے سادے باشندے نے کس طرح ایسے دنگ کرنے والے کارنامے سرانجام دیئے۔ اس نے تنہا اس نظام حکومت کے ذریعے جس کے خلاف کسی نے کوئی آواز بلند نہ کی، ان بدوؤں کو نظم وضبط اور قوانین وقواعد کا پابند بنایا جو اس سے قبل نظم وضبط کے نام تک سے آشنا نہ تھے اور ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ حیرت ہے کہ اس نے بدوؤں کے سرداروں کو جن کے ہاتھ میں ان قبائل کا اقتدار تھا کس طرح قابو میں رکھا۔ یہ درست ہے کہ اس قدر وسیع وعریض فتوحات اکیلے عمر رضی اللہ عنہ کا کارنامہ نہ تھا۔ لیکن یہ تنہا اسی کی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا کہ اس نے بڑے بڑے جرنیلوں کو کبھی بے قابو نہ ہونے دیا اور بنو امیہ جیسے طاقتور اور مقتدر قبیلہ تک کی صلاحیتوں سے فائدہ تو اٹھایا لیکن انہیں صاحب اختیار نہیں ہونے دیا۔ اس نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے سپہ سالار کو جس طرح معزول کیا۔ اس سے اس (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے سیاسی تدبر اور اقتدار کی

---

[1] علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کتبۂ مزار افغانستان سے تیار ہو کر آیا تھا اس پر ان کی یہ خوبصورت، معنی خیز اور سبق آموز دو بیتی کندہ ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک وتتاریم چمن زادیم واز یک شاخساریم
تمیز رنگ وبو بر ما حرام است کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

آج افغانستان میں روس اور اس کی دست آموز افغانی حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ مسلمانان عالم کے لئے مقام غور وفکر ہے۔ کاش مسلمان اپنا عالمگیر وفاق قائم کر سکیں جو دشمنوں کے عزائم کو خاک میں ملا دے۔ ربط وضبط ملت بیضا ہے شرق کی نجات۔ مؤلف

محکمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم بلا مبالغہ اسے سیاسی نابغہ کا لقب دیتے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس قسم کے متضاد عناصر پر جن سے یہ جدید مملکت مرکب تھی، وحدت و استحکام کا نقش ثبت کر دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت بظاہر شخصی حکومت کا دور نظر آتا ہے لیکن اس میں ملوکیت کے نشہ و جنون کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔" [1]

اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اخاذ طبیعت اور ذہنی جودت ودیعت کی تھی جس سے کام لے کر انہوں نے قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی مملکت کا ایسا عادلانہ نظام حکومت قائم کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے سیاست، معیشت، معاشرت، تمدن، ثقافت، عدل، مساوات، زہد، تقویٰ روحانیت وغیرہ پر اپنی عبقریت کی چھاپ لگا دی اور اپنے بعد آنے والوں کو تھکا دیا۔ انہوں نے جو نظامِ حکومت قائم کیا بعد کی صدیوں میں اس میں کوئی بہتر تبدیلی پیدا نہ کی جا سکی۔ عرب مسلمانوں کے علاوہ اگر وہ کسی اور قوم میں پیدا ہوئے ہوتے تو شاید ان کی وفات کے بعد ان کی پرستش شروع کر دی جاتی۔ اور جگہ جگہ ان کے مجسمے نصب کیے جاتے لیکن وہ تو اسلام کی برکات میں سے ایک برکت تھے اور ان کی عبقری شخصیت اسی دین خداوندی کی مرہون منت تھی۔

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا
تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

عمر رضی اللہ عنہ ہر لحاظ سے ایک دیو قامت شخصیت تھے۔ انہوں نے مدینہ کی چند سو کنبوں پر مشتمل چھوٹی سی شہری ریاست کو دس سال کے اندر دنیا کی سب سے بڑی اور مثالی سلطنت بنا دیا۔ جس میں سب کے حقوق مساوی تھے۔

سیرت و کردار

جب کوئی منصف مزاج شخص خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب، قوم یا ملک سے ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی، سیرت اور کارناموں کا مطالعہ کرتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ یہ ہے انسان! ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ سراپا انسانیت تھے۔ (He was every inch a man) سر سے پاؤں تک قرآن کے سانچے میں ڈھلے ہوئے انسان۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا مثالی مرد مومن۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

---

[1] ۱۹۳۶ء ایڈیشن صفحہ ۹۸۳

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرور ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورہ رحمٰن

الوالعزم پیغمبروں کے بعد تاریخ میں ایسے انسان دکھائی نہیں دیتے۔ اسی لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔'' اللہ نے عمر رضی اللہ عنہ کو پیغمبری نہیں دی لیکن پیغمبرانہ صفات سے متصف کیا۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت ایک ایسے کثیر الابعاد تر شے ہوئے ہیرے کی مانند تھی جس کا ہر پہلو اپنی جداگانہ آب و تاب اور دلکشی رکھتا ہو اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں خوشگوار قسم کی حیرت آمیز چکا چوند پیدا کرتا ہو۔ وہ ایک ایسے عظیم نابغہ روزگار تھے جو اس خاکدانِ ارضی پر انسانوں کے پیدا ہوتے رہنے کے لئے جواز فراہم کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے پر اپنی ذہانت، فطانت اور عظمت کی چھاپ لگا دی اور آنے والی صدیوں اور نسلوں کے لئے اپنے روشن اور بوقلموں کارناموں سے قابل تقلید نظیریں قائم کیں تاکہ لوگ رہنمائی کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے رہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفا میں کیا خوب لکھا ہے (فارسی سے ترجمہ)

''فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا سینہ ایک ایسے مکان کی مانند ہے جس کے متعدد و مختلف دروازے ہوں۔ اور ہر دروازے پر ایک صاحب کمال بیٹھا ہو۔ ایک دروازے پر سکندر ذوالقرنین اپنے ملک گیری و جہاں ستانی، جمع افواج اور دشمنوں کی جمعیت کو درہم برہم کرنے کے سلیقے اور فن کے ساتھ بیٹھا ہے۔ دوسرے دروازے پر نوشیرواں اپنی نرمی و شفقت و رعیت پروری اور عدل و انصاف کے خصائص کے ساتھ موجود ہے۔ (اگرچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے فضائل کے سلسلے میں نوشیرواں کا ذکر کرنا سوئے ادب ہے) ایک اور دروازے پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ احکام فقہ و فتاویٰ کے علم کے ساتھ تشریف فرما ہے ایک دروازے پر سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ یا خواجہ بہاؤ الدین رحمۃ اللہ علیہ جیسا مرشد کامل بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ کسی دروازے پر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسا محدث موجود ہے اور کسی پر جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ یا شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جیسا حکیم و صوفی۔ لوگ اس گھر کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ ہر ضرورت مند اپنی ضرورت کے مطابق صاحب فن و کمال سے رجوع کرتا ہے اور اپنی مراد پاتا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک ایسی جامع کمالات ہستی تھے کہ مؤرخ کو ان کے گوناگوں کمالات و اوصاف کا احاطہ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ انہیں ایسا ہونا ہی چاہئے تھا۔ کیونکہ وہ دعائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب تھے۔ وہ بیک وقت ایک عظیم فاتح و کشور کشا، بینظیر منتظم رعایا پرور، عدل و مساوات کو بلا رو رعایت نافذ کرنے والے، امور حکومت اور فلاح عامہ کے لئے دن رات دلسوزی اور جگر کاری سے کام کرنے والے تھے۔ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل کی

وسیع وعظیم سلطنت کا مقتدر سربراہ ہوکر بھی شہنشاہی کی خوبو سے دور، کبر ونخوت سے خالی درویشانہ زندگی بسر کرنے والے تھے۔ روکھی سوکھی کھاتے، موٹا جھوٹا پیوند لگا لباس پہنتے اور مسجد کے ننگے گرد آلود فرش پر سو رہنے والا یہ انسان اختیارات اور قوت وشوکت کے لحاظ سے اپنے وقت کا سب سے بڑا فرمانروا تھا۔ دشمن اس کا نام سن کر کانپتے تھے۔ لیکن وہ اپنی ذمہ داریوں کے احساس کے بوجھ تلے دبا ہوا متفکرانہ زندگی گزارتا تھا۔ رعایا چین سے سوتی اور وہ رعایا کے معاملات کی فکر میں راتوں کو بھی جاگتا تھا۔ وہ مسجد نبوی کے فرش پر بیٹھ کر اہل شوریٰ سے صلاح مشورے کرتا، لوگوں کی شکایتیں سنتا اور ان کا ازالہ کرتا۔ اپنے عمال کے نام احکام جاری کرتا۔ قیصر وکسریٰ کے سفیر بھی وہیں آکر باریابی حاصل کرتے اور اس کی سادگی، بے نفسی اور شان وشوکت سے عاری زندگی کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے ہر وقت متفکر اور اللہ سے دست بدعا رہتا۔ رعایا کے معمولی سے معمولی حالات ومعاملات سے بھی باخبر رہتا اور اصلاح حال کے لئے ضروری اقدامات کرتا۔

ایسا ذہین، فطین، نکتہ رس، دوربین، معاملہ فہم، صائب الرائے، پختہ کار، مدبر، عدل گستر، خدا ترس، قوی الجثہ، زاہد پاکباز، وسیع العلم، قرآن وسنت کی روح کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے والا، تفقہ فی الدین سے کام لینے والا، مساوات کو عملاً نافذ کرنے والا، خوف خدا سے رونے والا کوئی دوسرا شخص تاریخ میں نہیں ملتا۔ وہ بلاغت عقل وفکر کے نقطہ کمال پر تھے۔ انہوں نے مومن مخلص کی قوت وفراست، جانباز مجاہد کی اوالعزمی، جہاندیدہ بزرگ کی تجربہ کاری اور فطری قابلیت رکھنے والے ہوشیار شخص کی زیرکی سے کام لیتے ہوئے دس سال کی مختصر مدت میں قیصر وکسریٰ کی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ انہوں نے عرب کی وادئ غیر ذی زرع کے بدوؤں اور شتر بانوں کو قیصر و کسریٰ کا جانشین بنادیا۔ وہ کارنامے انجام دیئے جو بڑی منظم حکومتوں کے لئے بھی انتہائی دشوار تھے۔

وہ ایک عظیم سیاستدان، ماہر منتظم، مدبر، فقیہ اور مجتہد تھے۔ یہ سب جناب سید المرسلین ورحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور نظر کیمیا اثر کا فیضان تھا۔ جس نے مس خام کو کندن بنادیا۔

عہد رسالت کے بعد عہد فاروقی اسلام بلکہ دنیا کی تاریخ کا روشن ترین دور ہے ایک منارۂ نور جس سے ہر زمانے اور ہر خطے میں فلاح انسانیت کے لئے رہنمائی مل سکتی ہے۔ ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ ”اگر عمر رضی اللہ عنہ چند سال اور زندہ رہتے تو دوتہائی کرۂ ارض مسلمانوں کے زیرنگین ہوتا۔ جہاں کہیں اسلام پہنچا تمام آبادیاں مسلمان ہوگئیں اور وقت کی مہذب دنیا کو اسلام کے آستانہ پر جھکنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی گفتار اور کردار میں زمین پر حضرت حق کا ایک زبردست نشان تھے۔ ان کی سادہ وپرکار زندگی اور درخشاں کارناموں کا مطالعہ انسانی دل ودماغ کو چکرادیتا اور حیرت زدہ کردیتا ہے اور حالی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے قوموں کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

صورتِ شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

عہد فاروقی میں نہ صرف ملت اسلامیہ ہر زمان اپنے عمل کا حساب کرتی رہی بلکہ خود فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ذاتی مثال اس کے سامنے رہی۔ ان کا سا محاسبہ نفس کرنے والا کوئی دوسرا حکمران دکھائی نہیں دیتا۔ وہ پہلے اپنا محاسبہ کرتے تھے پھر اپنے عمالِ حکومت کا اور پھر رعایا کا۔ اسی لئے دنیا نیکی اور سعادت کے نور سے بھر گئی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اللہ نے عمر کی زبان اور دل کو حق سے نوازا ہے۔ وہ ناطق بالصواب ہے۔ چنانچہ ان سے غیر حق قول و فعل سرزد ہونے کی مثالیں شاذ ہیں۔ اور پھر ان کی طرف سے لوگوں کو دعوت عام تھی کہ بلا جھجک ان کے قول و فعل پر نکتہ چینی کریں اور غلط چلیں تو سیدھا کر دیں۔ ان کے اعمال حکومت دور دراز جگہوں پر بیٹھے ہوئے یوں محسوس کرتے تھے جیسے خلیفہ کی نظریں ان پر لگی ہوں اور انہیں دیکھ رہی ہوں۔

محاسبۂ نفس

وہ دوسروں سے پہلے اپنا محاسبہ کرتے تھے۔ کبھی اپنی ذات کو واجب الرحم اور مستحق آرام و راحت نہ جانا۔ کبر نفس اور غرور حکومت سے بچنے کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے ابتدائی حالات اپنے آپ کو یاد دلاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے گھر کے پاس سے گزرنے والوں نے سنا کہ آپ گھر کے اندر اپنے آپ سے یوں مخاطب تھے۔

''خطاب کا بیٹا امیر المومنین بنا پھرتا ہے۔ ابن خطاب ہوش کر۔ اگر تو اللہ کی اطاعت نہ کرے گا تو تجھے عذاب دیا جائے گا۔''

ایک دن مسلمان آپ کے گرد جمع تھے کہ آپ اچانک کھڑے ہو گئے۔ اور صرف یہ چند فقرے کہے کہ ''صاحبو! ایک وقت ایسا تھا کہ میں سخت نادار اور تہی دست تھا۔ لوگوں کے لئے پانی بھر دیا کرتا اور مزدوری میں جو چھوہارے ملتے وہی کھا کر گزارہ کرتا تھا۔'' لوگ حیران ہوئے کہ ایسی بات کہنے کا یہ کون سا موقع تھا؟ فرمایا کہ میری طبیعت میں کچھ غرور پیدا ہو گیا تھا۔ یہ اس کا علاج تھا۔''

ایک دفعہ سفر حج کے دوران میں مقام ضجنان سے گزرے تو آپ پر رقت طاری ہو گئی۔ اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔ ''یہ وہ مقام ہے جہاں میں نمدے کا کرتہ پہنے اپنے باپ خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور اگر سخت گرمی اور بھاگ دوڑ سے تھک کر قدرے بیٹھ کر سستانا چاہتا تو میرا باپ خطاب مجھ پر تشدد کرتا تھا۔ میں نے خطاب سے زیادہ سخت دل اور سخت گیر کسی کو نہیں دیکھا۔ لیکن آج یہ عالم ہے کہ خدا کے سوا مجھ پر کوئی حکمران نہیں۔''

سادہ زندگی اور معاشرت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خوراک، لباس اور بود و باش کا معیار رعایا کے ایک عام انسان کی مانند تھا۔ بلکہ بعض لحاظ سے اس سے بھی کمتر۔ آپ اپنی طرز معاشرت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز معاشرت سے سر مو تجاوز نہ کرتے۔ عام طور پر گیہوں کے بے چھنے آٹے کی روٹی اور روغن زیتون استعمال کرتے تھے۔ کبھی کبھی گوشت، دودھ، ترکاری

اور سرکہ بھی۔ قحط کے سال جو کی روٹی کھاتے رہے۔ فتوحات کے بعد جب مدینہ میں دولت کی ریل پیل ہوئی تو آپ کو بھی دوسروں کے ساتھ حصہ ملتا تھا۔ اس کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر و فاقہ کی زندگی کو پیش نظر رکھتے۔ ایک دفعہ آپ کی صاحب زادی ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ کے پاس قیصر و کسریٰ کے سفیر اور دوسرے معزز سردار آتے ہیں۔ اب اللہ نے کشائش عطا کی ہے۔ اس لئے اب آپ عمدہ غذا اور لباس استعمال کر سکتے ہیں۔ فرمایا کہ ''بیٹی! کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسرت کی زندگی کو بھول گئیں؟ خدا کی قسم! میں اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر ہی چلوں گا۔ تا کہ آخرت کی فراغت اور خوشحالی نصیب ہو۔'' باہر سے آنے والے عمالِ حکومت جو عراق، شام اور فلسطین مصر میں عمدہ غذا کے عادی ہو گئے تھے۔ مدینہ میں کبھی آپ کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ جاتے تو آپ کی روکھی سوکھی غذا ان کے حلق سے نہ اترتی۔ لباس بھی سادہ اور موٹا جھوٹا ہوتا تھا جس میں کئی کئی پیوند لگے ہوتے تھے۔ پاؤں میں پھٹی جوتیاں۔ ایک دفعہ دیر تک گھر میں رہے۔ لوگ انتظار کرتے رہے۔ باہر آئے تو بتایا کہ کپڑے پہننے کو نہ تھے، دھو کر سوکھنے کو ڈالے تھے، اس لئے دیر ہو گئی۔ سفر شام میں موٹے کپڑے کا ایک ہی کرتہ تھا۔ وہ میلا ہو گیا اور پھٹ گیا۔ عیسائی بطریق کو دھونے اور مرمت کرنے کے لئے دیا۔ اس نے اسے دھونے اور مرمت کرنے کے علاوہ اپنی طرف سے ایک قیمتی لباس پیش کیا۔ مگر آپؓ نے لینے سے انکار کر دیا اور یہ کہہ کر اپنا کرتہ پہن لیا کہ اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے۔ آپ کا سادہ اور پیوند لگا لباس اور درویشانہ وضع دیکھ کر استقبال کو آنے والے مسلمان امرائے لشکر جو لباس ہائے فاخرہ پہنے ہوئے تھے، دل ہی دل میں شرمائے جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ آپ قیمتی لباس پہن لیں جو بآسانی دستیاب تھا مگر آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ''ہم کو جو عزت اللہ نے دی ہے وہ اسلام کی وجہ سے ہے اور وہی ہمارے لئے کافی ہے۔''

غیر ملکوں کے سفیر آتے تھے تو آپ کو موٹے جھوٹے پیوند لگے لباس میں مسجد کے فرش خاک پر یا مدینہ کے باہر کسی درخت کے سائے تلے یکہ و تنہا لیٹے ہوئے دیکھ کر انگشت بدندان رہ جاتے تھے۔ شام و فلسطین کی فتح کے بعد قیصر روم سے سفارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے اور سفیروں کا باہم تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ پہلی دفعہ جب رومی سفیر مدینہ آیا تو اس کا خیال تھا کہ اتنا بڑا حکمران اور فاتح ایک عالی شان محل میں رہتا ہو گا۔ پر شکوہ دربار ہو گا، امیر و وزیر، حاجب، دربان اور محافظ ہوں گے لیکن وہاں اسے شان و شوکت کے یہ اسباب کہیں دکھائی نہ دیئے۔

اس نے خلیفہ کو مدینہ کے باہر ایک درخت کے سائے تلے فرش خاک پر اپنے پیوند لگے گاڑھے کے لباس میں سوتا پایا۔ اور وہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ ''عمر! تم اپنی رعایا کے خیر خواہ اور دمساز ہو اور اس سے وہی سلوک کرتے ہو جو اپنے لئے روا رکھتے ہو۔ عدل اور مساوات سے کام لیتے ہو۔ اس لئے تم رعایا کے دلوں پر حکومت کرتے ہو اور یوں کسی حملہ آور قاتل کے خوف سے بے پروا ہو کر سوتے ہو۔ لیکن قیصر خود اپنی رعایا سے خائف رہتا اور عالی شان اور مضبوط محلوں کے اندر مسلح محافظوں کے پہرے میں سوتا ہے۔ تم نے دلوں کو فتح کیا ہے۔ اس لئے فاتح زمانہ ہو۔ قیصر کبھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر میں سفیر نہ ہوتا اور ادائے فرض کے لئے مجھے قسطنطنیہ واپس نہ جانا ہوتا تو میں ابھی مسلمان ہو کر یہیں رہ جاتا۔''

چونکہ آپ خود امیر الحج ہوا کرتے تھے اس لئے حج کے اخراجات بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے لیکن آپ جزرسی سے کام لیتے اور کم سے کم خرچ کرتے۔ کوئی خیمہ وخرگاہ ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ پڑاؤ کرتے تو کنکریلی زمین پر کسی پتھر کا سرہانہ بنا کر لیٹ جاتے۔ چلچلاتی دھوپ میں کسی ببول کے درخت پر اپنی چادر تان کر اس کے نیچے بیٹھ جاتے۔ ایک ایسے ہی سفر کے انجام پر جب اپنے اخراجات حج کا اندازہ لگوایا تو معلوم ہوا کہ سولہ دینار خرچ ہوئے۔ فرمایا ہم نے بیت المال کی بڑی رقم خرچ کر دی یعنی تقریباً پچاس روپے۔

شام کے ایک سفر میں صرف ایک غلام اور ایک اونٹ ساتھ تھا۔ اسی پر خود اور غلام باری باری سوار ہوتے تھے جب شہر کے سامنے پہنچے تو غلام کی باری تھی وہ اونٹ پر سوار تھا اور خلیفہ اس کی مہار تھامے پیدل چل رہے تھے۔

ذرا آج کے حکمرانوں، وہ مطلق العنان آمر ہوں یا منتخب شدہ صدر یا وزیر اعظم، کو چشم تصور میں لایئے اور ان کے کروڑوں کے اخراجات کا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے برائے نام اخراجات سے مقابلہ کیجئے۔ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا! معاشرتی زندگی میں آپ ہر قسم کے احساس برتری وکمتری سے پاک تھے۔ صرف مساوات کا سبق یاد تھا۔

ذریعۂ معاش

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہجرت سے پہلے مکہ میں اور ہجرت کے بعد مدینہ کی ابتدائی زندگی میں تجارت کرتے تھے لیکن صرف اسی قدر کہ اہل وعیال کی کفالت ہو سکے۔ انہیں مال ودولت کے انبار جمع کرنے کی کبھی خواہش نہ رہی۔ بڑے غیور طبع، سیر چشم اور قانع تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی آپ کو کوئی چیز از قبیل نقد وجنس وغیرہ مرحمت فرماتے تو عرض کرتے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ''اس کے مجھ سے کہیں زیادہ مستحق موجود ہیں۔'' رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ اس وقت تو یہ لے لو پھر چاہے کسی کو دے دینا۔ فتح خیبر کے بعد ثمغ نامی ایک زرخیز قطعۂ اراضی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے راہ خدا میں وقف کر دیا جس کی آمدنی فقرائے ذوی القربیٰ، غلاموں، مہمانوں اور مسافروں پر خرچ ہوتی تھی۔ راہ اسلام میں یہ پہلا وقف تھا۔

معاشی مساوات کا اعلیٰ نمونہ

خلیفہ ہونے کے چند سال بعد تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے کچھ نہیں لیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر صحابہ کے مشورے سے معمولی خوراک اور لباس کے لئے روزینہ مقرر ہو گیا۔ ۱۵ھ میں جب سب لوگوں کے وظیفے مقرر کیے گئے تو آپ کے بھی پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر ہو گئے۔ اس میں سے بھی اپنے حاجت مند رشتہ داروں اور دوسرے محتاجوں کی مدد کرتے اور مقروض رہتے۔ وفات کے وقت آپ چھیاسی ہزار درہم کے مقروض تھے۔ یہ قرضہ آپ کا مکان بیچ کر ادا کیا گیا۔ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا حکمران اور مقروض! ذرا سوچئے اور آج کے حکمرانوں کو اپنی چشم تصور کے سامنے لایئے۔ آپ نے بار ہا بر سر عام فرمایا کہ مسلمانوں کے مال میں میرا اتنا ہی حق ہے جتنا ایک یتیم کے مال میں متوفی کا ہوتا ہے۔ ضرورت ہو گی تو بقدر کفاف لوں گا ورنہ نہیں۔ ایک دفعہ فرمایا کہ مسلمانوں کے مال میں سے مجھے صرف دو جوڑے، کپڑے ایک جاڑوں کے لئے ایک گرمیوں

کے لئے اور حج وعمرہ کے لئے ایک اونٹ لینا جائز ہے۔اس کے علاوہ اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے قریش کے متوسط گھرانوں کے معیار زندگی کے مطابق کھانے پینے کا سامان۔ پھر میں کسی دوسرے مسلمان کی طرح ایک عام فرد ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تو فارغ البالی اور عیش کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔لیکن ان کے پیش نظر اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔انہوں نے خلافت کو ایک بہت کڑا امتحان سمجھا اور اس پر تورا اترنے کی کوشش کی۔فرمایا کرتے اے اللہ! میرے رزق کی اتنی افراط بھی نہ ہو کہ میں تجھ سے سرکشی اختیار کرنے لگ جاؤں۔

علامہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے کہ ''آپ اللہ سے بہت ڈرتے، سادہ زندگی بسر کرتے اور معمولی خوراک کھاتے۔ بایں ہمہ دین حق کے تقاضوں کو پورا کرنے میں بڑے مستعد اور شدید تھے۔سادگی کا یہ عالم تھا کہ لباس میں خود چمڑے کے پیوند لگا لیتے۔پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ اٹھا لیتے، گدھے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو جاتے بہت کم ہنستے اور کبھی کسی سے مذاق نہ کرتے۔آپ کی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی۔کفی بالموت واعظا یا عمر'' (اے عمر تیرے لئے موت کا ناصح ہونا کافی ہے)

احساس ذمہ داری

عنان خلافت سنبھالنے کے بعد آپ کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب آ گیا۔دعا مانگی ''اے خدا میں سخت ہوں مجھے نرم کر دے'' چنانچہ مزاج بہت اعتدال پر آ گیا اور ذمہ داری کا انتہائی شعور بیدار ہو گیا۔سید القوم تھے۔مگر خادم القوم بن کر رہے۔انہوں نے جس احساس ذمہ داری، بیداریٔ ضمیر، فرض شناسی، خیر خواہی ملت، خدا خوفی اور بے نفسی کا مظاہرہ کیا، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ملی مصالح اور فلاح عوام کے مقابلے میں اپنی ذات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ہمیشہ خائف رہتے کہ کہیں خدا کے نزدیک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اپنے آپ کو عام لوگوں سے ممتاز اور معزز سمجھتے رہے۔ ہمیشہ یہ خیال رکھا کہ آپ کا معیار زندگی بے بضاعت لوگوں کے معیار سے بڑھنے نہ پائے کیونکہ اسی طریقے سے آپ کو ناداروں، مفلسوں اور بے سہارا لوگوں کے رنج وراحت کے متعلق صحیح طور پر محسوس ہو سکتا تھا اور ان کی تکالیف کے ازالہ کی تدابیر کی جا سکتی تھیں۔اس بات کا بھی خیال رکھتے کہ لوگ عیش پرستی اور تن آسانی میں مبتلا ہو کر سادگی اور جدوجہد کی خصوصیات سے محروم نہ ہو جائیں۔لوگوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت پر بھی کڑی نظر رکھتے۔

لوگوں کا حال چال اور دکھ سکھ معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے آپ ہی نے راتوں کو گشت لگانا شروع کیا۔لوگوں کی تکالیف دیکھ کر فوری طور پر ان کا تدارک کرتے، کسی سرخ فیتے کے صبر آزما تاخیری عمل کا کوئی سوال نہ تھا۔ پہلے باب میں ان کے احساس فرض اور انسانی ہمدردی کی چند مثالیں دی جا چکی ہیں۔

باریابی عام............آزادیٔ اظہار

آپ نے دروازے پر کبھی کوئی حاجب ودربان نہیں رکھا نہ ذاتی محافظ مقرر کئے۔ ہر کہہ ومہ کو آپ تک پہنچنا

آسان تھا۔کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ہر نماز کے بعد مسجد نبوی کے صحن میں بیٹھ جاتے۔لوگ آزادی سے اپنی شکایات اور ضروریات بیان کرتے۔آپ توجہ سے سنتے اور تدارک فرماتے۔لوگ سرراہ بھی روک لیتے اور آپ تحمل سے ان کی بات سنتے اور ضروری کارروائی کرتے۔نرم دلی، دل سوزی اور احساس فرض کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مرد،عورت کی باتیں بھی اتنی ہی توجہ سے سنتے جتنی کسی بڑے سے بڑے شخص کی۔اعتراضات کا برا نہ مانتے۔ان کا جواب دیتے اور اپنے طرز عمل کی وضاحت کرتے۔ ہر خاص و عام کو خلیفہ اور حکومت پر نکتہ چینی کرنے کی اجازت تھی بلکہ آپ اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔آزادی، حق گوئی، بے باکی اور خود داری کو پسند کرتے۔ ذاتی، سیاسی، فوجی، ملکی، ملی مصالح کی بنا پر لوگوں کی زبان بندی نہیں کی نہ کسی قسم کی سنسرشپ نافذ کی۔نہ خفیہ پولیس کو لوگوں کے پیچھے لگایا۔نہ اعتراض کرنے والوں یا مزعومہ مخالفوں کو قید و بند میں ڈالا۔نہ کسی کو راتوں رات غائب کرایا، نہ امتناع نظر بندی کا طریقہ رائج کیا۔نہ کسی معترض یا مخالف کے بیوی بچوں کو تعذیب کے شکنجوں میں کسا، نہ کسی کے اموال واملاک ضبط کئے۔اذنِ عام تھا ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے!''

ایک دفعہ جب آپ مجمع عام میں تقریر کر رہے تھے تو ایک معمولی شخص نے بار بار یہ کہہ کر مداخلت کی کہ اے عمر! اللہ سے ڈر! لوگوں نے اسے کہا کہ اب بس کر، بہت ہوگیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسے کہنے دو۔اگر یہ لوگ نہیں کہیں گے تو یہ بے مصرف ہیں اور اگر ہم نہ سنیں گے تو ہم کسی کام کے نہیں۔

ایک دفعہ چند صحابہ کے ساتھ کسی بستی کی طرف جا رہے تھے۔ایک بوڑھی خاتون راستہ میں ملیں آپ نے انہیں سلام کیا۔وہ باتیں کرنے لگیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑی توجہ سے سنتے رہے۔پھر کہا کہ مجھے کچھ نصیحت کرو۔ خاتون نے بلا ہچکچاہٹ نصیحتوں کا دفتر کھول دیا اور کہا کہ ''اے عمر! جب میں نے تم کو عکاظ کے بازار میں دیکھا۔ اس وقت تم عمیر کہلاتے تھے۔لاٹھی ہاتھ میں لئے بکریاں چراتے پھرتے تھے۔پھر کچھ زیادہ مدت نہ گزری کہ تم عمر کہلانے لگے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ تم امیر المومنین کہے جانے لگے۔ ذرا رعیت کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرتا ہے اس کے لئے دور کا آدمی بھی قریب کے رشتہ دار کی طرح ہوتا ہے۔'' اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک رفیق نے کہا کہ ''اے عورت! تو نے امیر المومنین کے ساتھ بہت زبان درازی کی۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''کہ انہیں کہنے دو۔ جانتے بھی ہو یہ کون ہیں؟ ان کی بات تو سات آسمانوں کے اوپر سنی گئی تھی۔عمر کو بدرجہ اولیٰ سننی چاہئے۔اگر یہ رات تک مجھے کھڑا رکھتیں تو میں کھڑا رہتا۔بس نمازوں کے اوقات میں ان سے معذرت کر لیتا۔یہ خولہ رضی اللہ عنہا ہیں۔''[1]

خدمت خلق

خدمت خلق، انسانی ہمدردی اور احساس فرض کے ایسے بے شمار واقعات ہیں۔ بیواؤں، یتیموں، محتاجوں،

---

[1] یہ بزرگ صحابیہ حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا تھیں۔حضرت اوس بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کی بیوی۔اٹھائیسویں پارے کی پہلی صورت (مجادلہ) انہی کے واقعہ ظہار پر نازل ہوئی تھی۔اللہ نے ان کی فریاد سن لی تھی اور ظہار کے بارے میں احکام نازل ہوئے۔مؤلف

معذوروں، لاوارثوں، مصیبت زدوں کی تکلیف سے آپ پر خواب و خور حرام ہو جاتا تھا۔ جب تک ان کی تکلیف دور نہ کر لیتے چین نہ آتا۔ بیواؤں اور مجاہدین کے اہل و عیال کی ذاتی طور پر بہت خبر گیری کرتے۔ خود مشکیں بھر بھر کی کنویں سے پانی اور بازار سے سودا سلف لا دیتے۔ محاذ جنگ سے مجاہدین کے خط آتے تو خود ان کے گھر پہنچاتے۔ اگر گھر میں کوئی لکھنے والا نہ ہوتا تو خود ان کی دہلیز پر بیٹھ کر مجاہدین کی بیویوں کی طرف سے ان کے شوہروں کو خط لکھ دیتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ اگر میں زندہ رہا تو مدینہ تو ایک طرف عراق تک کی بیواؤں کو ایسا بنا دوں گا کہ میرے بعد کسی کی محتاج نہ رہیں۔ مدینہ کے باہر ایک اندھی محتاج بڑھیا رہتی تھی اس کا کام کاج خود کر آتے اور ضرورت کی اشیاء پہنچاتے۔

ایک موقع پر مدینہ کے بازار میں ایک نوجوان عورت نے آپ کو سر راہ روک لیا اور کہا کہ ”امیر المومنین! میں بیوہ ہوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ جن کے لئے کھانے کپڑے کا کوئی سامان نہیں۔ میں خفاف بن ایماء انصاری کی بیٹی ہوں جو حدیبیہ میں رسول اللہ کے ساتھ تھے۔“ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بیوہ کی درد بھری داستان سنی۔ پھر اسے تھوڑی دیر رکنے کو کہا۔ واپس آئے اور بیت المال سے آٹا، کھجوریں، گھی، کپڑا اور دوسری اشیائے ضرورت لے کر اونٹ پر لادیں اور اس کے پاس لے گئے۔ کہا ”اے میری بیٹی! یہ اونٹ اور سامانِ رسد تیرے لئے ہے۔ اسے لے جا، آئندہ تمام ضروری سامان تیرے گھر پہنچ جایا کرے گا۔“

سفر شام سے واپسی پر راستے سے ذرا ہٹ کر ایک خیمہ دیکھا۔ اونٹ روک کر وہاں گئے۔ ایک عمر رسیدہ نابینا عورت موجود تھی۔ اس سے پوچھا خلیفہ کے متعلق کچھ جانتی ہو؟ اس نے جواب دیا ”اتنا معلوم ہے کہ وہ شام سے واپس چل پڑا ہے۔ خدا اس کا کبھی بھلا نہ کرے۔ اس سے مجھے کبھی کچھ نہیں ملا۔“ آپ نے فرمایا کہ تم اتنی دور غیر آبادی جگہ رہتی ہو۔ خلیفہ کو کیا معلوم کہ تمہاری ضروریات کیا ہیں؟ بڑھیا نے کہا کہ اگر وہ میری خبر گیری نہیں کر سکتا تو خلیفہ کیوں بنا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ اس کی ضروریات معلوم کر کے سب کچھ فراہم کر دیا اور آئندہ کے لئے بھی باقاعدہ فراہمی کا انتظام کر دیا۔ عورت خوش ہو گئی اور کہا کہ خلیفہ ہونے کے لائق تم ہو نہ کہ عمر رضی اللہ عنہ۔

ایک دفعہ مدینہ کے باہر ایک تجارتی قافلہ اترا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اہل قافلہ تھکے ماندے ہیں۔ آؤ ہم دونوں ان کی پہرہ داری کریں چنانچہ دونوں بزرگ رات بھر پہرہ دیتے رہے۔

ایک دفعہ ایک بوڑھے اور کمزور ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا۔ وجہ پوچھی تو اس نے کہا مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور میرے پاس کچھ نہیں۔ جزیہ کی ادائیگی کے لئے بھیک مانگتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت متاثر ہوئے۔ اسے اپنے ساتھ گھر لائے۔ کھلایا پلایا، بیت المال سے اس کی ضروریات پوری کیں اور اس کا روزینہ مقرر کر دیا۔ فرمایا یہ ٹھیک نہیں کہ اہل ذمہ کو ان کے بڑھاپے اور کمزوری میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے۔

بیت المال

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بیت المال کو مسلمانوں کی امانت سمجھتے تھے۔ ایک پیسہ بھی بیجا خرچ نہیں ہونے پاتا تھا۔

مالِ غنیمت کے خمس کے علاوہ خراج، عشر، جزیہ اور عشور کی بھاری رقوم دھڑا دھڑ آ رہی تھیں۔ اور مستحقین میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ مگر عمر رضی اللہ عنہ وہی دو درہم روزانہ اور کپڑوں کے دو جوڑے سالانہ لیتے تھے اور وہ بھی جب اپنا مال بقدر کفاف موجود نہ ہوتا۔ بیت المال سے تمام مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، لونڈیوں، غلاموں اور از کار رفتہ ذمیوں کے روزینے مقرر کر دیئے تھے۔ صدقات وصول کرنے والوں کو تاکیدی حکم تھا کہ وصولی میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھیں۔ ہر قبیلے کے فقراء کو اس کے صدقات واپس کئے جائیں تا کہ وہ سوال کی ذلت سے بچ سکیں۔ پھر جو کچھ بچ رہے وہ مرکزی بیت المال کے لئے مدینہ بھیج دیں۔ بیت المال میں جمع شدہ رقوم میں سے فقرا، مساکین، مسافروں، مقروضوں کی مدد کرتے، غلاموں کی گردنیں چھڑانے اور مجاہدین کے لئے سامان جنگ مہیا کرنے کے لئے خرچ کیا جاتا۔ فرمایا کرتے کہ زکوٰۃ، خراج، عشر، جزیہ، خمس، عشور وغیرہ محاصل مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہیں۔ کسی ایک فرد یا ایک جماعت کو نہیں دیئے جا سکتے۔ ان اموال کی حفاظت اور مستحقین تک پہنچانے کی ذمہ داری خود خلیفہ کے سر ہے۔ اگر صدقات کے اونٹوں میں سے کوئی بھاگ جائے یا اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو میں ڈرتا ہوں کہ قیامت کے دن اللہ مجھ سے باز پرس کرے گا۔ عام حاجت مندوں کو بیت المال سے بلا جھجک دیتے تھے لیکن اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال کے لئے بڑا سخت معیار قائم کر رکھا تھا۔ ایک دفعہ جب بہت سا مالِ غنیمت آیا تو آپ کی صاحب زادی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں اور فرمایا کہ ''امیر المومنین! میں ذوی القربیٰ میں ہوں، میرا حق دیجئے۔'' فرمایا، ''بیٹی! تیرا حق میرے ذاتی مال میں ہے نہ کہ مالِ غنیمت میں۔ تو نے اپنے باپ کو دھوکا دینا چاہا۔'' وہ دوٹوک اور روکھا جواب سن کر خفیف ہو کر واپس چلی گئیں۔ اسی طرح ایک دفعہ آپ کے خسر مالِ غنیمت میں سے کچھ لینے آئے تو ڈانٹ دیا۔ پھر اپنے ذاتی مال سے ان کی ضروریات پوری کر دی۔ ایک دفعہ آپ بیمار ہو گئے۔ طبیب نے علاج کے طور پر شہد تجویز کیا۔ بیت المال میں شہد موجود تھا۔ آپ نے مسجد نبوی میں مسلمانوں کے مجمع میں جا کر کہا کہ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں تھوڑا سا شہد لے لوں۔ بہت معمولی سی چیز تھی۔ لیکن تقویٰ، دیانت اور احساس ذمہ داری کا تقاضا یہی تھا کہ مسلمانوں کی امانت میں سے ان کی اجازت کے بغیر کچھ نہ لیا جائے۔

ایک دفعہ سرکاری سفیر قیصر روم کے پاس جانے لگا تو حضرت ام کلثوم نے جو آپ کی چہیتی زوجہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی صاحب زادی تھیں، سفیر کے ہاتھ قیصر کی ملکہ کے لئے اپنی طرف سے عطر کی چند شیشیاں بطور تحفہ بھیج دیں۔ قیصر کی ملکہ نے جوابی تحفہ کے طور پر شیشوں میں جواہرات بھر کر بھیجے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو حضرت ام کلثوم سے فرمایا کہ اگر چہ عطر تمہارا تھا لیکن اسے سرکاری سفیر لے کر گیا اور اس کے مصارف بیت المال سے ادا کئے گئے۔ لہٰذا یہ جواہرات بیت المال کا حق ہیں۔ تم صرف عطر کی قیمت لے سکتی ہو۔ چنانچہ عطر کی قیمت انہیں دے دی اور جواہرات بیت المال میں داخل کر دیئے۔ سرکاری تحائف کا یہ اصول فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر ان کی نواسی اور اپنی بیوی پر جاری کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ کسی صاحب کو کسی علاقے کا محصل بنا کر بھیجا تھا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نقد

وجنس لے کر آئے۔ اس کے دو حصے کر کے ایک کے متعلق کہا یہ تو وہ ہے جو میں نے لوگوں سے بیت المال کے حق کے طور پر وصول کیا اور یہ دوسرا وہ ہے جو لوگوں نے مجھے تحفے کے طور پر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان حلم وکرم تو نرالی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محصل سے براہ راست تو کچھ نہ فرمایا لیکن موجود مسلمانوں سے ایک عمومی بات کہی کہ بعض لوگوں کو جب محصل بنا کر بھیجا جاتا ہے تو واپس آ کر کہتے ہیں کہ علاقہ کے لوگوں نے انہیں یہ اور یہ تحفے دیئے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ تحفے انہیں ان کی سرکاری حیثیت میں ملے ورنہ جب وہ ایک عام آدمی کی طرح اپنے گھر میں رہتے تھے یا اپنی ذاتی حیثیت میں لوگوں سے ملتے تھے تو لوگ انہیں کتنے تحفے دیتے تھے؟

ایک اور واقعہ سنیئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ایک اونٹ خرید کر سرکاری چراگاہ میں چرنے کے لئے بھیج دیا۔ جب وہاں چر چگ کر خوب موٹا تازہ ہو گیا تو بازار میں بیچنے کے لئے بھیج دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بازاروں، منڈیوں میں گھومتے رہتے تھے۔ جب انہوں نے خوب پلا ہوا فربہ اونٹ دیکھا تو پوچھا کس کا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ آپ کے صاحب زادے عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔ آپ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ چونکہ اونٹ سرکاری چراگاہ میں چر کر موٹا ہوا ہے۔ اس لئے اتنی ہی قیمت کے حق دار ہو جتنی میں خریدا تھا۔ چنانچہ زائد رقم لے کر بیت المال میں داخل کر دی۔

بیت المال کے مہتمم نے ایک دفعہ بیت المال کا جائزہ لیا تو صرف ایک درہم موجود تھا۔ یہ خیال کر کے کہ ایک معمولی درہم بیت المال میں کیوں پڑا رہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک بچہ جو اتفاق سے وہاں موجود تھا، اسے وہ درہم دے دیا۔ معلوم ہونے پر آپ بہت خفا ہوئے بچے سے درہم لے کر خود بیت المال میں داخل کر دیا اور مہتمم سے کہا، کیا تمہیں مدینہ میں میری اولاد کے سوا کوئی غریب نظر نہ آیا؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ قیامت کے دن امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ میری گردن پر رہے؟

احساس ذمہ داری کی شدت ملاحظہ ہو کہ ایک دفعہ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا۔ آپ خود اس کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ عین اس وقت ایک بڑے رئیس اور سردار احنف بن قیس (فاتح خراسان) ملاقات کو آ گئے۔ ان سے کہا کہ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے آؤ ہم دونوں مل کر تلاش کریں۔ تم جانتے ہو ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ''امیر المومنین! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں، کسی غلام کو حکم دیجئے وہ ڈھونڈ لائے گا۔ فرمایا، مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے؟

ایک دفعہ صدقات کے اونٹوں کی کیفیت اور گنتی وغیرہ بڑی احتیاط اور باریک بینی سے مطالعہ کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتاتے اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے رجسٹر میں درج کراتے جاتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کارروائی سے بڑے متاثر اور محظوظ ہوئے اور قرآن مجید کی وہ آیت تلاوت کی جو مدین کے بزرگ (حضرت شعیب علیہ السلام) کی صاحب زادی کی زبانی حضرت موسیٰ کو ملازم رکھنے کے بارے میں سفارش تھی۔

يَا اَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (۲۸:۲۶)

(ابا جان! اس شخص کو نوکر رکھ لیجئے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہوسکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو)

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ہیں ''قوی الامین''

انسان تو انسان حیوانوں تک کی ایسی دیکھ بھال کرنے والا تاریخ میں کوئی دوسرا سربراہ حکومت نظر نہیں آتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سماجی وفلاحی شعور اس قدر ترقی یافتہ تھا کہ آج کی مہذب اور ترقی یافتہ سپر پاورز، میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر قرآنی ہدایات پر آج بھی عمل کیا جائے تو سماجی اور معاشی انصاف ذاتی ملکیت کو باطل، سرمایہ داری کو حرام اور کموزنزم کو نافذ کئے بغیر بھی قائم کیا جاسکتا ہے اور دنیا کو کمونسٹ سبز باغوں سے بچایا جاسکتا ہے۔ [1]

''عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ'' کے مصنف محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں:

''وہ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) مسلمانوں سے فرمایا کرتے، مجھے امید ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں گا انشاءاللہ تمہاری خدمت کرنے میں حق کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا اور کوئی مسلمان چاہے وہ محاذ جنگ ہی پر کیوں نہ ہو، ایسا نہ ہوگا جس کو مال میں سے اس کا حصہ نہ ملا ہوگا۔ اور آپ کا ارشاد ہوتا تھا، میں مسلمان ہوں اور ایک بندۂ ضعیف مگر یہ کہ اللہ عزوجل میری مدد فرمائے، تمہاری خلافت انشاءاللہ میری فطرت میں کوئی تغیر پیدا نہیں کرے گی۔ عظمت صرف خدائے بزرگ و برتر کے لئے ہے۔ بندوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ تم میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ جب سے عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوا ہے بدل گیا ہے۔ میں اپنا حق جانتا ہوں اور اپنی ایک ایک بات کھول کر تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ اگر کسی کی کوئی حاجت پوری نہ ہوئی ہو یا کسی پر ناحق ظلم کیا گیا ہو یا کسی کو میرے مزاج سے تکلیف پہنچی ہو تو وہ آکر مجھے پکڑے کیونکہ میں بھی تم ہی جیسا ایک انسان ہوں...... مجھے تم سب سے زیادہ تمہاری بھلائی محبوب ہے اور تمہاری تکلیف مجھ پر ایک بوجھ ہے...... مجھے اپنی امانت اور ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہے۔ جو مسئلہ میرے سامنے آئے گا انشاءاللہ میں خود ہی اسے حل کروں گا کسی دوسرے پر نہیں چھوڑوں گا مجھے صرف دیانتدار اور مخلص کارکنوں کی ضرورت ہے۔ انشاءاللہ میں ایسے ہی لوگوں کو اپنی امانت سپرد کروں گا۔'' [2]

کفالت عامہ کے سلسلے میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ہدایات تھیں کہ مسلمان ہو یا ذمی، ہر محتاج و تنگ دست کی مدد کی جائے، ہر مقروض کا قرضہ ادا کیا جائے، ہر کمزور، ضعیف اور مظلوم کی اعانت کی جائے۔ ہر بھوکے ننگے کو کھانا کپڑا مہیا کیا جائے۔ لاوارث بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال بھی حکومت کی ذمہ داری تھی۔

---

[1] حال ہی میں مشرقی یورپ نے کمیونسٹ پارٹی کی حکومت کو ٹھکرا کر کمیونزم کی اجارہ داری ختم کردی ہے۔ وسط ایشیائی مسلمان سوویت ریاستوں میں بھی کمیونزم کے خلاف ردِعمل شروع ہوگیا ہے۔ کمیونزم ایک ناکام سیاسی اور معاشی نظریہ ثابت ہوگیا ہے۔ مؤلف

[2] عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ (اردو ترجمہ) ص ۱۳۲

اجتماعی زندگی میں انقلاب

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلادعرب کی اجتماعی زندگی میں ایک حسین اور خوشگوار انقلاب پیدا کیا عدل ومساوات پر اسلامی معاشرے کی بنیاد استوار کی اور قرآن وسنت پر مبنی دنیا کو ایک نیا اور صحت مند فلسفہ زندگی دیا۔ معاشرت، معیشت، تہذیب وتمدن کے نئے اصول دیئے۔

جب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ مسند نشین خلافت ہوئے تو مسلمان غریب ونادار تھے۔ پھر اللہ نے انہیں غنی کر دیا۔ پہلے وہ ایران وروم سے ڈرتے تھے لیکن اب وہ ایران وروم پر حاوی ہو گئے اور اللہ کے سوا کسی کا خوف ان کے دلوں میں نہ رہا۔ پہلے وہ کرۂ ارض کے ایک الگ تھلگ گوشے میں سمٹے ہوئے تھے جن کا نام بھی دنیا کی زبان پر شاذ ونادر ہی آتا تھا جو جہاں سے الگ ایک جزیرہ نما تھا۔

ترقی کا اس پر پڑا تھا نہ سایہ
تمدن کا واں تک قدم تھا نہ آیا

لیکن فتوحاتِ فاروقی نے متمدن دنیا سے کٹے ہوئے اس گمنام جزیرہ نمائے عرب کو دنیا کی سماعت وبصارت اور تہذیب وحضارت کا مرکز بنا دیا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر دنیا کا یہ عظیم فاتح اور عدیم المثال منتظم وہی رہا جو تھا۔ اس کے ظاہر وباطل میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی، اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اس کا دامن امارت اوروں ہی کے نہیں بلکہ اپنے ضمیر کے بھی کسی شک وشبہ سے داغدار نہ ہونے پائے۔ اور وہ ہر حقدار کو اس کا حق پہنچا دیں۔ اس طرح اللہ نے اسلام کو عزت اور شوکت دی اور اپنے نیک بندوں کو زمین کا وارث بنا دیا۔ ع

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگا ہے!

اخلاق عالیہ

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اگر ”تم چاہتے ہو کہ تمہاری مجلس پاکیزہ ہو جائے تو عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا کرو“ یہ اس لئے کہ عمر رضی اللہ عنہ ایک ایسی ہمہ گیر اور جامع شخصیت کے مالک تھے کہ ان کے ذکر سے اہل مجلس کے قلوب واذہان میں بھی طہارت اور ترفع کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔

قبولِ اسلام سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فکر وعمل کی دنیا کی یکسر کایا پلٹ گئی۔ انہوں نے اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آئیڈل قرار دیا اور وہ قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک مثالی انسان بن گئے جس کی عظمت کا اعتراف آج تک غیر مسلم دانشور، محقق اور مؤرخ بھی کرتے چلے آرہے ہیں۔ اسلام نے انہیں طہارت اور تقویٰ کے مرتبہ عالی پر فائز کر دیا۔ ان کے دل اور ان کی عقل نے انہیں زندگی کی مادی خواہشات اور عام تعصبات سے بہت بلند کر دیا، خلوص، انقطاع الی اللہ، لذائذ دنیا سے اجتناب، زُہد وقناعت، صبر ورضا، شکر وتوکل، حق پرستی، حق گوئی میں وہ سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ تواضع، انکسار، سادگی، بے لوثی، انسانیت نوازی، عدل وانصاف اور مساوات پسندی ان کے اخلاقِ عالیہ کے نمایاں پہلو تھے۔ ان کے ان اوصاف کی عملی مثالوں سے تاریخ کے صفحات پر ہیں۔

مزاج میں فطری تندی و تیزی تھی۔ اسلام لانے کے بعد یہ سختی حمایت حق کے لئے استعمال ہونے لگی۔ حق کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرتے۔ خلیفہ بننے کے بعد بہت نرم ہو گئے تھے۔ دعا مانگی ''اے اللہ! میں سخت ہوں، مجھے نرم کر، میں کمزور ہوں مجھے قوت دے۔'' فرمایا کرتے کہ ''میرا دل خدا کے بارے میں نرم ہو جاتا ہے جھاگ سے بھی زیادہ نرم اور سخت ہو جاتا ہے تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔'' کتنے ہی سخت غصے میں کیوں نہ ہوں اگر کوئی ان کے سامنے قرآن کی آیات پڑھنا شروع کر دیتا تو فوراً نرم پڑ جاتے۔ راہِ حق میں شدت کے ساتھ شفقت بھی درجہ کمال پر تھی۔ عمال کو بھی تاکید کرتے کہ رعایا کے ساتھ شفقت اور نرمی سے پیش آئیں، ان کی جائز شکایات کا فوراً ازالہ کریں، عدل و انصاف قائم کریں، اور سخت سزائیں نہ دیں۔ رعیت کا ہر شخص مساوی حقوق کا حامل تھا ہر نماز کے بعد آپ صحن مسجد میں کھلی کچہری لگاتے، لوگ آزادی سے اپنی حاجات اور شکایات پیش کرتے۔ شام کے سفر کے دوران میں ایک ایک ضلع اور ایک ایک مقام پر ٹھہر کر لوگوں کے حالات معلوم کئے، ان کی ضروریات پوری کیں اور شکایات کا ازالہ کیا۔ گزشتہ صفحات میں چند مثالیں دی جا چکی ہیں۔ اسی مقصد سے عراق کا سفر بھی کرنا چاہتے تھے لیکن موت نے مہلت نہ دی۔

لوگوں کے حالات اور تکالیف سے باخبر ہونے کے لئے سب سے پہلے آپ نے راتوں کو گشت کیا۔ سب سے پہلے آپ نے درہ استعمال کیا۔ گلیوں بازاروں میں تن تنہا دُرّہ بدست گھومتے تھے اور خطا کاروں کو موقع پر ہی سزا دے ڈالتے۔ مثل مشہور ہو گئی کہ عمر رضی اللہ عنہ کا درہ دوسروں کی تلوار سے زیادہ ہیبت ناک ہے۔

اصابت رائے، عزم بالجزم، قوتِ فیصلہ، مردم شناسی، احساسِ فرض، خلوص، خدا خوفی، دیانت، امانت، عدل، مساوات، انسانیت نوازی کے اوصاف حسنہ کی وجہ سے عوام و خواص کو ان پر کامل اعتماد تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی ذات اور حکومت کو ایک کھلی کتاب کی طرح رکھا۔ تنقید اور نکتہ چینی کی حوصلہ افزائی کی۔ منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ ''اللہ اس شخص کا بھلا کرے جو مجھے میرے عیبوں کا تحفہ بھیجتا ہے۔'' (یعنی کوتاہیوں پر متنبہ کرتا ہے)

چنانچہ معمولی سے معمولی مرد، عورتیں بڑی بے باکی سے خلیفہ کے احکام اور اعمال پر نکتہ چینی کرتے اور وہ صبر و تحمل سے سنتے اور اپنی پوزیشن واضح کرتے اور بعض دفعہ اپنے احکام واپس لے لیتے۔ اموال کی کثرت سے لوگوں میں بھاری مہر باندھنے کا رواج ہو چلا تھا۔ آپ نے مجمع عام میں تقریر کی اور لوگوں کو بھاری مہر باندھنے سے منع کیا۔ اس پر ایک عمر رسیدہ عورت نے اٹھ کر کہا کہ ''اے عمر رضی اللہ عنہ! جب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی اور اس کا معاملہ متعلقہ لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے تو تم کون ہوتے ہو بھاری مہر مقرر کرنے سے منع کرنے والے؟'' آپ نے فرمایا کہ ''دین کے احکام کو یہ عورت بھی عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ جانتی ہے۔'' کسی قسم کی خفگی کا اظہار کیا نہ عورت پر کوئی عتاب فرمایا۔ لوگوں کو مہر مقرر کرنے میں آزاد چھوڑ دیا۔ اسی قبیل کے بعض وقعات پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔

خوفِ خدا

خوفِ خدا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے رگ وپے میں جاری وساری تھا۔ مواخذۂ آخرت سے لرزہ براندام رہتے۔ فرمایا کرتے کہ اگر آسمان سے ندا آئے کہ ایک کے سوا دنیا کے تمام انسان جنتی ہیں، تب بھی مواخذہ کا خوف زائل نہ ہوگا کہ شاید وہ ایک بدقسمت انسان میں ہوں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک دفعہ کہا ''کیا تم کو یہ پسند ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے، ہجرت کی، جہاد کیا اور نیک اعمال کیے۔ اس کے بدلے میں دوزخ سے بچ جائیں اور عذاب وثواب برابر ہو جائیں؟'' وہ بولے ''خدا کی قسم نہیں۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی روزے رکھے، نمازیں پڑھیں، بہت سے نیک کام کیے اور ہمارے ہاتھ پر بہت سے لوگ ایمان لائے، ہم کو ان اعمال سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ مجھے تو یہی غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ عذاب سے بچ جاؤں اور نیکی اور بدی برابر ہو جائیں۔'' خوف خدا اور مواخذۂ آخرت جس شخص کے دل ودماغ پر ہر وقت چھائے رہیں اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دوسروں پر بے جا سختی یا ظلم وزیادتی کرے گا۔

جمال وجلال کا امتزاج

سیرت فاروقی کا ایک رخ تو انتہائی تواضع اور سادگی ہے کہ بارہ بارہ پیوند لگا کرتہ اور تہمت زیب تن ہیں۔ سر پر پھٹا عمامہ اور پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہیں، کاندھے پر مشک کہ بیواؤں کے گھر پانی نہیں ہے۔ مجاہدین کے گھروں کی دہلیز پر بیٹھ کر ان کے اہل خانہ کی طرف سے ان کے خطوط کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اپنی پیٹھ پر سامان لاد کر محتاجوں کے ہاں پہنچا رہے ہیں، بدو کی بیوی کی زچگی میں اپنی زوجہ محترمہ کو رات کے وقت دایہ گیری کے لئے لے جاتے ہیں، باہر سے آنے والے قافلے کی حفاظت کے لئے رات کو پہرہ دیتے ہیں۔ مکہ اور شام کے سفروں میں کبھی خیمہ یا شامیانہ ساتھ نہیں لے جاتے، جہاں ٹھہرے درخت پر چادر ڈال کر اسی کے سائے میں پڑ رہے، روزانہ خانگی اخراجات صرف دو درہم (موجودہ پاکستانی ساٹھ پیسے) کبھی چھنا ہوا آٹا استعمال کرتے نہ ایک ساتھ دو سالن، زُہد وتقویٰ کا یہ عالم کہ کبھی کسی سے کوئی تحفہ قبول نہ کرتے۔[1] بیت المال کے اونٹوں کی خبر گیری، علاج اور گم ہو جانے پر تلاش وغیرہ خود کرتے۔ دوسرا رخ یہ کہ روم ایران کے محاذوں پر فوجیں بھیج رہے ہیں، قیصر وکسریٰ کے سفیروں سے مسجد کے فرش خاک پر پرانے پیوند لگے کپڑوں میں ملاقات کر کے انہیں حیرت زدہ کر رہے ہیں۔ عظیم جرنیلوں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، عیاض بن

[1] مثلاً بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ایک دفعہ ایک چٹائی آپ کے گھر بطور تحفہ دے گئے۔ آپ کو معلوم ہوا تو انہیں بلا کر ڈانٹا اور چٹائی ان کے منہ پر دے ماری کہ لے جاؤ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ایک دفعہ ایرانی محاذ سے ایک کمانڈر نے آپ کو مٹھائی کا تحفہ بھیجا۔ آپ نے ایک تہدیدی خط کے ساتھ اسے مٹھائی واپس بھیج دی کہ جو چیز تمام مسلمانوں کو میسر نہیں وہ ہمیں نہیں چاہیے۔ ایک کمانڈر نے مالِ غنیمت میں سے قیمتی جواہرات کا ایک صندوقچہ بطور خاص آپ کے لئے بھیجا۔ آپ نے اسے ڈانٹ کر لکھا کہ مجھے نہیں چاہئے یہ مجاہدین میں تقسیم کر دو، شام کے سفر میں عیسائی پادری کا پیش کردہ قیمتی کرتہ اسے لوٹا دیا۔ مولف

عنہم رضی اللہ عنہ، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ وغیرہ سے جواب طلبی کر رہے ہیں اور ان کے نام احکام لکھوار ہے ہیں ان میں سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔ خدم وحشم سے بے نیاز اس گدڑی پوش خلیفہ کی سطوت و جبروت کا یہ عالم تھا کہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں لرزہ براندام تھیں اور ان کے ایوانوں میں زلزلے۔ سچ ہے۔

خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

دینی غیرت

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دینی غیرت درجۂ کمال پر تھی۔ ان کے قبول اسلام سے پہلے مسلمان حرم شریف میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حرم شریف پر مشرکین سے زیادہ توحید پرست اہل اسلام کا حق ہے۔ پھر مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے حرم شریف میں گئے اور وہاں نماز پڑھی۔ مشرکین سے لڑ بھڑ کر مسلمانوں کا حق تسلیم کرایا۔ ہجرت کے وقت دوسروں کے برعکس حرم شریف میں جا کر اپنے عزم کا اعلان کیا اور مشرکین کو چیلنج دیا کہ جس کو اپنی بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنانا ہو آ نہیں ہجرت سے روکنے کی ہمت کر دیکھے۔ صلح حدیبیہ کے وقت اسی دینی غیرت کے جوش میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال و جواب کئے کہ جب ہم حق پر ہیں تو مشرکین سے دب کر صلح کیوں کریں۔

جنگ بدر میں اپنے ہاتھوں سے اپنے ماموں کو قتل کیا اور مشرک قیدیوں کے بارے میں بھی یہی تجویز کیا کہ ہر مسلمان اپنے مشرک رشتہ دار قیدی کو قتل کرے تاکہ وہ آئندہ مقابلے پر نہ آسکیں۔ ان کے دینی رعب و غیرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے قبیلہ بنی عدی کا کوئی مشرک مکہ کے دوسرے مشرکین کے ساتھ ہو کر بدر و واحد کی جنگوں میں مسلمانوں کے مقابلے پر نہ آیا۔ مدینہ کے منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی نے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بدتمیزی کی اور مدینہ سے نکال دینے کی دھمکی دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔ غیر مسلموں کی تالیف قلوب کے لئے اموال غنیمت وغیرہ میں سے کچھ رقم مختص کی جاتی تھی۔ جب اسلام کو غلبہ اور طاقت حاصل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اب ان مشرکین پر مال خرچ کیوں کیا جائے؟ اسی طرح اور متعدد واقعات ہیں۔ آپ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اسلام کی عزت شوکت اور غلبہ کا بہت خیال رہتا تھا حتیٰ کہ کسی مسلمان کو کمزوری اور ڈھیلے پن سے چلتے دیکھنا بھی پسند نہ کرتے، ایک ایسے ہی شخص کو ڈانٹا کہ "مردوں کی سی چال چھوڑ، سر اٹھا کر چست و چالاک ہو کر چل، اسلام کو ذلیل نہ کر۔" یہ اسی غیرت کا تقاضا تھا کہ اپنے وقت کی دو عظیم ترین اور قدیم ترین سلطنتوں کو نیچا دکھا کر چھوڑا تاکہ اللہ کے دین کو غلبہ اور سربلندی حاصل ہو اگرچہ مشرکوں اور کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔

قوتِ فیصلہ، عزم محکم

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ زبردست قوت فیصلہ اور عزم محکم کے مالک تھے، بڑی سے بڑی مشکل سے نہیں گھبراتے

تھے، بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے سے نہیں جھجکتے تھے، آندھی ہو یا طوفان وہ سب سے نپٹنا جانتے تھے، توفیق ایزدی ہر پیچیدہ مسئلہ میں ان کی رہنمائی کرتی رہی۔ ان کے ناخن تدبیر سے ملت کی گتھیاں سلجھتی چلی گئیں۔ عنان خلافت ہاتھ میں لیتے وقت انہوں نے کہا تھا کہ عرب ایک شتر بے مہار کی مانند ہیں۔ میں انہیں سیدھی راہ پر چلا کر چھوڑوں گا" چنانچہ انہوں نے ایسا کر دکھایا۔ ناقہ بے زمام کو سوئے قطار لے آئے وہ عزم وحوصلہ کا مضبوط اور بلند پہاڑ تھے۔ اقبال کے اس قول کی مثال۔

بخود گزیدہ و محکم چوں کوہساراں ذی
چوں خس مزی کہ ہوا تیز وشعلہ بیباک است!

اسلام کی حقانیت پر ایمان کامل نے ان کی خودی اور خود اعتمادی کو بڑی جلا بخشی تھی۔ وہ شرکت میانہ حق وباطل قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ وہ فاروق بلکہ فاروق اعظم ہو گئے۔ رضی اللہ عنہ۔ ان کے فکر وعمل میں کوہساری و انکساری کا حسین امتزاج تھا۔

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو موج نغمہ خواں ہو جا

دیوقامت شخصیت، عقلیت پسند ذہن

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ درویش خلیفہ صرف جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ دینی، علمی، اخلاقی، روحانی، فکری، سیاسی، انتظامی، فوجی ہر لحاظ سے ایک دیوقامت اور جامع شخصیت تھا۔ دنیا کے کسی دوسرے ایسے حکمران کی مثال نہیں ملتی۔ جو ان کے برابر فتوحات اور عدل دونوں کا جامع ہو۔ ان کی ذات بے مثل قیادت، سیادت، بصیرت، تدبر، سیاست اور عدالت کی حامل تھی۔ وہ زمین پر قدرت حق کا زبردست نشان تھے۔ پیغمبروں کے بعد اللہ کے ان معدود مختلف بندوں میں سے ایک جو اپنی آستینوں میں ید بیضا اور ہاتھوں میں عصائے موسوی لئے پھرتے ہیں۔ اپنے عہد کے لحاظ سے وہ انتہائی ترقی یافتہ، عقلیت پسند اور حریت نواز دل ودماغ کے مالک تھے۔ آیات قرآنی اور سنت نبوی کی تفسیر وتعبیر اور استخراج مسائل میں انہوں نے بارہا فقہی بصیرت اور دوراندیشی کا مظاہرہ کیا۔ عام الرمادہ میں چور کا ہاتھ کاٹنے کی قرآنی سزا یہ کہہ کر منسوخ کر دی کہ ان دنوں جو چوری کرے گا وہ بھوک سے مجبور ہو کر کرے گا۔ حالت اضطرار میں مردار کھانا بھی جائز ہے۔ اپنے زمانے میں جب حج کے لئے گئے تو اتباع سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حجر اسود کو بوسہ دیا لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ میں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔ حدیبیہ میں ببول کے جس درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے بیعت رضوان لی تھی۔ لوگوں نے اس درخت کو تقدس اور احترام کی نظروں سے دیکھنا اور وہاں نفل پڑھنا شروع کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو اس درخت کو کٹوا دیا تا کہ نہ بانس رہے نہ بانسری بجے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے واقعات ہیں۔ حضرت دانیال نبی علیہ السلام کی لاش مبارک محفوظ تھی۔ لوگ وہاں جا جا

کر دعائیں مانگتے تھے۔ آپ نے اسے عزت واحترام سے دفن کروادیا اور یہ صدیوں پرانی رسم ختم ہوئی۔

اسی طرح توہم پرستی کے تحت دریائے نیل میں طغیانی کے لئے اہل مصر ایک دوشیزہ کی قربانی ہر سال دیا کرتے تھے۔ مصر کی فتح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ قبیح اور ظالمانہ رسم بند کرادی۔

صحابہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اگر کسی شرعی حکم کی حکمت و مصلحت سمجھ میں نہ آتی تو بلا جھجک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر کے پوچھ لیتے اور جب تک پوری طرح اطمینان نہ ہو جاتا، سوال کرتے رہتے۔

فضل وکمال

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قریش کے ان سترہ آدمیوں میں سے تھے جو اسلام سے قبل لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اپنے زمانے کے علوم وفنون میں وہ کسی میں بند نہ تھے نہ کسی سے ہیٹے۔ قبول اسلام سے قبل عین عالم جوانی میں اپنے علم، تدبر، سیاست، خطابت، بصیرت اور علم الانساب میں مہارت کی وجہ سے آپ کو قریش کا اعتماد حاصل ہو چکا تھا۔ اور ان کی طرف سے سفارت اور منافرت کے امور سرانجام دیتے تھے۔ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے اور تورات پڑھ سکتے تھے۔ ذاتی حیثیت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہایت ذہین، طباع، بالغ نظر، مدبر اور صائب الرائے تھے۔ جاہلی اور اسلامی علوم دونوں میں آپ کو یکساں کمال حاصل تھا۔ فصاحت و بلاغت انشاء وخطابت شاعری ولسانی، سپہ گری، شہسواری، بہادری وغیرہ ان تمام اوصاف وکمالات میں جو عرب میں لازمہ شرافت سمجھے جاتے تھے۔ آپ کو بہرہ وافر حاصل تھا۔ آپ کی بہت سی تحریریں، تقریریں اور اقوال کتابوں میں محفوظ ہیں۔ جن سے آپ کی فصاحت وبلاغت اور دانشوری کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعری کا نہایت بلند اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ اپنے زمانے میں شعر کے سب سے بڑے نقاد اور ادا شناس تھے۔ عرب کے تمام بڑے بڑے شعراء کا کلام حفظ تھا۔ اور اس پر ناقدانہ رائے رکھتے تھے۔ اہل علم ودانش کی صحبت کو پسند کرتے تھے اور ایسے اصحاب کو اپنے قریب رکھتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو عزیز رکھتے اور ان کی قدر کرتے تھے حالانکہ وہ کم عمر تھے۔

عربی شعراء اشعار میں علانیہ عورتوں کے نام لے لے کر اپنی عشق ومحبت کی داستانیں بیان کرتے تھے۔ کسی شریف آدمی کی ہجو کہہ دینا معمولی بات تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں باتوں کی ممانعت کردی۔ [1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ومقدس صحبت، قرآن مجید میں غور وفکر اور تفقہ فی الدین نے ان کی گوناگوں صلاحیتوں کو جلا بخشی اور فاروق اعظم بننے میں مدد دی۔ آپ بلند پایہ محدث، مجتہد اور فقیہ تھے۔ آپ نے فقہ میں وہ اصول ونظریات مقرر کئے جنہیں بعد کی نسلوں نے اپنا مدارِ عمل بنایا۔

اہل بیت سے تعلقات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات سے والہانہ محبت اور شیفتگی تھی۔ رضائے نبوی کے سامنے جان ومال واہل وعیال کو بے حقیقت سمجھتے تھے۔ اس محبت کا یہ قدرتی تقاضا تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

۱۔ تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی

اہل بیت، ازواجِ مطہرات، اہل قبیلہ (بنی ہاشم) اور دوسرے متعلقین کا پاس اور لحاظ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال سے بھی زیادہ کرتے تھے۔ ان کے حقوق اور رضا جوئی کو دوسروں پر مقدم رکھتے تھے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا وظیفہ تمام مردوں سے اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے وظائف تمام خواتین سے زیادہ مقرر کیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ابھی عنفوان شباب تھا اور انہوں نے أعدائے اسلام کے خلاف کسی جہاد میں بھی حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کے باوجود ان کے وظیفے ان کے والد محترم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے برابر مقرر کیے اور اکثر مواقع پر ان سے ترجیحی حسن سلوک سے پیش آتے رہے اور مالِ غنیمت میں سے عمدہ چیزیں نذر کرتے رہے۔ دیوان کی ترتیب کے وقت حکم دیا کہ سب سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ بنی ہاشم کے نام لکھے جائیں ان میں بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سرفہرست رکھا جائے۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہا دھو کر اور صاف کپڑے پہن کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مکان کے پاس سے گزرے تو پرنالے سے گندہ پانی اور کپڑے ناپاک ہو گئے۔ دفع مضرت عامہ کے اصول پر آپ نے پرنالہ اکھڑوا دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے احتجاج کیا اور بتایا کہ پرنالہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے مبارک ہاتھوں سے نصب فرمایا تھا۔ بعض صحابہ نے بھی تصدیق کی۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے اصرار کیا کہ ان کے کندھے پر چڑھ کر پرنالہ دوبارہ اپنی جگہ پر نصب کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

آپ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ (خلفائے بنی عباس کے مورث اعلیٰ) کو بہت عزیز رکھتے تھے حالانکہ وہ ابھی ایک کمسن نوجوان تھے لیکن ان کی ذہانت، علم اور فہم دین کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں اکابر صحابہ کے برابر درجہ دیتے تھے اور انہیں اپنی خصوصی مجلسوں میں شامل کرتے تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پہلے ہی دن حضرت عمر کی بیعت بطیّب خاطر کر لی تھی اور ان کی مجلس شوریٰ کے ممتاز اور سرگرم رکن تھے۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اس قدر اعتماد تھا کہ دو بڑی اہم ذمہ داریاں یعنی عہدۂ قضا اور جنگی امور کی نظامت و نگرانی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سونپ دی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے اکثر اہم امور میں مشورہ لیتے اور ان کی رائے پر عمل کرتے تھے۔ جنگ نہاوند کے موقع پر اکثر صحابہ کا خیال تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہ نفس نفیس سپہ سالار بن کر ایرانیوں کے مقابلے میں تشریف لے چلیں لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف مشورہ دیا اور فرمایا:

"آپ مدینہ ہی میں رہیں کسی دوسرے کو امیر لشکر بنا کر بھیجیں۔ خود یہیں سے مجاہدین اور ساز و سامان کی فراہمی کرتے رہیں کیونکہ اگر خدانخواستہ میدان جنگ میں آپ کو کچھ ہو گیا تو اسلام اور مملکت اسلامیہ کو ضعف پہنچے گا اور دشمن ہم پر دلیر ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی دوسرا سپہ سالار خدانخواستہ شہید بھی ہو جائے تو اس کی جگہ آسانی سے پر کی جا سکتی ہے۔"

اس تقریر کا مفصل حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کو صائب خیال کر کے

قبول فرمایا۔ [1]

کیا اس مشورہ کے خلوص میں کوئی شک ہوسکتا ہے؟

جب بیت المقدس کی فتح کے سلسلے میں آپ نے شام و فلسطین کا سفر کیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا۔ انہوں نے تمام فرائض خلافت ادا کیے۔ باہمی اعتماد اور یگانگی کی انتہا یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بڑی صاحب زادی حضرت ام کلثوم بنت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا عقد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا۔ [2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر انہیں بہترین خراج تحسین حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی نے پیش کیا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کو جس شخص سے نفرت اور عداوت ہو اس کے نام تک سے نفرت کرتا ہے۔ اس کا نام لینا یا سننا پسند نہیں کرتا چہ جائیکہ اپنی کسی اولاد کا نام اس کے نام پر رکھے لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری بیویوں سے جو بیٹے پیدا ہوئے ان میں سے ایک بیٹے کا نام ابوبکر تھا جو کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شہید ہوئے۔ ایک بیٹے کا نام عثمان تھا وہ بھی کربلا میں شہید ہوئے اور ایک لڑکے کا نام عمر اکبر تھا جنہوں نے طویل عمر پائی۔ انسان اپنی اولاد کے نام بڑوں، بزرگوں اور اپنے پسندیدہ انسانوں کے نام پر رکھتا ہے۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دلی تعلق تھا؟ [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ اپنے تمام مشوروں میں شامل کرتے اور ان کی رائے کو وقعت دیتے تھے۔ مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جبرئیل اور میکائیل میرے دو آسمانی وزیر ہیں جب کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ میرے دو زمینی وزیر ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی قسم کی روایت ہے۔ (ترمذی، طبرانی، صواعق محرقہ)

ایک دوسرے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''خدا کی قسم! اگر تم دونوں کسی مسئلے پر متفق ہو جاتے ہو تو میں تمہارے مشورے سے کبھی نہیں ہٹتا۔'' (ترمذی)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مشہور روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو

---

[1] تاریخ طبری، نہج البلاغہ نیز تفہیم القرآن

[2] تاریخ طبری، طبقات ابن سعد، مجالس المومنین (از قاضی نور اللہ شوستری) کتاب مسلک (از ابوالقاسم قمی) تاریخ طراز مذہب مظفری، فروع کافی جلد دوم

[3] طبقات ابن سعد جلد سوم (حالات حضرت علی رضی اللہ عنہ)

عمر رضی اللہ عنہ ہوتا۔'' ۱

ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ ''میری امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو مکالمہ الٰہی اور گفتگوئے الٰہی سے سرفراز کئے جائیں گے اور عمر بھی انہی میں سے ہیں۔'' ۲

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر حق واضح کر دیا ہے اور وہ حق ہی بولتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے حق کو عمر رضی اللہ عنہ کے دل اور زبان پر جاری کیا ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اللہ نے اہل عرفہ (حج کرنے والوں) پر عموماً اور عمر رضی اللہ عنہ پر خصوصاً فخر کیا ہے۔'' (طبرانی)

بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے عمر! شیطان تم کو دیکھتے ہی راستہ کاٹ جاتا ہے۔''

حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ جب تک یہ شخص تمہارے درمیان موجود ہے تب تک فتنوں کا دروازہ بند رہے گا۔'' (تاریخ الخلفا بزار۔ صواعق محرقہ)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مجھے معلوم نہیں میرا قیام تم میں کب تک ہو۔ میرے بعد تم ان دونوں کی اقتداء کرنا۔'' اور اشارہ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی طرف فرمایا۔ ''صواعق محرقہ'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد میری امت میں ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر سب سے بہتر ہیں۔''

---

۱ یہاں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جناب حبیب ریحان ندوی لیکچرار اسلامک انسٹیٹیوٹ بیضا (لیبیا) نے لکھا ہے کہ وہ بغداد یونیورسٹی کے اکنامکس کے پروفیسر صادق المہدی السعید شیعہ ہیں۔ ان سے ایک ملاقات کے دوران میں میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب! خدارا کوئی ایسی شکل بتائیے کہ ہم میں اور آپ میں صلح ہو جائے۔ مسکرا کر کہنے لگے لڑائی کب ہے؟ میں نے کہا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ نے جو بھی کیا ہو سارے سنی مسلمان آپ کے بزرگوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں...... حضرت علی رضی اللہ عنہ کی برأت کے سلسلے میں بعض سنی مفکر حضرت عثمان، حضرت عائشہ، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہم) کی خطاؤں کو اجتہادی غلطی نہیں بلکہ محض خطا اور غلطی قرار دینا چاہتے ہیں لیکن آپ لوگ ہمارے اکابر صدیقین کے سربراہ اور فاروق رضی اللہ عنہ تک کی شان میں گستاخی خود ہمارے سامنے کرتے ہیں۔'' اور قدح وسب صحابہ جیسی غیر عقلی اور مجرمانہ حرکت کو جواز ہی کی سند نہیں بلکہ دین میں ایک ضروری فرض کا درجہ دیتے ہیں۔ اہل فضل و تقویٰ کسی عام مسلمان تک کو گالی دینے سے گریز کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے بڑی صراحت سے فرمایا۔ ''میرے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو گالی دینے والا شخص کافر ہے۔ علمی و فقہی اختلاف کی بات اور ہے۔ تکفیر یا گالی گلوچ بالکل غلط ہے۔''

(ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور اکتوبر ۱۹۷۲ء صفحات ۲۳-۲۴)

لَوْ كَانَ بَعْدِیْ نَبِیًّا لَكَانَ عُمَرُ (مسند احمد، ترمذی)

۲ اِنَّ مِنْ اُمَّتِیْ مُكَلَّمُوْنَ وَ مُحَدَّثُوْنَ وَاِنَّ عُمَرَ مِنْهُمْ ...... بحوالہ کتاب اللمع در تصوف اسلام، مصنفہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری امت میں سب سے رحم دل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور اللہ کے دین کے معاملے میں سب سے سخت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔'' (صواعق محرقہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں علم کا شہر ہوں، ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی بنیاد ہیں، عمر رضی اللہ عنہ اس کی چار دیواری، عثمان رضی اللہ عنہ اس کی چھت اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں۔'' (فردوس دیلمی، صواعق محرقہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے مجمع میں فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرے سامنے دودھ کا پیالہ لایا گیا۔ میں نے اسے پیا حتیٰ کہ اس کی تازگی میرے ناخنوں تک پہنچ گئی۔ پھر میں نے اس کا بقیہ حصہ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس کی تعبیر کیا ہے؟ فرمایا، علم [1]

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''خواب میں لوگ میرے سامنے پیش کیے گئے وہ قمیض پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض کی قمیض سامنے سے زیادہ لمبی تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ میرے سامنے پیش ہوئے تو ان کی قمیض زمین تک بچھی ہوئی تھی۔'' لوگوں نے پوچھا ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس کی تعبیر کیا ہے؟''

فرمایا۔ دین!

ایک اور موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک کنوئیں پر کھڑا ہوں۔ اس پر ایک ڈول پڑا ہے۔ میں نے اس میں سے ڈول نکالے جتنے خدا کی مرضی تھی پھر وہ ڈول ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لے لیا۔ اس نے بھی ایک دو ڈول آہستہ آہستہ نکالے پھر وہ ڈول بڑا چرسہ بن گیا اور عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اسے جا تھاما۔ میں نے ایسا کوئی جوانمرد نہیں دیکھا جو عمر رضی اللہ عنہ کی طرح چرسہ کھینچتا ہو۔ حتیٰ کہ چاروں طرف سے پیاسے آئے اور خوب سیراب ہوئے۔'' [2]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ تہذیب میں لکھتے ہیں کہ یہ اشارہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف ہے۔ یعنی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اسلام کو بہت غلبہ ہوگا اور فتوحات کی کثرت ہو گی۔ [3]

ایک متعصب مستشرق کا خراج تحسین

گزشتہ صدی کے اواخر میں سر ولیم میور ہندوستان کے صوبہ یوپی (اب اتر پردیش) کے گورنر تھے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب اور دشمنی کے لئے رسوائے زمانہ، انہوں نے اپنی کتاب ''خلافت کا عروج و زوال'' [4]

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر دنیا کا علم ترازو کے ایک پلڑے میں اور عمر رضی اللہ عنہ کا دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو عمر رضی اللہ عنہ کا پلڑا بھاری ہوگا۔

۲- بخاری و مسلم

۳ تاریخ الخلفاء

۴ Caliphate, it Rise, Decline and Fall

میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت و کردار کا خلاصہ اس طرح رقم کیا ہے۔

''عمر رضی اللہ عنہ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مملکت اسلامیہ کی عظیم ترین شخصیت تھے۔ یہ انہی کی دانائی، صبر و تحمل اور زور و توانائی کا نتیجہ تھا کہ دس سال کے اندر اندر شام و مصر و فارس مسلمانوں کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتد قبائل کو شکست دے کر پھر سے حلقہ بگوشِ اسلام بنا لیا تھا لیکن ان کی وفات کے وقت عساکر اسلامی نے ابھی شام کی سرحد ہی پار کی تھی۔ عنان خلافت سنبھالنے کے وقت عمر رضی اللہ عنہ صرف عرب کے حکمران تھے لیکن جب ان کی عمر کا پیالہ لبریز ہوا تو وہ ایک وسیع سلطنت کے سربراہ تھے جس میں بازنطینی سلطنت کے بہترین صوبے شامل تھے اور ایران بھی ان کے لشکر کے گھوڑوں کے پاؤں تلے روندا جا چکا تھا۔ تاہم اس حیرت انگیز بختاوری کے باوجود انہوں نے کبھی دانشمندانہ اور اعتدال پسندانہ قوت فکر و فیصلہ کو تلانجلی نہیں دی اور نہ کبھی اپنے آپ کو ایک عام کفایت شعار عرب سردار کی حیثیت سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ باہر سے آنے والے سفیر اور نمائندے مسجد نبوی میں چاروں طرف نظریں دوڑاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ خلیفہ کہاں ہیں؟ جب کہ مملکت اسلامیہ کا حکمران وہیں ان کے سامنے معمولی لباس میں فرش مسجد پر بیٹھا ہوتا تھا۔

سادگی اور فرض شناسی عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کے رہنما اصول تھے اور غیر جانبداری، خلوص، تدین ان کے نظم و نسق کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ انہیں اپنی ذمہ داری کا اس قدر شدید احساس تھا کہ سننے والوں نے انہیں یہ کہتے سنا ''کاش! میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا! کاش میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا!''............

وہ بے حد انصاف پسند تھے۔ سوائے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے معاملہ کے ظلم و ناانصافی کا کوئی واقعہ ان سے منسوب نہیں۔ خالد رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں بھی ان کی ناراضگی کا باعث خالد رضی اللہ عنہ کا وہ غیر محتاط سلوک تھا جو ایک ہزیمت خوردہ دشمن سے کیا گیا۔[1]

عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں اور امرائے لشکر کے انتخاب میں کبھی جانب داری سے کام نہیں لیا اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے سوا سبھی انتخاب بہترین تھے۔

سلطنت کے مختلف قبائل اور گروہ جن کے مفادات بے حد متنوع اور باہم مختلف تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ کی دیانت، صیانت اور بے لوثی پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی قوت بازو سے سلطنت میں قانون کی عملداری کو برقرار رکھا۔ بدوی قبائل اور قریش کے باہمی رشک و حسد اور رقابت کو دبائے رکھا۔ ان کی زندگی میں کسی کو اسلام (اور سلطنت اسلام) میں دخل انداز ہونے کی جرأت نہ ہو سکی۔ وہ درّہ بدست مدینے کی گلیوں اور بازاروں میں تن تنہا پھرتے تھے تاکہ قانون شکنی کرنے والوں کو موقع

---

[1] اس کے متعلق پہلے سے لکھا جا چکا ہے

پر ہی سزا دیں۔ اسی سے اس ضرب المثل نے جنم لیا کہ ''عمر کا درّہ دوسروں کی تلوار سے زیادہ خوفناک ہے۔'' اس کے باوجود وہ بہت نرم دل تھے۔ ان کے لطف و مہربانی کے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں مثلاً بیواؤں، یتیموں اور مظلوموں کی حاجت روائی۔''

مشہور شیعہ جج، مؤرخ اور دانشور سید امیر علی نے ''مختصر تاریخ اسلام'' ۱؎ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ عظیم طاقت اور اختیار کا مالک ہونے کے باوجود فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ قرآن و سنت کی روشنی میں کام کیا اور اپنے اقتدار و اختیار کا کبھی غلط استعمال نہیں کیا۔ تاہم انہوں نے روم و ایران کے بھیڑیوں کو کبھی یہ تاثر بھی نہیں دیا کہ ان کا سابقہ کسی لقمہ تر بن جانے والی کمزور بھیڑ سے ہے۔ ان کے فکر و عمل میں انکساری و کوہساری کا حسین امتزاج تھا۔ وہ زمین پر اللہ کی قدرت کا ایک زبردست نشان تھے۔ اسلام کو جیسی شوکت و تمکین ان کے عہد میں حاصل ہوئی پھر کبھی حاصل نہ ہو سکی۔''

ہم اسلام کے اس عظیم فرزند کے حالات جناب مجیب الرحمٰن شامی کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

''فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت مسلمانوں کی حکمرانی کی وہ بہترین تصویر ہے جو تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ رکھی ہے یہ ایک نمونہ ہے، مثال ہے، آئیڈیل ہے، ہر مسلمان معاشرے کے لئے۔ اس آئیڈیل کی طرف سفر کا آغاز کئے بغیر اسلامی نظام کے دعوے خواہ کس قدر دلفریب ہوں، درحقیقت کھوکھلے ہیں۔'' ۲؎

نظام اسلام کے نفاذ کے بارے میں حکومت پاکستان کی عقل گزشتہ چالیس سال سے محو تماشائے لب بام ہے۔

۱؎ A Short History of Saracens.

۲؎ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ، فاروق اعظم نمبر صفحہ ۱۴

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

(ذوالنورین)

''ہر نبی کے کچھ رفیق ہوتے ہیں
میرے رفیق جنت میں عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔''

(رسول اکرم ﷺ ...... ترمذی)

بیعت رضوان کا ہیرو

ذی قعدہ سنہ ۶ ہجری

مکہ مکرمہ سے نو میل باہر حدیبیہ کے مقام پر ایک نیم خشک چشمے کے کنارے ببول کے درخت کے نیچے رحمت للعالمین خاتم النبیین ﷺ کو اپنے حلقہ میں لئے چودہ سو احرام پوش جاں نثاران رسول ﷺ جمع ہیں۔ ان کی سواری کے جانوروں کے علاوہ دور دور تک قربانی کے اونٹ دکھائی دیتے ہیں جن کی گردنوں میں علامت کے طور پر قلادے پڑے ہوئے ہیں۔ چودہ سو قدوسیوں کے اس مجمع میں ایک گھمبیر سا جوش وخروش ہے، اعصابی تناؤ سے نورانی چہرے تمتمائے ہوئے ہیں، زبانیں خاموش ہیں، آنکھیں اپنے ہادی و آقا ﷺ کے روئے اقدس پر جمی ہوئی ہیں اور سارا مجمع ہمہ تن گوش ہے کہ دیکھیں حضور ﷺ کیا حکم دیتے ہیں۔ مجمع کی حالت تیغ وکفن باندھے ہوئے مرنے مارنے والوں کی سی ہے۔ قریش مکہ نے حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو عمرہ کی غرض سے مکہ میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے حالانکہ ایسا کرنے کا انہیں کوئی حق حاصل نہیں۔ بیت اللہ کے حج وعمرہ کا یکساں حق تمام قبائل عرب کو حاصل ہے۔ اس پر قریش کی اجارہ داری نہیں کہ جس کو چاہیں حج وعمرہ کرنے دیں اور جس پر چاہیں بیت اللہ کے دروازے بند کر دیں۔ حضور ﷺ کی بار بار کی سفارتیں ناکام ہو چکی ہیں، قریش اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ چونکہ آپ ﷺ کی نیت جنگ وجدال کی نہیں بلکہ پرامن طریقے سے عمرہ کر کے مدینہ واپس چلے جانے کی ہے، اس لئے میانوں میں بند تلواروں کے سوائی کوئی دوسرا اسلحہ ساتھ نہیں اور پرامن عزائم کا مزید ثبوت یہ ہے کہ قریش کے حملہ آور دستے کو گرفتار کرنے کے بعد غیر مشروط طور پر رہا کر دیا ہے اور مصالحت کی آخری کوشش کے طور پر اپنے معتمد علیہ، مخلص اور جان نثار عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو قریش کی طرف سفیر بنا کر بھیجا ہے۔ وہ آپ ﷺ کے داماد بھی ہیں حقیقی پھوپھی کے نواسے بھی ہیں اور قریش کی طاقتور اور صاحب اثر قبیلے بنی امیہ کے ایک معزز فرد بھی ہیں، بہت سنجیدہ مزاج، حلیم الطبع اور وجیہہ انسان ہیں، لیکن کئی دن گزر چکے ہیں اور عثمان رضی اللہ عنہ واپس نہیں آئے۔ لشکر اسلامی میں افواہ گشت کرنے لگی ہے کہ دامادِ رسول ﷺ کو قریش نے شہید کر دیا ہے۔ اس سے ایک عام اضطراب اور اشتعال کی کیفیت سب پر طاری ہے۔ بڑا نازک موقع ہے۔ مسلمان اپنے مرکز سے اڑھائی سو میل دور ہیں، جنگی تیاری بھی کر کے نہیں آئے، کوئی جنگی ساز وسامان ساتھ نہیں جبکہ دشمن کو ہر قسم کے وسائل حاصل ہیں۔

آخر رحمت للعالمین ﷺ کی باوقار آواز بلند ہوتی ہے۔

''اللہ کے مومن بندو! ہم صرف پرامن طریقے سے عمرہ کرنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ ہم نے

قریش کو ہر ممکن طریقے سے اپنے پرامن مقاصد کا یقین دلانے کی کوشش کی اور چاہا کہ وہ ہم سے معاہدہ کرلیں۔ آخری چارۂ کار کے طور پر ہم نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ کئی دن ہوگئے نہ تو وہ خود واپس آئے نہ ان کی طرف سے کوئی خبر آئی۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو اس خدا کی قسم جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے میں عثمان کے قصاص کے لئے اس وقت تک لڑوں گا جب تک میری گردن الگ نہ ہوجائے اور خداوند تعالیٰ اپنا فیصلہ پورا نہ کر دے۔ تم میں سے کون ہے جو میرے ہاتھ پر خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے بیعت کرتا ہے؟''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر بیعت کے لئے اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا اور فرمایا کہ یہ ہاتھ عثمان کا ہاتھ ہے۔ یہ دیکھ کر ایک صحابی نے بے اختیار کہا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ اس کے اپنے ہاتھ سے بہتر ہے۔ چودہ سو قدوسیوں کے مجمع کا جوش و خروش اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ سب آگے بڑھ بڑھ کر اپنا ہاتھ دست رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دینے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔ مجمع میں ایک بھی فرد ایسا نہ رہا جس نے عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لئے لڑنے اور جان تک دے دینے کا مقدس عہد نہ کیا ہو۔ تاریخ میں یہ بیعت بیعت رضوان، کے نام سے مشہور ہوئی۔ جب قریش کے جاسوسوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عزم بالجزم کی اطلاع انہیں پہنچائی تو ان کی عقل ٹھکانے آئی۔ انہوں نے یہ صرف عثمان رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا بلکہ انہیں عمرہ کر لینے کی پیشکش بھی کی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ نہیں کرتے، میں بھی نہیں کروں گا۔[1] پھر آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس پہنچے اور قریش کے حالات و خیالات سے آگاہ کیا۔

بالآخر صلح نامۂ حدیبیہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان طے پایا جس کا ذکر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالات میں کیا جا چکا ہے۔

مدینہ واپسی کے سفر کے اثنا میں ضجنان[2] کے مقام پر سورۃ الفتح (۴۸) نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''فتح مبین'' قرار دیا اور ان چودہ سو مسلمانوں سے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا جو بیعت رضوان میں شامل ہوئے فرمایا:

''اے نبی! جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر

---

[1] میر انیس نے اپنے ایک مرثیہ میں حضرت عباس علمبردار رضی اللہ عنہ سقۂ اہل بیت کی دریائے فرات کے کنارے معرکہ آرائی کا شاعرانہ نقشہ کھینچا ہے۔ واقعات کی تاریخی صحت سے قطع نظر، حضرت عباس مارتے دھاڑتے دریا کے کنارے پہنچ گئے مشک بھرلی۔ بہت پیاسے تھے، پانی پینا چاہا مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کی تشنگی یاد آگئی۔ اس لئے خود بھی پانی نہ پیا۔ گھوڑا بھی پیاسا تھا۔ اسے مخاطب کر کے کہا۔ تو پی لے اے فرس کہ بہت تشنہ کام ہے ہم پر تو بے حسین رضی اللہ عنہ کے پانی حرام ہے۔ حضرت عثمان کے عمل پر سبھی تاریخیں گواہ ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر مکہ پہنچ کر پیشکش کے باوجود عمرہ کرنے سے انکار کر دیا۔ عمرہ ہوگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہوگا۔ مولف

[2] مکہ سے تقریباً پچیس میل دور

اللہ کا ہاتھ تھا۔'' (آیہ ۱۰)

پھر آگے چل کے ارشاد ہوتا ہے:

''اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا۔ اس لئے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی۔ ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی اور بہت سا مالِ غنیمت عطا کیا جسے وہ (عنقریب) حاصل کریں گے۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔'' (آیہ ۱۸)

آخر میں ان اصحاب الشجرہ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں پاؤ گے، سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔'' (آیہ ۲۹)

سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ نے ''ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا'' (يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ) فرما کر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ انہوں نے اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ''اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔''

(لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ)

یہ سب کچھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خاطر ہوا اور ان کی طرف سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مار کر بیعت کی جو عثمان رضی اللہ عنہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی اعتماد پر شاہد ہے۔ یہ عز و شرف، یہ خصوصیت اور یہ امتیاز کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو سکا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک دوسرے تمام لوگوں کے ہاتھوں اور جانوں سے عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ کتنا افضل اور ان کی جان کتنی اہم عزیز اور گرامی تھی! اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز بنی امیہ کے سب سے پہلے مسلمان عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی قسمت میں لکھ دیا تھا کہ ان کے قصاص کی خاطر بیعت کرنے والوں کو اپنی خوشنودی اور بخشش و رحمت کا ابدی سرٹیفکیٹ عطا کرے۔ یہی بیعت رضوان فتح مکہ کی بنیاد بن گئی۔ اللہ علیم و خبیر ہے وہ اصل صورت حال کو جانتا تھا لیکن ظاہری صورت حال کو عثمان رضی اللہ عنہ کی عظمت اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے جذبۂ اخلاص پر شاہد بنانا مقصود تھا۔

صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی اشاعت، ترقی اور عروج کی راہیں کھل گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جان نثاران

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و اخلاق نے ہزاروں دلوں کو بے تیغ و تفنگ فتح کر لیا ان فتوحات و برکات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سفارتِ مکہ اور آپ کے انتقام کے لئے لی گئی بیعت رضوان کو بڑا دخل ہے۔ بیعت رضوان کے فوراً بعد خیبر فتح ہوا اور بالآخر دو سال بعد خود مکہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خاندان، قبولِ اسلام اور مکی زندگی

نسب اور خاندان

تو یہ ہیں حضرت عثمان بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی القرشی! قریش کا مشہور قبیلہ بنو امیہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پردادا امیہ سے منسوب ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں عبد مناف[1] پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ کی والدہ اروی بنت کریز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ام حکیم بیضا بنت عبدالمطلب کی صاحب زادی تھیں۔ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے نواسے تھے بنی امیہ کے خاندان کو زمانۂ جاہلیت سے عز و شرف اور اقتدار حاصل تھا۔ قریش کے تمام خاندانوں میں بنی ہاشم کے سوا ان کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ قریش کا قومی جھنڈا، عقاب، اسی خاندان کی تحویل میں رہتا تھا۔

بعثت نبوی کے وقت آپ کے والد عفان فوت ہو چکے تھے۔ آپ کی والدہ اروی نے عقبہ بن ابی معیط سے دوسرا نکاح کیا۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت عقبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ماں جائی بہن تھیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہجرت کرنے والی آپ سب سے پہلی مسلمان خاتون ہیں جو اپنے والدین اور حقیقی بہن بھائیوں کو چھوڑ کر تن تنہا مدینہ پہنچیں۔ سورہ ممتحنہ (۶۰) کی آیت ۱۰ آپ ہی کی ہجرت کے سلسلے میں نازل ہوئی۔ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ماں جائے بھائی تھے جو فتح مکہ کے موقع پر دوسرے بنی امیہ اور اہل مکہ کے ساتھ مسلمان ہوئے اور خلافت عثمانی کے دوران میں کوفہ کے گورنر رہے۔ اپنی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی ہجرت کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی والدہ بھی ہجرت کر کے مدینہ آ گئی تھیں۔ مسلمان ہوئیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مدینہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔

پیدائش

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اصحاب الفیل کے واقعہ کے چھ سال بعد (۵۷۶ء) میں پیدا ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ سال چھوٹے تھے۔ بعثت نبوی کے وقت آپ کی عمر ۳۴ سال تھی۔

---

[1] عبد مناف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپڑ دادا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے دادا۔ یہی عبد مناف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اپڑ دادا عبدالشمس کے والد تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم اور عثمان رضی اللہ عنہ کے اپڑ دادا عبدالشمس آپس میں بھائی تھے۔ آپ کی والدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد تھیں۔ یعنی باپ اور ماں دونوں کی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ داری تھی، تاہم دونوں خاندانوں بنی ہاشم اور بنی امیہ میں مکہ کے سیاسی و مذہبی قیادت کے سلسلے میں رقابت چلی آتی تھی۔ مؤلف

اسلام سے پہلے کی زندگی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بچپن کے حالات اور آپ کے والد کے حالات زندگی پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ بعثت نبوی سے پہلے آپ کے والد فوت ہو چکے تھے۔ چچا حکم بن العاص خاندان کے سربراہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ کے ان چند افراد میں سے تھے جو ظہور اسلام سے پہلے لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آپ ایک سلیم الفطرت، صالح، پرہیزگار، خوش خلق، منکسر المزاج، نرم خو، متین، باحیا، دیانتدار اور خوش معاملہ نوجوان کی حیثیت سے ممتاز اور نمایاں تھے۔ مکی معاشرہ میں رائج برائیوں سے اپنے دامن کو کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔ جاہلیت میں بھی شراب، زنا، جوا، قتل و غارت گری، جھوٹ، بد دیانتی، بدعہدی وغیرہ سے مجتنب رہے۔ جوان ہو کر تجارت شروع کی جو زیادہ تر غلے کی تھی۔ اس سلسلے میں روم و ایران کے دور دراز دیار و امصار کے سفر کیے، اپنی کاروباری سوجھ بوجھ، دیانت و امانت اور عمدہ اصول و اخلاق کی بنا پر تجارت میں بڑی ترقی کی اور قریش کے ملک التجار کہلائے۔ لوگوں میں مقبول اور معزز ٹھہرے۔ مکہ کے روسا میں شمار ہوئے، فطری نیک طبعی اور تجارت پیشگی کی مشترکہ خصوصیات کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ آپ کے قبولِ اسلام میں اس ہم مشربی کو بڑا دخل تھا۔

قبولِ اسلام

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسلام کے سابقون الاولون میں سے ہیں۔ آپ کا شمار صحابہ رضی اللہ عنہم کے طبقہ اولیٰ میں ہوتا ہے۔ روایات میں کہیں آپ کو چوتھا[1] مسلمان کہا گیا ہے کہیں چودھواں[2] اور کہیں ۳۵ واں یا ۳۶ واں[3]۔ آپ حضرت ابوبکر صدیق[4] کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اس وقت اسلام لائے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی دارارقم کو اپنا تبلیغی مرکز نہیں بنایا تھا۔ آپ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ ایک ہی دن مسلمان ہوئے۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آپ سے ایک دن بعد اسلام لائے۔ قبول اسلام کے وقت آپ کی عمر ۳۴ سال تھی[5]

۱۔ تاریخ الخلفا از سیوطی، ''عشرہ مبشرہ'' از قاضی حبیب الرحمٰن، حضرت عثمان، از عمر ابوالنصر۔ حضرت عثمان کا اپنا قول ہے کہ میں اسلام لانے والوں میں چوتھا ہوں اور یہی صحیح ہے۔ مؤلف

۲۔ بحوالہ مضمون ''مناقب سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ'' از مولانا محمد متین خطیب، مطبوعہ روزنامہ جنگ کراچی مؤرخہ ۱۴ جنوری ۱۹۷۴ء۔

۳۔ ''سیر الصحابہ (خلفائے راشدین)'' از معین الدین ندوی نیز ''محسن اعظم و محسنین'' از فقیر سید وحید الدین۔

۴۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اصابہ اور سیر الصحابیات کے حوالے سے اپنے مضمون ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغ دین میں عورتوں نے کیا ہاتھ بٹایا'' میں لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سعدیٰ بنت کریز کی ترغیب پر ایمان لائے تھے جو غالباً آپ کی پھوپھی یا خالہ تھیں لیکن راقم السطور کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ والی روایت زیادہ مشہور متداول اور صحیح ہے۔ مجھے طبقات ابن سعد میں سعدیٰ بنت کریز کا تذکرہ نہیں ملا۔

۵۔ عجیب بات ہے کہ قاہرہ یونیورسٹی کے تاریخ کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (مرحوم) اپنی کتاب مشاہیر اسلام کے صفحہ ۲۴ پر لکھتے ہیں کہ قبول اسلام کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عمر ۲۰ سال سے زیادہ نہ تھی حالانکہ اسی کے صفحہ ۲۳ پر یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے پانچ یا چھ سال بعد پیدا ہوئے۔ یہ دوسرا بیان درست ہے اس کے مطابق قبول اسلام کے وقت حضرت عثمان کی عمر ۳۴ سال ہوتی ہے۔ مؤلف

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے والد عفان فوت ہو چکے تھے۔ آپ کا چچا حکم بن العاص[1] خاندان کا سربراہ تھا اس نے آپ کو درخت کے ساتھ رسیوں سے جکڑ کر ڈنڈوں سے بری طرح پیٹا سخت ایذا پہنچائی اور اسلام ترک کرنے پر زور دیا۔ لیکن آپ نے کہا کہ ''بے شک جان سے مار ڈالو لیکن اب اسلام دل سے نہیں نکل سکتا۔ میں کسی صورت میں بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' تھک ہار کر چچا نے حضرت عثمان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ بنی امیہ میں سے آپ پہلے شخص ہیں جو اسلام لائے۔ تمام کافر اعزہ واقارب نے بے رخی اختیار کر لی۔ لیکن آپ نے ذرا پروانہ کی اور صبر واستقلال سے ان کی زیادتیاں برداشت کرتے رہے۔ ساتھ ہی اپنا تجارتی کاروبار بھی جاری رکھا۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے عقد

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پختگی ایمان، اخلاص، استقامت، حسن اخلاق، تقویٰ، متانت، حیاداری اور وجیہہ شخصیت سے بہت متاثر تھے اگرچہ وہ حسب ونسب اور دولت وثروت میں بھی ممتاز تھے اور مکی معاشرے میں ایک بلند مقام رکھتے تھے لیکن اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ان کے ایمان وتقویٰ کی وقعت اور سب اوصاف سے زیادہ تھی۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحب زادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا عقد آپ سے کر دیا۔ حضرت عثمان کے لئے یہ عظیم شرف تھا۔ مکہ میں یہ جوڑا مثالی خیال کیا جاتا تھا۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے ایک صاحب زادہ عبداللہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے جنہیں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نہایت عزیز رکھتے تھے۔ انہیں کے نام پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوعبداللہ ہوئی۔ لیکن یہ صاحب زادے چھ سال کی عمر میں ۴ھ میں مدینہ میں انتقال فرما گئے۔ یہ محمد ابن سعد کی روایت ہے۔ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ یہ صاحب زادے ۷۶ سال کی عمر تک زندہ رہے اور ان سے سلسلہ اولاد چلا۔ اس اختلافی روایت کی تفصیل آخر میں ازواج واولاد کے تحت دی گئی ہے۔

ہجرتِ حبشہ

جب مشرکین مکہ کے ظلم وستم کی انتہا ہو گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حبشہ (موجودہ ایتھوپیا) کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ مہاجرین حبشہ کا پہلا قافلہ گیارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھا جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھے۔ یہ ہجرت سنہ ۵ بعثت کے ماہ رجب میں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دونوں (عثمان اور رقیہ) حضرت لوط علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے لوگ ہیں جنہوں نے اہل وعیال سمیت اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔ کچھ عرصہ بعد قریش کے مسلمان ہو جانے کی خبر سن کر مہاجرین مکہ واپس

---

[1] یہ وہی حکم ہے جو مروان کا باپ تھا اور جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے شہر بدر کر دیا تھا لیکن وصال سے قبل اس کے حق میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سفارش قبول فرما کر مدینہ آنے کی اجازت دیدی تھی۔ اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ صلہ رحمی کی انتہا کر دی۔ اپنے پاس سے عطیات دیئے اس کے لڑکے مروان سے اپنی صاحب زادی کا عقد کر دیا جہیز میں ایک لاکھ درہم دیئے اور اسے اپنا سیکرٹری مقرر کیا۔ حکم کے متشددانہ رویہ کے مقابلے میں حضرت عثمان کی یہ صلہ رحمی ملاحظہ ہو: مولف

آ گئے مگر خبر غلط نکلی۔ دوسرے مسلمان تو پھر حبشہ کو لوٹ گئے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے اہل وعیال سمیت مکہ ہی میں ٹھہر گئے اور کفار کی زیادتیاں برداشت کرتے رہے۔ ابن سعد اور سیوطی کی روایت کے مطابق آپ نے دوسری مرتبہ بھی حبشہ کی طرف ہجرت کی۔

ہجرتِ مدینہ اور مدنی زندگی

بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد جب مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا عام حکم ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں پہنچ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے متصل ایک قطعہ زمین برائے مکان آپ کو عنایت فرمایا۔ آپ کے مکان کی کھڑکی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کے سامنے تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کھڑکی سے آپ کے ہاں تشریف لے جاتے تھے۔

مواخاۃ

مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی مواخاۃ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے قائم کی تھی۔ مدینہ پہنچنے کے بعد جب مہاجرین وانصار میں مواخاۃ قائم کرنے کا سوال پیدا ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی مواخاۃ انصار بنی نجار کے حضرت اوس بن ثابت بن منذر رضی اللہ عنہ سے قائم کی جو بڑے مرتبے کے صحابی تھے۔ شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے اور ستر انصار کے ساتھ بیعت عقبہ ثانیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور پھر بدر واحد کے غزوات میں شریک ہوئے۔

مدینہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تجارتی کاروبار پھر سے خوب چمک اٹھا۔ خود تو اپنا زیادہ وقت صحبت نبوی میں گزارتے تھے لیکن اپنا مال تجارت دوسروں کو مضاربت پر دے دیا کرتے تھے۔ تجارت سے پیدا کردہ دولت کو آپ نے اسلام کی ترقی واشاعت اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بے دریغ خرچ کیا۔ ہمیشہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ مشوروں اور غزوات میں شامل رہے۔ البتہ غزوۂ بدر میں شامل نہ ہو سکے کیونکہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سخت علیل تھیں اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان کی تیمارداری کے لئے مدینہ ہی میں چھوڑ گئے تھے۔ جب فتح بدر کی خوشخبری لے کر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے تو حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو دفن کیا جا رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بدریوں میں شمار کیا اور مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا۔ وہ جسمانی طور پر کفر واسلام کے اس معرکہ میں شریک نہ تھے لیکن ان کا دل وہیں اٹکا ہوا تھا اور بقول اقبال ع

سمجھو ہمیں وہاں ہی دل ہو جہاں ہمارا

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے عقد

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عزیمت ایمانی، حسن اخلاق اور دینی خدمات سے اس قدر خوش تھے کہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد اپنی دوسری صاحب زادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا عقد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا اور خانوادہ نبوت سے آپ کا پھر سے رشتہ قائم ہو گیا۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے آپ کے کوئی اولاد نہیں

ہوئی جب ۹ھ میں وہ فوت ہوئیں تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر میری چالیس ناکتخدا بیٹیاں ہوتیں تو بھی میں یکے بعد دیگرے ان کا نکاح عثمان سے کر دیتا۔"[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحب زادیوں کے یکے بعد دیگرے نکاح کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ذوالنورین یعنی دونوروں والے کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ یہ عظیم شرف عثمان رضی اللہ عنہ کے سوا کسی دوسرے کے نصیب نہ تھا۔

غزوات نبوی میں شرکت

غزوہ بدر کے بعد آپ تمام غزوات نبوی میں تن من دھن سے شریک رہے۔ یہ روایت غلط طور پر مشہور ہوگئی ہے کہ آپ جنگ احد سے بھاگ گئے تھے۔ اس کی توجیہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالات میں کی جا چکی ہے۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی غلط افواہ پھیل جانے سے متعدد مخلص اور جاں نثار صحابہ بددل اور مایوس اور سراسیمہ ہو کر بیٹھ گئے تھے کہ اب لڑنے کا کیا فائدہ؟ لیکن جونہی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ سلامت ہیں تو تمام صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے۔ تاہم غلط فہمی کی بناء پر ہتھیار پھینک کر بیٹھ جانے والوں یا میدان جنگ سے دور و مفرور ہو جانے والوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کر دیا جس پر خود قرآن گواہ ہے۔[2]

یہ درست ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی فطری نرم طبعی، امن پسندی اور حد سے بڑھی ہوئی صلہ رحمی کی خصوصیات کی بنا پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، حمزہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وغیرہ سابقون الاولون کی طرح جری، شجاع، اشداء علی الکفار اور جنگ کے مرد میدان نہ تھے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ بزدل یا بھگوڑے تھے۔ آپ نے ہر غزوہ اور ہر مشکل مرحلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ جیسا کہ ابتداء میں مذکور ہوا، آپ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں جان ہتھیلی پر رکھ کر کفارِ قریش کی طرف سفیر بن کر گئے تھے۔ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جری انسان نے بھی معذرت پیش کر دی تھی۔ بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ کے ہیرو آپ ہی تھے۔ حدیبیہ کے بعد غزوہ خیبر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کیمپ کمانڈر مقرر کیا تھا۔ آپ کا خاص فرض یہ تھا کہ یہودیوں اور ان کے حلیف بنی غطفان کے لشکروں کو اکٹھا نہ ہونے دیں۔ چنانچہ آپ کی تدبیر اور کارروائی سے دشمنوں کو اکٹھے ہو جانے کا موقع نہ مل سکا اور وہ اسلامی لشکر کا متحد ہو کر مقابلہ نہ کر سکے اور خیبر نسبتاً زیادہ آسانی سے فتح ہو گیا۔ فتح مکہ اور غزوہ حنین میں بھی آپ نے نمایاں حصہ لیا۔

---

[1] علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ الخلفا میں یہ روایت ابن عساکر کے حوالے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زبانی لکھی ہے۔ محمد ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میری تیسری بیٹی ہوتی تو میں اس کو بھی عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دے دیتا۔ یہ آخری روایت زیادہ صحیح اور قرین قیاس ہے۔ مؤلف

[2] دیکھئے سورہ آل عمران آیہ ۱۵۹- مقام حیرت وافسوس ہے کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو معاف کر دیا لیکن بعض بندے معاف نہیں کرتے۔ مؤلف

غزوۂ تبوک۔ جیش العسرہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ فائدہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مال سے پہنچا۔ آپ نے مسلمانوں کے لئے جنگی سروسامان کی فراہمی پر دل کھول کر اپنا مال خرچ کیا۔ خاص کر ۹ ھ میں غزوہ تبوک کے سلسلے میں "جیش العسرہ" کے تیس ہزار مجاہدین میں سے ایک تہائی کے لئے آپ ہی نے جنگی اسلحہ و سامان مہیا کیا۔ اسی موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا تمام مال و متاع لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا آدھا مال لے آئے تھے اور ایسے مخلص بھی تھے جنہوں نے رات بھر کسی کے باغ یا کھیت کو سینچ کر چند مٹھی کھجوریں حاصل کیں اور وہی لا کر خدمت عالی میں پیش کر دیں بعض ایسے بھی تھے جو بے سروسامان تھے اور اپنی بے سروسامانی پر روتے تھے۔ ان سب کا خلوص اور جذبہ بے حد قابل قدر اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں مقبول تھا۔ لیکن اکیلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو کچھ پیش کیا وہ بہت سے دوسرے صحابہ کرام کے مجموعی سازوسامان سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے مزید ایک ہزار اونٹ ستر گھوڑے اور ایک ہزار طلائی دینار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے اقدس اطمینان و مسرت سے چمک اٹھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ما ضر عثمان ما عمل بعد هذا اليوم[1]

(آج کے بعد عثمان کا کوئی بھی عمل اس کو نقصان نہیں پہنچائے گا)

یعنی عثمان رضی اللہ عنہ کو اللہ اور رسول کی دائمی خوشنودی حاصل ہوگئی۔

غزوہ ذات الرقاع (علاقہ نجد) کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا جو ایک بڑا اعزاز تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق جیش اسامہ رضی اللہ عنہ میں ایک معمولی ماتحت مجاہد کی حیثیت سے شرکت کی حالانکہ اسامہ رضی اللہ عنہ محض ایک اٹھارہ سالہ ناتجربہ کار نوجوان تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ان سے بہت بڑھ کر تھا، مگر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا عثمان رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے صحابی کو اس سے سرتابی کا خیال بھی نہ آ سکتا تھا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد عہد ابوبکر رضی اللہ عنہ میں روانہ ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس میں شامل رہے۔

دیگر رفاہی کام۔ جنت کی بشارتیں

مسلمانوں کی دفاعی تیاریوں پر مال خرچ کرنے کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی عام تکالیف کے ازالہ کے لئے بھی بہت مال خرچ کیا۔ مدینہ میں مسلمانوں کو پینے کے پانی کی سخت تکلیف تھی۔ بیئر رومہ نامی ایک کنواں تھا جس کا مالک ایک یہودی تھا وہ مسلمانوں کے ہاتھ بھاری قیمت پر پانی فروخت کرتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] مستدرک حاکم جلد ۳ نیز ترمذی۔ باب مناقب عثمان۔ جدید تحقیق کے مطابق مستدرک کے مؤلف حاکم شیعی رجحانات رکھتے تھے۔ مؤلف

نے فرمایا کہ ''اگر کوئی مسلمان اس کنوئیں کو یہودی سے خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دے تو میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہوں۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہودی کو منہ مانگی قیمت بیس ہزار درہم ادا کر کے کنواں خریدا اور مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔[1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جنت کی ایک اور ضمانت مل گئی۔

مسجد نبوی کی توسیع کے لئے زمین

لوگوں کے جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے اور بیرونجات سے آ کر مدینہ میں رہائش اختیار کرنے سے مسجد نبوی مسلمانوں کے لئے تنگ ہوگئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''کون ہے جو مسجد کا متصلہ قطعہ زمین خرید کر مسجد کے لئے وقف کر دے؟ اللہ اسے اس سے بہتر جگہ جنت میں عطا فرمائے گا۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مطلوبہ قطعہ زمین خرید کر مسجد کی توسیع کے لئے دے دیا۔ جنت کی ایک اور بشارت۔

کاتب وحی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تحریر بہت پختہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر آپ سے کاتب وحی کا کام لیتے تھے۔ کاتبان وحی میں آپ کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔

شیخین رضی اللہ عنہما سے تعاون

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آپ کے قبل اسلام سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اسلام نے انہیں مزید تقویت بخشی۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے بھرپور تعاون کیا۔ ان کے مشوروں میں شامل رہے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو آپ کی اصابت رائے پر اس قدر اعتماد تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نامزدگی کے بارے میں آپ سے خصوصی مشورہ کیا اور اپنی وصیت انہی سے لکھوائی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی بلا حیل وحجت کی اور امور خلافت کی انجام دہی میں ان کے مشیر ومعاون رہے۔ آپ ان کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن تھے۔ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ ردیف کہلاتے تھے یعنی ایسا شخص جس کے متعلق توقع کی جاتی ہو کہ امیر کے بعد وہ امیر ہوگا۔ جیسے غزل میں قافیہ کے بعد ردیف آتی ہے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ دینی مسائل میں فتویٰ دینے کے مجاز تھے خاص کر وراثت سے متعلقہ مسائل میں آپ کو بڑی مہارت تھی اور لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔

---

[1] یہ کنواں مدینہ کے شمال مغرب میں وادی عقیق میں سیلابی وادیوں کے مقام اتصال کے قریب واقع ہے اس کا قطر ۴ میٹر اور گہرائی ۱۲ میٹر ہے۔ یہ کنواں بار بار تعمیر ہوا۔ اس زمانے میں مدینہ سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ آج کل یہ قرب وجوار کی مزروعہ اراضی کے ساتھ مسجد نبوی کے اوقاف میں شامل ہے۔ مؤلف

انتخاب بطور خلیفہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جب قاتلانہ حملہ کیا گیا اور بچنے کی امید نہ رہی تو انہوں نے عشرۂ مبشرہ میں سے جو سات حضرات حیات تھے اور اہل حل وعقد تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے آخری دم تک خوش رہے تھے، ان میں سے چھ پر مشتمل ایک مجلس مشاورت یا انتخابی کونسل مقرر کر دی کہ اپنے میں سے یا اہل بدر واحد میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

۱- حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

۲- حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

۳- حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

۴- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

۵- حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ

۶- حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ

اگرچہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ بھی عشرۂ مبشرہ میں تھے اور حیات تھے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محض اپنی رشتہ داری کی وجہ سے انہیں انتخابی مجلس میں شامل نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انتخابی مجلس کے ارکان کو تاکید کر دی تھی کہ ان کی وفات کے بعد تین دن کے اندر نئے خلیفہ کا انتخاب کر لیا جائے تاکہ افتراق وتفرقہ کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ انتخابی مجلس کے ارکان حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کے مکان میں جمع ہوئے۔ پہلے دو دن تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا عامتہ المسلمین میں قیاس آرائیاں اور چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ سرحدوں پر رومی اور ایرانی بھی مدینہ کی صورت حال پر نگاہ رکھے ہوئے تھے اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کے لئے موقع کی تلاش میں تھے۔ ارکان مجلس میں اختلاف رائے تھا اور وقت تیزی سے اڑا جا رہا تھا یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ دوسروں کے مقابلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حقدار تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خلافت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا لیکن کسی دوسرے رکن نے تائید نہ کی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پہلے ہی امیدواری سے دستبردار ہو چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کر کے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ خود بخود امیدواروں کی فہرست سے خارج ہو گئے۔ ان کا اپنا نام کسی دوسرے رکن نے بھی تجویز نہ کیا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ سے باہر تھے۔ اب میدان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رہ گئے۔ دونوں میں سے کوئی امیدواری سے دستبردار ہونے پر تیار نہ تھا۔

یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے دوسرے ارکان مجلس سے کہا کہ ”میں خلافت کی امیدواری سے دستبردار ہو چکا۔ اگر آپ لوگ مجھے حکم تسلیم کر لیں اور میرے فیصلے کی پابندی کرنے کا وعدہ کریں تو

میں آپ لوگوں میں سے کسی موزوں شخص کو ملت اسلامی کے لئے منتخب کردوں۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، سعد رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ اس پر راضی ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے تو خاموش رہے پھر کہا کہ ''عبدالرحمٰن! پہلے یہ وعدہ کرو کہ تم فیصلہ کرنے میں کسی رشتہ داری و قرابت کا لحاظ نہ کرو گے۔ صرف حق کی پیروی کرو گے اور اسلام کے مجموعی مفاد کو پیش نظر رکھو گے۔''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے وعدہ کیا۔ دوسرے اصحاب کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی انتخاب کا کلی اختیار حضرت ابن عوف کے سپرد کر دیا فیصلے کا اختیار فرد واحد کے ہاتھ میں آ گیا جسے ایک بے حد دوررس نتائج کا حامل اہم تاریخی و سیاسی فیصلہ کرنا تھا۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے وہ رات مدینہ کے سرکردہ شہریوں، مہاجرین و انصار کے نمائندوں، عمال حکومت، فوجی افسروں، امہات المومنین، متعدد دوسری خواتین اور مدینہ کے عوام سے مشورہ کرنے میں گزاری۔ مختلف صوبوں، علاقوں کے حجاج بھی شہر میں موجود تھے۔ ان سے بھی صلاح مشورہ کرنے سے حتمی فیصلہ تک پہنچنے میں بڑی مدد ملی۔ اس انتخاب میں جتنے مردوں عورتوں کی اہل الرائے تعداد سے مشورہ کیا گیا، کسی دوسرے خلیفہ کے انتخاب میں نہ کیا گیا۔ کثرت رائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں تھی۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے براہ راست علیحدگی میں بات چیت شروع کی۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''اے ابوالحسن! اس میں شک نہیں کہ آپ گوناگوں فضائل و اوصاف کی وجہ سے خلافت کے مستحق ہیں لیکن اگر کسی وجہ سے آپ خلیفہ منتخب نہ ہو سکیں تو پھر آپ کے نزدیک اس منصب کا سب سے زیادہ مستحق کون ہو سکتا ہے؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔ جب عثمان رضی اللہ عنہ سے یہی سوال کیا گیا تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔

تیسری رات آ گئی۔ حضرت ابوطلحہ انصاری نے یاددہانی کرائی کہ اگلی صبح کو فیصلہ بہرحال ہو جانا چاہئے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ رات بھر نہیں سوئے۔ زیادہ سے زیادہ قابل وقعت لوگوں سے مشورے کرتے رہے۔ رات کے پچھلے پہر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک آخری طویل گفتگو کی حتیٰ کہ تڑکا ہو گیا۔

فجر کی نماز کے بعد ارکان مجلس مسجد نبوی میں جمع ہو گئے۔ فیصلہ سننے کی توقع میں مہاجرین و انصار۔ معززین و اکابرین، فوجی اور سول افسر اور عام مسلمان بھی اکٹھے ہو گئے۔ مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور خلیفہ کے انتخاب میں مجمع عام سے ایک آخری رائے طلب کی۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب پر زور دیا۔ حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ اور ابن ابی ربیع رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وکالت کی۔ تکرار اور ہنگامہ کی صورت پیدا ہو گئی۔ بنی ہاشم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا مطالبہ کیا جبکہ بنی امیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا استحقاق جتایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ظہور اسلام کے بعد بنی ہاشم اور بنی امیہ کی دیرینہ رقابت نے نئے سرے سے سر اٹھایا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''اس سے پہلے کہ کوئی فتنہ سر اٹھائے آپ اس کام

سے فارغ ہو جائیں اور اپنا فیصلہ سنا دیں" ابن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے بہت غور وفکر کیا ہے اور اپنا وقت صرف کیا ہے اب میں اپنا فیصلہ سناؤں گا۔ لوگوں کو چاہئے کہ بغیر تامل، انقباض خاطر اور ذہنی تحفظ کے اسے کھلے دل سے قبول کر لیں اور میری طرف سے کسی بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں نے مسلمانوں کی خیر خواہی کرنے میں پوری کوشش کی ہے۔"

اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور کہا کہ اگر آپ کو خلیفہ بنا دیا جائے تو آپ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضی اللہ عنہما کی سیرت کے مطابق عمل کریں گے؟" حضرت علی نے جواب دیا کہ "جہاں تک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے ہاں لیکن شیخین رضی اللہ عنہما کی سیرت کے علاوہ میں اپنی بصیرت اور صوابدید سے بھی کام لوں گا۔"

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے یہی سوال کیا گیا تو انہوں نے غیر مشروط طور پر ہاں میں جواب دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشروط جواب سے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ مطمئن نہیں ہوئے کیونکہ انہوں نے محسوس کیا اور اکابر صحابہ کی اکثریت بھی ان کی ہم خیال تھی کہ حالات شیخین رضی اللہ عنہما کی پالیسی اور طرز عمل کو بحال و برقرار رکھنے کے متقاضی تھے۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جواب اپنی فکر و بصیرت پر اعتماد رکھنے والے مخلص اور بالغ نظر انسان کا جواب تھا اور ہر قسم کی وقتی مصلحت سے بالاتر تھا (بعد میں خلیفہ ہو کر بھی انہوں نے وقتی مصالح کو بالائے طاق ہی رکھا) لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دوٹوک غیر مشروط مثبت جواب نے معاملہ کا فیصلہ کر دیا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنا سر آسمان کی جانب اٹھایا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا:

"اے اللہ! تو گواہ رہنا کہ جو بوجھ اب تک میرے سر پر تھا میں اسے عثمان کے سر پر رکھتا ہوں۔ میں نے اپنا اختیار عثمان کی طرف منتقل کر دیا۔"

پھر کہا: "اے عثمان رضی اللہ عنہ! ہم کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت شیخین رضی اللہ عنہ کی متابعت کی شرط پر آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے حضرت عثمان کی بیعت کر لی۔ ان کے فوراً بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ احتجاج کے بعد اپنا ہاتھ عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر ان سے مخلصانہ تعاون کرتے رہے بزرگ صحابی حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ، جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انتخابی کارروائی کی نگرانی کے لئے مقرر کیا تھا، نے کہا: "عبدالرحمٰن تم نے علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا حالانکہ علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ حق کے مطابق فیصلہ کرتے اور عدل وانصاف کو پیش نظر رکھتے ہیں۔" حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "اے مقداد! خدا کی قسم میں نے مسلمانوں کی مقدور بھر خیر خواہی کی ہے۔ میں نے جس شخص کو مسلمانوں کے لئے بہتر سمجھا اسی کو نامزد کیا۔ تمہیں اللہ سے ڈرنا چاہئے کیونکہ ایسی باتوں سے فتنہ وفساد کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔" اس پر مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا "اگر آپ کا ارادہ

اللہ کی رضا جوئی ہے تو اللہ آپ کو ان لوگوں کی مانند ثواب دے جو اچھے کام کرتے ہیں۔"

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد تمام اکابر صحابہ اور عامتہ المسلمین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی۔ بنی ہاشم کے بعض افراد نے بے اطمینانی کا اظہار کیا لیکن بیعت سے منہ نہیں موڑا۔ مشہور شیعہ عالم اور مؤرخ شیخ ابوجعفر محمد بن حسن بن علی الطوسی (متوفی ۴۶۰ھ) نے اپنی کتاب (امامی) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ہوا تو انہوں نے مجلس شوریٰ کے چھ منتخب آدمیوں میں مجھے چھٹا مقرر کیا تو میں ان کے شامل کرنے پر شریک ہوگیا۔ میں نے مسلمانوں کی جماعت میں تفریق کو ناپسند کیا اور اتفاق کی لاٹھی کو توڑنا مکروہ جانا۔ پس تم لوگوں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے بیعت کی۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب عوامی انتخاب کہلانے کا مستحق ہے اور صحابہ کے اتفاق رائے سے ہوا۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "منہاج السنہ" جلد۳ میں امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول درج کیا ہے کہ "جس طرح بیعت عثمان رضی اللہ عنہ پر لوگوں نے اتفاق کرلیا اس طرح کسی بیعت پر اتفاق نہیں ہوا۔ اہل اسلام نے تین روز کی باہمی مشاورت کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا والی و حاکم تسلیم کرلیا۔ اس مسئلہ پر مسلمان متفق و متحد ہوگئے۔ انہوں نے آپس میں محبت و دوستی کے ساتھ اللہ کے دین کی رسی کو مضبوط پکڑ لیا۔"

سرولیم میور نے اپنی تصنیف خلافت کا عروج و زوال کے صفحہ ۱۹۷ (حاشیہ۲) میں یوں تبصرہ کیا ہے۔

"انہوں (عبدالرحمٰن بن عوف) نے اپنا مشکل فرض ایک وفادار اور بے لوث محبّ ملت کی طرح ادا کیا۔ وہ رات دن سربرآوردہ افراد کے خیالات و جذبات معلوم کرنے میں لگے رہے انہوں نے انتخابی مجلس کے ارکان کے باہمی متخالف دعاوی کو ایک قابل عمل سمجھوتے میں سمونے کی بہترین کوشش کی۔ عثمان رضی اللہ عنہ کی نامزدگی کا فوری سبب یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ضمیر کے تقاضا کے تحت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسی پر سختی سے پابند رہنے کا عہد کرنے میں ہچکچاہٹ دکھائی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی تو بہر حال کریں گے لیکن پہلے دو خلفاء کی سنت کی پابندی صرف اپنی صوابدید کی حد تک کریں گے۔ لیکن جس طرح عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے پہلے علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیے اور پھر عثمان رضی اللہ عنہ سے اور ان دونوں نے جس طرح جواب دیئے ان میں اس مفروضہ کے لئے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ عباسیوں نے اپنے دور اقتدار میں جعلی روایات وضع کرلیں۔"

اس موقع پر دل میں ایک عجیب سا خیال گزرتا ہے کہ پہلے دو خلفاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر تھے جن میں حضرت صدیق اکبر سینئر تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے۔ ان دونوں میں حضرت عثمان سینئر اور دوہرے داماد تھے۔ پھر چاروں حضرات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے کم عمر تھے۔ عام رواج کے مطابق دامادوں کے مقابلے میں خسر اپنی بزرگی اور رشتہ مصاہرت کی بناء پر زیادہ قابل احترام سمجھے جاتے ہیں خصوصاً جب کہ تقویٰ و دینداری میں یکساں ہوں۔ امر خلافت میں بھی یہ سنیارٹی اور تقدم و تاخر برقرار رہا جیسے اللہ کی

مشیت یہی تھی اور یہی ترتیب بہترین تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اخلاص اور بے لوثی سے کام لیا اور بڑی تگ ودو کی۔ خواص وعوام کے خیالات معلوم کیے۔ وہ بنی امیہ میں سے نہ تھے۔ جہاں تک ان کے بس میں تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو پیش نظر رکھا اور اپنی طرف سے پوری خیر خواہی کی۔ کثرت رائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے حق میں تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے رائے عامہ کا لحاظ کیا اور اکثریت نے ان کے فیصلے کی تائید کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی بیعت کر لی۔ تاہم آنجناب رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ خلافت کا مستحق سمجھتے تھے۔ انہوں نے کوئی موروثی حق امامت نہیں جتایا نہ کوئی نظریہ امامت پیش کیا۔ علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انتخابی مجلس میں ایک تقریر نقل کی ہے۔ جس کے آخر میں انہوں نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے کوئی معاہدہ کرتے تو ہم اس معاہدہ کو نافذ کراتے اور اگر ہم سے کوئی بات کہتے تو ہم مرتے دم تک اس قول پر ڈٹے رہتے۔ دعوت حق اور صلہ رحمی میں کوئی مجھ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ تاہم قدرت اور اختیار صرف اللہ ہی کو ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے لئے آپ کے حق میں وصیت کی ہوتی تو آپ کسی دوسرے کو اپنا حق کبھی غصب نہ کرنے دیتے۔ وصیت کی عدم موجودگی میں آپ بھی دوسروں کی طرح خلافت کے ایک امیدوار تھے۔

مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک سے زیادہ دفعہ اپنی تقریروں میں فرمایا کہ ''ہم تمام صحابہ نے اتفاق کر لیا اور ہم نے جو ہم سب میں بہتر اور افضل تھا اور اس کو فوقیت تھی، اس کے تلاش کرنے میں کمی نہیں کی۔ پھر ہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔''[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری سالوں میں ان کی بعض پالیسیوں سے خود حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اختلاف کیا لیکن ان کے چناؤ کے وقت سبھی نے انہیں بہترین امیدوار قرار دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سمجھانے اور ان کا دفاع کرنے میں کوشاں رہے کبھی کھلی مخالفت پر نہیں اترے۔ یہ ان کی عظمت وشان بے لوثی اور ملی خیر خواہی کی ایک اور دلیل ہے۔

حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ مدینہ سے باہر ہونے کی وجہ سے انتخابی مجلس کی کارروائی میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ جب واپس آئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت ہو چکی تھی وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ موخر الذکر نے فرمایا ''تمہیں اس معاملے میں اختیار ہے اگر تم انکار کرو گے تو میں اس معاملہ کو لوٹا دوں گا۔'' حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا ''کیا آپ واقعی لوٹا دیں گے۔'' آپ نے فرمایا ''ہاں'' طلحہ نے پھر پوچھا ''کیا تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے؟''

آپ نے جواب دیا ''ہاں'' طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی یہ کہہ کر بیعت کر لی کہ میں لوگوں کے متفقہ فیصلہ سے الگ نہیں رہنا چاہتا۔''[2]

---

1. طبقات ابن سعد جلد سوم
2. تاریخ طبری حصہ سوم (خلافت راشدہ حصہ دوم)

مشہور شاعر فرزدق حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آل علی رضی اللہ عنہ کا حامی تھا اس نے اس موقع پر اشعار کہے جن کا ترجمہ یہ ہے۔

۱- صہیب[۱] نے تین دن تک نماز پڑھائی پھر اس غیر محدود ملک کو ابن عفان کے سپرد کر دیا۔

۲- یہ وہ خلافت تھی جو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھی کے سپرد کی تھی یہ سب ہدایت یافتہ اور اپنے خدا کی طرف سے مامور صحابہ کرام تھے۔

خطبہ بیعت

جب مجلس مشاورت کے ارکان نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو آپ نے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کیا۔ آپ اپنی کامیابی پر ہشاش بشاش ہونے کی بجائے بہت اداس اور افسردہ معلوم ہوتے تھے۔ آپ نے فرمایا:

''اے لوگو! تم اپنے کو قلعہ بند گھروں میں محفوظ سمجھتے ہو (جو خام خیالی ہے) یہ دنیا فانی ہے۔ چند روزہ زندگی میں زیادہ سے زیادہ نیک کام کرنے کی کوشش کرو کیونکہ تمہیں صبح یا شام کوچ کرنا ہوگا۔ تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے۔ گزرے ہوؤں کے حالات و واقعات سے عبرت حاصل کرو۔ غفلت شعار نہ بنو۔ خدا تم سے غافل نہیں ہے۔ کہاں ہیں وہ اہل دنیا جنہوں نے بڑی بڑی شاندار عمارتیں بنائیں اور دنیا کی نعمتوں سے لذت اندوزی میں لگے رہے؟ کیا دنیا نے انہیں اپنے سے دور نہیں پھینک دیا؟ تم بھی دنیا کو وہیں پھینک دو جہاں اللہ نے اسے پھینکا ہوا ہے۔ اس کی بجائے آخرت کے طلب گار رہو۔'' [۲]

پہلا مقدمہ

عنانِ خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے جو پہلا مقدمہ پیش ہوا وہ عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا تھا۔ اس کا کچھ ذکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابولولو کے لگائے ہوئے زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ قاتل کے خنجر کے بارے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے بیان دیئے تھے کہ وہ خنجر انہوں نے ہرمزان اور جفینہ کے پاس دیکھا تھا اور پوچھنے پر انہوں نے غیر تسلی بخش جواب دیا تھا۔ عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو یقین ہو گیا کہ ان کے والد محترم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہرمزان اور جفینہ کی

[۱] حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ عہد جاہلیت میں غلام رہے تھے۔ اسلام نے انہیں یہ عزت اور مرتبہ بخشا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد تین دن تک مدینہ میں موجود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نماز پڑھاتے رہے۔ جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور دوسرے بزرگ صحابہ بھی شامل تھے۔ مؤلف

[۲] تاریخ طبری

سازش سے شہید کیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد انہوں نے قصاص کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے کر ہرمزان جفینہ اور ابولؤلو کی کمسن مسلمان بیٹی کو قتل کر دیا۔ حالانکہ قصاص کا معاملہ نئے خلیفہ کو طے کرنا چاہئے تھا۔ عبید اللہ رضی اللہ عنہ دو مسلمانوں (ہرمزان اور بنت ابولؤلو) اور ایک ذمی عیسائی (جفینہ) کے قتل کا مرتکب ہوا۔ ان کا جرم ثابت نہ تھا نہ ظن وگمان کی بناء پر ان کا قتل جائز۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے بعد یہ پہلا کذھب مقدمہ تھا جو ان کے سامنے پیش ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مقتولین کے قصاص میں عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا مشورہ دیا لیکن اکثریت نے کہا کہ کل عمر رضی اللہ عنہ ایک کافر غلام کے خنجر کا نشانہ بنے اور ملت اسلامیہ کے لئے ان کی عظیم خدمات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آج اگر ان کا بیٹا قصاص میں مارا جائے تو یہ ایک مزید المیہ ہو گا۔ خاص کر بنی عدی (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خاندان) اس پر خاموش نہیں رہیں گے۔ فطرتاً نرم دل عثمان رضی اللہ عنہ ہچکچاہٹ میں پڑ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد صورت حال کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے قتل سے کسی دوسرے فتنے کا پیدا ہو جانا بعید از امکان نہ تھا۔ اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قصاص کو خون بہا میں بدل دیا اور خون بہا کی رقم بھی یہ کہہ کر اپنی جیب سے ادا کر دی کہ میں مقتولوں کا ولی ہوں۔

طبری کے ہاں ایک روایت یہ بھی ہے ابن سعد نے طبقات میں اور محمد حسین ہیکل نے بھی ''عمر فاروق اعظم'' میں اس کا ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو ہرمزان کے بیٹے قماذان کے حوالے کر دیا تھا کہ اپنے باپ کے قصاص میں اسے قتل کر دے۔ چنانچہ وہ عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ لے گیا اور پھر اللہ کی خوشنودی کے لئے اسے معاف کر دیا۔ معاملہ بظاہر خوش اسلوبی سے نپٹ گیا لیکن بعض تلخ اور دوررس اثرات چھوڑ گیا۔ اگر عہد فاروقی میں ایسا واقعہ پیش آتا تو وہ اپنے بیٹے کو بھی ہرگز معاف نہ کرتے۔ اس واقعہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے نہج میں ایک بین فرق ابتدا ہی سے نمایاں کر دیا۔ راقم کے نزدیک یہ روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ عبید اللہ کے چھوٹ جانے سے شاید آگے چل کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہونے والے قاتلوں کو بھی امید بندھی ہو کہ وہ بھی بچ نکلیں گے۔ عامتہ المسلمین پر بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کچھ زیادہ ہی بردباری اور نرم مزاجی کا تاثر قائم ہوا۔ بہرحال کوئی ناپسندیدہ ردعمل فوری طور پر سامنے نہیں آیا۔ ولیم میور کے بقول ایسا خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے فیصلے سے لوگوں نے عمومی اختلاف کیا ہو خاص کر جب کہ ہرمزان کے بیٹے نے عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو معاف کر دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آغاز اس عالم میں ہوا کہ ایک مسلمان (عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) کے ہاتھوں دو مسلمان (ہرمزان اور بنت ابولؤلو) اور ایک ذمی (جفینہ) قتل ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کسی مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو عمداً قتل نہیں کیا تھا۔ خلافت عثمانی کے لئے اسے بدشگونی ہی سمجھنا چاہئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک غیر معمولی واقعہ سے اپنے دور کا آغاز کیا اور بالآخر اپنی مظلومانہ شہادت سے اسے نقطۂ عروج پر پہنچایا۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے معاملات کے والی تھے۔ والی ہونے کی حیثیت سے ان کو اس کا حق تھا کہ وہ معاف کر دیتے۔ انہوں نے عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو معاف کر کے نہ حدود اللہ میں سے کسی کو معطل کیا نہ ہرمزان اور اس کے دونوں ساتھیوں کے خون سے بے اعتنائی برتی۔ اس لئے کہ اپنے مال میں سے انہوں نے دیت ادا کر دی۔ لیکن اس قسم کی معافی دین کے معاملے میں شدت برتنے والوں کو مشتبہ کر دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عبید اللہ کو اس کے جرم کی کوئی سزا نہیں ملی۔ اپنے مال سے معاوضہ ادا کر کے وہ سزا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود بھگتی جو عبید اللہ کو بھگتنی چاہئے تھی۔''

اور پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا جو مشورہ دیا تھا وہ عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے منہ میں تلخ مزا چھوڑ گیا۔ جنگ صفین کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے صرف وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑے اور قتل ہوئے۔

حکام اور عوام کے نام احکام و ہدایات

جب بیعت عام ہو چکی اور عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے مقدمے کا فیصلہ بھی ہو گیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امور خلافت کی طرف توجہ کی۔ مختلف صوبوں اور اضلاع کے والیوں، فوجی سالاروں، محصلین خراج اور عوام کے نام ضروری احکام، فرامین اور ہدایات جاری کیں۔ دراصل یہ احکام و فرامین و ہدایات شیخین رضی اللہ عنہما کی پالیسی کی تجدید، توثیق اور یاد دہانی کے طور پر ہی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے انتخاب کے وقت شیخین رضی اللہ عنہما کی پالیسی پر کاربند رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ سول اور فوجی افسروں اور عوام الناس نے ان احکام و ہدایات کا خوش دلی سے استقبال کیا۔

سول حکام کے نام

''اللہ تعالیٰ نے حاکموں کو حکم دیا ہے کہ وہ رعایا کے محافظ بنیں۔ امت کی نگہبانی کا فرض دیانتداری سے ادا کریں۔ صرف محصولات وصول کر کے خزانے جمع کرنے والے نہ بنیں۔ اگر تم ایسا کرو گے تو حیا، امانت اور وفا تم سے رخصت ہو جائے گی۔ مسلمانوں کا جو حق تم پر ہے وہ انہیں دو اور جو تمہارا حق ان پر ہے وہ ان سے لو۔ تمہاری دوسری ذمہ داری ذمیوں کی ہے۔ تم ان کے حقوق ادا کرو اور ان سے واجبات وصول کرو۔ اس کے بعد تمہارے اپنے دشمن سے معاملات ہیں۔ ان سے کئے گئے معاہدات کی پابندی کرو۔

تم اس روش پر قائم رہو جس پر عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں قائم تھے۔ کسی بات میں تبدیلی نہ کرو۔ اگر تمہیں کسی کام میں دشواری معلوم ہو تو ہماری طرف رجوع کرو۔ ہم اس مسئلے کو قوم کے سامنے پیش کر کے اس کا جواب دیں گے۔''[1]

---

[1] یہ جمہوری عمل اور مشاورت کی پابندی کی طرف واضح اشارہ ہے۔ مولف

فوجی سالاروں کے نام

''تم مسلمانوں کے حامی اور محافظ ہو۔ عمر رضی اللہ عنہ نے تمہیں جو ہدایات قائمہ بھیجی تھیں، ہم ان سے بخوبی آگاہ ہیں بلکہ ان کے اجراء میں ہمارا مشورہ شامل تھا۔ لہٰذا تمہاری طرف سے ان میں کوئی تغیر و تبدل ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ ان پر کاربند رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسروں کو مقرر کر دے گا جو تم سے بہتر ہوں گے۔ تم اپنی حالت پر نظر رکھو اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہو۔ اللہ نے میرے ذمے جو کام مقرر کئے ہیں میں ان کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔''

محصلین خراج کے نام

''اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ حق کے سوا اسے کوئی چیز پسند نہیں۔ اس لئے حق کے ساتھ کوئی چیز وصول کرو اور حق کے ساتھ دو۔ ہمیشہ امانت اور دیانتداری اختیار کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم سب سے پہلے بددیانتی کرو۔ اس طرح تم بعد کے لوگوں کے لئے بددیانتی کی راہ کھول دو گے اور ان کے گناہوں میں تمہاری بھی شرکت سمجھی جائے گی۔ وفاداری کی راہ پر چلو کسی یتیم اور معاہدہ کرنے والے پر ظلم نہ کرو۔ جو ان پر ظلم کرے گا اللہ اس کا دشمن ہوگا۔''

عامتہ المسلمین کے نام

مختلف صوبوں اور علاقوں کے عام مسلمانوں کے نام آپ نے مندرجہ ذیل ہدایت نامہ تحریر کیا جو متعلقہ عمال نے مجمعوں میں پڑھ کر سنایا۔

''تم اس بلند مرتبہ پر اللہ کے احکام کی پیروی اور اطاعت کی بدولت پہنچے ہو۔ خبردار! دنیا کی محبت تمہیں تمہارے فرائض سے غافل نہ کر دے۔ جب تمہارے اندر یہ تین چیزیں جمع ہو جائیں گی تو ملت اسلامیہ میں بدعت پھیل جائے گی۔

۱- نعمتوں کی تکمیل

۲- تمہاری اولادوں کا لونڈیوں باندیوں کے بطن سے پیدا ہونا۔

۳- اعرابیوں (عرب بدوؤں) اور عجمیوں (غیر عربیوں) کا قرآن کی قرأت میں اختلاف۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے عجمیت میں کفر کے جراثیم ہوتے ہیں۔ جب شریعت کا کوئی حکم ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا تو وہ تکلف سے نئی نئی باتیں نکالیں گے اور مسلمانوں پر عجمیت کا بدعتی رنگ غالب آجائے گا۔ لہٰذا خبردار رہو۔''

غرضیکہ آپ نے عدالت، امانت، دیانت، عوام کی حفاظت و خیر خواہی۔ ذمیوں کے حقوق کی ادائیگی، دشمنوں سے ایفائے عہد، احکام الٰہی کی اطاعت، محاسبۂ نفس کرتے رہنے اور بدعتوں سے بچنے پر زور دیا۔ یہی

السطور سے یہ بھی واضح ہے کہ اس ملت کے فتنوں کی شروعات میں لونڈیوں باندیوں کی اولادوں اور عجمی مسلمانوں کی بدعات کو دخل ہوگا۔ یہ ایک دور اندیشانہ انتباہ تھا۔ آپ کے عہد کے آخر میں ان تنبیہات نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔

بعض ابتدائی اقدامات

عطیات میں اضافہ

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے میں غنیمت، خراج، جزیہ، زکوٰۃ وصدقات کے اموال کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ انہوں نے فرمایا کہ ''اگر میں اگلے سال زندہ رہا تو لوگوں کے وظائف وعطایا میں اضافہ کر کے سب کو برابر کر دوں گا۔'' مگر موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عنان خلافت ہاتھ میں لیتے ہی عطیات میں سو سو درہم سالانہ کا اضافہ کر دیا۔ یہ ایک مستحسن اقدام تھا جس کا خیر مقدم کیا گیا لیکن آئندہ کے لئے توقعات بڑھ گئیں۔ اس سے ایک ایسا دروازہ کھل گیا جس میں لوگ داخل ہونا تو جانتے تھے مگر اس سے نکلنا نہ جانتے تھے۔

رمضان میں کھانے کی تقسیم

اس کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رمضان کے مہینے میں کھانا پکوا کر مسجد میں رہنے والے عبادت گزاروں، مسافروں اور سائلوں میں تقسیم کرانا شروع کیا۔ یہ بھی ایک خوش آئند اقدام تھا جس سے آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

فاروقی عمال

فاروق اعظم کی وصیت تھی کہ ان کے مقرر کردہ عاملوں اور گورنروں کو ایک سال تک برقرار رکھا جائے۔ مطلب یہ تھا کہ غیر ضروری اکھاڑ پچھاڑ سے بچا جائے تا کہ نظم ونسق میں خلل اور لوگوں میں بے اطمینانی پیدا نہ ہو۔ جب نئے خلیفہ کی پوزیشن مستحکم ہو جائے اور وہ انتظامی معاملات اور عمال کے بارے میں خود اپنی واضح رائے قائم کرنے کے قابل ہو جائے تو حسب موقع وضرورت اپنی صوابدید سے کام لے کر عمال میں ردوبدل کرے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک سال تک عہد فاروقی کے گورنروں کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا۔ البتہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی امارت سے فوراً معزول کر دیا کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ وصیت تھی۔

خلافت عثمانی کا ابتدائی دور

بغاوتیں اور فتوحات

مؤرخین متفق الرائے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غنی کی خلافت کے ابتدائی چھ سال بہت کامیاب گزرے۔ مسلمانوں میں کامل اتفاق ویکجہتی رہی اور وہ اپنے دشمنوں سے نپٹنے اور اللہ کے دین کی تبلیغ میں مصروف رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قائم کردہ نظام میں فوری طور پر کوئی ردوبدل نہیں کیا۔ مؤخر الذکر کی شہادت کے وقت اسلامی فوجیں ہنوز ایران وروم کی سلطنتوں سے نبرد آزما تھیں۔ دونوں سلطنتوں کے بہت سے علاقے فتح ہو چکے تھے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں مذکور ہوا۔ لیکن متعدد جگہ ابھی اسلامی تسلط مستحکم نہیں ہوا تھا۔ اور مفتوحہ علاقوں میں وقتاً فوقتاً رومی اور ایرانی شہنشاہوں کی انگیخت پر بغاوتیں ہو جاتی تھیں۔ اس لئے فتوحات کا پروگرام ابھی تکمیل کی منزل سے دور تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جب دشمنوں کو پہنچی تو انہوں نے اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیافت اور اپنے رعب واقتدار کی بحالی کے لئے یہ موقع غنیمت سمجھا۔ مفتوحہ ایرانی علاقوں خراسان، طبرستان، جرجان، فارس، سیستان، کرمان، آرمینیہ آذربائی جان وغیرہ میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ حالانکہ مسلمانوں نے ایرانی مفتوحین سے نہایت نرم، منصفانہ، فراخدلانہ بلکہ مساویانہ سلوک کیا تھا اور انہیں ہر طرح کی آسانیاں دی تھیں لیکن شہنشاہیت پسند طبائع اور اذہان ابھی تک نئے جمہوری نظام سے پوری مطابقت پیدا نہیں کر سکے تھے۔ اور بھگوڑا ایرانی شہنشاہ بغاوت کی تحریک کرتا رہتا تھا۔ ان بغاوتوں کا سلسلہ ۲۵ھ سے ۳۰ھ تک چلتا رہا مگر ایرانی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور یزدگرد کا اپنی شہنشاہی کی بحالی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ کوفہ کے والی ولید بن عقبہ پھر سعید بن العاص اور بصرہ کے والی عبداللہ بن عامر نے بڑی قابلیت، ہوشیاری اور جوانمردی سے پہلے تمام بغاوتوں کا استیصال کیا اور پھر مزید فتوحات کا آغاز کیا جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

یزدگرد کا انجام

یزدگرد اس زمانے میں ترکستان سے مرو (خراسان) پہنچ کر باغیوں کو برانگیختہ کر رہا تھا۔ بغاوت فرو ہونے کے بعد وہاں سے بھاگا۔ لیکن ترکستان واپس نہ جا سکا۔ جانا چاہا مگر امراء اور مرزبانوں نے مخالفت کی اور اس سے تمام خزانہ چھین لیا۔ وہ عرصہ تک ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آٹھویں سال ۳۱ھ میں اپنی رعایا کے ایک پن چکی والے دیہاتی کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خاقانِ چین کا اس قتل میں ہاتھ تھا۔ اس کی موت کے بعد ایرانی بغاوتوں کا خاتمہ ہو گیا اور ساسانی خاندان کا بھی۔ دنیا کی سب سے پہلی اور قدیم سلطنت ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ اس کو ختم کرنے کا فخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قسمت میں لکھا تھا۔

اسکندریہ کی بغاوت

مصر کا زرخیز علاقہ صدیوں سے رومی سلطنت کا اہم صوبہ چلا آتا تھا۔ ۲۱ھ میں یہ اسلامی عملداری میں آیا۔ رومیوں کو اس کا سخت غم وغصہ تھا۔ عہد فاروقی میں تو وہ کچھ نہ کر سکے بلکہ قیصر روم نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے سفارتی تعلقات بھی قائم کر لئے لیکن عہد عثمانی میں انہوں نے قسمت آزمائش کرنے کی ٹھانی۔ اسکندریہ مصر کی بندرگاہ تھا اور رومی عہد میں دارالحکومت بھی رہا تھا۔ وہاں رومیوں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد تھی جس کا بحری راستے سے قسطنطنیہ سے براہ راست رابطہ قائم تھا۔ اور ان کی درپردہ وفاداریاں قیصر کے ساتھ تھیں۔ ۲۵ھ میں انہوں نے قیصر

کی شہ پر بغاوت کر دی اور قیصر نے ان کی مدد کے لئے ایک زبردست جنگی بیڑہ بھیجا۔ لیکن مصر کے والی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بروقت کارروائی کر کے انہیں سخت شکست دی اور آئندہ کے لئے شہر کی فصیل مسمار کر دی تاکہ پھر کبھی باغیوں کے قلعہ بند ہونے کا امکان نہ رہے۔ مصر کی قبطی آبادی نے اس بغاوت میں حصہ نہیں لیا۔ رومیوں نے انہیں لوٹ لیا تھا۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ان کے نقصان کی تلافی کر کے ان کے دل جیت لئے۔

ایشیائے کوچک۔ ایک مسلمان خاتون کی بہادری

جب مسلمان آرمینیہ کی بغاوت فرو کرنے میں الجھے ہوئے تھے تو اطلاع ملی کہ رومیوں نے ایشیائے کوچک میں مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے ایک زبردست فوج جمع کر لی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے کوفہ کے گورنر ولید بن عقبہ نے سلمان بن ربیعہ رضی اللہ عنہ باہلی کو آٹھ ہزار مجاہدین کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شامی سپاہ کی مدد کے لئے روانہ کیا۔ وہ راستے میں کئی قلعے فتح کرتے ہوئے شامی فوج کے سالار حبیب بن مسلمہ سے جا ملے۔ رومی جرنیل موریان اسی ہزار رومی اور ترک سپاہیوں کا لشکر جرار لے کر مقابل ہوا۔ حبیب بن مسلمہ کے پاس مقابلے کے لئے بہت کم لشکر تھا۔ انہوں نے موریان پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا۔ ان کی بیوی ام عبد بنت یزید کلبیہ نے پوچھا "تمہاری یلغار کہاں تک ہو گی؟" حبیب نے جواب دیا کہ "ہم یا تو موریان کے خیمے تک پہنچیں گے (یعنی بھیڑئے کے بھٹ میں داخل ہو کر اسے پچھاڑیں گے) یا جنت میں پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے شب خون مارا اور قتال کرتے ہوئے موریان کے خیمے تک پہنچ گئے لیکن ان کی بیوی مار دھاڑ کرتی ہوئی ان سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھیں۔ حبیب بن مسلمہ نے موریان کو شکست دے کر بہت سے علاقوں کو مطیع و منقاد بنا لیا۔ اسلامی افواج طفلس اور بحیرہ اسود تک پہنچ گئیں۔

نئی فتوحات

مشرقی اور مغربی علاقوں میں بغاوتوں کے نتیجے میں اسلامی افواج کے لئے نئے علاقوں میں فاتحانہ پیش قدمی کی راہیں کھلتی گئیں۔ حالانکہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اسے ہمیشہ ناپسند کرتے رہے تھے۔ چنانچہ خراسان میں شاندار فتوحات کے باوجود انہوں نے احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ کو یزدگرد کے تعاقب میں جیحوں عبور کر کے ماوراء النہر کے ترکستانی علاقے میں داخل ہونے سے منع کر دیا تھا۔ حالانکہ خاقانِ ترکستان یزدگرد کی حمایت میں اشتعال انگیزی کر رہا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسی پر چلنا چاہتے تھے مگر جب دشمنوں نے آ بیل مجھے مار کی پالیسی اختیار کر کے اسلامی مقبوضات میں گھسنے کی کوشش کی تو ان کے خلاف دفاعی اقدامات کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ بلخ، ہرات، کابل، غزنی وغیرہ فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر لئے گئے۔ نیز کرمان، سیستان، خراسان پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ آرمینیہ اور ایشیائے کوچک بھی اسلامی مقبوضات میں داخل ہو گئے شمال میں طفلس اور بحیرہ اسود تک اسلامی سلطنت پھیل گئی۔ عثمانی فتوحات میں اموی گورنروں عبداللہ بن عامر، ولید بن عقبہ اور سعید بن عاص نے بڑا اہم کردار ادا کیا اور انہوں نے اپنے ماتحت کمانڈروں کا انتخاب بھی بڑی

سوجھ بوجھ سے کیا۔

طخارستان کی فتح

والی بصرہ عبداللہ بن عامر کے نائب سالار احنف بن قیس طخارستان کی طرف بڑھے۔ یہ علاقہ سابق سلطنت ایران اور سلطنت چین کے درمیان ترکوں کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ احنف نے طالقان، جوزجان اور فاریاب کے نواح میں خونریز جنگوں کے بعد دشمنوں کو زبردست شکست دی۔ انہوں نے صلح کر کے اطاعت قبول کی۔ یہ دیکھ کر جیحوں پار کے بعض امراء خودان کے پاس حاضر ہوئے، اطاعت کا اظہار کیا اور تحائف پیش کئے۔ اس طرح اسلامی سلطنت کی حدود چین کی سرحد تک پھیل گئیں۔

کش اور دوار

ربیع ابن زیاد کے بعد بجستان (سیستان) کے حاکم حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ مقرر ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں کی بغاوت فرو کر کے کابل کا رخ کیا زرنج اور ررنج سے لے کر دوار تک کے علاقے پر قابض ہو گئے۔ پھر دوار کے باشندے کوہ اوز میں جمع ہوئے۔ عبدالرحمٰن نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ انہوں نے مقابلہ کی طاقت نہ پا کر صلح کر لی۔ وہاں خالص سونے کا ایک بہت بڑا بت تھا۔ اس کی آنکھیں یاقوت کی تھیں۔ عبدالرحمٰن نے اس کے ہاتھ کاٹ کر آنکھوں کے یاقوت نکال لئے۔ پھر مرزبان کو یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ مجھے سونے یا یاقوتوں کی حاجت نہیں۔ میں تمہیں صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ یہ بت کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کی پرستش بے سود ہے۔

غزنی و کابل

زابلستان یعنی غزنی، کابل، ہرات وغیرہ بھی انہی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے فتح کئے۔ وہاں کے باشندے مسلمان ہو گئے۔ عبدالرحمٰن ان میں بہت ہر دلعزیز رہے۔

بلخ، نساء، سرخس، فرغانہ

مشرق کی طرف اسلامی فتوحات کی حدود وسط ایشیا میں خراسان کے شہروں بلخ، نسا، سرخس، فرغانہ تک پہنچ گئیں۔ اگر مسلمان سپہ سالاروں کو پیش قدمی کی اجازت ہوتی تو عین ممکن ہے کہ ماوراء النہر (ترکستان) بھی ان کے گھوڑوں کی جولا نگاہ بن گیا ہوتا۔ اور سمرقند و بخارا بھی عہد عثمانی ہی میں اسلامی مراکز بن جاتے۔ بجستان (سیستان)، زابلستان (موجودہ افغانستان) کرمان اور مکران کی فتوحات سے خلافت راشدہ کی حدود سندھ و ہند کی سرحدات سے مل گئیں بلکہ بلاذری کے بیان کے مطابق [۲] حکیم بن جبلہ کی قیادت میں ایک دستہ سمندر کے راستے سے بھی بلوچستان اور سندھ کے غربی علاقے تک پہنچ گیا تھا۔ سروے کے بعد اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو علاقے کے بارے میں رپورٹ بھیجی کہ وہاں پانی کم، پھل ردی اور چور بیباک ہیں، لشکر کم ہو تو ضائع ہو جائے

[۱] یہ غالباً بلوچستان کا موجودہ شہر وادر ہے۔ اس وقت بلوچستان بھی بجستان یا سیستان کا حصہ تھا۔ مولف

۲- فتوح البلدان حصہ دوم۔ فتوح السند

گا۔ بہت ہوتو بھوکوں مرے گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھرپور لشکر کشی کا ارادہ ترک کر دیا۔

عہد عثمانی میں ایران کی فتح مکمل ہوگئی۔ ایرانی شاہی خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

قبرص اور بعض دوسرے رومی مقبوضات کی فتح

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کے بھائی معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو دمشق کا والی مقرر کیا تھا۔ عہد فاروقی میں انہوں نے اعلیٰ فوجی اور انتظامی صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں پورے صوبہ شام کا گورنر بلکہ گورنر جنرل مقرر کر دیا۔ اناطولیہ اور ایشیائے کوچک میں رومیوں سے ان کی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ انہوں نے طرابلس (شام) عموریہ، طیطیہ وغیرہ انطاکیہ اور طرطوس کے درمیان تمام رومی قلعے فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر لئے اور اسلامی نوآبادیاں قائم کر دیں۔

قبرص کا جزیرہ جو بحیرہ روم میں اسلامی سرحدات سے بہت قریب تھا، رومیوں کی آماجگاہ تھا اور اسلامی سرحدات کے لئے خطرے کا باعث۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے قبرص پر بحری حملہ کی اجازت مانگی تھی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت نہ دی۔ عہد عثمانی میں اجازت مل گئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا بحری جہاد کرنے والے مسلمانوں کو جنت کی بشارت دی تھی چنانچہ اس جہاد میں متعدد بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، ان کی بیوی ام حرام رضی اللہ عنہا (جو وہیں خچر سے گر کر فوت اور دفن ہوئیں اور ان کا مزار آج بھی زیارت گاہ عام ہے) مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ، ابوداؤد رضی اللہ عنہ اور شداد بن اوس رضی اللہ عنہ وغیرہ بڑے اشتیاق سے شامل ہوئے۔ ۲۸ھ میں اہل قبرص نے خراج ادا کرنے، رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو اپنے جزیرے سے گزرنے دینے اور رومیوں کی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے رہنے کی شرائط پر صلح کر لی۔ لیکن ۳۲ھ میں انہوں نے شرائط صلح کی خلاف ورزی کر کے رومیوں کی مدد کی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حملہ کر کے قبرص بزور فتح کر لیا اور وہاں مسلمانوں کو آباد کیا۔ بحیرہ روم میں مسلمانوں کا ایک مضبوط بحری اڈہ پہلی دفعہ قائم ہوا۔

چند سال بعد جزیرہ روڈس بھی فتح ہوگیا۔

بحری بیڑے کا قیام

بحری بیڑے کا قیام عہد عثمانی کا ایک اہم اقدام تھا۔ رومی وقتاً فوقتاً سمندر کی راہ شام اور مصر کے ساحلی علاقوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ ان کے پاس بہت بڑا مضبوط اور منظم بحری بیڑہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو بحری جنگوں اور بحری بیڑہ بنانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ مسلمانوں کو جہاز سازی اور بحری جنگوں کا تجربہ نہ تھا۔ وہ مسلمانوں کی جانوں کو روم و ایران کے خزانوں اور علاقوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو سمندر کے خطرات میں ڈالنا پسند نہ کیا۔ عہد عثمانی میں بحری بیڑے کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ ابن سعد ابن ابی سرح نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قائل کر کے بحری بیڑہ تیار کیا جو آئندہ بہت کام آیا۔ قبرص اور روڈس بحری بیڑے ہی کی مدد سے فتح ہوئے اور شمالی افریقہ کی لڑائیوں میں بھی اس

نے اہم کردار ادا کیا۔ ۳۱ھ میں رومیوں نے پانچ سو جہازوں پر مشتمل زبردست بحری بیڑے کے ساتھ اسکندریہ پر حملہ کیا۔ عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے اپنے نسبتاً چھوٹے بیڑے کے ساتھ رومیوں کو عبرت ناک شکست دی۔ یہ ایک شاندار فتح تھی۔ تاہم اس موقع پر ابن ابی سرح اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بعض مجاہدین نے چہ مگوئیاں کیں۔ اس میں نوجوان محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور محمد بن ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے۔ کہا گیا کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے شخص کو امیر البحر مقرر کیا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کرادیا ہوتا۔[1]

کوفہ، بصرہ اور دوسرے مقامات پر بھی ایسے لوگوں کا تقرر کیا گیا ہے۔ جب یہ باتیں ابن ابی سرح کے کانوں تک پہنچیں تو انہوں نے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو جہاد میں شریک ہونے سے منع کر دیا۔ یہ بات انہیں اور بھی ناگوار گزری اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اشتعال انگیز باتیں کرنے اور پھیلانے لگے۔

۳۴ھ میں شمالی افریقی مقبوضات میں وسیع پیمانے پر بغاوت ہوئی جو ابن ابی سرح نے کامیابی سے فرو کر دی۔

قسطنطنیہ پر حملہ

۳۲ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خود قیصر روم کے دار السلطنت قسطنطنیہ پر حملہ کیا اور اس کے جوار میں پہنچ گئے۔ عموریہ کے راستے واپس ہوتے ہوئے متعدد رومی قلعے تباہ کر دیئے۔ ۳۱ھ میں رومیوں کی بحری شکست اور ۳۲ھ میں خود قسطنطنیہ پر حملے سے قیصر پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ ۳۳ھ میں اناطولیہ کا مضبوط قلعہ حصن المراۃ فتح ہو گیا۔

شمالی افریقہ...... فتح طرابلس

عبداللہ ابن سعد ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی تھے۔ اپنی خلافت کے تیسرے سال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصر کے فاتح اور گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بعض وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر آگے آئے گا، معزول کر کے ابن ابی سرح کو پورے مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔ انہوں نے اسلامی سرحدات کو دشمنوں سے محفوظ کرنے کے لئے ایک حوصلہ مندانہ منصوبہ بنایا۔ طرابلس الغرب (پرانا کا رتھیج موجودہ لیبیا)، تیونس، مراکش اور الجزائر مصر سے ملحق واقع تھے۔ اور مخاصمانہ عزائم رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ابن سعد ابن ابی سرح نے ۲۷ھ میں طرابلس الغرب پر حملہ کیا اور ایک طویل اور خونریز جنگ کے بعد فتح حاصل کی۔ وہاں کے رومی حاکم جرجیر (گریگوری) نے ۲۵ ہزار دینار سالانہ بطور خراج دینا منظور کر کے صلح کر لی۔

الجزائر، تیونس، مراکش

طرابلس الغرب کے بعد الجزائر، تیونس اور مراکش بھی فتح ہو گئے اور سارا شمالی افریقہ (افریقیہ) مصر سے لے کر مراکش یعنی بحر اوقیانوس کے افریقی ساحل تک اسلامی مقبوضات میں شامل ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ تمام آبادی مسلمان ہو گئی۔ چودہ سو سال کے بعد آج بھی اس وسیع علاقے میں اسلامی تہذیب و تمدن برقرار ہے۔ اور

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی سرح کے قتل کا حکم ضرور دیا تھا لیکن فتح مکہ کے بعد حضرت عثمان کی سفارش سے اسے معاف کر دیا تھا۔ مؤلف

مادری زبان عربی ہے۔ خلافت فاروقی وعثمانی کے دوران میں رومی سلطنت کے جو وسیع صوبے شام، لبنان، شرق، اردن، فلسطین، مصر، برقہ طرابلس، تیونس، الجزائر اور مراکش اسلامی قلمرو میں داخل ہوئے قلیل مدت میں وہاں اسلامی تہذیب وتمدن، معاشرت وثقافت بلا جبر واکراہ رائج ہو گئے اور عربی زبان پہلے وہاں کی لینگوا فرینکا اور پھر مادری زبان ٹھہری۔ جیسا کہ بعد میں اندلس میں بھی ہوا۔ لیکن ایرانی سلطنت پوری کی پوری اسلامی تسلط میں آنے کے باوجود وہاں عرب تہذیب وتمدن اور عربی زبان کا کامل دور دورہ نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ ایرانیوں کے ذہنی تحفظات تھے جو بالآخر عجمی سازش کی شکل اختیار کر گئے۔

حبشہ

مسلمان چاہتے تو حبشہ (ابی سینیا، اب ایتھوپیا) کو آسانی سے فتح کر سکتے تھے لیکن وہ اسے چھوڑ کر دوسرے علاقوں کی طرف فاتحانہ پیش قدمی کرتے رہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر دو دفعہ حبشہ ہی کی طرف ہجرت کی تھی اور اصحمہ نجاشی شاہِ حبشہ نے انہیں پناہ دی تھی۔ ان سے بہت اچھا سلوک کیا تھا اور انہیں قریش کے سفیروں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس احسان کا بدلہ مسلمانوں نے یوں دیا کہ کبھی حبشہ (ایتھوپیا) پر حملہ نہیں کیا اور اس کی آزادی برقرار رہنے دی۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایتھوپیا نے ایک جابر اور توسیع پسند ملک کی حیثیت سے اپنے ہاں کی مسلمان اکثریت پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اری ٹیریا کے آزادی خواہوں پر مظالم توڑ رہا ہے۔ ہمسایہ مسلمان ریاست صومالیہ سے بھی اس کا رویہ معاندانہ ہے۔

اندلس

عثمانی عہد میں ۲۷ھ میں شمالی افریقہ سے عبداللہ بن نافع کی زیر کمان مسلمانوں نے پہلی دفعہ اندلس پر حملہ کیا اور کچھ فتوحات حاصل کیں۔ یورپ کے دروازے پر یہ مسلمانوں کی پہلی دستک تھی۔

عثمانی فتوحات کی وسعت وخصوصیت

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد زرّیں میں تقریباً ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل رقبہ مملکت اسلامیہ میں شامل ہوا۔ اگر عہد عثمانی کی مشرقی اور مغربی فتوحات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عثمانی فتوحات بھی اپنی وسعت، رقبے اور اہمیت کے لحاظ سے فاروقی فتوحات سے لگا کھاتی ہیں۔ مسلمان جیحوں سیحوں اور دجلہ وفرات کے کناروں سے لے کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک اس طرح پھیل گئے کہ ع ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ما است، کی حسین تعبیر وتفسیر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ مفتوح اقوام مذہبی روحانی تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی لحاظ سے ملت اسلامیہ میں جذب ہوتی چلی گئیں۔ عثمانی عہد میں مسلمانوں نے وسطی ایشیا اور شمالی افریقہ میں جو فتوحات حاصل کیں وہ تاریخ اسلام کا ایک سنہری باب ہیں۔ چھ سات سال کے مختصر عرصے میں اسلامی حکومت کے حدود وثغور مشرق میں ترکستان سے گزر کر چین میں اور جنوب میں خراسان سے گزر کر بھروچ وتھانہ

(بمبئی) اور شمال میں آرمینیا اور ممالک خزر تک پھیل گئے۔ طبرستان، جرجان، طخارستان، سجستان، کرمان، محوات، کابل نیشاپور وغیرہ سبھی اس کے احاطہ میں آگئے۔ خلافت راشدہ کی وسعت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ مختلف نسلوں، رنگوں، مذہبوں، عقیدوں، تہذیبوں اور معاشرتوں کی حامل قومیں اور قبیلے اسلام کے حلقہ اقتدار میں شامل ہو گئے۔ ان میں سے اکثر مرورِ ایام کے ساتھ مسلمان ہو گئے کسی پر دین وملت کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں کی گئی۔ اور ان کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے بقول یہ ''انسانیت کی شہنشاہیت تھی جس میں ہر حاجت مند فردِ رعیت کو حکومت روٹی مہیا کرتی اور کسی کی آزادئ عمل میں کوئی رکاوٹ ڈالے بغیر اجتماعیت کا مظاہرہ کرتی تھی جس میں حکومت اور رعایا ایک ہی چیز تھے۔''

عمر ابونصر کے بقول ''تاریخ ابتدائے آفرینش سے اب تک کسی ایسی قوم کی مثال پیش نہیں کر سکی۔ جو حد درجہ قلیل التعداد مفلس وقلاش اور پرانے دقیانوسی ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے باوجود ایک بڑے علاقہ اور ان وسیع وعریض شہروں پر حملہ کرے جو شہر پناہوں کے ذریعہ خوب مضبوط بنائے گئے ہوں، جنگی اسلحہ کی وہاں کمی نہ ہو اور ان میں اتنے زبردست لشکر موجود ہوں کہ فاتح قوم کا لشکر ان کے عشر عشیر بھی نہ ہو لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ قوم اپنی حریف قوموں پر غلبہ حاصل کر کے ان کو شکست فاش دے اور ایک قلعہ کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے قلعہ پر قبضہ کرتی چلی جائے جو علاقوں کے علاقے فتح کر کے پہلے ان میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرے اور پھر مفتوح قوم کو اپنی قومیت میں مدغم کر لے۔ اپنے دین اور اپنی زبان کو اس میں پوری طرح رواج دے کر مغائرت کے کسی رشتہ کو بھی اپنے اور اس کے درمیان باقی نہ رہنے دے۔ اگر لوگوں کا ان روحانی اور غیبی قوتوں پر اعتقاد نہ ہوتا جو عربوں کو ان کی فتوحات میں مدد دیتی اور جنگوں میں ان کو تقویت پہنچاتی رہیں تو یقیناً ایسے امور دنیائے خواب وخیال کی باتیں سمجھے جاتے۔''

خلافت عثمانی کے پہلے چھ سات سال بغاوتیں فرو کرنے اور فوجی وسیاسی اہمیت کے مزید علاقے فتح کرنے میں صرف ہوئے۔ اس دوران میں نظم ونسق میں بھی کسی قسم کا انحطاط یا انتشار واقع نہیں ہوا۔ اسلامی فتوحات کا سیلاب آگے ہی آگے بڑھتا رہا اور اسلام کا جھنڈا نئی نئی سرزمینوں پر گڑتا رہا۔ مالِ غنیمت کی افراط ہوئی۔ جزیہ، خراج اور دوسرے محاصل میں بھی اضافہ ہوا۔ زراعت وتجارت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ لوگوں میں اموال تقسیم ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ علاقوں میں قلعے تعمیر کرائے۔ زراعت کی آب رسانی کے لئے نہیں کھدوائیں، سڑکیں بنوائیں، ان کے کنارے سایہ دار اور پھل دار درخت لگوائے۔ تجارت اور تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لئے باقاعدہ پولیس کا ادارہ قائم کیا اور تعمیر وترقی کے لئے مختلف اقدامات کئے تاکہ رعایا کو امن وامان، تحفظ، انصاف اور خوش حالی کی زندگی میسر آسکے۔ دورِ خلافت کا یہ نقطہ عروج تھا۔ لیکن شیریں کے آنے سے بالآخر تیشۂ فرہاد کے لئے بھی راہ کھلی۔ تمول اور تعیش کی فضا پیدا ہونے لگی۔ امن وامان اور خوشحالی نے سرمایہ داری کے جراثیم کو جنم دیا۔ باہمی رشک ورقابت نے سر اٹھایا۔ اس سے بعض مفتوحہ اقوام کی حوصلہ افزائی ہو۔ سازشی ماحول پیدا ہوا۔ حضرت عثمان کی خلافت کے آخری چھ سال عروج کے بعد ضد عروج (اینٹی کلائمکس) کی مثال تھے تفصیل آگے آئے گی۔

حکومت کا نظم ونسق

خلافتی نظام حکومت کی نوک پلک حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خوب سنوار دی تھی۔ انہوں نے رومی اور ایرانی سلطنتوں کی بعض عمدہ انتظامی خصوصیات کو بھی اپنانے سے گریز نہیں کیا تھا۔ اپنی سوچ اور اصحاب شوریٰ کے مشوروں سے بھی کام لیا تھا اور قرآن وسنت کی روشنی میں ضروری اقدامات کئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ہر ایسے اقدام سے پرہیز کیا تھا جو قرآن وسنت سے ہم آہنگ نہ ہو۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ان کی مجلس شوریٰ کے اہم ارکان میں سے تھے اور انتظامی کارروائیوں کے عینی شاہد اور ان کے پس منظر سے بخوبی آگاہ تھے۔ اسی لئے انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غنی کے انتخاب کے وقت ان سے عہد لیا تھا کہ وہ قرآن وسنت کے علاوہ صدیق رضی اللہ عنہ و فاروق رضی اللہ عنہ کی راہ عمل سے انحراف نہیں کریں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے پیشرو کے قائم کردہ نظام کو برقرار رکھا۔ البتہ بعض نئی ضروریات وحالات کے ماتحت کچھ ضروری تبدیلیاں کیں۔ مثلاً صوبوں میں افسر فوج کا ایک نیا عہدہ قائم کیا۔ اب تک یہ کام بھی صوبائی گورنروں سے متعلق تھا۔ لیکن گورنروں کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے امیر لشکر کا عہدہ الگ کر دیا گیا۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی گورنر اور کمانڈر انچیف کے عہدے الگ الگ ہوتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اہم امور میں سرکردہ صحابہ اور عمالِ حکومت سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی گورنروں اور سپہ سالاروں کو اپنی پالیسی کے رہنما اصول لکھ بھیجے جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکابر صحابہ کو مدینہ میں اپنے پاس رکھتے تھے تاکہ ان کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں۔ انہیں باہر کی دنیا کے جھمیلوں میں ملوث ہونے سے بچائیں اور کسی فتنہ کا باعث نہ بننے دیں۔ جب اسلام عرب سے باہر پھیلا اور ایرانی ورومی سلطنتوں کے وسیع علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہو گئے اور نئے نئے شہر کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، جنیرہ وغیرہ بسا کر نئی عرب آبادیاں قائم کی گئیں تو بھی بزرگ صحابہ مدینہ میں رہے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں مدینہ سے باہر جا کر نئے شہروں اور مفتوحہ ممالک میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ متعدد بزرگ اور بااثر صحابہ کوفہ، بصرہ، فسطاط، دمشق، حمص وغیرہ شہروں میں جا کر آباد ہو گئے۔ ان کے قدیم الایمان ہونے اور عہد رسالت میں خدمات بجالانے کی وجہ سے عقیدت مند ان کے گرد جمع ہونے لگے اور ان کے حلقہ ہائے اثر قائم ہو گئے۔ آگے چل کر یہ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف گئی اور انہی حلقوں میں ان پر نکتہ چینی اور لے دے ہونے لگی۔ جو ابتداً اگرچہ مخلصانہ ودیانتدارانہ تھی مگر نئے مسلمانوں، غیر قریشیوں اور ابھرتی ہوئی نوجوان نسل نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

صوبوں کی تقسیم جو عہد فاروقی میں تھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تقریباً اسے علی حالہ قائم رکھا البتہ شام کا ملک پہلے چار صوبوں دمشق، حمص، اردن اور فلسطین (بمعہ لبنان) میں تقسیم تھا اور وہاں چار گورنر تھے۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے دمشق کے گورنر چلے آتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چاروں

صوبوں کو مدغم کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پورے شام کا گورنر جنرل بنا دیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایک قابل منتظم تھے۔ حکومتی نظم و نسق بہتر ہو گیا لیکن ایک ناگوار تاثر بھی پیدا ہوا اور بددلی پھیلی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہم قبیلہ اور اعزہ میں تھے۔ وہ اپنے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ہمراہ فتح مکہ کے وقت اسلام لائے یعنی طلقاء[1] میں سے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالف اور مفاد پرست عناصر نے یہ تاثر پھیلایا کہ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی سنت کے خلاف اقربا نوازی پر اتر آئے ہیں۔ بعد میں جب کوفہ، بصرہ اور مصر میں بھی اموی گورنر مقرر کیے گئے تو اس تاثر کو مزید تقویت ملی اگرچہ انتخاب میں صلاحیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عہد فاروقی کے عمالِ حکومت کو ایک سال تک برقرار رکھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی وصیت بڑی دور اندیشی، مصلحت اور ملی خیر خواہی پر مبنی تھی۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم مزاجی اور قبائلی صلہ رحمی سے خوب واقف تھے۔

ایک سال تک نظم و نسق کو علیٰ حالہ قائم رکھنے میں یہ مصلحت تھی کہ مبادا نیا خلیفہ تازہ حاصل شدہ اختیارات کے استعمال میں جلد بازی سے کام لے اور پرانے تجربہ کار اور قابل اعتماد عہدہ داروں کو ہٹا کر ان کی جگہ نئے اور ناتجربہ کار افراد مقرر کرنے سے انتشار، بدنظمی اور بے اطمینانی پھیلے اور جاری کاموں میں خلل واقع ہو۔ سرحدوں اور شہروں میں مسلمانوں کے معاملات میں تعطل اور افراتفری کا بھی اندیشہ تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت گورنروں کی اکثریت غیر قریشی تھی اور خاندان عمر رضی اللہ عنہ کا تو کوئی آدمی گورنر یا معمولی عہدہ دار تک نہ تھا۔ انہوں نے گورنروں وغیرہ کا انتخاب بڑی غیر جانبداری سے اعلیٰ صلاحیت کی بنا پر کیا تھا۔ وہ عمال حکومت کا احتساب اور نگرانی بڑی سختی سے کرتے تھے۔ انہوں نے گورنروں کے لئے سادہ بود و باش اور رعایا سے منصفانہ و مساویانہ سلوک اور آزادانہ میل جول کے اصول مقرر کر رکھے تھے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فطرتاً حلیم الطبع اور خطا پوش تھے اور صلہ رحمی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے۔ لہٰذا عہد عثمانی میں مواخذہ و احتساب کا معیار ڈھیلا پڑ گیا۔ گورنر امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہنے لگے اور رعایا سے اپنا فاصلہ قائم کر لیا۔ اس سے بددلی پیدا ہوئی۔ عہد فاروقی میں مجلس شوریٰ کی بڑی اہمیت تھی لیکن عہد عثمانی میں اس کے اجلاسوں میں باقاعدگی نہ رہی۔ اس کی بجائے عمالِ حکومت کی مجلس شوریٰ کام کرنے لگی۔

فوجی انتظامات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محکمہ فوج کو سول محکموں سے الگ کر کے صوبوں میں علیحدہ فوجی کمانڈر مقرر کیے۔ نیز اہل فوج کے وظائف میں سو سو درہم کا اضافہ کر دیا۔ اس سے فوج کی کارکردگی بہتر ہو گئی اور صوبوں کے گورنر اپنی ساری توجہ انتظامیہ پر دینے لگے۔ نئے مفتوحہ ممالک میں بھی فوجی مراکز اور چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ تاہم گورنر اور

۱- طلقاء وہ اہل مکہ تھے جو اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف رہے تھے اور اس وقت حلقہ بگوش اسلام ہوئے جب مکہ فتح ہو گیا اور ان کے لئے کوئی دوسرا چارہ کار نہ رہا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ کہہ کر معاف کر دیا لاتثریب علیکم الیوم وانتم طلقا۔ (آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ تم آزاد ہو) مؤلف

فوجی کمانڈر میں کہیں کہیں رشک اور کشمکش کی صورت پیدا ہوئی مثلاً مصر میں۔ بہرحال یہ انتظامی ڈھانچہ اور طرزِ حکومت کم از کم پہلے چھ سال تک کامیابی سے چلا۔ عام طور پر لوگوں میں خوشحالی کا احساس تھا اور عمال سے شکایات نہ تھیں۔ جب بنوامیہ کو عہدے ملے تو قریش کے دوسرے نوجوان اور بدوی قبائل کے طالع آزما عناصر حکومت و سیادت کی آرزو کرنے کی اور نظم ونسق میں انتشار پھیلانے کی راہیں ڈھونڈنے لگے۔ عجمی عناصر نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مختلف انتظامی اور رفاہی اقدامات کرتے رہے جو عوام کے لئے فائدہ مند تھے۔

چراگاہیں

خلیفہ نے تمام مملکت میں فوجی ضروریات کے گھوڑوں اور اونٹوں کی پرورش و پرداخت کے لئے وسیع چراگاہیں قائم کی گئیں۔ زکوٰۃ کے مواشی بھی وہاں رکھے جاتے تھے۔ عام لوگوں کے مواشی کو وہاں چرنے کی اجازت نہ تھی۔ خودغرض مخالفین نے پراپیگنڈا کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اپنے اونٹ گھوڑے وہاں چرتے ہیں جو سراسر بے بنیاد تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک تقریر میں اس کی تردید کی۔

گورنروں کا عزل ونصب

گورنروں کا تقرر خلیفہ اپنی صوابدید سے کرتا تھا۔ البتہ اگر ضرورت محسوس ہوتی تو اربابِ حل وعقد سے مشورہ بھی کر لیتا تھا۔ دنیا کی دوسری حکومتوں میں بھی آج تک یہی رواج چلا آتا ہے۔ البتہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صدر مملکت کی طرح گورنر کا عہدہ بھی انتخابی ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گورنروں کا انتخاب بڑی سوچ بچار کے بعد کرتے تھے۔ اور جن پر ان کی نظر انتخاب پڑتی تھی انہیں ہر پہلو سے خوب ٹھونک بجا لیتے تھے۔ ان کے اثاثوں کی فہرستیں تک بنوا لیتے تھے اور گورنری سے برطرفی کے بعد ان کے اثاثوں کی پھر پڑتال کرتے تھے۔ اگر تقرری کے وقت کی فہرست اثاثہ سے مال واسباب زیادہ پاتے تو اکثر نصف مال لے کر بیت المال میں داخل کر دیتے تھے۔ گورنروں کے اعمال کا کڑا محاسبہ کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے کسی رشتہ دار یا ہم قبیلہ کو گورنر مقرر نہیں کیا۔ ہمیشہ اہلیت اور استحقاق کو مدنظر رکھتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے آخری عہد میں کوفہ اور بصرہ کے گورنروں کے خلاف وہاں کے شورہ پشت عناصر نے شکایتیں کیں حالانکہ یہ گورنر فاتح قادسیہ و مدائن حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے عظیم المرتبت صحابہ تھے۔ تحقیقات پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے خلاف شکایات غلط ثابت ہوئیں۔ تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحتاً انہیں مدینہ واپس بلا لیا اور ان کی جگہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ثقفی کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے خلاف بعض شکایات جزوی طور پر درست ثابت ہوئیں تو ان کا ازالہ کر دیا گیا۔ اہل کوفہ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ پر بھی رشوت وغیرہ کا الزام لگایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔ لیکن ان کی معزولی کی وصیت کر دی جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عمل کیا۔ ان تمام کارروائیوں سے مفسدہ پرداز عناصر کی حوصلہ افزائی ہوئی اور وہ گورنروں بلکہ بالآخر خود خلیفہ

کے خلاف الزام تراشی میں تیز ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اس صورتِ حال کا سامنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کرنا پڑا۔ وہ فطرتاً نرم خو اور صلح جو تھے۔ لوگوں کی اکثر بے سروپا شکایات پر گورنروں کا عزل ونصب کر کے انہیں مطمئن اور خوش کرنا چاہا مگر وہ الٹے شکایتوں میں دلیر اور فتنہ وسازش میں شیر ہوتے گئے۔ انہوں نے شکایت بازی کو ایک سوچا سمجھا سازشی کھیل بنالیا جو بالآخر خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی المناک شہادت پر منتج ہوا۔ شورہ پشت عناصر کا تعلق شمالی اور جنوبی عرب کے غیر قریش بدوی قبائل سے تھا جو فتوحات میں شریک رہے تھے اور اب چاہتے تھے کہ ان مفتوحہ علاقوں کی حکومت وسیادت پر انہیں فائز کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک سال تک گورنروں کا ردوبدل نہیں کیا۔ اس کے بعد نئے حالات کی روشنی میں کارروائیاں کیں۔

یہاں عزل ونصب کے نمایاں ترین واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی وصیت تھی کہ ''میرے جانشین کو چاہئے کہ وہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو حاکم بنائے کیونکہ میں نے انہیں کسی جرم کی بنا پر معزول نہیں کیا تھا بلکہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ان کی خواہ مخواہ بدنامی نہ ہو۔'' چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ۲۴ھ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو انہی کے آباد کردہ شہر کوفہ کا گورنر مقرر کیا اور حضرت مغیرہ کو وہاں کی گورنری سے معزول کر دیا۔ گورنروں کا یہ پہلا عزل ونصب تھا جو عہدِ عثمانی میں روبعمل آیا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایک سال سے زائد عرصہ تک کوفہ کے گورنر رہے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول کر دیا۔ انہوں نے بیت المال سے کچھ رقم قرض لی تھی جو وقت پر ادا نہ کر سکے۔ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ افسر بیت المال تھے، انہوں نے ادائیگی کا تقاضا کیا تو باہم جھگڑا ہو گیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے مدینہ واپس بلالیا۔ بعد میں ایک دوسرے موقع پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھی معزول کر دیا۔

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا تقرر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی جگہ اپنے نوجوان ماں جائے بھائی ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ وہ ایک قابل منتظم تھے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قریبی رشتہ داری کے علاوہ ان کا اپنا ایک ماضی تھا۔ بنوامیہ کے اکثر افراد کی طرح وہ بھی فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قبیلہ بنو مصطلق سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ قبیلہ کے لوگ ان کی پیشوائی کے لئے نکلے لیکن وہ سمجھے کہ ان پر حملہ کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ ڈر گئے اور الٹے پاؤں مدینہ واپس آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ بنو مصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور انہیں قتل کرنا چاہا۔ اس سے ایک نہایت خطرناک صورتحال پیدا ہو گئی اور قریب تھا کہ بنو مصطلق کے خلاف فوجی کارروائی کی جاتی لیکن اس سے پہلے اہل قبیلہ خود زکوٰۃ لے کر مدینہ پہنچ گئے اور

حضور ﷺ کو اصل صورتِ واقعہ سے آگاہ کیا۔ ولید بن عقبہ کا بیان غلط ثابت ہوا۔ بہر حال حضور ﷺ نے انہیں معاف کر دیا۔ قرآن مجید میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

اس شہرت کے ساتھ جب ولید گورنری کا پروانہ لے کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس کوفہ پہنچے تو انہوں نے فرمایا: ''معلوم نہیں ہمارے بعد تو زیادہ عقلمند ہو گیا ہے یا ہم تیرے بعد احمق ہو گئے ہیں۔'' ولید نے جواب دیا کہ ''ابو اسحاق! آپ ناراض نہ ہوں یہ تو بادشاہی ہے، صبح کو کوئی اس کے مزے لوٹتا ہے تو شام کو کوئی اور'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''واقعی تم لوگ اسے بادشاہی بنا کر چھوڑو گے۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ فاتح ایران تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنا جانشین منتخب کرنے والی مجلس شوریٰ کا رکن مقرر کیا تھا اور وہ شہر کوفہ کے بانی بھی تھے۔ ان کی جگہ ولید بن عقبہ کے تقرر کو لوگوں نے حیرت کی نظر سے دیکھا ہو گا ولید بن عقبہ کے تقرر سے اس تاثر کو تقویت پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے پیشروؤں کی روش سے ہٹ کر اقربا نوازی کرنے لگے ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پورے شام کا گورنر جنرل بنانے کے بعد یہ دوسری گورنری تھی جس پر خلفائے بنی امیہ کا ایک فرد فائز کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ولید بن عقبہ نے آرمینیہ، آذربائیجان وغیرہ علاقوں کی بغاوتیں فرو کرنے اور نئے علاقے فتح کرنے میں نمایاں انتظامی اور عسکری قابلیت کا مظاہرہ کیا اور طبری کے بقول اہل کوفہ کی محبوب ترین شخصیت بن گئے۔ وہ سب سے نرم گورنر تھے اور ان کے دروازے سب کے لئے کھلے رہتے تھے۔ لوگ ان سے خوش رہے اور وہ پانچ سال تک کامیاب گورنر رہے۔ آخر ایک بااثر غیر قریشی گروہ ذاتی اور قبائلی اغراض کی بنا پر ان کا مخالف ہو گیا اور سازش کر کے ان پر شراب نوشی کا الزام لگایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول کر کے مدینہ بلایا اور کوڑے لگوائے[1] ظاہر ہے اس سے دشمنوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انہوں نے اسے نہ صرف ولید بلکہ بنوامیہ، خلیفہ ثالث اور قبیلہ قریش کے خلاف اپنی فتح سمجھا ہو گا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی معزولی

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے عہد فاروقی میں مصر فتح کیا تھا اور تب سے وہاں کے گورنر چلے آتے تھے۔ اپنے مشفقانہ سلوک کی وجہ سے وہ مصر کے قبطیوں میں ہر دلعزیز تھے اور خراج کی وصولی میں نرمی سے کام لیتے تھے۔ خراج میں کمی واقع ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے خراج میں اضافہ کا مطالبہ کیا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے جواب

[1] ملاحظہ ہو تاریخ طبری حصہ سوم (خلافت راشدہ حصہ دوم) کا اردو ترجمہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی، کراچی۔
طبری نے بھی لکھا ہے اور عمر ابوالنصر نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ کوفہ کے کچھ نوجوانوں نے ایک گھر میں نقب لگائی اور گھر کے مالک کو قتل کر دیا۔ پڑوسی کی شہادت پر پولیس نے زہیر بن جندب اسدی، مورع بن ابی مورع اسدی اور شبیل بن ابی ازدی کو گرفتار کر لیا اور قتل کا جرم ثابت ہونے پر وہ قتل کر دیئے گئے۔ ان کے والدین کے دلوں میں ولید کے خلاف کینہ پیدا ہو گیا اور انہوں نے ولید کے خلاف شراب نوشی کی شہادت دی جو جھوٹی تھی اور انتقامی کارروائی تھی۔ لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت و ملوکیت، میں شراب نوشی کے الزام کو ''البدایہ والنہایہ'' اور ''الاستیعاب'' کے حوالے سے صحیح بتایا ہے بلکہ انہی حوالوں سے مزید لکھا ہے کہ ولید نشہ کے عادی تھے۔ ایک دن حالت نشہ میں انہوں نے فجر کی نماز دو کی بجائے چار رکعت پڑھائی اور پھر پلٹ کر مقتدیوں سے کہا ''اور پڑھاؤں؟'' ولیم میور نے بھی اس روایت کو صحیح مانا ہے۔ مولف

دیا'' کہ اونٹنی اس سے زیادہ دودھ نہیں دے سکتی۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول کر کے اپنے رضاعی بھائی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ابن سعد ابن ابی سرح کو ۲۷ھ میں پورے مصر کا گورنر مقرر کر دیا جبکہ اس سے پہلے وہ ایک تھوڑے سے علاقے سعید کے عامل تھے اور دونوں میں صوبائی نظم و نسق، فوجی معاملات اور خراج کے امور میں اختلافات چلے آتے تھے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک بات یہ بھی تھی کہ ۲۵ھ میں جب اہل اسکندریہ نے بغاوت کی تو بغاوت فرو کرنے کے بعد انہوں نے باغیوں کے اہل و عیال کو لونڈی غلام بنا لیا تھا۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے تھے کیونکہ ان کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مثال تھی۔ انہوں نے مصر کے اسیرانِ جنگ کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا تھا اور انہیں مسلمان ہو جانے یا اپنے پہلے دین پر قائم رہنے کا اختیار دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لونڈی، غلام آزاد کر دیئے۔

ابن ابی سرح کی کوششوں سے مصر کے خراج کی رقم بیس لاکھ سے بڑھ کر چالیس لاکھ سالانہ ہو گئی۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''تمہارے بعد اونٹنی زیادہ دودھ دینے لگی ہے۔'' انہوں نے جواب دیا ''ہاں! مگر اس کے بچے بھوکے رہ گئے۔''

عبداللہ ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا تقرر

یہ ایک قابل منتظم اور جرنیل تھے لیکن نظم و نسق میں سختی سے کام لیتے تھے۔ ان کا ماضی بھی لوگوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے اور ان چند افراد میں سے تھے جن کے قتل کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن دیا تھا لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جان بخشی کرائی تھی۔ مصر کی گورنری کے دوران میں انہوں نے شاندار فتوحات حاصل کیں۔ طرابلس الغرب اور دوسرے شمالی افریقی علاقے انہیں کی کوشش و تدبیر سے فتح ہوئے۔ وہ پہلے مسلمان سپہ سالار تھے جنہوں نے رومیوں کے خلاف بحری جنگ کی اور انہیں زبردست شکست دی۔ لیکن مخالفوں نے ان تمام باتوں سے صرفِ نظر کر لیا۔ مصر عبداللہ ابن سبا کی سازشی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا اور ابن ابی سرح کی مخالفت کے پردے میں حضرت عثمان کی مخالفت شروع ہو گئی۔ جس میں محمد ابن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور محمد ابن ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے۔ اول الذکر خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اور دوسرے مہاجرین اولین میں کے بزرگ صحابی ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے تھے۔ دونوں کو اپنے نسب و نسل اور خاندان کا بڑا زعم تھا۔ موخر الذکر کی تو پرورش ہی خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔ دونوں اپنی عالی خاندانی کی بنا پر اعلیٰ مراتب کے خواہش مند تھے جو انہیں نہ مل سکے۔ عبداللہ ابن سبا نے انہیں اپنا آلہ کار بنایا اور یوں گورنر اور خلیفہ کے شدید مخالف ہو گئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ولید بن عقبہ کے بعد عبداللہ ابن ابی سرح تیسرے اموی گورنر تھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی برطرفی اور عبداللہ ابن عامر کا تقرر بطور گورنر بصرہ

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ایک بزرگ اور بلند مرتبہ صحابی تھے ان کا تعلق یمن کے قبیلہ اشعر سے تھا۔ وہ

عہد فاروقی سے بصرہ کے گورنر چلے آتے تھے۔ عہد عثمانی میں باغی کردوں کے خلاف جہاد کی ضرورت پیش آئی۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک زوردار تقریر میں پاپیادہ جہاد پر چلنے کے فضائل بیان کیے۔ لوگ متاثر ہوئے اور چلنے پر تیار ہوگئے۔ لیکن خود ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ ایک عمدہ ترکی گھوڑے پر سوار ہوکر نکلے جبکہ ان کا سامان چالیس خچروں پر لدا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر مخالفین میں سے ایک شخص نے ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ ان کے قول وفعل کے تضاد پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ "ہمیں سواریاں دو اور خود پیدل چل کر ثواب حاصل کرو۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے باگ پکڑنے والے کی کوڑے سے خبر لی۔ مخالف گروہ نے مدینہ جا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ انہوں نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے پچیس سالہ عبداللہ ابن عامر کو بصرہ کا گورنر مقرر کر دیا یہ صاحب بھی بنی امیہ میں سے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی معزولی کا واقعہ ۲۹ھ میں پیش آیا۔

اس میں شک نہیں کہ عبداللہ بن عامر نہایت جوانمرد، شجاع، بیدار مغز، اولوالعزم اور صاحب ہمت و ہیبت تھے۔ مشکلات کو اپنے ناخن تدبیر سے حل کرنا جانتے تھے اور وہ ایک کامیاب گورنر ثابت ہوئے۔ انہوں نے فارس اور خراسان کی بغاوتیں فرو کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے ماتحت جرنیلوں احنف بن قیس، اقرع بن حابس، مجاشع بن مسعود، ربیع بن زیاد، عبدالرحمٰن بن سمرہ نے طخارستان، کرمان، افغانستان، سیستان وغیرہ علاقے فتح کیے۔ وہ حضرت عثمان کی شہادت تک بصرہ کے گورنر رہے۔

معاویہ رضی اللہ عنہ، ولید بن عقبہ اور ابن ابی سرح کے بعد یہ چوتھے اموی گورنر تھے۔

سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا تقرر بطور گورنر کوفہ

۳۰ھ میں حضرت عثمان نے ولید بن عقبہ کی جگہ سعید بن العاص کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ وہ بھی اموی تھے لیکن باصلاحیت اور قابل نوجوان تھے خود فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا۔

سعید پانچویں اموی گورنر ہوئے۔ ان کی معزولی اور ان کی جگہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی تقرری کا ذکر آگے آئے گا۔ اب نظم ونسق کی صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ چوٹی کے تمام مناصب یعنی صوبائی امارتوں پر بنوامیہ کے افراد فائز تھے۔

۱- شام میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ

۲- مصر میں عبداللہ ابن سعد ابن ابی سرح اموی رضی اللہ عنہ (حضرت عثمان کے رضاعی بھائی)

۳- کوفہ میں ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ (حضرت عثمان کے ماں جائے بھائی) اور ان کے بعد سعید بن العاص اموی

۴- بصرہ میں عبداللہ بن عامر (حضرت عثمان کے ماموں زاد بھائی)

۵- اس پر مستزاد یہ کہ حضرت عثمان نے اپنے چچازاد بھائی اور داماد مروان بن الحکم کو اپنا سیکرٹری مقرر کیا حالانکہ اس سے پہلے سیکرٹری کا کوئی باقاعدہ اور خصوصی عہدہ نہ تھا۔ مروان نے نہایت ہوشیاری سے پورے نظم حکومت

پر اپنا اثر و نفوذ قائم کر لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رشتہ داری اور اعتماد کا نا جائز فائدہ اٹھایا۔ خلیفہ کی سرکاری مہر بھی اسی کے قبضے میں رہتی تھی۔

اس طرح عملاً بنو امیہ کے خاندان کے ہاتھ میں حکومت کے تمام اختیارات جمع ہو گئے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو ''طلقاء'' کے زمرے میں آتے تھے یعنی جنہیں فتح مکہ کے دن معافی دی گئی تھی اور وہ آخری چارۂ کار کے طور پر حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

سنت شیخین رضی اللہ عنہما کے خلاف نظم و نسق کی ان تبدیلیوں اور ان کی پالیسی سے انحراف کے خلاف ردِ عمل بتدریج خلافت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں خطرناک اور المناک ثابت ہوا اور بالآخر حضرت عثمان کی شہادت اور خلافت میں انتشار و اضطراب پر منتج ہوا۔ قریش، انصار اور بدوی قبائل سبھی کو خیال ہوا کہ بزرگ صحابہ کو امارتوں سے اس لئے ہٹایا گیا تاکہ بنو امیہ کے افراد کا تعین ان کی جگہ کیا جائے۔ یہ اقربا نوازی تھی۔ وہ خود بھی ان مراتب کے آرزومند تھے مگر محروم رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی انتظامی پالیسی میں یہ بات داخل تھی کہ حاکم اور رعایا (خاص کر عرب قبائل) ایک قبیلے سے نہ ہوں۔ بصرہ میں مضری اور ربعی قبائل کی اکثریت تھی وہاں انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو گورنر مقرر کیا تھا جو یمن کے اشعری قبیلہ سے تھے۔ کوفہ میں یمنی قبائل کی اکثریت تھی، وہاں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو تعینات کیا تھا۔ جو بنو ثقیف میں سے تھے۔ شام اور مصر میں بھی یمنی قبائل زیادہ آباد تھے۔ اس لئے وہاں دو قریشی مصری یعنی معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو گورنر بنایا تھا۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس دور اندیشانہ پالیسی کو الٹ دیا اور خراسان سے لے کر شمالی افریقہ تک تمام صوبوں پر اموی گورنر مقرر کر دیئے۔ اور خلافت کے مرکزی دفتر پر بھی امویوں کا قبضہ ہو گیا اس سے لوگوں میں حسد، بدگمانی، بددلی اور بے اطمینانی پیدا ہوئی۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عزل و نصب کی کارروائیوں کے جواز میں ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں

''تامل کے بعد آپ کی اصابت رائے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کیونکہ ہر ایک کے عزل و نصب سے یا تو کسی لشکر کا اختلاف رفع کرنا منظور تھا یا کسی نئی اقلیم کا فتح کرنا۔ جو لوگ کسی وجہ سے اپنا اعتماد کھو دیتے حضرت عثمان ان کو ذمہ داری کا کام سونپنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس بات کی بڑی اہمیت تھی کہ جو جہاں مقرر ہے وہاں عوام کو اس پر اعتماد ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب عوام نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، ولید بن عقبہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی معزولی کا مطالبہ کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو پورا کیا۔''[1]

حضرت عثمان بنی امیہ کو حکومت کے عہدوں پر فائز کرنا نیک نیتی سے صلہ رحمی کا تقاضا سمجھتے تھے۔ جس طرح انہوں نے اپنا ذاتی مال بنی امیہ پر بے دریغ خرچ کیا اور انہیں اپنی دولت و ثروت میں شریک کیا، اسی طرح انہیں حکومتی مناصب میں شریک کرنا بھی صلہ رحمی کے طور پر اسلامی احکام کی بجا آوری خیال کرتے تھے۔ حالانکہ ذاتی مال اور حکومتی مناصب کی تقسیم میں بہت فرق تھا اور دونوں کو ایک سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔ شائد یہ بھی ہو کہ وہ بنی امیہ

[1] بحوالہ ماہنامہ بینات (کراچی) صفحہ ۵۲، شمارہ ستمبر ۱۹۸۷ء

کے افراد کو ان کی صلاحیتوں کی بنا پر واقعتاً مناصب حکومت کا زیادہ اہل سمجھتے تھے۔ وہ اپنے کارناموں سے اہل ثابت ہوئے بھی مگر اس کا کیا علاج کہ بہت سے غیر اموی باصلاحیت، حوصلہ منداور مستحق افراد بھی موجود تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان پر کما حقہ اعتماد نہ ہو۔ آخر بعد میں آنے والے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے قابل اعتماد اعزہ واقارب کو عہدے دیئے مگر تب تک حالات بدل چکے تھے اور مسلمانوں کی باہمی جنگیں شروع ہو چکی تھیں اس لئے انہیں اپنے ذاتی بھروسہ کے افراد کا انتخاب کرنا پڑا۔

ولائت کوفہ پر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا تقرر فتنہ وشورش کے ابتدائی آثار

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی جگہ سعید بن العاص اموی کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ انہوں نے کوفہ پہنچ کر وہاں کے حالات کا جائزہ لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی کہ اہل کوفہ کے معاملات میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے قدیم اور شریف خاندان مغلوب ہو گئے ہیں اور بعد میں آنے والے لوگ اور بدوی وہاں کے معاملات پر غالب آ گئے ہیں۔ شریفوں اور بہادروں کو کوئی نہیں پوچھتا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں ہدایت کی کہ تم ان قدیم اور سابق الخدمات لوگوں کو ترجیح دو جن کے ہاتھوں پر اللہ نے ملک فتح کرایا ہے۔ ہر ایک کی حیثیت، مرتبے اور حقوق کو ملحوظ رکھو۔ مردم شناسی کے ذریعے عدل وانصاف قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ سعید بن العاص نے اپنی خلوتِ خاص میں قدیم مجاہدین قادسیہ، قراء اہل بصرہ اور دیگر معزز افراد کو جگہ دینا شروع کی۔ البتہ مجلس عام میں ہر کوئی آ سکتا تھا۔ یہ فرق وامتیاز بھی شورش پسند اور غیر قانع عناصر کو ناگوار گزرا۔ سعید نے سرکش عناصر کو دبانے کے لئے ایک مردآہن کی طرح حکومت کرنا چاہی اور قریش سے ترجیحی سلوک شروع کیا۔ جس سے غیر قریش اور بدوی قبائل ناراض ہو گئے۔ ایک عرصے تک سعید بن العاص نے انہیں شمالی ایران میں جنگی مہمات میں مصروف رکھا اور باغیانہ سپرٹ دبی رہی لیکن مواد اندر ہی اندر پکتا رہا۔

ایک دن سعید ابن العاص نے مجلس عام میں کہہ دیا کہ ''سواد کوفہ قریش[1] کا باغ ہے'' اس پر حاضرین میں سے مالک اشتر نخعی اور بعض دوسرے غیر قریش افراد بھڑک اٹھے۔ اشتر نے کہا ''کیا تمہارا خیال ہے کہ یہ علاقہ جو اللہ نے بزور شمشیر غنیمت میں ہمیں دیا ہے تمہارا اور تمہاری قوم (قریش) کا باغ ہے؟ خدا کی قسم تمہارا بڑے سے بڑا حصہ دار بھی ہمارے برابر ہے۔'' اس پر محفل میں ہنگامہ آرائی اور باہمی زدوکوب شروع ہو گئی اور پھر لوگ اپنی مجلسوں اور گھروں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور سعید بن العاص کو سب وشتم کرنے لگے۔ سعید بن العاص اور کوفہ کے بعض دوسرے مخلص، معزز اور دور اندیش افراد کی رپورٹ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شرارت کے سرغنوں مالک اشتر نخعی، صعصعہ، ابن الکواء، جندب بن زہیر غامدی، عمرو بن الحمق خزاعی وغیرہ تقریباً ایک درجن افراد کو کوفہ سے جلا وطن کر کے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس دمشق بھیج دیا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں نرمی سے راہ راست پر لانے کی

[1] یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ سعید ابن العاص نے قریش کا باغ کہا بنی امیہ کا باغ نہیں کہا لیکن غیر قریشی قبائل تو بحیثیت مجموعی قریش کے اور بالخصوص بنی امیہ کے مخالف اور حاسد تھے۔ آگے چل کر ستم یہ ہوا کہ خود قریش میں سے بھی کچھ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالف ہو گئے۔ اگرچہ اکثریت نے ان کا ساتھ دیا۔ (مؤلف)

ناکام کوشش کی۔ آخر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ان لوگوں کا مقصد تفرقہ پردازی اور انتشار پھیلانا ہے۔ انہوں نے کوفہ میں ماحول کو خراب کیا ہے۔ اب اگر یہ اہل شام کے درمیان رہے تو اندیشہ ہے کہ یہ لوگ انہیں بھی خراب کر دیں گے۔ انہیں ان کے شہر (کوفہ) کو لوٹا دیا جائے تا کہ یہ اسی شہر میں رہیں ہاں سے ان کی منافقت پھوٹی ہے۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفہ واپس جانے کی اجازت دیدی۔ لیکن وہاں جا کر ان کی زبانیں پھر کھل گئیں۔ پھر ان لوگوں کو حمص کے گورنر عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ عبدالرحمٰن نے انہیں ایک ساحلی مقام پر ٹھہرایا۔ ان کے وظیفے مقرر کر دیئے اور انہیں خوب ڈرایا دھمکایا۔ کچھ عرصہ بعد جب عبدالرحمٰن نے دیکھا کہ ان کی باغیانہ اسپرٹ دب گئی ہے تو انہیں کوفہ واپس جانے کی اجازت دے دی، اس دوران میں کوفہ کے حالات بہتر نہ ہو سکے۔ اکثر سر کردہ اور بااثر اصحاب جو عامتہ الناس کو قابو میں رکھ سکتے تھے، فوجی مہمات پر گئے ہوئے تھے۔

سعید بن العاص نے مدینہ جا کر خلیفہ کو صورتِ حال سے مطلع کرنے اور ان سے ضروری ہدایات لینے کا پروگرام بنایا۔ ان کے جاتے ہی سرکش اور سازشی عناصر سرگرم و فعال ہو گئے۔ مالک اشتر اور اس کے ساتھی بھی پہنچ گئے اور غلط اور اشتعال انگیز افواہیں پھیلانے لگے۔ جب سعید بن العاص مدینہ سے واپسی پر کوفہ کے قریب پہنچے تو اشتر اور اس کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ ان کے غلام کو قتل کر دیا۔ انہیں کہا کہ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں تم عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ واپس جاؤ۔ سعید وہیں سے الٹے پاؤں مدینہ روانہ ہو گئے۔

سرکش عناصر کے مطالبے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بزرگ اور عمر رسیدہ صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (جو غیر قریشی اور یمنی تھے) کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا یہ وہ صاحب تھے جنہیں اہل بصرہ کی شکایت پر ۲۹ھ میں وہاں کی گورنری سے برطرف کیا گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ کو لکھا کہ میں نے سعید کو معزول کر کے جس کو تم چاہتے ہو اس کو تمہارا والی مقرر کر دیا ہے۔ خدا کی قسم میں تم سے اپنی آبرو بچاؤں گا۔ تمہارے مقابلے میں صبر سے کام لوں گا اور تمہاری اصلاح کے لئے پوری کوشش کروں گا جیسا کہ اس باب کے آغاز میں لکھا گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ گورنروں کا تقرر اپنی صوابدید سے کرتے تھے البتہ اصحابِ شوریٰ سے مشورہ کر لیتے تھے۔ کوفہ کے شورہ پشتوں کے مطالبہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا تو سرکش عناصر کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ خلیفہ اور اس کی انتظامیہ کے مقابلے میں دلیر ہو گئے۔ حضرت شعبی کہتے ہیں کہ ''کوفہ پہلا شہر ہے جہاں شیطان نے جھگڑا پیدا کیا'' خلیفہ نے سرکش و مفسد عناصر کے مقابلے میں جو حد سے زیادہ نرمی دکھائی، اس کے نتائج نہایت خطرناک اور تباہ کن ثابت ہوئے اگر وہ مفسدہ پردازوں اور ان کے سرغنوں کو مناسب سزائیں دیتے اور کوفہ کی فضا کو ان کے مسموم اثرات سے پاک کر دیتے اور قابل، غیر جانبدار، دور اندیش، مدبر، مخلص اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے مالک شخص کو گورنر مقرر کرتے تو اس عظیم فتنہ و فساد کی نوبت نہ آتی جو بالآخر ان کی المناک شہادت پر منتج ہوا۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ خود عمر رسیدہ، نرم مزاج اور مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ باغیوں نے ان کی تقرری کا مطالبہ اپنی اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا تھا۔ ابوموسیٰ یمنی تھے۔ بنی امیہ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ بگڑتی

ہوئی صورت حال پر قابو نہ پا سکے۔ کچھ عرصہ تک دبے رہنے کے بعد شرپسندوں کی سرگرمیاں پھر تیز ہو گئیں۔ اور وہ دوسرے شہروں کے مفسد عناصر سے بھی خط و کتابت کے ذریعے گٹھ جوڑ کرنے لگے۔ بصرہ اور مصر میں بھی سازشی ٹولے سرگرم کار ہو گئے۔ دراصل عثمان رضی اللہ عنہ بلکہ خود اسلام کے خلاف سازش کا پہلا مرکز کوفہ ہی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنہوں نے یہ شہر آباد کرایا تھا۔ وہ بھی اہل کوفہ کی شکایتوں سے تنگ آ گئے تھے۔ کوفہ کے بانی اور اس کے پہلے گورنر فاتح قادسیہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو انہوں نے اہل کوفہ کی بے بنیاد شکایتوں پر مصلحتاً مدینہ واپس بلا لیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم پالیسی اور لوگوں کے مطالبہ پر عمال کی اکھاڑ پچھاڑ اور امویوں کی تقرریوں نے صورت حال کو ان کے خلاف بگاڑنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ ابن سبا یہودی نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔

سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں سرمایہ داری نے سر اٹھایا۔ نظم و نسقِ حکومت میں ڈھیل پیدا ہو جائے تو بہت سی خرابیاں جنم لینے لگتی ہیں اور موقع پرست عناصر علانیہ یا خفیہ طور پر سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

راقم کے خیال میں گورنروں کے عزل و نصب نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف مخالفت کو ابھارنے میں سب سے زیادہ کام کیا۔

سرمایہ داری کا آغاز

دور دراز ممالک کی فتوحات اور غنائم سے مسلمانوں میں مال و دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ اموالِ غنیمت کے ساتھ ہاتھ آنے والے لونڈی غلاموں کی بھی کثرت ہو گئی۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کے ابتدائی چھ سات سال کے بعد فتوحات کا اسٹیم رولر تھمنے لگا تو فرصت اور فارغ البالی نے عیش و عشرت کی راہیں کھول دیں۔ شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب لینے لگے۔ دولت اور غلاموں کی بہتات سے سرمایہ کاری اور سرمایہ داری کا آغاز ہوا۔ اس طرح ایک سرمایہ دار اور صاحب جائیداد طبقہ پیدا ہو گیا جس کے لئے لونڈیاں اور غلام کام کرتے تھے۔ لونڈیوں کی موجودگی نے عیش و طرب کے جذبات کو ابھارا۔ حجاز اور دوسرے عرب شہروں میں تمدن کی نفاستوں نے جنم لیا۔ باہمی رشک و حسد، رقابت و مسابقت اور جاہلیت کے قبائلی تعصّبات نے پھر سر اٹھایا۔ دولت و تعیش کی وجہ سے خطرناک معاشی و سیاسی انقلاب کے جراثیم پرورش پانے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دولت کی فراوانی کے خطرناک اثرات کے خلاف متنبہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ مجھے تمہاری موجودہ عسرت و تنگ دستی سے اتنی تشویش نہیں جتنی کہ دولت کی اس فراوانی سے تشویش ہے جو میں دیکھ رہا ہوں کہ عنقریب تمہیں حاصل ہو گی۔ اسی طرح عہد فاروقی میں جب نہاوند کی فتح کے بعد انبار در انبار مالِ غنیمت مدینہ پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے دیکھ کر رونے لگے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''امیر المومنین! یہ موقع تو خوش ہونے کا ہے نہ کہ رونے کا۔'' فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''میں اس لئے روتا ہوں کہ دولت کی فراوانی کے ساتھ رشک و حسد، بغض و عناد، عجب و غرور اور تعصب بھی چلے آتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں مسلمان بھی ان کا شکار نہ ہو جائیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے عمال اور عوام کو بھی سادگی اور کفائت شعاری سے رہنے کی

تاکید کرتے تھے۔ اس لئے ان کے عہد میں غنیمت، خراج اور جزیہ وغیرہ کی کثرت کے باوجود لوگ خلیفہ کی ذاتی مثال سے متاثر تھے اور عیش وعشرت کی زندگی سے بچتے تھے۔ دشمنوں سے جہاد وقتال میں مصروفیت بھی عیش کوشی سے مانع تھی۔ سرمایہ داری کے کہیں کوئی آثار نہ تھے۔ گنتی کے چند صحابہ جو اپنی تجارت پیشگی کی وجہ سے مالدار تھے۔ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عظیم مالی قربانیاں پیش کی تھیں اور ایثار پیشگی ان کی فطرتِ ثانی بن چکی تھی۔ ان میں سرمایہ دارانہ فطرت کا فقدان تھا کیونکہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ عہد نبوی سے لے کر عہد فاروقی تک مسلمانوں کی عام روش سادگی، توکل، قناعت اور زُہد ودرویشی کی رہی لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ زمانۂ قبل اسلام سے ایک متمول تاجر چلے آتے تھے۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں ذاتی طور پر کہیں زیادہ دولت مند تھے۔ ان کی دولت وثروت کا انحصار مالِ غنیمت اور بیت المال کے وظیفے پر نہ تھا۔ وہ دوسرے سابق الایمان مہاجرین کی طرح پانچ ہزار درہم سالانہ وظیفہ کے حقدار تھے۔ لیکن انہوں نے بیت المال سے کبھی وظیفہ نہیں لیا بلکہ اپنے ذاتی مال سے اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات پر بے دریغ خرچ کرنے کے علاوہ اپنے اعزہ واقارب سے بھی فیاضانہ صلہ رحمی کرتے تھے۔ چونکہ وہ خود دولت مند تھے اس لئے خلیفہ بننے کے بعد انہوں نے دوسروں کی بڑھتی ہوئی دولت وثروت پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ انہوں نے خود بھی مدینہ میں ایک عالی شان دو منزلہ مکان تعمیر کرایا اور دوسرے متمول افراد نے بھی بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرائیں بلکہ دوسرے شہروں میں بھی مکانات تعمیر کرائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملی مالیات کے معاملے میں کفائت شعاری اور جزرسی سے کام لیتے تھے جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فراخدل واقع ہوئے تھے۔ روزینوں میں اضافے، بعض بزرگ صحابہ کو عطیات اور اپنے رشتہ داروں سے فراخدلانہ صلہ رحمی اس پر شاہد ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ کو مفتوحہ ممالک میں زمینیں حاصل کرنے اور حجاز میں واقع اپنی جائیدادوں کو عراق، شام مصر کی جائیدادوں سے تبادلہ کرنے کی اجازت دیدی۔ سرمایہ داری اور زمینداری کا آغاز ہو گیا۔ تجارت وزمینداری سے دولت کی پیدائش وافزائش میں غلاموں کی کثرت کو بڑا دخل تھا۔ یہ غلام زیادہ تر عجمی تھے۔ لوگوں کو فراغت اور فرصت میسر آئی، دولت کے اکتناز واحتکار کی راہیں کھلیں۔ قرآن وسنت کے مطابق واجبات، عشر وزکوٰۃ وغیرہ ادا کرنے کے باوجود دولت جمع ہونے لگی رشک وحسد ورقابت کی فضا پیدا ہوئی جاہ ومراتب کی ہوس نے معاشرے میں زہر گھولنا شروع کیا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اسلام کے سابقون الاولون میں سے تھے۔ ان کی زندگی پر سادہ مزاجی، زُہد وتوکل اور صبر وقناعت کا رنگ غالب تھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی سادگی اور نفس کشی دیکھی تھی۔ انہوں نے ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی علاقے کی امارت کی درخواست کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''ابوذر! تم امارت کا بوجھ نہ اٹھا سکو گے'' پھر کبھی کسی منصب کی آرزو نہ کی۔ چار ہزار

درہم سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اموالِ غنیمت سے بھی حصہ ملتا ہوگا۔ سال بھر کے لئے اپنی ضرورت کا سامان خرید لیتے تھے۔ باقی اہل حاجت میں تقسیم کر دیتے تھے۔ نقد روپیہ، سونا چاندی اپنے پاس رکھنے کے خلاف تھے۔ ضرورت کے لئے درہم و دینار کو بھی تانبے کے سکوں میں تبدیل کر کے اپنے پاس رکھتے تھے پہننے کے کپڑوں کے علاوہ زائد از ضرورت کوئی کپڑا بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کسی پوچھنے والے کو جواب دیا کہ ''ایک چادر میرے پاس ہے۔ کچھ بکریاں ہیں جن کا دودھ پیتا ہوں۔ ایک اونٹ اور خچر بھی ہے جو سواری کے کام آتے ہیں۔ ایک خادم ہے جو کھانا پکا دیتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہئے؟'' غرضیکہ وہ فقیرانہ اور بے نیازانہ وضع رکھتے تھے۔ ایثار، سخاوت، مہمان نوازی اور انفاق فی سبیل اللہ ان کے نمایاں اوصاف تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ کے زُہد کو حضرت مسیح علیہ السلام کے زُہد سے مشابہ قرار دیا تھا۔ انہوں نے دمشق کو اپنا تبلیغی مرکز بنا لیا اور اکتناز دولت اور عیش پرستی کے خلاف تبلیغ شروع کر دی۔ اس سے شام کے پرسکون ماحول میں بے اطمینانی کی فضا پیدا ہونے لگی اور غریبوں میں دولت مندوں کے خلاف جذبات ابھرے۔

وہ تقریریں کرتے کہ ''ان لوگوں کو خوشخبری ہو جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، قیامت کے دن اسی سونے اور چاندی کو گرم کر کے ان کے چہروں، پیٹوں، پہلوؤں اور پیٹھوں پر داغ لگائے جائیں گے۔''[1] ابن سبا یہودی بصرہ اور کوفہ سے نکالے جانے کے بعد ان دنوں دمشق میں تھا۔ اس نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہا اور اس میں خاصا کامیاب رہا۔ اس نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو شام کے گورنر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے امرائے شام کے خلاف بھڑکایا۔ شام کی پرسکون فضا میں بدامنی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں ایک ہزار درہم کی تھیلی بھیج کر آزمایا۔ انہوں نے ساری رقم قاصد کے سامنے ہی حاجت مندوں میں تقسیم کر دی۔ یہ دیکھ کر کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اپنے تبلیغی مشن میں مخلص ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے بیت المال کے اموال کے متعلق بے سود بحث کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ اہل شام کے لئے خطرہ اور فتنہ کی علامت بن گئے ہیں اور مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ اس لئے انہیں مدینہ بلا لیا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں مدینہ بلا کر نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی اور فرمایا کہ ''ابوذر! میرا یہ فرض ہے کہ میں اپنے فرائض ادا کروں اور رعایا کے ذمہ جو واجبات ہوں انہیں وصول کروں۔ میں انہیں زاہد بننے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ البتہ انہیں محنت کرنے اور کفائت شعار بننے کی تلقین کر سکتا ہوں۔''

لیکن ابوذر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ جس پر زکوٰۃ فرض ہو وہ صرف زکوٰۃ دینے پر اکتفا نہ کرے بلکہ وہ پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی بھی کرے۔ ایک مسلمان کو ضرورت سے زیادہ مال و اسباب و جائیداد رکھنا جائز نہیں۔ قرآن مجید کی رو سے زکوٰۃ وغیرہ واجبات کی ادائیگی کے علاوہ بھی مسلمانوں کے مال میں ''سائل و محروم'' کا حق ہے اور حکم ہے کہ زائد از ضرورت مال (العفو) راہ خدا میں خرچ کر دیا جائے۔ غرضیکہ ابوذر رضی اللہ عنہ اپنے موقف پر جمے رہے اور کہا کہ ''واللہ! میں دولت مندوں اور امیروں سے اس وقت تک راضی نہیں

---

[1] سورہ توبہ آیات ۳۴، ۳۵

ہوں گا جب تک وہ اپنے مال واسباب کو حاجت مندوں، پڑوسیوں، دوستوں، رشتہ داروں میں تقسیم نہ کر دیں۔

ابوذر رضی اللہ عنہ کا نظریۂ حیات انتہا پسندانہ تھا۔ اسلام دین اعتدال ہے اس میں انتہا پسندی کی گنجائش نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنی ساری دولت تقسیم کرنے سے منع کر دیا تھا۔ صرف ایک تہائی تقسیم کرنے کی اجازت دی تھی اور فرمایا تھا کہ تمہارے لئے یہ بہتر ہے کہ اپنی اولاد کو مفلس و قلاش چھوڑ جانے کی بجائے انہیں مالدار چھوڑ کر جاؤ تا کہ انہیں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ ایمرجنسی (ہنگامی صورت حال) کی اور بات ہے کہ اندریں صورت جس کے پاس جو کچھ ہو، ملت کے مفاد کے لئے حاضر کر دے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ لوگوں کو کیسے مجبور کر سکتے تھے کہ جائز طریقوں سے پیدا کردہ مال و دولت دوسروں میں تقسیم کر دیں خواہ وہ مستحق ہوں یا نہ ہوں، زاہدانہ زندگی بسر کریں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو جھٹلائیں۔ خلیفۂ وقت اگر ہنگامی حالات کے تحت اس کی ضرورت محسوس کرتا تو وہ عشر و زکوٰۃ کے علاوہ بھی لوگوں کو رضا کارانہ طور پر مالی قربانیاں دینے کی اپیل کر سکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دولت کی ریل پیل ہونے لگی تھی۔ جن مجاہدین کے پاس اموالِ غنیمت سے ملی ہوئی فالتو دولت جمع ہو گئی تھی خلیفہ نے ان سے چھینی نہیں نہ جبراً دوسروں میں بانٹ دینے کا حکم دیا بلکہ وہ انہیں سرمایہ کاری کا مشورہ دیتے تھے یعنی بکریوں وغیرہ کی تجارت کرنے کی۔ حالانکہ خود ابوذر رضی اللہ عنہ ہی کی طرح زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خلفائے راشدین کا عمل مسلمانوں کے لئے زیادہ قابل تقلید تھا جو قرآن وسنت کے خلاف نہ تھا۔ آج مسلمانوں کا ایک نام نہاد دانشور طبقہ، روسی اشتراکیت سے متاثر ہو کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی دعوت کا بہت پروپیگنڈہ کرتا ہے یہ وہ طبقہ ہے جس میں ابوذر رضی اللہ عنہ کی دیانت، زہد، تقویٰ اور مساوات پسندی کا عشر عشیر بھی نہیں لیکن یہ نہیں دیکھتا کہ خود سوویت یونین کے حکمرانوں کا طرزِ عمل کیسا ہے۔ اگر یہ گروہ روسی نوبل انعام یافتہ دانشور اور منصف الیگزینڈر سولژے نستین کے خط ''روسی رہنماؤں کے نام'' نیز اس کے ناول ''کینسر وارڈ'' کا مطالعہ کرے تو سرخ جنت کی منظر کشی سے ان کی آنکھیں کھل جائیں۔ سولژے نستین اسی بنا پر معتوب ٹھہرا اور ملک بدر کر دیا گیا۔ روسی حکمران اور لیڈر اور مراعات یافتہ طبقہ کے افراد ایسی ہی متموّلانہ اور عیش پسندانہ زندگی بسر کرتے ہیں جیسے کسی سرمایہ دار ملک کا دولت مند طبقہ۔ چین کے سیاسی ومعاشی نظام کے خلاف حال ہی میں طلبا نے جو وسیع پیمانے پر جمہوری تحریک چلائی اور اس کا جو انجام ہوا، وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ روسی لیڈر بریژنیف کے پاس بہترین قسم کی اسی کاریں تھیں۔ تمام مقتدر لیڈروں کے پاس ماسکو سے باہر شاندار بنگلے (ولاز) ہیں اور اب نوستر سالہ تجربہ کے بعد روس کا کمیونسٹ نظام بالکل ناکام ہو گیا ہے۔ مختلف سوویت ریاستوں نے اس کے خلاف شورشیں اور بغاوتیں شروع کر دی ہیں۔

خود ہمارے اس روس کے قصیدہ خوان دانشور طبقے کے پاس مال وزر کی کمی نہیں۔ کاریں بھی ہیں اور کوٹھیاں بھی ہیں۔ مشہور انگریز ادیب اور ڈرامہ نویس نے ایک دفعہ فیبئین ہال[1] (Fabian Hall) میں اشتراکیت کی

[1] اشتراکیت پسند فیبئین سوسائٹی کا ہال جہاں اشتراکیت کی حمایت میں لیکچر وغیرہ ہوتے تھے۔ برنارڈ شا ان دنوں سرگرم اشتراکی تھے۔ (مؤلف)

حمایت اور تقسیم دولت اور معاشی مساوات کے حق میں زبردست لیکچر دیا۔ لوگ اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے اس کے دل میں خدشہ گزرا۔ کہا "کہاں جارہے ہو؟ دیکھنا باہر جو کار کھڑی ہے وہ میری ہے" (یعنی اشتراکیت کے جوش میں کہیں دوسروں کی کاروں کے ساتھ میری کار کو بھی نہ جلا دینا) ان لوگوں کے قول اور عمل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے رضا کارانہ طور پر ربذہ میں اقامت اختیار کرلی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں مدینہ میں روکنا چاہا لیکن انہوں نے کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جب مدینہ کی آبادی بڑھتے بڑھتے کوہ سلع تک پہنچ جائے تو تم اس میں نہ رہنا۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی گزر بسر کا مناسب انتظام کردیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے پسماندگان کو اپنے پاس مدینہ بلالیا۔

محمد ابن سعد، علامہ جریر طبری اور دوسرے ثقہ مؤرخ کثرت روایات کی بنا پر متفق ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ربذہ جلاوطن نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے اپنی مرضی سے اپنی رہائش گاہ کے لئے اسے منتخب کیا تھا۔ ربذہ میں ان کا انتقال بیکسی کے عالم میں ہوا۔ جبکہ ربذہ کے باشندے حج کے لئے گئے ہوئے تھے اور ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس صرف ان کی بیوی اور بیٹی تھیں۔ ان کی دعوت وتبلیغ سے بڑھ کر شاید ان کی بیکسی کی موت نے عوام کو متاثر کیا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالفوں نے ابوذر رضی اللہ عنہ کی جلاوطنی اور بیکسی کی موت کا ذمہ دار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قرار دیا اور خوب پروپیگنڈہ کیا ابن سودا نے خاص کر اس سے فائدہ اٹھایا۔ دولتمندی وسرمایہ داری کے خلاف ایک ردعمل ظہور میں آیا جس کی بازگشت کوفہ، بصرہ اور مصر کے غیر قریش عرب قبائل اور نومسلم عجمیوں میں سنی گئی[1]

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ سورہ الروم (۳۰) کی آیت ۳۸ (فات ذا القربی حقہ والمسکین وابن السبیل ط ذلک خیر للذین یریدون وجہ اللہ او ولئک هم المفلحون ○ (ترجمہ: پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین ومسافر کو اس کا حق۔ یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔) کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

"یہ نہیں فرمایا کہ رشتہ دار، مسکین اور مسافر کو خیرات دے۔ ارشاد یہ ہوا کہ یہ اس کا حق ہے جو تجھے دینا چاہئے اور حق ہی سمجھ کر تو اسے دے۔ اس کو دیتے ہوئے یہ خیال تیرے دل میں نہ آئے کہ یہ کوئی احسان ہے جو تو اس پر کر رہا ہے اور تو کوئی بڑی ہستی ہے دان کرنے والی۔ بلکہ یہ بات اچھی طرح تیرے ذہن نشین رہے کہ مال کے مالک حقیقی نے اگر تجھے زیادہ دیا ہے اور دوسرے بندوں کو کم عطا فرمایا ہے تو یہ زائد مال ان دوسروں کا حق ہے جو تیری آزمائش کے لئے تیرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے تاکہ تیرا مالک دیکھے کہ تو ان کا حق پہچانتا اور پہنچاتا ہے یا نہیں۔

اس ارشاد الٰہی اور اس کی روح پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن مجید انسان کے لئے اخلاقی و روحانی ارتقا کا جو رستہ تجویز کرتا ہے اس کے لئے ایک آزاد معاشرہ اور آزاد معیشت کی موجودگی ناگزیر ہے۔ یہ ارتقاء کسی ایسے اجتماعی ماحول میں ممکن نہیں ہے جہاں لوگوں کے حقوق ملکیت ساقط کردیئے جائیں، ریاست تمام ذرائع کی مالک ہوجائے اور افراد کے درمیان تقسیم رزق کا پورا کاروبار حکومت کی مشینری سنبھال لے حتیٰ کہ نہ کوئی فرد اپنے اوپر کسی کا حق پہچان کر دے سکے اور نہ کوئی دوسرا فرد کسی سے کچھ لے کر اس کے لئے اپنے دل میں کوئی جذبہ خیر سگالی پرورش کرسکے۔ اس طرح کا خالص کمونسٹ نظام تمدن ومعیشت جسے آج کل ہمارے ملک میں "قرآنی نظام ربوبیت" کے پرفریب (باقی حاشیہ اگلے صفحات پر)

جمع واشاعت قرآن

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا سب سے اہم اور نمایاں دینی کارنامہ قرآن مجید کو اختلافِ قرأت سے محفوظ کر کے ملت اسلامیہ کو ایک قرأت پر جمع کرنا ہے۔ عہد صدیقی میں جنگ یمامہ کے بعد قرآن مجید کو ایک مصحف کی صورت

نام سے زبردستی قرآن کے سر منڈھا جا رہا ہے، قرآن کی اپنی اسکیم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس میں انفرادی اخلاق کے نشوونما اور انفرادی سیرتوں کی تشکیل وترقی کا دروازہ قطعاً بند ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اسکیم تو اسی جگہ چل سکتی ہے جہاں افراد کچھ وسائل دولت کے مالک ہوں (روس اور چین جیسے عظیم کمونسٹ ممالک بھی اپنے نظامِ معیشت میں ترمیم کر کے ادھر آ رہے ہیں اور محدود پیمانے پر کسانوں اور دوسروں کو زمینوں اور جائیدادوں کا مالک ہونے کی اجازت ان پر آزادانہ تصرف کے اختیارات رکھتے ہوں اور پھر اپنی رضا ورغبت سے خدا اور اس کے بندوں کے حقوق اخلاص کے ساتھ ادا کریں (جیسا کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں ہوتا رہا۔ مؤلف) اسی قسم کی معاشرت میں یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ فرداً فرداً لوگوں میں ایک طرف ہمدردی، رحم وشفقت، ایثار وقربانی اور حق شناسی وادائے حق کے اعلیٰ اوصاف پیدا ہوں اور دوسری طرف جن لوگوں کے ساتھ بھلائی کی جائے ان کے دلوں میں بھلائی کرنے والوں کے لئے خیر خواہی، احسان مندی اور جزاء الاحسان بالاحسان کے پاکیزہ جذبات نشوونما پائیں یہاں تک کہ وہ مثالی حالت پیدا ہو جائے جس میں بدی کا رکنا اور نیکی کا فروغ پانا کسی قوت جابرہ کی مداخلت پر موقوف نہ ہو بلکہ لوگوں کی اپنی پاکیزگی نفس اور ان کے اپنے نیک ارادے اس ذمہ داری کو سنبھال لیں۔''

(تفہیم القرآن جلد ۳ صفحہ ۵۸۷ حاشیہ ۵۷)

ہمارے ہاں کے کمونسٹ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی دعوت وتبلیغ کے ڈانڈے مارکسیت سے ملا دیتے ہیں اور ان بزرگ صحابی کا نام لے کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم کو بھی یہ لوگ کمیونزم کا حامی ومؤید قرار دیتے ہیں اور اپنے زعم میں اسلام اور اشتراکیت کو ایک ٹھہراتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ اسلام کا نقطۂ نظر اشتراکیت سے سراسر مختلف ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کبھی نہیں کہا کہ انسان کا پیٹ ہی سب کچھ ہے اور اس کی تسکین دین کی غائت ہے۔ جاوید نامہ، میں اشتراکیت وملوکیت پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک ❊ جز بہ تن کارے ندارد اشتراک

دین آں پیغمبر حق ناشناس ❊ بر مساوات شکم دارد اساس

(ترجمہ: انسانی روح کو محض جسم کی پرورش وپرداخت سے پاکیزگی، توانائی اور حسن حاصل نہیں ہو سکتا اور حالت یہ ہے کہ اشتراکیت محض تن پروری سے سروکار رکھتی ہے۔ اس حق ناشناس داعی (کارل مارکس) نے اپنے دین ودعوت کی بنیاد صرف مساوات شکم پر رکھی ہے)

اور اب تو حالت یہ ہے کہ کارل مارکس کے زمانے کی صنعتی سرمایہ داری میں بھی ایک عظیم انقلاب آ چکا ہے۔ عہد عثمانی کی سرمایہ داری وہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی، جس پر وہ یہودی کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب، گرجا اور برسا ہے۔ اور جس کا آغاز گزشتہ دو صدیوں کی صنعتی ترقی اور لوٹ کھسوٹ سے یورپ اور امریکہ میں ہوا اور جس نے بدترین قسم کے انسانی استحصال کو جنم دیا۔ جو معترضین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے دولت مند صحابہ کو محض ان کی دولت مندی کی وجہ سے سرمایہ دار کہتے ہیں اگر وہ مغربی سرمایہ داری اور ان بزرگوں کی سرمایہ داری کا تقابلی مطالعہ کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ مغربی سرمایہ داری کی

میں مدون اور محفوظ کیا جا چکا تھا۔ عہد فاروقی وعثمانی میں جب دور دراز کے ممالک فتح ہوئے اور مختلف عرب قبائل وہاں پھیل گئے نیز مفتوحہ قوموں نے اسلام قبول کیا جن کی زبان عربی نہ تھی تو قرأت میں اختلاف پیدا ہونے لگا۔ مختلف علاقوں اور قبیلوں کے عربوں میں بھی تلفظ اور لہجہ کا اختلاف تھا۔ نومسلم عجمیوں میں اور بھی پیدا ہوا۔ مشہور

لعنت کے مقابلے میں ان حضرات کی سرمایہ داری جسے ثروت کہنا زیادہ مناسب ہے، دین وملت کے لئے رحمت وبرکت تھی۔ یہ حضرات رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے اور جیتے جی جنت کی خوشخبری سے نوازے گئے تھے، ان سے دین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف روش اختیار کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی خاطر جس طرح بے دریغ دولت لٹائی اس کی مثال تاریخ عالم میں نایاب ہے۔

اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ جائز شرعی طریقوں سے جو مالکانہ حقوق کسی کو دنیا میں حاصل ہوں وہ بہر حال احترام کے مستحق ہیں۔ کسی حکومت اور کسی مجلس قانون ساز کو یہ حق نہیں ہے کہ انہیں سلب کرلے، اجتماعی فلاح وبہبود کے نام پر شریعت کے دیئے ہوئے حقوق کو پامال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات اسلامی حکومت کے فرائض میں ہے کہ افراد کے شرعی حقوق کی حفاظت کرے اور ان سے جماعت کے وہ حقوق حاصل کرے جو شریعت نے ان پر عائد کئے ہیں۔

''خدا نے اپنی نعمتوں کی تقسیم میں مساوات ملحوظ نہیں رکھی ہے بلکہ اپنی حکمت کی بنا پر بعض انسانوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ حسن، خوش آوازی، تندرستی، جسمانی طاقتیں، دماغی قابلیتیں، پیدائشی ماحول اور اسی طرح کی دوسری چیزیں سب انسانوں کو یکساں نہیں ملیں۔ ایسا ہی رزق کا معاملہ بھی ہے خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق میں تفاوت ہو۔ لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطہ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائیں۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے، وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصول رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی میں ایسی قانونی اور رواجی رکاوٹیں باقی نہ رہیں جن کی بنا پر کوئی شخص اپنی قوت واستعداد کے مطابق معاشی جدوجہد نہ کرسکتا ہو۔ اور ایسے امتیازات بھی قائم نہ رہیں جو بعض طبقوں، نسلوں اور خاندانوں کی پیدائشی خوش نصیبی کو مستقل قانونی تحفظات میں تبدیل کر دیتے ہوں۔ یہ دونوں طریقے فطری نامساوات کی جگہ زبردستی ایک مصنوعی نامساوات قائم کرتے ہیں۔ اس لئے اسلام انہیں مٹا کر سوسائٹی کے معاشی نظام کو ایسی فطری حالت پر لے آنا چاہتا ہے جس میں ہر شخص کے لئے کوشش کے مواقع کھلے ہوں مگر جو لوگ چاہتے ہیں کہ کوشش کے ذرائع اور نتائج میں بھی سب لوگوں کو زبردست برابر کر دیا جائے، اسلام ان سے متفق نہیں ہے کیونکہ وہ فطری نامساوات کو مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔''

(یہ اقتباس سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تقریر ''اسلام کا اقتصادی نظام'' سے لیا گیا ہے جو ۲مارچ ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوئی تھی اور ''اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات'' میں مطبوعہ صورت میں شامل ہے صفحات (۴۵۰تا۴۶۰)

مشہور انگریز ادیب، ڈرامانویس اور دانشور جارج برنارڈ شا سوشلزم کا زبردست حامی تھا لیکن غیر فطری مساوات کا وہ بھی قائل نہ تھا۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ لوگوں کو کام کرنے اور اپنی ذہانتوں، قابلیتوں سے کام لینے کے یکساں مواقع فراہم کرنا تو درست ہے لیکن ان سے یکساں کارکردگی اور پیداوار کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ بڑے فخر اور تیقن سے لکھتا ہے کہ کسی عام بلکہ اچھے تعلیم یافتہ شخص کو بھی برنارڈ شا کا قلم کاغذ وغیرہ دے دینے سے یہ نہیں ہوسکتا کہ برنارڈ شا کے سے ڈرامے لکھ سکے۔

مشہور امریکی سائنس داں اور موجد ٹامس ایڈیسن کا ایک واقعہ سنئے۔ ایک بہت بڑے کارخانے میں کوئی خرابی واقع ہوگئی اور وہ چلنا بند ہوگیا۔ مالکوں نے بہترین انجینئروں کی خدمات حاصل کیں مگر وہ نہ نقص معلوم کرسکے اور نہ اسے دور کرکے کارخانہ چالو کرسکے۔ آخر مالکوں نے ایڈیسن سے درخواست کی۔ وہ پیشہ ور انجینئر نہ تھا مگر مالکوں کے اصرار پر رضامند ہوگیا۔ اس نے مشینوں وغیرہ کا بغور معائنہ کیا اور آخر خرابی دور کرکے کارخانہ چلانے میں کامیاب ہوگیا۔ مالک خوش ہوئے اور ایڈیسن سے بل مانگا۔ اس نے بل دیا تو نئے لگائے جانے والے پرزوں کی

بزرگ صحابی حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ جہاد کے سلسلے میں ۳۰ ھ میں آرمینیہ میں تھے۔ وہاں انہوں نے دو مسلمانوں کو قرآن مجید کی قرأت کے بارے میں باہم اختلاف ونزاع کرتے دیکھا۔ ہر ایک دوسرے کی قرأت کو غلط اور اپنی قرأت کو صحیح بتاتا تھا۔ ایک معروف حدیث کے مطابق قرآن مجید سبعہ احرف یعنی سات طریقوں یا تلفظوں میں نازل ہوا ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں عرب میں سات اہم قبائل قریش، ہذیل، ثقیف، ہوازن، کنانہ تمیم، یمن (معہ اہل مدینہ) کی زبان فصیح اور مستند سمجھی جاتی تھی لیکن بعض تلفظات میں مقامی اختلافات تھے۔ قریش مکہ کی زبان فصیح تریں تسلیم کی جاتی تھی تاہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں مختلف قبائل کے تلفظات اور لہجہ کے اختلاف کو روا رکھا تھا۔ لیکن عہد عثمانی میں غیر عرب اقوام کے داخل اسلام ہو کر قرآن پڑھنے سے قرأت کے تلفظ اور لہجہ میں مزید فرق پیدا ہونے لگا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اختلافِ قرأت کو خطرہ کی گھنٹی سمجھا اور انہیں خوف پیدا ہوا کہ کہیں مختلف علاقوں اور ملکوں میں قرآن کے متن ہی میں اختلاف پیدا نہ ہو جائے، انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو توجہ دلائی کہ اختلافِ قرأت کا جلد سے جلد سد باب کیا جائے اور تمام مسلمانوں کو ایک قرأت پر جمع اور متحد کیا جائے ورنہ عیسائیوں کی طرح مسلمان بھی کلام اللہ میں اختلاف پیدا کر دیں گے اور یہ اختلاف دین میں رخنہ اور مسلمانوں میں افتراق کا باعث بن جائے گا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا اور عہد صدیقی کا مدون شدہ مصحف منگوا کر اس کی نقلیں تیار کرنے کے لئے حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث رضی اللہ عنہ مخزومی پر مشتمل ایک بورڈ قائم کر دیا اور ہدایت کر دی کہ اگر "تمہیں کسی کلمہ میں اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان میں لکھا جائے کیونکہ قرآن قریش ہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔" چنانچہ اس متفقہ ومصدقہ مصحف کی متعدد نقلیں اسی نبوی رسم الخط میں تیار کی گئیں جس میں صحابہ نے اپنے قرآنی نسخوں کو عہد نبوی میں لکھا تھا اور جس

قیمت تو صرف تین چار ڈالر تھی اور خدمات کا معاوضہ دو ڈھائی لاکھ ڈالر۔ مالکان ششدر رہ گئے۔ پوچھنے پر ایڈیسن نے بتایا کہ دو ڈھائی لاکھ میرے خصوصی علم اور مہارت کا معاوضہ ہے۔ پرزوں کا نہیں۔ مطلب یہ کہ بعض لوگوں کے پاس خصوصی ذہانت، عقل، تجربہ اور مہارت ہوتی ہے انہیں عام لوگوں کے ساتھ مساوات کی بنیاد پر معاوضہ، تنخواہ، رزق وغیرہ نہیں دیا جائے گا۔ روس اور چین میں حکمرانوں کے علاوہ خصوصی ماہرین اور متخصصین کی تنخواہیں بھی عام کارکنوں سے کئی گنا زیادہ ہیں اور معاشی عدم مساوات رائج ہے۔ گھوڑے، گدھے ایک لاٹھی سے نہیں ہانکے جاتے۔ نہ زیادہ آمدنی والوں سے زائد از ضرورت مال لے کر خزانہ سرکار میں داخل کیا جاتا ہے نہ کم آمدنی والوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

جو لوگ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے معاملے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ انہیں اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا موقف بالکل درست تھا اور اسلامی نقطہ نظر کے عین مطابق۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا۔

اشتراکیت کا بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ یہ حال ہے کہ ع

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اور حکومت پاکستان نے زکوٰۃ، عشر جہیز، وغیرہ کے قانون بنائے ہیں۔ پیپلز ورکس پروگرام کی بھی بنا ڈالی ہے اور مزید فلاحی ورفاہی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ اگر ان پر صحیح اسلامی اسپرٹ کے ساتھ عمل کیا گیا تو معیشت پر سوشلزم کا ٹھپہ لگانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ مؤلف

کے مطابق مصحف صدیقی لکھا گیا تھا۔ تیار شدہ نسخے، اہم اسلامی مراکز بصرہ، کوفہ، شام، یمن، مصر اور بحرین روانہ کئے گئے۔ ایک نسخہ مدینہ میں رکھا گیا اور ایک نسخہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس رکھا کیونکہ انہیں حافظ قرآن ہونے کے باوجود ناظرہ تلاوت سے شغف تھا۔ شہادت کے وقت آپ اسی نسخہ سے تلاوت کر رہے تھے اور اسی پر آپ کے مقدس خون کے قطرے گرے۔ یہ نسخہ آج کل سوویت یونین کے شہر تاشقند (بقول بعض ماسکو) میں موجود ہے۔ اسلامی عہد میں تاشقند اسلامی علوم وفنون کا مرکز رہ چکا ہے۔

مصحف عثمان کے تین اور نسخے حجرہ نبوی (مدینہ منورہ) تحزانہ آثار بنویہ (استنبول) اور کتب خانہ مصریہ میں موجود ہیں۔

کلام اللہ کے جو ذاتی طور پر مرتب کردہ نسخے صحابہ کے پاس موجود تھے، تلف کروادیئے گئے۔ اس طرح جمیع امت مسلمہ کا اتفاق ایک قرآن، ایک قرأت پر ہو گیا جو گزشتہ چودہ سو سال سے بعینہ اسی طرح غیر متبدل اور غیر محرف چلا آتا ہے اور زمانہ حال میں کمپیوٹر کی مدد سے بھی بعض محققین نے اس کا محفوظ اور غیر محرف ہونا ثابت کر دیا ہے اور وہ جو خود قرآن نازل کرنے والے خدائے بزرگ وبرتر نے فرمایا کہ ''ہم نے اسے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''[1] چودہ صدیوں کے بعد بھی حرف بحرف صحیح ہے ہر قسم کے حذف واضافہ سے پاک۔ اس کی ترتیب وتدوین بھی وہی ہے جو جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سکھائی تھی۔ اس کی ترغیب وتدوین اور رسم الخط دونوں توقیفی ہیں۔ زمانہ حال میں دو مصری فاضل استاذ عبدالرزاق نوفل اور ڈاکٹر راشد خلیفہ نے الگ الگ طور پر قرآن کے اعداد وشماریات وغیرہ کے متعلق ایک نئے انداز سے تحقیق کی ہے خاص کر موخر الذکر نے کمپیوٹر کی مدد سے قرآن کے اندرونی دروبست کے متعلق حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں جن سے اس بات کی ناقابل تردید شہادت ملتی ہے کہ اگر قرآنی حروف، الفاظ، آیات، سورتوں میں کوئی کمی بیشی کی گئی ہوتی تو اس کے حروف والفاظ وآیات وسور کا باہمی اندرونی نظام بگڑ گیا ہوتا[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو عام طور پر جامع القرآن کہا جاتا ہے جو صحیح نہیں کیونکہ جمع قرآن کا کام تو عہد صدیقی ہی میں سرانجام پا چکا تھا اور ان کے مدونہ ومرتبہ مصحف کو ''امام'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی نشر واشاعت کا کارنامہ سرانجام دیا۔ یہ ایک عظیم خدمت تھی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسلام اور مسلمانوں کی سرانجام دی اور انہیں بنیادی تفرقہ اور اختلاف فی القرآن سے بچالیا۔ ان کے احسان سے دنیائے اسلام کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن بعض مفاد پرستوں اور بعض کم فہم مخلصوں نے بھی اسے ان کے خلاف ایک شکایت بنا لیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بعض صحابہ۔ جن میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے کے ذاتی

---

[1] انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون○ (۹:۱۵)

[2] دیکھئے استاذ نوفل کی تصانیف ''اسلام دین ودنیا'' اور عالم الجن والملائکہ۔ جناب محمد شریف نے ان کا مختصر اقتباسی حوالہ اپنے مضمون ''عددی اعجاز قرآن'' مطبوعہ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ جولائی ۱۹۸۰ء میں دیا ہے۔ نیز کتابچہ ''قرآن کریم کا ایک زندہ اعجاز مصنفہ جناب حسنات احمد کھٹانہ شائع کردہ صدیقی ٹرسٹ کراچی اور راشد خلیفہ کا انگریزی کتابچہ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معجزہ'' اور ''عدی اعجاز القرآن'' از محمد شفیع رانوی۔ مؤلف

مصاحف ان سے لے کر جلا دیئے تو انہیں ناگوار گزرا۔ بعد میں شر پسندوں نے اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک پروپیگنڈہ آئٹم بنا لیا۔ علامہ ابن جریر طبری اپنی تاریخ (جلد پنجم) میں لکھتے ہیں کہ سوید بن غفلہ جو اپنے قول کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنے کان، آنکھ، دل اور زبان سے زیادہ محبوب رکھتے تھے، مختار ثقفی کے خروج کے زمانے میں کوفہ آئے اور وہاں کے ہمدانیوں (شیعانِ علی رضی اللہ عنہ) سے دوران گفتگو انہوں نے منجملہ اور باتوں کے کہا کہ

"میں ہرگز تم سے کوئی ایسی بات بیان نہ کروں گا جسے خود میرے کانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نہ سنا ہو یا جسے میرے دل نے یاد نہ رکھا ہو۔ میں نے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو صحائف کا پھاڑنے والا مت کہو۔ خدا کی قسم انہوں نے جو کچھ کیا، ہم اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے سے کیا۔ اگر یہ کام میرے سپرد کیا گیا ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔"

ولیم میور نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کا حوالہ دیا ہے۔

"انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ "جس حفاظت سے قرآن ہم تک پہنچا ہے اس کی نظیر دنیا میں نہیں۔"[1]

اس تاریخی قرآن مجید کا عکس جس کی تلاوت کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے استنبول کے توپ کاپی عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

متفرق اقدامات و واقعات

مسجد حرام کی توسیع (۲۶ ہجری)

حاجیوں کی روز افزوں تعداد کے پیش نظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد حرام میں توسیع کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ ۲۶ھ میں کچھ ملحقہ مکان خرید کر مسجد حرام میں شامل کر کے اسے وسیع کر دیا۔ بعض مالکان مکانات نے احتجاج کیا لیکن توسیع ناگزیر ہو گئی تھی۔ مالکوں کو بہت مناسب معاوضہ ادا کیا گیا۔ بعد میں بھی مختلف ادوار میں مسجد حرام میں توسیع اور اس کی تعمیر نو کی گئی۔ ترکی دور میں توسیع اور تعمیر نو کی گئی۔ ترکی دور کی توسیع و تعمیر کے بعد تازہ ترین توسیع سعودی عرب کے شاہ فیصل مرحوم کے عہد میں کی گئی۔

مسجد نبوی میں توسیع (۲۹ ہجری)

مدینہ کی آبادی بڑھ جانے اور نمازیوں کی کثرت ہو جانے کی وجہ سے مسجد نبوی تنگ ہو گئی تھی، اس لئے ۲۹ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے متصلہ زمینیں، مکانات وغیرہ خرید کر مسجد کی توسیع کی اور اسے پختہ اور خوبصورت بنوایا۔ مسجد میں خوشبو جلانے کا بھی اہتمام کیا۔ مسجد حرام کی طرح مختلف ادوار میں مسجد نبوی میں بھی توسیع کی جاتی رہی۔ ترکی عہد کی توسیع کے بعد شاہ فیصل مرحوم نے اسے بہت وسیع کر دیا۔ حاجیوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ

[1] حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے حالات کے آخر میں ضمیمہ "قرآن غیر محرف اور غیر مبدل ہے" بھی ملاحظہ فرمائیے۔

سے مسجد نبوی کی توسیع کا کام شاہ فیصل کے بعد بھی سعودی حکومت نے جاری رکھا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد حرام اور مسجد نبوی کی توسیع کے اخراجات اپنے ذاتی مال سے ادا کیے۔

مدینہ کا حفاظتی بند

مدینہ اور مسجد نبوی کو خیبر کی طرف سے وقتاً فوقتاً آنے والے سیلابوں سے محفوظ رکھنے کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک حفاظتی بند بھی تعمیر کرایا جسے بندِ مہروز کہا جاتا تھا غالباً اس لئے کہ ایک ایرانی انجینئر مہروز نامی نے اسے تعمیر کیا تھا۔

قلعے اور چھاؤنیاں

حضرت عثمان نے مفتوحہ علاقوں کی حفاظت واستحکام اور بغاوتوں کی روک تھام کے لئے متعدد نئی چھاؤنیاں اور قلعے بھی تعمیر کرائے اور ان میں فوجی دستے تعینات کیے۔

کبوتر بازی کی ممانعت

عہد عثمانی میں مدینہ میں دولت کی فراوانی ہوئی تو لوگ خوش عیشی میں مبتلا ہو گئے اور طرح طرح کے تفریحی مشاغل ایجاد کر لئے۔ کبوتر بازی عام ہو گئی لوگ غلیل سے شکار کرنے لگے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے آٹھویں سال ایک آدمی کو مقرر کیا جو کبوتروں کو پکڑ کر ان کے پر قینچ کر دیتا اور لوگوں کی غلیلیں توڑ ڈالتا تھا۔ بہر حال ان تفریحی مشاغل کا رواج آنے والے زمانے کی ہوا کا رخ بتا رہا تھا۔

دیگر رفاہی اقدامات وتعمیرات

توسیع مملکت کے ساتھ انتظامیہ میں بھی توسیع ہوئی۔ مختلف دفاتر قائم کیے گئے اور ان کے لئے تمام صوبوں میں عمارتیں بنوائی گئیں۔ عوام کی سہولت اور آرام کے لئے سڑکیں، پل، مسجدیں، مہمان خانے تعمیر کیے گئے۔ مسجدوں کے لئے تنخواہ دار مؤذن مقرر کیے گئے۔ کوفہ میں ایک عظیم الشان مہمان خانہ بنوایا۔ مدینہ کے راستے میں جگہ جگہ چوکیاں، سرائیں اور کنوئیں تعمیر کرائے گئے۔ نجد کی راہ میں مدینہ سے چوبیس میل کے فاصلے پر ایک بہت عمدہ اور وسیع سرائے تعمیر کرائی گئی۔ اس کے ساتھ ایک مختصر سا بازار بھی قائم کیا گیا تاکہ مسافر اپنی ضرورت کی اشیاء وہاں سے حاصل کر سکیں نیز وہاں میٹھے پانی کا ایک کنواں بھی تعمیر کرایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عوام کی ضروریات کے لئے متعدد دوسرے کنوئیں۔ بیرِ سائب، بیرِ عامر بیرِ اریس وغیرہ بھی تعمیر کرائے۔

خاتم نبوت کی گمشدگی

آخر الذکر کنواں (بیرِ اریس) مشہور سیاح محمد ابن جبر اندلسی کے مطابق مسجد نبوی کے قبلہ کی طرف حضرت

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکانات کے سامنے واقع تھا[1] اس کی تعمیر نو اور کھدائی کے دوران میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ساتویں سال (۳۰ھ) ان کی انگلی سے خاتم نبوت اس میں گر گئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ انگشتری مبارک جس پر محمد رسول اللہ کندہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خط و کتابت پر مہر ثابت کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد یہ انگشتری یکے بعد دیگرے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رہی اور وہ اسے مہر خلافت کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئی۔ آپ کی انگلی سے پراسرار طریقے سے کنوئیں میں ایسی گری کہ ہر ممکن تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔ کنوئیں کا پانی، کیچڑ، ریت۔ وغیرہ نکلوائی گئی اور اس کی تہ بھی چھان ماری گئی مگر انگشتری نہ ملنا تھی نہ ملی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سخت رنج ہوا۔ لوگوں نے اسے خلیفہ کے حق میں بدشگونی خیال کیا۔ طبری کے بیان کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دوبارہ بالکل ویسی ہی انگوٹھی تیار کرائی۔ آپ کی شہادت کے وقت وہ بھی جاتی رہی۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش کے اسباب

اس بات پر سبھی مورخین متفق ہیں کہ خلافت عثمانی کے ابتدائی چھ سال نہایت کامیاب تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس طرح کام کیا کہ لوگوں نے ان کی کوئی بات ناپسند نہ کی اور وہ عوام وخواص میں ہر دلعزیز رہے۔ انہوں نے عوام کی بہبود کے لئے بہت کام کئے اور ان کے لشکروں نے مشرق ومغرب میں فتوحات کثیر حاصل کیں۔ جو عہد فاروقی کی فتوحات سے کم اہم نہیں تھیں۔ مملکت اسلامیہ کی حدود چین و ہندوستان اور بحیرہ خزر سے شمالی افریقہ میں ساحل اوقیانوس تک پہنچ گئیں۔ وسیع وعظیم وقدیم ایرانی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ مشرق میں ترکستان، خراسان، کاکیشیا، افغانستان، کرمان، مکران بھی سرنگوں ہوگئے۔ مغرب میں بازنطینی سلطنت کے متعدد اہم اور زرخیز صوبے شام، فلسطین، اردن، مصر، لیبیا، برقہ، مراکش اور شمال میں آذربائی جان اور آرمینیہ اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ دنیا میں کوئی ایسی سلطنت وحکومت نہ رہی جو اسلامی سلطنت سے برابری کا دعویٰ کرسکے۔ فتح وکامرانی، دولت واقبال مندی نے ہر جگہ مسلمانوں کے قدم چومے۔ ہر طرف امن، خوشحالی، اتحاد واخوت کا دور دورہ ہوا۔ عمدہ نظم و نسق، غنائم، محاصل، جزیہ اور خراج کی فراوانی، وظائف کی کثرت اور زراعت وتجارت کی ترقی سے فارغ البالی اور عیش وتنعم کے سامان پیدا ہوگئے۔ خلیفہ کا وجود مسلمانوں کے لئے ایک سن رسیدہ شفیق باپ کی مانند تھا۔ جو ہر حال

---

[1] ابن بطوطہ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ لیکن جناب اقبال احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون (کامل الحیاء والایمان سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ) مطبوعہ ہفت روزہ اخبار جہاں ۱۷-۲۳ ستمبر ۱۹۸۴ء میں لکھا ہے کہ یہ کنواں مسجد قبا کے مغرب میں واقع ہے۔ اس میں چٹانوں سے گر کر پانی آتا ہے نہایت ٹھنڈا اور میٹھا۔ اس کنوئیں کو بیئر حاتم بھی کہتے ہیں شائد انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ وہ کنواں ہے جس کا پانی پہلے کھاری تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب دہن اس میں ڈالا جس کی برکت سے پانی میٹھا ہوگیا۔ اگر چٹانوں سے گر کر پانی آتا ہوتا تو کیفیت مختلف ہوتی۔ مولف

[2] تاریخ الخلفاء کے مصنف سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مہر خلافت پر آمنت بالذی خلق فسوی کندہ تھا۔ مولف

میں ان کا خیر خواہ تھا۔ پھر جیسے مثالی صورت حال کو نظر لگنے لگی، کلائمکس کے بعد اینٹی کلائمکس کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ کوفہ، بصرہ، مصر اور دوسری نو آبادیوں میں بس جانے والے بدوی قبائل میں نسبی، لسانی اور علاقائی تفرقات و تعصّبات نے سر اٹھانا شروع کیا اور ایک نئی اشرافی عصبیت نمودار ہونے لگی۔ جسے دراصل قبل اسلام کی جاہلی عصبیت کا احیا کہنا چاہئے۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے اس سے یہ کہہ کر منع فرمایا تھا کہ ''جو شخص عصبیت کو ابھارتا، عصبیت کی طرف بلاتا، عصبیت کو ابھارنے میں مدد کرتا ہے اور اسی مقصد کے لئے لڑتا اور مارا جاتا ہے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔'' بعض بزرگ صحابہ بھی ان نو آبادیوں میں جا کر آباد ہو گئے اور مختلف گروہوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ دوسرے عرب قبائل اور مفتوحہ اقوام کے لوگوں کی سوچوں کو اس سے نئی نئی راہیں ملیں۔ خلیفہ نے مفتوحہ ممالک میں زمینوں، جائیدادوں کے تبادلے اور خریداری کی اجازت بھی دے دی۔ اہل حجاز خاص کر اکابر صحابہ قریش مفتوحہ ممالک میں جائیدادوں اور زمینوں کے مالک بن گئے۔ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی زمینیں خریدیں۔[1] اس سے قبائلی عصبیت اور رشک و حسد کو ہوا ملی۔

یہ بات ان قبائل کو ناگوار گزری جو عرب میں زمینوں جائیدادوں کے مالک نہ تھے جن کے بدلے میں وہ کوفہ، بصرہ، فسطاط وغیرہ میں زمینیں لے سکتے۔ عرب میں وہ خانہ بدوشانہ زندگی گزارتے رہے تھے لیکن فتوحات میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے نو آباد شہروں میں بسائے گئے تھے۔ اس طرح حجاز سے آنے والے حضارت کے عادی قریش (اور انصار) کے خلاف ایک عام تعصب پیدا ہو گیا جسے قریش کی شاخ بنو امیہ کے افراد کی امارتوں پر تقرری سے مزید تقویت ملی بلکہ یہ تقرریاں ہی بالآخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سب سے بڑا الزام اور شورش کا سبب بن گئیں۔ قبائلی رقابتوں کے علاوہ بزرگ صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اکتنازِ دولت اور عشرت پسندی کے خلاف انتہا پسندانہ تبلیغ شروع کر دی اور عامۃ الناس اس سے متاثر ہونے لگے۔ اس سے بالواسطہ طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اپنی دولت مندی، مالی اور انتظامی پالیسی کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے احکام شریعت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا لیکن غیر مطمئن اور سازشی عناصر نے ایک خفیہ محاذ قائم کر لیا۔ کھلے اور چھپے دشمنوں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں اور بعض نادان دوستوں کی غلط کارروائیاں، باہمی رقابتیں، جاہ و مناصب کی ہوس، نئی نسل اور غیر عرب نو مسلموں موالیوں کی دینی و اخلاقی کمزوریاں اور قدیم قومی و نسلی عصبیتیں ایک فتنہ عظیم کا باعث بن گئیں۔ اور عالم اسلام کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے اجتماعی داخلی المیہ پر منتج ہوئیں۔ نظامِ خلافت درہم برہم اور مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ فتنہ و فساد کی ایک ایسی آگ بھڑک اٹھی جس کے شعلے عمر رسیدہ، نیک نہاد اور پارسا خلیفہ راشد کے خون سے بھی نہ بجھ سکے۔ مصری مؤرخ، عمر ابوالنصر نے لکھا ہے کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف قوم کو جرأت اسی لئے ہوئی کہ آپ میں حد درجہ نرمی تھی۔ نیز بڑھاپے کی کمزوری اور بعض ایسی باتوں نے جن کو آپ سے پہلے خلفا نہیں کیا کرتے تھے

[1] تاریخ اسلام۔ از شاہ معین الدین احمد ندوی

جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔[1] فتنہ وانتشار کا یہ عمل خاصا پیچیدہ تھا۔ جو عرب مزاج کی بجائے یہودی مزاج کا خاصا تھا۔ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا اور پھر اچانک عظیم زلزلے کی طرح پھٹ پڑا لیکن یہ ایک ایسا زلزلہ تھا جس کی نہ صرف پیش گوئی کی جاسکتی تھی بلکہ اس سے بچنے کے اقدامات بھی کئے جاسکتے تھے۔ اس بھس میں اپنی چنگاری...... عظیم و خبیث چنگاری...... ڈال کر عبداللہ ابن سبا یہودی نے بی جمالو کا روایتی یہودی کردار ادا کیا۔ اس نے حالات سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی کوششوں سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جس یہودی اور عجمی سازش کا آغاز ہوا اس نے نہ صرف مسلمانوں کے اتحاد و جمعیت کو ختم کر کے فرقہ بندی اور خانہ جنگی کا آغاز کیا بلکہ اسلامی فتوحات کا آگے بڑھتا ہوا سٹیم رولر بھی رک گیا۔ اس کی وجہ سے ہم قلب اسلام میں اسرائیل کا خنجر بھی پیوست دیکھتے ہیں بلکہ اب یہودیوں نے اسرائیل کے ناپاک منصوبے میں شام، فلسطین، لبنان، اردن، مصر، عراق اور شمالی عرب (مدینہ منورہ تک) کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اسلام دشمن قوتیں امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اس کی پشت پر ہیں۔ اسلامی ممالک میں اتحاد و یک جہتی کی کوئی چیز نہیں بلکہ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کے لئے وہ سپر پاورز کے خیمہ بردار بنے ہوئے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اصل منصوبہ ابن سبا یہودی کا تھا۔ اس کے خاکہ میں اس نے بڑی چالاکی اور مکاری سے مختلف رنگ بھرے۔ یہ منصوبہ خود اسلام کے خلاف تھا۔ فراعنۂ مصر کے زمانے میں اہرام مصر اور دوسری عمارتوں، منصوبوں کی تعمیر کے لئے یہودیوں سے بیگار کا کام لیا گیا تھا۔ اور ان پر سختیاں کی گئی تھیں۔ ان بیگاری یہودیوں نے فراعنہ کے خلاف ایک خفیہ تنظیم قائم کی تھی جو فری میسنز (Free Masons) کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر جہاں جہاں بھی یہودی گئے اس خفیہ تنظیم کو اپنے ساتھ لیتے گئے اور غیر یہودی اہل اقتدار کے خلاف استعمال کرتے رہے اور سازشوں کے تانے بانے بنتے رہے۔ جدید دور میں انہوں نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے متمول اور بارسوخ غیر یہودیوں کو بھی اس کے رکن بنایا اور اسے بین الاقوامی خفیہ تنظیم بنا دیا۔ کچھ سال پہلے تک پاکستان میں بھی اس کی شاخیں تھیں اور بظاہر اسے ایک فلاحی اور اصلاحی تنظیم ظاہر کیا جاتا تھا اور ارکان ایک دوسرے کی مدد کرتے جب کہ اصل مقصد دنیا کے مختلف ممالک کے راز معلوم کرنا اور وہاں یہودی اثر و رسوخ اور غلبہ پیدا کرنا تھا۔ غیر یہودی ارکان پر یہ راز افشا نہیں کیا جاتا تھا۔ عبداللہ ابن سبا نے یہودیوں کی اس قدیم فری میسن تحریک کو ماڈل کے طور پر سامنے رکھا اور اسلام اور مسلمانوں کی تخریب کے لئے ناواقف، سادہ لوح اور بعض شاکی اور احساسِ محرومی میں مبتلا مسلمانوں ہی کو اپنا آلہ کار بنایا اور انہیں مزید متاثر کرنے کے لئے اس کا ایک مذہبی شاخسانہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کی حمایت اور نئے عقائد کی ایجاد کا بھی پیدا کر لیا۔ ابن سبا اور اس کی خفیہ تحریک میں شامل ہونے والوں کا کوئی خاص اصلاحی مقصد نہ تھا۔ ان میں سے متعدد ایسے تھے جن کو حضرت

[1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مصنفہ عمر ابو النصر، اردو ترجمہ از محمد احمد پانی پتی، مصنف کا یہ کہنا درست نہیں کہ قوم حضرت عثمان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ باغیوں کی تعداد دو ہزار سے زائد نہ تھی اور نہ وہ اپنے اپنے صوبوں کے نمائندہ تھے۔ تاہم بے اطمینانی کی ایک ہلکی سی لہر موجود تھی۔ ابن سبا کے خفیہ پراپیگنڈہ اور بزرگ صحابہ کی طرف سے بنائے گئے جعلی خطوط نے اس کو تقویت پہنچائی۔ مؤلف

عثمان رضی اللہ عنہ سے ذاتی شکایات تھیں اور وہ اپنے اندر انتقامی جذبہ رکھتے تھے۔ مثلاً سودان بن حمران نے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حملہ کر کے انہیں ضربیں لگائیں تو کہا کہ اس (عثمان رضی اللہ عنہ) نے میرے باپ کو جیل میں قید کیا تھا اور وہ وہیں مر گیا۔ میں اس کا انتقام لے رہا ہوں۔ ان سازشیوں، باغیوں کے کردار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تقویٰ، اخلاص، دینداری اور حب اسلام سے محروم تھے۔ انہیں بزرگ صحابہ سے بھی کوئی عقیدت نہ تھی۔ نہ ان کا احترام ان کے دلوں میں تھا نہ وہ ان کے عزل اور توہین کی بنا پر ان کی حمایت میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان شرپسندوں کے اجتماعی سے زیادہ ذاتی مقاصد تھے، جب کہ ان کا سرغنہ ابن سبا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دوررس اور خطرناک مقاصد رکھتا تھا جن سے اس کے اکثر سازشی ساتھی بھی کماحقہ آگاہ نہ تھے۔

عہد عثمانی کے اواخر میں قبائلی صورتِ حال کچھ اس طرح تھی۔

بدوی قبائل

ابن سبا کی تحریک کے لئے پہلے سے کچھ پس منظر تیار تھا۔ جسے وہ پیش نظر میں لے آیا۔ عالم اسلام میں جو ہلکی ہلکی زیر سطح لہریں نسلی، قبائلی، علاقائی اور لسانی امتیازات و تعصّبات کی اٹھ رہی تھیں اور معاشی اور معاشرتی سوالات بھی جنم لے رہے تھے۔ ابن سبا نے انہیں اپنی تیز نگاہی سے بھانپ لیا اور ان مختلف امور کو اس نے اپنی تحریک میں مدغم کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک مجموعی فہرست الزامات تیار کر لی۔ درآنحالیکہ اس کا اپنا مقصد خاص اسلام کی بنیادوں توحید، نبوت، خلافت اور صحابیت پر ضربِ کاری لگانا اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار و افتراق پیدا کرنا تھا۔ اس نے بدوی قبائل کی بے اطمینانی، بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت، انصار کے غم و غصہ، صحابہ کی نئی نسل کے جواں عزائم اور عجمی عناصر کے احساسِ محرومی و کمتری کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ بدوی قبائل کو قریش خاص کر بنو امیہ کا حکومت کے مناصب پر قبضہ کھلتا تھا۔ اموال، وظائف اور مناصب کی تقسیم میں وہ برابری کے خواہاں تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اکثر ممالک ان کی تلواروں اور نیزوں کے بل پر فتح ہوئے ہیں۔ لیکن فتوحات کے ثمرات زیادہ تر بنو امیہ اور پھر دوسرے مہاجرین و انصار کی جھولیوں میں جا رہے ہیں۔ مالک اشتر نخعی، ابن الکواء، عمیر ضابی، صعصعہ وغیرہ نے سب سے پہلے کوفہ میں اسی بنیاد پر گورنر ولید بن عقبہ اور سعید بن العاص کے خلاف شورش برپا کی۔ وہ اپنی محرومیوں کا ذمہ دار حضرت عثمان اور ان کے اموی گورنروں کو سمجھتے تھے اور اپنی محرومیوں کا مداوا چاہتے تھے۔ ابن سبا نے انہیں مزید بھڑکایا اور اپنا آلہ کار بنایا۔ کوفہ میں اشتر نخعی ان کا سرغنہ تھا جس نے آگے چل کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ اور ان کی شہادت اور پھر جنگ جمل اور جنگ صفین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کوفہ کی طرح بصرہ بھی عراق میں نئی اور اہم چھاؤنی تھا جہاں زیادہ تر بدوی عرب قبائل، عجمی موالی اور عجمی ذمی اور غلام آباد تھے۔ قریش اور انصار بہت کم تھے۔ بصرہ میں ایک شورہ پشت چور حکیم بن جبلہ تھا۔ ابن سبا نے اپنی چرب زبانی سے اسے متاثر کیا اور اپنے گروہ کا سرغنہ بنایا۔ مالک اشتر کی طرح وہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ اور ان کی شہادت اور پھر جنگ جمل میں پیش پیش رہا۔ اس طرح کوفہ اور بصرہ میں ابن سبا کے خفیہ گروہ منظم ہو گئے۔

بعدازاں اس نے دور افتادہ فسطاط میں بیٹھ کر وہاں کے یہودی، عیسائی اور موالی عناصر کو اپنے ساتھ ملایا اور اس طرح مشرقی علاقوں خراسان وغیرہ اور شام کو چھوڑ کر مصر اور عراق میں سبائی گروہ منظم ہوگیا۔

قریش......بنو ہاشم

قریش کی جو نئی نسل عہد عثمانی میں پروان چڑھی اس میں قبائلی اور خاندانی تفوق وتفاخر اور دوسروں سے برتر ہونے کا احساس بہت زیادہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو حکومتی مناصب کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتی تھی جب کہ بدوی قبائل قریش سے مناصب اور اموال کی تقسیم میں مساوات چاہتے تھے۔ قریش کی نئی نسل کے نوجوان مثلاً محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور محمد بن ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ وغیرہ بھی عہدے نہ ملنے کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے خفا تھے۔ نیز صحابہ کی نئی نسل کی ایک خاصی تعداد عجمی لونڈیوں کے بطن سے تھی جو عجمی غلاموں کے زیر اثر پل کر جوان ہوئی اور اکثر عجمیوں کے دلوں میں خواہ وہ نو مسلم موالی ہوں یا غیر مسلم غلام، ایرانی سلطنت کو ختم کرنے کی وجہ سے حضرت عثمان کے خلاف عناد اور انتقام کا جذبہ تھا۔ انہوں نے غیر محسوس طور پر صحابہ کی نئی نسل کو بھی متاثر کیا اور محرومی کا بھی احساس دلایا۔ ابن سبا نے ان کو بھی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ اکثر نو مسلم عجمی عرب قبائل کے موالی بن کر رہتے تھے۔ ان قبائل نے موالیوں کا ساتھ دیا۔

بنو ہاشم اپنے آپ کو سب سے زیادہ خلافت اور حکومتی مناصب کا حقدار سمجھتے تھے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں زمانہ جاہلیت میں قریش کی سیادت کے لئے رقابت اور مسابقت چلی آتی تھی جسے اسلام نے آکر دبا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں مقابلہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ منتخب ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی بیعت کر لی لیکن بنو ہاشم کے بعض دوسرے افراد مطمئن نہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کے وقت کچھ تو تو، میں میں بھی ہوئی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کاروبار خلافت میں بنو امیہ پر کلی انحصار کر لیا اور دوسرے قریش خاص کر بنو ہاشم کو نظر انداز کر دیا۔ اس سے احساسِ محرومی اور غم وغصہ ابھرا اور بنو امیہ اور بنو ہاشم کی جاہلی رقابت پھر ابھر آئی۔ خلیفہ کے گرد بنو امیہ نے گھیرا ڈال لیا اور معترضین کے مقابلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کا دفاع کرتے رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخلصانہ مشوروں پر عمل نہ کیا گیا۔ عہد عثمانی کے آخری چند سالوں میں سیاسی اور معاشی حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ ایک طرف تو قریش اور دوسرے عرب قبائل کے درمیان برتری اور اموال ومناصب کے لئے رسہ کشی شروع ہوگئی دوسرے خود بنو امیہ اور بنو ہاشم کے مابین عہد جاہلیت کی رقابت اور کشمکش جاگ اٹھی۔ تیسرے عام قریشی اور انصاری نوجوان بھی عہدوں کی طلب میں تلملا تے لگے۔ اگر بنو امیہ اور بنو ہاشم متحد رہتے تو بدوی قبائل کے غیر مطمئن عناصر کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ نہ ابن سبا اور عجمی گروہ کی سازشیں زور پکڑتیں۔ دوسرے قبائل کے مقابلے میں قریش کی طاقت کمزور پڑ گئی اور تعداد بھی کم ہو گئی۔ بنو امیہ کے اقتدار کا توڑ کرنے کے لئے بدوی قبائل، عجمی موالیوں اور غلاموں اور یہودیوں، عیسائیوں نے بنو ہاشم کو بڑھاوے دینے شروع کئے۔ اس پیچیدہ صورتِ حال میں ابن سبا نے اہل بیت اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ

کے نام پر عجیب وغریب نظریات وعقائد گھڑے جن کی بنیادیں یہودی، عیسائی اور مجوسی عقائد پر تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ انہیں مرکزی نقطہ بنا کر وہ مختلف عناصر کو اپنی تحریک میں جمع کر لے گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف مخالفت ابھارنے میں ان کے عم زاد اور داماد مروان بن الحکم نے ''بدروح'' (Evilgenius) کا کردار ادا کیا۔ غرضیکہ ایک رقابتی تکون پیدا ہوگئی تھی۔ جس کا زاویہ اس بنوامیہ تھے اور دوسرے ضلعی زاویئے بنو ہاشم اور بدوی قبائل۔ انصار میں سے بھی بعض لوگوں کو۔ خاص کر قبیلہ خزرج کے ان افراد کو بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اپنے سردار قبیلہ حضرت سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ شاید یہ خیال آتا ہوگا کہ مدینے کا اکثریتی گروہ ہونے کی وجہ سے خلافت ان کا حق تھا جو مہاجرین نے ان سے چھین لیا۔ اور پھر یہ کہ قریش اور انصار کے قدیم الایمان بزرگ صحابہ کی تعداد کم رہ گئی۔ اکثر بڑھاپے کی وجہ سے خانہ نشین ہوگئے اور امورِ خلافت میں حصہ لینا تقریباً چھوڑ دیا۔ خاص کر جب کہ عہد عثمانی میں مجلس شوریٰ تقریباً معطل ہو کر رہ گئی۔ ان کی نئی نسل میں اپنے بڑوں کا سا تقویٰ اور اخلاص نہ تھا بلکہ عہدوں کی ہوس تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ وہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد بڑھاپے میں خلیفہ ہوئے۔ اس جانشینی نے انہیں تھکا دیا۔ وہ اپنے پیشرووں کے کڑے معیار کو کما حقہ برقرار نہ رکھ سکے۔ وہ غیر جانبداری اور عمال کی کڑی نگرانی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شعار تھی پوری طرح قائم نہ رہ سکی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگران آنکھیں اپنے عمال کی طرف لگی رہتی تھیں۔ بڑے سے بڑا عامل جواب طلبی اور محاسبے سے خائف اور ان کے درہ سے لرزہ براندام رہتا تھا۔ انہوں نے عرب جیسی غیر منظم، شتر بے مہار اور آزادی کی دلدادہ قوم کو نظم وضبط اور احکام وشعار کا پابند بنا دیا تھا۔ انہوں نے اور ان سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے قبیلہ کے کسی شخص کو کوئی ذمہ دار عہدہ نہیں دیا تھا لیکن بدقسمتی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قبیلہ بنوامیہ ان پر غالب آ گیا اور حکومت کے نظم ونسق پر چھا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ لوگوں کے اعتراضات کا ہدف بن گئے وہ فطرتاً نرم خو، بردبار، رحم دل اور ذی مروت تھے۔ اور عمال کی انتظامی خرابیوں اور کوتاہیوں کا محاسبہ اور اصلاح اس سختی سے نہ کر سکے جو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا طرۂ امتیاز تھی۔ بعض عمال خلیفہ کے نام پر من مانی بھی کر گزرتے تھے اور انہیں توقع ہوتی تھی کہ خلیفہ درگزر فرمائیں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ابتدائی بے اطمینانی کے محرک اور ان کے عم زاد اور داماد مروان بن الحکم کا مختصر ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم عبداللہ ابن سبا کے کردار پر روشنی ڈالیں گے۔

مروان بن الحکم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہرت کو نقصان پہنچانے اور آپ کا امیج بگاڑنے میں مروان بن الحکم کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ اس کا باپ حکم فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا اور مدینہ میں مقیم ہوگیا۔ اس کی بعض ناسزا حرکات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طائف جلاوطن کر دیا تھا۔ مروان بھی اس کے ساتھ رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو باپ بیٹے کو مدینہ بلا لیا۔ لوگوں نے اعتراض کیا تو آپ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت اجازت

لے لی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر اجازت ملی ہوتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم کو مدینہ کیوں نہ آنے دیا۔ پھر آپ نے اپنی صاحب زادی کا مروان سے عقد کر دیا اور مروان کو اپنا خصوصی کاتب یا سیکرٹری بنالیا۔ لوگوں کو حکم کی واپسی اور مروان کا تقرر پسند نہ آیا۔ محمد ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں کہ ''لوگ حضرت عثمان سے اس لئے خفا اور آزردہ تھے کہ مروان ان کا مقرب تھا اور وہ اس کی باتوں پر کان دھرتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بہت سے کام جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں ان کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کبھی حکم نہیں دیا بلکہ مروان ان سے پوچھے بغیر کر ڈالتا ہے۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بنو امیہ سے صلہ رحمی کے لئے اپنے سارے دروازے کھول رکھے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ ''اگر جنت کی کنجیاں مجھے دے دی جائیں تو میں سارے بنی امیہ کو اس میں داخل کر دوں۔'' مروان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر صحابہ کے باہمی تعلقات کو خراب کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ نائلہ بھی یہی رائے رکھتی تھیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی بڑی ذمہ داری مروان پر عائد ہوتی ہے۔

ایک دفعہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ''اگر آپ مروان کے کہے پر چلیں گے تو وہ آپ کو قتل کرا کے چھوڑے گا۔ اس کے اندر نہ تو اللہ کی قدر ہے نہ ہیبت نہ محبت۔''

مروان ہی نے یہ احساس عام کیا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا مطلب بنو امیہ کی سیادت و سلطنت ہے۔ اب نظم و نسق کی صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ صوبائی گورنر سارے کے سارے بنو امیہ میں سے تھے۔ اور خلیفہ کے مرکزی دفتر کا انچارج بھی ایک اموی یعنی مروان تھا۔ بنو امیہ کی یہ اجارہ داری دوسروں کو کھلنے لگی تھی۔ ممکن ہے وقت کے حالات یا صلہ رحمی کے تقاضوں کے تحت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا ہو۔ ان کی نیت پر کسی قسم کا شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ اموی عمال کے خلاف شکایتوں کی انہوں نے تحقیقات کرائی اور تادیبی کارروائی بھی کی، حدود بھی جاری کیں اور لوگوں کے مطالبے پر بعض عمال کو برطرف بھی کیا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کاروبارِ حکومت چلانے کے لئے مروان اور دوسرے بنو امیہ پر کلی انحصار کر لیا۔ بنو ہاشم اور دوسرے قریش کو نظر انداز کر دیا۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی پرانی رقابت و چشمک پھر سے ابھر آئی۔ تاہم حضرت علی نے بنو ہاشم کو کھلی مخالفت سے باز رکھا اور خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اصلاحِ حال کے لئے مخلصانہ مشورے دیتے رہے۔ دوسرے قبیلوں کو بھی مروان اور اموی عمال کی اجارہ داری ناگوار گزرتی تھی۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو سن شریف ستر سال تھا۔ جب فتنوں نے سر اٹھانا شروع کیا تو آپ چھہتر سال کے ہو چکے تھے۔ طبعی نرم مزاجی اور صلہ رحمی کے ساتھ کہولت بھی جمع ہو گئی۔ نظم و نسق پر گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ جب فتنوں نے زور پکڑا تو آپ کی عمر اسی سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اس عمر کو پہنچ کر انتہائی مضبوط دل و دماغ اور سخت فطرت کے لوگ بھی نرم پڑ جاتے ہیں۔ بنو امیہ نے آپ کی حلیم الطبعی، صلہ رحمی اور عمر رسیدگی سے فائدہ اٹھایا۔ دوسرے قبائل میں رشک و رقابت پیدا ہوئی۔ ابن سبا نے غیر مطمئن عناصر کو شورش کا آلۂ کار بنایا۔ ایران کے نو مسلموں اور ذمیوں کے دلوں میں بھی جذبۂ انتقام موجود تھا۔ انہوں نے زیر زمین سازشوں کا جال بچھانا

شروع کیا۔ اس میں ایرانی یہودی اور مجوسی پیش پیش تھے۔ وہ اسلامی اقتدار کا خاتمہ چاہتے تھے۔ یا اس کا ایسے ہاتھوں میں جانا پسند کرتے تھے جو عربوں کے مقابلے میں انہیں ترجیح دے یا کم سے کم سیاسی لحاظ سے مساوی سلوک کرے۔ لہٰذا عرب قبائل کے غیر مطمئن اور شورہ پشت عناصر کی طرح یہ بھی ابن سبا کی سازش میں شامل ہو گئے۔ دور جدید کا ایک ایرانی مؤرخ کاظم زادہ اپنی تصنیف ''تجلیاتِ روح ایران درادوارِ تاریخی'' میں صاف صاف لکھتا ہے۔ (ترجمہ)

''جس دن سے سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوئم کی جانب سے ایران فتح کیا اور اس پر غلبہ پایا، ایرانی اپنے دل میں کینہ وانتقام کا جذبہ پالتے رہے۔ کینہ وانتقام کا یہ جذبہ متعدد مواقع پر ظاہر ہوتا رہا۔ تا آنکہ فرقہ شیعہ کی بنیاد پڑ جانے سے یہ کلیتہً بے نقاب ہو گیا۔ ارباب علم واطلاع اس حقیقت کو بخوبی جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ شیعیت کی بنیاد وظہور میں اعتقادی مسائل اور نظری اختلافات کے علاوہ ایک اور مسئلہ کو بھی دخل تھا۔ ایرانی اس بات کو کبھی نہ بھول سکتے تھے کہ مٹھی بھر ننگے پاؤں پھرنے والے بادیہ نشین عربوں نے ان کی مملکت پر قبضہ کر لیا۔ اس قدیم مملکت کے خزانوں کو لوٹ کر غارت کر دیا اور ہزاروں بے گناہ انسانوں کو قتل کر ڈالا''

آگے چل کر یہی مصنف مزید لکھتا ہے:

''ہمارے دانش مند بزرگوں کو نہ تو بنو فاطمہ سے عشق تھا اور نہ ہی خاندانِ بنو امیہ سے دشمنی۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح عرب حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے اور اپنی عظمت وحکومت بحال ہو جائے۔ چونکہ ہاشمی خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ختم ہو گئی اور اموی خالص عرب حکومت دنیائے اسلام کی مرکزی حکومت تسلیم کر لی گئی اور اس طرح عرب عجم پر بری طرح مسلط ہو گیا لہٰذا ہمارے لئے واحد چارۂ کار یہی تھا کہ ہم ہاشمیوں کا ساتھ دے کر ان کو ابھارتے۔ ہمارے بزرگوں نے ایسا ہی کیا۔'' [۲]

ایک ایرانی شاعر رضائے کردنے ساسانی شہنشاہیت ختم کرنے کے ''جرم'' میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خلاف یوں غم وغصہ کا اظہار کیا ہے۔

بشکست عمر رضی اللہ عنہ پشتِ ہزبرانِ عجم را
بربادِ فنا داد رگ و ریشۂ جم را
این عربدہ بر غصبِ خلافت ز علی رضی اللہ عنہ نیست
با آل عمر رضی اللہ عنہ کینہ قدیم است عجم را

---

[۱] خلافت وملوکیت صفحہ ۱۴۴۔ از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ چودھویں اشاعت۔ نیز تاریخ طبری جلد ۳۔ (خلافت راشدہ حصہ دوم صفحہ ۴۳۷۔) اردو ترجمہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی

[۲] بحوالہ ''شاہکار رسالت'' از غلام احمد پرویز صفحہ ۴۷۲

ترجمہ: عمر رضی اللہ عنہ نے ایرانی بہادروں کی کمر توڑ دی اور ایرانی شہنشاہیت کو ختم کر دیا۔ یہ قضیہ علی رضی اللہ عنہ سے خلافت غصب کرنے کا نہیں بلکہ ایران کو آل عمر رضی اللہ عنہ سے پرانی عداوت ہے۔

مشہور دانشور، عالم مصنف اور مفسر قرآن جرمن نومسلم علامہ محمد اسد نے تو اپنی سوانح عمری شاہراہ مکہ (روڈ ٹو مکہ) میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ایران میں ماہ محرم کا ماتم دراصل ایرانی شہنشاہیت کے خاتمے کا ماتم ہے۔ غرضیکہ مختلف اغراض ومقاصد کے تحت مختلف گروہوں نے سازشیں شروع کر دیں اور پھر عبداللہ ابن سبا کی قیادت میں متحد ہو گئے اور اموی عمال سے گزر کر خود خلیفہ کو متہم اور بدنام کرنے لگے۔ دارالخلافہ مدینہ بھی سازشوں کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہاں عجمی غلاموں اور نومسلموں کی خاصی تعداد تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی یہ ایک عجمی سازش تھی جس میں بدو عرب قبائل کے شورہ پشت اور غیر مطمئن عناصر نیز نئی پود کے جاہ طلب قریشی نوجوان بھی شامل ہو گئے۔ کوفہ، بصرہ میں بھی زط (جاٹ) سیابچہ، نومسلم ایرانی اور غلام بھی بکثرت تھے جو اس خفیہ تحریک میں انتقاماً شامل ہو گئے۔ مصر تو ابن سبا کا مرکز تھا ہی۔ خود عشرہ مبشرہ کے باقی ماندہ صحابہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بعض کارروائیوں پر نکتہ چینی کی جو اگرچہ مخلصانہ اور لوجہ اللہ تھی لیکن شرپسندوں نے اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا بلکہ ان حضرات کی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں جعلی خط تیار کر کے مختلف صوبوں میں پھیلائے۔ علامہ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ) کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے کے لئے سب سے بڑا ہتھیار جو ان کے مخالفین کے پاس تھا وہ یہی تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ کو معزول کر کے اپنے رشتہ داروں کو گورنر بنایا تھا۔ لوگوں میں یہ تاثر عام ہو گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شیخین رضی اللہ عنہما کی روش سے روگردانی کر کے اقربانوازی شروع کر دی ہے۔ مجلس شوریٰ تعطل کا شکار ہو گئی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے عم زاد و داماد مروان بن الحکم اور دوسرے اموی عمال کے مشوروں سے امور حکومت سرانجام دینے لگے۔ بے شک اموی عمال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ، سعید بن العاص رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن ابی سرح قابل جرنیل اور اعلیٰ منتظم تھے۔ لیکن مفسد معترضین نے ان کے عمدہ اوصاف کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ اموی عمال طلقا، میں سے تھے جبکہ ان سے بڑھ کر سابق الایمان اور مناصب کے اہل دوسرے حضرات موجود تھے۔ جن میں صحابہ بھی تھے۔ کوفہ، بصرہ، فسطاط وغیرہ نئے شہروں اور علاقوں میں آباد ہونے والے قبائل کو شکایت تھی کہ یہ علاقے ان کی تلواروں سے فتح ہوئے۔ لیکن حکومت کرنے کو بنوامیہ چلے آتے ہیں اور خود ان کو حکومتی مناصب میں حصہ نہیں ملتا۔ آخر یہ سلسلہ کبھی ختم بھی ہوگا؟

حضرت عثمان کے عہد آخر کی زندگی کا نقشہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ''الفتنہ الکبریٰ'' (خلافت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما) میں اس طرح کھینچا ہے۔

''اس وقت کی اسلامی زندگی کا ماحول قدرتی طور پر یہ چاہتا تھا کہ آپس میں اختلاف اور خواہشوں

میں فرق ہو۔ باہم مختلف اور متضاد سیاسی مسلک قائم ہوں۔ ایک طرف وہ لوگ جو قرآن کی آیات، نبی ﷺ کی سنت اور شیخین رضی اللہ عنہما کی سیرت کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے، دیکھ رہے تھے کہ نئے نئے معاملات پیش آ رہے ہیں۔ جن سے ان کی واقفیت نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان معاملات کا مقابلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح دور اندیشی، شدت، استقلال اور رعایا کو سنبھال کر کریں۔ دوسری طرف قریشی، غیر قریشی عربی نوجوان ان پیش آنے والے معاملات کا اپنی نئی زندگیوں میں استقبال کر رہے تھے۔ جس میں حرص بھی اور حوصلہ بھی۔ غرض تھی اور بڑی بڑی امیدیں بھی اور ایسا ارادہ بھی جو کہیں رکنا نہ جانتا تھا۔ اور ان تمام باتوں کے ساتھ عہدوں اور منصب سے متعلق سب چیزوں میں مقابلہ کی تیز اسپرٹ بھی۔ پھر یہ معاملات بجائے خود ایسے تھے جو بوڑھوں اور جوانوں کو اسی منزل پر لے جائیں جہاں وہ پہنچے۔ زمین کے بڑے بڑے خطے فتح ہو رہے تھے۔ ان خطوں سے بے شمار دولت پہنچ رہی تھی۔ ایسی حالت میں حیرت اور تعجب کی بات نہیں اگر وہ ان مفتوحہ علاقوں کی حکمرانی اور انتظام چلانے میں اور دولت سے نفع اٹھانے میں باہم مقابلہ کریں......اور پھر اتنی طویل وعریض حکومت کے چلانے میں اور اتنی زبردست دولت وثروت کے استعمال میں کیوں نہ آپس میں رایوں کا اختلاف ہو۔ ہرگز ہرگز حیرت کا مقام نہیں، اگر قریش کے حریص اور حوصلہ مند نوجوان ان دروازوں کی طرف پل پڑے جو ان کے سامنے کھولے گئے تاکہ وہ عزت، دولت اور حکومت تک پہنچ سکیں اور اس پر تعجب نہ کرنا چاہئے کہ ان قریشی نوجوانوں کے مقابلے کے لئے انصار اور دوسرے عرب قبیلوں کے نوجوان ہمت کریں اور یہ دیکھ کر کہ خلیفہ ان کی راہ میں حائل ہے اور تمام بڑے بڑے اور اہم عہدوں پر صرف قریش اور بنو امیہ کے متعلقین کا تقرر کرتا ہے ان کے دل غیظ وغضب اور کینے سے بھر جائیں ......مخالفت ایک فطری اور یقینی پیش آنے والی بات تھی۔ وہ اجتماعی اور سیاسی زندگی کا تقاضا تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ زندگی کے ان طبعی تقاضوں اور حالات کا مقابلہ کریں اور ان پر غالب آ جائیں......حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ لوگ ان کی طویل زندگی سے اکتا گئے ہیں۔ یہ مشاہدہ غیر معمولی نہیں کہ اولاد بھی والدین کی طویل زندگی کا خاص کر بڑھاپے کی کمزور سے اکتا جاتی ہے۔ اور حکومت کا طویل اور قابل شکایت زمانہ خود ردعمل پیدا کر دیتا ہے۔''

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ردعمل کو فطری، سادہ اور ناگزیر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے ربع صدی بعد حالات میں یقیناً تغیر پیدا ہوا اور آبادی کے مختلف عناصر کے خیالات اور توقعات نے بھی ایک نئی کروٹ لی لیکن قرآن وسنت کی تعلیمات پر مبنی ایک نظریاتی اور فلاحی مملکت میں اتنی بڑی خطرناک اور الٹی زقند انتخاب لگانا جو بالآخر خلافت سے ملوکیت کی طرف لے جائے ایک فطری صورت حال کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر اس کے بعد کا زمانہ پھر

اس کے بعد کا زمانہ یعنی پہلے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا زمانہ پھر تابعین کا پھر تبع تابعین کا۔ اب کیسے مان لیا جائے کہ اتنی جلدی برا زمانہ آ گیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ایک غیر فطری صورت حال یعنی سازشی گروہ بندی کو نظر انداز کر دیا ہے عہد عثمانی کے آخری دو تین سالوں میں مصر سازشیوں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا جہاں سے عبداللہ ابن سبا یہودی اپنے خفیہ پراپیگنڈہ کے گائیڈڈ میزائل چلا رہا تھا۔ بعض مصری دانشور اور محقق ایک تو مغربی مستشرقین کی مسموم اور متعصبانہ تحریروں سے بہت متاثر ہیں اور جب خود لکھتے ہیں تو انہی کا لبادہ اوڑھ کر انہی کا قلم سنبھال لیتے ہیں اور اپنی ''غیر جانبدارانہ تحقیق'' کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دوسرے ان حضرات میں کہیں کہیں اسلام سے بھی بڑھ کر مصری قومی جذبہ دفاع پایا جاتا ہے[1]۔ چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سب سے پہلا سازشی اور باغی جتھا لے کر مدینہ آنے والے مصری تھے اور بالآخر انہی کے ہاتھوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی المناک شہادت وقوع میں آئی، اس لئے طٰہٰ حسین نے مصریوں پر سے داغ دھونے کے لئے قدرتی عوامل کا سہارا لیا ہے اور نیز عبداللہ ابن سبا کے وجود ہی کا انکار کر دیا ہے کیونکہ علامہ ابن جریر طبری کے سوا ان کے پیش رووں یا ہم عصروں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ طویل مدت کے بعد جب مصر میں عبیدیوں کی حکومت قائم ہوئی تو ان کے معتقدات وہی تھے جن کا پراپیگنڈہ ابن سبا نے کیا تھا اور تو اور محمد حسین ہیکل جیسا مصنف بھی مصری عصبیت سے بری نہیں۔ ''عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ'' اس کی عظیم تصنیف ہے لیکن جہاں تک فتح مصر کا تعلق ہے ہیکل نے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی تمام کارروائیوں حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے گستاخانہ خط و کتابت اور اپنے لئے مصر کی حکومت کے استقلال کی مساعی کی وکالت کی ہے اور انہیں اہل مصر کا ہیرو بنا کر پیش کیا ہے۔ عہد فاروقی کے آغاز تک ہر سال ایک نوجوان دوشیزہ کو دریائے نیل کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے اس قبیح رسم کو بند کیا گیا۔ ہیکل نے اس رواج کا بھی انکار کیا ہے کیونکہ یہ بات قبل اسلام کے مصر کے خلاف جاتی تھی۔ (اس کا مفصل ذکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں دیکھئے) اسی طرح قاہرہ یونیورسٹی کے پروفیسر حسن ابراہیم حسن نے اپنی تصنیف اعلام الاسلام میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ پر الزام لگایا ہے کہ وہ بصرہ اور کوفہ کی امارتوں کے طلب گار تھے (حالانکہ اصل حقیقت یہ نہ تھی) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انکار پر ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور جنگ جمل کا باعث بنے۔ اگر یہ حضرات مناصب کے ایسے ہی خواہش مند تھے تو مدینہ پر یلغار کرنے والے باغی سبائیوں نے جب انہیں یکے بعد دیگرے خلافت کی پیش کش کی تو انکار کیوں کر دیا بلکہ ان لوگوں کو الٹا ڈانٹا کیوں؟ اور حضرت زبیر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع میں لڑنے کی پیشکش کیوں کی تھی؟ عمر ابوالنصر کے قلم سے بھی بعض ایسی تراوشیں ہوئی ہیں۔

[1] جمال ناصر کے زمانے میں تو مصر میں ''نحن ابناء الفرعون'' کا نعرہ عام ہو گیا تھا اور اخوان المسلمین کو جن شدائد و مصائب کا سامنا کرنا پڑا، ان کے تذکرہ سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ ''ابنا الفرعون'' کو روایتی بنی اسرائیل سے سابقہ پڑا اور ہار گئے۔ مولف

عبداللہ ابن سبا

گزشتہ صفحات میں کہیں کہیں عبداللہ ابن سبا کا ذکر آچکا ہے۔ وہ یمن کا یہودی تھا۔ اس کی ماں حبشی نژاد لونڈی تھی جس کا نام سودا تھا۔ اس کی نسبت سے اسے ابن سودا بھی کہا جاتا ہے۔ یہودی سازشی منصوبہ بندی اور اپنی قوم کے مفاد میں دوسری قوموں کے استحصال اور تخریب کاری کے لئے سینکڑوں سالوں سے بدنام چلے آتے ہیں۔ اہرام مصر کی تعمیر کے لئے یہودیوں سے بیگار کا کام لیا گیا ان بیگاری یہودیوں نے ایک خفیہ تنظیم قائم کی جسے فری میسنز (free Masons) یا آزاد معمار کا نام دیا اور پھر مصر سے نکل کر جہاں جہاں بھی یہودی گئے اس تنظیم کو ساتھ لیتے گئے بلکہ بڑی چالاکی اور مکاری سے غیر یہودیوں کو بھی اس کا رکن بنایا اور اس پر ایک بین الاقوامی فلاحی تنظیم کا ٹھپہ لگا دیا۔ کچھ سال پہلے تک پاکستان میں بھی اس کی شاخیں قائم تھیں اور ارکان انتہائی رازداری کا حلف بڑے خوفناک اور پرہیبت ماحول میں اٹھاتے تھے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے علاوہ شاید حکومت کے ہنگامی رفاہی کاموں میں خفیہ طور پر چندہ دیتے تھے۔ مختلف ممالک کی حکومتوں کے مقتدر افراد نیز دوسرے دولت مند اور بااثر اصحاب عموماً اس تنظیم کے رکن ہوتے ہیں۔ اصل مقصد دنیا کے مختلف ممالک میں یہودی اثر ورسوخ اور غلبہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ غیر ملکوں اور قوموں میں اپنی یہودیت کو چھپانے کے لئے یہ اپنے نام بھی بدل لیتے ہیں۔ عبداللہ ابن سبا یہودی نے یہودیوں کی اسی تنظیم کو ماڈل کے طور پر سامنے رکھا اور اسلام اور مسلمانوں کی تخریب کے لئے اپنی خفیہ تنظیم قائم کی۔ وہ مدینہ، خیبر اور عرب کے دوسرے مقامات سے نکالے گئے یہودیوں اور یہودی مذہب کی اسلام کے ہاتھوں ذلت وخواری کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ یہودیوں سے بڑھ کر کینہ خو قوم شائد ہی دنیا میں کوئی دوسری ہو۔

اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس نے ظاہری طور پر اسلام قبول کیا اور یمن سے مدینہ پہنچا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کسی منصب کے لئے درخواست کی لیکن ناکام ہوا۔ بہر حال وہاں کے عجمی نومسلموں اور عجمی غلاموں اور تھوڑے بہت یہودی اور عیسائی جو کسی شکل میں موجود تھے ان سے ملتا رہا اور ان کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مدینہ سے کوفہ کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر اپنے تخریبی منصوبہ کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبا کے وجود اور شخصیت کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔ یہ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ مشہور مصری مؤرخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس کے وجود سے انکار کیا ہے اور اسے ایک فرضی شخصیت قرار دیا ہے کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق ''ان اہم ماخذوں میں عبداللہ ابن سبا کا کوئی ذکر نہیں ملتا جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہونے والی شورش کا تذکرہ کیا گیا ہے طبقات ابن سعد (پیدائش ۱۶۸ھ وفات ۲۳۰ھ) میں عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش کا حال درج ہے مگر ابن سبا کا کوئی ذکر نہیں۔ طٰہٰ حسین کہتے ہیں کہ ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ابن سبا نام کا کوئی شخص تاریخ اسلام میں گزرا ہی نہیں۔ دراصل شیعہ اصحاب کے مخالفوں نے انہیں زچ کرنے کے لئے اس کا ایک فرضی ہیولیٰ تیار کر لیا ہے تا کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ شیعی عقائد

کی بنیاد رکھنے والا ایک یہودی تھا۔[1] طٰہٰ حسین کے دعویٰ کی تردید میں یہ کہنا کافی ہے کہ اگر چہ ابن سعد نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات میں ابن سبا کا ذکر نہیں کیا لیکن تابعین کے حالات لکھتے وقت مشہور تابعی اور فقیہ ابراہیم نخعی کے حالات میں لکھا ہے کہ ''ایک شخص ابراہیم نخعی کے پاس آیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ان سے پوچھا کہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ''ما انا سبائی ولا مرجئی'' (یعنی نہ میں سبائی ہوں نہ مرجئی)[2]۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں سبائی فرقہ موجود تھا۔ ابراہیم نخعی اور ان کے ہم عصر تابعین میں اس کے متعلق گفتگو ہوتی تھی۔ ایک دوسرے مشہور تابعی امام شعبی کا یہ قول حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ ''اول من کذب عبداللہ ابن سبا'' یعنی جس نے سب سے پہلے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا وہ عبداللہ ابن سبا ہے۔[3]

ابن قتیبہ (پیدائش ۲۱۳ھ وفات ۲۶۷ھ) تقریباً ابن سعد (پیدائش ۱۶۸ھ وفات ۲۳۰ھ) کے جونیئر ہم عصر ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی مشہور تصنیف المعارف میں لکھا ہے کہ

''سبائی عبداللہ بن سبا کی طرف منسوب ہیں اور وہ رافضیوں میں پہلا شخص ہے جس نے کفر اختیار کیا اور کہا کہ ''علی رضی اللہ عنہ جہاں کے رب ہیں''[4]

ان حضرات کے فوراً بعد امام ابن جریر طبری (پیدائش ۲۲۴ھ وفات ۳۰۸ھ) کی اولیں تاریخ میں کھلم کھلا ابن سبا کا ذکر ملتا ہے[5] اور طٰہٰ حسین کو بھی اس کا اعتراف ہے اور یہ وہ بزرگ ہیں جن پر شیعیت کا بھی شبہ کیا جاتا ہے ان کے بعد تو مؤرخوں کی ایک قطار لگ جاتی ہے جو ابن سبا کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے عہد عثمانی کے فتنہ و شورش کا بانی قرار دیتے ہیں اور جنگ جمل کو بھی اس کی کارستانی سمجھتے ہیں۔ ان عظیم مؤرخین کی فہرست میں ابن کثیر (البدایہ والنہایہ) ابن اثیر (الکامل فی التاریخ) ابن حجر (لسان المیزان)، ذہبی (میزان الاعتدال)، ابن خلدون (مقدمہ و تاریخ)، ابن عساکر (تہذیب التہذیب)، ابن حزم (الملل والنحل) شہرستانی (الملل والنحل) مقریزی (الخطط) جاحظ (البیان والتبیین) امام ابن تیمیہ (منہاج السنہ) نوبختی (فرق الشیعہ) الکشی (معرفۃ اخبار الرجال) اور متعدد دوسرے شامل ہیں۔

آخر الذکر دونوں تو معتبر شیعہ مؤرخ ہیں جبکہ طبری بھی شیعیت سے متہم ہیں الکشی کی کتاب ''معرفۃ اخبار الرجال'' شیعہ حضرات میں مستند ترین مانی جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''عبداللہ ابن سبا یہودی تھا جس نے اسلام قبول کر لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا محب بن گیا جب وہ

---

[1] الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۱۹

[2] طبقات ابن سعد جلد ۶ صفحہ ۲۷۵ تذکرہ ابراہیم نخعی

[3] لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۲۸۹ نیز ''تہذیب التہذیب'' ابن عساکر جلد ۷ صفحہ ۴۳۰

[4] معارف از ابن قتیبہ صفحہ ۶۲۲

[5] تاریخ طبری حصہ سوم خلافت راشدہ حصہ دوم، اردو ترجمہ ص ۴۰۸ (شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی)

یہودی تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی یوشع بن نون کی محبت میں بہت مبالغہ کیا کرتا تھا۔ اسلام لانے کے بعد اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں غلو کیا۔ ابن سبا پہلا شخص ہے جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت (خلافت) کے فرض ہونے کو شہرت دی۔''[1]

الکشی نے امام جعفر صادق کا یہ قول بھی اپنی کتاب میں نقل کیا ہے:

''خدا کی لعنت ہو عبداللہ ابن سبا پر جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ دعویٰ کیا کہ وہ خدا ہیں حالانکہ خدا کی قسم امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ صرف خدا کے بندے تھے۔ خدا اس شخص کو ہلاک کرے جو ہم پر کوئی تہمت لگائے۔''[2]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے نزدیک اس عہد کا اہم تریں ماخذ ''البلاذری (پیدائش ۲۰۲ھ وفات ۲۷۹ھ) کی ''انساب الاشراف'' ہے (البلاذری ابن سعد کے جونیئر ہم عصر ہیں) لیکن اس میں ابن سبا کا ذکر نہیں ملتا۔ اس لئے وہ اس کے وجود کے منکر ہیں۔ لیکن ابوالعجبی ملاحظہ ہو کہ خود اپنی کتاب الفتنۃ الکبریٰ کی دوسری جلد میں البلاذری کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ''ایک دفعہ عبداللہ بن سبا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے اسے جھڑکا اور فرمایا کہ تم لوگ ان بحثوں میں الجھے ہوئے ہو اور یہاں یہ حالت ہے کہ مصر پر مخالفوں کا تسلط ہو گیا اور وہ تمام لوگ قتل کر دیئے گئے جو ہمارے مددگار تھے۔'' اس سے ظاہر ہے کہ البلاذری بھی ابن سبا کی شخصیت کو حقیقی سمجھتا ہے۔

طبری، الکشی اور نوبختی کے حوالوں سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا یہ دعویٰ بھی باطل ہو گیا کہ شیعہ حضرات کے مخالفوں نے ابن سبا کا ایک فرضی وجود وضع کیا کیونکہ خود شیعہ مؤرخ اس کے وجود کے قائل ہیں۔ طٰہٰ حسین مصری عصبیت کا شکار ہیں ابن سبا کے حقیقی وجود کے بارے میں مزید حوالوں کی ضرورت نہیں۔ الکشی اور بعض دوسرے مؤرخوں کے بقول حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے زندہ جلوا دیا تھا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق اسے یہ کہہ کر ساباط (ایران) کی طرف جلاوطن کر دیا تھا کہ ''خدا کی قسم جس شہر میں میں رہتا ہوں یہ وہاں نہیں رہ سکتا۔'' اس نے اپنے ابتدائی موقف سے ترقی کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا اور خود کو ان کا نبی کہنا شروع کر دیا تھا۔

عبداللہ ابن سبا کا کردار

عالم اسلام کا یہ دمدار تارہ جو اپنی حبشی ماں کی نسبت سے ابن سودا کے نام سے بھی مشہور ہوا یمن کا یہودی تھا۔ اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق عہد عثمانی میں منافقانہ طور پر اسلام قبول کیا۔ اس کا مقصد اسلام کو زک پہنچانا، نظامِ خلافت کو پارہ پارہ کرنا، مملکت میں فتنہ و انتشار پیدا کرنا اور اسلام کے اعظم رجال کو باہم دست و گریباں کرنا تھا۔ یہودی رہ کر وہ ایسا نہ کر سکتا تھا۔ اس نے اسلام کا لبادہ پہن کر اسلام اور خلافت کی بنیادوں میں

[1] الکشی۔ معرفۃ اخبار الرجال جلد اول صفحہ ۷۱ نیز نوبختی۔ الفرق الشیعہ ص ۴۴

[2] ایضاً صفحہ ۷۱

اندر سے ڈائنامائٹ بچھانے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے اس نے ابتداء میں حکومتی نظم ونسق میں کوئی منصب حاصل کرنے کی بھی ناکام کوشش کی۔ اس ناکامی نے اسے اور زیادہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کر دیا۔ اس نے فری میسنری طریق کار کو اپنایا۔ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بظاہر زُہد ودرویشی اور ترک دنیا کا بہروپ اختیار کیا اور اپنے معتقدوں اور داعیوں کو بھی یہی بہروپ اختیار کرنے کی ہدائت کی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تبلیغی ڈھونگ رچایا۔ جب کم فہم اور کم علم لوگ اس کی باتوں پر کان دھرنے لگے تو اموی۔ ہاشمی رقابت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حب اہل بیت کا چولا بدلا اور نئے نئے عقائد ونظریات وضع کر کے پھیلانا شروع کئے جو عیسائیت، یہودیت اور مجوسیت کا ملغوبہ تھے۔ مثلاً یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ محمد خاتم الانبیاء تھے، علی رضی اللہ عنہ خاتم الاوصیا ہیں، خلافت ان کا حق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو پورا نہ کرنے والے ظالم اور غاصب ہیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی موجود ہیں۔ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتبہ اس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کیا کہ اس کی حدیں الوہیت سے ملا دیں اور ان کے نام سے جعلی خط لکھ کر پھیلائے جن میں لوگوں کو عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے پر ابھارا جاتا تھا۔ اس نے اور اس کے داعیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے عمال کے خلاف زبردست خفیہ پراپیگنڈہ کیا کہ ان کو دینداری اور خدا خوفی سے کوئی تعلق نہیں۔ چاروں طرف ظلم اور بے دینی کا دور دورہ ہے۔ بنوامیہ کے اقتدار کو ختم کئے بغیر سچائی اور انصاف کو بحال نہیں کیا جا سکتا۔ عوام کی آزادی اور صحیح اسلام خطرے میں ہے۔ خلیفۂ وقت کے عمال بدعنوان اور ناقص ہیں۔ خلیفہ کو معزول کرنا ضروری ہے۔

ابن سبا نے سب سے پہلے ۳۳ھ میں سابق ایرانی سلطنت میں واقع اسلامی مراکز بصرہ کوفہ وغیرہ کا رخ کیا جہاں غیر قریش عرب قبائل میں عہدوں اور اموال کی تقسیم کے سلسلے میں بے اطمینانی کی لہر موجود تھی اور وہ بنوامیہ اور دوسرے قریش اور انصار کی فوقیت اور مفادات کے خلاف تھے۔ اگرچہ مخالفوں اور نکتہ چینیوں کی تعداد ہنوز قلیل تھی لیکن ان کی زبانیں سنانیں اور کمانیں تیز اور دراز تھیں۔ یہ مختصر سازشی ٹولہ ابتدا میں خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف نہ تھا بلکہ اپنی بعض حقیقی اور بعض مزعومہ شکایات کا ازالہ چاہتا تھا۔ عہد عثمانی کے اواخر میں معاشرہ اور انتظامیہ میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ابن سبا نے ان کا تیز نگاہ سے جائزہ لیا اور صورت حال کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے موافق پا کر کارروائیوں کا پروگرام بنا لیا۔ وہاں اس کے ہم وطن یمنی قبائل کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اسے توقع تھی کہ وہ ان کی قبائلی عصبیت کو بھڑکا کر انہیں اپنا آلہ کار بنا سکے گا۔ فری میسن کی یہودی تنظیم کے متعدد درجے اور دائرے ہوتے ہیں۔ ابن سبا نے اپنی تحریکی تنظیم میں بھی ایسے یہ دائرے قائم کئے۔ مثلاً

۱- غیر قریش قبائل کی محرومی کے ازالے اور قریش کے ساتھ مساوی حقوق کا دائرہ۔

۲- نچلے طبقے کے بدحال عوام اور اونچے طبقے کے خوشحال خواص کے مابین تفاوت کا دائرہ۔

۳- غیر عرب نومسلموں، موالیوں، عجمی غلاموں کے احساسِ کمتری اور عجمی سلطنت کی تباہی کے انتقام کا

دائرہ۔

۴- بنوامیہ کے مقابلے میں بنو ہاشم خاص کر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کی امامت وسیادت کا دائرہ اور ان کے پردے میں عرب سے ایران کی تباہی ومحکومی کے انتقام کا دائرہ۔

۵- یہودیت اور عجمیت کے زوال اور سرنگونی کا اسلام سے انتقام اور اس کے خاتمہ کی کوشش کا دائرہ۔

ابن سبا نے بڑی ہوشیاری سے ان کو ایک بڑے ہم مرکز دائرے کی شکل دیدی جس کا نقطہ پرکار وہ خود بن گیا اور مختلف دائروی عناصر کو اس کا احساس نہ ہو سکا۔

ابن سبا نے اپنی دعوت کا آغاز بصرہ سے کیا اور وہاں کے غیر قریشی قبائل کے غیر مطمئن عناصر میں اپنا خفیہ پراپیگنڈہ شروع کیا۔ وہاں اسے ایک لٹیرا حکیم بن جبلہ مل گیا جو نظر بندی کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اور اس کے کچھ ساتھی ابن سبا کے ہم نوا بن گئے۔ ابن جبلہ نے بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محاصرہ اور شہادت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب بطور خلیفہ کے وقت لوگوں کو بیعت پر مجبور کیا اور پھر جنگ جمل میں اس نے سبائی گروہ کے ایک لیڈر کی حیثیت سے سرگرم حصہ لیا۔ بصرہ کے گورنر عبداللہ ابن عامر کو ابن سبا کے باغیانہ خیالات اور سازشی دعوت کا پتہ چلا تو اسے بصرہ سے نکال دیا چونکہ وہ بظاہر مسلمان تھا اس لئے اس کے خلاف کوئی دوسری سخت کارروائی نہ کی۔ تقریر و تحریر کی آزادی تھی اور قابل اعتراض تقریروں، تحریروں پر سزا دینے کا تصور ناپید تھا۔ بصرہ سے نکل کر وہ کوفہ پہنچا۔ وہاں پہلے ہی سے ایک شورہ پشت عنصر موجود تھا جس کا لیڈر مالک اشتر نخعی تھا۔ یہ گروہ قریش خاص کر بنوامیہ کی سیادت اور مناصب پر تصرف کے خلاف تھا اور خلیفہ پر بھی نکتہ چینی کرتا تھا۔ ابن سبا نے اسے اپنے ساتھ گانٹھ لیا۔ مالک اشتر نخعی اور اس کے ساتھی ابن الکواء عمیر ضابی، جندب، کمیل اور ابن الجبلہ وغیرہ کو اس نے بھڑکایا کہ اسلامی تعلیم کے مطابق قریش اور غیر قریش سب برابر ہیں اور حکومت کے اموال اور مناصب میں برابر کے حقدار، خلیفہ اقربا پروری کا مرتکب ہو رہا ہے اور غیر قریش محکوموں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اشتر خود بھی کسی اعلیٰ عہدے کا طلب گار تھا۔ یہ اس کے دل کی آواز تھی۔ وہ فوراً ابن سبا کا ہم نوا بن گیا۔ غیر مطمئن اور احساس محرومی کا شکار عناصر پر مشتمل ایک گروہ خلیفۂ وقت کے خلاف تیار ہو گیا۔ اشتر ان کا سرگروہ تھا۔ اس گروہ نے پہلے کوفہ کے گورنر ولید بن عقبہ کے خلاف سازشی مہم چلائی۔ پھر اس کے جانشین سعید بن العاص کے خلاف۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نرمی اور دلجوئی سے کام لے کر سازشی گروہ کے مطالبات مان کر دونوں گورنروں کو یکے بعد دیگرے معزول کر کے مدینہ بلا لیا اور سازشیوں کی مرضی کے مطابق حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔

اس عزل ونصب سے اور خلیفہ کے نرم رویہ سے سازشی گروہ کی حوصلہ افزائی ہوئی اور وہ اپنے مطالبات اور جارحانہ رویہ میں دلیر ہوتے گئے۔ تنگ آ کر اشتر اور اس کے ساتھیوں کو پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام بھیج دیا گیا۔ وہاں انہوں نے انہیں سمجھانے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوئے، تب انہیں حمص میں عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے پاس بھیجا گیا۔ انہوں نے سختی سے کام لیا تو بظاہر ان کے دماغ درست ہو گئے اور انہوں نے اپنے رویہ سے توبہ کی۔ تب عبدالرحمٰن نے انہیں خلیفہ کے پاس مدینہ بھیج دیا۔ وہاں انہوں نے خلیفہ

کے پاس نیک چلنی کا مظاہرہ کیا۔ مطمئن ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں واپس کوفہ بھیج دیا۔ مگر کوفہ پہنچ کر وہ اپنے سابقہ رویہ کی طرف لوٹ آئے اور ابن سبا کے پروگرام پر عمل کرنے لگے کوفہ کے سرکردہ سردار سرحدوں پر جہاد میں مصروف تھے۔ اشتر اور اس کے ساتھیوں کے لئے میدان خالی تھا۔

عراق میں مختلف قوموں اور قبیلوں کی ملی جلی آبادی کی وجہ سے اختلاف، فتنہ اور سازش کی فطری صلاحیت تھی۔ اپنے ہم وطن یمنی قبائل میں سازش و بغاوت کے جراثیم پیدا کرنے کے علاوہ ابن سبا کا مقصد موروثی شہنشاہیت کے پرستار ذمی اور نو مسلم عجمیوں کو انتخابی خلافت کے خلاف ابھارنا اور بظاہر اہل بیت کی موروثی حکومت کے حق میں زمین ہموار کرنا تھا جبکہ اصل اور در پردہ مقصد اسلامی نظام کا شیرازہ درہم برہم کرنا تھا۔ ایرانی سلطنت سے کشمکش کا آغاز عہد صدیقی میں ہوا تھا اور اس کا خاتمہ عہد عثمانی میں ہوا۔ اس لئے خلفائے ثلاثہ کے خلاف شہنشاہیت پرست ایرانیوں کے انتقامی جذبات کو برانگیختہ کرنا آسان تھا۔ وہ لوگ بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور بنو ہاشم کو خاندان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ کر اور ان کی حکومت کے قیام میں خدمات انجام دے کر زیادہ سے زیادہ حقوق، مراعات اور مناصب حاصل کرنا چاہتے تھے[1] اگر ''ایرانی شہزادی'' شہر بانو کا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حرم میں داخل ہونا اور حضرت امام زین العابدین کی والدہ محترمہ ہونا درست مان لیا جائے[2] تو ایرانیوں کو یہ خیال بھی ہوگا کہ اب ایران کی موروثی و پشتینی شہنشاہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھرانے میں منتقل ہو گئی ہے اور اسی لئے انہوں نے اپنا دارالخلافہ کوفہ منتقل کر لیا ہے۔ اس لئے ان کی اطاعت ان پر فرض ہے۔ ایرانی عناصر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے محاربات میں حصہ بھی لیا۔ کاظم زادہ مصنف ''تجلیات روح ایران در ادوار تاریخی'' کے کھلے اعتراف کے مطابق اہل ایران نے بنو ہاشم کی بنو امیہ کے مقابلے میں انتقاماً حمایت کی۔ ورنہ انہیں بنو ہاشم سے پیار تھا نہ بنو امیہ سے بغض۔ (اس کتاب کے اقتباسات پہلے درج کئے جا چکے ہیں) وہ ایرانی سلطنت کی تباہی کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ وہ سلطنت جسے سابق شاہِ ایران نے زندہ کرنا چاہا اور اپنے عروج کے دوران میں اس کا ڈھائی ہزار سالہ جشن بھی منایا جس میں اس وقت کے پاکستانی ڈکٹیٹر یحییٰ خاں نے بھی شمولیت کی۔

غرضیکہ ابن سبا نے عجمی عناصر کے جذبات کو بھی خلیفہ کے خلاف برانگیختہ کیا اور اپنے سازشی پروگرام میں شامل کر لیا۔

جب ابن سبا کی خفیہ سازشی سرگرمیوں کا پتہ چلا تو گورنر نے اسے کوفہ سے بھی نکال دیا۔ تب وہ دمشق پہنچا لیکن وہاں اس کی دال نہ گلی۔ اس نے بزرگ صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کے اموال کی تقسیم کے متعلق اپنے خیالات تھے وہ ابن سبا کے بھرّے میں نہ

---

[1] جیسا کہ بعد میں بنو عباس کی خلافت کے دوران میں فی الواقع ایسا ہوا ایرانی اس پر چھا گئے اور پھر اسے ہلاکو کے ہاتھوں ختم کرا کر دم لیا۔ مولف

[2] مشہور سندھی محقق ڈاکٹر قمر واحد اپنے تحقیقی مقالہ ''سندھی عورت صدیوں کے آئینے میں'' (مطبوعہ روزنامہ جنگ کراچی مؤرخہ ۲ نومبر ۱۹۸۳ء) میں لکھتی ہیں کہ ''معتبر ذرائع کے مطابق امام زین العابدین کی والدہ محترمہ نسباً سندھی تھیں اور ان کا اصل نام سلافہ تھا۔

آئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو انہوں نے ابن سبا کو خارج البلد کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو مدینے بلا لیا۔ اس طرح ابن سبا کا ان سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ دمشق سے نکل کر ابن سبا نے دور افتادہ فسطاط (مصر) کو اپنی سازشی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ وہاں یمنی قبائل کی آبادی موجود تھی۔ خیبر اور دوسرے عرب علاقوں سے نکالے جانے کے بعد یہودی اور عیسائی بھی شام، فلسطین اور مصر میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کے سینوں میں بھی انتقام کی آگ تھی۔ مصر ہی میں فرعونی دور میں یہودیوں نے فری میسن تحریک کا آغاز کیا تھا۔ ابن سبا نے اب اسے زندہ کیا۔ اس کے صحیح اور مکمل مقاصد کا اس کے سب ساتھیوں کو بھی پتہ نہ چل سکا ہر ایک جزوی طور پر جانتا تھا۔ اکثر اس کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے نیز محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور محمد بن ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔[1] جو وہاں کے گورنر کے خلاف تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکتہ چیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تحقیقاتی کمیشن کے رکن کی حیثیت سے عمر رسیدہ بزرگ صحابی حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے اور پھر سازشیوں کے بہکانے سے وہاں رہ گئے۔ ابن سبا نے ان حضرات اور ان سے متاثر ہونے والے دوسرے افراد کو اپنا آلۂ کار بنایا اور اس کی خفیہ دعوت پھیلنے لگی۔ اور باغیانہ تحریک اپنے شباب کو پہنچ گئی۔

غرضیکہ بصرہ سے لے کر فسطاط تک ابن سبا جہاں جہاں سے گزرا اپنے زہریلے اثرات چھوڑتا گیا۔ اس نے ایسی باتیں پھیلائیں جن سے مذہب، سیاست، حکومت، ایڈمنسٹریشن اور معیشت کے بارے میں عوام کے خیالات، نظریات، اعتقادات کو خراب کرنا قبائلی، تعصبات پیدا کرنا اور ابتری پھیلانا مقصود تھا۔ اس نے اپنے داعیوں کو چاروں طرف بھیجا اور مختلف شہروں کے کم علم کم فہم اور محض ابتدائی دینی معلومات رکھنے والے حریص اور جاہ پسند سازشی عناصر سے خفیہ خط و کتابت کے ذریعے روابط قائم کئے۔ اس کی یہ خط و کتابت اپنی سازشی تحریک اور تنظیم کے اندرونی حلقے کے سرگرم اور معتبر افراد سے ہوتی تھی اور وہ اپنے عام ارکان تک پہنچاتے تھے، خود مدینہ کے بعض لوگوں، خاص کر نوجوان نسل اور وہاں کے عجمی عناصر کے ساتھ بھی اس کی خفیہ خط و کتابت تھی۔ اور روہ جھوٹی افواہوں اور الزام تراشیوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وقائع نویسی اور خبر رسانی کا انتظام بہت عمدہ تھا لیکن عہد عثمانی میں ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ ابن سبا کی خفیہ دعوت اور زہریلے پراپیگنڈہ کی اطلاعات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک اس وقت پہنچیں جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ کوفہ، بصرہ اور فسطاط (مصر) کے شورش پسند عناصر منظم ہو چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جیسی بزرگ ہستیوں کی طرف سے ابن سبا اور اس کے ساتھیوں نے خود جعلی خطوط لکھ کر مختلف شہروں میں

---

[1] محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے صاحب زادے تھے وہ بہت کمسن تھے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا ان کی والدہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نکاح کر لیا اور محمد کو اپنے بچوں کی طرح پالا۔ اس طرح دوگونہ نسبت سے ان کے دماغ میں اپنے تفوق اور برتری کے اونچے خیالات تھے اور وہ خود کو اعلیٰ سے اعلیٰ منصب حکومت کا حقدار سمجھتے تھے لیکن محروم رہے۔ محمد ابن ابی حذیفہ کے والد بزرگ صحابی تھے جنگ احد میں شہید ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پرورش کیا۔ کسی بڑے منصب کے طلب گار ہوئے۔ مستحق نہ پا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا۔ محمد ان کے خلاف ہو گئے۔ مؤلف

پھیلائے اور مجمعوں میں پڑھ کر سنائے۔ ان خطوط میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے عمال کے خلاف باغیانہ خیالات ابھارنے کی کوشش کی جاتی۔

نیز یہ کہ عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے عمال کو دینداری اور خدا خوفی سے کوئی تعلق نہیں۔ چاروں طرف ظلم اور بے دینی کا دور دورہ ہے۔ بنوامیہ کے اقتدار کو ختم کیے بغیر سچائی اور انصاف کو بحال نہیں کیا جاسکتا۔ عوام کی آزادی خطرہ میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ ایک شہر کا سازشی گروہ دوسرے شہر کے لوگوں کو عثمانی عمال کے فرضی ظلم و تعدی کی داستانیں لکھ کر بھیجتا تھا۔ سادہ لوح مسلمان فرضی مظالم کی داستانیں سنتے تو ان کے دلوں میں عمال کے خلاف نفرت اور اپنے ''مظلوم'' بھائیوں کے لئے رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے اور وہ کہتے کہ ''ہم تو ان مظالم سے امن میں ہیں جن میں ہمارے دوسرے شہروں کے بھائی مبتلا ہیں۔'' وہ نہیں جانتے تھے کہ دوسرے شہروں کے مسلمانوں کو ان کے بارے میں اسی طرح کے خطوط لکھے جاتے تھے جنہیں پڑھ سن کر وہ خدا کا شکر کرتے تھے کہ وہ خود ہر مصیبت اور ظلم سے محفوظ ہیں۔ علامہ ابن حزم ''الملل والنحل'' (جلد ۳ صفحہ ۱۰۵) میں لکھتے ہیں کہ ''لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنے کے لئے ابن سبا ہی نے آمادہ کیا۔''

اس نے اپنی سازشی تحریک میں شامل ٹولے اور کچھ دوسرے عوام کو بھی یہ تاثر دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے بزرگ صحابہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حتیٰ کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں اور ان کے اعمال کی کارروائیوں کے مخالف ہیں اور ان کی معزولی کے خواہش مند۔ ان محترم ہستیوں کو اس کے اس دجل و مکر اور بے بنیاد زہریلے پراپیگنڈہ کا کوئی علم نہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کی حمایت میں جو عجیب و غریب عقائد و نظریات اس نے وضع کیے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے بے خبر تھے۔ یہ سازشی تحریک انہی مقامات پر زیادہ کامیاب ہوئی جہاں صحابۂ کرام کی تعداد بہت کم تھی اور جو تھے وہ ضعیف اور گوشہ نشیں تھے۔

کوفہ، بصرہ، فسطاط وغیرہ کی فوجی چھاؤنیوں میں بدوی عرب قبائل اور نو مسلم عجمی موالی زیادہ تھے، جن کی اکثریت کو صحبت نبوی اور خلفائے راشدین کی صحبت سے استفادہ کا موقع نہیں ملا تھا یا بہت کم ملا تھا اور جو جہاد کی مصروفیات کی وجہ سے اسلامی تعلیمات کو بہت کم یا بقدر ضرورت بنیادی عقائد ہی کو سمجھتے تھے، بیشتر موالی اور عجمی اپنے انتقامی جذبات کے تحت ابن سبا کی تحریک میں شامل ہو گئے ابن سبا نے محنت کر کے مختلف الخیال عناصر کو منظم کر کے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے بنوامیہ کی طاقت کو توڑا جائے پھر جو ہو سو ہو۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بطور خلیفہ اسلام کے نمائندہ تھے ان پر حملہ اسلام پر حملہ تھا مگر اس فری میسن یہودی کی گہری چال کا احساس اس کے دام میں پھنسنے والے سادہ لوح مسلمانوں کو نہ ہو سکا۔ بزرگ صحابہ کی مناصب سے معزولی اور توہین کے پردے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقربا نوازی، اموی عمال کی نااہلیوں اور غلط کاریوں کے افسانے

گھڑے گئے، جعلی اور فرضی خفیہ خطوط کے ذریعے مختلف شہروں کے لوگوں میں بے اطمینانی پیدا کرنے اور انہیں بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔ یہ ایک زیر زمین تحریک تھی جیسا کہ عام یہودی طریقہ کار ہے۔ فسطاط (مصر) جیسی دور افتادہ جگہ پر بیٹھ کر اس نے اپنی سازش کا تانا بانا دوسرے شہروں میں بھی پھیلا دیا۔ مصر میں خلیفہ اول کے بیٹے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ (جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں پل کر جوان ہوئے) اور محمد بن ابی خدیفہ رضی اللہ عنہ (جو خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاں پل کر جوان ہوئے) جو مزعومہ محرومیوں کا شکار تھے کہ انہیں خلیفہ نے بلند مناصب دینے سے انکار کر دیا تھا، آسانی سے ابن سبا کی چالوں میں آ گئے اور وہاں موجود دوسرے مجاہدین کو بھی خلیفہ اور اموی عمال کے خلاف بھڑکانے لگے۔ آخر میں بزرگ صحابی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی اس کے بہکاوے میں آ گئے اور وہاں ان حضرات کی دیکھا دیکھی کچھ دوسرے غیر مطمئن لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے اور اس سازشی ٹولہ نے اپنے فتنہ وشر کو جواز کا رنگ دینے کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست تیار کر لی۔ پرانی کتب تاریخ کے علاوہ ان الزامات کی تفصیل اور جوابات کے لئے عمر ابوالنصر کی تصنیف ''حضرت عثمان'' معین الدین ندوی کی تصنیف ''سیر الصحابہ'' (جلد اول۔ خلفائے راشدین) ان کے ہمنام شاہ معین الدین احمد ندوی کی تصنیف تاریخ اسلام (جلد اول) اور متعدد جدید کتب تواریخ ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ یہ مختصر سازشی گروہ وسیع مملکت اسلامی کی عظیم آبادی کا نمائندہ اور ترجمان نہ تھا کہ ان کی طرف سے الزامات پیش کرتا۔ بہر حال چند بڑے بڑے الزامات حسب ذیل تھے:

۱- کبار صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کو ان کے عہدوں سے معزول کر کے اپنے رشتہ داروں اور حاشیہ نشینوں کو ان کی جگہ مقرر کیا حالانکہ وہ نااہل اور ناتجربہ کار تھے۔

۲- اموی عمال کی بدعنوانیوں پر کوئی کارروائی نہیں کی۔

۳- حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ صحابہ سے بدسلوکی کی اور ان کی توہین کی۔

۴- حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے ربذہ جلاوطن کر دیا جہاں وہ بیکسی کے عالم میں فوت ہوئے۔

۵- اپنے لئے اور اپنے اہل وعیال کے لئے بلند وبالا پختہ محل تعمیر کرائے۔

۶- اپنے چچا حکم بن العاص کو طائف سے مدینہ بلوا لیا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مدینہ سے شہر بدر کر کے طائف بھیج دیا تھا۔

۷- اپنے اسی چچا حکم کے بیٹے مروان سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا اور اسے ایک لاکھ درہم دیئے۔ بیٹی کو بھی جہیز میں ایک لاکھ درہم دیئے۔

۸- حکم کے دوسرے بیٹے خالد کو مدینہ کے بازار سے عشر وصول کرنے کا اختیار دیا۔

۹- مروان کو طرابلس الغرب کے مالِ غنیمت کا خمس دیا۔

۱۰- بیت المال سے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ایک لاکھ درہم دیئے۔
۱۱- اپنے رشتہ داروں اور حاشیہ نشینوں کو وسیع قطعات اراضی دیئے۔
۱۲- مدینہ کے اطراف میں بقیع کو سرکاری چراگاہ قرار دیا۔ عوام کو اس میں اپنے جانور چرانے سے منع کر دیا۔
۱۳- ایک قرآن کے علاوہ باقی مصحف نذرِ آتش کر دیئے۔
۱۴- مصری وفد سے بدعہدی کی۔
۱۵- بدعات کو رواج دیا۔

بعد میں جب سازشی ٹولہ کی مخالفت نے زور پکڑا تو مزید اعتراضات اور الزامات بھی گھڑ لئے گئے[1] اکثر الزامات غلط اور بے بنیاد تھے اور اس توقع پر گھڑے گئے تھے کہ یک طرفہ پراپیگنڈہ سے ناواقف لوگ متاثر ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بدظن ہو جائیں گے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں جرمنی کے پراپیگنڈہ وزیر گوبلز کا کہنا تھا کہ جھوٹ بولو، بار بار بولو اور بولتے رہو حتیٰ کہ لوگ اسے سچ مان لیں۔ اچھالا گیا کیچڑ کچھ نہ کچھ تو کہیں نہ کہیں چپک جائے گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شورہ پشت بلوائیوں کے مجمع کے سامنے الزامات کے جواب دیئے اور کوئی تردید نہ کر سکا۔ ابن سبا اور اس کے سازشی ساتھیوں کے دلوں میں جب خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کا کوئی احترام نہ تھا۔ حالانکہ وہ اولیں مسلمانوں میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحب زادیاں یکے بعد دیگرے ان سے بیاہی گئیں اور انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی عظیم خدمات سرانجام دیں اور ان کی دولت سے اسلام اور مسلمانوں کو جتنا فائدہ پہنچا کسی دوسرے کی دولت سے نہ پہنچا اور سازشیوں نے خود اس کا اعتراف کیا تو ظاہر ہے کہ دوسرے صحابہ کا ان کے دلوں میں کیا احترام ہو سکتا تھا لیکن انہوں نے صحابہ کی معزولی اور توہین، کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بہت بڑا الزام بنا کر پیش کیا حالانکہ درحقیقت انہیں ان بزرگ صحابہ سے کوئی ہمدردی نہ تھی ورنہ ان کی بحالی کا مطالبہ کرتے اور اگر یہ سوال اٹھانا ہی تھا تو مدینہ کے اہل شوریٰ یا اربابِ حل وعقد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس پر توجہ دلا سکتے تھے چہ جائیکہ مصر، کوفہ اور بصرہ کے بدوی قبائل وغیرہ کے دو ہزار لوگ جو وسیع مملکت اسلامیہ کے کسی طرح بھی نمائندہ نہ تھے، اسے محل اعتراض بناتے، بے شک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بعض کبار صحابہ کو مناصب سے معزول کیا لیکن یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ان کے پیشرو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ کو معزول کیا تھا اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی معزولی کی وصیت بھی انہوں نے کی تھی جس پر عملدرآمد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا۔ کسی نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے احکامات کے خلاف زبان اعتراض نہ کھولی تھی۔ دراصل معترضین کا اصل ہدف بنوامیہ کے وہ افراد تھے جنہیں معزول صحابہ کی جگہ مقرر کیا گیا۔ یعنی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، ولید بن عقبہ، سعید بن العاص، عبداللہ بن عامر نیز حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ بھی۔ جہاں تک موخر الذکر کا تعلق ہے انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے ایک صوبے کا گورنر مقرر کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں پورے شام کا گورنر جنرل مقرر کر دیا اور انہوں نے شام کا نظم ونسق بڑی خوبی سے چلایا اور کسی کو ان کے خلاف کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی۔ البتہ جیسا کہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کی حیثیت ان کے ایک غلام کی طرح تھی جبکہ آپ (عثمان) کے عہد میں وہ من مانی کر جاتے ہیں اور آپ انہیں نہیں روکتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ دوسرے اموی عمال ان کے رشتہ دار ہونے کے علاوہ نوجوان اور ناتجربہ کار ہی سہی لیکن انہوں نے اپنے کارناموں سے اپنے آپ کو امارتوں کا اہل ثابت کیا۔[1]

وہ اچھے منتظم اور فاتح ثابت ہوئے اور انہوں نے بڑے بڑے علاقے فتح کئے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ نہ صرف عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے بلکہ قریش کے ایک ہی قبیلہ بنوامیہ میں سے تھے اور ''طلقا'' میں سے تھے اسے قریش کے دوسرے قبیلوں کے لوگ نیز انصار اور بدوی قبائل، اپنی حق تلفی سمجھتے تھے جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مقرر کردہ افراد کے استحقاق کے علاوہ اپنی صلہ رحمی کا تقاضا بھی سمجھتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کسی رشتہ دار کو کسی منصب پر فائز نہیں کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نئی روایت قائم کی۔ پھر یہ کہ ان کے مقرر کردہ حضرات کو اس وقت کے اسلامی معاشرے میں وہ اہمیت اور حیثیت حاصل نہ تھی جو معزول کردہ صحابہ کو حاصل تھی نہ ان کی سی دینداری اور قربانیوں کا ریکارڈ تھا البتہ وہ عمدہ انتظامی اور فاتحانہ اوصاف کے مالک ضرور ثابت ہوئے۔ لیکن ولید بن عقبہ (گورنر کوفہ) کے سوا کسی کے خلاف کسی کھلی بدعنوانی، بے قاعدگی اور احکام دین کی خلاف ورزی کا ثبوت نہیں ملتا۔ تحقیقاتی کمیشن نے بھی ان کے خلاف کچھ نہ پایا۔ الزامات کی فہرست میں بھی ان کی غلط کاریوں کی نشاندہی نہیں ملتی۔ ابن جریر طبری کے مطابق ولید بن عقبہ پر شراب نوشی کا الزام دراصل ایک سوچی سمجھی سکیم کے مطابق کوفہ کے چند شورہ پشتوں نے بڑی ہوشیاری اور انتقاماً وضع کیا تھا کیونکہ ولید نے انہیں سزا دی تھی حالانکہ ولید بحیثیت مجموعی اہل کوفہ میں ہردلعزیز تھا۔ بہرحال اپنا اطمینان کر لینے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ولید پر حد جاری کی اور امارت سے معزول کر دیا۔ اس میں تاخیر ہوئی لیکن کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔

دیکھا جائے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں اپنے چچا زاد بھائیوں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، قثم بن عباس رضی اللہ عنہما کو بصرہ یمن اور مدینہ کا گورنر مقرر کیا اور اپنے بھانجے جعد بن ہبیرہ کو خراسان کا والی بنایا۔ شیخین رضی اللہ عنہما کے بعد ایسے حالات پیدا ہونے لگے تھے کہ ان کے جانشینوں نے اپنے اعتماد کے حاکم مقرر کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ عمال کو دیکھ کر مالک اشتر نخعی اور اس کے ساتھیوں کو مایوسی ہوئی کہ وہ عہدوں سے محروم رہے۔ اشتر نے کہا کہ اگر علی رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کچھ کرنا تھا تو ہم نے خواہ مخواہ اُس بڈھے (عثمان رضی اللہ عنہ) کو قتل کیا۔ آج کل کی ''مہذب'' ترقی یافتہ اور عوامی اعتماد کی حامل ہردلعزیز جمہوری حکومتوں میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ بیٹے، بیٹیاں، بھائی، مائیں، داماد، سسر، بھتیجے وغیرہ حکومت کے مناصب پر فائز کر دیئے جاتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت میں ۱۹۴۷ء سے ایسا ہوتا چلا آرہا ہے نہرو خاندان کے لوگ حکمران ہیں۔ ہمارے ہاں جو گیارہ سال کی آمریت کے بعد جمہوری حکومت آئی ہے وہ بھی ایسی

---

[1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات گھڑنے کا سلسلہ تیسری صدی ہجری تک جاری رہا۔ بنوعباس نے اپنے دور اقتدار میں نیز ایک غالی گروہ نے بنوامیہ کی ضد میں ان کے خلاف متعدد بے بنیاد الزامات وضع کئے بلکہ بدقسمتی سے آج تک یہ سلسلہ جاری معلوم ہوتا ہے۔ مولف

مثالوں سے خالی نہیں۔

یہ اعتراض بھی درست نہیں کہ بزرگ صحابہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی توہین کی گئی۔ واقعہ یہ تھا کہ اول الذکر نے اپنا مرتب کردہ نسخہ قرآن (جس میں ترتیب و تالیف کے اختلاف کے علاوہ آخری دو سورتیں معوذتین شامل نہ تھیں) حکومت کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا جبکہ دوسروں نے اپنے اپنے نسخے حوالے کر دیئے تھے تاکہ انہیں تلف کر کے مصحف صدیقی کی مصدقہ نقول تیار کر کے سب جگہ بھیجی جائیں اور اختلاف قرأت ختم کیا جائے۔ اس لئے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر قدرے سختی کرنا پڑی اور ان کا وظیفہ عارضی طور پر روک دیا گیا جو بعد میں ان کی بیٹیوں کے نام جاری کر دیا گیا۔ کیونکہ خود انہوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے عباس بن عتبہ بن ابی لہب رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا تھا۔ اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان پر حد جاری کی۔ یہ زیادتی اور توہین نہ تھی۔ بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں تحقیقاتی کمیشن کا رکن بنا کر مصر بھیجا تو وہ ابن سبا محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ کے ساتھ مل گئے اور مصر ہی میں رہ گئے یعنی خلیفہ کے خلاف سازش کرنے والوں کا ساتھ دینے لگے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو جلاوطن کرنے کا الزام بھی غلط ہے۔ انہوں نے خود اپنی مرضی سے ربذہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں فوت ہوئے۔ ان کا حال گزشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے بلند اور پختہ مکانات بنوائے۔ اس سے پہلے مسلمانوں میں بلند و بالا پختہ عمارات بنوانے کا رواج نہ تھا۔ عہد عثمانی میں بعض دوسرے مالدار صحابہ نے بھی پختہ مکانات بنوائے۔ شریعت نے اس سے منع نہیں کیا۔ اعتراض فضول تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے چچا حکم بن العاص کو طائف سے مدینہ ضرور بلا لیا تھا اور معترضین کو بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے پہلے اجازت لے لی تھی جس کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم نہ ہو سکا تھا۔ یہی وہ چچا تھا جس نے اسلام قبول کرنے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بڑی بے دردی سے مارا پیٹا تھا مگر عثمان رضی اللہ عنہ نے ترک اسلام نہ کیا۔ چونکہ ان کی صلہ رحمی حد سے بڑھی تھی، انہوں نے اپنے عہد خلافت میں چچا اور اس کی اولاد پر مہربانی کی۔ اپنی صاحب زادی کا نکاح مروان بن الحکم سے کر دیا اور صلہ رحمی کے طور پر اپنے پاس سے اسے ایک لاکھ درہم دیئے اور اپنی صاحب زادی کو بھی جہیز میں ایک لاکھ درہم دیئے۔ بیت المال سے کچھ نہیں دیا۔

یہ الزام بھی غلط ہے کہ مروان بن الحکم کو طرابلس الغرب کے مالِ غنیمت کا خمس دیدیا۔ ابن خلدون کے مطابق مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ مدینہ آیا جو مروان نے پانچ لاکھ دینار میں خرید لیا۔ ہو سکتا ہے یہ رقم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ذاتی مال سے ادا کی ہو یا معاف کر دی ہو جس کا انہیں حق تھا یا مروان نے خود ادا کی۔

خالد بن حکم کو مدینہ کے بازار سے عشر وصول کرنے کا اختیار قطعاً نہیں دیا۔

فاتح افریقیہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو وہاں کے مالِ غنیمت کا خمس بطور انعام دیا تھا لیکن جب لوگوں

نے اعتراض کیا تو اس سے واپس لے لیا اور مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کارِ نمایاں کرنے والوں کو خصوصی انعامات دیا کرتے تھے۔ کبھی کسی نے اعتراض نہ کیا۔ تاریخ میں مثالیں موجود ہیں۔

بیت المال میں بیجا تصرف اور اس کے روپے سے بنوامیہ کو نوازنے کا الزام غلط ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہت مالدار تھے، غنی کہلاتے تھے اور سیر چشم تھے۔ اپنا وظیفہ بھی بیت المال سے نہ لیتے تھے۔ بنوامیہ کو اپنے مال سے دیتے تھے یہ ممکن ہے کہ اپنا وظیفہ بھی انہیں دے دیتے ہوں اور ضرورت پڑنے پر انہیں بیت المال سے قرض بھی دلا دیتے ہوں اور پھر خود ادا کر دیتے ہوں ان کی صلہ رحمی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ مخالفوں نے غلط فہمی یا دانستہ غلط بیانی سے کام لے کر انہیں متہم کیا۔ حضرت عثمان نے مجمع عام میں اپنی پوزیشن واضح کی اور کوئی تردید نہ کر سکا۔ ایک دفعہ فرمایا:

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی صلہ رحمی کرتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا تھا جو ان کے لئے تھیں۔ میں نے انہیں لے لیا اور اپنے قرابتداروں میں تقسیم کر دیا میرے پیشرو سرکاری مال میں اپنی اور اپنے قرابتداروں کی صرف حاجت کا اندازہ کرتے تھے۔ میں اس میں اپنے صلہ رحمی کا اندازہ کرتا ہوں۔ وہ خدا کے خوف سے صلہ رحمی سے بچتے تھے میں خدا کے خوف سے صلہ رحمی کرتا ہوں۔''

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ایک لاکھ درہم دینے کا الزام بھی غلط ہے۔ دراصل ایک دفعہ تقسیم وظائف کے بعد کچھ رقم بچ گئی تھی۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیت المال کے مہتمم تھے۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے یہ رقم مسجد کی توسیع و تعمیر پر خرچ کی۔

جہاں تک کچھ لوگوں کو قطعات اراضی دینے کا تعلق ہے۔ یہ الزام بھی مغالطہ انگیز ہے۔ عراق وغیرہ مفتوحہ ممالک میں جو بنجر اور غیر آباد زمینیں پڑی تھیں۔ وہ حدیث نبوی کے مطابق بعض افراد کو الاٹ کی گئیں کہ متواتر تین سال تک بنجر پڑی رہنے والی زمین کو جو شخص آباد کرے وہ اس کو دے دی جائے۔

حقیقت یہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بنوامیہ اور اپنے دوسرے قریبی افراد کی خاطر بیت المال میں ناجائز دست اندازی نہیں کی نہ کوئی ایسا عوامی پروگرام چلایا جس کے پردے میں کسی کو سرکاری اموال غصب کرنے کا موقع ملتا۔ اگر بنوامیہ کو بیت المال سے دیا بھی تو اپنے حصے کا دیا یا خود بطور قرضہ لے کر دیا اور پھر بیت المال کو لوٹا دیا۔ بہر حال بنوامیہ کے مناصب اور عزل صحابہ کے علاوہ ان کی مالیاتی پالیسی سب سے زیادہ اعتراضات کا ہدف بنی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو موقع بے موقع خواہی نخواہی عطیات وانعامات نہیں دیتے تھے۔ اپنے عزہ واقارب کو تو خاص کر بیت المال سے دور رکھتے تھے۔ لیکن حضرت عثمان کو صلہ رحمی کا خیال رہتا تھا اور اکثر اپنے ذاتی مال سے بنوامیہ کے افراد کی مدد کرتے تھے۔ انہوں نے بیت المال سے کفاف کے طور پر کبھی کچھ نہیں لیا۔ عہد فاروقی میں شرکائے بدر واحد کی طرح ان کا بھی پانچ ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر ہوا لیکن انہوں نے یہ وظیفہ

بھی کبھی نہیں لیا بلکہ بنوامیہ کے حاجت مندوں کو دے دیتے تھے جس کا انہیں حق تھا۔ اموال وعطیات کی تقسیم میں کبھی کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ مگر لوگوں کے سامنے ان کے پیشرووں کا انتہائی محتاط عمل تھا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ بنوامیہ کو اموال دینے کے متعدد واقعات کا ذکر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

''ان روایات سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اقرباء کو روپیہ دینے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ ہرگز شرعی جواز سے متجاوز نہ تھا۔ انہوں نے جو کچھ لیا وہ یا تو صدرِ مملکت کی حیثیت سے اپنے حق الخدمت کے طور پر یا بیت المال سے قرض لے کر دیا جسے وہ ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ یا اپنی صوابدید کے مطابق انہوں نے خمس کا مال تقسیم کیا جس کے لئے کوئی مفصل شرعی ضابطہ موجود نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی طرح وہ بھی اپنے رشتہ داروں کے سوا دوسرے لوگوں کے ساتھ اس نوعیت کی فیاضی برتتے تو کسی کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر خلیفۂ وقت کا خود اپنے رشتہ داروں کے معاملہ میں یہ فیاضی برتنا موضوع تہمت بن گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ نے اسی بناء پر اپنے آپ کو ہر شک وشبہ سے بالاتر رکھنے کی خاطر اپنی ذات پر بھی سختی کی تھی اور اپنے عزیزوں کو بھی ان فیاضیوں سے محروم رکھا تھا جو دوسرے سب لوگوں کے ساتھ برتتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ احتیاط ملحوظ نہ رکھی اور وہ اعتراضات کا ہدف بن گئے۔''[1]

بنوامیہ کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کو چھوڑ کر باقی ہر لحاظ سے ان کا کردار خلیفہ کی حیثیت سے مثالی تھا۔

سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''ان (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کی خلافت میں بحیثیت مجموعی خیر اس قدر غالب تھی اور اسلام کی سربلندی کا اتنا بڑا کام ان کے عہد میں ہو رہا تھا کہ ان کی پالیسی کے اس پہلو (یعنی بنوامیہ پر نوازشات) سے غیر مطمئن ہونے کے باوجود عام مسلمان پوری مملکت میں کسی بھی جگہ ان کے خلاف بغاوت کا خیال تک دل میں لانے کے لئے تیار نہ تھے...... یہی وجہ ہے جو مختصر سا گروہ ان کے خلاف شورش برپا کرنے اٹھا اس نے بغاوت کی دعوت عام دینے کی بجائے سازش کا راستہ اختیار کیا۔''[2]

ایام محاصرہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر کے دوران میں اپنی اقربا پروری اور صلہ رحمی کی یوں وضاحت کی:

''لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے اہل خاندان سے محبت کرتا ہوں اور ان کے ساتھ فیاضی کرتا ہوں۔ لیکن میری محبت نے مجھے ظلم پر مائل نہیں کیا بلکہ میں صرف واجبی حقوق ادا کرتا ہوں۔ اور اسی طرح فیاضی

[1] خلافت وملوکیت صفحہ ۳۲۸

[2] ایضاً صفحہ ۱۱۷

بھی میرے اپنے مال تک محدود ہے۔ مسلمانوں کا مال نہ میں اپنے لئے حلال سمجھتا ہوں نہ کسی دوسرے کے لئے۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اپنے مال سے گرانقدر عطیئے دیتا تھا حالانکہ اس زمانے میں میں بخیل وحریص تھا۔ اب جبکہ میں اپنی خاندانی عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ زندگی ختم ہو چکی ہے اور اپنا تمام سرمایہ اپنے اہل وعیال کے سپرد کر دیا ہے تو ملحدین ایسی باتیں مشہور کرتے ہیں۔ میں نے کسی شہر پر خراج کا کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالا کہ اس قسم کا الزام دینا جائز ہو اور جو کچھ وصول ہوا وہ ان ہی لوگوں کے رفاہ و بہبود پر صرف ہوا، میرے پاس صرف خمس آتا ہے اور اس میں سے بھی میرے لئے کچھ لینا جائز نہیں۔ مسلمانوں نے اس کو میرے مشورے کے بغیر مستحقین میں صرف کیا۔ خدا کے مال میں ایک پیسہ کا تصرف نہیں کیا جاتا۔ میں اس سے کچھ نہیں لیتا ہوں۔ یہاں تک کہ کھاتا بھی ہوں تو اپنے ہی مال سے۔''

عمر ابوالنصر نے لکھا کہ ''اگرچہ ہمیں اس امر سے انکار نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے اعزہ واقارب سے بہت محبت تھی اور آپ ان سے احسان کا سلوک کرتے، ان کو ملک کی خدمت کے لئے مواقع بہم پہنچاتے رہے تھے لیکن یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے بلادِ اسلامیہ میں بغاوت پھیلانا، مدینہ پر حملہ کرنا اور خلیفہ کو شہید کرنا جائز سمجھا جائے۔''

باغیوں کو اس پر بھی اعتراض تھا کہ اہل مدینہ کو بیت المال سے عطیات کیوں دیئے جاتے ہیں کیونکہ مالِ غنیمت ان لوگوں کا حق ہے جنہوں نے جہاد کیا ہو یا بوڑھے صحابہ کرام۔ عطیات کا سلسلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مشورہ سے شروع کیا تھا نہ کہ حضرت عثمان نے۔ پھر مالِ غنیمت کے علاوہ کئی دوسرے قسم کے اموال بھی آنے لگے تھے جو صرف مجاہدین کے لئے نہ تھے۔ مثلاً جزیہ، عشر، خراج، عشور وغیرہ ان میں ہر مسلمان بلکہ محتاج ومعذور ذمیوں کا بھی حصہ تھا۔

بقیع کو سرکاری چراگاہ بنا لینے پر اعتراض اگر کرتے تو اہل مدینہ کو شاید اس کا حق ہوتا لیکن تعجب ہے کہ یہ اعتراض مصر، کوفہ اور بصرہ کے باغیوں نے کیا۔ یہ چراگاہ بیت المال کے جانوروں کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی اور عوام کو اس میں اپنے جانور چرانے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ سرکاری جانوروں کی کثرت کی وجہ سے لوگوں کے پرائیویٹ جانوروں کے لئے گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ خلیفہ کا حکم غلط نہ تھا۔

تدوین واشاعت قرآن کا جو کام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا وہ ان کا ایک عظیم اور شاندار کارنامہ تھا لیکن باغی گروہ نے اسے بھی اعتراض کا ہدف بنایا مشہور صحابی حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے عراق وایران کے مفتوحہ علاقوں میں لوگوں۔ بدوی قبائلیوں اور عجمی نومسلموں۔ کو قرأت پر جھگڑتے دیکھا تھا نیز بصرہ، کوفہ، مصر، دمشق وغیرہ کے لوگ اپنے ہاں کے قاری کی قرأت کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مستند سمجھتے تھے اور اسی کا تتبع کرتے تھے۔ ہر عرب قبیلے کی اپنی الگ الگ قرأت تھی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے خطرہ کی گھنٹی سمجھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو

ادھر متوجہ کیا اور مشورہ دیا کہ لوگوں کو ایک قرأت پر متفق کیا جائے اور قرآن کو ایک معیاری مصحف کی شکل میں تیار کر کے مختلف اسلامی مراکز میں بھیجا جائے تا کہ اختلافات ختم ہوں۔ چونکہ قرآن مجید قریش کی قرأت پر نازل ہوا تھا۔ اس لئے قریش کی معیاری قرأت وتلفظ کو مدنظر رکھ کر نقول تیار کرائی گئیں اور کوفہ، بصرہ، دمشق، فسطاط وغیرہ اہم مراکز میں بھجوادی گئیں اور آئندہ کو ہمیشہ کے لئے اختلافِ قرأت وتلفظ اور ترتیب سور کا سدباب کر دیا گیا۔ چونکہ باغی زیادہ تر بدوی قبائل اور عجمی نومسلموں میں سے تھے اور ان کی اپنی اپنی قرأت تھی انہیں عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ سنہری اور مہتم بالشان خدمت اسلام بھی پسند نہ آئی۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان کے سامنے کسی نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے فرمایا کہ "چپ رہو۔ عثمان نے سب کچھ ہمارے مشورے سے کیا۔ اگر مجھے یہ کام کرنا پڑتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔" جمع واشاعت قرآن کے باب میں مفصل لکھا جا چکا ہے۔

اسی طرح باغیوں نے دین کے بارے میں بعض "بدعات" کا بھی الزام لگایا۔ بدوی قبائل اور نومسلم عجمی عثمان رضی اللہ عنہ پر بدعات کا الزام لگائیں تعجب کی بات ہے، مثلاً ایک الزام یہ تھا کہ حج کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرفات اور منیٰ میں دورکعت کی بجائے چار رکعت نماز پڑھائی۔ انہوں نے جواب دیا کہ چونکہ میں نے مکہ میں مقیم ہونے کا ارادہ کر لیا تھا اس لئے چار رکعت پڑھائی۔ بہرحال "بدعات" کا الزام یا الزامات محض کچھ مزید کیچڑ اچھالنے والی بات تھی کہ شاید چپک جائے۔ جیسا کہ آج کی جدید جمہوریتوں اور آمریتوں میں "مہذب اور تعلیم یافتہ" افراد اسمبلیوں میں بیٹھ کر بڑی ڈھٹائی اور مہارت سے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔ مصری وفد سے "بدعہدی" کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔ دیکھا جائے تو یہ "بدعہدی" خود مصری وفد کی جانب سے سرزد ہوئی کہ وہ کوفہ اور بصرہ کے وفود سے سازش کر کے مدینہ سے اپنے مطالبات منوا کر واپس روانہ ہوا اور پھر تینوں وفود ایک ساتھ اچانک مدینہ واپس پہنچ گئے حالانکہ وہ اپنی الگ الگ راہوں پر روانہ ہوئے تھے۔ واپس آکر انہوں نے خلیفہ کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور اہل مدینہ بے بس ہو کر رہ گئے۔ باقی مطالبات کو چھوڑ کر انہوں نے خلیفہ کی ذات کو ہدف مطالبہ بنا لیا کہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں ورنہ انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی متفقہ جانشین ان کے مدنظر نہ تھا۔

دراصل تمام الزامات میں سے بڑا اور ٹھوس الزام اقربا نوازی یعنی بنوامیہ پر نوازشات تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا صلہ رحمی کے بارے میں شرعی اور منطقی استدلال مخالفوں کو مطمئن نہ کر سکا۔ معاشرہ میں معاشی، انتظامی، سیاسی اور فکری تغیرات رونما ہونے لگے تھے۔ حضرت عثمان اور ان کے عمال نے ان کا کوئی خاص اور بروقت نوٹس نہ لیا اور یہی سمجھا کہ "سب ٹھیک ہے۔" ابن سبا نے معاشی، انتظامی اور سیاسی بے چینی میں نئے عقائد ونظریات کا اضافہ کر دیا اور سب کا ایک ملغوبہ تیار کر لیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات اور مطالبات میں ابن سبا کے نئے مذہبی افکار وعقائد کا کوئی ذکر نہیں ملتا کیونکہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کے عقائد ونظریات نہ تھے بلکہ ابن سبا اور اس کے محدود گروہ کے تھے۔ اگر اس نے مسلمانوں کی اکثریت کے سامنے ان کا اظہار کیا ہوتا تو شاید اسے جان سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ وہ ان کی خفیہ تبلیغ کرتا رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی خلافت کے زمانے میں جب ان کا علم ہوا تو وہ سخت برافروختہ ہوئے اور ابن سبا کو قتل کرا دینا چاہا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت علی

نے اسے جلوادیا اور بعض کہتے ہیں کہ ساباط (مدائن) کی طرح جلاوطن کردیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے احکام شریعت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا لیکن کھلے اور چھپے دشمنوں کی سازشیں، ریشہ دوانیاں، مفتوحہ زمینوں اور جائیدادوں کی تقسیم وفروخت اور تبادلے، عمال کے تقرر، بعض نادان دوستوں کی غلط کارروائیاں، باہمی رقابتیں، جاہ ومناصب کی ہوس، نئی نسل اور غیر عرب نومسلموں، موالیوں کی دینی واخلاقی کمزوریاں، قدیم قومی، نسلی اور لسانی عصبیتیں اور غیر مسلم عناصر کے انتقامی جذبات ایک فتنہ عظیم کا باعث بن گئے۔ اس طرح عالم اسلام کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا اندرونی المیہ ظہور میں آیا۔ فتنہ وفساد کی ایک ایسی آگ بھڑک اٹھی جس کے شعلے عمر رسیدہ، نیک نہاد، نیک نیت، پارسا اور نرم مزاج خلیفہ کے خون سے بھی نہ بجھ سکے۔ عمر ابوالنصر نے لکھا ہے کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف قوم کو اسی لئے جرأت ہوئی کہ آپ میں حد درجہ نرمی تھی۔ نیز بڑھاپے کی کمزوری اور بعض ایسی باتوں نے جن کو آپ سے پہلے خلفا نہیں کیا کرتے تھے، جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔'' لیکن اس کا یہ کہنا درست نہیں کہ قوم آپ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ بغاوت کرنے والے مصری، کوفی اور بصری سازشیوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہ تھی، اور نہ وہ اپنے اپنے صوبوں کے نمائندے تھے۔ تاہم بے اطمینانی کی زیر زمین لہر موجود تھی، ابن سبا کے خفیہ پراپیگنڈا اور بزرگ صحابہ کی طرف سے لکھے گئے جعلی خطوط نے اسے تقویت پہنچائی۔ حلیم الطبع عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے وظائف بڑھائے، بہت سے عوامی رفاہی کام کئے اور لوگوں کو متعدد دوسری سہولتیں دیں۔ انہیں ایرانی سلطنت کے مابقی اور مصر سے آگے شمال مغربی افریقہ کے دوسرے ممالک فتح کرنے کے لئے جہاد میں مصروف کردیا۔ وقتی طور پر لوگوں کی توجہ اندرونی مسائل سے ہٹ گئی۔ لیکن کوفہ، بصرہ اور مصر میں بعض ایسے شرپسند عناصر موجود تھے جو جہاد پر جانے کی بجائے چھاؤنیوں میں رہتے ہوئے یا جہاد پر جانے کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے عمال کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ کرتے تھے۔ گھروں اور مجلسوں میں حکومت کے خلاف باتیں ہوتی تھیں۔ دور دراز جنگی مہمات کی وجہ سے سرکردہ اور بااثر قبائلی سردار اور فوجی افسر چھاؤنیوں سے باہر تھے اور چھاؤنیوں میں موجود رہ جانے والے مفسدوں کو شرانگیزی کی کھلی چھٹی مل گئی تھی۔

چونکہ حضرت عثمان کے انتخاب میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا اس لئے احساسِ ذمہ داری کے تحت وہ اموی اعمال کی بے قاعدگیوں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقربا نوازی پر کڑھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک اعلیٰ نسل کا اونٹ زکوٰۃ میں آیا جو خلیفہ نے اپنے کسی رشتہ دار کو بخش دیا۔ حضرت ابن عوف کو معلوم ہوا تو انہوں نے وہ اونٹ پکڑ لیا اور ذبح کر کے گوشت غربا میں تقسیم کردیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ اس طرح حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے احکام کی کھلی خلاف ورزی کی پہلی مثال قائم کی جس سے شرپسندوں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور لوگوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ خلیفہ نے اپنے پیشروؤں کی سنت سے قدرے انحراف شروع کردیا ہے۔ بہرحال حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ شورش کے زور پکڑنے سے پہلے فوت ہوگئے۔ ورنہ ممکن تھا کہ اس کے دبانے میں ایک دفعہ پھر تاریخی کردار ادا کرتے۔ اگرچہ مخالفین کا یہ بھی کہنا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہی نے

''غلط'' انتخاب کر کے فتنہ وشورش کی بنیاد رکھی۔ لوگ وقتاً فوقتاً مجلس شوریٰ اور عشرہ مبشرہ کے بقیہ صحابہ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس بھی شکایتیں لے کر آتے اور سازشیوں کی خفیہ خط و کتابت، نقل وحرکت اور ریشہ دوانیوں سے بھی مطلع کرتے۔ یہ اکابر صحابہ خلیفہ کو توجہ دلاتے۔ وہ اصلاحی اقدامات کا مخلصانہ وعدہ بھی کرتے مگر مروان بن الحکم اور دوسرے بنی امیہ برعکس مشورے دے کر بے عملی اور تعطل کو برقرار رکھتے۔ مفسدوں کی مرضی کے مطابق گورنروں کے ردو بدل سے صورت حال بہتر ہونے کی بجائے شر انگیزی میں اضافہ ہی ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مفسدوں کے مطالبات پورا کرنے اور ان کو نرمی سے سمجھانے اور مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ وہ پہلا جابر اور خونریز خلیفہ نہیں بننا چاہتے تھے۔ لیکن مفسدوں نے ان کی نرمی کا غلط فائدہ اٹھایا اور وہ ان کے خلاف دلیر ہو گئے۔ گورنروں کے عزل ونصب کے سلسلے میں اس بارے میں لکھا جا چکا ہے۔

مجلس شوریٰ کا تعطل

ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مجلس شوریٰ ایک اہم اور فعال ادارہ تھا اور اس میں تمام فیصلے باہمی مشورے سے کیے جاتے تھے، لیکن عہد عثمانی میں شورائی نظام ڈھیلا پڑ گیا۔ آخری زمانے کے بحران میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ وغیرہ اکابر صحابہ سے مشورے کیے لیکن ان پر عمل نہ ہو سکا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ ''میں معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں اور مروان ان کو پھر بگاڑ دیتا ہے۔ آپ خود منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مطمئن کر دیتے ہیں اور آپ کے جانے کے بعد آپ کے دروازے پر کھڑا ہو کر مروان لوگوں کو گالیاں دیتا ہے اور آگ پھر بھڑک اٹھتی ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ بھی حضرت عثمان کی بعض پالیسیوں سے غیر مطمئن تھے لیکن وہ پرامن طریقے سے اصلاح چاہتے تھے۔ وہ خلیفہ کے دشمن ہرگز نہ تھے۔

کوفی وفد

کوفہ کے شر پسندوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے گفت وشنید کے لئے اپنے نمائندے بھیجے۔ انہوں نے خلیفہ کو کھلم کھلا دھمکی دی کہ ''آپ سنگین کاموں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اللہ سے ڈریں، توبہ کریں اور ان کاموں سے پرہیز کریں ورنہ اللہ آپ کی گھات میں ہے۔'' سربراہِ مملکت نے ان کی دھمکیوں کو صبر و تحمل سے سنا۔ لیکن ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ حالانکہ نظم ونسق کے مفاد میں وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہوتے۔ بہر حال اصلاحِ حال کا وعدہ کیا لیکن رشتہ داروں کے ساتھ ان کی فیاضی، صلہ رحمی اور عطائے مناصب کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کی مالی اور انتظامی پالیسی پر اعتراضات شدت اختیار کرتے گئے اور مبالغہ آمیزی اور افترا پردازی سے خلیفہ کے خلاف ''فرد جرم'' کو نہایت بدنما اور مکروہ بنانے کی پوری کوشش کی گئی۔ شورش اور فتنہ وفساد کے طوفانی بادل گھرے اور تاریک ہوتے گئے۔

اصلاحِ حالات کی کوشش

عمال سے مشورہ

شر پسندوں اور سازشیوں کی سرگرمیوں، خفیہ خط وکتابت اور مخالفانہ پراپیگنڈہ کی خبریں جب پے در پے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک پہنچنے لگیں تو انہوں نے مصر، شام، کوفہ اور بصرہ کے گورنروں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عامر کو مدینہ طلب کیا اور مقامی طور پر سابق گورنر مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے اکابر صحابہ کو بھی بلایا تا کہ امورِ مملکت میں ان سے مشورہ کریں اور لوگوں کی شکایات و مطالبات پر غور کر کے اصلاح حال کے لئے مناسب اقدامات کئے جائیں۔ عمال نے مختلف مشورے دیئے۔

عبداللہ بن عامر (گورنر بصرہ) نے مشورہ دیا کہ لوگوں کو سرحدات پر دشمنوں کے خلاف جہاد و قتال میں لگا دیا جائے اور مسلسل مصروف رکھا جائے تا کہ انہیں فضول اور فتنہ انگیز باتیں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ ان کی توجہ ہٹ جائے اور وہ خلیفہ کے خلاف غلط افواہیں اڑانے سے باز رہیں۔

سعید بن العاص نے کہا کہ سارا شور و شر چند مفسدوں کی وجہ سے ہے۔ نظم ونسق کے مفاد میں ان کے سرغنوں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے۔ دوسرے خود بخود دب جائیں گے۔

عبداللہ بن ابی سرح کا خیال تھا کہ شر پسند حریص اور زر پرست افراد ہیں۔ بیت المال سے عطیات دے کر ان کے منہ بند کر دیئے جائیں۔ اس طرح وہ خود بخود خلیفہ کے مطیع اور حامی ہو جائیں گے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہر عامل کو اپنے اپنے صوبے میں امن وامان قائم رکھنے کا ذمہ دار قرار دیا جائے میں خود اپنے صوبے میں امن وامان کی ذمہ داری لیتا ہوں۔

عبداللہ ابن سبا کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا حالانکہ فتنہ وفساد کا اگر اصل نہیں تو بڑا سرچشمہ وہی تھا۔

اپنی جگہ ہر تجویز معقول تھی، خاص کر عبداللہ بن عامر اور سعید بن العاص کی تجاویز بہت عملی اور فوری قسم کی تھیں اور ان سے سازشیوں کا خاتمہ ممکن تھا۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی فطری نرم طبعی کی وجہ سے ان پر عمل نہ کیا بلکہ مفسدوں کے مطالبات حتی الوسع پورے کر کے انہیں فتنہ وشر سے باز رکھنا چاہا لیکن اس نرم پالیسی کا الٹا اثر ہوا۔ مطالبات بڑھتے گئے اور سازش کے تانے بانے پھیلتے گئے۔

کوئی متفقہ تعمیری، اصلاحی اور تعزیری پروگرام مرتب نہ ہو سکا۔ گورنروں کی کانفرنس تقریباً بے نتیجہ رہی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے گورنروں کو ہدایت کی کہ وہ لوگوں پر سختی سے کنٹرول کریں اور فوجی مہمات میں مشغول رکھیں۔

مفسدوں اور باغیانہ ذہن کے افراد کے وظیفے بند کر دیئے جائیں تا کہ ان کے دماغ درست ہو جائیں اور وہ امن پسندی اختیار کریں۔

لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور مخالفت شدت پکڑتی گئی، خود مدینہ میں لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر

اعتراض کرنے لگے کیونکہ مفسدوں کے جعلی خطوط سے وہ بھی متاثر ہونے لگے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشورہ

جب مخالفت اور شورش بڑھ گئی تو بزرگ انصار صحابہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، ابواسید ساعدی رضی اللہ عنہ، کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اکٹھے ہو کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ صورت حال کی فوری اصلاح کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر زور دیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر حسب ذیل تقریر کی:

"بخدا میں نہیں جانتا کہ آپ سے کیا کہوں۔ میں کوئی ایسی بات نہیں جانتا جس کی آپ کو خبر نہ ہو۔ میں کوئی ایسا امر نہیں بتلا سکتا جس سے آپ واقف نہ ہوں۔ جتنا علم آپ کو ہے اتنا ہی علم ہم کو ہے۔ ہم کو آپ پر کسی شے میں سبقت نہیں جس کی خبر آپ کو دے سکیں ہم نے آپ سے علیحدہ کچھ نہیں سیکھا جس کی اب تبلیغ کر سکیں۔ جو کچھ ہم نے دیکھا وہ آپ نے دیکھا جو کچھ ہم نے سنا وہ آپ نے سنا۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے جیسا کہ ہم رہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ آپ سے افضل نہ تھے۔ آپ ان دونوں سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری رکھتے ہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا داماد ہونے کا شرف حاصل ہے جو ان دونوں کو نہ تھا۔ کسی امر میں ان کو آپ پر تقدم حاصل نہیں۔

آپ ان سے زیادہ تقدم بالحق کے مستحق ہیں۔ خدا کے واسطے اپنے معاملے پر غور کیجئے۔ بخدا آپ بے بصیرت، کم سمجھ اور نادان نہیں۔ راستہ بالکل کھلا اور صاف ہے۔ اللہ کے بندوں میں عدل و انصاف کرنے والا وہ حاکم افضل ہے جو خود ہدائت یافتہ ہو اور دوسروں کی رہنمائی بھی کرے۔ بدتریں انسان وہ ظالم حاکم ہے جو خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو گمراہ کرے۔

اے عثمان! میں آپ کو اللہ کی سطوت اور انتقام کا خوف دلاتا ہوں کیونکہ اللہ کا عذاب نہایت شدید اور دردناک ہوتا ہے۔ میں آپ کو اس بات سے بھی ڈراتا ہوں کہ کہیں آپ اس امت کے ایسے شہید حاکم نہ بن جائیں جس کی شہادت سے روز قیامت تک قتل و غارت کا دروازہ کھل جائے اور پھر واقعات و حوادث اس طرح مشتبہ ہو جائیں کہ مسلمان گروہ بندیوں میں بٹ جائیں[1] اور باطل کے غلبہ کی وجہ سے حق کو نہ دیکھ سکیں اور ان باتوں میں وہ بری طرح ملوث ہو جائیں گے کہ انہیں ان سے الگ کرنا مشکل ہو جائے گا۔"[2]

---

[1] افسوس کہ ایسا ہو کر رہا۔ مولف

[2] تاریخ طبری جلد سوم (خلافت راشدہ حصہ دوم) "تاریخ اسلام جلد اول" (عہد رسالت و خلافت راشدہ) از شاہ معین الدین ندوی۔ "عشرہ مبشرہ" از قاضی حبیب الرحمٰن۔ نہج البلاغہ مطبوعہ تبریز ۱۲۶۷ھ صفحہ ۱۲۵۔ نیز "نیرنگ فصاحت" اردو ترجمہ نہج البلاغہ از سید ذاکر حسین اثناعشری مطبوعہ مطبع یوسفی۔ دہلی۔

اس کے بعد اموی عمال کے بارے میں باہم سوال و جواب ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے رشتہ دار عمال کا دفاع کیا اور فرمایا کہ جن لوگوں کو میں نے عہدوں پر مامور کیا ہے۔ انہیں عمر رضی اللہ عنہ نے بھی عہدے دیئے تھے پھر مجھ پر ہی اعتراض کیوں؟ کیا عمر رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو گورنر مقرر نہیں کیا تھا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''عمر رضی اللہ عنہ جس کسی کو حاکم مقرر کرتے تھے اس کے اعمال کی متواتر نگرانی کرتے تھے اور اگر اس کے متعلق کوئی قابل اعتراض بات معلوم ہوتی تھی تو فوراً کڑی گرفت کرتے تھے لیکن آپ اپنے رشتہ دار عہدیداروں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ بے شک عمر رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو گورنر مقرر کیا تھا لیکن عمر رضی اللہ عنہ کا غلام یرفاء بھی ان سے اتنا نہیں ڈرتا تھا جتنا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ ڈرتے تھے اور اب یہ کیفیت ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے پوچھے بغیر من مانی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خلیفہ کا حکم ہے اور آپ ان کا محاسبہ نہیں کرتے۔''

گفتگو بے نتیجہ رہی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھ کر چلے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے اور منبر پر بیٹھ کر لوگوں سے یوں خطاب کیا۔

''اس امت کے لئے باعث مصیبت وہ نکتہ چیں اور طعن و تشنیع کرنے والے لوگ ہیں جو دیکھنے میں اچھے معلوم ہوں گے مگر ان کی پوشیدہ باتیں تمہیں ناگوار معلوم ہوں گی اور وہ تمہاری تکالیف اور مصائب پر خوش ہوں گے۔ وہ اس کے پیچھے لگ جائیں گے جو زور سے چیخے چلائے گا اور ناحق شور مچائے گا۔ دیکھو بخدا! تم نے ایسی باتوں پر نکتہ چینی کی ہے جن کی تم عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تائید کر چکے ہو حالانکہ انہوں نے تمہیں اپنے پاؤں سے روندا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے مارا اور اپنی زبان سے تمہاری خبر لی تھی۔ مگر تم ان کے مطیع و فرمانبردار رہے۔ اس کے برخلاف میں تمہارے ساتھ نرم رہا۔[1]

تمہارے سامنے سر جھکایا مگر تم مجھ پر دلیر ہوتے گئے تم نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے اخلاق و عادات اور لب و لہجہ کو تبدیل کروں جسے میں اچھا نہیں سمجھتا۔ تم اپنی زبانوں کو روکو اور اپنے حکام پر طعن و تشنیع اور ان کی عیب جوئی بند کرو۔ کیونکہ میں نے ان لوگوں کو روک رکھا ہے جو ہر وقت میری مدد کے لئے مستعد ہیں۔ وہ تم سے ایسا سلوک کریں گے جو تم کو مطمئن کردے گا آگاہ ہو جاؤ کہ تمہاری کوئی حق تلفی نہیں ہوگی۔ میں نے لوگوں کے حقوق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ میں نے اپنا مال بخشش اور سخاوت میں صرف کر دیا ہے۔ کیونکہ میں کس کام کا خلیفہ ہوں گا اگر میں نے لوگوں میں مال تقسیم نہیں کیا۔''

---

[1] طبری، ندوی اور قاضی حبیب الرحمن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تقریر کا جو متن یا اردو ترجمہ دیا ہے اس میں یہی ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل نہ تھے۔ البتہ سید ذاکر حسین نے نیرنگ فصاحت میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''ابن خطاب (عمر رضی اللہ عنہ) اور ابن ابی قحافہ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) عمل حق میں آپ سے اولیٰ اور افضل ہیں۔ رسول اللہ سے از روئے وصلت و خویشی بہ نسبت ان دونوں کے آپ قریب تر ہیں۔ مولف

اس کے بعد مروان بطور خود اٹھ کھڑا ہوا اور حاضرین کو یہ کہہ کر دھمکایا کہ ''اگر تم چاہو تو ہم تمہارے اور اپنے درمیان تلوار کے ذریعے فیصلہ کروا سکتے ہو۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے ڈانٹا اور فرمایا کہ ''تم خاموش رہو۔ تم مجھے میرے ساتھیوں کے ساتھ چھوڑ دو۔ تم کیسی گفتگو کر رہے ہو؟ کیا میں نے تم سے نہیں کہہ رکھا کہ تم بیچ میں نہ بولا کرو۔''[1]

مروان کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ بنی امیہ کو بحیثیت ایک فریق سمجھتا تھا اور بقیہ مسلمانوں کو دوسرا فریق۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی محولہ بالا تقریر غالباً ان کے کیریئر کی سخت ترین تقریر تھی۔ جس میں اپنے احکام اور کارروائیوں کے جواز کے لئے اموی عمال کا دفاع بھی تھا اور غیر مطمئن اور شر پسند عناصر کے لئے انتباہ بھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس پر تعجب اور غصہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جن کارروائیوں کو لوگ بطیب خاطر برداشت کرتے رہے۔ انہی کا صدور ان کی اپنی جانب سے کیوں برداشت نہیں کرتے؟ اس کا جواب حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی گفتگو میں دے چکے تھے۔ زمانہ اور حالات بدل چکے تھے۔ دریا کے پل کے نیچے سے بہت پانی گزر چکا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے طبائع اور طریق کار کے فرق کے علاوہ اب رعایا بھی پہلی سی رعایا نہیں رہی تھی اور شر پسند عناصر غلط پراپیگنڈہ سے اسے شب و روز بھڑکانے میں لگے تھے۔ اکابر صحابہ کی مجلس شوریٰ عضو معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ خلیفہ کے پاس عوام کے حالات و شکایات کی صحیح نمائندگی کرنے اور اصلاح کی مخلصانہ کوشش کرنے اور فتنہ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی راہ روکنے والے اکابر صحابہ ہی ہو سکتے تھے مگر وہ غیر موثر ہو کر رہ گئے تھے۔

بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقریر کا کوئی خاص مثبت اثر سامعین پر نہ ہوا۔ بے چینی اور بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ فضا مسموم ہوتی گئی۔ ۳۴ھ کے آخر تک حالات خاصے تشویش ناک ہو گئے۔

تحقیقاتی کمیشن

۳۵ھ میں اہل مدینہ کے صلاح مشورے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تا کہ وہ مختلف صوبوں، علاقوں کا دورہ کر کے حالات کی تحقیقات کرے اور خلیفہ کو اپنی رپورٹ پیش کرے۔ کوفہ، بصرہ، مصر اور شام میں بالترتیب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو بھیجا گیا۔ یہی چار بڑے مرکز تھے ان کے علاوہ بعض دوسرے علاقوں میں بھی تحقیقاتی نمائندے روانہ کئے گئے۔ ان حضرات نے اپنے اپنے نامزد علاقوں، شہروں میں جا کر وہاں کے کہ ومہ سے مل کر حالات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کی۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے سوا باقی بزرگوں نے یہ رپورٹ دی کہ ''ہم نے وہاں کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہیں دیکھی اور نہ وہاں کے خواص و عوام کو کسی ناخوشگوار معاملے کا علم ہے۔ مسلمانوں کو اپنے معاملات پر اختیار حاصل ہے۔ ان کے حکام ان کے درمیان عدل و انصاف کرتے اور ان کی خبر گیری رکھتے ہیں۔'' اموی عمال کے لئے یہ ایک عظیم سرٹیفکیٹ تھا۔ البتہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جو بہت سادہ دل ہونے کے علاوہ بہت عمر رسیدہ بھی تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کچھ ذاتی بنا پر آزردہ خاطر بھی۔ زیر زمین کام کرنے والے ابن سبا

---

[1] تاریخ طبری جلد سوم (خلافت راشدہ حصہ دوم)

اوراس کے ساتھیوں کی غلط اور چکنی چپڑی باتوں میں آ کر ان کے نہ صرف ہم نوا بن گئے بلکہ وہیں رہ گئے۔ مصر ابن سبا کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہاں اس کا پراپیگنڈہ بہت تیز تھا۔ عمار رضی اللہ عنہ حقیقت حال کو نہ پا سکے۔ ابن سودا اور اس کے ساتھی خالد بن ملجم، سودان بن حمران اور کنانہ بن بشر نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی صحابیت، سبقت فی الاسلام اور کبر سنی کو اپنے تخریبی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ہوا خواہوں نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ اگر چہ اوپر کی سطح اکثر و بیشتر پرسکون ہے لیکن زیر سطح کچھ اضطراب کی لہریں پائی جاتی ہیں۔ تخریب کار عناصر ہمیشہ زیر زمین رہ کر ہی کام کرتے ہیں وہ تو سطح پر اس وقت نمایاں ہوتے ہیں جب سمجھتے ہیں کہ کھلم کھلا وار کرنے کے لئے زمین پوری طرح ہموار ہو چکی ہے۔ کوفہ، بصرہ اور مصر کے سازشی عناصر تحقیقات کنندگان کے سامنے کیوں پیش ہونے لگے تھے؟ تحقیقاتی کمیشن ان کی زیر زمین تخریبی کارروائیوں کا پتہ نہ چلا سکا۔ عامتہ الناس کو کوئی شکایت نہ تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اعلان عام

خلیفہ ثالث تحقیقاتی کمیشن کے ارکان کی تسلی بخش رپورٹوں پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھ گئے۔ انہوں نے تمام اسلامی مراکز میں یہ اعلان عام کرایا کہ ''میں نے عمال حکومت کے لئے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ وہ ہر سال حج کے موقع پر مجھ سے ملاقات کریں اور اپنے اعمال کی جوابدہی کریں۔ جب سے خلافت کی ذمہ داری میرے سر پر ڈالی گئی ہے میں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا اصول کار بنایا ہے۔ میرے اور میرے عمال کے سامنے جو معاملات پیش کئے جاتے ہیں ان کی کما حقہ انجام دہی اور لوگوں کی شکایات کا تدارک میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں رعایا کے حقوق کو اپنے اہل و عیال کے حقوق پر مقدم سمجھتا ہوں۔ بیت المال میں رعایا کا حق ہے۔ اگر کسی کی حق تلفی ہوئی یا اس سے زیادتی کی گئی ہو تو وہ حج کے موقع پر آ کر مجھ سے اور میرے عمال سے اپنا حق طلب کرے اور اگر معاف کر دے تو اللہ معاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور جزائے خیر دے گا۔''

یہ خط نما اعلان ایسا اثر انگیز تھا کہ لوگ پڑھ سن کر روئے اور خلیفہ کے حق میں دعا کی۔ تاہم دور اندیش افراد کو اس میں ملی مصیبت کے آثار نظر آئے۔

عمال سے آخری مشورہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اعلان عام ہی پر بس نہ کی بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنے تمام عمال کو حج (۳۴ھ) کے موقع پر طلب کیا۔ چنانچہ حج کے بعد سب مدینہ حاضر ہوئے۔ ان کے علاوہ سعید بن العاص (سابق گورنر کوفہ) اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ (سابق گورنر مصر) بھی اس کانفرنس میں شامل ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے گورنروں سے پوچھا کہ یہ شکایتیں اور افواہیں کیسی ہیں جو بار بار میرے کانوں تک پہنچ رہی ہیں؟ مجھے خوف ہے کہ کہیں یہ سچ نہ ہوں۔ کیا یہ سب باتیں میری اور تمہاری وجہ سے ہو رہی ہیں؟ گورنروں نے جواب دیا کہ ''امیر المومنین! آپ اپنے قابل اعتماد نمائندوں کے ذریعے افواہوں کی تحقیقات کرا چکے ہیں اور ان کے تحقیقاتی بیانات بھی آپ تک پہنچ چکے ہیں۔

وہ لوگوں سے آزادانہ ملے جلے، ان کے سامنے کسی نے کوئی شکایت پیش نہیں کی۔ یہ تمام غلط اور بے بنیاد افواہیں مفسدوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ان کی بنیاد پر کسی سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔آپ کے اعلان عام کے باوجود بھی کوئی شکایت کنندہ، کوئی فریادی اور حق طلب آپ کے سامنے پیش نہیں ہوا۔'' اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حاضر عمال سے مشورہ طلب کیا۔سعید بن العاص نے کہا کہ یہ فریب اور سازش کا تانا بانا ہے۔سازشیوں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے۔افواہ سازی کا کارخانہ بند ہو جائے گا۔ابن ابی سرح نے مشورہ دیا کہ جب آپ لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں تو ان سے بھی ان کے فرائض کی ادائیگی کا مطالبہ کریں۔یک طرفہ ٹریفک کسی طرح بھی مناسب نہیں۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے علاقے میں ہر طرح امن و امان ہے۔ادھر سے آپ کو کوئی ناخوشگوار اور فتنہ انگیز خبر نہ ملے گی۔عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ نے لوگوں کو عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے زیادہ عطیات و وظائف دینے شروع کر دیئے ہیں۔آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی طرح سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نرمی اختیار کیجئے۔آپ نے سازشیوں اور مخلصوں کے ساتھ ایک ہی جیسا نرم رویہ اختیار کر رکھا ہے۔''

حضرت عثمان کے اعلان عام کے باوجود بھی اس موقع پر لوگ شکایات لے کر پیش نہیں ہوئے۔

موجودہ اور سابق عمال کے مختلف مشورے سن چکنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''ہر کام کے انجام دینے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ہر ہونے والے واقعہ کا ایک دروازہ ہوتا ہے جس سے وہ آتا ہے۔اس امت کے لئے جس حادثہ کا اندیشہ ہے وہ آ کر رہے گا۔اگر اس کا دروازہ بند بھی کر دیا جائے تو وہ بزور کھول دیا جائے گا۔میں اسے نرمی، موافقت اور اطاعت کے ذریعے بند رکھنے کی کوشش کروں گا۔البتہ اللہ کے حدود و قوانین کی حفاظت کروں گا اور اس معاملے میں کوئی نرمی نہ برتوں گا۔میں نے لوگوں کی بھلائی میں کسی قسم کی کوتاہی اور غفلت نہیں برتی۔تاہم فتنہ و فساد کی چکی گردش میں آ کر رہے گی۔اگر عثمان اس حالت میں مر گیا کہ اس نے اس چکی کو حرکت نہیں دی تو اس کے لئے بشارت ہے۔تم لوگوں کو فتنہ و فساد سے روکو۔امن و سکون پیدا کرو۔ان کے حقوق ادا کرو۔ان سے درگزر کرو، حقوق اللہ کی ادائیگی میں کسی قسم کی مداہنت سے کام نہ لو۔''

غرضیکہ کوئی فیصلہ کن اقدام نہ کیا جا سکا۔گورنر اپنے اپنے صوبوں کو لوٹ گئے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے بڑی نیک نیتی سے لوگوں کی حقیقی شکایات معلوم کر کے ان کے ازالہ کرنے کی کوشش کی لیکن جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ گفتگو سے ظاہر ہوا اموی عمال کے خلاف شکایات کو وہ معاندانہ پراپیگنڈہ سمجھتے تھے اور ان کو ہٹا کر دوسرے بہتر افراد کو مقرر کرنے پر آمادہ نہ تھے۔عمال نے بھی اپنے صوبوں میں زیر سطح چلنے والی سازشی لہروں کے رخ اور زور کو جاننے اور ان کا سدباب کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ابن سبا اور اس کے ساتھیوں کا مخالفانہ اور باغیانہ پراپیگنڈہ بڑی ہوشیاری سے زیر زمین جاری رہا۔عمال کے خلاف شکوہ و فساد اور رد و بدل کے واقعات پیش آئے مگر ان کی اصل نوعیت اور فساد کی جڑ کا اندازہ نہیں لگایا گیا۔کوفہ کے دس بارہ شورش پسندوں کو وقتی طور پر شام جلا وطن کیا گیا لیکن انہیں بھی بعد میں معافی دے دی گئی۔کوفہ واپس پہنچ کر وہ پہلے سے زیادہ مخالفانہ سرگرمیوں میں لگ گئے اور عبداللہ ابن سبا کے سازشی پروگرام میں شامل ہو گئے۔مصر کے گورنر عبداللہ بن سعد بن

ابی سرح کو اپنے ہاں کے شر پسندوں کی باغیانہ سرگرمیوں کا علم اس وقت ہوا جب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور محمد بن ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ نے علانیہ مخالفت شروع کی۔ رومیوں کے خلاف لڑنے والے مجاہدین میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور گورنر کے خلاف علانیہ پراپیگنڈہ شروع کیا اور انہیں جہاد میں شرکت سے یہ کہہ کر باز رکھنے کی کوشش کی کہ سب سے بڑا دشمن تو مدینہ میں بیٹھا ہے۔ اس کے خلاف جہاد کی ضرورت ہے۔

اس سال (۳۴ھ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کا آخری حج کیا۔ حج کے موقع پر ان کے سامنے کوئی شکایات پیش نہیں کی گئیں۔ نہ مدینہ واپس آنے کے بعد۔ اندریں حالات وہ اپنے گورنروں کو برقرار رکھنے میں حق بجانب تھے۔ تاہم پوری مملکت اسلامیہ میں سنجیدہ ذمہ دار اور مخلص طبقے اضطراب سا محسوس کرنے لگے تھے جیسے خطرے کی گھنٹی بج رہی ہو۔ بیرونجات کے لوگ اہل مدینہ کو خط لکھ لکھ کر پوچھتے تھے کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ اور کیا ہونے والا ہے؟ اہل مدینہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس دریافت حال کے لئے آتے تھے مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ ملتا تھا۔ زیر سطح لاوا پک رہا تھا۔ یوں ۳۴ھ انجام کو پہنچا۔

مجلس شوریٰ کا اجلاس

حج سے واپسی پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مجلس شوریٰ جو عرصے سے تقریباً معطل تھی، کا اجلاس منعقد کیا جس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وغیرہ جلیل القدر صحابہ نے شرکت کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑے سکون اور نرمی سے باتیں کیں اور فرمایا کہ ''میں قوم کے مشورہ کا پابند ہوں۔ جہاں مجھے لے جائے گی جاؤں گا۔'' سب خوش اور مطمئن ہو کر مجلس سے اٹھے۔ سب کا خیال تھا کہ ۳۵ھ سکون واطمینان کا سال ہوگا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تجویز

دوسروں کے چلے جانے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تنہائی میں ملاقات کر کے یہ تجویز پیش کی کہ بڑھتے ہوئے خطرہ کے پیش نظر یا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شام چلے چلیں کہ وہاں امن وسکون ہے یا وہ شامی فوج کا ایک دستہ مدینہ بھیج دیتے ہیں جو ان کی حفاظت کرے گا لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جیتے جی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار کو چھوڑنا اور دارالہجرت سے دور رہنا گوارا نہ کیا۔ یہ بھی خیال ہوگا کہ اس طرح دارالخلافہ مدینۃ الرسول سے دوسری جگہ منتقل ہو جائے گا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی سربلندی کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ اس کا مسلمانوں پر برا اثر پڑتا اور پھر یہ کہ شام میں ان کی حیثیت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں ایک قیدی کی سی ہوتی۔ وہاں نہ تو وہ منبر نبوی پر خطبہ دے سکتے تھے نہ مسجد نبوی میں نماز پڑھا سکتے۔ جہاں تک فوجی دستے کا تعلق ہے، حضرت عثمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور ان کے اہل وعیال کو شامی لشکروں کے پڑوس سے پریشان اور تنگ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس سے کئی دوسرے مسائل پیدا ہو جاتے اور خلیفہ کی آزاد اور مربیانہ وسرپرستانہ حیثیت اور عوامی مقبولیت متاثر ہوتی۔ انہوں نے یہ پسند نہ کیا کہ ایک آمر کی طرح قوت وغلبہ کی

بنا پر حکومت چلائیں اور شہر رسول ﷺ کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکریوں کا محکوم بنائیں اور اسلام میں اس المناک حادثہ کا سبب بنیں کہ مہاجرین وانصار مسجد نبوی ﷺ اور مدینۃ الرسول ﷺ سب کے سب معاویہ رضی اللہ عنہ کی فرستادہ شامی فوج کے زیر اطاعت ہوں جس نے نہ نبی ﷺ کو دیکھا نہ نبی ﷺ سے کچھ سنا اور نہ شیخین رضی اللہ عنہما کی زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ وہ پہلے شخص ہوں جس نے خلافت کو سلطنت میں اور خلافت کی رحمت وچشم پوشی کو سلطنت کے قہر، تشدد اور خوف میں بدل دیا۔ آپ ایک جابر آمر بن کر ایک ایسی فوج کے بل پر اصحاب رسول ﷺ پر حکومت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جو آپ کے حامیوں کی حمایت کرتی، آپ گھر میں ہوتے تو گھر پر پہرہ دیتی اور جب گھر سے باہر نکلتے تو آپ کی حفاظت کے لئے آپ کے جلو میں رہتی۔ مدینہ کی راہوں اور گلیوں میں چلتے وقت حفاظتی گارڈ کے طور پر آپ کے ساتھ لگی رہتی۔ جب آپ مسجد نبوی میں خطبہ کے لئے منبر پر کھڑے ہوتے تو ہر طرف سے آپ کا احاطہ کئے رکھتی۔ اس طرح آپ ان تمام صحابہ اور رفقا سے کٹ جاتے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اور آپ کے ساتھ تمام معرکوں اور مصیبتوں میں شریک رہے تھے۔ ان باتوں کا سیرت رسول ﷺ اور سیرت شیخین رضی اللہ عنہما سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت قبول کرتے وقت قرآن وسنت اور سیرت شیخین رضی اللہ عنہما پر چلنے کا عہد کیا تھا۔ وہ تو مدینہ کے کوچہ وبازار میں کسی محافظ اور ساتھی کے بغیر اکیلا چلنے پھرنے، گھومنے اور لوگوں سے گھلنے ملنے کے عادی تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فرستادہ شامی فوج حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کی وفادار اور ان کی ہدایات اور سیاست کی زیادہ پابند ہوتی۔ بہرحال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صاف انکار پر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''اندریں صورت شر پسند لوگ آپ سے لڑیں گے اور آپ کی جان جائے گی۔'' آپ نے جواب دیا کہ ''میرے لئے اللہ کافی ہے اور وہی میرا بہترین کارساز ہے۔'' (حسبی اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر)

سازش زور پکڑتی ہے

کوفہ، بصرہ، مصر اور دوسرے علاقوں کے سازشی دھڑوں کو عبداللہ ابن سبا نے خفیہ خط وکتابت اور منصوبہ بندی کے ذریعے منظم کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت پر متحد کر دیا۔ اگرچہ مختلف جماعتوں کے اپنے اپنے مخصوص اغراض ومقاصد بھی تھے اور وہ عثمان کے جانشین کے بارے میں بھی مختلف الخیال تھے...... اہل مصر (جہاں ابن سبا اور محمد بن ابی بکر موجود تھے) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرف دار تھے۔ اہل بصرہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو چاہتے تھے اور اہل کوفہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے حق میں تھے۔ جب کہ اہل عراق کی جماعت جملہ قریش کے خلاف تھی...... لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معزولی اور بنو امیہ کو منظر حکومت سے ہٹانے پر سب متفق تھے۔ نظم ونسق کو سبوتاژ کرنے کے لئے سب سے پہلے کوفہ کا سازشی اور شر پسند جتھا جس میں یزید بن قیس، مالک اشتر نخعی، ابن ذی الحبکہ، صعصہ، ابن الکواء، کمیل اور عمیر ضابی وغیرہ دس بارہ اشخاص (سب غیر قریش اور غیر انصار) پیش پیش تھے...... نے وہاں کے

گورنر سعید بن العاص کے خلاف کامیاب بغاوت کی۔ ان کے غلام کو قتل کیا اور خود انہیں مدینہ واپس جانے پر مجبور کر دیا اور بصرہ کے سابق گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اپنی مرضی کا گورنر مقرر کرایا جنہیں اس سے پہلے بصرہ کے شر پسند عناصر جھوٹی سچی شکایات کر کے اپنے ہاں سے معزول کرا چکے تھے۔ (یعنی ایک ہی صاحب کے بارے میں کوفہ اور بصرہ کے لوگوں کی رائے باہم متضاد تھی) ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کوفہ پہنچ کر لوگوں سے ازسرنو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت لی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہاں کے لوگ امن واطمینان سے رہیں گے۔ لیکن شر پسند عناصر نے اپنی خفیہ کارروائیاں پھر سے شروع کر دی رحمۃ اللہ علیہ۔ بصرہ میں بھی زیرزمین فتنہ وبغاوت کی لہریں رواں رہیں اگرچہ بظاہر ابوموسیٰ کے جانشین عبداللہ بن عامر نے حالات کو قابو میں رکھا۔ سنجیدہ طبقے دونوں گورنروں کا ساتھ دے رہے تھے۔ مصر میں ابن سبا کی ذاتی موجودگی کچھ گورنر ابن ابی سرح کی قدرے سخت گیر پالیسی اور کچھ حضرت عمار رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ اور پیرانہ سال صحابی کی حمایت کی وجہ سے باغیانہ تحریک کو بڑی تقویت ملی۔ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور محمد بن ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ گرم خون نوجوان تھے اور قریش کے دوسر کردہ اور معزز صحابہ کی اولاد۔ وہ بلند مناصب کو اپنا حق سمجھتے تھے لیکن خلیفہ اور مصر کے گورنر سے ان کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ اس لئے وہ کھلم کھلا مصر کے گورنر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت پر اتر آئے اور عوام کے علاوہ مجاہدین میں جہاد کے خلاف فتنہ وبغاوت کی تبلیغ کرنے لگے۔ یہ بااثر نوجوان تھے ان کے مسموم خیالات آہستہ آہستہ دوسروں کو متاثر کرنے لگے۔ انہوں نے رومیوں کے خلاف بحری جہاد میں رکاوٹ پیدا کرنے اور لوگوں کو اس میں حصہ لینے سے باز رکھنے کی بھی کوشش کی۔ ابن ابی سرح نے انہیں سمجھایا اور فتنہ انگیزیوں سے سختی سے روکا اور کہا کہ ”خدا کی قسم! اگر امیرالمومنین کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہیں اس مفسدہ پردازی کا مزہ چکھا دیتا۔“ مگر ان پر اس تنبیہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔

بالآخر مصر، کوفہ بصرہ کے شر پسندوں نے مدینہ کے بعض عناصر کو ساتھ ملا کر خلیفہ پر یلغار کرنے کا پروگرام طے کر لیا۔

شہادت عظمیٰ

(۳۵ھ)

جب عمال اپنے اپنے علاقوں کو واپس چلے گئے اور عمال کانفرنس میں جو کچھ پیش آیا تھا اس کی اطلاع شر پسندوں کو ملی تو ان کے حوصلے مزید بڑھ گئے۔ انہوں نے باہمی خط وکتابت اور صلاح مشورے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک خاصی طویل فہرست الزامات تیار کی جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور ۳۵ھ کے موسم حج میں اپنے اپنے شہروں سے بیک وقت حج کے بہانے سے نکلے اور مدینہ کا رخ کیا تاکہ خلیفہ کے سامنے اپنے مطالبات پیش کر کے انہیں خلافت سے دستبردار ہونے پر مجبور کریں اور اگر وہ انکار کریں تو قتل کر دیں۔ اب فرد گزاشتوں کی تلافی اور غلطیوں کی اصلاح کا وقت نہیں رہا تھا۔ باغیوں کو شاید یہ خوف بھی لاحق ہو گیا تھا کہ اگر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دستبردار نہ ہوئے اور اپنی عمر طبعی تک خلیفہ رہے تو اپنے بعد بنی امیہ میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کر دیں گے اور اگر ایسا نہ بھی کیا تو قریش میں سے کوئی دوسرا شخص ان کی جگہ لے لے گا۔ اور قریش کی سیادت واقتدار کبھی ختم نہ ہوں گے۔ مدینہ میں بھی باغیوں کے درپردہ ہمنوا پیدا ہو گئے تھے جو انہیں دارالخلافہ کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ بہرحال یہ لوگ صحابہ میں سے نہ تھے۔

سبائی سازشی جانتے تھے کہ ان کے بیشتر اعتراضات بے بنیاد یا کمزور تھے جن کے شافی جواب دیئے جا سکتے تھے اور دیئے بھی گئے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ایک سازشی گروہ ہیں اور ان کی کوئی نمائندہ حیثیت نہیں۔ ان کا مقصد تو فتنہ پردازی اور مملکت اسلامیہ کے نظام کو درہم برہم کرنا تھا۔ ان کا اولین ہدف باقاعدہ منتخب شدہ تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات تھی۔ عزل یا قتل اور پھر نظم ونسق کا انتشار۔ بنی امیہ اور دوسرے قریش کے اقتدار و تفوق کا خاتمہ۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے عزل یا قتل کے بعد بھی ملت اسلامیہ کا سواد اعظم ان کے گروہ میں سے کسی کو خلیفہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ تاہم وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر مملکت اسلامیہ پارہ پارہ نہ بھی ہوئی تو جو بھی نیا خلیفہ ہوگا اس کے انتخاب میں ان کا ہاتھ ہوگا اور اس پر ان کا دباؤ رہے گا۔ اور وہ اس سے من مانی کرا سکیں گے۔

مصر کے باغیوں کے اصل عزائم کی اطلاع جب گورنر حضرت عبداللہ ابن سعد ابن ابی سرح کو ملی تو انہوں نے ان کا تعاقب کیا مگر وہ مصر کی حدود سے نکل چکے تھے۔ ہاتھ نہ آئے ان کی غیر حاضری میں محمد ابن ابی حذیفہ نے مصر کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور عبداللہ ابن سعد کو عارضی طور پر فلسطین میں پناہ لینا پڑی۔ کوفہ اور بصرہ کے باغی ایسی ہوشیاری اور خاموشی سے نکلے کہ گورنروں کو ان کے اصل عزائم کی بھنک تک نہ ملی۔ اس لئے وہ انہیں روکنے کے لئے کوئی کارروائی نہ کر سکے۔ انہوں نے باغیوں کو عام حاجیوں کی طرح جانے دیا۔

باغیوں کی مدینہ میں آمد

محمد ابن سعد کی روایت کے مطابق مصر سے تقریباً چھ سو، کوفہ سے دو سو، اور بصرہ سے ایک سو یعنی مجموعی طور پر نو سو باغیوں نے مدینہ کے قریب پہنچ کر ذی خشب کے مقام پر پڑاؤ کیا[1]

یہ سب لوگ چار چار کے قافلوں کی صورت میں آئے تاکہ ایک دم بڑی جمعیت کو دیکھ کر کسی کو شک نہ گزرے۔ اکثریت مصریوں کی تھی کیونکہ مصر ابن سبا کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اور وہ خود وہاں باغی گروہ کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ اگرچہ بظاہر باغیوں کے سردار دوسرے لوگ تھے اور وہ خود پس پردہ رہ کر تار ہلا رہا تھا۔ مصری باغیوں کے سردار عبدالرحمٰن بن عدیس البلوی، کنانہ بن بشر الکندی، سودان بن حمران مرادی، قتیرہ سکونی اور عمرو بن الحمق خزاعی تھے سب کا سردار اعلیٰ غافقی بن حرب تھا۔ کوفہ کے باغیوں کے سردار مالک اشتر نخعی، زید بن صوحان

---

[1] علامہ جریر طبری کے مطابق مصریوں، کوفیوں اور بصریوں کی تعداد برابر برابر تھی۔ مصری کم سے کم چھ سو اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار۔ ابن سعد کے بیان کردہ کوفیوں اور بصریوں کو شامل کر کے تقریباً تیرہ چودہ سو۔ اگر ہر گروہ کی تعداد چھ سو مان لی جائے تو کل اٹھارہ سو ہوئے۔ مولانا مودودی مرحوم نے خلافت وملوکیت میں سب کی مجموعی تعداد تقریباً دو ہزار لکھی ہے۔ اس میں غالباً وہ اعرابی شامل ہیں جو اثنائے راہ میں یا مدینہ کے قریب پہنچ کر لوٹ مار کے ارادے سے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مؤلف

عبدی، زید بن نضر حارثی اور عبداللہ بن اصم تھے۔ اور سردار اعلیٰ عمرو بن اصم۔ اہل بصرہ کے سربراہ حکیم بن جبلہ عبدی، ذریح بن عباد عبدی، بشر بن شریح اور ابن المحر اس تھے۔ جب کہ سردار اعلیٰ حرقوس بن زہیر اسدی تھا۔[1]

مدینہ اور نواح مدینہ کے کچھ اراذل اور غیر ذمہ دار لوگ بھی ان کے ہمدرد اور رفیق بن گئے۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شرپسندوں اور باغیوں کے ذی خشب میں اترنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے دریافت حال کے لئے دو آدمیوں کو بھیجا باغیوں نے اپنے مطالبات بتائے اور کہا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کے عمال کے بارے میں کچھ بحث و گفتگو کرنا اور انہیں ان کی بعض ذمہ داریاں یاد دلانا چاہتے ہیں۔ مدینہ میں جو لوگ موجود تھے وہ باغیوں سے جنگ کرنے پر تیار ہو گئے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ باغی ہیں اور باغیوں سے جنگ اور ان کا قتل جائز ہے۔ لیکن حضرت عثمان کو یہ پسند نہ تھا وہ نرمی اور درگزر کے قائل تھے اور ملت اسلامیہ میں جبر و تشدد اور قتل و خون کا آغاز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ کو مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے ساتھ باغیوں سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا اور انہیں اختیار دیا کہ وہ جس شرط پر بھی باغیوں کو راضی کریں گے انہیں منظور ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے باغیوں کو سمجھایا بجھایا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پوزیشن واضح کی اور باغیوں کے کسی غلط اقدام کے خطرناک نتائج و عواقب سے انہیں خبردار کیا۔ نیز انہیں بتایا کہ خلیفہ ان کے معقول مطالبات کو ماننے اور ان کی جائز شکایات کا ازالہ کرنے پر تیار ہیں۔ پھر وہ باغیوں کے کچھ نمائندوں کو ساتھ لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تاکہ خلیفہ بہ نفس نفیس ان کو اطمینان دلا دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی بعض غلطیوں کا اعتراف کیا۔ اپنے عمال کے کردار و عمل کی وضاحت کی، خدا سے مغفرت چاہی اور آئندہ کے لئے اصلاح حال کا وعدہ کیا۔ پھر اس قدر روئے کہ دیکھنے سننے والوں پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ اس وقت تک باغی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جانشین کے بارے میں متفق نہ ہو سکے تھے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ سے رابطہ قائم کیا مگر تینوں نے انہیں ڈانٹ دیا۔

مصری وفد کو مصر کے عامل عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے خلاف شکایات تھیں۔ انہوں نے ان کی فوری معزولی اور ان کی جگہ محمد بن ابی بکر کے تقرر کا مطالبہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مان لیا اور حکم نامہ لکھ دیا۔ باغی گروہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے تقرر کا حکم نامہ لے کر بظاہر خوشی خوشی اپنے شہروں کو واپس روانہ ہو گئے اور مدینہ میں جو اہل اخلاص موجود تھے انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آئی بلا ٹل گئی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس موقع پر کوفہ اور بصرہ کے باغیوں نے اپنے ہاں کے گورنروں کی تبدیلی کا مطالبہ نہیں کیا۔ گویا وہ اپنے گورنروں سے مطمئن تھے۔

باغیوں کی دوبارہ آمد

دراصل باغیوں کی یہ ظاہری پسپائی ایک گہری چال تھی۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا

[1] بعد میں جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمٰن بن عدیس، کنانہ بن بشر، مالک اشتر اور حکیم بن جبلہ کو حضرت عثمان کے دروازے پر دیکھا تو اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارا اور انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور کہا داللہ وہ امر جس کے یہ رؤسا ہوں بے شک بدترین امر ہے۔ (ابن سعد) حضرت سعد رضی اللہ عنہ ان لوگوں کی شرپسندی اور فتنہ انگیزی سے آگاہ تھے۔ مولف

کہ اہل مدینہ جو دراصل پوری دنیائے اسلام کے ارباب حل وعقد تھے، ان کے مخالف تھے اور مقابلے پر آمادہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے بزرگ صحابہ نے بھی ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی بلکہ انہیں روکنے کے لئے باہر نکل آئے تھے۔ تاکہ دارالہجرت اور دارالخلافہ کو ان سے محفوظ رکھیں۔ اس لئے باغیوں نے آپس میں یہ طے کرلیا تھا کہ سردست یہی ظاہر کریں کہ مطمئن ہوکر اپنے اپنے شہروں کو واپس جا رہے ہیں۔ لیکن چندروز بعد اچانک واپس آ کر مدینہ کا محاصرہ کر کے خلیفہ کو دستبرداری پر مجبور کر دیں اور اگر وہ نہ مانیں تو قتل کر دیں۔ انہوں نے اپنی واپسی کے لئے بظاہر ایک معقول بہانہ بھی گھڑ لیا۔ اہل مدینہ کی ایک بڑی تعداد حج کے لئے مکہ روانہ ہو چکی تھی باقی لوگ بھی سمجھوتہ ہو جانے سے مطمئن ہوکر اپنے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گئے۔ شہر میں مدافعت کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ مدینہ میں نئی نسل کے کچھ لوگ اور کچھ عجمی غلام در پردہ باغیوں کے حامی اور مددگار تھے اور انہیں صحابہ کے ارادوں اور نقل وحرکت سے باخبر رکھتے تھے۔

مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ مروان بن الحکم اور شائد بعض دوسرے بنی امیہ کے مشوروں کے زیر اثر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے وعدہ کے مطابق اصلاحی اقدامات نہیں کئے، شاید کرتے مگر مہلت ہی نہ ملی۔ اس عالم میں ایک دن اچانک مدینہ کی گلیاں باغیوں کے نعرہ ہائے تکبیر اور انتقام، انتقام کے شور سے گونج اٹھیں۔ باغی تین منزل جا کر واپس آ گئے تھے اور حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے اکابر صحابہ جو شہر میں موجود تھے۔ انہوں نے بلوائیوں سے واپس آنے کی وجہ پوچھی تو دعویٰ کیا کہ خلیفہ نے بدعہدی کی ہے۔ مصری جماعت نے واپس جاتے ہوئے ایک شتر سوار کو مشتبہ حالات میں پکڑا جس کے پاس سے ایک خط برآمد ہوا۔ پوچھ گچھ پر معلوم ہوا وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا غلام تھا اور اونٹ بھی انہی کا تھا۔ اور سربمہر خط حاکم مصر عبداللہ ابن ابی سرح کے نام تھا جس میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ جب یہ شورش پسند لوگ مصر واپس پہنچیں تو ان کے سرغنوں کو قتل کر دیا جائے اور دوسروں کی داڑھیاں منڈوا دی جائیں اور سخت سزائیں دی جائیں۔ یہ بیان کر کے باغی بلوائیوں نے حضرت عثمان کی معزولی کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ معزولی سے انکار کی صورت میں انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خط کے متعلق قطعاً لاعلمی ظاہر کی اور فرمایا کہ میں نے یہ خط نہ کسی سے لکھوایا نہ اس پر اپنی مہر ثبت کی۔ نہ کسی غلام کو اپنے اونٹ پر سوار کر کے عامل مصر کے پاس روانہ کیا۔ باغیوں نے کہا کہ اگر آپ نے نہیں لکھا تو آپ کے سیکرٹری مروان نے لکھا ہوگا کیونکہ آپ کی مہر اس کے پاس رہتی ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کسی تحقیق کے بغیر ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر باغیوں نے خود ان کی معزولی کا مطالبہ یہ کہہ کر کیا کہ ایک ایسا خلیفہ جسے اپنے ماتحتوں پر کنٹرول نہ ہو اور وہ اس کے پس پشت اپنی مرضی سے جو چاہیں کرتے ہوں، خلیفہ رہنے کے قابل نہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کہنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باغیوں سے گفتگو کی اور پوچھا کہ تم لوگ مختلف راہوں سے اپنے اپنے شہروں کو واپس روانہ ہوئے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ تم سب ایک ساتھ ایک وقت میں یہاں واپس پہنچ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے واپسی کا منصوبہ یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے ہی تیار کرلیا تھا۔ بلوائی

کوئی معقول جواب نہ دے سکے اور نہ وہ خط ہی پیش کر سکے۔ صرف یہ کہا کہ آپ جو چاہیں خیال کریں ہمیں موجودہ خلیفہ کی ضرورت نہیں۔ دراصل یہ ایک سازشی چال تھی اور سارا قصہ من گھڑت تھا۔ اگر باغیوں کے سرغنوں کو قتل ہی کروانا ہوتا تو جب وہ دوبارہ مدینہ آئے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ راہ اختیار نہ کی اور باغیوں کو کسی قسم کی سزا نہ دی۔ داڑھیاں منڈوانے کا غیر شرعی حکم بھی خلیفہ راشد نہ دے سکتے تھے۔ دراصل باغیوں ہی میں سے کسی چالاک اور مکار شخص (غالباً ابن سبا) نے وہ خط تیار کیا۔ بڑی ہوشیاری سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا مروان کے رسم الخط کی نقل اتاری۔ اور بیت المال کا اونٹ چرا کر کسی اپنے آدمی کو سکھا پڑھا کر اس کے ہاتھ روانہ کیا۔ اغلب ہے کہ دوسرے باغیوں کو بھی اس جعل سازی کا علم نہ ہوسکا۔ بہرحال باغیوں نے اصرار کیا کہ مروان کو ان کے حوالے کیا جائے تا کہ وہ خود اسے سزا دیں۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا مطالبہ تسلیم نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ایک تو یہ کہ مروان کا جرم متحقق نہیں ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ سزا دینا، نہ دینا خلیفہ کا کام تھا۔ باغیوں کو کوئی اختیار نہ تھا کہ جرم وسزا کا قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ بہر کیف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سوال و جواب سے باغیوں کے دعوے کا کھوکھلا پن اور ان کی پرفریب چال کا پول کھل گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت محمد بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے دوبارہ کہا کہ وہ باغیوں سے بات چیت کر کے معاملے کو سلجھائیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ خلیفہ نے ان کے مشورہ پر عمل نہیں کیا تھا اور باغیوں سے کئے ہوئے اصلاح کے وعدوں پر عمل درآمد نہیں کیا گیا تھا بلکہ ہمیشہ مروان کے مشوروں کو اہمیت دی جاتی رہی۔ باغیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے باری باری رابطہ قائم کیا اور انہیں منصب خلافت قبول کرنے کے لئے کہا لیکن سب نے انہیں جھڑک دیا اور انکار کر دیا اور فرمایا کہ ”مومنوں کو معلوم ہے کہ ذوالمردہ، ذوخشب اور اعوص کی فوجوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔“[2]

مصری حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چاہتے تھے لیکن جب انہوں نے انکار کر دیا تو باغیوں نے کہا کہ ”پھر آپ ہمیں عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے عمال کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لئے خط کیوں لکھا کرتے تھے؟“ آپ نے اس کی سختی سے تردید کی۔ جس پر باغیوں کو حیرت ہوئی۔ آپ کے جعلی خط ابن سبا اور اس کے مخصوص ساتھیوں نے تیار کر کے لوگوں میں پھیلائے ہوں گے۔ کوفی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور بصری حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے مگر ان دونوں بزرگوں نے بھی صاف انکار کر دیا۔

محاصرہ

بلوائیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور ان کی خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کیا کیونکہ

---

1. غالباً یہ اسی مطالبہ کا ردعمل تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے حوالے کیا جائے تا کہ وہ خود ان سے شہید خلیفہ کا انتقام لیں۔ مولف

2. ان مقامات پر مصریوں، کوفیوں اور بصریوں کے پڑاؤ تھے۔ مولف

انہیں یقین ہو گیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول یا قتل کئے بغیر اگر وہ اپنے صوبوں کو واپس گئے تو گورنر انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر دستبرداری سے انکار کر دیا کہ جو خلعت مجھے اللہ نے پہنایا ہے میں اسے جیتے جی نہیں اتاروں گا۔ کیونکہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا تھا۔[1]

ہاں میں دوسرے مطالبات پر غور کرنے اور شکایات دور کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن بلوائی معزول کے مطالبے پر اڑے رہے۔ ابتدا میں محاصرہ ہلکا تھا۔ خلیفہ کو گھر سے باہر آنے جانے کی آزادی تھی۔ وہ مسجد نبوی میں نماز پڑھاتے اور خود بلوائی بھی ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے۔ آپ لوگوں کو خطبہ دیتے، وعظ و نصیحت کرتے، اپنی پوزیشن واضح کرتے، اپنے حقوق جتاتے اور باغیوں سے مصالحت کی بات چیت کرتے۔ باغی چاہتے تھے کہ آپ از خود خلافت سے دستبردار ہو جائیں اس طرح ہلکے اور پر امن محاصرہ کے تیس دن گزر گئے۔ اس اثنا میں حج کے ایام قریب آ گئے۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو امیر حج بنا کر مکہ روانہ کر دیا اور ایک مفصل تحریر بھی انہیں دی جس میں اپنے موقف کی وضاحت کی اور باغیوں کی زیادتیاں بیان کیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے وہ تحریر منیٰ میں حاجیوں کے مجمع میں پڑھ کر سنائی مگر اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ مکہ کے گورنر نے غیر جانبداری بلکہ سرد مہری کے رویہ کا اظہار کیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر سنگ باری

جب باغیوں کو یقین ہو گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبرداری پر آمادہ نہیں اور عنقریب لوگ حج سے واپس آ جائیں گے اور کسی صوبے سے انہیں (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو) فوجی کمک بھی پہنچ سکتی ہے۔ تو انہوں نے انتہائی اقدام کا منصوبہ بنایا۔ جمعہ کے دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر خطبہ کا آغاز کیا تو ایک شخص نے اٹھ کر کہا کہ ''عثمان کتاب اللہ کو اپنا طرز عمل بنا'' آپ نے تحمل اور درگزر سے کام لیتے ہوئے اس کے دخل در معقولات کو نظر انداز کر دیا اور بڑی نرمی سے اسے بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا لیکن تھوڑی دیر بعد دوبارہ اٹھ کر اس نے پھر وہی جملہ دہرایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پھر اسے بیٹھ جانے کو کہا مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ دراصل اس کی سازش پہلے سے کی جا چکی تھی۔ مسجد میں شور و ہنگامہ شروع ہو گیا۔ جہجاہ بن سعید غفاری[2] کود کر منبر پر چڑھ گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کا عصا چھین کر توڑ ڈالا اور پرے پھینک دیا۔ پھر بلوائیوں نے عام پتھراؤ شروع کر دیا۔ حضرت عثمان زخمی ہو کر منبر سے گر گئے اور بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں لوگوں نے اٹھا کر گھر پہنچایا۔ اس کے بعد آپ کی میت ہی گھر سے نکلی۔

---

[1] بحوالہ مسند احمد جلد ۶ ص ۲۶۳

[2] یہ صحابی تھے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے ہم قبیلہ۔ غالباً حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی ربذہ میں خود اختیار کردہ جلاوطنی اور بیکسی کی موت کی وجہ سے اور مخالفوں کے پراپیگنڈہ سے متاثر ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے خفا تھے۔ کتنے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ ایک صحابی نے اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کا عصائے مبارک توڑ کر پھینک دیا اس کے بعد عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے۔ مؤلف

حضرت علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ دریافت حال اور مزاج پرسی کے لئے آپ کے گھر تشریف لے گئے وہاں بنی امیہ کا ہجوم تھا۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملامت کی اور کہا کہ ''تمہیں نے امیر المومنین کے ساتھ یہ سلوک کرایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ منغض اور دل برداشتہ ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔ اس سانحہ میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ شروع سے خلیفہ سے تعاون کرتے چلے آئے تھے اور باغیوں کو سمجھانے بجھانے میں انہوں نے سرگرم حصہ لیا تھا۔

محاصرہ کی شدت

اب محاصرہ کا آخری عشرہ شروع ہوا۔ مدینہ پر عملاً باغیوں کا تسلط تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بجائے مصری باغیوں کے سرغنہ غافقی بن حرب نے مسجد نبوی میں نماز پڑھانا شروع کر دی۔ عمر رسیدہ صحابہ اور ان کی اولاد میں سے جو مخلص اور صالح جوان موجود تھے وہ باغیوں کی اکثریت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے۔ نیز انہیں یہ بھی خیال تھا کہ جدال و قتال تک نوبت نہیں پہنچے گی اور باغی اپنی شکایات کے ازالہ کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ اہل مدینہ کی اکثریت کو زیر زمین سازش کا صحیح اندازہ بھی نہ تھا۔ جب محاصرہ نے شدت پکڑی تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ انصار کی ایک جمعیت لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے اور باغیوں سے جنگ کر کے انہیں دفع کرنے کی اجازت چاہی لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہتھیار اٹھانے اور خون خرابہ سے سختی سے منع کر دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی باغیوں سے مقابلہ کی اجازت چاہی مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں باز رکھا اور فرمایا کہ ''میرا ہمدرد اور خیر خواہ وہ ہے جو باغیوں کے خلاف حرب و ضرب سے باز رہے۔ میں مسلمانوں کا وہ پہلا خلیفہ نہیں بننا چاہتا جو مسلمانوں کا خون بہائے اور حرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت کو پامال کرے۔''

اگرچہ سب حضرات خلیفہ کی ذات سے آگے خود خلافت کو درپیش خطرہ کا احساس کرتے تو خلیفہ کے منع کرنے کے باوجود باغیوں کا مقابلہ کرتے مگر ایسا نہ ہوا۔ بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحب زادوں کو حضرت عثمان کے دروازے پر حفاظت کے لئے متعین کر دیا۔ چنانچہ امام حسن، امام حسین، عبداللہ بن زبیر اور محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ آخری دم تک دروازے پر پہرہ دیتے رہے اور آخر بلوائیوں کے حملہ میں زخمی بھی ہوئے۔ کچھ دوسرے ہوا خواہوں کے علاوہ بنی امیہ کے لوگ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کے اندر جمع ہو گئے تھے۔ غلاموں کی بھی ایک تعداد موجود تھی۔ یعنی تقریباً سات سو افراد قصر خلافت میں جمع تھے اور اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اجازت دیتے تو وہ باغیوں کا موثر مقابلہ کر سکتے تھے۔ اب صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ باغیوں نے اپنے باقی سارے مطالبات کو فراموش کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات کو اپنا ہدف بنا لیا تھا۔ معزولی یا قتل۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معزولی اور خونریزی پر اپنے قتل کو ترجیح دی۔ تاہم اتمام حجت کے طور پر آپ نے وقتاً فوقتاً اپنے مکان کی چھت پر

سے باغیوں سے خطاب کیا۔ اپنی پوزیشن واضح کر کے انہیں سمجھانے اور فتنہ انگیزی اور خونریزی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ آپ کی معزولی یا قتل کے جو خطرناک نتائج وعواقب ہو سکتے تھے ان کے بارے میں متنبہ کیا۔ مختلف مواقع پر انہوں نے جو تقریریں باغیوں اور بلوائیوں کے سامنے کیں۔ وہ تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں۔ باغیوں نے آپ کی سب باتوں کو درست تسلیم کیا لیکن عملاً ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ مدینہ میں جو اکابر صحابہ موجود تھے انہوں نے باغیوں کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ خلیفہ ثالث وسطی ایشیا، چین و ہندوستان سے لے کر شمالی افریقہ کے آخری سرے بحر اوقیانوس تک پھیلی ہوئی وسیع وعریض مملکت اسلامیہ کے منتخب شدہ خلیفہ تھے۔ اور اپنی حفاظت اور باغیوں کی سرکوبی پر قادر تھے۔ مقامی حمایتوں کے علاوہ وہ صوبوں سے فوجیں بھی اپنی مدد کے لئے منگوا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے خونریزی سے پرہیز کرتے ہوئے پرامن مزاحمت یا عدم مزاحمت یا راستہ اختیار کیا۔ دنیا میں مقاومت مجہول (Passive Ressisstance) کی یہ پہلی اور آخری عظیم الشان مثال ہے۔ باغیوں نے اس کی اہمیت ومعنویت کو سرے سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کیونکہ وہ اپنے سازشی منصوبے کو ہر صورت میں پایہ تکمیل تک پہنچانے پر تلے ہوئے تھے۔ بالآخر جب صوبائی گورنروں نے آنے جانے والوں کے ذریعے محاصرے کی خبریں سنیں تو انہوں نے اپنے طور پر فوجی دستے خلیفہ کی مدد کے لئے روانہ کئے۔ مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور ان کے مدینہ پہنچنے سے پہلے خلیفہ کو شہید کیا جا چکا تھا۔

کھانا پینا بند

آخری دس دنوں میں بلوائیوں نے خوردونوش کی اشیاء کو بھی قصر خلافت میں جانے سے روک دیا خاص کر پانی کی ممانعت اور عدم دستیابی سے حضرت عثمان کے گھرانے میں سخت تکلیف پیدا ہوئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے باغیوں کو سمجھانے اور شرم دلانے کی کوشش کی کہ روم وایران کے کافر بھی اپنے قیدیوں کو کھانا پانی دیتے ہیں اور تم اسلام کے مدعی ہو، تمہارا خلیفۂ وقت اور ان کے اہل خانہ پر پانی بند کرنا سخت شرم اور گناہ کی بات ہے۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

بہرحال حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوشش کر کے کچھ پانی اندر پہنچایا مگر وہ کب تک کام دیتا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پڑوسی عمرو بن حزم کبھی کبھی رات کی تاریکی میں باغیوں سے نظریں بچا کر کچھ کھانا پانی پہنچا دیتے تھے۔ کتنا کربناک ہے یہ تصور کہ جو کنواں خود حضرت عثمان ذوالنورین نے اپنی جیب خاص سے بھاری رقم ادا کر کے یہودی سے خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کیا تھا اور جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جنت کی بشارت دی تھی، اسی کنوئیں کا پانی ان پر بند کر دیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوبارہ پیغام بھیجا کہ وہ آئے مگر باغی ان سے لپٹ گئے اور انہیں اندر نہیں جانے دیا۔ مجبوراً انہوں نے اپنا عمامہ اتار کر دروازہ پر متعین ایک صاحب کے ہاتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس اندر بھجوا دیا تا کہ انہیں ان کی مجبوری معلوم ہو سکے۔ پھر ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا خچر پر سوار ہو کر پانی لے کر آئیں مگر باغیوں نے ان سے سخت بدتمیزی کی اور وہ خچر سے گرتے گرتے بچیں۔ لوگوں نے

انہیں بچا کر گھر پہنچایا۔ یہ تھا سبائی بلوائیوں کے دلوں میں عم زاد و داماد رسول ﷺ علی رضی اللہ عنہ اور زوجہ مطہرہ رسول ﷺ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا احترام۔ تا بہ دیگراں چہ رسد! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے چاروں طرف سے گھرے ہوئے مکان کی چھت پر چڑھ کر باغیوں کے مجمع سے یوں خطاب فرمایا۔

''اے لوگو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینے آئے تو یہ مسجد تنگ تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کون اس زمین کو خرید کر مسجد کے لئے وقف کرے گا؟ اس کے صلے میں اسے اس سے بہتر جگہ جنت میں ملے گی۔'' میں نے حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل کی لیکن آج تم اسی مسجد میں مجھے نماز نہیں پڑھنے دیتے۔ میں تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں کیا یہ سچ نہیں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینے تشریف لائے تو یہاں بیئر رومہ کے سوا میٹھے پانی کا کوئی دوسرا کنواں نہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اس کو کون خرید کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کرتا ہے؟ اس سے بہتر اسے جنت میں ملے گی'' یہ میں ہی تھا جس نے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کی۔ لیکن آج تم اسی کنوئیں کے پانی سے مجھے محروم کر رہے ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ مسلمانوں کا وہ لشکر جو تبوک کی طرف پیش قدمی کرنے والا تھا، بہت تنگی و عسرت کی حالت میں تھا۔ اس لشکر کو میں نے ساز و سامان سے آراستہ کیا تھا؟''

باغیوں نے جواب دیا کہ ''آپ نے جو باتیں کہی ہیں سب سچ ہیں۔'' لیکن اس اقرار کے باوجود ان کا دل نہ پسیجا۔ انہوں نے خلیفۂ وقت کو نہ تو مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے گھر سے باہر آنے دیا نہ ان کی اور ان کے اہل خانہ کی تشنگی رفع کرنے کے لئے پانی گھر کے اندر جانے دیا۔[1]

باغیوں کی جارحانہ کارروائیوں، دھمکیوں اور بدتمیزیوں کو دیکھ کر اکثر صحابہ خانہ نشین ہو گئے۔ اور پھر یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے دفاع کے لئے کوئی مدد لینے کے روادار نہ تھے۔ تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اتمام حجت کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے مکان کی کھڑکی سے سر نکال کر یا چھت پر سے باغیوں کو نصیحت کرتے تا کہ وہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے سے باز آ جائیں۔ باغی بعض دفعہ نہایت سخت اور گستاخانہ جواب دیتے۔ آخر باغی آپ کے قتل کے مشورے کرنے لگے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ مشورے اپنے کانوں سے سنے تو آپ مکان کی چھت پر سے باغیوں کے مجمع سے آخری بار یوں خطاب کیا۔

''اے لوگو! آخر کس جرم کی پاداش میں تم میرا خون بہانا چاہتے ہو؟ اسلامی شریعت میں کسی کے قتل کی

---

[1] پانی بند کرنے کی یہ رسم جو باغیوں نے شروع کی اسلامی رحم و شفقت اور اخوت بلکہ عام انسانیت کے خلاف بھی نہایت قبیح اور ظالمانہ حرکت تھی اور پھر ایسے شخص کے خلاف تھی جس نے وہ کنواں خود اپنے مال سے خرید کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کیا تھا۔ اس گھناؤنی رسم کا ردعمل آئندہ چل کر بھی ہوا۔ جنگ صفین کے موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دریائے فرات کے ساحل پر قبضہ کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر پر پانی بند کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ساحل پر بزور قبضہ کر لیا تو انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو بھی پانی لینے کی عام اجازت دے دی۔ پھر اس کے بعد سانحہ کربلا کے موقع پر ابن زیاد کے لشکر نے حضرت امام حسین اور ان کے رفقا اور اہل و عیال پر اسی دریائے فرات کا پانی بند کر دیا۔ مولف

صرف تین ہی صورتیں ہیں یا تو اس نے زنا کاری کی ہو تو اسے سنگسار کیا جائے گا۔ یا قتل عمد کا مرتکب ہوا ہو تو قصاص میں مارا جائے گا۔ یا وہ اسلام ترک کر کے مرتد ہو گیا ہو تو ارتداد کے جرم میں مارا جائے گا لیکن میں نے تو نہ اسلام لانے سے پہلے نہ اسلام لانے کے بعد بدکاری کی، نہ کسی کو قتل کیا اور نہ اسلام لانے کے بعد مرتد ہوا۔ میں اب بھی گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ تم مجھے قتل نہ کرو۔ میں والی ہوں، بھائی ہوں، مسلمان ہوں۔ میں نے اپنے امکان بھر سوائے اصلاح کے کچھ نہیں چاہا۔ اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو ہمیشہ کے لئے تمہارے اتحاد و اتفاق کا خاتمہ ہو جائے گا اور پھر کبھی تم متحد ہو کر نہ نماز پڑھو گے نہ جہاد کرو گے نہ مالِ غنیمت تقسیم کر سکو گے۔ اور اللہ تمہارا باہمی اختلاف کبھی دور نہیں کرے گا۔"[1]

یہ سچی رقت آمیز اور دردانگیز تقریر بھی بہرے کانوں پر پڑی۔ بلوائیوں نے زور دیا کہ آپ خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ ورنہ قتل کی چوتھی قسم بھی ہے اور وہ یہ کہ ان لوگوں کو بھی قتل کیا جائے جو زمین میں فتنہ وفساد کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ (یعنی آپ ایسے ہی ہیں حالانکہ فتنہ وفساد کی کوشش خود باغی کر رہے تھے) لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں۔ آپ حق وصداقت کی راہ میں حائل ہیں۔ زبردستی امیر بنے ہوئے ہیں۔ آپ نے حکومت کرنے اور مال و دولت کی تقسیم میں ظلم سے کام لیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ مکان کے ایک چور دروازے سے نکل کر رات کی تاریکی میں دمشق یا مکہ روانہ ہو جائیں۔ دمشق میں معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں اور مکہ حرم ہے جہاں جنگ و جدال حرام ہے۔ یا باغیوں سے قتال کریں کہ آپ خلیفہ برحق ہیں۔ لیکن آپ نے اس انتہائی خطرناک موقع پر بھی دار الہجرت اور جوارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑنے اور اپنے دفاع میں خونریزی کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس وقت میرا اور اسلام کا سچا خیر خواہ وہ ہے جو اپنا ہاتھ اور اسلحہ روکے رکھے۔ باغیوں کا ہنگامہ عظیم جاری رہا۔ اس دوران میں انہوں نے ایسی ایسی شنیع حرکات کا ارتکاب کیا جو شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سے پہلے نہیں کی گئی تھیں۔ اہل مدینہ کے عجمی غلام اور گرد و نواح کے بدو بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ اس اثناء میں باغیوں کو معلوم ہوا کہ مصر پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد ابن ابی سرح نے وہاں سے حضرت عثمان کے لئے کمک روانہ کر دی ہے۔ شام اور عراق کے متعلق بھی ایسی ہی خبریں ملیں۔ اس لئے باغیوں نے فوجی امداد پہنچنے اور حاجیوں کے واپس آنے سے پہلے خلیفہ برحق حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا باغیوں سے خطاب

جب محاصرہ کی شدت انتہا کو پہنچ گئی اور باغی کھلم کھلا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی باتیں کرنے لگے تو ایک دن

[1] طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری

افسوس کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ مؤلف

مشہور اور بزرگ صحابی حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے جرأت سے کام لے کر باغیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے لوگو! تم عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے سے باز رہو۔ اللہ کی تلوار اب تک میان میں ہے لیکن اگر تم نے ان کو قتل کر دیا تو خدا کی قسم! وہ تلوار کو میان سے کھینچے گا اور پھر وہ قیامت تک میان میں نہ جائے گی۔ آنے والا حاکم بزور شمشیر تم پر حکومت کرے گا۔"

باغیوں نے بزرگ صحابی کی تقریر کے تنبیہی الفاظ پر غور کرنے کی بجائے ان کی تحقیر کی اور انہیں برا بھلا کہا۔ وہ حق گوئی اور خیر خواہی کا فریضہ ادا کر کے چلے گئے۔ کاش مدینہ میں موجود دوسرے بزرگ اور بارسوخ صحابہ نے بھی ان کی تقلید کی ہوتی!

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت یقینی ہوگئی۔ اور وہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی معیت میں زلزلہ سے ملنے والے کوہ احد کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ "ٹھہر اے احد! تجھ پر تو ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک صدیق (ابوبکر رضی اللہ عنہ) اور دو شہید (عمر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ) ہیں۔ اس کے آخری حصہ کی پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آپہنچا۔[1]

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن

۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ (۱۷ جون ۶۵۶ء) کو جمعہ کا دن تھا۔ جناب ذوالنورین رضی اللہ عنہ اپنے معمول کے مطابق روزہ سے تھے۔ آپ نے غسل کیا اور خلاف معمول پاجامہ زیب تن کیا۔[2]

اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ آج میری حیات فانی کا آخری دن ہے۔ اگر تم اسے میری آرزو اور خوش فہمی نہ سمجھو تو میں ایک عجیب بات کہوں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "عثمان! آج تم ہمارے ساتھ روزہ افطار کرنا۔" حاضرین

---

[1] طبری کی روایت کے مطابق ایک دن مروان بن الحکم نے باہر نکل کر باغیوں کو ڈانٹا اور کہا "کیا بات ہے؟ تم لوگ اس طرح اکٹھے ہوئے ہو جیسے لوٹ مار کے لئے آئے ہو۔ کیا تم اس لئے آئے ہو کہ ہمارے ہاتھ سے ہماری سلطنت چھین لو؟ یہاں سے چلے جاؤ۔ بخدا اگر تم نے ہمارا قصد کیا تو ہم تم سے ایسا سلوک کریں گے جو تمہیں ناپسند ہوگا اور اس کا انجام برا ہوگا۔" روایت یہ بھی ہے کہ اس نے باغیوں سے مبارزت طلبی بھی کی اور زخمی بھی ہوا۔ ممکن ہے کہ عہد عباسیہ میں ایسی روایات وضع کی گئی ہوں۔ لیکن تاریخ کے صفحات سے مروان کا جو کردار ابھر کر سامنے آتا ہے وہ ان سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجہ حضرت نائلہ نے آپ کو مروان کے مشوروں اور کارروائیوں سے بچنے اور حضرت علی کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا اور یہ بھی کہا کہ مروان کی وجہ سے لوگوں نے آپ کو چھوڑ رکھا ہے۔ مروان کی مندرجہ بالا تقریر کا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور فرمایا کہ مروان آپ کی عقل اور دین کو خراب کر کے چھوڑے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ آپ کو ہلاکت کی طرف لے جائے گا۔ مولف

[2] غالباً اس لئے کہ بلوائیوں کے حملہ اور شہادت کی صورت میں ستر کھلنے نہ پائے اور کامل الحیاوالایمان کو موت کے وقت برہنگی و بے پردگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مولف

نے ایک بار پھر اصرار کیا کہ باغیوں کا مقابلہ کیا جائے مگر اس حلم وصبر کے پیکر نے یہ کہہ کر روک دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے جو ذمہ داری سونپی ہے۔ میں صبر کے ساتھ اس پر قائم رہوں گا حتیٰ کہ اس معرکہ میں گرادیا جاؤں جو میرے لئے مقدر ہو چکا ہے۔"

اسی روز آپ نے بیس غلاموں کو آزاد کیا اور اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا کہ شہادت کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ پھر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو اپنا وصی مقرر کیا کہ آپ کی شہادت کے بعد آپ کے ذاتی معاملات کو نپٹائیں۔ اس کے بعد قرآن مجید کھول کر تلاوت میں مصروف ہو گئے حالانکہ حافظ قرآن تھے لیکن ناظرہ تلاوت کو ترجیح دی۔ شاید چاہتے تھے کہ شہادت کے وقت کلام اللہ ان کے پیش نظر ہو اور وہ حشر کے دن ان کی مظلومانہ شہادت کی شہادت دے۔

قصر خلافت کے دروازے پر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ اور متعدد دوسرے حضرات شبانہ روز رضا کارانہ طور سے پہرہ پر مستعد رہتے تھے۔ ان کی موجودگی میں بلوائیوں کو ادھر سے اندر گھسنے کا حوصلہ اور موقع نہ تھا۔ چند ایک بار کوشش کی مگر سخت مزاحمت ہوئی۔ آخر انہوں نے دروازے کو آگ لگا دی۔ اور مدافعین کی توجہ کو ادھر منعطف کر دیا۔ کچھ لڑائی بھی ہوئی۔ اس شور و ہنگامہ میں چند بلوائی اپنے منصوبہ کے مطابق عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے پڑوس کے مکان کی چھت سے کود کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کی بالائی منزل میں داخل ہو گئے۔ جہاں آپ اپنے رفقا اور اہل وعیال سے الگ خلوت گزیں ہو گئے تھے۔ بلوائیوں کے داخلے کا گھر میں موجود دوسرے لوگوں کو علم نہ ہو سکا۔ تین بلوائی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سر پر جا پہنچے مگر ان کے مطمئن، پروقار اور خاموش انداز اور تلاوت قرآن میں انہماک سے متاثر اور مرعوب ہو کر واپس چلے گئے۔ تب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ آگے بڑھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی داڑھی پکڑ کر چیخا۔ "اے نعثل (لمبی داڑھی والے احمق) اللہ تجھے رسوا اور غارت کرے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ابن عامر تیرے کام نہ آئے۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بدستور پرسکون اور پروقار انداز میں فرمایا "بھتیجے میری داڑھی چھوڑ دو۔ میں نعثل نہیں ہوں۔ میں مسلمانوں کا خلیفہ ہوں اور میرا نام عثمان ہے۔ اگر تمہارا باپ تمہاری یہ حرکت دیکھتا تو اسے ہرگز پسند نہ کرتا۔" یہ سن کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا نالائق بیٹا بھی متاثر اور شرمسار ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور واپس چلا گیا۔

یہ دیکھ کر بلوائیوں کے لیڈر جوش غضب میں بے تاب ہو گئے۔ دروازہ اور اس کی چھت بھی جل کر گر گئے تھے۔ ایک دم ہلہ کر کے بہت سے باغی آگے بڑھے۔ دروازے پر سخت جنگ ہوئی۔ حضرت حسن، عبداللہ بن زبیر، محمد بن طلحہ، مروان بن الحکم، سعید بن العاص، مغیرہ بن اخنس وغیرہ نے بلوائیوں کا مقابلہ کیا اور زخمی ہوئے (موخر الذکر شہید ہو گئے) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اوپر سے چلا کر فرمایا کہ "تم لوگ میری مدد کرنے سے بری الذمہ ہو" تاہم وہ ڈٹے رہے اور باغی سامنے سے اندر داخل نہ ہو سکے۔ یہ دیکھ کر مصری باغیوں کے لیڈر کنانہ بن بشر، غافقی بن حرب اور کوفہ کے قتیرہ، سودان بن حمران اور عمرو بن الحمق پڑوس کی چھت سے کود کر حضرت عثمان کے خلوت خانہ

میں گھس گئے۔ وہ بڑے اطمینان وسکون سے تلاوت قرآن میں محو تھے۔ سب سے پہلے آگے بڑھ کر عافقی بن حرب نے حملہ کیا اور قرآن مجید کو پاؤں سے ٹھوکر ماری، کنانہ بن بشر نے لوہے کی ایک بھاری سلاخ اس زور سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پیشانی پر ماری کہ آپ پہلو کے بل گر گئے اور فرمایا بسم اللہ توکلت علی اللہ[1] پیشانی مبارک سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ آپ کی ریش مبارک خون سے تربتر ہوگئی اللہ کے مقدس ومتبرک کلام کے اوراق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ذوالنورین اور تیسرے خلیفہ راشد اور ملت اسلامیہ کے عظیم محسن کے خون بے گناہ سے رنگین ہو گئے۔ سودان بن حمران نے تلوار کا وار کیا۔ چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ گھر میں موجود مردوں سے الگ تھلگ ہوکر اوپر کی منزل کے زنانہ حصے کے ایک کمرے میں گوشہ نشین تھے، وہاں کوئی مرد موجود نہ تھا کہ مدافعت کے لئے ہاتھ اٹھاتا۔ شور و ہنگامہ کی آوازیں سن کر آپ کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہ بے تابانہ دوڑ کر آئیں اور سودان بن حمران کی تلوار کو اپنے ہاتھ پر روکا جس سے ان کی تین انگلیاں کٹ گئیں اور ان کی بری طرح توہین کی گئی۔ پھر اس نے تلوار کی ضرب سے خلیفہ راشد کے سانس کی ڈور کاٹ دی۔ ابھی زندگی کی رمق باقی تھی کہ عمرو بن الحمق آپ کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور پے در پے نیزے کی نو ضربات لگائیں۔ عمیر ضابی نے آپ کی پسلی توڑ دی حضرت نائلہ نے صدائے واویلا بلند کی نو (۹) گھر میں موجود آزاد کردہ غلام دوڑ کر آئے۔ سودان بن حمران کو ایک غلام نے قتل کر دیا لیکن وہ خود قتیرہ کے ہاتھوں شہید ہوگیا۔ دوسرے غلام نے کنانہ بن بشر کو اس کے کیفر کردار تک پہنچادیا، قتیرہ بھی اسی انجام کو پہنچا۔

شہادت کے وقت حضرت حضرت ذوالنورین قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے جو آپ کے خون سے رنگین ہوگئی۔

فسیکفیهم الله وهو السمیع العلیم

(ان لوگوں کے مقابلے میں عنقریب اللہ آپ کے لئے کافی ہوگا اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے)

اس حادثہ جانکاہ کے موقع پر کتنی برمحل اور پر معنویت ہے یہ آیہ کریمہ!

گھربار لوٹ لیا

باغیوں نے صبر وتحمل اور عدم تشدد کے مجسمے تیسرے خلیفہ راشد کے بہیمانہ قتل ہی پر اکتفا نہ کی۔ ان کے گھر میں جو کچھ موجود تھا، سب لوٹ لیا۔ عورتوں کے زیور بھی اتار لئے اور ایک بدبخت نے تو حضرت نائلہ کے سر کی چادر بھی کھینچ لی۔ پھر گھر کو بند کر دیا گیا۔ وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے غلام اور سودان بن حمران کی لاشیں پڑی رہیں۔ قتیرہ اور کنانہ گھر کے باہر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دوسرے غلاموں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔

بیت المال لوٹ لیا

حضرت عثمان کو شہید کرنے ان کا گھربار لوٹنے، ان کی خواتین کے زیورات نوچنے اور سر کی چادر تک اتار

---

[1] بسم اللہ۔ میں نے اللہ پر بھروسہ کیا

لینے کے بعد باغیوں نے نعرہ لگایا کہ "اب چلو بیت المال کی طرف اس میں مسلمانوں کا مال ہے اور اس پر ہمارا حق ہے۔" چنانچہ بیت المال جو پوری ملت اسلامیہ کی امانت تھا وہ بھی باغیوں کی دستبرد سے نہ بچا۔

یہ عظیم المیہ، تاریخ اسلام کا انتہائی کربناک اور پرفتن حادثہ ۱۸ ذی الحجہ کو جمعہ کے دن عصر کے وقت وقوع میں آیا[1] اور ہمیشہ کے لئے ملت اسلامیہ کو پارہ پارہ اور بے وقعت کر گیا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ۔ خلافت راشدہ کا تیسرا ستون گر گیا اور چوتھے کو بھی متزلزل کر گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے جس مکان میں شہید ہوئے اس کا ایک حصہ اب جدید شاہراہ میں شامل ہے جو مسجد نبوی کے مشرقی جانب نکالی گئی ہے۔ باقی حصے میں رباط اصفہانی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ مکان چھٹی صدی ہجری کے آخر تک موجود تھا۔ مشہور سیاح ابن جبیر نے اسے ۵۸۰ھ میں دیکھا یہ باب جبریل کے مقابل واقع تھا۔

تدفین

باغیوں کی شورہ پشتی اور چیرہ دستی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ مدینہ پر عملاً ان کا قبضہ تھا۔ بدامنی اور خوف و ہراس کا عالم تھا۔ کسی میں گھر سے نکلنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ خلیفہ راشد کی مظلومانہ شہادت نے اہل مدینہ کے دل و دماغ کو سن کر دیا تھا۔ ان کی سوچ اور عمل کی قوتیں مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ کسی کے وہم و خیال میں بھی نہ تھا کہ خلیفہ راشد کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال ہونی ہو کر رہی۔ لگاتار دو دن تک اس وقت کی دنیا کے سب سے بڑے، سب سے نیک دل، نرم مزاج اور برگزیدہ حکمران کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ آخر سنیچر کا دن گزرنے پر سترہ آدمیوں[2] نے اپنی جانوں پر کھیل کر رات کی تاریکی میں آپ کی تجہیز و تکفین کی۔ خلیفہ شہید کو غسل اور کفن کی ضرورت نہ تھی۔ انہی خون آلود کپڑوں میں رات کی تاریکی میں کابل سے مراکش تک کے فرمانروا کا جنازہ چار دردمندوں نے اٹھایا۔ آپ کے وصی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی[3] اور سترہ غمگساروں نے خاموشی سے جنت البقیع کے قریب حش کوکب[4] میں سپرد خاک کر دیا[5] اور لاش کی بے حرمتی کے خوف سے قبر کا نشان چھپا دیا۔ یوں ایمان و حیا، حلم و بردباری، تقویٰ و دیانت اور عصمت و شرافت کا ماہ کامل خاک و خون کے بادلوں میں چھپ گیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ کا جنازہ اسلام کی عظمت و شوکت اور اتحاد و اخوت کا جنازہ تھا۔

---

[1] والعصرo ان الانسان لفی خسرo (۱۰۳-۲-۲) ترجمہ قسم ہے عصر کی! بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ مولف

[2] ایک روایت کے مطابق صرف چار آدمیوں نے یہ جرأت کی۔ محمد بن سعد کے نزدیک یہ روایت زیادہ صحیح ہے۔ مؤلف

[3] دوسری روایت کے مطابق حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ مولف

[4] لفظی مطلب ہے پھولوں کا باغ، بعد میں جب بنی امیہ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے حش کوکب ہی کو اپنا قبرستان قرار دیا اور اسے جنت البقیع سے ملا دیا۔ مولف

[5] ایک انگریز جرنیل کی میدان جنگ میں موت پر ایک انگریز شاعر نے نظم لکھی تھی اس کے پہلے شعر کا اردو ترجمہ یہ ہے۔ نہ بانگ دہل تھی نہ ماتم کا باجا۔ چلا سوئے مدفن جب اس کا جنازہ۔ تدفین عثمان رضی اللہ عنہ کی کیفیت اس سے کہیں زیادہ الم انگیز ہے۔ مولف

یہ گور بے نشاں اسد خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
(غالب بہ ادنیٰ تصرف)

عمر اور مدت خلافت

شہادت کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عمر بیاسی سال تھی۔ روایات میں پچھتر سال اور نوے سال بھی آئی ہے جو صحیح نہیں۔ آپ نے بارہ دن کم بارہ سال تک خلافت کے فرائض ادا کیے۔

شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا ردّعمل

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کی خبر اہل مدینہ پر بجلی بن کر گری۔ ہر کہ ومہ، موافق اور مخالف اپنی جگہ دم بخود رہ گیا۔ خلفا پر نکتہ چینی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ پر بھی لوگوں نے ان کے روبرو اعتراضات اور نکتہ چینیاں کی تھیں۔ اس لئے عثمان رضی اللہ عنہ پر بھی نکتہ چینی کی گئی، اعتراضات بھی کیے گئے اور مخالفت بھی کی گئی۔ لیکن صحابہ اور اہلِ مدینہ کے صالح عناصر کے اعتراضات نیک نیتی پر مبنی تھے اور ان کا مقصد صورت حال کی اصلاح تھا۔ انہوں نے یہ کبھی نہ چاہا تھا کہ خلیفہ برحق کو قتل کر دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ حملہ آوروں کے جائز مطالبات مان لئے جائیں گے۔ اور وہ واپس چلے جائیں گے اور دھمکیوں سے گزر کر قتل کا ارتکاب نہ کریں گے سبائی گروہ کے زبردست پراپیگنڈہ کی وجہ سے ویسے بھی کچھ لوگوں پر حقیقت مشتبہ ہوگئی تھی اور وہ کنفیوژن کا شکار ہوگئے تھے۔ یہودی منافق عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھیوں کے انتہا پسندانہ عزائم کی اہل مدینہ کما حقہ پیش بینی نہ کر سکے بلکہ مصر، کوفہ اور بصرہ کے باغی گروہوں میں بھی ایسے لوگ تھے جو قتل کے حامی نہ تھے لیکن سبائی عزائم سے وہ بھی بے خبر تھے۔ جب ان کی سوچ کے برعکس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بلوائیوں کے ہاتھوں اپنے خون میں نہا گئے تو انہیں پشیمانی لاحق ہوئی لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ بہر حال انہوں نے اس دلدوز سانحہ کے سنگین اور تباہ کن نتائج کو بھانپ لیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب یہ المناک خبر سنی تو بھاگم بھاگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازے پر پہنچے۔ اپنے زخمی صاحب زادے حسن رحمۃ اللہ علیہ کو غصہ کے عالم میں چانٹا مارا اور حسین رضی اللہ عنہ کو دو ہنٹر رسید کیا۔ محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت میں اپنی جانیں کیوں نہ لڑا دیں۔ پھر بڑے کرب کے ساتھ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر فرمایا کہ ''باری تعالیٰ! میں عثمان کے خون سے بری ہوں اور اے لوگو! اب تم پر ہمیشہ تباہی رہے گی۔''

رازدار رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ

نے فرمایا کہ ''عثمان کے خون سے وہ رخنہ پیدا ہوگیا ہے جسے پہاڑ بھی بند نہیں کرسکتا۔''

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ

نے فرمایا: ''آج عرب ہلاک ہو گئے۔ان کی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔''

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ (یکے از عشرہ مبشرہ)

نے فرمایا کہ ''لوگو! اگر تمہاری بداعمالی کی سزا میں کوہ احد تم پر ٹوٹ پڑے تو بجا ہو گا۔''

فاتح قادسیہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

نے فرمایا کہ ''یہ (باغی) وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیاوی زندگی میں اکارت گئیں حالانکہ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔اے اللہ! تو انہیں اپنے کاموں میں پشیمان بنا اور پھر انہیں اپنی گرفت میں لے لے۔''

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ

نے فرمایا کہ ''اللہ عثمان رضی اللہ عنہ پر رحم کرے اور ان کا مددگار رہے انہوں (باغیوں) نے بری سازش کی اور جو وہ چاہتے تھے وہ پورا نہیں ہو سکا۔ان کے لئے ہلاکت ہے۔''

حضرت ثمامہ بن عدی رضی اللہ عنہ

امیر صنعا کو جب خبر پہنچی تو بہت روئے اور کہا: ''آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی وخلافت کا خاتمہ ہو گیا۔اب بادشاہت کا دور شروع ہو گا۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

نے فرمایا کہ ''اگر ساری مخلوق اس قتل میں شریک ہوتی تو قوم لوط کی طرح اس پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوتی۔''

خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس بن مالک

نے فرمایا ''عثمان کی زندگی میں اللہ کی تلوار میان میں تھی۔لیکن اب میان سے نکلی ہے تو قیامت تک برہنہ ہی رہے گی۔''

ایک اور صحابی نے فرمایا کہ ''آج تک تم اس اونٹنی سے دودھ دوہتے رہے۔آج کے بعد دودھ کی بجائے خون نکلے گا''[1]

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

نے فرمایا! ''عثمان رضی اللہ عنہ دھلے ہوئے کپڑوں کی طرح پاک صاف ہو گئے۔لوگوں نے انہیں قتل کر دیا حالانکہ وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والے اور خدا کا خوف کھانے والے تھے۔''

---

[1] افسوس کہ یہ پیش گوئی اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، ثمامہ رضی اللہ عنہ اور انس رضی اللہ عنہ کی پیش گوئیاں آئندہ چل کر حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں۔مولف

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر صحابہ سوگوار اور اشکبار تھے اور تو اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری سال میں ان کے مخالف اور نکتہ چیں رہے اور سبائی گروہ کے ہم نوا ہو گئے تھے وہ بھی منفعل اور پشیمان تھے اور مخالفین سے کہتے تھے کہ ''ہم نے ابن عفان کے ہاتھوں پر برضا و رغبت بیعت کی تھی۔ تم لوگوں نے انہیں شہید کیوں کیا؟ ہم نے تو یہ کبھی نہیں چاہا تھا۔''

ابن سعد اور طبری نے لکھا ہے کہ بہت سے باغی بھی پشیمان ہوئے ع

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

مرثیے

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر متعدد شعراء نے دردناک مرثیے اور نوحے لکھے۔ قاسم بن امیہ نے ایک ہی شعر میں شہادت عثمان کے المیہ کی روح کھینچ کر رکھ دی:

لوگو! خدا کی قسم تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قربانی کے دن بہت بری قربانی کی ہے۔

شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے ایک سے زیادہ مرثیے کہے۔ ان کے بعض اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

- جو خالص موت دیکھنے کا آرزومند ہو جس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو اسے چاہئے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر جائے۔
- لوگوں نے اس شخص کو ذبح کر ڈالا جس کی پیشانی پر سجدوں کے نشان تھے۔ اور تمام شب نماز اور تلاوت قرآن میں گزار دیتا تھا۔
- اگر آج ابن اروی (حضرت عثمان) کا گھر تباہ ہو گیا ہے۔ اس کا ایک دروازہ گرا ہوا ہے اور دوسرا دروازہ جل کر تباہ ہو گیا ہے تو کبھی ایسا زمانہ بھی تھا کہ اس گھر پر پہنچ کر حاجت مند اپنی حاجت روائی کرتا تھا۔ یہاں ذکر الٰہی اور شرافت کے کاموں کا چرچا رہتا تھا۔
- تم ضرور ان (باغیوں) کے شہروں میں تاخت و تاراج کی خبر سنو گے اور اللہ اکبر کے ساتھ انتقام کے نعرے سنو گے۔
- میں ابو عمرو (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا ماتم کرتا ہوں۔ وہ اپنی آزمائش میں پورے اترے۔

حضرت کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ کے بعض اشعار کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

- ہوش اڑ گئے ہیں اور آنسو لگاتار بہہ رہے ہیں۔
- ایک بہت خوفناک حادثہ رونما ہو گیا ہے جس نے پہاڑوں کو گرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔
- خدا اس قوم کو غارت کرے جس نے پاک، طیب، برگزیدہ امام کو قتل کیا۔
- وہ کسی گناہ کی بنا پر قتل نہیں کیا گیا بلکہ لوگوں نے اس کے خلاف جھوٹی باتیں بنائیں جن کی کوئی اصل نہ تھی۔
- اس نے اپنا ہاتھ روک کر دروازہ بند کر لیا اور یقین کر لیا کہ اللہ غافل نہیں ہے۔

○ اس نے اپنے گھر والوں سے کہہ دیا کہ دشمنوں کو قتل نہ کرو۔ خدا اس کو معاف کرے گا جو مسلمان کو قتل نہیں کرتا۔
○ پھر تم نے دیکھ لیا کہ خدا نے ان پر کیسی مصیبت نازل کی یعنی باہمی الفت کے بعد باہمی بغض وعداوت میں مبتلا ہو گئے۔
○ تو نے دیکھ لیا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد بھلائی لوگوں سے یوں پیٹھ پھیر کر چل دی گویا کہ آندھی تھی کہ آئی اور نکل گئی۔
○ اس (عثمان رضی اللہ عنہ) کی قبر میں بخشش، سخاوت اور سیاست دفن ہو گئی اور وہ نیکی جو سب سے آگے بڑھ کر جاتی تھی۔
○ کتنے یتیم تھے جن کی خبر گیری کی جاتی تھی۔ اب وہ تباہ و برباد ہو گئے۔
○ وہ حلم و بردباری کے ساتھ بار خلافت اٹھا رہے تھے۔ ان کی نیکی اور شرافت شہرہ آفاق تھی۔

ولید بن عقبہ:

○ کیا تم انصار کی بدقسمتی نہیں دیکھتے کہ ان کے سامنے دن دیہاڑے وہ شخص قتل کر دیا گیا۔
○ جس کے بعد راتوں کو آسمان پر ستارے نہیں جگمگائیں گے۔"
○ اور قریش کو دیکھو کہ انہوں نے عصبیت کی بنا پر اس کا خون دیکھا جبکہ وہ اس کے قرابت دار اور اصحاب تھے۔
○ عثمان رضی اللہ عنہ کو ان مشیروں نے قتل کیا جو اس کے عزیز تھے۔ یہ اقارب اب روز عقارب کی طرح ہماری طرف لپک رہے ہیں۔[1]

نضر بن حارث سہمی:

○ ان کے آبا کی قسم جو کچھ انہوں نے کیا کبھی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔
○ خون بہا چکنے کے بعد اب اس پر روتے ہیں۔ کیا اس طرح وہ خون جائز ہو جائے گا؟
○ انہوں نے اس کے گھر کو لوٹ کر منہدم کر دیا جس کی وجہ سے سورج اور چاند بھی گہنا گئے۔

مشہور شاعر فرزدق کے چچا حباب بن یزید مجاشعی نے یہ اشعار کہے:

○ تمہارے باپ کی قسم! تم مت گھبراؤ کیونکہ اب خیر و برکت بہت کم رہ گئی ہے۔
○ مسلمان اپنے دین میں کمزور ہو گئے ہیں اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت نے (اپنے پیچھے) طویل شر و فساد چھوڑا ہے۔
○ اے ملامت کرنے والو! ہر انسان کو فنا ہونا ہے، اس لئے تم اللہ کے راستے پر خوش اسلوبی سے چلتے رہو۔

ان کے علاوہ حنظلہ بن ربیع تمیمی، خالد بن عقبہ اور مغیرہ بن اخنس نے بھی دردناک اشعار کہے۔

---

[1] ولید بن عقبہ کے اشعار سے متبادر ہوتا ہے کہ بنی امیہ کا گمان تھا کہ انصار اور قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا اگر وہ ساتھ دیتے تو یہ حادثۂ فاجعہ پیش نہ آتا لیکن تاریخ اسے جھٹلاتی ہے۔ مولف

حقیقت یہ ہے کہ ملت کا سواد اعظم عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے لئے ہمیشہ سوگوار رہے گا۔ ان کی مظلومانہ شہادت سے اسلام اور ملت اسلامیہ کو جو ضعف پہنچا اور جس نفاق وتشتت کا آغاز ہوا اس کی تلافی قیامت تک نہیں ہو سکے گی۔ آج ہم دنیا میں نوے کروڑ ہونے کے باوجود اپنی نا اتفاقی کی وجہ سے ذلیل وخوار ہیں۔

شہادت پر تبصرہ

اسلام کے تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت دنیا کی تاریخ کا ایک ایسا المیہ ہے جس کی مثال نہیں ملتی اور نہ آئندہ ملے گی۔ دنیا کی سب سے بڑی مملکت کا فرمانروا جسے وسیع اختیارات اور ذرائع حاصل تھے اور اس کے ایک اشارے پر فوجوں کے دل بادل اکٹھے ہو سکتے اور باغیوں کو بڑی آسانی سے تہ تیغ کر سکتے تھے، وہ بھوک پیاس کے عالم میں بیکسی اور مظلومی کی موت اور گھر بار کی تباہی اپنے لئے قبول کر لیتا ہے لیکن اپنے خیر خواہوں اور ساتھیوں کو مقابلہ اور مدافعت کے لئے ہاتھ اٹھانے سے سختی سے منع کر دیتا ہے۔ لڑنے کی بجائے باغیوں کے سامنے اتمام حجت اور اپنے موقف کی وضاحت کے لئے بار بار تقریریں کرتا ہے اور ان کے گستاخانہ جوابات اور چیرہ دستیوں کو بے مثال صبر وتحمل کے ساتھ برداشت کرتا ہے حالانکہ باغیوں کے خلاف تادیبی کارروائی اور ان کا قتل جائز تھا۔ باغی حق پر نہ تھے اور سراسر قصوروار تھے۔ انہیں خلیفہ پر چڑھائی کرنے اور الٹے سیدھے مطالبات پیش کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ اپنی ذاتوں کے سوا کسی علاقہ یا صوبہ کے نمائندے نہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اصلاح کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔

تاہم اگر اس پر عملدر آمد میں تاخیر ہو رہی تھی تو بھی خلیفہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے اس کی معزولی کا مطالبہ کرنے اور پھر قتل تک نوبت پہنچانے کا قطعاً کوئی جواز نہ تھا۔ ساری مملکت اسلامیہ کے متفقہ طور پر منتخب اور مسلمہ خلیفہ کو محض چند انتظامی شکایات کی بنا پر صرف کوفہ، بصرہ اور مصر کے دو ہزار غیر نمائندہ سازشی افراد معزول کرنے کا کوئی حق نہ رکھتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو سزا یافتہ تھے اور خلیفہ کے خلاف انتقامی جذبات رکھتے تھے اور پھر ان ظالموں نے محاصرہ کے دوران میں شرمناک زیادتیاں کیں۔ آخر تمام شرعی اور قانونی حدود سے تجاوز کر کے اسے قتل کر دیا اور گھر بار لوٹ لیا۔ خلیفہ کا خون اور مال دونوں اپنے اوپر حلال کر لئے بیت المال بھی لوٹ لیا۔ حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جن کاموں کو وہ اپنے نزدیک گناہ سمجھتے تھے۔ وہ اگر گناہ تھے تو بھی شریعت کی رو سے کوئی شخص انہیں ایسا گناہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس پر کسی مسلمان کا خون حلال ہو جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریروں میں باغیوں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اسلامی قانون میں کسی انسان کا قتل صرف تین صورتوں میں جائز ہے۔ قتل کے بدلے قتل، شادی شدہ ہو کر زنا کا ارتکاب اور ارتداد۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان تینوں میں سے کسی کے مرتکب نہ ہوئے تھے۔ سورہ مائدہ کے پانچویں رکوع میں حضرت آدم کے بیٹے ہابیل کا اس کے بھائی قابیل کے ہاتھوں قتل کا واقعہ آیا ہے۔ قابیل کی جارحیت کے مقابلے میں ہابیل نے اپنے دفاع میں ہاتھ نہیں اٹھایا۔ امت محمدیہ میں سے پہلا شخص جس نے بااختیار اور طاقتور ہونے کے باوجود ہابیل کے عمل کی پیروی کی وہ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے اپنا گلا کٹوانا گوارا کرلیا لیکن کسی مسلمان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا گوارا نہ کیا۔ انہوں نے جان و مال کی قربانی دے کر بلند ترین اسلامی ادارے یعنی خلافت کی حرمت اور مسلمانوں کو باہمی فتنہ وفساد اور افتراق وانتشار سے بچانے کی کوشش کی۔[1]

جس طرح دنیا کے پہلے قاتل قابیل کو ہر بعد کے قاتل کے گناہ کا ایک حصہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو بھی شاید ہر اس قاتل کے گناہ کا ایک حصہ پہنچتا ہوگا جس نے اسلام کا مدعی ہو کر کسی دوسرے مسلمان کو ناحق قتل کیا ہوگا۔

دنیا میں آج تک کسی ایسے حکمران کی مثال نہیں ملتی جس نے اپنی حکومت وسلطنت کو مخالفوں اور دشمنوں سے بچانے کے لئے ہر قسم کے حربوں اور خونریزی کو جائز نہ سمجھا ہو۔ قیصر و کسریٰ ہوں یا فغفور و خاقان یا مشرق و مغرب کا کوئی دوسرا شہنشاہ یا سلطان، سب نے اپنے دشمنوں اور باغیوں کا محض شک وشبہ کی بنیاد پر بھی بے دریغ خون بہایا ہے تاکہ ان کا اپنا تختِ حکومت محفوظ رہے۔ اس انتہائی نازک موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے طرزِ عمل سے ایک خلیفہ برحق اور ایک بادشاہ کے فرق کو صاف صاف نمایاں کر کے رکھ دیا۔ ''ان کی جگہ کوئی بادشاہ ہوتا تو اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے کوئی بازی کھیل جانے میں بھی اسے باک نہ ہوتا۔ اس کی طرف سے اگر مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی، انصار و مہاجرین کا قتل عام ہو جاتا اور ازواج مطہرات کی توہین ہوتی اور مسجد نبوی مسمار ہو جاتی تو وہ پروانہ کرتا۔ مگر وہ خلیفہ راشد تھے۔ انہوں نے سخت سے سخت لمحوں میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا کہ ایک خدا ترس فرمانروا اپنے اقتدار کی حفاظت کے لئے کہاں تک لے جا سکتا ہے اور کس حد پر پہنچ کر اسے رک جانا چاہئے۔ وہ اپنی جان دے دینے کو اس سے ہلکی چیز سمجھتے تھے کہ ان کی بدولت حرمتیں پامال ہوں جو ایک مسلمان کو ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہونی چاہئیں۔''[1]

عدم تشدد کا سب سے بہترین اور درخشاں عملی نمونہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پیش کیا۔ ہندو لیڈر موہن داس کرم چند گاندھی بھی عدم تشدد کا زبانی پرچار کرتے تھے ان کا یہ پرچار دراصل برطانوی اقتدار و استعمار کے مقابلے میں اپنی کمزوری اور بے بسی کی بنا پر تھا، کسی دینی یا روحانی یا مستقل سیاسی عقیدے کی بنا پر نہ تھا[2] بہرحال جب وہ اچانک ایک سرپھرے ہندو نتھو رام گاڈسے کی گولیوں کی نشانہ بن گئے تو مشہور برطانوی ادیب جارج برنارڈ شا نے کہا تھا کہ یہ نتیجہ ہے بے حد نیک ہونے کا (This is the result of benig too good) یہ قول اگر صحیح معنی میں

---

[1] خلافت وملوکیت صفحہ ۱۲۰ از سید ابوالاعلیٰ مودودی

[2] اگست ۱۹۴۲ء میں جب انہوں نے یہ دیکھا کہ جاپان بڑی تیزی سے مشرقی ایشیا کے ممالک فتح کر کے برما پر قابض ہو چکا ہے اور کلکتہ پر بمباری کر رہا ہے تو گاندھی جی نے انگریزوں کے خلاف ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی پر تشدد مہم چلائی جس میں بے شمار اتلاف جان و مال ہوا۔ اسی طرح ۱۹۴۶ء میں جب بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کے ردعمل کے طور پر نواکھالی (بنگال) میں ہندوؤں کے خلاف کچھ فسادات ہوئے تو گاندھی جی نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ راقم الحروف نے دہلی میں ان کے پرارتھنا جلسوں میں ان کی زبان سے اشتعال انگیز کلمات سنے آخر وہ گڑھ مکتیسر میں مسلمانوں کا قتل عام کرا کر رہے۔ مولف

کسی پر صادق آسکتا ہے تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات اور ان کی المناک شہادت ہے کہ با اختیار ہو کر بے اختیار بنے رہے۔ انہوں نے ابن سبا کی سازش اور اس کے دوررس مضمرات کو بھانپ لیا تھا کہ باغیوں کا ہدف محض ان کی ذات ہی نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کا اقتدار اور اتحاد ہے۔ وہ جانتے تھے کہ مسئلہ کا صحیح حل تلوار نہیں۔ ابھی تک مسلمان کی تلوار مسلمان پر نہیں اٹھی۔ اس لئے خون کا احترام باقی ہے لیکن اگر ایک دفعہ تلوار چل گئی تو پھر چلتی ہی رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سنگین، مہلک اور اندوہناک نتائج کے لحاظ سے خلیفہ ثالث کی شہادت تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی باہمی ابدی خونریزی کے علاوہ بنی امیہ کی ملوکیت کے لئے راہ ہموار کر دی۔

اس میں شک نہیں کہ بنی امیہ سے حد سے بڑھی ہوئی صلہ رحمی کے باوجود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ساری دنیا کے ایک عظیم انسان تھے اور شہادت نے انہیں عظیم تر کر دیا۔ اس حادثہ فاجعہ کا ایک ایسا اندوہناک سلسلۂ ردعمل شروع ہوا جس نے مسلمانوں کی توانائیوں کو اس طرح چوس لیا جیسے آکاش بیل کسی ہرے بھرے درخت کا رس چوس کر اسے ہیزم خشک بنا دیتی ہے۔

(جنگ جمل، جنگ صفین، جنگ نہرواں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت، حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی شہادت، مختار ثقفی کی شورش، عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت و شہادت، حجاج بن یوسف کی سفاکی و خونریزی، بنی امیہ اور بنی عباس کی جنگ اقتدار، فرقہ خارجیہ اور پھر فرقہ شیعہ کا ظہور سبھی شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کا نتیجہ تھے۔ مرور ایام کے ساتھ فرقوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی[1]

اسلام اور ملت اسلامیہ کو جن خطرات سے بچانے کی خاطر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عظیم قربانی دی، وہ پیش آ کر رہے۔ مسلمانوں کا سیاسی اور مذہبی اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ اسلامی فتوحات کا سیلاب تھم گیا اور باہمی جنگ و جدال و مناقشات کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا حصار ملی میں ایسا رخنہ عظیم پیدا ہو گیا جو آج تک بند نہ ہو سکا۔ جہاد فی سبیل اللہ کی بجائے فساد فی سبیل اللہ شروع ہو گیا۔ ملت واحدہ متحارب گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت وحدت اسلامی کی شکست ثابت ہوئی۔ اور یہ وہ ملی بدبختی تھی جس کے متعلق

---

[1] شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے ۲۵ سال بعد کربلا کے میدان میں ابن زیاد کی چار ہزار فوج کے مقابلے میں قطعی مایوس کن حالات کے باوجود نواسۂ رسول حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما نے عدم تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اپنے بے سروسامان بہتر ساتھیوں (جنہیں اقبال رحمۃ اللہ علیہ ''بہ یزداں ہم عدد'' کہتا ہے) کے ساتھ حق کی خاطر مقابلہ کرنے کے بعد اپنی قیمتی جانیں جاں آفریں کے سپرد کیں۔ ان پر دریائے فرات کا پانی بند کیا گیا جبکہ عثمان رضی اللہ عنہ پر اس کنوئیں کا پانی روک دیا گیا جو خود انہوں نے اپنے مال سے خرید کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کیا تھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے خیمے بھی لوٹ لئے گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھر بار بھی۔ کربلا کا المیہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے۔ صبر عثمان رضی اللہ عنہ اور صبر حسین رضی اللہ عنہ کی معرکہ وجود میں مثال نہیں ملتی۔ ایک نے صاحب اقتدار ہو کر مسلمانوں کو فتنہ و خونریزی سے بچانے کے لئے عدم تشدد سے کام لیا اور شہادت پائی۔ دوسرے اسلام اور خلافت کو اصلی صورت میں برقرار رکھنے اور باطل کے غلبہ سے بچانے کے احتجاجی جنگ کر کے آغشتہ بخوں ہوئے۔ مؤلف

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محصوری کے ایام میں باغیوں کو بار بار متنبہ کیا، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر صحابہ نے بھی متنبہ کیا مگر باغیوں نے سنی ان سنی کر دی۔ دشمنوں کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب وخوف اٹھ گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد، یگانگی، اخلاص، شوق جہاد اور ان کے متعلق اس قرآنی تصور کو کہ وہ ''رحمآء بینھم اشدآء علی الکفار'' ہوتے ہیں۔ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ ع

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے!

عہد جاہلیت کی وہ قبائلی عصبیتیں جنہیں اسلام نے دبا دیا تھا اگرچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں سر اٹھانے لگی تھیں لیکن ان کی شہادت کے بعد پورے زور شور سے بیدار ہو گئیں اور قبیلے اپنے جاہلی تفاخر کے ساتھ باہم دست وگریباں ہونے لگے۔ اس کا پہلا بھرپور مظاہرہ جنگ جمل میں ہوا۔ عہد نبوی تک قریش عرب کا سب سے بڑا بارسوخ اور خوشحال تاجر قبیلہ تھا۔ ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانے میں وہ جہاد میں ایسا مصروف ہوا اور مالِ غنیمت اور وظائف کا ایسا چسکا پڑا کہ اس کی تجارت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور اس کا سیاسی تفوق دوسرے بدوی عرب قبائل کے لئے رشک وحسد کا باعث بن گیا جس کا پہلا ہدف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بنے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے ساتھ قریش کی حقیقی برتری ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ ہر مخلص اور دردمند مسلمان سوچتا ہے کہ کاش حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش نہ آیا ہوتا! کاش حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک خارجی کے ہاتھوں شہید نہ ہوئے ہوتے[1] اور کاش کربلا کا المیہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک باب نہ ہوتا!

اس موقع پر خیال آتا ہے کہ مصری، کوفی اور بصری باغی بالترتیب حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرف مائل تھے اور ابتدا میں انہوں نے انہی تینوں بزرگوں کی طرف رجوع کیا تھا۔ اگر یہ حضرات یک دل اور یک زبان ہو کر باغیوں کے ساتھ اپنے اثر ورسوخ کو کام میں لاتے اور اہل مدینہ کو بھی خلیفہ کے دفاع پر مجتمع کر کے ابھارتے۔ خواہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے دفاع میں ہتھیار اٹھانے کو پسند نہ بھی کرتے لیکن ملت اسلامیہ اور نظم خلافت کی بقا کے لئے یہ ضروری تھا...... تو عین ممکن تھا کہ باغی خلیفۂ وقت کو قتل کرنے کے انتہائی اقدام سے باز رہتے اور افہام وتفہیم سے معاملہ سلجھ جاتا اور اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معزولی ناگزیر ہوتی تو کسی دوسرے موزوں شخص کو منتخب کیا جا سکتا تھا لیکن بعض روایات سے متبادر ہوتا ہے کہ بعض اکابر کے لاتعلقانہ رویہ سے باغیوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ مدینہ کی بیشتر آبادی باغیوں کی ناسزا حرکات کو قابل نفرین سمجھتی رہی لیکن باغیوں نے دوسری بار اچانک مدینہ پہنچ کر اہم ناکوں پر قبضہ کر کے اہل شہر کو تقریباً بے بس کر دیا تھا پھر یہ بھی کہ لوگوں نے قتل کی دھمکیوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور یہی سمجھا کہ باغی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت سے دستبرداری پر مجبور کرنے کے لئے قتل کی باتیں کرتے ہیں۔ شہادت کے بعد سب کو سخت ندامت اور پشیمانی ہوئی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین شہادت عثمان رضی اللہ عنہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس میں شک اور انکار کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ آپ کا خون قاتلوں کے لئے کسی طرح بھی حلال نہ

---

[1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل سودان بن حمران قبیلہ مراد سے تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتل ابن ملجم بھی اسی قبیلہ سے تھا۔ مولف

تھا اس لئے کہ آپ جس مسلک کے پابند تھے اس میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہے۔ آپ کے ساتھیوں کی بے پروائی دانستہ بھی ہوسکتی ہے اور نادانستہ بھی۔ آپ کے معترضین کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش اس کی تھی کہ وہ بغاوت کرتے اور امت کو بغاوت پر آمادہ کرتے۔ اگر کامیاب ہوجاتے تو صوبوں کے لئے مسلمانوں کے نمائندے مقرر کر لیتے۔ اب یہ نمائندوں کا فرض تھا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بحث ومباحثہ اور گفت وشنید کرتے۔ کچھ ان کی سنتے، کچھ اپنی سناتے۔ اس کے بعد اگر ان کا باقی رکھنا مناسب خیال کرتے تو باقی رکھتے ورنہ معزول کر کے ان کی جگہ دوسرا امام مقرر کر لیتے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معاملہ نئے امام کے حوالے کر دیتے جو ان سے ان کی جانوں اور مالوں کے بارے میں اگر کوئی قضیہ تھا تو باز پرس کرتا۔ لیکن وہ باغی جن کو مسلمانوں کی وکالت حاصل نہیں ہے، اس کا حق نہیں رکھتے کہ خلیفہ کو معزول کر دیں اور یہاں تو معزول کرنے کی بات بھی نہیں ہے۔ انہوں نے تو خلیفہ کا خون ہی کر دیا حالانکہ عام مسلمانوں کی طرح خلیفہ کا خون حرام تھا بلکہ اس میں خلافت کی حرمت کا اضافہ بھی تھا[1]۔''

اب ایک اقتباس سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کا ملاحظہ فرمائیے:

''مگر واقعہ یہ ہے کہ اس ایک پہلو[2] کو چھوڑ کر باقی جملہ پہلوؤں سے ان (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا کردار بحیثیت خلیفہ ایک مثالی کردار تھا جس پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ علاوہ بریں ان کی خلافت میں بحیثیت مجموعی خیر اس قدر غالب تھی اور اسلام کی سربلندی کا اتنا بڑا کام ان کے عہد میں ہوا تھا کہ ان کی پالیسی کے اس خاص پہلو سے غیر مطمئن ہونے کے باوجود عام مسلمان پوری مملکت میں کسی جگہ بھی ان کے خلاف بغاوت کا خیال تک دل میں لانے کے لئے تیار نہ تھے...... یہی وجہ ہے کہ جو مختصر سا گروہ ان کے خلاف شورش برپا کرنے کے لئے اٹھا اس نے بغاوت کی دعوت عام دینے کی بجائے سازش کا راستہ اختیار کیا اس تحریک کے علمبردار مصر، کوفہ اور بصرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے باہم خط وکتابت کر کے خفیہ طریقے سے یہ طے کیا کہ اچانک مدینہ پہنچ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر دباؤ ڈالیں۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست تیار کی جو زیادہ تر بالکل بے بنیاد یا ایسے کمزور الزامات پر مشتمل تھی جن کے معقول جواب دیئے جاسکتے تھے اور بعد میں دیئے بھی گئے...... یہ لوگ کسی علاقے کے بھی نمائندے نہ تھے بلکہ ساز باز سے انہوں نے اپنی پارٹی بنائی تھی جب یہ مدینہ سے باہر پہنچے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو انہوں نے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر تینوں بزرگوں نے ان کو جھڑک دیا اور

---

[1] ''الفتنۃ الکبریٰ'' اردو ترجمہ ''خلافت عثمان وعلی'' مترجمہ شاہ حسن عطا۔ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی

[2] یعنی بنی امیہ سے حد سے بڑھی ہوئی صلہ رحمی اور مملکت کے اعلیٰ مناصب پر ان کا تقرر۔ مولف

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ایک ایک الزام کا جواب دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پوزیشن صاف کی۔ مدینے کے مہاجرین وانصار بھی، جو دراصل اس وقت مملکت اسلامیہ کے ارباب حل وعقد کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے ہم نوا بننے کے لئے تیار نہ ہوئے، مگر یہ لوگ اپنی ضد پر قائم رہے اور بالآخر انہوں نے مدینہ میں گھس کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو گھیر لیا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب یہ تھا کہ میں تمہاری ہر اس شکایت کو دور کرنے کے لئے تیار ہوں جو صحیح اور جائز ہو مگر تمہارے کہنے سے میں معزول نہیں ہو سکتا ...... آخر ان لوگوں نے ہجوم کر کے سخت ظلم کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا ...... یہ صرف حضرت عثمان پر نہیں خود اسلام اور خلافت راشدہ کے نظام پر ان لوگوں کا ظلم عظیم تھا۔ ان کی شکایات میں سے اگر کوئی شکایت وزنی تھی تو صرف وہی جس کا اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں[1] اس کو رفع کرانے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہو سکتی تھی کہ یہ لوگ مدینہ طیبہ کے انصار ومہاجرین اور خصوصاً اکابر صحابہ سے مل کر ان کے ذریعے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اصلاح پر آمادہ کرتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوشش شروع بھی کر دی تھی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اصلاح کا وعدہ کر لیا تھا۔ تاہم اگر یہ شکایت رفع نہ بھی ہوتی تو شرعاً اس کی بنا پر خلیفہ کے خلاف بغاوت کر دینے اور اس کی معزولی کا مطالبہ کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہ تھا لیکن یہ لوگ ان کی معزولی پر اصرار کرنے لگے۔ حالانکہ ساری دنیائے اسلام کے خلیفہ کو صرف بصرہ وکوفہ ومصر کے دو ہزار آدمی، جو خود اپنے علاقوں کے نمائندے بھی نہ تھے۔ معزول کرنے یا اس سے معزولی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہ رکھتے تھے۔ انہیں خلیفہ کے انتظام پر اعتراض کا حق ضرور تھا، وہ شکایات پیش کرنے کے بھی حقدار تھے اور اپنی شکایات کے ازالہ کا مطالبہ بھی کر سکتے تھے۔ مگر یہ حق انہیں ہرگز نہیں پہنچتا تھا کہ اہل حل وعقد نے اس وقت کے دستور کے مطابق جس شخص کو خلیفہ بنایا تھا اور جسے دنیا کے سب مسلمان مان رہے تھے۔ اس کے خلاف یہ چند آدمی بغاوت کر دیتے اور کسی نمائندہ حیثیت کے بغیر اپنے اعتراضات کی بنا پر اس کی معزولی کا مطالبہ کرتے ...... پھر انہوں نے اس زیادتی پر بھی بس نہ کی بلکہ تمام شرعی حدود سے تجاوز کر کے خلیفہ کو قتل کر دیا اور ان کا گھر لوٹ لیا ...... جو لوگ شریعت کا نام لے کر ان پر معترض تھے انہوں نے خود شریعت کا کوئی لحاظ نہ کیا اور ان کا خون ہی نہیں ان کا مال بھی اپنے اوپر حلال کر لیا۔''[2]

مختصر یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہ تھا۔ سازشی باغیوں کا فعل خلاف شریعت تھا۔ ایک یہودی منافق ابن سبا نے کچھ لوگوں کی بے اطمینانی سے فائدہ اٹھا کر اپنی سازشی تحریک منظم کی جیسے پہلی عالمی

---

[1] یعنی بنی امیہ نوازی۔ مولف

[2] ''خلافت وملوکیت''۔ چودھویں اشاعت صفحات ۱۱۶ تا ۱۱۹۔

جنگ کے دوران میں یہودی لینن اور اس کے ساتھیوں نے روس کی زار شاہی کے خلاف اشترا کی سازش تیار کر کے جرمنی اور دوسرے ممالک کی مدد سے وہاں کمیونزم کو ٹھونس دیا حالانکہ ملک کی آبادی کا کثیر حصہ ان سے اور ان کی تحریک سے لاتعلق تھا۔ دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کسی ایک واقعہ سے ایسے زبردست اور بھیانک اثرات مترتب ہوئے ہوں گے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے مترتب ہوئے۔ اسلام کی تاریخ کا رخ بدل گیا اور اگلے چند ہی سال میں اسلام کا جمہوری نظام خلافت سے ملوکیت میں تبدیل ہو گیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ایک فرد کی شہادت نہ تھی بلکہ ایک پرامن، مساویانہ اور عادلانہ صالح نظام کی موت کی طرف ایک بڑا اور فیصلہ کن اقدام تھا۔ ملی افتراق و انتشار کے تاریک سائے باہمی خونریزی کی سرخ دھاریوں کی آمیزش سے گہرے، وسیع اور خوفناک ہوتے چلے گئے، اور یہ سب کچھ داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے پچیس سال کے اندر ہوا۔ اس عظیم و کربناک المیہ کے منحوس اثرات سے امت مسلم کو چھٹکارا ملتا نظر نہیں آتا۔

آج روئے زمین پر مسلمانوں کے متعدد آزاد ممالک اور حکومتیں موجود ہیں جن کی مجموعی آبادی نوے کروڑ ہے۔ وسائل پیداوار کی بھی کمی نہیں لیکن دنیا کے معاملات میں ان کی آواز صدا بہ صحرا کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ ان کی آواز متفقہ آواز نہیں ہوتی۔ کچھ روس کی آواز میں اپنی آواز ملاتے ہیں، کچھ امریکہ کے ہم زبان اور خیمہ بردار بنے ہوئے ہیں۔ دنیا کی سپر پاورز انہیں اپنے اپنے اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ برطانیہ، امریکہ اور روس کی ساختہ پرداختہ بے حد چھوٹی سی اسرائیلی ریاست جو دنیا کے نقشہ پر محض ایک نقطہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کی آبادی بمشکل پچاس لاکھ ہوگی یعنی اکیلے شہر کراچی کی آبادی سے بھی کم، دنیا بھر کے مسلمانوں خصوصاً مشرق وسطیٰ کی تیل کی دولت سے مالا مال غیر جمہوری عرب ریاستوں کو ناکوں چنے چبوا رہی ہے اور عظیم تر اسرائیل کے خواب دیکھ رہی ہے۔ جس میں خاکم بدہن حجاز بھی شامل ہوگا۔ ادھر مسلمان حکومتیں اور فرقے ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں۔

راقم الحروف کو ۱۹۷۷ء میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کو ناکام جنگ آزادی کے بعد بعض مسلمان علماء ہندوستان سے مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے، ان کی مساعی سے وہاں مدرسہ صولتیہ قائم ہوا۔ جو آج بھی جاری ہے۔ مدرسہ مذکور کے ناظم اعلیٰ مولانا مسعود شمیم نے اس بندۂ عاجز کی دعوت کی۔ دوران گفتگو انہوں نے بتایا کہ اس سال یعنی ۷۷ء میں تقریباً آٹھ لاکھ سے زائد سعودی باشندے موسم گرما گزارنے کے لئے یورپ اور امریکہ گئے یعنی سعودی عرب کی کل آبادی کا تقریباً دس فیصد۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ کسی ملک کی اتنی بڑی آبادی سیر و تفریح و تماشا کے لئے اپنے ملک سے بیک وقت باہر چلی جائے؟ کثرت مال کا نتیجہ کثرت عیش!

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے مختلف مواقع پر از راہ تنبیہ فرمایا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں پر بارش کی طرح فتنے برس رہے ہیں۔ خدا کی قسم! مجھ کو تم پر فقر و فاقہ کا خوف نہیں بلکہ دولت کا خوف ہے کہ جس طرح تم سے پہلوں پر دنیا پھیلا دی گئی تھی تم پر بھی نہ پھیلا دی جائے تو تم اس میں آپس میں رشک و حسد کرنے لگو اور جس طرح اس نے تم سے پہلوں کو غافل کر دیا تم کو بھی غافل کر دے۔

دیکھو میرے بعد ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگنا۔ ایک زمانہ آئے گا کہ تمہارے سامنے دن کو ایک کھانے کا پیالہ اور رات کو دوسرے کھانے کا پیالہ آئے گا اور کعبہ کے پردوں کی طرح (بیش قیمت اور عمدہ) تمہارے لباس ہوں گے۔ تم اس (موجودہ) حالت میں اچھے ہو کہ تم سب باہم ایک دوسرے سے محبت اور پیار کرتے ہو اور اس وقت تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹو گے۔"[1]

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ "قریب ہے کہ قومیں تم پر حملہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گی (یعنی تم پر متحدہ حملہ کریں گی) جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر گرتے ہیں۔" حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا یہ اس لئے ہوگا کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی تعداد کم ہو جائے گی؟" فرمایا "نہیں، تمہاری تعداد ان دنوں بہت بڑی ہوگی لیکن تم ایسے ہو جاؤ گے جیسے سیلاب کی سطح پر کف اور خس و خاشاک ہوتا ہے" کہ سیلاب ان کو بہائے لئے جاتا ہے) اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب دور کر دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا۔" کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا "دنیا (فوائد دنیا) کی محبت اور موت سے کراہت۔"[2]

افسوس کہ آج ہم جناب رحمت للعالمین و خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پیشین گوئیوں کا مصداق بن چکے ہیں۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے میں ہی کثرت مال، کثرت عیش اور باہمی رشک و رقابت کے حالات پیدا ہو گئے تھے (آپ کے لئے ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے بعد مسند نشین خلافت ہونا سب سے بڑی آزمائش بن گیا۔ لوگ جانے والے سربراہ حکومت اور اس کے بعد آنے والے سربراہ حکومت کو باہمی متابلہ کی کسوٹی پر کس کر پرکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے پرکھ کا یہ معیار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں نہ تھا۔ ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فتنے کا ذکر کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ "یہ اس میں بے گناہ مارے جائیں گے۔" اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبل احد پر چڑھے ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ یکایک پہاڑ تھرتھرایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ٹھوکر ماری اور فرمایا "ٹھہر اے احد! تجھ پر تو ایک نبی ہے۔ ایک صدیق اور دو شہید، یہ دو شہید عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ تھے۔ اور شہید وہ ہوتا ہے جو کہ راہ خدا میں مارا جائے۔ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور بھی پیش گوئیاں ہیں۔

فضائل اور سیرت و کردار

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ قدیم الایمان تھے۔ جاہلیت کے زمانے میں بھی آپ کا دامن ذمائم اخلاق سے پاک رہا۔ شرم و حیا آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو "کامل الحیا والایمان" کے

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم، مسند احمد و مستدرک حاکم بحوالہ "سیرت النبی" جلد سوم از سید سلیمان ندوی (باب اخبار غیب یا پیش گوئی)

[2] صحیح بخاری و صحیح مسلم، مسند احمد و مستدرک حاکم بحوالہ "سیرت النبی" جلد سوم از سید سلیمان ندوی (باب اخبار غیب یا پیش گوئی)

الفاظ سے یاد فرمایا۔ آپ کے ایمان کی پختگی، خلوص وعقیدت، جذبۂ ایثار کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگرے اپنی دو صاحب زادیاں آپ کے حبالہ عقد میں دیں۔ دوسری صاحب زادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا آپ سے عقد کرتے وقت فرمایا کہ ''یہ جبریل کہہ رہے ہیں کہ خدائے بزرگ کا حکم ہے کہ میں اپنی دوسری بیٹی تجھ سے بیاہ دوں''[1]۔ اسی لئے آپ ''ذوالنورین'' (دونوروں والے) کہلائے۔ جنت کی متعدد بشارتوں کے آپ مورد ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ ''ہر نبی کا ایک رفیق ہوتا ہے۔ جنت میں میرے رفیق عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔'' بیعت رضوان کے ہیرو آپ ہی تھے۔ جب آپ کو مکہ والوں نے روک لیا اور افواہ پھیل گئی کہ آپ قتل کر دیئے گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چودہ سو صحابہ سے عثمان رضی اللہ عنہ کے انتقام کے لئے جو بیعت لی اس میں اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارتے ہوئے فرمایا کہ یہ عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ ہے گویا خود اپنی طرف سے عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ عثمان کبھی بیعت سے باہر رہ ہی نہیں سکتا اور پھر اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح نازل کر کے مزید عزت واعزاز سے یہ کہہ کر نوازا کہ اے نبی! جب مسلمان آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ (یداللہ فوق ایدیھم)۔ اللہ نے بیعت رضوان کرنے والوں سے بڑے واضح الفاظ میں اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور یہ سب کچھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خاطر ہوا۔

جمع واشاعت قرآن آپ کا وہ کارنامہ اور امت مسلمہ پر احسان عظیم ہے جس سے یہ امت کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ آپ نے ملت اسلامیہ کو جس طرح ایک متن پر متفق کیا اور کلام اللہ کو تحریف وتبدل سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا وہ آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس کارنامے کی انجام دہی میں دوسرے عوامل کے علاوہ آپ کے حافظ قرآن اور کاتب وحی ہونے کا بھی دخل ہے آپ قریش کے معدودے چند پڑھے لکھے اصحاب میں سے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر آپ سے کتابت وحی کی خدمت لیتے تھے۔ اسد الغابہ میں ہے کہ آپ سے بہتر کتاب اللہ کا حافظ کوئی نہ تھا۔ تلاوت قرآن سے بہت شغف تھا۔ محمد ابن سعد نے لکھا ہے کہ ایک رکعت میں پورا قرآن مجید ختم کر دیتے تھے، عبادت اور نوافل میں بہت انہماک تھا۔ کثرت سجود سے پیشانی پر نشان پڑ گئے تھے۔ اکثر روزہ رکھتے تھے اور روزے کی حالت ہی میں شہید ہوئے۔ آپ کی ذات فضل وکمال کا نمونہ تھی۔ کلام اللہ پر آپ کی نظر بہت وسیع تھی۔ حدیث وفقہ میں بھی ممتاز تھے۔ اس خوف سے حدیث کی روایت کم کرتے تھے کہ مبادا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں کمی بیشی یا تغیر وتبدل ہو جائے۔ تاہم آپ سے ایک سو چھیالیس احادیث مروی ہیں۔ متعدد صحابہ اور تابعین نے آپ سے روایت حدیث کی ہے۔ فقہ میں بھی مجتہدانہ حیثیت کے مالک تھے۔ علم فرائض میں آپ کو صحابہ کی جماعت میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ شیخین رضی اللہ عنہما کے عہد میں وراثت کے تنازعات اور مشکلات کو آپ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ حل کرتے تھے۔

آپ کے زمانے میں اس کثرت سے فتوحات ہوئیں کہ مملکت اسلامیہ دنیا کی سب سے بڑی مملکت بن گئی اور اس میں عدیم النظیر خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔

---

[1] ''رحمت للعالمین'' از قاضی محمد سلیمان منصور پوری جلد ۲ صفحہ ۱۰۷۔ شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور

آپ بڑے متقی، پرہیز گار، حلیم الطبع، نرم خو اور بردبار تھے۔ دیانت، سخاوت، سیر چشمی اور صلہ رحمی آپ کے نمایاں اوصاف تھے۔ اپنی زندگی ہی میں اپنی تمام جائیداد اور مال و متاع اپنی اولاد، اعزہ و اقارب اور بنی امیہ کے دوسرے افراد میں بحصہ مساوی تقسیم کر دیا۔ کوئی سائل آپ کے در سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ قریش میں ہر دلعزیز تھے۔ خلافت کے ابتدائی چھ سالوں میں آپ کی خاص و عام میں مقبولیت اور ہر دلعزیزی عروج پر رہی۔

رسول اکرم ﷺ آپ کی اسلامی خدمات کو بڑی قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آپ کو کم سے کم تین دفعہ انفرادی طور پر جنت کی بشارت دی ایک دفعہ بیئر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کرنے پر، دوسری دفعہ مسجد نبوی کی توسیع کے لئے ملحقہ قطعہ زمین خرید کر مسجد کے لئے دینے پر اور تیسری دفعہ تبوک جانے والے جیش عسرت کے لئے ساز و سامان فراہم کرنے پر۔ خود اللہ تعالیٰ نے بیعت رضوان پر اپنے کلام پاک (سورہ فتح) میں اپنی خوشنودی کی سند عطا کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسلام اور مسلمانوں کی خاطر اپنا مال بے دریغ خرچ کیا۔ آپ متمول ترین مسلمان تھے اور مالی قربانیوں کے لئے سب سے پیش پیش رہتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی معمولی سی تکلیف دیکھ کر بے چین اور بے قرار ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ اہل بیت رسول ﷺ پر کئی وقت فقر و فاقہ سے بیت گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو بہت روئے اور اسی وقت گیہوں کے آٹے اور کھجوروں کی کئی بوریاں اور بہت سا بکری کا گوشت اور تین سو درہم نقد لے جا کر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پیش کئے اور عرض کیا کہ جب کبھی ایسی صورت اور ضرورت پیش آئے تو عثمان کو یاد فرمایا جائے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے آپ کے حق میں دعا فرمائی۔ آپ کو آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس و بابرکات سے بے پناہ شیفتگی اور عقیدت تھی اور جناب ﷺ کے اشارۂ ابرو پر اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتے تھے۔ حضور ﷺ بھی آپ کی شرافت، نجابت، سخاوت، مروت، تقویٰ، حلم، حیا اور استقامت فی الدین کو بہت پسند فرماتے تھے۔ آپ کے دل میں جناب رسالت مآب ﷺ کا اس قدر احترام تھا کہ جس ہاتھ پر جناب ﷺ کے دست مبارک پر بیعت اسلام کی تھی، اسے تمام عمر محل نجاست سے مس نہیں کیا۔ اتباع سنت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ حضور ﷺ نے آپ سے فرمایا تھا کہ "عثمان! اللہ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا کچھ لوگ تم سے مطالبہ کریں گے کہ اسے اتار دو لیکن تم ایسا نہ کرنا۔" اس فرمان نبوی کی تعمیل میں آپ نے جان دیدی لیکن خلافت سے دستبردار نہ ہوئے اور نہ دشمنوں کا مقابلہ کیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک متمول اور کامیاب تاجر تھے، لیکن انہوں نے اکتناز دولت کو اپنا مطمحِ نظر نہیں بنایا۔ اسلام اور ملت اسلامیہ کے لئے خرچ کرنے کے علاوہ اپنے اعزہ و اقارب اور اہل قبیلہ میں دل کھول کر اپنی دولت تقسیم کی جسے بعض معترضین نے یہ سمجھا یا عمداً ایسا مشہور کیا کہ آپ بیت المال سے اپنے رشتہ داروں کو عطیات دیتے ہیں۔ آپ سرمایہ دار تھے لیکن آج کل کی اشترا کی اصطلاح میں نہیں۔ وہ سرمایہ کے سانپ نہ تھے اور نہ سرمایہ داری کے چکر میں پڑ کر جلب زر کے لئے دوسروں کا استحصال کرتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ کمایا حلال طریقوں سے کمایا۔ اس میں سے شرعی زکوٰۃ و صدقات کے علاوہ فراخدلی سے سخاوت کی اور عطیات دیئے جیسا کے اوپر ذکر

ہوا ہے۔ اپنی خلافت کے دوران میں اپنی کثیر دولت اور جائیداد اپنی اولاد و ازواج کے علاوہ بنی امیہ کے تمام افراد میں تقسیم کر دی۔ اپنی بساط بھر اپنے اہل قبیلہ میں سے کسی کو حاجت مند نہیں چھوڑا۔ بنی امیہ کے علاوہ بھی جو حاجت مند ان کے دروازے پر آیا خالی ہاتھ نہ گیا۔ جمع و تقسیم کے متعلق یہی صحت مند اسلامی طریق کار ہے۔ اب اگر کوئی شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مارکسی قسم کی سرمایہ داری سے مہتم کرے تو یہ صریح ظلم ہوگا۔ جس سرمایہ داری کا ذکر اور مخالفت مارکس کی کتاب، سرمایہ داری (داس کیپتال) میں ہے وہ مطلق آزاد اور خود مختار انفرادی ملکیت کی قائل ہے۔ دوسروں کا استحصال اس کا لازمی جزو ہے۔ اشتراکیت سرے سے انفرادی ملکیت کی منکر ہے[1] جبکہ دین اعتدال اسلام انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے مگر یہ ملکیت حدود و قیود کی پابند ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ (اور آپ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی) بیت المال سے بقدر کفاف لیتے تھے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے کبھی روزینہ نہیں لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کی طرح آپ کو بھی خیبر میں ایک قطعہ اراضی دیا تھا اور کچھ دوسرے علاقوں میں آپ نے اپنے ذاتی مال سے زمینیں خریدی تھیں۔ آپ بٹائی پر کاشت کراتے تھے۔ پیداوار کا دو تہائی کاشتکار کا اور ایک تہائی آپ کا ہوتا تھا۔[2] غالباً بیج اور پانی کی فراہمی آپ کے ذمہ تھی۔ آج جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں بٹائی (مزارعت) کی اجازت نہیں انہیں اس پر غور کرنا چاہئے۔ خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عمل خلاف اسلام نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو باغی اس پر زور شور سے اعتراض کرتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی ینبوع میں ایک قطعہ اراضی ملا تھا، ظاہر ہے کہ آپ بھی بٹائی پر کاشت کراتے تھے کیونکہ خود آپ کا وہاں جا کر کاشت کرنا ممکن نہ تھا۔ اس اراضی سے آپ کو پینسٹھ ہزار درہم کی سالانہ یافت ہوتی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ چالیس ہزار دینار سالانہ زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔[3] اس کے باوجود انفاق فی سبیل اللہ کی وجہ سے فاقوں کی نوبت آ جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قدر آمدنی اور وہ بھی سال بھر آپ کے پاس رہنے والی عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد شیخین رضی اللہ عنہما میں محض اموال غنیمت سے نہ ہو سکتی تھی۔ زرعی آمدنی اس میں شامل تھی۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے احادیث مروی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بٹائی پر زمین دینے سے منع فرمایا۔ البتہ یہ احادیث سونے چاندی کے عوض کرائے یعنی ٹھیکے پر دینے کے بارے میں خاموش ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح بخاری (باب ماجاء فی الحرث والمزارعہ) میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کرایہ سے منع نہیں فرمایا بلکہ آپ کا ارشاد ہے کہ یہ بات کہ ''کوئی شخص تم میں اپنی زمین اپنے بھائی کو دے اس سے بہتر ہے کہ وہ اس کا کرایہ لے۔''

صحیح بخاری کے اسی باب میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بٹائی سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسا نہ کرو بلکہ اس پر خود زراعت کرو یا کسی سے زراعت کروالو یا ان (زمینوں) کو اپنے پاس

[1] اگرچہ اب روس اور چین میں محدود ذاتی ملکیت کی اجازت دیدی گئی ہے۔
[2] سیر الصحابہ (خلفائے راشدین) از معین الدین ندوی مرحوم
[3] تاریخ اسلام (حالات حضرت علی رضی اللہ عنہ) حصہ اول۔ از شاہ معین الدین احمد ندوی

رکھو۔'' اس پر آگے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور امارت میں اپنے کھیت کرایہ پر دیا کرتے تھے پھر جب رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث ان سے بیان کی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھیتوں کو کرایہ پر دینے کی ممانعت فرمائی ہے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کیا تم کو معلوم ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اپنے کھیت چوتھائی پیداوار اور کچھ بھوسے پر کرایہ پر دیا کرتے تھے۔ حدیث رافع رضی اللہ عنہ سن کر ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ بخاری و مسلم میں عمرو بن دینار سے یہ حدیث بھی آئی ہے[1] کہ انہوں نے حضرت طاؤس تابعی سے ایک بار کہا کہ آپ بٹائی یا لگان پر یہ زمین اٹھانا چھوڑ دیتے تو اچھا ہوتا کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں کاشتکاروں کو کاشت کے لئے زمین بھی دیتا ہوں اور اس کے علاوہ بھی ان کی مدد کرتا ہوں اور امت کے بڑے عالم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھ کو بتلایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو بٹائی یا لگان پر اٹھانے سے منع نہیں فرمایا تھا البتہ یہ فرمایا تھا کہ اپنی زمین اپنے دوسرے بھائی کو کاشت کے لئے (بغیر کسی معاوضہ کے) دے دینا اس سے بہتر ہے کہ اس پر کوئی مقرر لگان وصول کرے۔

بہرحال یہ بات واضح ہے کہ خلفائے راشدین اور مہاجرین نے بٹائی اور ٹھیکے پر زمینیں دیں اس کا مطلب یہی سمجھا جو مندرجہ بالا حدیث میں حضرت ابن عباس نے بیان کیا ہے ورنہ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف عمل کرتا، یہ بھی درست ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی جیسے آئمہ فقہا نے مزارعت (بٹائی) کو ناجائز قرار دیا ہے البتہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد نے اسے جائز قرار دیا ہے اور حنفی دنیا کا انہی دونوں (صاحبین) کے فتوے پر عمل رہا۔ آج کے بدلے ہوئے حالات میں جبکہ زرعی اراضی کا رقبہ فی کس فی خاندان محدود کر دینے کی ضرورت ساری دنیا میں محسوس کی جا رہی ہے اور ایسا کیا بھی جا رہا ہے اور پاکستان میں دو تین دفعہ ایسے نیم دلانہ اقدامات کئے جا چکے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت رافع بن خدیج والی حدیث اور فقہائے ثلاثہ...... ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، مالک رحمۃ اللہ علیہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ...... کے فتاویٰ پر عمل کیا جائے۔ مولانا محمد طاسین نے اپنی بہت مفید تصنیف ''مروجہ نظام زمینداری اور اسلام'' میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے زراعت (بٹائی) کی ممانعت اور زمین کو سونے چاندی کے عوض کرائے پر دینے کو جائز سمجھا ہے اور اس بارے میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کی مروی احادیث سنن نسائی اور سنن ابی داؤد سے نقل کی ہیں اور صحیح بخاری کی بعض روایات کے حوالے دیئے ہیں۔

بہرحال یہ جملہ معترضہ تھا۔ قرآن مسلمانوں کو جائز طریقے سے کمائے ہوئے مال وزر سے منع نہیں کرتا۔ حکم یہ ہے کہ زکوٰۃ، صدقات، عشر، کفارات اور دوسرے واجبات ادا کر کے اسے پاک بنایا جائے۔ نیز اپنے مال سے سائل و محروم کا حق ادا کیا جائے۔

سورہ الذاریات کی آیت ۱۹ میں فرمایا گیا کہ ''ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔''

---

[1] بحوالہ معارف الحدیث جلد ہفتم صفحہ ۱۵۶-۱۵۵

سورہ الروم کی آیت ۳۸ میں بھی رشتہ دار، مسکین اور مسافر کو اس کا حق (نہ کہ صدقہ و خیرات) دینے کا حکم ہے۔ سورہ المعارج کی آیات ۲۴، ۲۵ میں بھی اس حکم کا اعادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر ملکی و ملی ایمرجنسی میں دل کھول کر خرچ کیا جائے جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرتے رہے۔ اگر جمع اموال و جائیداد کی سراسر ممانعت ہوتی تو ادائی زکوٰۃ اور تقسیم وراثت کے احکام قرآن مجید میں نہ ہوتے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے براد یس، خیبر اور وادی القریٰ میں دو لاکھ دینار مالیت کی جائیداد فی سبیل اللہ وقف کر دی تھی۔ عہد صدیقی میں مدینہ میں قحط کی حالت پیدا ہوئی تو انہی دنوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک ہزار اونٹ غلہ سے لدے ہوئے آئے۔ مدینہ کے تاجروں نے آپ کو پندرہ گنا قیمت پیش کی مگر آپ نے سب فقرائے مدینہ میں تقسیم کر دیئے۔ آپ سینکڑوں بیواؤں، یتیموں اور غریبوں کی اپنے ذاتی مال سے پرورش کرتے تھے۔ کیا یہ کسی سکہ بند مارکسی سرمایہ دار کا عمل ہے؟ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے۔ اگر کسی جمعہ کوئی غلام آزاد کرنے کو نہ ہوتا تو اگلے جمعہ کو دو غلام آزاد کرتے۔ شہادت بھی جمعہ کے دن ہوئی۔ اس دن بیس غلام آزاد کئے۔ انہیں آزاد کردہ غلاموں نے آپ کی شہادت کے وقت حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ اور ایک لڑتا ہوا شہید بھی ہوا۔ کیا غلاموں کی یہ وفاداری اور جاں نثاری ''سرمایہ دار'' عثمان رضی اللہ عنہ سے نفرت پر دلالت کرتی ہے؟

مدینہ کی کوئی گلی ایسی نہ تھی جہاں آپ کا آزاد کردہ کوئی نہ کوئی غلام چلتا پھرتا نظر نہ آتا ہو۔ ابن خلدون کے بقول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جو فیاضی اور سیر چشمی کی وہ ان کی سخاوت، ثروت اور دریا دلی کی بے مثل نظیر ہے۔''

آپ فرمایا کرتے تھے کہ چار چیزیں بیکار ہیں:

(۱) وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے۔

(۲) وہ مال جو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے

(۳) وہ زُہد جس سے دنیا حاصل کی جائے

(۴) وہ لمبی عمر جس میں سامان آخرت تیار نہ کیا جائے۔

نیز آپ کا یہ بھی قول تھا کہ مجھے دنیا میں تین باتیں پسند ہیں:

(۱) بھوکوں کو کھانا کھلانا

(۲) ننگوں کو کپڑا پہنانا

(۳) قرآن مجید خود پڑھنا اور اوروں کو پڑھانا۔

اگرچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دولت کی گود میں پلے تھے اور عرب کے سب سے بڑے دولت مند تاجر تھے اور ایک ایسے خاندان (بنی امیہ) سے ان کا تعلق تھا جسے قریش میں سیادت حاصل تھی، لیکن اسلامی مساوات، انسانی ہمدردی اور سادگی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ان کی حلیمانہ فطرت کو تکبر اور نخوت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا نہ انہیں کسی قسم کی شان و شوکت اور جاہ و طمطراق کے مظاہرہ کی ہوس تھی۔ وہ مدینے کی گلیوں میں تن تنہا گھومتے تھے۔

کوئی محافظ وغیرہ ساتھ نہ ہوتا تھا۔لوگوں کے مجمعوں میں بلا تکلف جاتے،ان کی سنتے،اپنی سناتے،مسجد کے فرش پر اپنی چادر کا تکیہ بنا کر لیٹ جاتے،جمعہ کے دن منبر نبوی پر بیٹھتے تو لوگوں سے نہایت شفقت اور رحمت کے ساتھ خطاب کرتے،ان کی خیر وعافیت،حالات،ضروریات دریافت کرتے،مریضوں کی بیمار پرسی کرتے اور بازار کے نرخ وغیرہ پوچھتے،اذان کے بعد خطبہ دیتے(مدینہ میں آبادی کی کثرت ہو جانے کی وجہ سے جمعہ کے روز آپ نے ایک کی بجائے دو اذانوں کا حکم دیا تاکہ سب لوگ نماز کے وقت سے مطلع ہو جائیں۔آج بھی اہل سنت کا یہی عمل ہے) موقع ومحل کے مطابق جو کچھ فرمانا ہوتا فرماتے۔غرضیکہ اپنی دولت وثروت،عالی خاندانی اور ملت اسلامیہ کے سب سے بڑے منصب خلافت کا حامل ہونے کے باوجود آپ عامتہ المسلمین سے خلا ملا رکھتے تھے اور لوگوں کی آپ تک عام رسائی تھی۔کوئی حاجت ودربان نہ تھا لوگ اپنی شکایات اور اعتراضات بلا جھجک پیش کرتے اور آپ ان کا جواب دیتے۔آپ کا یہ طریق کار زندگی کے آخری دنوں(محاصرہ سے پہلے) تک جاری رہا۔اس سے قدرتی طور پر خیال آتا ہے کہ اگر آپ کی حکومت کے خلاف کوئی عام اور حقیقی بے اطمینانی ہوتی تو اس کی خبر براہ راست آپ تک پہنچ جاتی اور آپ ازالہ کی کوشش کرے۔جو کچھ بھی ہوا ایک محدود اور مخصوص سازشی گروہ کی کارستانی تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہایت رقیق القلب تھے۔باغیوں سے سختی سے نپٹنے اور عمال حکومت کا کما حقہ محاسبہ نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔آپ کا دل ہمیشہ خوفِ الٰہی سے معمور رہتا تھا۔جب کسی قبر کے پاس سے گزرتے تو رقت طاری ہو جاتی اور کثرت گریہ سے داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔قیامت کے مواخذہ کا خوف آپ پر غالب رہتا تھا۔جس کے دل پر ہر وقت یہ خوف طاری رہے،کیا وہ دیدہ ودانستہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کا کبھی خیال بھی اپنے دل میں لا سکتا ہے؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حافظ قرآن تھے۔اس کے باوجود قرآن مجید کا ذاتی نسخہ اپنے سامنے رکھ کر کثرت سے تلاوت کیا کرتے تھے۔اسی عالم میں شہادت سے سرفراز ہوئے،حافظہ بہت قوی تھا،طہارت کا بہت خیال رکھتے تھے۔حیا کا یہ حال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ''عثمان رضی اللہ عنہ سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔''حج وعمرہ بھی بکثرت کرتے تھے۔اپنے عہد خلافت میں پہلے اور آخری سال کے سوا ہر سال حج کیا اور لوگوں کو اپنی امارت میں حج کرایا۔آخری حج کے موقع پر بلوائیوں نے محصور کر رکھا تھا۔اس لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو امیر الحج بنا کر بھیجا۔مقام منیٰ میں اپنا خیمہ نصب کراتے اور جب تک حجاج کو کھانا نہ کھلا لیتے لوٹ کر اپنے خیمے میں نہ آتے تھے۔سارا خرچ اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے۔

مزاج میں سادگی تھی۔غلاموں،خادموں کی موجودگی میں بھی اپنے کام اپنے ہاتھوں سے کر لیا کرتے تھے۔ رات کو تہجد کی نماز کے لئے اٹھتے تو کسی غلام کو نہ جگاتے۔خود ہی پانی لے کر وضو کر لیتے۔فرماتے کہ رات کا وقت ان لوگوں کے آرام کرنے کا ہے۔تہجد کی نماز میں طویل قیام کرتے۔غلاموں سے مساویانہ بلکہ مشفقانہ سلوک کرتے۔ایک دفعہ ناراض ہو کر غلام کا کان مروڑا۔لیکن فوراً پشیمان ہوئے اور اسے کہا کہ تو بھی میرا کان اسی طرح

مروڑ۔اس نے انکار کیا مگر آپ نے اسے مجبور کر دیا۔

آپ پیدائشی پارسا تھے۔ایام جاہلیت میں بھی جھوٹ، چوری، جوا، زنا، شراب نوشی وغیرہ ذمائم سے مجتنب رہے۔

کسی حالت میں بھی حلم وعفو اور صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔باغیوں کے ساتھ آپ کا طرز عمل اس پر گواہ ہے۔

جسٹس سید امیر علی نے اپنی مختصر تاریخ عرب[1] میں آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ ''آپ کا بڑا وصف تقویٰ و پرہیز گاری تھا۔''

راقم السطور یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ تقویٰ و پرہیز گاری (Piety) کے علاوہ موصوف اور کیا چاہتے تھے جبکہ خود قرآن حکیم نے انسانی عظمت وشرافت کا معیار تقویٰ ہی کو قرار دیا ہے؟ غالباً کچھ اپنے مخصوص عقیدہ اور کچھ مستشرقین کے خیالات سے متاثر ہو کر انہوں نے ایسا لکھا۔اگر حکومت کے نظم ونسق میں عہد عثمانی میں کچھ ڈھیل آئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تمام خوبیوں اور محاسن کی طرف سے آنکھ بند کر لی جائے۔ولیم میور اپنے کھلے تعصب کی بنا پر حضرت عثمان کو تنگ نظر، قوت ارادی[1] سے محروم، کمزور، خودغرض[1] اور اقربا نواز قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس کے باوجود وہ نرم اور مہربان فطرت کے مالک تھے اور اگر انہیں طوفان انگیز حالات سے سابقہ نہ پڑتا تو لوگوں میں بہت مقبول ہوتے۔لیکن ان کی کمزوری، خودغرضی، اقربا نوازی کی وجہ سے اسلامی اشرفیہ (Arstoracy) ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور دلوں میں تلخیاں بھر گئیں۔دراصل اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات سے زیادہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کو دخل تھا۔اگر حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شرافت و بردباری کمزوری ہے تو بے شک یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں تھی اور ایک حد تک نظم ونسق پر اثر انداز بھی ہوئی، دنیاوی نقطہ نظر رکھنے والوں کے نزدیک ذاتی رعب وداب اور کڑا نظم ونسق ہی حاکم وقت کی عظمت کا سب سے بڑا معیار ہوتا ہے خواہ اس کے لئے اعلیٰ دینی، اخلاقی اور روحانی اصولوں کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔اس لحاظ سے شاید بعد کی تاریخ کے عبدالملک بن مروان، حجاج بن یوسف اور پھر چنگیز خان، ہلاکو، تیمور وغیرہ ''مثالی'' حکمران تھے؟ جہاں تک خودغرضی اور تنگ نظری کا تعلق ہے اس کا شائبہ تک ان کی زندگی اور کردار میں نہیں پایا جاتا۔خلافت سے دستبرداری سے انکار کسی خودغرضی پر مبنی نہ تھا۔بلکہ ملت اسلامیہ کو افتراق وانتشار اور باہمی فتنہ وفساد سے بچانا اور حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل مقصود تھا۔اس کے لئے انہوں نے جان تک دے دی۔انہوں نے منصب خلافت سے کوئی ذاتی منفعت حاصل نہیں کی بلکہ اپنا پر منفعت تجارتی کاروبار بھی اس کی نذر کر دیا۔ان کی حد سے بڑھی ہوئی صلہ رحمی کو زیادہ سے زیادہ اجتہادی غلطی کہا جا سکتا ہے جو نیک نیتی پر مبنی تھی۔وہ دوسروں سے بھی حسن سلوک اور فیاضی سے پیش آتے تھے۔

یہ درست ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سی مضبوط قوتِ ارادی نہ تھی

---

[1] کیا محاصرے کے دوران میں انہوں نے قوت ارادی سے محرومی کا مظاہرہ کیا؟ کون سی تنگ نظری اور کون سی خودغرضی ان سے ظاہر ہوتی؟ مولف

اورعمال کا محاسبہ اورنگرانی اس شدت سے نہ کرتے تھے جو آپ کے پیش رو کا معمول تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو ان کی فطری نرم مزاجی تھی اور کچھ بڑھاپا۔ آپ حلم وعفو کا پیکر تھے۔ بالآخر جان دیدی مگر باغیوں کے خلاف جس صبر وحلم کا مظاہرہ کیا وہ انسانی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اپنے اخلاص، بردباری اور انتہائے سادگی کی وجہ سے ایک قلیل التعداد سازشی گروہ کے ہاتھوں آپ کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنی جانِ گرامی کا نذرانہ پیش کر کے بھی مسلمانوں کے اتحاد و یگانگی کو برقرار رکھنے کی آخری کوشش کی۔

عظیم انسان

انگریز ناول نگار اور شاعر ٹامس ہارڈی نے لکھا ہے کہ ''عظیم انسان شہاب ثاقب کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کو روشن کرنے کے لئے اپنے آپ کو بھسم کر ڈالتے ہیں۔'' حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ایک ایسے ہی عظیم انسان تھے۔ انہوں نے ملت اسلامیہ کو بالخصوص اور دنیا کو بالعموم بہت کچھ دیا۔ ان کا شمار ہمیشہ دنیا کے عظیم انسانوں میں ہوگا اور انصاف پسند غیر مسلم بھی ان کے حالات اور کارنامے پڑھ کر تعجب اور تحسین کرتے رہیں گے۔ اسلام کی عظمت کو ان کی عظمت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی تاریخ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد آپ بلاشک وشبہ چوتھے بڑے انسان ہیں۔ آپ کے ایمان واخلاص، تقویٰ و دینداری، دیانت وصیانت اور عظمت وبزرگی میں جو شک کرے اسے پکا مسلمان تو کیا معمولی شریف اور منصف مزاج آدمی کہنا بھی مشکل ہے۔

قاضی محمد سلیمان نے رحمت للعالمین، جلد دوم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''جس نے دین عثمان رضی اللہ عنہ سے بیزاری کا اظہار کیا وہ ایمان ہی سے بیزار رہا'' علامہ سیوطی نے ''تاریخ الخلفا'' میں صحیح بخاری جلد اول کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے محمد حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت کی ہے کہ ''ایک دفعہ میں نے اپنے والد (حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے پوچھا کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کون افضل ہے؟ فرمایا ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ میں نے کہا پھر کون؟ فرمایا عمر رضی اللہ عنہ۔ پھر مجھے خیال ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا نام نہ لے دیں لہٰذا میں نے خود ہی کہا پھر آپ ہیں۔ فرمایا میں تو مسلمانوں میں سے ایک آدمی ہوں۔'' اس روایت سے اسد اللہ الغالب علی ابن طالب کرم اللہ وجہہ کی انصاف پسندی، حق گوئی اور انکسار کا اظہار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلفائے راشدین جس ترتیب سے منصب خلافت پر فائز ہوئے وہی ترتیب ان کی عظمت کی بھی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آخری دنوں میں جو مذاکرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا وہ گزشتہ صفحات میں درج کیا جا چکا ہے۔ اس میں انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شیخین رضی اللہ عنہما سے کم نہیں گردانا۔ اسی طرح، البدایہ والنہایہ، کے مصنف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کرم اللہ وجہہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''عثمان تو ہم میں سے زیادہ نیک، زیادہ صلہ رحمی کرنے والے، زیادہ صاحب حیا، پاک طینت اور خداوند تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔''[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ، جلد ۷ ص ۱۹۴ بحوالہ ''صحابہ کبار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر میں'' مصنفہ منشی عبدالرحمٰن خاں

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کارنامے، فتوحات اور کردار انہیں تاریخ میں ایسی جگہ دیتے ہیں جو دنیا کے عظیم ترین اور نیک ترین انسانوں کے لئے وقف ہے۔

طرز معاش و بود و باش

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ذریعہ معاش ابتداء ہی سے تجارت تھا۔ اس میں وہ بڑے کامیاب اور عرب کے ملک التجار تھے۔ دولت و ثروت ان کے قدم چومتی تھی۔ اپنا تجارتی مال مضاربت پر اور زرعی زمین بٹائی پر دیتے تھے۔ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اچھا لباس اور اچھی غذا استعمال کرتے، عطر لگاتے تھے لیکن لباسِ فاخرہ سے پرہیز کرتے۔ رنگین کپڑے بھی استعمال کر لیتے تھے۔ عموماً تہہ پہنتے تھے۔ صرف شہادت کے دن پاجامہ پہنا تاکہ کامل الحیا و الایمان کی مرتے وقت بھی بے پردگی نہ ہو۔ مزاج میں نفاست اور طہارت تھی۔ روزانہ غسل فرماتے۔ دستر خوان وسیع تھا۔ روزانہ اعزہ و احباب کا جمع رہتا۔ لباس و خوراک میں وہ سادگی تو نہ تھی جو آپ کے پیشرو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا خاصہ تھی۔ تاہم غیر ضروری تکلف بھی نہ تھا۔ رات کو کھانا بہت کم کھاتے تھے۔ تاکہ تہجد کے لئے اٹھنے میں سستی نہ ہو۔

حلیہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میانہ قامت اور خوبصورت تھے۔ چہرے پر ہلکے سے چیچک کے نشان تھے۔ شخصیت اور بشرے سے وجاہت ٹپکتی تھی۔ رنگت میں سرخی کی جھلک تھی۔ شانے کشادہ تھے۔ پنڈلیاں بھری ہوئی۔ ہاتھ لمبے اور ان پر بال تھے۔ سر کے بال گھنگریالے جو کنپٹی کے نیچے تک آتے تھے۔ دانت بہت خوش نما اور سونے کے تار سے بندھے ہوئے تھے۔ داڑھی گھنی تھی۔ بالوں میں زرد خضاب لگاتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "میں اور عثمان رضی اللہ عنہ اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام سے بہت مشابہ ہیں۔" حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ مازنی کا قول ہے کہ "میں نے کسی مرد یا عورت کو عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا۔"

ازواج و اولاد

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وقتاً فوقتاً آٹھ نکاح کئے۔ پندرہ اولادوں کی تفصیل محمد بن سعد نے طبقات میں دی ہے۔ جب کہ شاہ معین الدین ندوی نے تاریخ اسلام میں لکھا ہے کہ آپ کی سترہ اٹھارہ اولادیں ہوئیں حسب ذیل اسماء کتب تواریخ میں ملتے ہیں۔

۱۔ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ان سے عبداللہ تولد ہوئے جو عام روایت کے مطابق چھ سال کی عمر میں ۴ھ میں مدینہ میں فوت ہو گئے۔ انہی کی نسبت سے حضرت عثمان کی کنیت ابو عبداللہ ہوئی۔

۲- حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

آپ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں دونوں بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یکے بعد دیگرے نکاح کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ذوالنورین کہا جاتا ہے۔
حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۳- فاختہ بنت غزوان رضی اللہ عنہا

ان سے عبداللہ اصغر ہوئے جولا ولد فوت ہو گئے۔

۴- ام عمرو بنت جندب رضی اللہ عنہا

ان سے عمرو، خالد، ابان اور مریم تولد ہوئے۔

ابان مشہور محدث اور فقیہ تھے۔ مدینہ کے دس فقہا میں شمار کئے جاتے تھے۔ عبدالملک بن مروان کے عہد میں سوا سات سال تک مدینہ کے گورنر رہے۔ عمرو بن عثمان رضی اللہ عنہ کے بیٹے زید سے حضرت سکینہ بنت امام حسین رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا تھا۔ جن سے ایک بیٹا عثمان پیدا ہوا۔ پھر سید امیر علی کے مطابق اموی خلیفہ سلیمان نے زبردستی جدائی کرادی۔ غالباً اپنی سیاسی مصلحتوں کی بناء پر۔

۵- فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت الولید بن عبد شمس

ان سے ولید، سعد اور ام سعید پیدا ہوئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سعید بن عثمان رضی اللہ عنہ کو خراسان کا گورنر مقرر کیا تھا۔ وہ پہلے سپہ سالار تھے جو لشکر کو ماوراء النہر لے گئے۔ اور سمرقند کو فتح کیا۔

۶- ام البنین بنت عینیہ بن حصن الفزاری رضی اللہ عنہا

ان سے عبدالملک ہوئے جولا ولد فوت ہوئے۔

۷- رملہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا

ان سے تین صاحبزادیاں عائشہ، ام ابان اور ام عمرو پیدا ہوئیں۔

۸- نائلہ بنت الفرافضہ رضی اللہ عنہا

ان سے ایک صاحبزادی مریم ہوئیں۔ طبری نے ہشام بن الکلبی کی روایت سے ایک صاحبزادے عتبہ کا نام بھی دیا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت نائلہ نے آپ کو بچانے کی کوشش کی۔ ایک بلوائی کی تلوار سے ان کی تین انگلیاں کٹ گئیں۔ بلوائیوں نے زیورات کے علاوہ ان کی چادر تک سر سے کھینچ لی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دنوں میں حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا نے اہم کردار ادا کیا۔ آپ کو مفید مشورے دیئے اور آپ کو بچانے کی کوشش کی۔

ایک ام ولد سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی ام البنین تولد ہوئیں۔[1]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق

ملت اسلامیہ کا سوادِ اعظم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلفائے راشدین تسلیم کرتا ہے۔ اور ہر مسجد کے منبر سے خطیب ان کی تعریف کرتا اور ان کی خلافت کے برحق ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کی آبادی کا بیشتر حصہ ان خلفائے اربعہ کی عظمت وصداقت کا معتقد ہے اور انہیں اسلام کے استقلال اور قوت وشوکت کے چار ستون مانتا ہے کہ انہی بزرگوں کی مساعی سے اسلام نہ صرف زندہ رہا بلکہ اطراف واکناف عالم میں پھیل گیا اور تو اور متعصب مستشرقین بھی ان کی عظمت اور اسلامی خدمات کے معترف ہیں۔ بدقسمتی سے خود مسلمانوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں سیاسی اختلاف پیدا ہوئے۔ جنہوں نے بڑھ کر فتنہ وفساد اور باہمی جنگ وجدال کی شکل اختیار کر لی اور پھر سیاسی کشمکش اور باہمی جنگ و جدال نے مذہبی اختلاف اور فرقہ بندی کو جنم دیا۔ سب سے پہلے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو باقاعدہ منتخب شدہ خلیفہ برحق ماننے سے انکار کیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اپنی صفوں سے خوارج نکلے جنہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ برحق تسلیم کرنے سے پہلو تہی کی اور انہیں کافر کہا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد علی رضی اللہ عنہ کے طرف داروں نے اپنے آپ کو

---

[1] شاہ بلیغ الدین صاحب نے اپنے ایک مضمون ''شہید مظلوم سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ'' مطبوعہ ہفت روزہ اخبار جہاں۔ کراچی (۱۷ ستمبر تا ۲۳ ستمبر ۱۹۸۴ء) میں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے عبداللہ کے بارے میں محمد بن سعد اور ابن جریر طبری وغیرہ مؤرخین کی روایات کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''مروج الذہب کی روایت ہے کہ وہ (عبداللہ) ۷۶ برس زندہ رہے۔ آج ان کی اولاد ملتان، کشمیر اور جنوبی افریقہ میں موجود ہے۔ ملتان کے شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ کا ننھیالی سلسلہ انہی سے ملتا ہے۔ آزاد کشمیر کے صدر مقام مظفر آباد کے بانی بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے صاحب زادے عبداللہ رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہیں۔ ان کے شجرے کی تصدیق مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا احمد سعید کاظمی جیسے بزرگوں نے کی ہے۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عثمان بن عفان جناب علی بن حسین رضی اللہ عنہ (حضرت زین العابدین) کے استاد تھے۔''

مروج الذہب کے مصنف مسعودی چوتھی صدی ہجری کے مؤرخ ہیں اور اعتزال اور شیعیت سے متہم۔ اس کے باوجود اگر وہ یہ لکھتے ہیں تو ان کے بیان کو وقعت دینی پڑتی ہے۔ لیکن ان کے کسی پیشرو مؤرخ نے حضرت عبداللہ بن عثمان کے بارے میں یہ کچھ نہیں لکھا نہ ۴ھ کے واقعات کے بعد تاریخ میں ان کا ذکر ملتا ہے حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعض دوسرے صاحب زادوں کے تاریخی کردار کے حوالے پائے جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ ۷۶ سال کی عمر پانے والے عبداللہ رضی اللہ عنہ کے متعلق مسعودی کے سوا دوسرے مؤرخ چپ سادھ لیں۔ اور مسعودی نے بھی ان کے کیریئر کی وہ تفصیل نہیں دی جو شاہ صاحب کے بیان میں پائی جاتی ہے۔ مولف

ایک الگ مذہبی فرقہ کی صورت میں منظم کرنے کی کوشش شروع کر دی اور تیسری صدی ہجری میں یہ فرقہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے اپنے بعض بنیادی معتقدات میں کافی حد تک الگ تھلگ ہو گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیشروؤں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کو نہ صرف خلفائے برحق ماننے سے انکار کر دیا بلکہ انہیں غاصب اور منافق کہا۔ پھر خود اس فرقے کے علمبردار متعدد فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ راقم الحروف یہاں اس کی تفصیل اور تاریخ میں نہیں جانا چاہتا یہاں صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ صرف یہی نہیں کہ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو کے مصداق دنیا کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی اکثریت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی عظمت و استحقاق کی معترف ہے بلکہ خود قرآن مجید کی اندرونی شہادت ان ہر سہ بزرگوں کی خلافت برحق ہونے پر موجود ہے۔ یہاں بحث و مناظرہ مقصود نہیں۔ صرف ایک دردمند مسلمان کی حیثیت سے سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تفہیم القرآن جلد ۳ سے سورۂ النور (۲۴) کی آیت ۵۵ کی تفسیر کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

سورۂ النور کی آیت ۵۵ حسب ذیل ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔ بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔''

اس جگہ (یعنی مندرجہ بالا آیت میں) خلافت کا لفظ اس حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اللہ کے امر شرعی کے مطابق (نہ کہ محض قوانین فطرت کے مطابق) اس کی نیابت کا حق ٹھیک ادا کرنے والی ہو۔ اسی لئے کفار تو درکنار، اسلام کا دعویٰ کرنے والے منافقوں تک کو اس وعدے میں شریک کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ اسی لئے فرمایا جا رہا ہے کہ امن کے مستحق صرف ایمان اور عمل صالح کی صفات سے متصف لوگ ہیں۔ اسی لئے قیامِ خلافت کا ثمرہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کا پسند کردہ دین یعنی اسلام مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے گا۔ اور اسی لئے اس انعام کو عطا کرنے کی شرط یہ بتائی جا رہی ہے کہ خالص اللہ کی بندگی پر قائم رہو جس میں شرک کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے۔''

مولانا مودودی آگے چل کر مزید رقم طراز ہیں:

''اس جگہ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو تو بالواسطہ پہنچتا ہے۔ بلاواسطہ

اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے۔ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم) وعدہ جب کیا گیا تھا (سورہ النور ۶ ھ میں نازل ہوئی) اس وقت واقعی مسلمانوں پر حالت خوف طاری تھی اور دین اسلام نے ابھی حجاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی۔ اس کے چند سال بعد یہ حالت خوف نہ صرف امن سے بدل گئی بلکہ اسلام عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پر چھا گیا اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش ہی کی زمین نہیں، کرۂ زمین میں جم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پورا کر دیا۔ اس کے بعد کوئی انصاف پسند مشکل ہی سے اس امر میں شک کر سکتا ہے کہ ان تینوں حضرات کی خلافت پر خود قرآن کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے اور ان کے مومن صالح ہونے کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دے رہا ہے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو نہج البلاغہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی وہ تقریر پڑھ لے جو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایرانیوں کے مقابلے میں خود جانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لئے کی تھی۔ اس میں وہ فرماتے ہیں۔

''اس کام کا فروغ یا ضعف کثرت وقلت پر موقوف نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا دین ہے جس کو اس نے فروغ دیا اور اللہ کا لشکر ہے جس کی اس نے تائید ونصرت فرمائی یہاں تک کہ یہ ترقی کر کے اس منزل تک پہنچ گیا۔ ہم سے تو اللہ خود فرما چکا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ .... فِي الْاَرْضِ (آیہ ۵۵ مذکور) اللہ اس وعدے کو پورا کر کے رہے گا اور اپنے لشکر کی مدد ضرور کرے گا۔ اسلام میں قیم کا مقام وہی ہے جو موتیوں کے ہار میں رشتے کا مقام ہے۔ رشتہ ٹوٹتے ہی موتی بکھر جاتے ہیں اور نظم درہم برہم ہو جاتا ہے اور پراگندہ ہونے کے بعد پھر جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عرب تعداد میں قلیل ہیں مگر اسلام نے ان کو کثیر اور اجتماع نے ان کو قوی بنا دیا ہے۔ آپ یہاں قطب بن کر جمے بیٹھے رہیں اور عرب کی چکی کو اپنے گرد گھماتے رہیں اور یہیں سے بیٹھے بیٹھے جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں ورنہ اگر آپ ایک دفعہ یہاں سے ہٹ گئے تو ہر طرف سے عرب کا نظام ٹوٹنا شروع ہو جائے گا اور نوبت یہ آجائے گی کہ آپ کے سامنے کے دشمنوں کی بہ نسبت پیچھے کے خطرات کی زیادہ فکر لاحق ہوگی۔ اور ادھر ایرانی آپ ہی کے اوپر نظریں جما دیں گے۔ کہ یہ عرب کی جڑ ہے اسے کاٹ دو تو بیڑا پار ہے۔ اس لئے وہ سارا زور آپ کو ختم کرنے پر لگا دیں گے۔ رہی وہ بات جو آپ نے فرمائی ہے کہ اس وقت اہل عجم بڑی کثیر تعداد میں امنڈ آئے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہم جو ان سے لڑتے رہے ہیں تو کچھ کثرتِ تعداد کے بل پر نہیں لڑتے رہے ہیں بلکہ تائید ونصرتِ الٰہی ہی نے ہمیں آج تک کامیاب کرایا ہے۔''

دیکھنے والا خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اس تقریر میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کس کو آیت استخلاف کا مصداق ٹھہرا رہے ہیں۔'' [1]

[1] تفہیم القرآن جلد ۳ - حاشیہ ۸۳ صفحات ۴۱۹ - ۴۲۰

مذکورہ بالا آیت میں اللہ نے ان لوگوں کو خلیفہ بنانے کا وعدہ کیا ہے جو اس کے نزول کے وقت موجود تھے۔ اور ایمان اور عمل صالح سے متصف تھے۔ اگر خلفائے ثلاثہ کو اس کا مصداق نہ قرار دیا جائے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت نبوت عطا کرنے کا وعدہ صحیح نہیں رہتا۔ ایک گروہ کے خیال کے مطابق گویا ۲۵ سال تک عملاً کوئی خلیفہ برحق موجود نہ تھا تا آنکہ نوبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچی۔ یعنی ربع صدی تک مستحق حضرات کی جگہ غیر مستحق افراد خلافت پر قابض رہے۔ حالانکہ واقعتاً صورت یہ تھی کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اسلام کو استحکام، غلبہ اور شوکت سے ہم کنار کیا۔ ان بزرگوں کو یہ اعلان کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ آیہ استخلاف ہمارے ہی حق میں نازل ہوئی ہے۔ ایک شخص آگے کھڑا ہو اور ہزاروں مسلمان اس کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہوں تو اسے یہ اعلان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اے لوگو! میں تمہارا امام ہوں اور میں نے تمہیں نماز پڑھائی ہے۔

مشہور شیعہ مترجم قرآن مولوی مقبول احمد نے آیہ استخلاف کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

> ''ان سب لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اللہ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور ان کو اس زمین میں جانشین بنائے گا جیسا کہ اس سے پہلوں کو جانشین بنایا تھا اور ضرور ان کے دین کو جو اس نے ان کے لئے پسند کر لیا ہے ان کی خاطر پائیدار کر دے گا اور ضرور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ اس وقت وہ میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد ناشکری کرے گا پس نافرمان وہی ہیں۔''

کیا اس ترجمہ سے بھی کسی دوسری تاویل وتعبیر کی گنجائش نکلتی ہے؟

اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت ناجائز خیال کی جائے تو ان کے زمانے کی فتوحات اور اموالِ غنیمت بھی ناجائز ٹھہرتے ہیں حالانکہ ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے بنی ہاشم کو بھی حصہ ملا اور روایات کے مطابق شہر بانو بھی فتوحاتِ فاروقی میں سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئیں اور ان سے علی بن حسین (امام زین العابدین) تولد ہوئے۔

خود نہج البلاغہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعدد فرمودات موجود ہیں جو ان کے پیشرو خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو صحیح طور پر منعقدہ خلافت تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنی بیعت کرنے کے سلسلے میں جو خط لکھا اس میں فرماتے ہیں:

> ''یقیناً ان لوگوں نے مجھ سے بیعت کی ہے جنہوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان سے بیعت کی تھی اور جس مقصد کے لئے ان سے بیعت کی اسی مقصد کے لئے مجھ سے بیعت کی۔ پس حاضر کو بیعت فسخ کرنے کا اختیار نہیں اور غائب کو انکار کا مجاز نہیں کیونکہ مہاجرین اور انصار کو مجلس شوریٰ میں فیصلہ کا حق ہے۔ جب مہاجرین نے کسی کو منتخب کر لیا اور مسلمانوں کا امام (خلیفہ) بنا دیا تو اللہ کی رضا کے عین مطابق ہے۔'' (نہج البلاغہ ص ۱۴۰)

اشتر نخعی کو مصر کا گورنر بنا کر بھیجتے وقت جو خط لکھا اس میں طریق عمل کے متعلق مفصل ہدایات دیتے وقت فرمایا۔

''اس اچھے قانون کو نہ توڑنا جو اس امت کے پہلے لوگ قائم کر گئے ہیں اور جس سے لوگوں میں اتحاد پیدا ہوا ہے، رعایا کی بھلائی ہوئی ہے۔ (نہج البلاغہ ص ۱۳۱)

ظاہر ہے کہ ''پہلے لوگ'' سے ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی دوسرے مراد نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اور بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

مغربی مصنفین کی مشہور تصنیف ''ہسٹوریز آف دی ورلڈ'' میں ان غیر مسلم مؤرخین کا بے لاگ تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

''شروع سے لے کر اب تک بلادِ اسلامیہ شخصی اور جابر حکومتوں کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ خلفائے راشدین کی حکومت بالکل جمہوری طریقوں سے کام کرتی تھی اور تمام مسلمان رعایا حقوق و واجبات میں برابر تھی۔ کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہ تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہر شخص کو حکومت میں دخل تھا وہ اس طرح کہ خلفاء بغیر اہل الرائے سے مشورہ لئے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔''

ان خلفاء میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

ضمیمہ

قرآن کا متن غیر محرف اور غیر مبدل ہے

قرآن مجید کے متن کے غیر محرف اور ہر قسم کے حک واضافہ سے پاک اور محفوظ ہونے کے لئے خود اس کے نازل کرنے والے خدائے بزرگ و برتر کی یہ یقین دہانی کافی ہونی چاہئے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝ (سورہ الحجر ۱۵- آیہ ۹) یعنی اس قرآن کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔ اس میں تحریف اور ردوبدل کرنے کا کبھی کسی کو موقع نہ مل سکے گا۔ یہ براہِ راست اللہ کی حفاظت میں ہے۔ کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتا نہ کسی کے دبائے دب سکتا ہے۔ اس خداوندی گارنٹی کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے متن میں کمی بیشی یا تبدیلیاں کر دیں تو وہ کچھ اور تو ہو سکتا ہے لیکن مسلمان نہیں ہو سکتا۔ عہد عثمانی میں ابھی بہت سے اکابر صحابہ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ وغیرہ موجود تھے۔ وہ قرآن میں کسی ردوبدل کو نہ تو برداشت کرتے نہ اس کی اجازت دیتے۔ بہت سے حفاظ صحابہ بھی موجود تھے جن کے سینوں میں قرآن کا ایک ایک لفظ اور حرف محفوظ تھا اور پھر جس احتیاط اور تحقیق کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ بورڈ نے مستند متن کو مدون کر کے شائع کیا وہ بجائے خود ایک معرکہ آرا کام تھا۔ عہد صدیقی میں متن مرتب ہو چکا تھا اور محفوظ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے متعدد نسخے تیار کراتے وقت ایک دفعہ پھر تحقیق کر لی اور اطمینان ہو جانے کے بعد نسخے تیار کرا کے مختلف صوبائی مرکزوں میں بھجوا دیئے اور وہی متن آج تک مروج و متداول چلا آتا ہے۔ عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام لگانے والے بھی کوئی زیادہ صحیح اور معتبر متن پیش نہ کر سکے۔ قرآن کے متن کی صحت اور اس کے غیر محرف ہونے کے بارے میں غیر مسلم

مغربی مستشرقین نے بھی گواہی دی ہے۔

گزشتہ صدی کا مشہور متعصب مصنف سر ولیم میور جو متحدہ ہندوستان کے صوبہ یوپی (موجودہ اتر پردیش) کا گورنر بھی رہا، لکھتا ہے۔

''کوئی جزو، کوئی فقرہ، کوئی لفظ قرآن میں ایسا نہیں سنا گیا جسے جمع کرنے والوں نے چھوڑ دیا ہو اور کوئی لفظ ایسا نہیں سنا گیا جو اس مجموعہ میں شامل کر دیا گیا ہو۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن کی طرح بارہ (اب چودہ) صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو احادیث میں جن میں محمد (ﷺ) کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی محفوظ رکھی گئی ہیں، ان کا پتہ چل جاتا۔''

موجودہ صدی کا مشہور انگریز مستشرق ایچ اے۔ آر گب اپنی تصنیف ''محمڈن ازم'' کے باب ''قرآن'' میں رقم طراز ہے۔

''یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ (قرآن کے) مواد اور معانی میں کوئی تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔ اور محمد (ﷺ) کے خطبات (سورتوں) کی اصل ہیئت اور مافیہ کو بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ محفوظ رکھا گیا۔''

تازہ ترین شہادت زمانہ حال کے مشہور ماہر طب، سائنس دان اور محقق ڈاکٹر ماریس بوکائی کی ہے جس کی معرکہ آرا تصنیف ''بائبل، قرآن اور سائنس'' عالمی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اگر بعد میں قرآنی متن میں کوئی تحریف یا ترمیم کی جاتی تو یہ بات بظاہر ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ یہ مبہم آیات (یعنی آیات متشابہات، خاص کر سائنسی موضوعات سے متعلق) انسانی دستبرد سے محفوظ رہ سکتیں۔ متن میں ہلکی سی ترمیم بھی ان آیات میں پائے جانے والے باہمی ربط وضبط کو خود بخود تباہ کر دیتی اور ہم اس قابل نہ رہتے کہ جدید علم اور ان آیات کے درمیان مطابقت کو ثابت کر سکتے۔ ان آپس میں مربوط آیات وبیانات کی قرآنی متن میں موجودگی ایک غیر جانبدار مبصر کو قرآن کے مستند اور ترمیم وتحریف سے پاک آسمانی صحیفہ ہونے کا قائل کر دیتی ہے۔''

قرآن کی صحت، صداقت اور عظمت کے یہ کھلے اعترافات مسلمانوں کی دلداری یا کسی سیاسی مصلحت پر مبنی نہیں۔ ان کے مصنفوں کے سامنے ایسی کوئی مصلحت نہ تھی۔

قرآن مجید کی کل آیات کی تعداد ۶۶۶۶ ہے۔ مختلف موضوعات کی آیات میں عددی توازن پایا جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) آیات وعدہ......۱۰۰۰	(۲) آیات وعید......۱۰۰۰
(۳) آیات نہی......۱۰۰۰	(۴) آیات امر......۱۰۰۰
(۵) آیات امثال ۱۰۰۰	(۶) آیات قصص ۱۰۰۰

(۷) آیات تحلیل ......۲۵۰ (۸) آیات تحریم ۲۵۰

(۹) آیات تسبیح ...... ۱۰۰ (۱۰) آیات متفرقہ...... ۶۶

سوچنے کی بات ہے کہ اگر قرآنی آیتوں اور سورتوں میں کوئی کمی بیشی کی گئی ہوتی تو کیا یہ توازن وتسویہ قائم رہ سکتا تھا؟ نیز اگر کوئی انسان اس کتاب (قرآن ابتدا ہی سے اپنے آپ کو کتاب کہہ کر متعارف کراتا ہے مثلاً ذالك الكتاب لا ريب فيه، كتاب انزل اليك، تنزيل الكتب من الله العزيز الحكيم، ذالك الكتاب مبين وغیرہ) کا مصنف ہوتا تو کیا ۲۳ سالہ نزول کے دوران میں وہ یہ ترتیب وتوازن اور عددی نظام برقرار رکھ سکتا تھا؟ ظاہر ہے کہ ابتدائی وقت نزول ہی سے اس کی کتابت، ترتیب، تدوین حکم الٰہی سے شروع کر دی گئی تھی اور حضور اکرم ﷺ نزول وحی کے فوراً بعد لکھوا دیتے تھے اور سورت اور آیت کی ترتیب اور مقام بھی بتا دیتے تھے۔ حیات اقدس کے آخری رمضان میں جبریل امین نے آپ کو خلاف معمول دو دفعہ قرآن مجید کا دور کرایا اور وہ ترتیب کے ساتھ تھا نہ کہ الل ٹپ۔

علم طبیعیات کی جدید ترین تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اعداد کا ایک خاص آرڈر اور ان کی مخصوص ترتیب ہی کائنات کو وجود میں لانے کا باعث ہے یعنی کائنات ایک قفل ابجد کی طرح ہے۔ قرآن کے متعلق کمپیوٹری تحقیق سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے کہ مادی کائنات کی مخصوص اندرونی ترتیب ونظم کی طرح قرآن حکیم کے حروف و الفاظ وآیات وسور کی کائنات میں بھی ایک داخلی ترتیب وتوازن اور نظم وآہنگ کارفرما ہے اور کمی بیشی کرنے سے اس میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق قرآن کے عجائبات کی کوئی حد نہیں۔ اس کے حروف والفاظ وعبارات اپنے اندر اعجاز وعجائب کی بے شمار دنیا میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان میں حروف واعداد کے اعجاز کی دنیا بھی شامل ہے۔ موجودہ دور اعداد وشماریات اور کمپیوٹروں کا دور ہے۔ قرآنی تحقیقات میں بھی ان سے کام لیا جانے لگا ہے جس سے بعض حیرت انگیز انکشافات ہوئے ہیں۔

رواں صدی کی چھٹی دہائی میں ایک مصری عالم محمود فواد عبدالباقی نے قرآنی شماریات پر ایک نئے زاویئے سے تحقیق کی اور نتائج تحقیق کو اپنی تصنیف ''المعجم الفہرس الالفاظ القرآن الحکیم'' میں دنیا کے سامنے پیش کیا جس سے قرآنی شماریات کے بارے میں جدید سائنسی تحقیق کا آغاز ہوا، ان کے ایک دوسرے ہم وطن ڈاکٹر عبدالرزاق نوفل نے اپنی تصنیف ''اسلام دین ودنیا'' میں ان کی تحقیق کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اسے ایک چونکا دینے والی کروٹ دی۔ نوفل کی تصنیف سے چند دلچسپ حیران کن اور فکر انگیز اعداد وشمار بطور مشتے نمونہ ازخروارے پیش کئے جاتے ہیں۔ جو ایک نئے پہلو سے قرآن کے کلام خداوندی اور تحریف وترمیم سے پاک ہونے کی شہادت فراہم کرتے ہیں۔ اگر قرآنی متن میں انسانی ہاتھ کی ذراسی بھی دخل اندازی ہوتی تو الفاظ کا یہ اندرونی توازن اور دروبست قائم نہ رہ سکتا۔ بعض متضاد یا باہم معنوی ربط رکھنے والے الفاظ قرآن میں مختلف مقامات پر الگ الگ وارد ہوئے ہیں اور ایسی سورتوں میں ہیں جو مختلف اوقات میں نازل ہوئیں لیکن ان کی مجموعی تعداد آپس میں برابر ہے یا دگنی ہے یا نصف ہے اور ایک معنی خیز تناسب پر شاہد۔

مثالیں:

لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، روح القدس اور شریعت چار چار مرتبہ آئے ہیں۔

قرآن اور ملائکہ ۶۸-۶۸ مرتبہ

آخرت اور دنیا ۱۱۵-۱۱۵ مرتبہ

رحمت اور ہدیٰ ۷۹-۷۹ مرتبہ

زکوٰۃ اور برکات ۳۲-۳۲ مرتبہ

ملائکہ (معہ مشتقات) اور شیطان ۸۸-۸۸ مرتبہ

(نمائندہ خیر)　(نمائندہ شر)

صالحات اور سیئات ۱۶۷-۱۶۷- مرتبہ

(معہ مشتقات)　(معہ مشتقات)

جبر اور قہر ۱۰-۱۰- مرتبہ

شدت اور صبر ۱۰۲-۱۰۲- مرتبہ

حر اور برد ۴-۴ مرتبہ

نفع اور فساد ۵۰-۵۰ مرتبہ

جحیم (جہنم) اور عقاب (سزا) ۲۶-۲۶ مرتبہ

طین (مٹی) اور نطفہ ۱۲-۱۲ مرتبہ

(انسان کی پیدائش پہلے طین یعنی مٹی اور پھر نطفہ سے ہوئی)

فعل اور اجر ۱۰۸-۱۰۸ مرتبہ (فعل اور اجر لازم وملزوم)

رحیم ۱۱۴ مرتبہ اور رحمان ۵۷ مرتبہ

(خدا کے علاوہ بندوں کے لئے بھی مستعمل) (خدا کے لئے مخصوص) (رحیم سے نصف)

جزا ۱۱۷ مرتبہ اور مغفرت ۲۳۴ مرتبہ

فجار ۳ مرتبہ ابرار ۶ مرتبہ (فجار سے دگنی بار)

(مغفرت جزا سے دگنی اس لئے کہ جزا کے مقابلے میں زیادہ عام ہے)

قرآن حکیم سات آسمانوں (سبع سموات) کا ذکر کرتا ہے اور یہ بھی سات ہی سورتوں میں سات بار آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لفظ ''قل'' کا استعمال ۳۳۲ مرتبہ کیا ہے۔ اللہ کی مخلوق جن، بشر اور ملائکہ نے بھی لفظ قول (قال قالو وغیرہ) ۳۳۲ مرتبہ ہی استعمال کیا ہے۔ اللہ کے نزدیک مہینوں (شہور) کا شمار ۱۲ ہے۔ قرآن میں لفظ شہر (مہینہ) ۱۲ مرتبہ آیا ہے۔ کیا یہ نظم وتوازن محض اتفاقی ہوسکتا ہے؟

راشد خلیفہ کا کام

محمد فواد عبدالباقی اور عبدالرزاق نوفل کے ہم وطن ڈاکٹر راشد خلیفہ کو قرآنی شماریات کے سلسلے میں کمپیوٹر سے کام لینے کا خیال آیا۔ انہوں نے کمپیوٹری تحقیق کی بنیاد پر قرآن حکیم کے داخلی نظم و ربط و توازن کے بارے میں جو حیرت انگیز حرفی وعددی حقائق منکشف کیے ہیں وہ ان غیر مسلم محققوں کی توجہ کو بھی اپنی طرف کھینچتے ہیں جو خالصتاً سائنسی نقطہ نظر رکھتے ہیں اور ہر چیز کو سائنس کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ نے امریکی محققوں اور سائنس دانوں کے ایک نمائندہ اجتماع میں ''محمد کا دائمی معجزہ'' (The Perpetual Miracle of Muhammad) کے موضوع پر ایک بصیرت افروز لیکچر دیا۔ اس پر موقر امریکی رسالہ ''سائنٹفک امریکن'' کے شمارہ ستمبر ۱۹۸۰ء (صفحات ۲۲ تا ۲۴) میں تعریفی کلمات کے ساتھ تبصرہ کیا گیا۔ اس سے پہلے مصری مجلّہ ''آخر ساعۃ'' کے شمارہ جون ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر خلیفہ کا انٹرویو شائع ہوا جسے رابطہ عالمی اسلامی (مکہ) کے اخبار العالم الاسلامی نے اپنی ۱۹ جنوری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں نقل کیا۔ پھر ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) بھارت نے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جو بعد میں بعض پاکستانی رسائل میں بھی چھپا۔

ڈاکٹر خلیفہ کا وہ لیکچر جو انہوں نے امریکن سائنس دانوں کے اجتماع میں دیا مذکورہ بالا عنوان کے تحت ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں دیئے گئے کمپیوٹری تحقیق کے نتائج سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو بطور معجزہ محمد ﷺ پر نازل ہوئی جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیات ۵۰-۵۱ میں فرمایا گیا ہے۔ ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں اس کے ربّ کی طرف سے؟ کہو نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر۔ اور کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔'' اور پھر قرآن حکیم کے معجزہ ہونے پر اللہ نے مخالفین کو یہ چیلنج دے کر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ ''کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں'' (سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۸) گویا قرآن حکیم رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا دائمی معجزہ ہے۔

دوسری بات یہ کہ قرآن مجید میں آج تک کوئی تحریف و ترمیم نہیں ہوئی۔ خود اللہ اس کا محافظ ہے۔ اللہ کی یہ کتاب چودہ صدیوں سے آج تک اپنی اصلی شکل میں موجود ہے اور کمپیوٹری شماریات نے سائنسی طریقے سے اس کے ثبوت فراہم کئے ہیں۔ چند ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر راشد خلیفہ نے قرآن حکیم کی پہلی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنا کر اسے سارے قرآن پر منطبق کیا ہے۔ یہ آیت کلیدی حیثیت رکھتی ہے یہ آیت جو ۱۹ حروف پر مشتمل ہے۔ قرآن حکیم کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۱۱۳ کے آغاز میں اور سورہ النمل کی اندرونی عبارت میں مکرر واقع ہوئی ہے۔ اس طرح اس کی

مجموعی تعداد قرآنی سورتوں کی تعداد کے برابر ۱۱۴ ہو گئی ہے جو آیت بسم اللہ کے ۱۹ حروف پر قابل تقسیم ہے۔ (۱۱۴÷۱۹=۶) جب کہ ۱۹ کا عدد فی نفسہ نا قابل تقسیم ہے۔[1]

راشد خلیفہ نے حروف آیہ بسم اللہ کو ایک عظیم سمندری تودہ برف کی نمودار چوٹی سے مشابہ قرار دیا ہے جب کہ سمندری تودہ برف (آئس برگ) کا ۷۵ فی صد حصہ زیر آب یعنی نظروں سے پوشیدہ ہی رہتا ہے۔ مزید یہ کہ آیہ بسم اللہ کے حروف کا عدد ۱۹ حسابی گنتی کے ابتدائی ۹ مفرد اعداد کے سلسلے کے پہلے عدد اور آخری عدد ۹ سے مرکب ہے۔ اس ابتدا اور انتہا میں سب کچھ آ گیا ہے جو ھو الاول و الاخر ۔ خود ۱۹ کا یہ عدد غیر منقسم ہے جو ایک اور معنویت ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ کی تحقیق کی طرف مزید بڑھنے سے پیشتر راقم الحروف یہ عرض کرنا چاہے گا کہ سورہ توبہ (۹) کے شروع میں آیہ بسم اللہ نہیں ہے۔ ہمارے مفسرین اس کی مختلف وجوہ بیان کرتے آئے ہیں۔ کسی نے کہا کہ قرآن حکیم کو جمع کرتے وقت جمع و ترتیب دینے والوں سے بھول ہو گئی۔ کسی نے کہا کہ انہوں نے سورہ توبہ کو سورہ انفال (۸) ہی کا حصہ سمجھا۔ اس لئے بسم اللہ لکھنا ضروری نہ سمجھا۔ حالانکہ یہ بات متحقق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے جمع وضبط، ترتیب تدوین، تلاوت اور رسم الخط وغیرہ تک کے بارے میں مفصل ہدایات دے دی تھیں اور کاتبان وحی نے حضور ﷺ کی ہدایات کے مطابق لکھا۔ لہٰذا سورۂ توبہ کی ابتداء میں کسی غلط فہمی کی بنا پر آیہ بسم اللہ کے نہ لکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا دراصل حضور ﷺ کی ہدایت کی تعمیل میں کیا گیا کیونکہ اگر آیہ بسم اللہ لکھی جاتی تو کل تعداد ۱۱۵ ہو جاتی جو حروف بسم اللہ کی تعداد پر تقسیم نہ ہوتی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ۱۹ حروف کا قرآن حکیم کے داخلی نظم و ربط و توازن سے گہرا تعلق ہے۔ یہ آیت چار الفاظ اسم، اللہ، رحمٰن اور رحیم پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر لفظ قرآن حکیم میں جتنی دفعہ آیا ہے وہ ۱۹ پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ لفظ اسم ۱۹ مرتبہ یعنی آیہ بسم اللہ کے حروف کی تعداد کے برابر آیا ہے۔ لفظ اللہ ۲۶۹۸ مرتبہ (۱۹×۱۴۲) لفظ رحمٰن ۵۷ (۱۹×۳) مرتبہ اور لفظ رحیم ۱۱۴ (۱۹×۶) مرتبہ آیا ہے۔ یعنی پہلا اسم، حروف بسم اللہ کے برابر اور آخری رحیم سورتوں کی تعداد کے برابر۔ اصل معجزہ ۱۹ کے عدد میں نہیں بلکہ آیہ بسم اللہ میں ہے جو ۱۹ حروف سے مرکب ہے اور جس کے ہر لفظ کے مکررات قرآن مجید میں ۱۹ ہی کے مکررات ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آیہ بسم اللہ کے ہر لفظ کے مکررات کی تعداد اس آیت کے حروف کی تعداد پر تقسیم ہوتی ہے۔ کیا اسے محض اتفاق کہا جا سکتا ہے؟ اتفاق ایک بار، دو بار ہو سکتا ہے۔ بار بار نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیہ کریمہ اپنے الفاظ و حروف کے ذریعے نہ صرف

---

[1] اگر ۱۹ کو مفرد کیا جائے تو ۹+۱=۱۰=۱ ہے جو توحید خداوندی کی طرف اشارہ ہے اسم حسنٰی واحد کا مفرد عدد بھی ا ہے۔ خود قرآن کا مفرد عدد ایک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا ایک، کتاب ایک، رسول ﷺ ایک (قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے دو نام محمد اور احمد آئے ہیں۔ دونوں کے اعداد کو جمع کر کے مفرد کریں تو ایک حاصل ہوتا ہے) اور تو اور عربی کے حروف تہجی کی تعداد ۲۸ ہے اس کا بھی مفرد عدد (۸+۲=۱۰=۱) ایک ہے۔ حروف تہجی کو حروف ابجد بھی کہتے ہیں۔ ابجد کا بھی مفرد عدد ا ہے۔ ا+ب+ج+د یعنی ۱+۲+۳+۴=۱۰=۱) خود عربی کے حروف تہجی میں آج تک کوئی کمی بیشی نہ کی جا سکی تا بہ قرآن چہ رسید! مولف

یہ کہ قرآن حکیم کے غیر انسانی ہونے کا مادی اور محسوس ثبوت پیش کرتی ہے بلکہ اس ابدی حقیقت کی شہادت بھی فراہم کرتی ہے کہ دوسری آسمانی کتابوں کے برعکس قرآن حکیم ادنیٰ تحریف سے بھی محفوظ ہے۔

بعض حضرات نے عدد ۱۹ پر اعتراض کیا ہے کہ یہ بہائیوں کا مخصوص علامتی عدد ہے اور ان کے ہاں ہر جگہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن کراچی کے بہائی ریسٹورانوں میں یہ کہیں نظر نہیں آیا اور پھر یہ کہ راشد خلیفہ بہائی نہیں ہیں اور بہائیوں کے نزدیک قرآن منسوخ ہو چکا ہے۔ راشد خلیفہ کی امریکی بیوی بھی مسلمان ہے۔[1]

حروف مقطعات

ڈاکٹر راشد خلیفہ نے بعض سورتوں کی ابتداء میں واقع حروف مقطعات کی عددی معنویت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور بسم اللہ کے حروف کے عدد ۱۹ کی ہر جگہ کارفرمائی کو اجاگر کر کے ثابت کیا ہے کہ ان حروف کا متعلقہ سورتوں کے ساتھ ایک حیرت انگیز قفلی نظام (Interlocking System) ہے جو کسی انسان مصنف کے بس کا نہیں۔ عربی حروف تہجی کے نصف یعنی ۱۴ حروف مقطعات کے طور پر آئے ہیں یعنی ا ح ر س ص ط ع۔ ق ک ل م ن ہ اور ی ان کے ۱۴ سیٹ بن گئے ہیں جو حسب ذیل ۲۹ سورتوں کے آغاز میں واقع ہوئے ہیں۔

البقر، آل عمران، مریم، طہٰ، الشعراء، النمل، القصص، العنکبوت، روم، لقمن، السجدہ، یٰسین، ص، المومن، حم السجدہ، الشوریٰ، الزخرف، الدخان، الجاثیہ، الاحقاف، ق اور القلم

ان قرآنی مقطعات کا آیہ بسم اللہ کے حرفی عدد ۱۹ سے راست اور مستقل تعلق ہے۔ اگر مقطعات میں شامل ۱۴ حروف تہجی، مقطعات کے ۱۴ سیٹ اور جن ۲۹ سورتوں کے آغاز میں یہ واقع ہیں، کی تعداد جمع کی جائے تو ۱۴ + ۱۴ + ۲۹ = ۵۷ حاصل ہوتا ہے اور ۵۷ کا عدد حروف بسم اللہ کے عدد ۱۹ پر تقسیم ہو جاتا ہے (۵۷-۱۹ = ۳) اگر کسی اور سورت کے آغاز میں بھی ایک، دو، تین یا چار حروف مقطعات ہوتے تو مجموعی عدد ۱۹ پر قابل تقسیم نہ رہتا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ مذکورہ بالا سورتیں مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر نازل ہوئیں اور عرصہ نزول کئی

---

[1] محترم مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ علی محمد باب کا سن پیدائش ۱۸۱۹ء ہے۔ اس طرح اس کے سال پیدائش کا عدد ۱۹ ہے (۱۸۱۹ = ۹ + ۱ + ۸ + ۱ + ۱۹) اس لئے بہائیوں کے نزدیک ۱۹ کا عدد مقدس ہے۔ حالانکہ اسے مزید مفرد کیا جائے تو یہ ا ہوگا (۹ + ۹ = ۱ = ۱۰ = ۱) بہرحال اگر اسے ۱۹ ہی مان لیا جائے تو بھی یہ بابی مذہب کے بانی علی محمد باب کا عدد پیدائش ہوگا نہ کہ بہائی مذہب کے بانی بہاء اللہ کا۔ موخر الذکر کا سن پیدائش ۱۸۱۷ء ہے لہٰذا عدد پیدائش ۱۷ - اس نے ابتدائی تقلید کے بعد علی محمد باب سے اختلاف کیا اور بہائی مذہب کی بنیاد ڈالی۔ علی محمد باب کی کتابیں ''الواح'' اور ''بیان'' ہیں جو بابیوں کے نزدیک مقدس ہیں۔ بہاء اللہ نے انہیں رد کر کے بہائیوں کے لئے ''اقدس'' اور ایقان تصنیف کیں۔ ایرانی شاعر پورداؤد نے شعر ذیل میں اس اختلاف کو واضح کر دیا ہے۔

بابی الواح و بیاں را پرستد — بہائی اقدس و ایقاں پرستد

بہرحال اگر ۱۹ کا عدد بہائیوں کے نزدیک بھی مقدس ہو تو اس سے قرآن مجید کے اعداد و شماریات پر کیونکہ اثر پڑ سکتا ہے۔ بہائیوں کے نزدیک تو قرآن اور شریعت محمدی منسوخ ہو چکے اگر کچھ لیا تو انہوں نے قرآن سے لیا نہ کہ قرآن نے ان سے۔ راقم کے مضمون میں دیئے گئے اعداد و شمار اسلامی شریعت کا حصہ تو نہیں۔ مولف

سالوں پر حاوی ہے۔ ایک انسان مصنف کے لئے یہ نظم و توازن اور عددی ہم آہنگی قائم رکھنا ممکن نہیں۔ اگر بعد میں کسی سورت، آیت یا لفظ کی کمی بیشی یا تحریف و ترمیم کی گئی ہوتی تو بھی یہ عددی توازن قائم نہ رہ سکتا۔

مقطعاتی سورتوں کے متن میں آنے والے اس کے حروف مقطعات کے اعادہ کی تعداد اور اس کے ۱۹ پر قابل تقسیم ہونے کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سورہ الرعد (۱۳) کے شروع میں حروف ال م ر بطور مقطعات آئے ہیں سورہ کے متن میں ان حروف کے مجموعی تعداد ۱۵۰۱ ہے جو ۱۹ پر قابل تقسیم ہے۔ (۱۵۰۱-۱۹=۷۹)۔ سورۂ مریم کے حروف مقطعات ک ہ ی ع ص متن صورت میں ۷۹۸ مرتبہ آئے ہیں اور یہ تعداد ۱۹ پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ (۷۹۸-۱۹=۴۲)۔ سورۂ طٰہ کے حروفِ مقطعات ط اور ہ متن میں ۳۴۲ مرتبہ آئے ہیں یعنی ۱۹x۱۸ ۔علیٰ ہذا القیاس

سورہ ق (۵۰) کا ابتدائی حرف مقطع ق متن میں ۵۷ مرتبہ آیا ہے جو ۱۹ پر قابل تقسیم ہے۔ سورہ ق کی آیت ۱۳ (وعاد و فرعون واخوان لوط) میں ایک مزید ق آنے کا امکان ہو سکتا تھا یعنی اخوان لوط کی بجائے قوم لوط کہا جا سکتا تھا۔ قرآن حکیم میں دوسرے تمام ۱۲ مقامات پر قوم لوط ہی کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن اس تیرہویں موقع پر سورہ ق کی تیرہویں آیت میں خصوصیت سے اخوان لوط اس لئے کہا گیا کہ اگر یہاں بھی قوم لوط کہا جاتا تو ایک حرف ق کا اضافہ ہو کر کل تعداد ۵۸ ہو جاتی جو ۱۹ پر تقسیم نہ ہوتی۔ سورہ ق کے علاوہ حرف ق صرف ایک اور سورت الشعراء (۴۲) کے ابتدائی حروف مقطعات (ح م ع س ق) میں شامل ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ سورہ الشعراء میں بھی حرف ق کی تعداد وہی ہے جو سورۂ ق میں ہے یعنی ۵۷...... دونوں سورتوں کے رف ق کی تعداد مل کر ۱۱۴ ہو جاتی ہے جو قرآن کی کل سورتوں کی تعداد کے برابر ہے ۱۹x۶ ق کا حرف مقطع رکھنے والی ان دو سورتوں کے مجموعی ۱۱۴ ق یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ۱۱۴ سورتیں ہی قرآن ہیں پورا قرآن۔ ق سے قرآن۔ حرف ق کا ابجدی عدد ۱۰۰ ہے جس کا مفرد ایک ہے۔ قرآن (ق ر ا ن) ابجدی عدد ۳۵۲ ہے اس کا مفرد عدد بھی ایک ہے۔ (۲+۵+۳=۱۰=۱) اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے حروفی عدد ۱۹ کا مفرد بھی ایک ہے۔ (۹+۱=۱۰=۱) کیا الل ٹپ طریقے سے ایسا ریاضیاتی اتفاق ہو سکتا تھا؟ اور پھر اگر متن قرآن میں کوئی کمی بیشی، تحریف و ترمیم کی گئی ہوتی تو کیا یہ ریاضیاتی نظم و توازن قائم رہ سکتا تھا؟ اگر گزشتہ ۱۴ صدیوں میں ان دونوں سورتوں میں حرف ق کا حامل ایک بھی لفظ گھٹایا یا بڑھایا گیا ہوتا تو یہ داخلی نظم و توازن تہ و بالا ہو گیا ہوتا، اور حروف مقطعات کا معجزاتی پہلو آج ہمارے سامنے یوں نمایاں ہو کر نہ آتا۔

ایک اور حیرت انگیز مثال ملاحظہ ہو۔

حرف ص صرف تین سورتوں الاعراف (۷)، مریم (۱۹) اور ص (۳۸) کے ابتدائی حروف مقطعات میں شامل ہے۔ تینوں سورتوں کے متن میں اس کی مجموعی تعداد ۱۵۲ ہے جو ۱۹ پر قابل تقسیم ہے۔ (۱۵۲-۱۹=۸) سورہ ق کی طرح سورہ الاعراف میں بھی حیرت انگیز لفظی و حرفی نظم و توازن کا معجزہ سامنے آتا ہے۔ اس کی آیت ۶۹ میں لفظ بصطۃ حرف ص سے آیا ہے حالانکہ عربی میں اس کے عام مروجہ ہجے س کے ساتھ بسطۃ ہوتے ہیں چنانچہ دوسری سورہ البقرہ کی آیت ۲۴۷ میں یہ لفظ حرف س ہی کے ساتھ آیا ہے یعنی بسطة في العلم والجسم۔ لیکن سورہ الاعراف میں

اس کے ہجے حرف ص کے ساتھ واقع ہوئے ہیں اور ہمیشہ سے سبھی اس کی کتابت اور قرأت اسی طرح کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ طرزِ کتابت توفیقی یعنی فرض اور لازم ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر یہ لفظ سورۂ اعراف میں بھی حرف س کے ساتھ آتا تو جن مذکورہ بالا تین سورتوں کی ابتداء میں حرف ص آیا ہے ان کے متون میں اس کی مجموعی تعداد ۱۵۲ کی بجائے ۱۵۱ رہ جاتی جو ۱۹ پر تقسیم نہ ہوتی جب کہ ۱۵۲ قابل تقسیم ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سورہ الاعراف کے نزول کے وقت حضرت جبرئیل نے خود اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہوگا کہ اپنے کاتب وحی سے یہ لفظ ''س'' کے بجائے ''ص'' کے ساتھ لکھوائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی یہ کتابت برقرار رکھی گئی۔ جہاں طرزِ کتابت کو بھی برقرار رکھنے کا یہ اہتمام کیا گیا ہو وہاں متن میں تحریف وترمیم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں انتہائی احتیاط اور دیانت سے کام لیا۔

جن سورتوں کے آغاز میں ایک سے زیادہ حروف مقطعات آئے ہیں ان حروف کو الگ الگ طور پر سورت متن میں گنا جائے تو نہ صرف یہ کہ ہر ایک کی تعداد فرداً فرداً ۱۹ پر تقسیم ہو جاتی ہے بلکہ تمام مقطعاتی سورتوں میں آنے والے ایسے ہر حرف کی مجموعی تعداد بھی ۱۹ پر قابل تقسیم ہے۔ مختلف سورتوں کے حروف والفاظ کا یہ دروبست، نظم و توازن خود قرآن کے نازل کرنے والے خدائے حکیم وبصیر کے پیدا کردہ قفلی نظام (Interlocking System) پر شاہد ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک عظیم اور تازہ منکشف نشانی ہے۔

قرآن حکیم کے داخلی ریاضیاتی، عددی اور حرفی نظام کی یہ چند مثالیں بھی ظاہر کرتی ہیں کہ اس کتاب مقدس کا مصنف کوئی انسان نہیں بلکہ خود خداوند کائنات ہے جس نے اپنی مادی کائنات کی طرح اس روحانی کائنات یا کائنات وحی کا نظم وتوازن بھی اپنی قدرتِ کاملہ سے قائم کیا اور اسے چودہ صدیوں سے علی حالہ قائم رکھا ہے۔ رسولِ امی صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہی ذہین، فطین و جینیئس کیوں نہ ہوں، ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ تیئس سال کے طویل عرصے میں وقفہ وقفہ سے مختلف مقامات، اوقات اور حالات میں نازل ہونے والی ضخیم کتاب کے اندر شعوری طور پر اس قسم کا ایک بنیادی قفلی نظام وضع کرتے اور اسے برقرار رکھ سکتے اور اس کا ربط ونظم اور ترتیب وتوازن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جوں کا توں قائم رہتا۔ تغیر وتبدل، ترمیم وتحریف سے پاک اور محفوظ۔ قرآن کے نازل کرنے والے نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے اور علی الاعلان فرمایا ہے کہ نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون (ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہمیں اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) اللہ ہی کو معلوم ہے کہ آگے چل کر قرآن حکیم کے اور کیا کیا اسرار وعجائبات دنیا کے سامنے آئیں گے اور تحریف وتبدل کے دعویداروں کو جھٹلاتے چلے جائیں گے۔

مذکورہ بالا اعداد وشمار کا مسلمانوں کے عقیدہ وعمل سے کوئی بنیادی اور لازمی تعلق نہیں ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر خصوصی توجہ دلائی۔ تاہم ان کا علم موجودہ سائنسی اور کمپیوٹری دور میں ایمان کی تازگی اور تقویت میں معاون ضرور ہو سکتا ہے اور منکروں کے لئے ایک چیلنج۔ ع

ایک پہلو یہ بھی ہے قرآن کی تفسیر کا!

بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ
صد جہانِ تازہ در آیات اوست ۔۔۔ عصرہا پوشیدہ در آنات اوست

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

(فاتح خیبر)

مسلم اوّل شہ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ
(اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

فاتح خیبر

۱- جس کا میں مولیٰ ہوں، علی رضی اللہ عنہ بھی اس کے مولیٰ ہیں۔ (حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

۲- میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کے دروازہ ہیں۔ (حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

محرم ۷ ہجری

مدینہ سے چند منزل دور خیبر عہد نبوی کا اسرائیل بن چکا تھا۔ مدینہ سے نکالے گئے یہودی بھی وہیں مرتکز ہو گئے تھے۔ سب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف۔ عرب قبائل سے جوڑ توڑ کر کے انہیں بھی برانگیختہ کر رہے تھے۔ خیبر میں یہودیوں کے چھ قلعے تھے اور بیس ہزار آزمودہ کار جنگ جو جن کے پاس وافر سامانِ رسد و حرب موجود تھا۔ یہودیوں کو اپنے قلعوں کی مضبوطی، جنگی تعداد اور سامانِ حرب پر غرور تھا۔ اور وہ اپنے حلیف عرب قبائل کے ہمراہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے عزائم اور تیاریوں کی اطلاع ملی تو آپ سانپ کو اس کے بل میں کچلنے کے لئے سولہ سو جاں نثار صحابہ کے ہمراہ اچانک خیبر پہنچ گئے اور یہودیوں کی گڑھیوں کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ بیس دن جاری رہا۔ اللہ نے یہودیوں کے دلوں میں نفاق ڈال دیا اور وہ متحد ہو کر نہ لڑ سکے۔ یکے بعد دیگرے ان کے پانچ قلعے فتح ہو گئے۔ مگر چھٹا قلعہ قموص فتح ہونے میں نہ آتا تھا۔ یہ بڑا مستحکم تھا اور اس کا سردار مرحب عرب کے مشہور بہادروں میں شمار ہوتا تھا۔ بڑے بڑے صحابہ جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے لشکر اسلام کا علم تھام کر اس قلعہ پر حملہ آور ہوئے مگر ناکام رہے۔ فتح میں غیر معمولی تاخیر ہوتی دیکھ کر ایک شام جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"کل میں اس شخص کو جھنڈا دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ فتح دے گا اور جسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اور اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔" [1]

یہ ایک بہت اہم اعلان تھا اور سارے لشکر میں پھیل گیا۔ قلعہ قموص کی فتح اور پورے خیبر کے مسلمانوں کے تسلط میں آ جانے کی نوید اور فاتح کے لئے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور محبت کا ابدی سرٹیفکیٹ۔ قدرتی طور پر ہر صحابی رسول یہ چاہتا تھا کہ یہ اعزاز اس کے حصے میں آئے۔ اکثر نے ساری رات بے قراری اور اشتیاق کے عالم میں دعائیں مانگتے گزاری۔

فیصلہ کن صبح نمودار ہوئی تو دانائے سبل فخر رسل مولائے کل صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوجوان کو طلب فرمایا۔ نام سن کر صحابہ متعجب رہ گئے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! وہ تو سخت آشوب چشم میں مبتلا ہیں اور اپنے خیمے میں پڑے ہیں۔"

[1] صحیح بخاری

جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ "انہیں لے کر آؤ"۔ ارشاد نبوی کی تعمیل کی گئی۔ آپ ﷺ نے اس نوجوان کی آنکھوں پر اپنا لعاب دہن لگایا اور دعا فرمائی۔ حیرت انگیز طور پر نوجوان کی آنکھوں کی تکلیف جاتی رہی۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے انہیں لشکر اسلام کا علم عطا کیا اور فرمایا کہ "جاؤ۔ اللہ حافظ و ناصر ہو۔ پہلے قموص کے یہودیوں کو نرمی سے اسلام پیش کرو۔ اگر ایک شخص بھی تمہاری تبلیغ سے اسلام لے آئے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔"

نوجوان موصوف لشکر اسلام کا جھنڈا اٹھا کر آگے بڑھے۔ لشکر ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ قلعہ کے سامنے پہنچ کر انہوں نے باآواز بلند یہود کو پکار کر کہا کہ "فتنہ و فساد سے باز آ جاؤ۔ اسلام قبول کر لو یا امن و صلح سے رہنے کا معاہدہ کر لو۔" لیکن یہودیوں نے یہ پیشکش بڑی حقارت سے ٹھکرا دی اور قلعہ کا سردار مرحب جو ہزار سواروں کے برابر سمجھا جاتا تھا، لوہے میں غرق بڑے غرور و تمکنت سے رجزیہ اشعار پڑھتا ہوا نکلا اور مبارزت طلبی کی۔ نوجوان نے بھی رجزیہ اشعار پڑھے اور مرحب کو پہلے وار کرنے کا موقع دیا۔ اس نے پوری طاقت اور مہارت سے تلوار کا وار کیا لیکن نوجوان نے بڑی مہارت سے دار بچایا اور پھر دشمن پر اس زور و قوت سے وار کیا کہ تلوار خود اور سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر گئی اور ضرب کی آواز لشکر تک پہنچی۔ یہودی شہسوار اور تیغ زن ایک ہی وار میں ڈھیر ہو گیا۔[1]

فلک گفت احسن ملک گفت زہ!

یہودیوں پر دہشت طاری ہو گئی۔ پھر ان میں سے کوئی مبارزت طلب نہ ہوا۔ حملۂ عام شروع ہو گیا۔ گھمسان کی لڑائی کے بعد ناقابل تسخیر سمجھا جانے والا قلعہ قموص فتح ہو گیا۔ ترانوے یہودی مارے گئے اور بیس مسلمان شہید ہوئے۔ قموص کی تسخیر کے بعد پوری وادیٔ خیبر مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ اس کے بعد پھر کبھی یہودی سر نہ اٹھا سکے اور مسلمانوں کے ماتحت ہو کر رہے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں سازشوں کی وجہ سے خیبر سے شام کی طرف نکال دیئے گئے اور ان کی املاک کا معاوضہ دے دیا گیا۔ جزیرہ عرب یہودیوں سے خالی ہو گیا۔

یہ نوجوان کون تھے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے آشوبِ چشم کے باوجود بطور خاص بلا کر علم دیا اور جن کے ہاتھ پر خیبر کا ناقابل تسخیر سمجھا جانے والا مضبوط ترین قلعہ فتح ہوا؟ یہ تھے قریش مکہ کی شاخ بنو ہاشم کے سردار ابو طالب کے بیٹے اور رسول اللہ ﷺ کے عم زاد و داماد حضرت علی کرم اللہ وجہہ جن کی شجاعت اور دینداری کو بعد کی نسلوں نے اساطیری رنگ دے دیا۔ شیر یزداں، شاہ مرداں قوتِ پروردگار!

پیدائش اور نام و نسب

حضرت علی کرم اللہ وجہہ عام الفیل سے تقریباً انتیس برس بعد اور بعثت نبوی سے تقریباً دس برس پہلے (۵۵۹

[1] ابن ہشام، موسیٰ بن عقبہ، واقدی، مسند احمد اور ابن کثیر کے مطابق مرحب کو حضرت محمد بن مسلمہ انصاری نے قتل کیا جن کے بھائی محمود بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو ایک دن پہلے مرحب نے شہید کیا تھا۔ لیکن صحیح بخاری، صحیح مسلم، مستدرک حاکم اور تاریخ الخلفا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرحب کا قاتل بیان کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی نے بھی سیرت النبی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے۔ مؤلف

عیسوی) ماہ رجب کی تیرہویں تاریخ کو بروز جمعہ عالم وجود میں آئے۔ آپ باپ اور ماں دونوں کی طرف سے ہاشمی النسب تھے۔ والد کا نام ابوطالب[1] بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی تھا اور والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی...... ابوطالب جناب رسالت مآب ﷺ کے حقیقی چچا تھے۔ اعلانِ نبوت کے بعد وہ کفارِ قریش کے مقابلے میں مرتے دم تک حضور ﷺ کی حمایت اور حفاظت کرتے رہے۔ اپنے والد عبدالمطلب کے بعد وہ بنی ہاشم کے سردار ہوئے۔ انہوں نے اپنے اس نومولود بیٹے کا نام زید رکھا۔ والدہ نے حیدر۔ چونکہ ابوطالب کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اس لئے رسول کریم ﷺ نے اس بچے کو کمسنی ہی میں اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اپنی طرف سے علی نام رکھا۔ تاریخ میں وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ شعر و قصائد میں حیدر کے نام کا بھی حوالہ آیا ہے لیکن زید کو لوگ بالکل بھول گئے۔ ابوطالب کے اس بیٹے کی خوش نصیبی کا کیا کہنا جو رحمت للعالمین ﷺ اور آپ کی زوجہ محترمہ مسلمہ اول حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے دامن تربیت و محبت میں پل کر جوان ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد جناب ابوطالب کے ایمان کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔[2]

ان کا انتقال ۱۰ نبوی میں ہوا۔ حضرت علی کرم اللہ کی والدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت اسد کے ایمان کے متعلق تمام روایتیں متفق ہیں۔ انہیں رسول اللہ ﷺ سے اور آپ کو ان سے بڑی محبت تھی۔ عبدالمطلب کی وفات کے بعد انہوں نے اپنے گھر میں آپ ﷺ کی پرورش کی تھی۔ آپ ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ ''میں ابوطالب کے بعد سب سے زیادہ ان (فاطمہ بنت اسد) کا احسان مند اور شکرگزار ہوں۔'' ان کا انتقال مدینہ میں ہوا۔ حضور ﷺ خود ان کی قبر میں اترے اور اپنا کرتہ مبارک بطور کفن عطا فرمایا۔ فاطمہ پہلی ہاشمی خاتون تھیں جو ایمان لائیں۔

قبولِ اسلام

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً دس برس تھی جب جناب محمد ﷺ کو اللہ نے اپنے آخری نبی کے طور پر مبعوث کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے گھر ہی میں رہتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اچانک حضور اکرم ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو مصروف نماز پایا۔ قیام، رکوع، سجود اور تلاوت قرآن کا یہ انوکھا منظر نوعمر علی رضی اللہ عنہ کے لئے حیرت و دلچسپی کا باعث ہوا۔ جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا کہ ''آپ یہ کیا کر رہے تھے؟''

حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''اے علی! اللہ نے مجھے اپنا نبی بنایا ہے اور صرف اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔ بت پرستی اور شرک سے منع کیا ہے۔ ہم اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کر رہے تھے، تم بھی میری نبوت پر ایمان لاؤ

[1] اصل نام عبدمناف تھا۔ مگر اپنے سب سے بڑے بیٹے طالب کی نسبت سے ابوطالب کنیت ہوئی اور اسی کنیت سے مشہور ہوئے۔ ابن ہشام کے مطابق طالب دراصل عقیل ابن ابی طالب ہی کا دوسرا نام تھا۔ عقیل بھی اسلام لائے۔ ابوطالب کے تینوں بیٹے عقیل، جعفر اور علی بلند پایہ مرتبہ صحابہ کی صف میں شامل ہوئے۔ مؤلف

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوت میں لکھا ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے نزع کے وقت ابوطالب کے لب ہلتے دیکھے تو ان کے منہ سے اپنا کان لگایا اور سنا کہ وہ کلمہ شہادت پڑھ رہے تھے۔ حضور ﷺ کو بتایا تو آپ بہت خوش ہوئے لیکن فرمایا کہ میں نے تو نہیں سنا۔ مؤلف

اور ایک اللہ کی عبادت کرو۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "میں اس معاملے میں اپنے باپ سے مشورہ کرلوں۔"

ساری رات سوچ اور بے چینی میں گزری۔ دن چڑھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

"اللہ نے مجھے باپ سے مشورہ کے بغیر پیدا کیا۔ پھر میں اس کی عبادت کے لئے اپنے باپ کی رائے کیوں لوں؟ آپ مجھے اپنا نیا دین سکھایئے۔"

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم بے حد مسرور ہوئے۔ علی رضی اللہ عنہ کے حق میں دعا کی اور اب انہیں عام پرورش و تربیت کے علاوہ بڑی توجہ سے اسلامی تعلیم و تربیت بھی دینا شروع کی۔ ابتداء ہی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے سے علی نے کبھی بت پرستی نہ کی۔ اور نہ کبھی کفار و مشرکین کی دوسری اخلاقی برائیوں میں ملوث ہوئے۔ ان کا آئینہ قلب پہلے ہی سے مجلّا و مصفا تھا، اسلام کے محاسن اخلاق اس میں بڑی آب و تاب سے منعکس ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے کہ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیر کو مبعوث ہوئے اور میں منگل کو ایمان لایا۔" حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بعد آپ دوسرے مسلمان تھے۔[1]

سیرت ابن ہشام اور تاریخ طبری کے مطابق کسی موقع پر جناب ابوطالب نے بھی کمسن علی رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ "یہ کیا دین ہے جس پر تو چل رہا ہے؟" علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اختیار کرلیا ہے۔ وہ اللہ کے نبی ہیں۔ میں نے ان کے طریقے کے مطابق نماز پڑھی ہے۔"

ابوطالب نے کہا کہ "وہ تمہیں بھلائی کے سوا کسی چیز کی دعوت نہ دیں گے۔ تم ان کے ساتھ لگے رہو اور ان کی مدد کرو۔"

پھر جب حکم خداوندی کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریبی رشتہ داروں بنی ہاشم کو ایک دن کھانے پر بلایا اور کھانے کے بعد اسلام کی دعوت دی تو کسی نے اس پر کان نہ دھرا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار اپنی دعوت کو دہرایا لیکن صرف نوعمر علی رضی اللہ عنہ اٹھے اور اکابر بنی ہاشم کی پروا نہ کرتے ہوئے بڑی بے خوفی اور جرأت سے بھری مجلس میں فرمایا:

"اگرچہ میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں۔ میری آنکھیں دکھتی ہیں اور ٹانگیں پتلی اور کمزور ہیں۔ تاہم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست و بازو بنوں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دوں گا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور علی رضی اللہ عنہ کے حق میں دعا کی۔

ہوسکتا ہے کہ اس وقت کم سن علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے پُراعتماد اور بلند بانگ الفاظ سن کر اکابر بنی ہاشم ہنسے ہوں اور استہزا اڑایا ہو کہ اس ٹنگڑی برابر چھوکرے کی ہمارے مقابلے میں کیا حیثیت ہے۔ لیکن تاریخ نے ثابت کردیا کہ علی رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کہا وہ کر دکھایا۔ وہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو بنے اور ہر موقع و محل پر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عظیم ترین زعیم بنی ہاشم بنے۔

---

[1] مشہور روایت یہی ہے لیکن راقم کا خیال ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایمان لاتے ہی آپ کی کمسن صاحبزادیاں بھی اپنی والدہ کے ہمراہ خود بخود ایمان لے آئی ہوں گی۔ لہٰذا سب سے پہلے مسلمان تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیوی بچے ہوئے۔ مؤلف

مکی زندگی

حضرت علی رضی اللہ عنہ ۲۲-۲۳ سال کی عمر تک مکہ ہی میں حضور ﷺ کی تربیت اور رفاقت میں رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حصولِ معاش کے لئے کوئی خاص پیشہ اختیار نہیں کیا۔ نوشت و خواند سیکھی۔ مروجہ جنگی فنون میں مہارت حاصل کی۔ حضور ﷺ سے بہترین دینی، اخلاقی، روحانی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اور اپنی زندگی کے بقیہ اوقات حضور ﷺ کی رفاقت و حمایت کے لئے وقف کر دیئے۔ آپ ﷺ کی خلوت و جلوت کی مجلسوں اور دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں میں ساتھ رہے۔ کاتب وحی بھی رہے۔ حضور ﷺ سے براہ راست اور زیادہ سے زیادہ حصولِ علم و تربیت کے جو مواقع علی رضی اللہ عنہ کو میسر آئے۔ کسی دوسرے صحابی کو میسر نہ آسکے۔ اسی لئے باب مدینۃ العلم کہلائے۔

ہجرت

۱۰ نبوی میں جناب ابوطالب اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا تو مشرکین مکہ کو روکنے والا کوئی نہ رہا۔ جب ان کی ایذا رسانی حد سے بڑھ گئی تو مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم خداوندی آگیا۔ حضور ﷺ کی اجازت سے ایک ایک، دو دو کر کے مسلمان مدینہ جانے لگے۔ آخر میں حضور ﷺ خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہمراہ لے کر عازم مدینہ ہوئے۔ چونکہ صادق و امین ﷺ کے پاس اہل مکہ کی بہت سی امانتیں رکھی تھیں، اس لئے آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ہجرت کی رات کو آپ ﷺ کی چادر اوڑھ کر آپ ﷺ کے بستر پر سو جائیں اور پھر لوگوں کی امانتیں واپس کر کے مدینہ چلے آئیں۔ بڑی ہی خوفناک اور خطرناک تھی یہ رات۔ دشمنوں نے اس رات اجتماعی حملہ کر کے حضور ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ علی رضی اللہ عنہ بھی خطرے سے آگاہ تھے بہ نظر ظاہر اس رات بستر رسول ﷺ بستر موت سے کم نہ تھا لیکن انہوں نے فرمانِ رسول ﷺ کی اطاعت میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ بہر حال حضور اکرم ﷺ جانتے تھے کہ قریش کو علی رضی اللہ عنہ سے کوئی پرخاش نہیں۔ اس لئے انہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بستر رسول ﷺ پر بڑے اطمینان سے سو گئے۔ بستر رسول ﷺ پر سونا کسی دوسرے صحابی کے حصے میں نہ آیا۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ کفارِ قریش کا جتھا تلواریں، نیزے، خنجر سنبھالے دروازے کے باہر منتظر تھا کہ کب محمد ﷺ تہجد کی نماز کعبہ میں ادا کرنے کے لئے گھر سے نکلیں اور سب مل کر حملہ کر کے آپ ﷺ کا خاتمہ کر دیں اور اپنے معاشرے کو اسلام کے اثرات سے بچالیں۔ لیکن اللہ کا منصوبہ تو تمام ادیان پر دین اسلام کو غالب کرنے کا تھا اور اس لئے محمد ﷺ اور ان کے رفقا کو بھی۔ رسول اللہ ﷺ تو کیا ان کے بستر پر دلجمعی سے سونے والے علی رضی اللہ عنہ کا بھی وہ بال بیکا نہ کر سکے۔ وہ ہتھیار بند ہو کر آپ ﷺ کے دروازے پر ساری رات کھڑے رہے اور آپ ﷺ ان کے درمیان سے سورہ یٰسین پڑھتے ہوئے گزر گئے۔ صبح کو وہ علی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کے بستر پر محوخواب دیکھ کر بہت جھلائے اور سٹپٹائے۔ علی رضی اللہ عنہ سے پوچھ گچھ کی لیکن وہ حضور ﷺ کے بارے میں کب کچھ بتا کر دینے والے تھے۔ دشمنوں کا منصوبہ خاک میں مل گیا اور اللہ کا منصوبہ کامیاب رہا۔ اللہ ہی کے منصوبے کو کامیاب ہونا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دو روز میں اہل مکہ کی امانتیں ان کے سپرد کر کے مدینہ

روانہ ہو گئے اور حضور ﷺ ابھی قبا ہی میں تھے کہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ کیا عجیب بات ہے کہ ہجرت مدینہ کے بے حد خطرناک سفر میں تو حضور ﷺ کے رفیق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جنہیں اللہ نے ثانی اثنین، کہا اور وہ آپ ﷺ کے خسر اور خلیفہ اول ہوئے اور ہجرت کی رات دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے بستر نبوی پر بے خوف لیٹنے والے علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے داماد اور خلیفہ چہارم ہوئے۔ اول الذکر سے خلافت راشدہ کا آغاز ہوا اور موخر الذکر پر خاتمہ ہوا۔

مواخاۃ

مدینہ میں حضور ﷺ نے مہاجرین وانصار میں مواخاۃ قائم کی تو انصار میں سے حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھائی چارہ قائم کیا۔[1]

مدنی زندگی......غزوات میں شرکت

مدینہ پہنچ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس فعال وسرگرم زندگی کا آغاز ہوا جس نے انہیں اسد اللہ الغالب بنا دیا۔ اسلام کی اشاعت واستحکام کے لئے حضور ﷺ نے جو اقدامات کیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان میں بھرپور حصہ لیا۔ سب سے پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر تھا۔ دوسرے صحابہ کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اینٹ گارا ڈھونے میں شریک رہے۔ دوسرے اوقات میں معاش کے لئے محنت مزدوری بھی کر لیتے۔

مدینہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ایک گھر میں رہتے تھے۔ ہجرت کے دوسرے سال ہی قریش مکہ سے آویزش شروع ہو گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قوت وشجاعت، دلیری وپامردی، جانبازی وفداکاری کے جوہر ان غزوات میں کھلے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زیر قیادت تمام غزوات میں شرکت کی۔ اور کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

غزوۂ بدر (۲ھ) میں قریش کے مانے ہوئے بہادروں اور سرداروں عتبہ اور شیبہ کو مبارزت طلبی میں قتل کیا اور زخمی حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کو اپنے کیمپ میں اٹھا لائے۔ جب عام جنگ شروع ہوئی تو دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے اور بہت سوں کو تہ تیغ کیا۔ مشرکین مکہ کو سخت اور شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کل ستر مشرک مقتولین میں سے اٹھارہ انیس حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے۔

۳ ہجری میں غزوۂ احد پیش آیا ابتداء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قریش کے علم بردار اور مبارزت طلب طلحہ رضی اللہ عنہ کو تہ تیغ کیا۔ عام جنگ میں جب مسلمانوں کے علمبردار مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

---

[1] سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ بڑے بلند مرتبہ صحابی تھے۔ بدر، احد، خندق اور دیگر تمام غزوات میں حضور ﷺ کے ساتھ رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جگہ شام کا عامل مقرر کیا تھا لیکن وہ چارج نہ لے سکے۔ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے ۳۸ ہجری میں کوفہ میں وفات پائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ان کے دوسرے بھائی حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بصرہ کے عامل تھے جنہیں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ نے جا کر برطرف کیا۔ مؤلف

علم سنبھالا اور بے جگری سے لڑے۔ پہلے مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا اور دشمن بھاگ نکلا۔ مسلمان مالِ غنیمت لوٹنے میں لگ گئے۔ مسلمان تیر انداز جو درہ کی حفاظت پر مامور تھے ان میں سے زیادہ تر رسول اکرم ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ درہ کو خالی پا کر مسلمانوں کے عقب سے قریش کے گھوڑ سوار دستے نے حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی صفوں میں افراتفری اور بھگدڑ مچ گئی۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی زخمی ہو گئے اور دشمنوں نے مشہور کر دیا کہ حضور ﷺ شہید ہو گئے۔ اس سے بددلی پھیلی۔ مسلمان منتشر ہو گئے اور بہت سے ہتھیار پھینک کر بیٹھ گئے کہ اب لڑنے کا کیا فائدہ؟ آپ ﷺ کے گرد دس بارہ جاں نثار رہ گئے۔ انہیں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انہوں نے دشمنوں کی صفوں میں گھس کر جدھر بھی حملہ کیا دشمنوں کے پرے کے پرے کائی کی طرح چھٹ جاتے رہے اور جب آخر منتشر مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ سلامت ہیں تو از سر نو آپ ﷺ کے گرد اکٹھے ہوئے اور قریش کو جنگ جاری رکھنے کی ہمت نہ دی۔ جنگ کے خاتمے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ڈھال میں پانی بھر کر لائے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کے زخموں کو دھویا اور خون بند کرنے کے لئے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر اس کی راکھ آپ ﷺ کے زخموں میں بھری۔ جنگ احد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سولہ زخم آئے۔ احد کا دن علی رضی اللہ عنہ کا دن تھا۔

۵ ہجری میں غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قریش کے بہادر ترین شخص عمرو بن عبدود کو قتل کیا جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ وہ گھوڑا کودا کر خندق پار کر کے مبارزت طلب ہوا تھا۔ شیر خدا کی تلوار کے ایک ہی وار سے اپنی آخری منزل کو پہنچ گیا۔ دشمنوں پر دہشت چھا گئی۔

۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی تھے جنہوں نے معاہدہ کی عبارت تحریر کی۔ قریش نے آپ ﷺ کے اسم مقدس کے ساتھ، رسول اللہ، کے الفاظ پر اعتراض کیا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ الفاظ مٹانے کو کہا مگر جاں نثارِ رسول ﷺ نے کہا خدا کی قسم! مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ بالآخر آپ ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے یہ الفاظ یہ کہہ کر مٹا دیئے کہ ''بے شک میں اللہ کا رسول ہوں لیکن قریش مکہ نے ابھی تک مجھے تسلیم نہیں کیا اس لئے ان کے نقطۂ نظر سے یہ اعتراض درست ہے۔''

۷ ہجری میں خیبر فتح ہوا جس میں جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کلیدی کردار ادا کیا۔

۸ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فتح مکہ اور غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ فتح مکہ کے دن اسلامی لشکر کا ایک علم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ خانہ کعبہ کے اندر رکھے ہوئے تمام بت حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ سے توڑ کر گرا دیئے۔ ایک بت بہت اونچائی پر نصب تھا۔ وہاں تک ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! میرے کندھوں پر سوار ہو کر اس بت کو توڑ دیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، علی رضی اللہ عنہ! تم بار نبوت کو نہیں اٹھا سکو گے۔'' پھر علی رضی اللہ عنہ کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور انہوں نے وہ آخری بت بھی توڑ دیا۔ کعبہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بتوں کی نجاست سے پاک ہو گیا۔

غزوۂ حنین میں جب ابتدائی غلبے کے بعد دشمنوں کی تیر اندازی سے مسلمان منتشر ہو گئے۔ یوم احد کی سی

حالت پیدا ہوئی اور صرف چند جاں نثار صحابہ پروانوں کی طرح شمع رسالت کے گرد رہ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ انتہائی پامردی اور جاں بازی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں لڑے حتیٰ کہ مسلمانوں نے دوبارہ حملہ کر کے دشمنوں کی صفوں کو الٹ دیا اور وہ بھاگ نکلے۔ اس دن مہاجرین کا ایک لواء حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ غزوۂ حنین سے عرب کی قسمت کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ ہو گیا کہ اب اسے دارالاسلام بن کر ملکوں اور قوموں کے درمیان زندہ اور سر بلند رہنا تھا۔

واقعۂ تبوک۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت

رجب ۹ ہجری (اکتوبر ۶۳۰ء) میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار جاں نثار صحابہ کا لشکر لے کر قیصر روم ہرقل کے مقابلہ اور جنگ موتہ کا انتقام لینے کے لئے تبوک روانہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے نائب کے طور پر مدینہ میں چھوڑا لیکن جب منافقین نے ان پر طرح طرح کے طعنے کسنے شروع کئے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے روانہ ہو گئے اور جرف کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جاتے ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اے علی! کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ تم میرے لئے اسی طرح ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہارون تھے، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے اور مدینہ لوٹ آئے۔ رومی طرح دے گئے اور تبوک میں جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ جہاد کی نیت سے تبوک کا سفر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری سفر تھا۔ بدر سے لے کر حنین تک حضرت علی رضی اللہ عنہ شامل رہے اور کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ تبوک کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اپنے نائب کے طور پر بطور خاص مدینہ میں چھوڑ گئے۔

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے شادی

جنگ بدر کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی محبوب ترین صاحب زادی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شادی کر دی اور فرمایا کہ ''پیاری بیٹی! میں نے اپنے خاندان کے بہترین شخص سے تمہاری شادی کی ہے۔'' شادی کے لئے ضروری سروسامان بہم پہنچانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی زرہ فروخت کرنے کے لئے مدینہ کے بازار میں تشریف لے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زرہ چار سو درہم میں خرید لی۔ لیکن اس پر قبضہ کرنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہدیہ کے طور پر لوٹا دی حضرت علی رضی اللہ عنہ زرہ اور درہم لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں کلمات خیر کہے۔[1] اس رقم سے ضرور سامانِ خانہ داری اور ولیمہ کا انتظام کیا گیا۔ سامان (جسے لوگ جہیز کہتے ہیں) میں چمڑے کا ایک گدا جس میں کھجور کے پتے بھرے تھے، بان کی چارپائی، ایک چادر، دو آٹا پیسنے کی چکیاں، ایک چھاگل، ایک مشک اور دو مٹی کے

---

[1] شیعی تصنیف کشف الغمہ جلد اول ص ۴۸۶-۴۸۵ طبع جدید ایران۔ نیز بحار الانوار، جلد عاشر ص ۲۹۰، طبع قدیم، ایران۔ بحوالہ خلفائے راشدین کی یگانگت ص ۴۳، مصنفہ منشی عبدالرحمٰن خاں۔

گھڑے شامل تھے۔ تقریب نکاح میں مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ شریک ہوئے۔ اتنی ہی تعداد انصار کی تھی۔ دعوتِ ولیمہ میں کھجوریں، جو کی روٹی، پنیر اور ایک خاص قسم کا شوربہ تھا۔ یہ تھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی سادہ ترین شادی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ اور اس کا سروسامان اور اہتمام! آج کے مسلمانوں خاص کر صاحب ثروت طبقے کی شادیوں، دعوتوں اور ولیموں کے تکلفات اور اخراجات کا بھی تصور کیجئے جن کا اندازہ لاکھوں تک پہنچتا ہے۔

ایک انصاری صحابی حضرت حارث بن نعمان رضی اللہ عنہ نے اپنے مکانوں میں سے ایک مکان نئے شادی شدہ جوڑے کو رہائش کے لئے دے دیا جو حجرہ نبوی کے قریب ہی تھا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تین صاحب زادے حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ اور محسن رضی اللہ عنہ اور دو صاحب زادیاں ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور زینب رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ محسن رضی اللہ عنہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ باقی چاروں نے اسلامی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جیتے جی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسری شادی نہیں کی۔

حج اور اعلانِ برأت

ذی قعدہ ۹ ہجری میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو مسلمانوں کا قافلہ حج بیت اللہ کے لئے مکہ روانہ کیا[1] اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر الحج مقرر کیا۔ ان کی روانگی کے بعد سورۂ توبہ کی ابتدائی چالیس آیات نازل ہوئیں۔ ان میں شامل احکام کی اہمیت کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تاکہ حج کے موقع پر سارے عرب کے نمائندہ مجمع میں پڑھ کر سنائیں اور اعلان کر دیں کہ آئندہ سال سے کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا اور جن مشرک قبائل کے مسلمانوں سے معاہدے ہیں وہ چار ماہ کے بعد ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مناسک حج کی تعلیم دی قربانی کے دن خطبہ میں حج کے مسائل بیان کئے اور اپنی امارت میں مراسم حج ادا کرائے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سورہ توبہ کی پہلی چالیس آیات پڑھ کر سنائیں عرب کے اکناف و اطراف سے آنے والے ہزاروں کفار و مشرکین موجود تھے جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف تین سو تھی۔ اعلانِ برات سن کر مشرکین منہ تکتے رہ گئے اور ان پر کعبہ کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے۔

سرایا

ان غزوات اور خدمات کے علاوہ خیبر کی فتح کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سو آدمیوں کا ایک دستہ دے کر بنی سعد کے مقابلے کے لئے فدک بھیجا۔ یہ قبیلہ خیبر کے یہودیوں کی مدد کے لئے جمع ہوا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اللہ نے کامیابی دی۔ بنی سعد بھاگ گئے۔ بعض دوسری مہمات بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں سر کی گئیں۔

---

[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود غالباً اس لئے تشریف نہ لے گئے کہ یہ مسلمانوں کا پہلا اور مشرکین کا آخری ملا جلا حج تھا جو اسلامی اور جاہلی رسوم کے ساتھ ادا کیا گیا۔ اگلے سال خالص اسلامی طریقے سے آپ کی قیادت میں حج ادا ہوا۔ دوسرے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے پہلے حج کا امیر بنا کر بھیجنے میں خلافت کی طرف بھی اشارہ تھا۔ مؤلف

یمن میں تعیناتی۔دعوت وتبلیغ اسلام

فتح مکہ کے بعد ۸ ہجری کے اواخر میں حضور ﷺ نے یمن کے سب سے بڑے قبیلے ہمدان کی طرف تبلیغ اسلام کے لئے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔تب آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ان کی مساعی سے سارا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ربیع الآخر ۹ ہجری میں آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قبیلہ طے کا بت الفلس توڑنے کے لئے بھیجا۔انہوں نے جا کر بت کو توڑا اور مالِ غنیمت اور قیدی لے کر واپس آئے۔انہی میں حاتم طائی کی بیٹی سفانہ بھی تھی۔حضور ﷺ نے اسے اور اس کے قبیلہ کو آزاد کر دیا۔سفانہ کی کوشش سے اس کا مفرور بھائی عدی بن حاتم بھی مسلمان ہوگیا۔عدی رضی اللہ عنہ جنگ جمل اور صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر لڑا۔

۱۰ ہجری میں یمن کے قبیلہ مذحج کی طرف تبلیغ اسلام کے لئے آپ کو رسول اکرم ﷺ نے بھیجا۔کچھ ابتدائی چپقلش کے بعد حضرت علی کو اپنے مشن میں کامیابی ہوئی اور لوگ ایمان لے آئے،ہمدان اور مذحج قبائل میں ایمان کی روشنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مساعی سے پھیلی۔

یمن میں قاضی کے فرائض بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد تھے۔تقرر کے وقت آپ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ''آپ مجھے جس قوم کی طرف بھیج رہے ہیں اس میں مجھ سے زیادہ عمر رسیدہ اور تجربہ کار لوگ موجود ہوں گے۔ان کے معاملات کا فیصلہ کرنا میرے لئے مشکل ہوگا۔''

جناب ختمی مرتبت ﷺ نے جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سینے پر اپنا دست مبارک رکھا اور دعا فرمائی: ''اے اللہ! علی رضی اللہ عنہ کی زبان کو راست گو بنا دے اور اس کے دل کو ہدائت کے نور سے منور کر دے۔'' اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور روانہ کیا۔چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسلام کی تبلیغ واشاعت میں وہاں بڑی کامیابی ہوئی اور وہاں لوگوں کے معاملات اور مقدمات بڑی عمدگی سے نپٹائے۔حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''میرے صحابہ میں مقدمات کا سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علی رضی اللہ عنہ ہیں (اقضی ھم علی)۔بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضور ﷺ کا یہ جملہ متعدد مواقع پر دہرایا۔آج بھی اہل سنت کے خطیب ہر مسجد کے منبر سے یہ الفاظ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں دہراتے ہیں اور اپنے خطباتِ جمعہ میں قیامت تک دہراتے رہیں گے۔

حجتہ الوداع میں شرکت

حضرت علی کرم اللہ وجہہ ابھی یمن ہی میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ حجتہ الوداع کے لئے مکہ تشریف لے گئے۔حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی قربانی کے سو اونٹ ساتھ لے کر یمن سے سیدھے مکہ پہنچ گئے۔ان اونٹوں میں سے تریسٹھ اونٹ خود حضور ﷺ نے بہ نفس نفیس اپنے دست مبارک سے ذبح کئے۔

غدیر خم

حجتہ الوداع سے واپسی پر مدینہ کے راستہ میں بعض افراد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں معترضانہ چہ

میگوئیاں کیں جو حضور ﷺ کے کانوں تک پہنچیں۔ آپ ﷺ نے جحفہ سے تین میل کے فاصلے پر غدیر خم[1] نامی گاؤں میں پڑاؤ ڈالا اور ایک خطبہ دیا جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف کی اور باتوں کے علاوہ فرمایا کہ "میں جس کا مولا ہوں، علی رضی اللہ عنہ بھی اس کے مولا ہیں[2]۔ جو علی رضی اللہ عنہ کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔

اے اللہ! جو علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرے تو بھی اس سے محبت رکھ۔"

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغل گیر ہوئے۔ انہیں مبارکباد دی اور کہا کہ "آج سے آپ میرے بھی مولا ہیں۔"

حضور ﷺ کی تجہیز و تکفین

۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری کو رسول اللہ ﷺ نے انتقال فرمایا۔ حضور ﷺ کے اعزہ و اقارب نے تجہیز و تکفین کی خدمت انجام دی۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی مدد سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے غسل دیا اور انہی کی مدد سے قبر میں اتارا۔ یہ آخری خدمت خاص بھی ان کے حصے میں آئی۔

پیشرو خلفاء کی بیعت

یہ سچ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بعد مسلمانوں کی عام مشاورت کے دوران میں کوئی بھی ان کے حق جانشینی سے انکار نہیں کرے گا کیونکہ وہ آپ ﷺ کے قریبی عزیز تھے[3] لیکن ہنگامی حالات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بطور خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔ تاہم انہوں نے اگلی صبح کو لوگوں کو مسجد میں جمع کر کے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ سقیفہ بنی ساعدہ میں بعجلت کئے جانے والے فیصلہ کو قطعی تصور نہیں کرتے اور اب لوگوں کو آزادی ہے کہ جسے چاہیں خلیفہ منتخب کر لیں۔ مگر کسی نے مخالفت نہ کی نہ بیعت فسخ کی۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے، خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ "خدا کی قسم! نہ ہم از خود بیعت فسخ کرتے ہیں نہ آپ سے بیعت کی واپسی کی خواہش کرتے ہیں۔ آپ کو نبی کریم ﷺ نے نماز میں مقدم فرمایا۔ اب کون سی ہستی آپ کو موخر کر سکتی ہے؟" علامہ ابن جریر طبری، محمد ابن سعد، بلاذری (انساب

---

[1] آج کل رابغ کہتے ہیں

[2] عربی کا لفظ مولا بہت وسیع المعنی ہے۔ بالخصوص یہ ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی تعلق کی بنا پر دوسرے شخص کی حمایت کرے قطع نظر اس کے کہ وہ رشتہ داری کا تعلق ہو یا دوستی کا یا کسی اور نوع کا۔ دوست، حامی، یار و مددگار، ہمسایہ، آقا، آزاد کردہ غلام وغیرہ سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ سیاق کی رو سے یہاں دوست اور محب مراد ہے۔ مؤلف

[3] سب سے قریبی عزیز آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ تھے لیکن ایک مشہور روایت کے مطابق وہ اپنی بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بطور جانشین آگے بڑھانا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ آپ ﷺ کے مرض الموت کے دوران میں جانشینی کے متعلق واضح طور پر پوچھ لیا جائے تاکہ بعد میں کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے نہ کوئی دوسرا دعویدار کھڑا ہو۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھنے سے انکار کر دیا۔ مؤلف

الاشراف) محب طبری (ریاض النضرۃ) سید ذاکر حسین جعفری (تحفۃ الاحباب فی تاریخ الاصحاب، باب دوم ص ۱۴) مرزا محمد تقی لسان الملک (ناسخ التواریخ) اور متعدد دوسرے مؤرخین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رضامندانہ بیعت کی تصدیق کرتے ہیں۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے فوراً بعد جب مانعین زکوٰۃ اور مرتدین نے عظیم فتنہ وفساد برپا کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسرے صحابہ کے ساتھ مل کر اس کو کچلنے کی پوری کوشش کی اور مدینہ پر حملہ آور ہونے والوں کو مار بھگایا۔ بعد میں بھی ہمیشہ ان کے مشیر معاون اور مددگار رہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بلا حیل وحجت کی اور ان کے ساڑھے دس سالہ دور خلافت میں ان سے بھرپور تعاون کیا اور ان کے مشیر بنے رہے۔ اہم معاملات میں بڑے صحیح اور مفید مشورے دیئے۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''اگر علی نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو گیا ہوتا۔'' قاضی کی حیثیت سے اہل مدینہ کے مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے اور حدود نافذ کرتے تھے۔ اخلاص اور خیر خواہی کا یہ عالم تھا کہ سلطنت ایران کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ (نہاوند) جب نہایت نازک اور آخری فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہوئی تو متعدد صحابہ کی رائے تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کی سپہ سالاری خود اپنے ہاتھ میں لے کر پیش قدمی کریں اور وہ تقریباً آمادہ بھی ہو گئے تھے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف مشورہ دیا اور وہ سب سے صائب مشورہ تھا جسے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قبول فرمایا۔ اس کا مفصل حوالہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں دیا جا چکا ہے۔ غرضیکہ آپ ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کو ملحوظ خاطر رکھتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ کی دیانت، اصابت رائے اور اخلاص پر کامل اعتماد تھا۔ وہ بیت المقدس کے سفر کے موقع پر مدینہ میں کاروبار خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کے سپرد کر گئے تھے۔ باہمی اعتماد اور اتحاد ویگانگی کی انتہا یہ تھی کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا...... حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی صاحب زادی ...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں اور ان سے ایک صاحب زادہ زید اور ایک صاحب زادی رقیہ تولد ہوئے۔

حضرت عمر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں براہ راست مقابلہ تھا۔ اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعض اقوال وآثار سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے تھے لیکن وفات کے وقت انہوں نے نامزدگی وانتخاب کا بوجھ اپنے سر لینا پسند نہ کیا اور معاملہ انتخابی مجلس پر چھوڑ دیا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہو گئے تو دوسروں کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی بیعت کر لی۔ پھر ہمیشہ انہیں مخلصانہ تعمیری مشورے دیتے رہے۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ آپ اس وقت تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کرتے رہے جب تک کہ بلوائیوں اور مفسدوں کے ہاتھوں بالکل بے دست و پا نہیں ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر آپ کو سخت رنج اور قلق ہوا۔ دوسروں کے ساتھ آپ کے صاحب زادے حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لئے ان کے دروازے پر موجود

تھے۔ آپ ان پر سخت ناراض ہوئے اور تھپڑ اور دو ہتڑ رسید کیے کہ تمہارے ہوتے ہوئے یہ سانحہ کیسے ہو گیا؟ پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر فرمایا ''خدایا! میں عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے اپنی برأت ظاہر کرتا ہوں۔''

مختصر یہ کہ خلفائے ثلاثہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باہمی تعلقات ہمیشہ برادرانہ و مخلصانہ رہے۔ کسی معاملے میں نیک نیتانہ اختلاف اور بات ہے اور دشمنی اور بات۔ جنہیں قرآن رحماء بینہم کا سرٹیفکیٹ دے وہ ایک دوسرے کے دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب بطور خلیفہ اور ان کے عہد کے حالات و واقعات کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کی ایک طویل تقریر کا اقتباس درج کر دیا جائے جو انہوں نے بصرہ تشریف لے جانے پر ابن الکواء اور قیس بن زیاد کے استفسار کے جواب میں کی تھی اور جسے علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زبانی ابن عساکر کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ استفسار یہ تھا:

''لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے عہد کیا تھا کہ ان کے بعد آپ خلیفہ ہوں گے۔ لہٰذا آپ ہمیں حقیقت الامر سے آگاہ فرمائیں۔ آپ سے زیادہ ثقہ کون ہو سکتا ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا:

''بخدا یہ غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کوئی عہد کیا تھا۔ جب میں نے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی تو سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ کیوں بولوں؟ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خلیفہ بنانے کا عہد مجھ سے کیا ہوتا تو میں ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو منبر نبوی پر کھڑا نہ ہونے دیتا اور دونوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتا۔ اگرچہ اس وقت اس معاملے میں میرا کوئی ساتھی بھی نہ ہوتا۔ پھر اس بات پر بھی غور کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو اچانک قتل ہوئے نہ کسی دوسرے طریقے سے آپ کو ناگہانی موت آئی بلکہ عرصہ تک بیمار رہے۔ موذن آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کی امامت کے لئے عرض کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت کریں۔ چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کئی دن تک امامت کرتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ میں بستر علالت سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھاتے دیکھتے رہے ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے ایک (ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ارادہ یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت نماز سے باز رکھنا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ سے فرمایا کہ تم یوسف کے زمانہ کی خواتین کی مانند ہو۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہو وہی نماز پڑھائیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما گئے تو ہم لوگوں نے مصالح ملت پر غور کیا اور اس شخص (ابوبکر رضی اللہ عنہ) کو اپنی دنیا (کی امارت و خلافت) کے لئے قبول کر لیا جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کے لئے پسند فرمایا کیونکہ نماز ہی دین اسلام کا اصلی اصول اور رکن اعظم ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمارے دین کے سردار اور اسے قائم و مستحکم کرنے والے تھے۔ اس لئے ہم نے ان سے بیعت کر لی اور وہ اس کے اہل تھے۔ ان کو خلیفہ بنانے میں ہم

میں سے کسی ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا اور کسی نے بھی ایک دوسرے کے خلاف کوئی بات نہ کہی۔ نہ نقصان پہنچانے کے درپے ہوا اور یقین ہے کہ کوئی فرد ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیزار نہیں ہوا۔ اسی لئے میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حق بیعت ادا کیا۔ ان کی اطاعت کی اور ان کے لشکر میں شامل ہو کر ان کی طرف سے لڑا۔ انہوں نے جو کچھ مجھے دیا میں نے بخوشی قبول کیا۔

ان کے سامنے مجرموں پر اپنے درہ سے حدود جاری کرتا رہا۔ انہوں نے بوقت انتقال عمر رضی اللہ عنہ کو ہم پر خلیفہ تجویز کیا۔ وہ خلیفہ ہوئے اور ہم میں سے کسی نے بھی ان کی مخالفت نہیں کی۔ نہ کوئی ان سے بیزار ہوا۔ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کا بھی حق ادا کیا۔ ان کے لشکروں میں شامل ہو کر جہاد کئے۔ انہوں نے جو کچھ مجھے دیا۔ میں نے بخوشی قبول کیا۔ ان کے عہد خلافت میں بھی میں نے اپنے کوڑے سے مجرموں کو سزا دی لیکن ان کے انتقال کے وقت میں نے اپنے دل میں سوچا کہ مجھے قرابت نیز اسلام لانے میں سبقت حاصل ہے اور اسلام کے ابتدائی زمانہ میں وہ کام کئے ہیں جو اللہ کو پسند ہیں۔ اسی لئے اپنی برتری اور فضیلت کا خیال آیا اور یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ عمر رضی اللہ عنہ اب میری خلافت سے اعراض نہیں کریں گے اور مجھی کو خلیفہ منتخب کریں گے لیکن عمر رضی اللہ عنہ کو خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں وہ ایسا خلیفہ منتخب نہ کرلیں جس کے اعمال کا خود انہیں قبر میں جواب دینا پڑے۔ چنانچہ انہوں نے خود کو اور اپنی اولاد کو خلافت کے معاملے سے علیحدہ کر لیا۔ اگر آپ بخشش وعطایا کا اصول اختیار کرتے تو اپنے بیٹے سے بڑھ کر کسی کو مستحق نہ سمجھتے۔ غرضیکہ خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار قریش کے چند افراد کے سپرد کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ جب لوگ انتخاب کے لئے جمع ہوئے تو میں نے خیال کیا کہ اب کے خلافت کا بار میرے کندھوں پر ہی پڑے گا۔ اور مجلس انتخاب کسی کو میرے برابر نہیں سمجھے گی۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہم سے عہد و پیمان لئے کہ جو شخص بھی خلیفہ مقرر کیا جائے ہم سب اس کی بیعت اور اطاعت کریں گے۔ پھر انہوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ لیا (بیعت کر لی) اس وقت میں نے غور کیا کہ میرا اقرارِ اطاعت میری بیعت پر مقدم ہے کیونکہ مجھ سے جو وعدہ لیا گیا تھا وہ دوسرے کی بیعت کے لئے تھا۔ لہٰذا میں نے بھی عثمان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور گزشتہ خلفا کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرح عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کے حقوق ادا کئے، ان کی فرمانبرداری کی، ان کی ماتحتی اور ان کے لشکر میں شامل ہو کر جنگ و جہاد میں حصہ لیا اور جب وہ مجھے کچھ دیتے تو میں لے لیا کرتا اور ان کے سامنے مجرموں پر شرعی حدود جاری کرتا تھا۔ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مجھے خیال ہوا کہ پہلے اور دوسرے خلیفہ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام بنایا تھا رخصت ہو گئے۔ اور تیسرے خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ جن کی خلافت کے لئے مجھ سے وعدہ لیا گیا تھا، شہید ہو گئے، اس وقت اہل حرمین اور ان دونوں شہروں (کوفہ و بصرہ) کے باشندوں نے میری بیعت کر لی...... اور اب خلافت کے لئے ایک۔

ایسا شخص امیر[1] مد مقابل بن گیا ہے جو قرابت رسول ﷺ علم اور سبقت اسلامی میں میرے برابر ہو ہی نہیں سکتا۔ اور میں ہر لحاظ سے اس سے بڑھ کر خلافت کا حق دار ہوں۔''

ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انتخاب خلیفہ کو جمہوری اور شورائی عمل سمجھ کر قبول کیا۔ موروثی حق امامت کا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہ تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت......کار مشکل

۲۴ ذی الحجہ ۳۵ ہجری......(۲۳ جون ۶۵۶ء)

علامہ ابن جریر طبری کی روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد پانچ دن تک مدینہ منورہ پر باغیوں کا قبضہ رہا۔ مصریوں کا سرغنہ غافقی بن حرب مسجد نبوی میں نماز کی امامت کرتا تھا۔ اہل مدینہ پر سراسیمگی طاری تھی۔ وہ کوئی موثر اقدام نہ کر سکے۔ افراتفری اور یاس و نومیدی کا عالم تھا۔ انہونی بات ہوگئی تھی۔ مملکت اسلامیہ سربراہ حکومت سے زبردستی محروم کردی گئی تھی جس کی کبھی توقع نہ تھی۔ اس المیہ عظیم کے ذمہ دار خود باغی بھی صورت حال سے مشوش تھے اور چاہتے تھے کہ جلد سے جلد نئے خلیفہ کا انتخاب ہو جائے اور اس انتخاب میں ان کا بھی ہاتھ ہو۔ انہیں خطرہ تھا کہ تاخیر کی صورت میں مصر، شام، کوفہ اور بصرہ کے گورنران کے خلاف کارروائی کے لئے فوجیں بھیج دیں گے۔ مدینہ سے حج پر گئے ہوئے لوگ بھی واپس آجائیں گے اور عوامی ردعمل بھی شروع ہوسکتا ہے جس سے نپٹنا دو ہزار باغیوں کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ ان کی مدد سے نیا خلیفہ منتخب ہو جانے سے شاید وہ انتقامی کارروائی سے محفوظ ہو جائیں یا کم سے کم اپنی پوزیشن کو مستحکم کرلیں۔ بہر حال باغیوں کو اس امر میں کوئی شبہ نہ تھا کہ نئے خلیفہ کا انتخاب ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح مدینہ ہی میں ہوگا جو مرکز اسلام ہونے کے علاوہ اہل حل وعقد مہاجرین وانصار کا بھی مرکز تھا۔ مدینہ سے باہر دوسرے دور دراز صوبوں اور علاقوں سے اس بارے میں فوری طور پر استصواب ممکن نہ تھا، نہ ماضی میں اس کی کوئی مثال موجود تھی۔ باغیوں کو خطرہ تھا کہ اگر وہ نئے خلیفہ کے انتخاب کے بغیر اپنے اپنے علاقوں میں لوٹ گئے اور ان کی عدم موجودگی میں مہاجرین وانصار نے اپنی مرضی سے کسی کو خلیفہ منتخب کرلیا تو نئے خلیفہ کا پہلا اقدام یہ ہوگا کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں ملوث باغیوں کو گرفتار کر کے ان سے انتقام لے۔ اس وقت باغی خلیفہ کی فوجوں اور اہل مدینہ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خود ان میں سے کوئی خلیفہ منتخب نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا انہوں نے اکابر صحابہ خصوصاً عشرہ مبشرہ کے باقی ماندگان کے پاس آنا جانا اور انہیں خلافت کا منصب قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششیں شروع کیں اہل کوفہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو چاہتے تھے اور اہل بصرہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو۔ لیکن ان دونوں نے اس خلافت سے بیزاری ظاہر کی جو قاتلین کے ذریعے حاصل ہو۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تو عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے

---

[1] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

وقت ہی خلافت کی امیدواری سے دستبردار ہو گیا تھا۔ مجھے خلافت کی کسی حال میں بھی ضرورت نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے باغیوں کو جواب دیا کہ اس خلافت میں اب انتقامی عنصر اور جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔ اس انتقامی کارروائی کے لئے تم میرے علاوہ کسی دوسرے کو تلاش کرو۔

مصری باغیوں کی اکثریت تھی اور مدینہ پر انہی کا قبضہ تھا۔ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بعض دوسرے اہل مدینہ اور عجمی غلام ان کے ساتھ تھے۔ ان کا رجحان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف تھا۔ ویسے بھی سبھی جانتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنتے بنتے رہ گئے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے وقت ہی یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صوبوں کے گورنروں، دوسرے منصب داروں، اکابر مہاجرین و انصار، امہات المومنین، عامتہ المسلمین اور مدینہ سے گزرنے والے حاجیوں کے قافلوں سے گفتگو کر کے رائے عامہ معلوم کر لی تھی اور اس فیصلے پر پہنچے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد دوسرے شخص جن کو ملت اسلامیہ کا سب سے زیادہ اعتماد حاصل ہے، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لئے عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی دوسرا شخص خلافت کے موزوں اور اہل نہ تھا۔ اگر زمانہ جدید کے مروجہ طریقوں کے مطابق بھی کوئی انتخاب کرایا جاتا تو لازماً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ ووٹ ملتے۔ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رابطہ قائم کیا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''بخدا مجھے شرم آتی ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ مظلومانہ شہید ہوں، ان کی لاش بے گور و کفن پڑی ہو اور میں ان کی جگہ خلافت کا منصب سنبھالوں۔ مجھے اس کی حاجت نہیں۔ تم کسی اور کو اپنا امیر بنا لو اور مجھے اس کا وزیر رہنے دو۔ اور پھر یہ کہ خلیفہ کا چناؤ اہل شوریٰ اور اہل بدر کا حق ہے'' اس پر باغیوں نے اکابر صحابہ اور اہل مدینہ کو نوٹس دے دیا کہ ''اگر تم لوگوں نے تین دن کے اندر اندر اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب نہ کیا تو ہم علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ اور بہت سے دوسرے لوگوں کو قتل کر دیں گے۔'' یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ سب نے مل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منت سماجت کی اور انہیں خلافت کا منصب قبول کرنے پر آمادہ کیا اور کہا کہ اگر آپ خلافت قبول نہیں کریں گے تو فتنوں کا دروازہ کھل جائے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ اس موقع پر خلافت کی ذمہ داری قبول کرنا کانٹوں کی سیج ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر یہ معاملہ یونہی چھوڑ دیا گیا تو باغی عناصر مزید اپنی سی کر گزریں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آخری چارہ کار کے طور پر اپنے ہی میں سے کسی کو چن لیں اور انکار کرنے والے صحابہ اور دوسروں کا وہی انجام ہو جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہوا اور ملت اسلامیہ مزید انتشار، نفاق اور باہمی خونریزی کا شکار ہو جائے، دشمن اس پر دلیر ہو جائیں اور نظام خلافت علیٰ منہاج نبوت ختم ہو جائے۔ اس لئے ملت کے مجموعی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے آخر انہوں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ لیکن فرمایا کہ ''میری بیعت خفیہ طور پر گھر کے اندر نہیں ہو سکتی۔ یہ اسی طرح برسرِ عام مسجد میں ہونی چاہئے جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی ہوئی تھی تاکہ خاص و عام کو اس کا علم ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی عام رضامندی کے بغیر خلافت مجھے حاصل بھی نہیں ہو سکتی۔'' انہوں نے اپنی افضلیت اور ماموریت کی کوئی بات نہ کی۔

چنانچہ مسجد نبوی میں مہاجرین وانصار نے آپ کی بیعت کی۔ان کے بعد دوسرے اہل مدینہ اور باغیوں نے بھی بیعت کی۔لوگوں کو اکٹھا کرنے اور بیعت پر مجبور کرنے میں کوفی باغیوں کے سرغنہ مالک اشترنخعی نے بڑی سرگرمی دکھائی۔سب سے پہلے اسی نے بیعت کی۔حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ مذبذب تھے۔اول الذکر کو مالک اشتر اور مؤخر الذکر کو حکیم بن جبلہ عبدی قتل کی دھمکی دے کر گھر سے زبردستی پکڑ کر لایا۔جیسا کہ ان دونوں بزرگ صحابہ نے بعد میں کہا۔انہوں نے اس حالت میں بیعت کی کہ تلوار ان کی گردن پر تھی۔بہرحال ان کی بیعت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے ساتھ مشروط تھی۔بعض بزرگ صحابہ جن کی تعداد سترہ یا بیس تھی، نے بیعت نہیں کی۔لیکن انہوں نے بعد میں کبھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سرگرم مخالفت بھی نہیں کی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان سے تعرض نہیں کیا۔ان میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ وغیرہم شامل تھے۔بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قریش حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ناپسند کرتے تھے۔بہرحال حضرت علی رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفہ راشد منتخب ہو گئے۔گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے باغیوں نے جو محاصرہ، ہنگامہ آرائی، بلوہ اور خونریزی کی فضا پیدا کر رکھی تھی۔اس کے تناؤ میں کچھ کمی آئی اور ملت کو پھر سے ایک باقاعدہ منتخب شدہ سربراہ میسر آیا کچھ باغی اپنے اپنے علاقوں کو لوٹ گئے لیکن زیادہ تر مدینہ میں رہ گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل ہو گئے۔بنوامیہ اور ان کے ہمدرد اپنے دلوں میں خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص اور انتقام کا جذبہ لئے ہوئے یا تو دمشق چلے گئے یا مکہ۔انہوں نے بیعت نہیں کی۔وہ عہد عثمانی ہی میں خلافت پر اقتدار کو اپنا حق سمجھنے لگے تھے اب اس حق خلافت میں حق انتقام بھی شامل ہو گیا۔بہرحال حضرت علی رضی اللہ عنہ زبردستی خلیفہ نہیں بنے۔نہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کوئی جوڑ توڑ کیا نہ کوشش کی۔ان کے پیشرو خلفا کے عہد کی طرح صحابہ کی بڑی اکثریت نے ان کے ہاتھ پر برضا و رغبت بیعت کی۔بعد میں شام کے سوا تمام اسلامی صوبوں نے ان کی خلافت کو تسلیم کر لیا البتہ خلافت کے مصفا دودھ میں عثمان رضی اللہ عنہ کے خون بے گناہ قطرے شامل ہو گئے۔

خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجمع عام میں حسب ذیل خطبہ دیا جس سے خلافت وحکومت کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے:

> ''لوگو! میں تم ہی میں کا ایک آدمی ہوں۔جو حقوق تمہارے ہیں وہی میرے لئے بھی ہیں اور جو ذمہ داریاں تم پر عائد ہوتی ہیں وہی مجھ پر عائد ہوتی ہیں۔میں تمہیں تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلاؤں گا اور مجھے جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے انہیں تم پر نافذ کروں گا۔

لوگو! آگاہ رہو ایسا نہ ہو کہ کل تم میں سے وہ لوگ جن پر دنیا چھا گئی اور وہ عمارتوں کے مالک بنے، جن لوگوں نے نہریں نکالیں، گھوڑوں پر سواری کی اور ملازم و خدمت گار مقرر کئے، انہیں جب میں اس ناجائز عیش و عشرت

سے محروم کردوں اوران کے اصل حقوق کی حدوں میں واپس لاؤں تو وہ کہنے لگیں کہ تم نے ہمیں ہمارے حقوق سے محروم کردیا۔ سنو! رسول اللہ ﷺ کے صحابی مہاجرین وانصار میں سے جو کوئی صحبت رسول ﷺ کی وجہ سے خود کو دوسروں پر فضیلت دیتا ہے وہ جان لے کہ یہ فضیلت کل کو اللہ کے حضور ﷺ کام آئے گی اور وہی اس کا اجر وثواب دے گا۔ آگاہ رہو کہ جس شخص نے بھی خدا اوراس کے رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہی اور ہمارے دین میں داخل ہوا وہ اسلام کے دیئے ہوئے حقوق کا مستحق اوراس کی مقرر کردہ حدود کا پابند ہوگیا۔ تم سب اللہ کے بندے ہو اور یہ مال اللہ کا مال ہے۔ یہ تمہارے درمیان برابر تقسیم کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں کسی کو کسی پر فضیلت نہیں ہے۔ البتہ متقی لوگوں کے لئے اللہ کے پاس بہترین اجر ہے۔''[1]

یہ خطبہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سابقون الاولون اور شرکائے بدر واحد کے ساتھ تقسیم اموال اور عطیات میں جو ترجیحی سلوک روا رکھا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے انحراف کرکے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مساویانہ پالیسی اختیار کریں گے اور دنیاوی امتیاز اور تفاخر وتعیش کے اسباب پر قدغن لگائیں گے۔ یا کم سے کم حوصلہ شکنی کریں گے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک ایک مراعات یافتہ طبقہ پیدا ہوچکا تھا جسے اس کے حقوق کی اصل حدود میں لانا آپ ضروری سمجھتے تھے۔ قریش کی اکثریت ابتداہی سے آپ کے خلاف تھی۔ اس خطبہ نے مخالفت کو شاید مزید مہمیز کیا۔ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت علی کی باتیں قریش پر گراں گزریں اورانہوں نے مدینہ سے بھاگنا شروع کیا۔ سب سے پہلے بنی امیہ مدینہ چھوڑ کر بھاگے۔ انصار میں سے بھی ممکن ہے کچھ لوگوں نے مخالفیانہ اثر لیا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کا کوئی ذکر نہیں کیا حالانکہ فوری طور پر یہ سب سے اہم معاملہ ان کے درپیش تھا اوراس بارے میں لوگوں کو مطمئن کرنا ضروری تھا۔

کانٹوں کی سیج

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد خلافت کی ذمہ داری سنبھالنا اور نظم ونسق کو بحال کرنا ایک بے حد مشکل کام تھا۔ پیچیدہ پرشورش اور اضطراب انگیز حالات میں منتخب خلیفہ پر قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں ملوث ہونے کا الزام لگنا تھا خواہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بجائے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ ہوتے یا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ یا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ یا کوئی اور۔ یہی وجہ تھی کہ یہ حضرات پہلو بچا گئے اور طوعاً وکرہاً نئے خلیفہ کی بیعت کرلی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کرم اللہ وجہہ کو درپیش مسائل اور مشکلات کا احساس تھا لیکن ملت کو انتشار، اختلاف اور خانہ جنگی سے بچانے کے لئے انہوں نے یہ عظیم ذمہ داری قبول کرلی۔ ویسے بھی ان میں خود اعتمادی بدرجہ اتم تھی۔ اگر حالات مساعدت کرتے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے خلافت راشدہ کے نظام میں جو خطرناک دراڑ پیدا ہوگئی تھی حضرت

[1] سید قطب شہید کے مضمون ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تصور حکومت اور طرز حکمرانی'' مطبوعہ روزنامہ جسارت کراچی مؤرخہ ۷ ستمبر ۱۹۷۷ء سے اقتباس...... نہ تو طبری نے یہ خطبہ دیا ہے نہ عمر ابونصر نے اپنی تصنیف ''علی'' میں۔ مجھے کہیں اور بھی یہ خطبہ دکھائی نہیں دیا۔ معلوم نہیں سید قطب رحمہ اللہ کا ماخذ کیا ہے۔ مولف

علی رضی اللہ عنہ اسے بند کرنے کے اہل تھے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں اور باغیوں کی انتخاب خلیفہ میں شرکت ایک اور بہت بڑے فتنہ کا باعث بن گئی۔ مخالفین نے اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ اگر تمام اکابر مہاجرین وانصار کھلے دل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعاون کر کے ان کے ہاتھ مضبوط کر دیتے تو صورت حال پر قابو پانا، قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے کیفر کردار تک پہنچانا اور فتنے کا سر کچل دینا مشکل نہ تھا لیکن واقعات کچھ ایسی تیزی اور کنفیوژن سے پیش آئے کہ بیعت سے الگ رہنے والے بزرگ صحابہ تذبذب اور شبہ میں پڑ گئے کہ حق کس طرف ہے۔ انہوں نے افتراق اور فتنہ سے بچنے کی خاطر نیک نیتی سے کنارہ کشی اور غیر جانبداری اختیار کر لی۔ "لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ جس فتنے سے وہ بچنا چاہتے تھے اس سے بدر جہا زیادہ بڑے فتنے میں ان کا یہ فعل الٹا مددگار بن گیا۔ وہ بہر حال امت کے بااثر لوگ تھے۔ ان میں سے ہر ایک ایسا تھا جس پر ہزاروں مسلمانوں کو اعتماد تھا۔ ان کی علیحدگی نے دلوں میں شک ڈال دیئے اور خلافت راشدہ کے نظام کو از سر نو بحال کرنے کے لئے جس دلجمعی کے ساتھ امت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے تھا جس کے بغیر وہ اس کام کو انجام نہ دے سکتے تھے وہ بدقسمتی سے حاصل نہ ہو سکی۔"[۱] حالات کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے غیر مشروط طور پر سرگرم تعاون کیا جاتا اور جب نظم ونسق خلافت کلی طور پر بحال ہو جاتا تو قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے انتقام لینے اور باغیوں کو سزا دینے کا مطالبہ کیا جاتا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت اور ان کے قتل کے خطرناک نتائج کو بعض دور اندیش صحابہ نے ان کے محاصرہ کے دوران ہی میں بھانپ لیا تھا اور اپنے خدشات کا برملا اظہار کیا تھا اور باغیوں کو اس سے باز رہنے کی تنبیہ کی تھی، اب وہ خدشات حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آنے لگے تھے۔

بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے حسب ذیل فوری مسائل تھے:

۱- قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کا پتہ چلانا اور ان سے قصاص لینا

۲- خلافت کے نظم ونسق کی درستی واستواری اور لوگوں میں سربراہ مملکت اور قانون کا احترام بحال کرنا۔ شیخین رضی اللہ عنہما کے طرز حکومت کو از سر نو زندہ کرنا۔

۳- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نظم خلافت سے لوگوں کو جو حقیقی یا فرضی شکایات ان کے آخری عہد میں پیدا ہوئی تھیں، انہیں دور کرنا، ادارۂ خلافت میں لوگوں کا اعتماد بحال کرنا اور امن وامان قائم کرنا

۴- قریش اور دوسرے عرب قبائل کے باہمی رشک ورقابت اور غلط فہمیوں کو دور کرنا، جاہلی تعصبات کو دبانا، معاشرے کو غیر قبائلی اسلامی اخوت، عدل اور مساوات پر از سر نو قائم کرنا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ وبغاوت نے نظم حکومت اور معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ قانون کی بالادستی کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آزادی اور استقلال کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ بدویوں کے گروہ لوٹ مار کی امید میں مدینہ کے ارد گرد بھیڑیوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ اہل مدینہ کے وہ کثیر التعداد غیر مسلم عجمی غلام جو مختلف جنگوں میں گرفتار ہو کر آئے تھے اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باغیوں کا ساتھ دیا تھا اب اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہے تھے اور بے قابو ہو گئے تھے۔ وہ بدوی گروہوں سے گٹھ جوڑ کر رہے تھے

تاکہ مناسب موقع پر ایک ساتھ مدینہ پر جھپٹ پڑیں اور بیت المال اور اکابر مدینہ کے گھروں کو لوٹ لیں۔

غرضیکہ تقریباً ایسے ہی حالات پیدا ہو گئے تھے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے فوراً بعد مدینہ میں پیدا ہو گئے تھے۔ انہیں مانعین زکوٰۃ، مرتدین اور جھوٹے مدعیانِ نبوت سے نپٹنا پڑا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی سرکوبی، نظم ونسق کی درستی، اس پر عامتہ المسلمین کے اعتماد کی بحالی، بین القبائلی رقابتوں کا قلع قمع وغیرہ مسائل تھے۔ بہت سے باغی بھی مدینہ میں موجود تھے اور ان کا دباؤ ہنوز قائم تھا۔

درپیش مسائل میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کو اولیت حاصل تھی۔ اسلامی قانون کے تقاضوں کو پورا کرنے، شہید خلیفہ کے وارثوں کی دادرسی کرنے اور خلافت وحکومت کا احترام اور دبدبہ بحال کرنے کے لئے ضروری تھا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور دوسرے مقتدر اور مخلص صحابہ اس معاملے کی اہمیت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ انہیں یہ بھی پچھتاوا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع میں انہوں نے کما حقہ عملی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ عنہ پر قصاص کے لئے زور دیا۔ آپ کا جواب یہ تھا کہ ''جو کچھ آپ حضرات کہتے ہیں میں اس سے بے خبر اور غافل نہیں ہوں لیکن سردست اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں ہم اس قوم کا کیا کر سکتے ہیں جو ہماری مالک بنی ہوئی ہے اور ہم اس کے مالک نہیں اور پھر اس قتل میں آپ لوگوں کے غلام بھی شریک ہیں۔ اور ان کے ساتھ کچھ دیہاتی بدوی بھی مل گئے ہیں۔ یہ سب اپنی من مانی کر رہے ہیں۔ جیسے جاہلیت کا زمانہ لوٹ آیا ہو۔ صبر وتحمل سے کام لیجئے۔ جو آپ کہتے ہیں انشاء اللہ وہی ہوگا۔''[1]

قریش بدوی قبائل کے مقابلے میں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد بدوی قبائل ان پر جری اور دلیر نہ ہو جائیں۔ باغیوں کا تعلق ان عرب قبائل سے تھا جو عراق اور مصر کی فتوحات کے بعد ان ممالک خاص کر نئے شہروں اور چھاؤنیوں میں آباد ہو گئے تھے اور یہ بات انہیں بہت کھلتی تھی کہ حکومت کے عہدوں پر قریش کی اجارہ داری تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں حکومت کے مناصب پر بنوامیہ کی اکثریت فائز تھی تاہم تھے وہ بھی قریش میں سے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بہت پہلے بدوی قبائل نہ صرف بنوامیہ بلکہ بحیثیت مجموعی قریش کے اقتدار اور غلبہ کے خلاف اپنی آواز بلند کر چکے تھے۔ اس لئے قریش میں سے وہ بھی جو بنوامیہ کے بالخصوص طرف دار نہ تھے لیکن اسلام اور خلافت کے خیر خواہ تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ پر زور دے رہے تھے کہ باغیوں سے جلد از جلد خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لیا جائے۔ ادھر ابھی صرف اہل مدینہ ہی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی یا مصر، کوفہ اور بصرہ کے باغیوں نے جو اپنے صوبوں کے نمائندہ نہ تھے۔ اس لئے ابھی مختلف صوبوں کے عمال اور عوام سے بیعت کی تصدیق توثیق کا مرحلہ درپیش تھا۔ نیز صوبوں کے عثمانی عمال ابھی اقتدار پر فائز تھے۔ انہیں برطرف کر کے ان کی جگہ ایسے نئے عمال کی تعیناتی کی ضرورت تھی جنہیں نئے خلیفہ اور عوام کا اعتماد حاصل ہو۔ بنوامیہ انتقام،

[1] تاریخ طبری

کے نعرے لگاتے ہوئے مکہ اور دمشق میں جمع ہو گئے تھے۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنی طاقت مجتمع کر کے خلیفہ اور مملکت کے خلاف کوئی باغیانہ اقدام کریں ان پر قابو پانا بھی ضروری تھا۔ المختصر یہ تھے وہ مسائل جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فوری طور پر درپیش تھے اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ (ابتدائی عہد) کی خلافت کے برعکس ان کی اپنی خلافت جھگڑوں اور قضیوں سے خالی نہیں۔ یہ مسائل بدقسمتی سے روز بروز اس طرح مزید الجھتے چلے گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پونے پانچ سالہ دور خلافت میں کوئی ایک مسئلہ بھی تسلی بخش طریقے سے حل نہ ہو سکا بلکہ خود ان کے حق خلافت کو چیلنج کر دیا گیا اور اسلامی فتوحات کا سیلاب بھی تھم گیا۔ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی زور پکڑ گئی۔ ان مسائل پر ہم یہاں الگ الگ مختصر بحث کریں گے۔

قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص

سب سے بڑا اور مقدم مسئلہ یہی تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں اور ان کا خون بہانے والوں سے قصاص لیا جائے کیونکہ اس سے آنکھیں بند کر لینے سے احکام قرآن کی خلاف ورزی کے علاوہ خلافت، مملکت اور معاشرہ سبھی خطرے کی زد میں تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ دل سے چاہتے تھے کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے انہوں نے اپنی طرف سے قاتلوں کا پتہ چلانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ وہ ایک بااصول ضابطہ پسند اسلامی مملکت کے سربراہ تھے۔ ایک مطلق العنان آمر نہ تھے کہ اپنی مرضی سے پکڑ دھکڑ کر کے محض شبہ کی بنا پر لوگوں کو قصاص میں قتل کروا دیتے۔ وہ قانون شہادت کے پابند تھے۔ بدقسمتی سے کسی قاتل کی حتمی نشاندہی نہ ہو سکی نہ مطلوبہ عینی شہادتیں مل سکیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت ان کے پاس صرف ان کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہ موجود تھیں۔ وہ حملہ آوروں میں سے صرف محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو پہچانتی تھیں لیکن انہوں نے گواہی دی کہ محمد ابن ابی بکر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زباں سے چند جملے سن کر شرمسار ہوئے اور واپس چلے گئے۔ بعد میں جن باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا نائلہ ان میں سے کسی کو پہچانتی نہ تھیں۔ قتل کا جرم کسی خاص شخص یا اشخاص کے خلاف ثابت نہ ہو سکا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی کے خلاف قصاص کی کارروائی نہ کر سکے۔ اگر صحیح قاتلین کا پتہ چل بھی جاتا تو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ فوری طور پر قصاص لینے کی پوزیشن میں نہ تھے کیونکہ قاتلین اور ان کے ساتھی مدینہ پر چھائے ہوئے تھے۔ انہی کی مدد اور اصرار سے آپ خلیفہ بنے تھے اور وہ لوگ آپ کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ سخت مزاحمت کرتے اور مدینہ میں پہلے سے بھی بڑا فتنہ وفساد شروع کر دیتے۔ شہر میں باغیوں کی بالادستی کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے مکمل تحقیقات کرانا بھی ممکن نہ ہو سکا چہ جائیکہ قصاص لینا۔

قیاس کہتا ہے کہ اگرچہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ واپس چلے گئے تھے لیکن وہ دوسرے مصری حملہ آوروں کو جانتے ہوں گے کیونکہ وہ بھی مصری تھے اور محمد کے حامیوں اور ساتھیوں میں سے تھے۔ تاریخوں میں قاتلانہ حملہ کے مجرموں کے جو نام ملتے ہیں، محض فرضی تو نہیں، مورخ ان پر متفق ہیں۔ کسی نے تو ان کی نشاندہی کی۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاص کے معاملہ کو حالات کی سازگاری تک ملتوی نہ کرتے اور مصلحتوں سے بالاتر ہو کر فوری کارروائی

کرتے تو اصل حقیقت ان کے سامنے آجاتی اور قاتلوں سے اسلامی قانون کے مطابق قصاص لے کر اکابر صحابہ، عامۃ المسلمین اور بنو امیہ کو مطمئن کر دیتے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لئے بیعت سے انکار کا کوئی عذر باقی نہ رہ جاتا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین کی نوبت نہ آتی نہ خوارج کا گروہ پیدا ہوتا مختصر یہ کہ وہ تمام فتنے جو عدم قصاص کی وجہ سے پیدا ہوئے نہ پیدا ہوتے عالم اسلام اور مسلمان باہمی نفاق وتشتت اور جنگ وجدال سے بچ جاتے اور اسلامی فتوحات کا سلسلہ بھی نہ رکتا۔ بلکہ عین ممکن تھا کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بہت سے ممالک حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے۔

لوگ بار بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آتے اور قصاص پر زور دیتے۔ ان کا یہی جواب تھا کہ ''آپ لوگ جو کچھ کہتے ہیں میں اس سے غافل نہیں۔ لیکن ایسی جماعت کے ساتھ کیا کروں جس پر میرا قابو نہیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی ایام میں ان کی فوج باغیوں ہی پر مشتمل تھی۔ دوسرے مسلمان بہت کم تھے۔ اسی باغی گروہ میں قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے ان سب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا انتقام اور قصاص کے مطالبے میں شدت اور پیچیدگی پیدا ہوتی گئی اور اس کی اصل جڑ سے کئی دوسری اور کڑی شاخیں پھوٹ نکلیں۔ ان کے قلع قمع کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود باغی گروہ کا سہارا لیا اور وہ اپنی سلامتی کے لئے آپ کے مشیر اور دست و بازو بن گئے۔ جنگ جمل کے موقع پر صلح ہوتے ہوتے رہ گئی اور مسلمانوں کے باہمی خون خرابے کا آغاز ہو گیا۔

جنگ جمل سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ اس باغی سبائی گروہ سے بیزار تھے اور اسے بادلِ ناخواستہ برداشت کر رہے تھے اور اس پر گرفت کے لئے موقع کے منتظر تھے۔ لیکن جنگ جمل کے بعد انہوں نے حالات کی مجبوری سے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیا اور انہیں اپنا لیا اگر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے تعاون کیا ہوتا تو قصاص کا مسئلہ حل ہو سکتا تھا اور دوسرے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی بیعت کی شرط قرار دیا۔ پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کی گورنری سے معزول کر دیا ہے تو قصاص کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بیعت سے انکار کر دیا اور نئے گورنر کو چارج نہیں دیا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی قصاص کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور معاملہ سلجھنے کی بجائے الجھتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان کی نوبت آئی اور مسلمان اپنے ہی خون میں نہا گئے۔ لشکر علی رضی اللہ عنہ میں شامل بیس ہزار باغیوں نے بیک زبان ہو کر کہا کہ ہم سب عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بیس ہزار افراد کی گردن مارنا ممکن نہ تھا۔ انہی باغیوں کی سازش سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، عائشہ رضی اللہ عنہا میں صلح ہوتے ہوتے رہ گئی اور جنگ جمل پیش آئی اور پھر جنگوں اور دوسرے واقعات کا سلسلہ چلتا گیا جو بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اپنی شہادت پر منتج ہوا۔

عمالِ عثمانی کی معزولی

قاتلین عثمان کے خلاف کارروائی کا مسئلہ ابھی زیر غور ہی تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تمام صوبوں کے عثمانی عمال کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ان کی جگہ اپنے اعتماد کے عمال کو مقرر کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ و بغاوت کی بڑی وجہ عثمانی عمال ہی تھے۔ جو کوفہ کے عامل ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے سوا سب اموی تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف مشورہ دیا اور کہا کہ اس وقت انہیں برطرف کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ سر دست انہیں برداشت کیجئے اور امارت پر برقرار رکھئے۔ جب وہ آپ کی بیعت کر کے آپ کو خلیفہ تسلیم کر لیں تو اس کے بعد اگر ضروری سمجھیں تو جس کو چاہے برطرف کر دیں۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوئی مشورہ سننے سے انکار کر دیا۔ پھر دوسرے دن حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو عمال عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیں۔ آپ کے چچا زاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو خبر ہوئی تو انہوں نے کہا: ''مغیرہ رضی اللہ عنہ نے پہلے آپ کو صحیح مشورہ دیا تھا۔ آج دھوکا دیا۔ کم سے کم معاویہ رضی اللہ عنہ کی معزولی اس وقت مناسب نہیں۔ انہیں عثمان رضی اللہ عنہ نے نہیں بلکہ عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر کیا تھا۔ پورا شام ان کے تابع اور زیر اثر ہے۔ وہ بڑے زیرک، سیاسی مدبر اور زمانہ شناس ہیں۔ شام میں ان کی پوزیشن بڑی مستحکم ہے اور اہل شام ان کی حکومت سے خوش اور مطمئن ہیں۔ اگر آپ ان کو شام کی امارت پر برقرار رکھیں گے تو وہ آپ کی بیعت کر لیں گے اور انہیں اس کی پروا نہیں ہوگی کہ خلیفہ کون ہے۔ انہیں اپنی امارت سے دلچسپی ہے لیکن اگر آپ انہیں معزول کرتے ہیں تو وہ اور اہل شام خود آپ کے انتخاب کو چیلنج کریں گے اور عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کی دعوت لے کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور آپ کو عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا ذمہ دار قرار دے کر سارے شام و عراق کو آپ کے خلاف بھڑکا دیں گے۔ وہ خود بھی آپ کی بیعت نہیں کریں گے اور دوسروں کو بھی روکیں گے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''میں معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک دن کے لئے بھی برقرار نہیں رکھوں گا۔ اس کے لئے میرے پاس تلوار کے سوا کچھ نہیں۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ''آپ شجاع ضرور ہیں لیکن لڑائی میں صائب الرائے نہیں۔ اگر آپ میرے کہنے پر عمل کریں تو میں آپ کو ایسے راستے پر چلاؤں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ انجام کار پر غور ہی کرتے رہ جائیں اور پیش پا افتادہ امور بھی ان کو نہ سوجھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنگ میں دھوکہ جائز ہے، اس میں نہ کچھ آپ کا نقصان ہے نہ کچھ گناہ۔'' لیکن طویل بحث و تمحیص کے بعد بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا اور دورِ عثمانی کے عمال کی جگہ اپنے اعتماد کے عمال بھیجنا شروع کئے۔

نئے عمال کا تقرر

معاویہ رضی اللہ عنہ کی جگہ انہوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو شام کا گورنر بنا کر بھیجنا چاہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ تب اپنے اسلامی بھائی حضرت سہل بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایک سرحدی فوجی دستے نے انہیں تبوک کے قریب شام کی سرحد پر روک لیا اور کہا کہ اگر آپ عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے

آئے ہیں تو مرحبا اور اگر کسی دوسرے نے آپ کو بھیجا ہے تو بھیجنے والے کے پاس واپس چلے جائیے۔ چنانچہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ مدینہ واپس چلے آئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صورت واقعہ سے مطلع کر دیا۔ ظاہر ہو گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ امارت کا چارج دینے کی بجائے مخالفت اور مقابلہ پر آمادہ ہیں۔

بصرہ کے اموی عامل عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی مزاحمت کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ عامل حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کو امارت کا چارج دے دیا اور خود مکہ چلے گئے جہاں دوسرے بنی امیہ بھی جمع ہو رہے تھے۔ کوفہ کی امارت پر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو سردست برقرار رکھا گیا۔ وہ غیر اموی تھے۔ انہوں نے اہل کوفہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت لے لی۔

قیس بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ کو آپ نے مصر کا عامل بنا کر بھیجا۔ وہ بڑے مدبر انسان تھے انہوں نے حسن تدبیر سے وہاں کی امارت سنبھال لی اور وہاں کی اکثریت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ صرف خرتبا کے لوگ باز رہے لیکن انہوں نے بھی واجبات حکومت کی ادائیگی سے انکار نہیں کیا۔ قیس رضی اللہ عنہ نے بھی حالات کے پیش نظر نرمی سے کام لیا اور دباؤ نہیں ڈالا۔ وہاں کے سابق اموی عامل عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ دمشق چلے گئے۔

عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یمن کی امارت کا چارج بلا مزاحمت حاصل کر لیا۔ قثم بن عباس کو مکہ کی گورنری دی گئی۔ سب سے اہم اور پریشان کن معاملہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تھا۔ حضرت نعمان بن بشیر انصاری رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون آلود کرتہ اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس دمشق پہنچ گئے۔ انہوں نے کرتہ اور انگلیوں کو دمشق کی جامعہ مسجد کے منبر پر آویزاں کر دیا۔ اور خود جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ نمازیوں کے گروہ خون آلود کرتے اور کٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھ دیکھ کر زار و قطار روتے۔ جب ان میں پراپیگنڈا کیا جاتا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل علی ہیں ورنہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو علی رضی اللہ عنہ اس سے قصاص لیتے تو اہل شام کے غم و غصہ کے جذبات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑک اٹھتے۔ کرتے اور انگلیوں کی نمائش سے یہی مقصود تھا۔ بے لوث اور صاف ستھری اسلامی سیاست کے شفاف پانیوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے جو خون کی سرخی اور منافقت و سازش کا گدلا پن شامل ہو گیا تھا اب اس کے گہرا اور تاریک ہونے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

علی رضی اللہ عنہ...... معاویہ رضی اللہ عنہ خط و کتابت

ادھر دمشق میں کرتے اور انگلیوں کی نمائش کا ڈرامہ شروع ہو چکا تھا، ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بیعت کے لئے خط لکھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاصد کو دمشق میں روک لیا اور مذکورہ بالا منظر اسے کئی دفعہ دکھایا۔ پھر اس کے ساتھ اپنا ایک قاصد ایک مہر شدہ لفافہ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس روانہ کیا۔ انہوں نے کھولا تو اندر سے خالی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سمجھ گئے۔ بیعت کی دعوت کا جواب نفی میں تھا۔ آپ نے قاصد سے دمشق کے حالات پوچھے تو اس نے بتایا کہ وہاں ساٹھ ہزار شیوخ عثمان رضی اللہ عنہ کے خون آلود کرتہ

اوران کی زوجہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھ دیکھ کر روتے ہیں اور عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینے کا عہد کر چکے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا، کس سے بدلہ لینا چاہتے ہیں، قاصد نے جواب دیا'' آپ کی رگ گردن سے۔'' یہ سن کر آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ'' خدایا! میں عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے بری ہوں۔'' بہر حال اس میں کوئی شک وشبہ نہ رہا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بیعت اور اطاعت نہیں کریں گے بلکہ خون عثمان رضی اللہ عنہ کو بہانہ بنا کر آمادۂ جنگ ہیں۔ ان کے پیش نظر دراصل سیاسی استقلال اور خودمختاری تھی اور اب انہیں حصولِ مقصد کا اچھا موقع نظر آرہا تھا۔ ملت اسلامیہ کے لئے یہ بڑی بدقسمتی کی بات تھی کہ ایک صوبائی گورنر نے خلیفۂ وقت کے خلاف ایسا رویہ اختیار کیا جسے بغاوت کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

بنوامیہ اور بنو ہاشم کی زمانۂ جاہلیت کی رقابت وچشمک از سرنو ابھر آئی تھی۔ آئندہ چل کر قریش کی ان دو شاخوں کی باہمی رقابت، عداوت اور کشمکش اسلام اور مسلمانوں کے لئے نہایت خوفناک اور تباہ کن نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مشورہ مان بھی لیتے اور فوری طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول نہ بھی کرتے تو بھی شاید حسب منشا نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ طویل زمانۂ امارت نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو امور مملکت اور سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر بنا دیا تھا۔ ان کی سیاسی اور فوجی طاقت بہت مستحکم ہو چکی تھی۔ اہل شام میں ان کی مقبولیت مسلم تھی۔ رائج الوقت بدنظمی، انتشار اور کنفیوژن میں انہیں اپنے سیاسی مستقبل کے لئے ایک سنہری موقع دکھائی دے رہا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں میں دنیادارانہ سیاست کی طرح ڈالی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ دوسرے اموی عمال کی طرح ایک نہ ایک دن علی رضی اللہ عنہ انہیں بھی معزول کر کے رہیں گے اور معزولی کا تصور ہی ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ ان کے لئے ایک بہانہ بن گیا...... سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا طرز عمل غیر آئینی تھا۔ وہ معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ شام کے گورنر کی حیثیت سے خون عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کے لئے اٹھے۔ مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کیا۔ گورنری کی طاقت اپنے اس مقصد کے لئے استعمال کی اور مطالبہ بھی یہ نہیں کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دیں بلکہ یہ کیا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے حوالے کر دیں تا کہ وہ خود انہیں قتل کریں۔ یہ سب کچھ دورِ اسلام کی اسلامی حکومت کے بجائے زمانہ قبل اسلام کی قبائلی بدنظمی سے زیادہ مشابہ ہے۔ خون اسلام کے مطالبے کا حق اول تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے شرعی وارثوں کو پہنچتا تھا۔ تاہم اگر رشتہ داری کی بنا پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے مجاز ہو بھی سکتے تھے تو اپنی ذاتی حیثیت میں نہ کہ شام کے گورنر کی حیثیت سے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رشتہ جو کچھ بھی تھا وہ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے تھا۔ شام کی گورنری ان کی رشتہ دار نہ تھی۔ اپنی ذاتی حیثیت میں وہ خلیفہ کے پاس مستغیث بن کر جا سکتے تھے اور مجرمین کو

گرفتار کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ گورنر کی حیثیت سے انہیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ پر آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی، جس کی خلافت کو ان کے زیر اہتمام صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی، اس کی اطاعت سے انکار کر دیتے اور اپنے زیر انتظام علاقے کی فوجی طاقت کو مرکزی حکومت کے مقابلے میں استعمال کرتے۔"[1]

اس طرح حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پوزیشن بھی آئینی حیثیت سے درست نہیں تھی۔

قاضی ابوبکر ابن العربی نے اس مسئلہ کی صحیح شرعی پوزیشن اس طرح بیان کی ہے:

"شام کے لوگوں نے ان (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی بیعت کے لئے یہ شرط لگائی کہ پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو گرفتار کر کے ان سے قصاص لیا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ پہلے بیعت میں داخل ہو جاؤ پھر حق کا مطالبہ کرو اور وہ تمہیں مل جائے گا۔ مگر انہوں نے کہا کہ آپ بیعت کے مستحق ہی نہیں جب کہ ہم قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو صبح و شام آپ کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اس معاملے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے زیادہ صحیح تھی۔ اور ان کا قول درست تھا کیونکہ اگر وہ اس وقت قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے تو قبائل ان (قاتلین) کی حمایت پر اٹھ کھڑے ہوتے۔[2] اور لڑائی کا ایک تیسرا محاذ کھل جاتا اس لئے وہ انتظار کر رہے تھے کہ حکومت مضبوط ہو جائے اور تمام مملکت میں ان کی بیعت منعقد ہو لے۔ اس کے بعد با قاعدہ عدالت میں اولیائے مقتول کی طرف سے دعویٰ پیش ہو اور حق کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے۔ علمائے امت کے درمیان اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ امام کے لئے قصاص کو مؤخر کرنا ایسی حالت میں جائز ہے جب کہ اس سے فتنہ بھڑک اٹھنے اور تفرقہ برپا ہونے کا اندیشہ ہو۔" [3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیاریاں

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عم زاد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا تھا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے لئے میرے پاس تلوار کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک پہلے سے طے شدہ نقطہ نظر رکھتے تھے اور کسی سیاسی مصلحت کی بناء پر انہیں ڈھیل دینے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے کورا جواب آنے پر انہوں نے شام پر چڑھائی کے لئے تیاری شروع کر دی۔ جزیرۃ

---

[1] خلافت وملوکیت ص ۱۲۶-۱۲۵

[2] جنگ جمل کے موقع پر حرقوص بن زہیر کے معاملے میں ایسا ہی ہوا اور حضرت طلحہ وزبیر اسے خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے جرم میں گرفتار کر کے سزا نہ دے سکے کیونکہ اس کا کثیر التعداد قبیلہ اس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مولف

[3] احکام القرآن بحوالہ خلافت وملوکیت صفحہ ۱۲۶

العرب، عراق، ایران، مصر اور شمالی افریقہ ان کے تابع فرمان تھے اور ان کے وسائل انہیں میسر تھے۔ تنہا شام کا صوبہ جو شمال اور جنوب سے علوی مقبوضات میں گھرا ہوا تھا زیادہ دیر تک مطالبہ نہ کر سکتا تھا۔ اپنے کو بچانے کے لئے اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عیسائی قیصر روم سے بھی مصالحت اور باہمی امداد و اعانت کا معاہدہ کر لیتے تو بھی یہ اقدام ان کے لئے زیادہ مفید اور موثر ثابت نہ ہوتا کیونکہ قیصر ایرانی سلطنت کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اور اس کے اپنے بچے کھچے مقبوضات بھی اسلامی خلافتی مقبوضات میں گھرے ہوئے تھے۔

بہر حال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے موقف پر اڑے ہوئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب پہلی بار مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے خلاف چلیں گی جنگی کارروائی کے لئے مجبور تھے کیونکہ وہ اسلامی مملکت کو ٹکڑے ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسلامی اصولوں کے مقابلے میں وہ کسی وقتی سیاسی مصلحت کے قائل نہ تھے۔ اکثر اکابر صحابہ اس نئی صورت حال سے متردد اور مشوش تھے۔ ایسے بھی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی مخالفت کی اور ایسے بھی جنہوں نے احتیاط کا تقاضا سمجھ کر غیر جانبداری اختیار کر لی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے طرفین میں سے کسی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اس جنگ میں شریک ہوں تو مجھے ایسی تلوار دیجئے جو کافر پر تو چلے لیکن مسلمان پر نہ چلے۔" عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا "آپ مجھے ایسی چیز میں شرکت پر مجبور نہ کریں جس کے حق یا باطل ہونے کا فیصلہ میں نہیں کر سکا۔" محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اپنی تلوار کو مشرکوں کے مقابلوں میں استعمال کروں اور جب مسلمانوں سے لڑنے کا وقت آئے تو اسے کوہ احد کے پتھروں پر مار کر توڑ دوں۔ چنانچہ کل میں نے اسے توڑ دیا۔" اسی طرح اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے کہا کہ "مجھے اس میں شرکت سے معاف رکھا جائے۔ میں نے عہد کیا ہے کہ کلمہ شہادت پڑھنے والوں سے جنگ نہ کروں گا۔" تاہم ایسے صحابہ بھی تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ مہاجرین قریش زیادہ تر الگ رہے۔ دارالخلافہ مدینہ کے لوگ متحد اور متفق الرائے نہ رہے۔

اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف چڑھائی اور جنگ کا تصور بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے سخت اذیت ناک تھا لیکن اسلام کی حکمرانی، خلافت کی بالادستی اور مسلمانوں کی جمعیت کو برقرار رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہو گیا۔ حق و صداقت اور انصاف کی خاطر لڑنا فرض ہے۔ اس میں نہ یہ دیکھنا چاہئے کہ مدمقابل کون ہے اور نہ یہ کہ نتیجہ کیا نکلے گا۔

طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا

حضرت علی رضی اللہ عنہ شام پر چڑھائی کی تیاریوں میں ابھی مصروف ہی تھے کہ شام کی صورت حال سے بھی زیادہ نازک، خطرناک اور فوری توجہ طلب صورت حال دوسری طرف پیدا ہو گئی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجبوراً شام کا ارادہ ترک کر کے اس نئی صورت حال سے نپٹنے کے لئے اقدامات کرنے پڑے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت طوعاً وکرہاً کی تھی اور یہ قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ مشروط تھی اور بیعت کرنے کے بعد وہ انہیں وقتاً فوقتاً یاد دلاتے رہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابھی بہت سے اہم ابتدائی امور سے فرصت نہ ملی تھی باغیوں پر ابھی انہیں قابو حاصل نہ تھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے خط وکتابت کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ”خدا کی قسم! میں بھی وہی خیال رکھتا ہوں جو آپ کا ہے۔ ذرا حالات کو پرسکون ہو لینے دیجئے تاکہ لوگوں کے حواس بجا ہو جائیں۔ خیالات کی پراگندگی دور ہو اور حقوق وصول کرنا ممکن ہو جائے۔“[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے برعکس ان دونوں حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی نہ تو انہوں نے علی رضی اللہ عنہ کو خلافت سے بے دخل کیا تھا نہ ان کے دین پر معترض تھے۔ البتہ ان کا خیال یہ تھا کہ سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی رائے پر قائم رہے اور انہی کی رائے صحیح تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تجویز پیش کی کہ انہیں بالترتیب کوفہ اور بصرہ جانے دیا جائے یا وہاں کی حکومتیں ان کے سپرد کی جائیں تاکہ وہ وہاں سے اپنے حامیوں کو لے کر آئیں اور ان کی مدد سے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو پکڑا جائے اور انتقام لیا جائے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر غور نہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ عام دیا اور بدوؤں، کوفیوں، بصریوں اور مصریوں کو اپنے اپنے علاقوں میں واپس جانے کی ہدایت کی۔ صرف بدوؤں نے تعمیل کی۔ بیعت کرنے کے بعد کوفیوں، بصریوں اور مصریوں کی اکثریت نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ چار ماہ تک طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ مدینہ میں رہے اور جب دیکھا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے باغی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے مدینہ میں ہی دندنا رہے ہیں اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو رہی تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اجازت سے عمرہ کے لئے مکہ روانہ ہو گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محاصرہ کے دوران میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حج کے لئے مکہ تشریف لے گئی تھیں۔ حج سے فارغ ہو کر واپس آ رہی تھیں کہ راستے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت، مدینہ میں بدامنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہونے کی خبر ملی۔ مدینہ کے مخدوش حالات کی وجہ سے آپ مکہ واپس چلی گئیں۔ پھر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیان کیا کہ ”ہم لوگ بدوؤں، غلاموں اور عوام کے ہنگامہ وشورش کی وجہ سے جان بچا کر بھاگ آئے ہیں۔ مدینہ میں لوگ حیران وسرگرداں ہیں وہ نہ تو حق کو پہچان سکتے ہیں نہ باطل سے گریز کر سکتے ہیں۔ اور نہ وہ اپنی حفاظت کرنے کے قابل ہیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے کی وہاں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔“ حضرت عائشہ کی واپسی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کی آمد کی

1. طبری جلد ۳

اطلاع پا کر بہت سے لوگ ان کے پاس آنے جانے لگے۔ ان تینوں برگزیدہ ہستیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے اور فتنہ وفساد کی اصلاح کا پروگرام بنایا۔ حضرت عائشہ نے اہل مکہ کے ایک بڑے مجمع کے سامنے ایک مختصر اور مؤثر تقریر کی:

''لوگو! مختلف ملکوں کے عوام، اجنبیوں اور اہل مدینہ کے غلاموں نے چند معمولی باتوں پر عثمان رضی اللہ عنہ کو مظلوم شہید کر دیا۔ ان کے پاس اس فعل کی کوئی حجت نہ تھی۔ انہوں نے سرکشی کر کے حرام خون بہایا۔ بلد حرام (مدینہ) اور شہر حرام (ماہ ذی الحجہ) کو حلال کیا۔ ناجائز طریقہ سے دوسروں کے مالک پر قبضہ کیا۔ خدا کی قسم! عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک انگلی ان کے جیسے سارے روئے زمین کے عوام سے بڑھ کر ہے۔

میں اس لئے واپس آئی ہوں کہ عثمان رضی اللہ عنہ مظلوم شہید کر دیئے گئے۔ اس شور وغوغا اور فتنہ وفساد کی اصلاح اس طرح نہ ہوگی۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص لے کر اسلام کو معزز کر دو۔''[1]

مجمع میں جوش وخروش پھیل گیا اور ہزاروں لوگ عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کی خاطر لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ چونکہ اصل مقصد مدینہ کے حالات کی اصلاح اور باغیوں سے انتقام تھا اور وہ مدینہ میں موجود تھے اور نئے خلیفہ بھی وہیں تھے، اس لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی رائے تھی کہ مدینہ چلا جائے لیکن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کے حامی بصرہ اور کوفہ میں موجود تھے۔ اس لئے آخری فیصلہ بصرہ جانے کا ہوا۔ بنی امیہ میں سے مروان بن الحکم، ولید بن عقبہ، سعید بن العاص اور ان کے گروہ کے لوگ بھی ہمراہ ہو گئے۔ پروگرام یہ طے ہوا کہ بصرہ پر قبضہ کر کے اہل بصرہ کو بھی قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ پر آمادہ کر لیں گے جیسا کہ اہل مکہ کو کیا۔ پھر آسانی سے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے نپٹ لیں گے۔ بنی امیہ کا خیال تھا کہ قصاص کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو خلیفہ بنایا جائے لیکن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اکابر مہاجرین کو چھوڑ کر لوگ عثمان رضی اللہ عنہ کے یتیم کو خلیفہ نہیں مانیں گے۔

طبری کا بیان ہے کہ جب مکہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کو لے کر روانہ ہوئے تو اس روز سے زیادہ لوگ اسلام پر کبھی نہیں روئے کہ اسلام کو باہمی اختلاف وافتراق اور خانہ جنگی کا یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ اس دن کا نام ''یوم النحیب'' (یوم گریہ) مشہور ہو گیا۔ مرالظہر ان (موجودہ وادی فاطمہ) پہنچ کر سعید بن العاص نے اپنے گروہ کے لوگوں سے کہا کہ اگر تم لوگ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دو۔ کیونکہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ صرف وہی نہیں ہیں جنہوں نے ان کو قتل کیا یا جو ان کے خلاف شورش برپا کرنے کے لئے باہر سے آئے بلکہ وہ سب لوگ بھی ان کے قاتلین میں شامل ہیں جنہوں نے وقتاً فوقتاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کئے تھے۔ یا جو شورش کے وقت مدینہ میں موجود تھے مگر قتل عثمان رضی اللہ عنہ کو روکنے کے لئے نہ

[1] تاریخ طبری جلد سوم کا حصہ دوم (خلافت راشدہ حصہ سوم) ص ۶۰-۵۹، ترجمہ حبیب الرحمٰن صدیقی نیز تاریخ اسلام جلد اول از شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۱۸۰۔ مطبوعہ غضنفر اکیڈمی۔ کراچی

لڑے۔ مروان نے کہا کہ "نہیں، ہم ان کو (طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ) کو ایک دوسرے سے لڑائیں گے۔ دونوں میں سے جس کو بھی شکست ہوگی وہ تو یوں ختم ہو جائے گا اور جو فتح یاب ہوگا وہ اتنا کمزور ہو جائے گا کہ ہم بآسانی اس سے نپٹ لیں گے۔"[1] بنو امیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے مطالبے کو اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کا ذریعہ بنا لیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ ربیع الثانی ۳۶ ہجری میں اپنے لشکر سمیت عازم بصرہ ہوئے۔ بعض مخلص افراد نے ان کے رویئے پر اعتراض بھی کیے اور واپس لوٹ جانے کے مشورے بھی دیئے۔ لیکن بے سود۔ شاید اس اٹل عزم میں اموی گروہ کو بڑا دخل تھا۔ اور ان کا اپنا منصوبہ تھا۔ وہ طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے حامیوں کی لاشوں پر اپنی امارت کا محل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے لئے بڑی نازک اور کٹھن گھڑی آ پہنچی تھی۔ مسلمانوں کی تلواریں اپنے بھائی مسلمانوں ہی کے خلاف برہنہ ہونے والی تھیں۔ جس کے تصور ہی سے مخلص اور دور اندیش حضرات کے دل سخت متفکر اور پریشان تھے۔ مسلمانوں کے خلاف جو ان کے بدترین دشمن نہ کر سکے وہ خود ان کے اپنے ہاتھوں ہونے والا تھا۔ اسے اجتہادی غلطی کہیے یا عام غلطی، سیدھے سادے لفظوں میں یہ منتخب خلیفہ کے خلاف ایک غیر آئینی اقدام ہی تھا۔ بے شک یہ حضرات اپنی سوچ میں مخلص تھے لیکن ضروری نہیں کہ مخلصانہ سوچ صحیح بھی ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ جاہلیت کے زمانے کا قبائلی نظام تو نہ تھا کہ کسی مقتول کے خون بہا کا مطالبہ لے کر جو چاہے اور جس طرح چاہے اٹھ کھڑا ہو اور جو طریقہ چاہے اسے پورا کرنے کے لئے استعمال کرے۔ حکومت اگر مجرموں کو پکڑنے اور ان پر مقدمہ چلانے میں واقعی دانستہ تساہل کر رہی تھی تو بلاشبہ دوسرے لوگ بھی (حقیقی وارثوں کے علاوہ) اس سے انصاف کا مطالبہ کر سکتے تھے۔"[1]

لیکن قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کسی کو اجازت نہیں۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنی سوچ کے مطابق اصلاح اور خون عثمان رضی اللہ عنہ کے بدلے کا بیڑہ اٹھایا۔ ان کا یہ اقدام ملت کے لئے سخت نقصان دہ بلکہ تباہ کن ثابت ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک خون کے بدلے ہزارہا مزید خون ہوئے۔ مملکت کا نظام درہم برہم ہوا۔ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خلافت اور سیاسی قوت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گئی۔ ملت ٹکڑوں اور فرقوں میں تقسیم ہوگئی۔ انصار و مہاجرین کی بجائے آئندہ کے لئے خلیفہ کی طاقت کا انحصار بدوی قبائل، عجمی نومسلموں اور غلاموں پر ہوگیا۔ جنگ جمل کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہمیشہ اس پر متاسف رہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کا فوجی تیاری کے ساتھ بصرہ روانہ ہو جانے کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف چڑھائی کرنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کے معاملے پر توجہ کرنی پڑی۔ اگر یہ صورت پیش نہ آتی تو وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بآسانی نپٹ لیتے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ یا تو بیعت کر لیتے یا امارت سے علیحدہ ہو کر بعض دوسرے صحابہ کی طرح غیر جانبدار ہو

---

1. خلافت و ملوکیت ص ۱۲۵

جاتے۔ بعد میں یہ سنہری موقع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کبھی نہ مل سکا۔ انہیں معاویہ رضی اللہ عنہ کی بجائے پہلے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے لڑنا پڑ گیا۔ باغی سبائی گروہ کی سازش سے جنگ جمل پیش آئی جس میں طرفین کی تقریباً دس ہزار قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کے حامیوں کے قتل سے ان کے اہل قبیلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ہو گئے۔ باغیوں اور سازشیوں کو اپنی اسلام دشمن کارروائیوں کو آگے بڑھانے کے مزید مواقع مل گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنی فوجی اور سیاسی طاقت مستحکم کرنے کی مزید مہلت مل گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے کبھی قصاص نہ لے سکے بلکہ قاتلین ان کی فوج کا حصہ بن گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت مسلمانوں کے خلاف جنگی کارروائیوں میں بیت گیا تعمیر و تسخیر کا خلافتی عہد ختم ہو گیا اور بالآخر انہی جنگوں اور مناقشوں کے نتیجے میں وہ خود بھی خون خرابے سے تنگ آئے ہوئے ایک منتقم المزاج خارجی کی تلوار کا نشانہ بن گئے۔

جنگ جمل (جمادی الثانی ۳۶ھ.....دسمبر ۶۵۶ء)

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے لشکر سمیت بصرہ روانہ ہو گئے۔ عالم اسلام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد یہ تینوں ہستیاں بہت محترم تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر میں ان کی اہمیت شام اور معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہیں زیادہ تھی۔ انہوں نے شام کا ارادہ سردست ترک کر کے طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے تعاقب کا فیصلہ کیا۔ بزرگ صحابی حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے آپ کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور بڑی درد مندی سے عرض کیا کہ ''امیر المومنین! آپ مدینہ سے نہ نکلئے۔ اگر اس وقت آپ نکلے تو خدا کی قسم! آپ پھر یہاں واپس نہ آئیں گے۔ خلافت و حکومت کا مرکز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مدینہ سے نکل جائے گا'' دوسرے اکابر صحابہ نے بھی ان کی تائید کی۔ لیکن درپیش صورتِ حالات کے پیش نظر کسی دوسرے فوجی کمانڈر کو بھیجنے کی بجائے آپ نے بہ نفس نفیس جانے کو ترجیح دی۔ شاید کوئی دوسرا سالار طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مقابلے میں صورت حال سے عہدہ برآنہ ہو سکتا۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دفعہ مدینہ سے نکلے......اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ایسا پہلی اور آخری بار ہوا......تو پھر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک واپس نہ آ سکے نہ کبھی خلافت و حکومت مدینہ واپس آ سکی۔ مدینہ کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوفہ مرکز حکومت رہا۔ بنو امیہ کے عہد میں دمشق اور بنو عباس کے عہد میں بغداد۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارادہ دیکھ کر بہت سے اکابر صحابہ اور دوسرے اہل مدینہ تذبذب میں مبتلا ہو گئے اور وہ اپنے ذہنوں کو باہمی خانہ جنگی کے تصور سے ہم آہنگ نہ کر سکے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے سے باز رہے۔ روانگی کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ صرف سات سو آدمی تھے جو زیادہ تر وہی اہل کوفہ و بصرہ تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش میں حصہ لیا تھا اور جن سے پیچھا چھڑانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ

مناسب موقع کے انتظار میں تھے۔اس سے مخالفوں کو آپ کے خلاف مزید اعتراض کرنے اور اشتعال پھیلانے کا موقع ملا۔بہرحال اثنائے سفر میں اور لوگ آ آ کر ہمرکاب ہوتے گئے۔

حوأب کے کتے

آگے بڑھنے سے بیشتر یہاں ایک جعلی واقعہ کی تردید ضروری معلوم ہوتی ہے۔جریر طبری نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ عورتیں بیٹھی تھیں۔آپ ﷺ نے فرمایا "شاید تم میں سے کوئی عورت ایسی ہو جس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے۔"[1]

چنانچہ طبری کے مطابق بصرہ کو جاتے ہوئے حوأت کا چشمہ اور بستی راہ میں آئے۔ وہاں کتے بھونکے اور حضرت عائشہ نے واپس لوٹنے کا ارادہ کر لیا لیکن حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ جو شخص یہ کہتا ہے یہ حوأب کا چشمہ ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔تب حضرت عائشہ آگے بڑھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبری دانستہ یا نادانستہ تضاد بیانی کا شکار ہو گئے ہیں کیونکہ اس سے پہلے وہ اپنی تاریخ کے حصہ دوم (خلافت راشدہ حصہ اول)[2] میں لکھ چکے ہیں کہ یہ واقعہ دراصل ام زمل سلمٰی بنت ام قرفہ سے متعلق ہے۔یہ عورت کچھ عرصہ لونڈی کی حیثیت سے حضرت عائشہ کے پاس رہی تھی۔اس دوران میں ایک مرتبہ جب وہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھی تھی رسول اللہ ﷺ آئے اور فرمانے لگے کہ "تم میں سے ایک حوأب کے کتوں کو بھونکائے گی۔" حضرت عائشہ نے اس لونڈی کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے قبیلے میں چلی گئی۔عہد صدیقی کے فتنۂ ارتداد کے دوران میں "سلمٰی نے مرتد ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی اس بات کو پورا کیا۔" اور اپنے ہمراہیوں سمیت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج سے جنگ کرتے ہوئے ماری گئی۔بدباطن مخالفوں نے عہد صدیقی کے ۱۱ھ کے اس واقعہ کو عہد علوی کے ۳۶ھ کے واقعہ جمل سے جوڑ دیا۔کیا طبری کا حافظہ کوتاہی کر گیا یا وہ اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہو گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کردار کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی اور ان کے بعد نقال مؤرخوں نے بلا سوچے سمجھے اور دشمنوں نے دیدہ و دانستہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کے کردار پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی؟ بہرحال صحیح صورت حال یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔طبری کے پیشرو ابن سعد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جنگ جمل کے ذکر میں اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔مشہور مصری مؤرخ ابوالنصار عمر نے بھی حضرت علی المرتضیٰ کے بارے میں اپنی کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

بصرہ پہنچ کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا نے وہاں کے گورنر حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کو

---

[1] تاریخ طبری حصہ سوم (خلافت راشدہ حصہ سوم) اردو ترجمہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی صفحہ ۹۵

[2] ایضاً خلافت راشدہ حصہ اول صفحہ ۸۳۔

ویسے بھی سید سلیمان ندوی نے سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں لکھا ہے کہ اثنائے سفر میں لشکر عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر کتوں نے بھونکنا شروع کیا۔کسی نے یونہی کہہ دیا کہ یہ حوأب ہے۔حضرت عائشہ نے واپسی کا ارادہ کر لیا لیکن گاؤں کے پچاس آدمیوں نے شہادت دی کہ یہ حوأب نہیں۔تب انہیں اطمینان ہوا۔ مؤلف

پیغام بھیجا کہ شہران کے حوالے کر دیں۔ انہوں نے انکار کیا۔ بصری باغیوں کے ایک سرغنہ حکیم بن جبلہ نے آگے بڑھ کر جنگ چھیڑ دی۔ آخر کچھ سمجھ دار اور خیر خواہ حضرات نے بیچ میں پڑ کر جنگ رکوادی اور فیصلہ ہوا کہ ایک قاصد جسے طرفین کا اعتماد حاصل ہو یہ معلوم کرنے کے لئے مدینہ جائے کہ آیا طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ کی بیعت برضا و رغبت کی یا ان سے جبراً لی گئی۔ جبر کی صورت میں عثمان رضی اللہ عنہ بصرہ کی امارت ان کے حوالے کر دیں گے ورنہ طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر بصرہ سے لوٹ جائیں گے۔ بصرہ کے قاضی کعب بن سور کو حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے مدینہ بھیجا گیا۔ وہ سیدھے مسجد نبوی میں پہنچے۔ جمعہ کا وقت تھا۔ انہوں نے مجمع عام سے خطاب کیا۔

''اے اہل مدینہ! مجھے اہل بصرہ نے تم سے یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا ہے کہ آیا طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر مجبور کیا گیا تھا یا انہوں نے برضا و رغبت بیعت کی تھی؟''

مجمع خاموش رہا لیکن حضرت اسمہ بن زید رضی اللہ عنہ اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی کہ دونوں سے زبردستی بیعت لی گئی تھی۔ اس پر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ ہوا۔ کعب بن سور نے بصرہ واپس پہنچ کر حقیقت حال بیان کر دی۔ ادھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ کے واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ واللہ! طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کو جماعت کی وحدت برقرار رکھنے کے لئے مجبور کیا گیا تھا۔ اور ایک نیک کام کی خاطر زبردستی کی گئی تھی۔ اگر وہ ہمیں خلافت سے معزول کرنا چاہتے ہیں تو انہیں کسی حیلہ کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ کسی اور شے کے طلب گار ہیں تو ہم اس پر غور کریں گے۔''

کعب بن سور کی رپورٹ کے مطابق طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے حامیوں نے عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ وہ حسب وعدہ بصرہ خالی کر دیں۔ لیکن انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خط پیش کر کے کہا کہ یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے جس کا فیصلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے بصرہ خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر حکیم بن جبلہ کی اشتعال انگیزیوں سے فریقین میں جنگ چھڑ گئی۔ عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو شکست ہوئی۔ عثمان رضی اللہ عنہ گرفتار ہوئے۔ مخالف لشکر کے کچھ لوگوں نے ان سے بہت اہانت آمیز سلوک کیا۔ یہ بات طلحہ رضی اللہ عنہ زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کو بہت ناگوار گزری۔ بہر حال عثمان رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔ بصرہ پر قصاص طلب اور اصلاح پسند پارٹی (طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، عائشہ رضی اللہ عنہا) کا قبضہ ہو گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت اور ان کے قتل میں حصہ لینے والے بصریوں کو کتوں کی طرح گھسیٹ گھسیٹ کر لایا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ البتہ حرقوص بن زہیر کو اس کے قبیلہ نے بچا لیا۔ پھر یہ شخص پہلے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حامی رہا۔ پھر کٹر خارجی بن کر ان کے خلاف لڑا۔ باغیوں، قاتلوں کے خلاف انتقامی کارروائی کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ان کے قبیلوں کے بہت سے لوگ طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ سے علیحدہ ہو گئے اور کچھ مخالف کیمپ میں شامل ہو گئے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو قریش کے نمائندہ سمجھ لیا گیا۔ جب کہ ان بدوی قبائل کی قریش سے حریفانہ چشمک تھی جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے...... بدوی قبائل کے علاوہ عراق کے جاٹ،

کاشتکار، عجمی غلام اور نو مسلم مخالف صفوں میں شامل ہو کر ان کے خلاف لڑے۔ تاہم بہت سے قبیلے ان کے ہمراہ بھی ہو گئے اور کوفہ سے بھی ایک جمعیت آ کر ان کے لشکر میں شامل ہو گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی جان کی قربانی دے کر مسلمانوں کو جس خانہ جنگی اور باہمی خونریزی سے بچانا چاہا تھا، ان کے قصاص کے نام پر اس خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔

اس اثناء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ذی قار پہنچ چکے تھے۔ بصرہ کے سابق گورنر حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ اور بعض بصری قبائل بھی وہاں جا کر آپ سے مل گئے۔ آپ نے ان سے حالات دریافت کئے اور پھر کوفہ و بصرہ سے مدد حاصل کرنے کے لئے اپنے داعی روانہ کئے۔ آپ نے لکھا کہ "ہمارا مقصود اصلاح ہے ہم چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ میں پھر سے اتحاد و یگانگی پیدا ہو جائے اور موجودہ اختلاف و افتراق ختم ہو۔" گویا دونوں متحارب گروہ اتحاد و یگانگی اور اصلاح کے عزائم رکھتے تھے۔

کوفہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ایک نیک طینت اور مرنجاں مرنج بزرگ تھے جو عہد عثمانی کے اواخر سے اہل کوفہ (جن میں مالک اشتر نخعی اور اس کا گروہ بھی شامل تھا) کی اپنی پسند کے مطابق وہاں تعینات تھے۔ انہی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اہل کوفہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت لی تھی۔ وہ مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کے مخالف تھے۔ اہل کوفہ ان سے خوش تھے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نامزد گورنر عمارہ بن شہاب کو کوفہ میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے داعیوں محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور محمد بن جعفر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مالک اشتر نخعی کو بھی ناکام واپس کر دیا تھا۔ آخر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بڑے تپاک اور گرمجوشی سے ملے لیکن اپنی غیر جانبداری پر قائم رہے۔ اہل کوفہ کے سامنے ایک دفعہ پھر اپنے نقطہ نظر کو دہرایا اور لوگوں کو باہمی جنگ و جدال سے باز رہنے کی نصیحت کی۔ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "اے لوگو! میرا کہنا مانو۔ تم عرب کی بیخ و بنیاد بن جاؤ تاکہ مظلوم تمہارا سہارا پکڑیں اور خوفزدہ تمہارے دامن میں پناہ لیں۔ لوگو! جب فتنہ آتا ہے تو پہچانا نہیں جاتا۔ جب گزر جاتا ہے تب اس کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ معلوم نہیں موجودہ فتنہ کا سرچشمہ کہاں سے پھوٹا ہے اپنی تلواروں کو نیام میں کر لو۔ نیزوں کے پھل اتار ڈالو، کمانوں کی تانت کاٹ دو۔ لوگو! فتنہ کے زمانے میں سونے والا جاگنے والے سے اور کھڑا ہونے والا سوار ہونے والے سے بہتر ہے۔"[1]

جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ لوگ اب موسیٰ رضی اللہ عنہ کی تقریر سے متاثر ہو رہے ہیں تو انہوں نے مؤخر الذکر کو مسجد سے نکال دیا اور خود ایک موثر تقریر کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہزار کوفی ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ قرظہ بن کعب انصاری کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کا نیا گورنر مقرر کر دیا۔

---

[1] تاریخ طبری جلد سوم (خلافت راشدہ حصہ سوم)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوفہ سے کمک پہنچ گئی۔ لیکن وہ مسلمانوں کو باہم لڑانا اوران کا خون بہانا پسند نہ کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سبائی سازش اور ایک محدود گروہ کی بغاوت کا نتیجہ تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو باہمی کشت وخون سے بچانے کے لئے اپنے حامیوں کو دفاع میں ہتھیار اٹھانے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اور فوج سے بھی مدد طلب نہ کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سب کچھ جانتے تھے۔ وہ بھی مسلمانوں کا خون بہانے والا پہلا خلیفہ نہیں بننا چاہتے تھے۔ بلکہ افہام وتفہیم سے معاملہ سلجھانا چاہتے تھے۔ کوفہ کے سرداروں میں بزرگ صحابی حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انہوں نے جنگ قادسیہ اور دوسری جنگوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے تھے۔ وہ بہت مخلص، دور اندیش اور ملت کے خیر خواہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مصالحت کی بات چیت کے لئے بھیجا انہوں نے وہاں بڑی معقول اور دردمندانہ تقریر کی اور باہمی کشمکش کے مہلک نتائج وعواقب سے آگاہ کیا اور قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے امن و سکون کی فضا پیدا کرنے پر زور دیا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے قعقاع رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ”اگر تمہارے اور علی رضی اللہ عنہ کے یہی خیالات ہیں تو ہم مصلحت پر آمادہ ہیں۔ انشاء اللہ معاملات اصلاح پذیر ہو جائیں گے۔“

صلح کی امید

قعقاع رضی اللہ عنہ خوش خوش حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو گفتگو ہوئی تھی، اس سے مطلع کیا۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ مخلص مسلمانوں کی بڑی اکثریت نے بھی صلح کے امکان پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لشکر کے سامنے خطبہ دیا اور اگلے دن بصرہ کی طرف کوچ کرنے کا عزم ظاہر کیا اور باتوں کے علاوہ فرمایا کہ ”ہمارے ساتھ کوئی ایسا شخص ہرگز نہ جائے جس نے عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں کسی قسم کی معاونت کی ہو یا اس میں کسی قسم کا حصہ لیا ہو۔ یہ لوگ ہم سے جدا ہو جائیں۔“ دوسرے دن حضرت علی ذی قار سے بصرہ پہنچ گئے اور طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کے کیمپ کے سامنے ہی اپنا کیمپ لگایا۔ طرفین کے لشکروں میں چونکہ صلح کی خبر پھیل چکی تھی، دونوں طرف سے لوگ باہم ملاقات کے لئے ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے لگے اور اس خیال سے خوش اور مطمئن تھے کہ اللہ نے مسلمانوں کو باہمی خونریزی سے بچالیا۔ جانبین میں صلح کے لئے فضا تیار ہوگئی۔ لیکن فریقین میں بعض گروہ...... مثلاً طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کے لشکر میں بنوامیہ اور علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سبائی گروہ...... اپنے اپنے مفادات کی خاطر فوراً جنگ چھیڑنے کے حق میں تھے مگر سربراہوں نے انکار کردیا۔

سبائی گروہ کی شرانگیزی

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارادۂ صلح اور یہ اعلان کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں ملوث لوگ ان کے لشکر سے نکل جائیں سبائی گروہ کو سخت ناگوار گزرا اور انہیں اس آخری مرحلے پر اپنا شیطانی منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ا[illegible]

میں صلح ہوگئی تو پھر ہماری خیر نہیں۔ جیسا کہ علامہ ابن جریر طبری علامہ ابن خلدون وغیرہ مؤرخین نے لکھا ہے، سبائی گروہ کے چند سرغنوں عبداللہ ابن سبا، مالک اشترنخعی، خالد بن ملجم اور بعض دوسروں نے باہم خفیہ صلاح مشورہ کیا۔

اشترنخعی نے کہا کہ ''علی رضی اللہ عنہ قصاص کے مدعیان کے مقابلے میں کتاب اللہ سے زیادہ واقف ہیں اور اس پر عامل بھی ہیں۔ وہ یقیناً خون عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لیں گے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کی رائے ہم لوگوں کے بارے میں پہلے ہی معلوم ہے۔ علی رضی اللہ عنہ کی رائے اب تک نہیں معلوم۔ اگر یہ صلح مکمل ہوگئی تو ہم سب مارے جائیں گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم سب مل کر علی رضی اللہ عنہ کو بھی عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچادیں تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہوجائے۔ پھر خود بخود سکون ہوجائے گا۔ واللہ! ان کی باہمی مصالحت ہمارے خون پر ہی ہوسکتی ہے۔'' عبداللہ بن سبا نے کہا کہ ''علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کو مزید غور وفکر کا موقع ہی نہ دو اور معاہدۂ صلح کی تکمیل سے پہلے جنگ چھیڑ دو اور طرفین پر اندھیرے میں حملہ کردو۔ طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ یہ سمجھیں گے کہ علی رضی اللہ عنہ نے غداری کی اور علی رضی اللہ عنہ یہ خیال کریں گے کہ طلحہ علیہ السلام اور زبیر رضی اللہ عنہ نے بدعہدی کی۔ جب ایک دفعہ جنگ کی آگ بھڑک اٹھے گی تو پھر کسی کے بجھائے نہ بجھے گی۔ اور تم لوگ ان سے محفوظ ہوجاؤ گے۔'' ابن سبا کی رائے کو پسند کیا گیا اور پروگرام طے ہوگیا۔[1]

ادھر فریقین میں شرائط صلح طے پاکر ان کا اعلان کردیا گیا تھا۔ لوگ مطمئن اور بے فکر ہوکر سوئے۔ اگلی صبح کو معاہدۂ صلح لکھا جانے والا تھا۔

سبائیوں کا حملہ

سبائی گروہ نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق رات کی تاریکی میں دونوں طرف کی فوجوں پر حملہ کردیا اور ان کی توقع کے مطابق ہنگامۂ جنگ برپا ہوگیا۔ اصل بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ دونوں فریق غلط فہمی اور سازش کا شکار ہوگئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر نے پکار پکار کر لوگوں کو روکنے کی کوشش کی۔ حضرت عائشہ بھی اپنے جائے قیام سے اونٹ پر سوار ہوکر پہنچ گئیں اور لوگوں سے بار بار اپیل کرتی رہیں کہ اپنے ہاتھ روک لیں مگر اسلحہ کی جھنکار، شورِ دار و گیر، نعروں اور چیخوں میں کسی نے ان کی بات نہ سنی ہر فریق نے یہی سمجھا کہ دوسرے فریق نے بدعہدی کی۔ یہ حالت دیکھ کر خود سالارانِ لشکر جو گزشتہ رات صلح کر چکے تھے اپنی اپنی فوجوں کی کمان سنبھال کر بادل ناخواستہ میدان میں آگئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کی گفتگو..... طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جب بھائی کو بھائی کے قبیلہ کو قبیلہ کے خلاف صف آرا دیکھا تو فرمایا:

''آہ! مسلمان جب زور وقوت میں پہاڑ ہوگئے تو خود ٹکرا کر چور ہوا چاہتے ہیں۔'' ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار بے نیام کرنے سے پہلے ایک آخری کوشش کے طور پر لشکر سے باہر نکل کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کو پکارا کہ ایک منٹ کے لئے آگے آکر ان کی بات سن لیں۔ چنانچہ

[1] تاریخ طبری، تاریخ ابن خلدون، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی وغیرہ

وہ دونوں بزرگ بھی اپنے لشکر سے نکل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اتنے قریب آ گئے کہ ان کے گھوڑوں کی گردنیں آپس میں مل گئیں اور یوں گفتگو ہوئی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ: تم لوگوں نے سامانِ جنگ اور فوجوں کو جمع کر کے میرے ساتھ عداوت کی۔ کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عداوت کا کوئی جواز ہے؟ کیا میں تمہارا دینی بھائی نہیں ہوں؟ کیا تم پر میرا خون اور مجھ پر تمہارا خون حرام نہیں؟ کیا کوئی ایسی وجہ بتا سکتے ہو جس سے میرا خون تم پر مباح ہو؟

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ: کیا تم عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی سازش میں شریک نہ تھے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ: اللہ تعالیٰ اپنے دین کو پورا کرے گا اور عثمان کے قاتلوں پر لعنت بھیجے گا۔ اے طلحہ رضی اللہ عنہ! کیا تم نے میری بیعت نہیں کی؟

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ: ہاں! لیکن میری گردن پر تلوار تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ: اے زبیر! کیا تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہم آپس میں ہنس بول رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے پوچھا تھا کہ تمہیں علی رضی اللہ عنہ سے محبت ہے؟ اور تم نے جواب دیا تھا کہ ہاں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک دن آئے گا کہ تم علی رضی اللہ عنہ سے لڑو گے اور زیادتی تمہاری ہوگی۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ: ہاں مجھے یاد آ گیا...... واللہ! اب میں تم سے ہرگز نہ لڑوں گا۔

یہ کہہ کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ لڑائی کے میدان سے نکل گئے۔ انہوں نے اپنے فرزند حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو بھی ساتھ لے جانا چاہا مگر انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو جنگ کے گھمسان میں چھوڑ کر جانا پسند نہ کیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ مدینہ کے عزم سے روانہ ہوئے لیکن بصرہ سے چند میل باہر وادی السباع میں بنی تیم کے ایک شخص عمرو بن جرموز نے انہیں عین حالت نماز میں دھوکے سے قتل کر دیا۔ جب وہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا سر اور تلوار لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا تو انہیں سخت دکھ اور قاتل کو دوزخ کی بشارت دی۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی لڑائی سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کر لیا اور وہ میدان جنگ سے نکلنا چاہتے تھے کہ ان کے ارادے سے آگاہ ہو کر مروان بن الحکم نے انہیں زہر آلود تیر سے سخت زخمی کر دیا اور وہ اس زخمی کے اثر سے شہید ہو گئے۔ ایک تو مروان حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں شمار کرتا تھا کہ انہوں نے محاصرہ کے دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو باغیوں سے بچانے کی کوشش نہ کی، دوسرے وہ اور اس کے ساتھی اسی نیت سے ان کے لشکر میں شامل ہوئے تھے کہ فریقین کو آپس میں لڑا کر ختم یا کمزور کر دیں گے اور پھر آسانی سے اپنا مقصد حال کر لیں گے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ کو لشکر سے نکلتے دیکھ کر اسے خوف ہوا کہ اس طرح وہ عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ بھی نہ لے سکے گا۔ اور زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ دونوں کے میدان چھوڑ جانے سے فوج بددل ہو کر علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے خلاف جم کر نہ لڑ سکے گی۔ جب جنگ کے خاتمہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی گرد سے اٹی ہوئی لاش ملی تو آپ پر رقت

طاری ہوگئی۔ سخت متاسف ہوئے آپ نے فرمایا ان کو بٹھاؤ۔ لوگوں نے انہیں بٹھایا۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے طلحہ رضی اللہ عنہ کے چہرے سے گرد صاف کی اور کہا ''اے ابو محمد! مجھے یہ بات سخت ناپسند تھی کہ میں تمہیں آسمان کے تاروں کے نیچے اس وادی میں خون میں لتھڑا ہوا دیکھوں۔ خصوصاً جب کہ تم جہاد فی سبیل اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں قابل قدر اور نمایاں حصہ لے چکے تھے۔'' اس کے بعد انہیں احترام سے دفن کر دیا۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے اور حقیقت میں وہی دونوں فوج کے سربراہ تھے لیکن ہنگامہ جنگ گرم ہو چکا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھی کسی نے نہ سنی بلکہ جس اونٹ پر وہ سوار ہو کر جنگ روکنے کے لئے آئی تھیں۔ وہی جنگ کا مرکز و محور بن گیا۔ ان پر ہر طرف سے تیروں کی بارش ہونے لگی۔ ان کا ہودج تیروں سے پرو گیا جیسے ساہی کی پشت ہو۔ بنی صنبہ اور بنی ازد نے اونٹ کے گرد گھیرا ڈال لیا اور اس کی حفاظت میں چار ہزار سات سو جوانمردوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اونٹ کی مہار کو پکڑنا گویا موت کے منہ میں جانا تھا۔ فریق مخالف کا سارا دباؤ اسی جانب تھا اونٹ کے گرد ایسی گھمسان کی جنگ ہوئی کہ شاید ہی پہلے کبھی ہوئی ہو۔

جنگ کا خاتمہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سمجھ لیا کہ جب تک اونٹ اپنی جگہ پر قائم ہے جنگ بند نہیں ہوگی۔ اس لئے انہوں نے حکم دیا کہ اونٹ کی کونچیں کاٹ دی جائیں چنانچہ متعدد جنگ جوؤں نے مل کر حملہ کیا اور اونٹ کے پاؤں زخمی کر دیئے وہ بلبلا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی گویا ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی فوج کا جھنڈا سرنگوں ہو گیا۔ لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فوج بددل ہوگئی۔ عصر کے وقت لڑائی ختم ہوگئی۔

جنگ کے اختتام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے میدان کارزار کا ایک چکر لگایا۔ اکابر صحابہ اور اسلام کے جانبازوں کو جنہوں نے کبھی اعدائے اسلام کے مقابلے میں شجاعت و جاں نثاری کے کارنامے سرانجام دیئے تھے، اب انہیں ایک دوسرے کے ہاتھوں خاک و خون میں لتھڑے پڑے دیکھا تو بے حد متاثر اور ملول ہوئے۔ آئندہ کئی صدیوں کی تاریخ اسلام شہادت دیتی ہے کہ اسلام پر دشمنوں کی بجائے خود مسلمانوں کے ہاتھوں تباہی آتی رہی جس کا آغاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور جنگ جمل سے ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہدایات

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر میں منادی کرادی کہ

۱- کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔

۲- کسی زخمی کو قتل نہ کیا جائے۔

۳- کسی کو قیدی نہ بنایا جائے۔

۴- کسی کے گھر میں نہ گھسا جائے۔ کسی محارب کا مال و اسباب نہ لوٹا جائے۔

۵- صرف اسلحہ جنگ پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔

۶- جو شخص ہتھیار ڈال دے یا اپنے گھر کا دروازہ بلند کر لے، اسے امن ہے۔
ان ہدایات میں فتح مکہ کے موقع پر کی نبوی ہدایات کی روح صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ ان سے یہ بھی واضح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک ان کے مخالف مسلمان تھے جن پر کافروں سے جنگ کرنے کے اصولوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضری

اونٹ بیٹھ گیا۔ اس اونٹ کی بھی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں ملی[1]...... مخالف لڑنے والوں سے میدان خالی ہو گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوتیلے بھائی محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ (جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے لڑے) کو بھیجا کہ جا کر اونٹ سے ان کا ہودج علیحدہ کریں اور دیکھیں کہ انہیں زخم وغیرہ تو نہیں پہنچا، وہ حکم بجا لائے اور پھر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کو کوئی زخم تو نہیں پہنچا اپنا ہاتھ ہودج کے اندر کیا تو انہوں نے غضبناک لہجے میں پوچھا کہ یہ کس ملعون کا ہاتھ ہے؟ محمد نے جواب دیا کہ میں آپ کا بھائی محمد ہوں۔'' فرمایا ''تم محمد (قابل تعریف) نہیں ہو بلکہ مذمم (قابل مذمت) ہو'' پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ پوچھا ''اماں مزاج کیسا ہے؟'' فرمایا، اچھی ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اللہ آپ سے درگزر کرے۔'' جواب دیا ''آپ سے بھی درگزر کرے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے ام المومنین کو عبداللہ بن خلف رضی اللہ عنہ کے مکان میں لے جا کر ٹھہرایا جو بصرہ میں سب سے بڑا مکان تھا۔ ان کے بہت سے زخمی ساتھی اور دوسرے حامی بھی وہاں منتقل ہو گئے۔

مقتولین کی تدفین

جنگ جمل میں دس ہزار افراد دونوں طرف سے کام آئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان سب کی نماز جنازہ کسی تمیز و تفریق کے بغیر پڑھی اور سب کو اپنی نگرانی میں دفن کرایا جو اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ آپ اپنے مخالفین کو بھی مسلمان اور اپنے برادرانِ دینی سمجھتے تھے۔ زخمیوں بھاگنے والوں اور ہتھیار ڈالنے والوں کے متعلق آپ عام ہدایات پہلے ہی دے چکے تھے وہ بھی مسلمان متحاربوں کے بارے میں تھیں نہ کہ کافر متحاربوں کے بارے میں۔

مخالفین کا مال و اسباب

مخالف لشکر گاہ سے مقتولوں، زخمیوں اور بھاگنے والوں کا جو مال و اسباب ہاتھ آیا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ اکٹھا کرا کر جامع مسجد میں رکھوا دیا اور منادی کرا دی کہ لوگ اپنا مال شناخت کر کے لے جائیں۔ آپ نے اسے غنیمت قرار دے کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم نہیں کیا۔ چنانچہ اوروں کے علاوہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے موسیٰ بھی آئے۔ آپ نے انہیں مرحبا کہا، مل کر خوش ہوئے اور فرمایا کہ ''بھتیجے! میرے بھائی طلحہ رضی اللہ عنہ اور اپنے بھائی محمد

(حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بڑے صاحب زادے جو جنگ جمل میں مارے گئے) کا مال اسباب شناخت کر کے لے جاؤ۔ اور بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ''

نیز فرمایا کہ ''مجھے امید ہے کہ آخرت میں تمہارے والد اور میرے درمیان وہی معاملہ پیش آئے گا جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ

و نزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علی سرر متقابلین[1]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اظہار حسرت

اس اثناء میں امرائے لشکر اور روسائے شہر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ میں جنگ جمل سے قبل صلح کرانے کی انتہائی کوشش کی تھی جو سبائی سازشیوں کی وجہ سے کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے فرمایا کہ ''مجھے یہ زیادہ پسند تھا کہ میں آج سے بیس برس پہلے مرگئی ہوتی۔'' قعقاع رضی اللہ عنہ نے واپس جا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ قول بیان کیا۔ انہوں نے بھی ایسا ہی فرمایا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مکہ روانگی

چند روز کے آرام کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کو عزت واحترام کے ساتھ مکہ پہنچا دیں۔ آپ نے سواری، زادراہ، نقد وجنس وغیرہ جملہ سامانِ ضرورت فراہم کیا۔ بصرہ کی چالیس معزز خواتین کو ہمرکاب کیا۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا کے ساتھیوں میں سے جن لوگوں نے ساتھ جانا چاہا انہیں بھی اجازت دے دی۔ چند میل تک خود مشائعت کی پھر ایک دن کی مسافت تک حضرت حسن رضی اللہ عنہ پہنچانے لگے۔ رخصت ہوتے وقت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے الوداع کہنے والے مجمع سے فرمایا کہ ''میرے بچو! یہ جنگ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ اس لئے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ میرے اور علی رضی اللہ عنہ کے درمیان جو ساس، داماد کے درمیان کبھی کبھی ہو جایا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی رنجش نہ تھی۔ وہ ان واقعات کے بعد بھی میرے نزدیک اخیار میں ہیں، اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''ام المومنین رضی اللہ عنہا سچ فرماتی ہیں۔ خدا کی قسم! میرے اور ان کے درمیان اس کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم ہیں[2] ''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مکہ ہوتی ہوئی مدینہ تشریف لے گئیں اور بقیہ زندگی وہیں لوگوں کو رشد و ہدایت

---

1. ترجمہ: ہم ان کے دلوں کی کدورت نکال دیں گے اور وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔'' سورہ الحجر آیہ ۴۷، یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی فرمائی۔

2. تاریخ طبری (خلافت راشدہ)، تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی نیز سیرت عائشہ از سید سلیمان ندوی

اور حدیث وفقہ کی تعلیم دینے میں گزار دی۔ جب کبھی جنگ جمل کا واقعہ یاد آ جاتا تو بے اختیار آنسو بہانے لگتیں۔ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جنگ کی طلب گار نہ تھیں۔ لیکن لوگوں نے انہیں گھبراہٹ میں ڈال دیا اور ہونی ہو کر رہی۔

جنگ جمل کے نتائج

جنگ جمل اسلامی تاریخ کا ایک بے حد اندوہناک واقعہ ہے جس نے مسلمانوں کے باہمی کشت وخون کی راہ کھول دی۔ اسلامی تاریخ میں خلافت کے خاتمہ اور ملوکیت کے آغاز کے لئے راہ ہموار کر دی۔ چند در چند غلط فہمیوں کی بناء پر جنگ جمل کے لئے زمین تیار ہوئی اور جب فریقین کے لیڈروں نے باہم صاف دلی سے مذاکرات کر کے جنگ سے دستبرداری اور صلح صفائی سے معاملات کو سلجھانے کا فیصلہ کر لیا تو سبائی گروہ نے اپنے مفاد میں مسلمانوں کو باہم لڑا دیا۔ اور ہمیشہ کے لئے باہمی عداوت اور جنگ وجدال کا راستہ کھول دیا۔ عشرۂ مبشرہ کے دو انتہائی بزرگ اور با اثر صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ جو جنگ سے علیحدگی کا فیصلہ کر چکے تھے اور بزرگی اور رفعت شان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد انہی کا مرتبہ تھا، شہید ہو گئے۔ ان کے علاوہ دس ہزار اور دوسرے مسلمان بھی مارے گئے۔ ہزاروں مسلمان عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ قبیلوں کی آپس میں مستقل عداوتیں قائم ہو گئیں۔ خود قبیلے بھی بٹ گئے۔ مسلمانوں کو جو توانائیاں دشمنوں کے خلاف اور تسخیر ممالک کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ اب ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہونے لگیں اور لوگوں پر حق مشکوک ہو گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا باقاعدہ قصاص بھی نہ لیا جا سکا۔ سبائیوں نے ایسی چال چلی کہ آئندہ کے لئے بھی اس کا امکان نہ رہا۔ سبائیوں نے اپنی جانیں بچانے اور مسلمان میں انتشار اور تفرقہ پھیلانے کے لئے جنگ چھیڑی تھی۔ بظاہر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے لڑے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ذی قار سے بصرہ آتے وقت ان سے علیحدگی کا اعلان کر چکے تھے۔ اب وہ اس سازشی گروہ کو اپنے ساتھ رکھنے بلکہ اس پر انحصار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ، مالک اشتر نخعی اور دوسرے سازشی ہر کام میں پیش پیش ہو گئے۔ ابن سبا کے بعد دوسرا بڑا شیطانی دماغ (Evilgenius) مالک اشتر ہی تھا۔ ان لوگوں کی ریشہ دوانیوں اور خود غرضیوں کی وجہ سے مصر جیسا اہم صوبہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے جاتا رہا اور عامتہ الناس میں یہ غلط بات عام پھیل گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ کرنے والے باغیوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت حاصل تھی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس صورت حال کو اپنے مقاصد کے لئے جی بھر کر استعمال کیا۔

قریش کی اکثریت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا تھا۔ جنگ جمل میں ان کی ہزیمت کے بعد قریش کے وقار اور طاقت کو بہت نقصان پہنچا۔ سبائی گروہ کے علاوہ دوسرے عرب قبائل، عجمی نو مسلم، غلام اور جاٹ وغیرہ بھی قریش پر دلیر ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انتظامیہ میں قریش کا اثر ورسوخ اور حصہ بہت کم ہو گیا۔ قریش کی جمعیت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہونے لگی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کیمپ کا اتحاد

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ کا تفرقہ بنیادی طور پر جنگ جمل کا نتیجہ تھا۔ اگر یہ جنگ پیش نہ آئی ہوتی تو گزشتہ خرابیوں اور افسوسناک واقعات کے باوجود خلافت کو اس کی صالح اور علی منہاج السنّت روایات کے ساتھ قائم رکھنا اور ملوکیت کی راہ روکنا ممکن ہوسکتا تھا۔

جنگ کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خلافت ہمیشہ کے لئے نکل گئی۔ مدینہ کی سیاسی اہمیت اور مرکزیت ختم ہوگئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلام اور مسلمانوں کے حقیقی مرکز سے دور ہو گئے اور یہ امر ان کے حق میں مفید ثابت نہ ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مستقبل کے منصوبے اور کارروائیاں کوفیوں کی خوشنودی مزاج پر منحصر ہو گئے۔ حالات کی مجبوریوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو دارالخلافہ بنالیا جہاں ان کے حامیوں کی اکثریت تھی۔ مہاجرین وانصار کی اکثریت سے کٹ کر انہوں نے دوسرے عرب قبائل اور عجمی نومسلموں اور عجمی غلاموں سے اپنی قسمت وابستہ کر لی۔ کوفہ سیاسی، سماجی، معاشی، تنظیمی، علمی، ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ مدتوں تک سازشوں، فتنوں، بغاوتوں اور باہمی منافرتوں کا ہیڈکوارٹر بھی یہی شہر رہا۔ مذہبی فرقہ وارانہ اختلافات کا آغاز بھی اسی شہر سے ہوا۔ شیعیت اور خارجیت نے یہیں جنم لیا۔ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی شہادت اور اس کے عواقب میں کوفیوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

جنگ جمل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بادل ناخواستہ اپنے انتہائی قریبی عزیزوں اور رفیقوں سے لڑنا پڑا جو گزشتہ نصف صدی سے ان کے ایمان اور میدان کے ساتھی رہے تھے، ایک ساتھ اسلام کے ابتدائی ایام کی سختیاں اور مصائب جھیلے تھے اور شانہ بشانہ اسلام کے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو کر لڑے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور حفاظت میں سرفروشی وفداکاری کے مظاہرے کئے تھے۔ ظاہر ہے کہ جنگ جمل کے کشت وخون سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ کسی کو دکھ نہ ہوا ہوگا۔ جس باغ کی انسان نے مدتوں اپنے خون پسینہ سے آبیاری کی ہو اسے تباہ ہوتے دیکھ کر کیا کچھ رنج وغم نہ ہوا ہوگا۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی دوسرا عظیم ومخلص انسان دکھائی نہیں دیتا جسے ایسی کربناک اور دلدوز صورت حال سے سابقہ پڑا ہوا۔ شیکسپیئر نے اپنے ایک خیالی ڈرامہ کا ہیرو ڈنمارک کا شہزادہ ہیملٹ دکھایا ہے جسے ایک ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا یعنی اپنوں سے لڑنا بھڑنا۔ اگرچہ یہ ظاہری مشابہت کی ایک بہت بے معنی سی بات ہے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک عظیم ترین ہیملٹ کہا جا سکتا ہے۔ جنگ جمل میں ان کے دل ودماغ پر جو کچھ گزری ہوگی، آج چودہ سو سال بعد اس کا صحیح تصور اور تجزیہ بہت مشکل ہے کیونکہ تاریخ ظاہری واقعات کو ریکارڈ کرتی ہے۔ انسان کے دل ودماغ کی سرگزشت ریکارڈ نہیں کرتی۔ تاہم طبری، ابن خلدون اور بعض دوسرے مؤرخین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بعض متشکک افراد سے گفتگوئیں ریکارڈ کی ہیں۔ مثلاً اعور، کلیب، ابوسلامہ، مالک بن حبیب وغیرہ، ان سے اصحابِ جمل کے بارے میں ان کی آراء اور خیالات کی مثبت عکاسی ہوتی ہے، عداوت کی پرچھائیں تک نہیں لیکن کرب کی کیفیت ضرور ہے۔ بہر حال سبائی سازشیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے کوئی دوسری راہ کھلی نہ رہنے دی اور آئندہ کے لئے وہ اسی گروہ پر انحصار کرنے لگے۔ آپ نے جب اپنے چچازاد بھائیوں عبداللہ بن عباس، عبیداللہ بن عباس اور قثم بن عباس کو بصرہ،

یمن اور مدینہ کا گورنر مقرر کیا تو مالک اشتر نے اس کا سخت برا مانا اور کہا کہ اگر علی رضی اللہ عنہ نے اپنوں ہی کو ریوڑیاں بانٹنی تھیں تو عثمان رضی اللہ عنہ کیا برا تھا۔ آخر اس فتنہ وفساد کے بانی کو بھی آپ نے مصر جیسے اہم صوبہ کا گورنر بنا کر بھیجا لیکن راستہ ہی میں مر گیا۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت سے قریش کی سیادت و قیادت بری طرح متاثر ہوئی۔ دوسرے قبائل میں ان کی حیثیت گر گئی۔ جنگ جمل میں قریش نے عموماً حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہیں دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قریش کی اکثریت کے درمیان نفرت و بیگانگی کی ایک خلیج حائل ہو گئی۔ کوفہ کو مستقل دار الخلافہ بنانے کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی۔

جنگ جمل اور اس کے بعد فوری طور پر پیدا شدہ صورت حال سے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نپٹے اس سے ان کی عظمت کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ وہ واقعی ایک بے حد عظیم انسان اور چوتھے خلیفہ راشد تھے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس جنگ کے سلسلے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ ایک خلیفہ راشد اور ایک بادشاہ کے فرق کو پورا طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ انہوں نے اپنی فوج میں پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرنا، کسی زخمی پر حملہ نہ کرنا اور فتحیاب ہو کر مخالفوں کے گھروں میں نہ گھسنا۔ فتح کے بعد انہوں نے دونوں طرف کے شہداء کی نماز جنازہ پڑھائی اور انہیں یکساں احترام کے ساتھ دفن کرایا۔ تمام مال جو لشکر مخالف سے ملا تھا، اسے مالِ غنیمت قرار دینے سے انکار کر دیا اور بصرہ کی جامع مسجد میں جمع کر کے اعلان فرما دیا کہ جو اپنا مال پہچان لے وہ لے جائے۔ لوگوں نے خبر اڑائی کہ علی رضی اللہ عنہ یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ بصرے کے مردوں کو قتل اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً اس کی تردید کی اور فرمایا ''مجھ ایسے آدمی سے یہ اندیشہ نہ ہونا چاہیے۔ یہ سلوک تو کافروں کے ساتھ کرنے کا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا جا سکتا۔'' بصرے میں داخل ہوئے تو ہر گھر سے عورتوں نے گالیوں اور کوسنوں کی بوچھاڑ کر دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج میں اعلان کیا کہ خبردار! کسی کی بے پردگی نہ کرنا، کسی کے گھر میں نہ گھسنا، کسی عورت سے تعرض نہ کرنا خواہ وہ تمہیں اور تمہارے امرا اور صلحا کو گالیاں ہی کیوں نہ دیں ہم کو تو ان پر دست درازی کرنے سے اس وقت بھی روکا گیا تھا جب یہ مشرک تھیں۔ اب ہم ان پر ہاتھ کیسے ڈال سکتے ہیں جبکہ یہ مسلمان ہیں۔'' حضرت عائشہ کے ساتھ جو شکست خوردہ فریق کی اصل قائد تھیں، انتہائی احترام کا برتاؤ کیا اور پوری حفاظت کے ساتھ انہیں مدینہ بھیج دیا۔''[1]

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۳۱

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے قاتل کو دوزخ کی نوید سنائی، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی لاش دیکھ کر جس طرح آپ پر رقت طاری ہوئی اور جو دلسوز الفاظ آپ نے کہے پھر ان کے صاحب زادے موسیٰ سے جس طرح محبت سے پیش آئے اور اپنے اور طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کا جنت میں صاف دلی اور مودت کے ساتھ ایک دوسرے کے بالمقابل تختوں پر بیٹھنے کا آیت قرآنی کے حوالے سے جس طرح ذکر کیا وہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔

شکست خوردہ مخالفوں سے یہ حسن سلوک اور ان کا نیکی کے ساتھ ذکر دنیا کے کسی دوسرے فاتح یا صاحب اقتدار کے ہاں نہ ملے گا۔

سواد اعظم کی رائے ہے کہ جنگ جمل کے معاملے میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے اجتہادی غلطی ہوئی اگرچہ بعض اسے محض غلطی بھی کہتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وارثوں اور عزیزوں کی موجودگی میں ان بزرگ ہستیوں کو قصاص کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اجتہادی غلطی یا محض غلطی یہ تھی کہ انہوں نے سبائیوں کو اپنی فوج میں رکھا۔ نہ صرف ان کو اپنی فوج میں رکھا اور ان سے مدد لی بلکہ بعض کو حکومتی مناصب بھی دیئے۔ ان لوگوں کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں رہنا ہی عامتہ المسلمین کے اس گمان کے لئے کافی تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون بہانے میں شریک تھے۔ اگرچہ آپ اس الزام سے قطعی اور بجا طور پر انکار کرتے تھے۔ جنگ جمل ایک لحاظ سے اہل بصرہ پر اہل کوفہ کی فتح تھی۔ دونوں شہروں کے قبیلوں میں جاہلی عصبیت کے جراثیم ہنوز موجود تھے بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے۔

کیا جنگ جمل نہیں ہوئی؟

جنگ جمل کے اسباب و واقعات کی طول طویل تفصیلات قدیم و جدید تقریباً سبھی مسلمان مورخوں نے بیان کی ہیں۔ کہیں کہیں باہم اختلاف ہے لیکن انکار نہیں۔ اس جنگ کے بارے میں ایک مبسوط کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ راقم السطور چاہتا تو اس جنگ کا ذکر ایک آدھ صفحے میں بھی کر سکتا تھا۔ لیکن بعض ناگزیر تفصیلات کا ذکر اس لئے بھی کرنا پڑا کہ ایک گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنے والوں کو بغیر کسی رکھ رکھاؤ اور استثنا کے برا کہتا ہے جبکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اپنے مخالفوں کو ہمیشہ مسلمان سمجھا کئے اور ان سے غیر مسلم محاربین کا سلوک کبھی نہیں کیا۔ غلام احمد پرویز جملہ مورخین سے اپنی الگ رائے بلکہ ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جنگ جمل سرے سے پیش ہی نہیں آئی اور یار لوگوں نے افسانے گھڑ لئے۔ وہ نہ حدیث کے قائل ہیں نہ تاریخ کے۔ وہ انہیں خرافات اور افسانہ و افسون کا پلندہ سمجھتے ہیں۔

اپنی کتاب ''شاہکار رسالت'' میں بھی انہوں نے حدیث اور تاریخ پر طنز و تضحیک کے انداز میں لے دے کی ہے کیونکہ حدیث و تاریخ کی مفصل اور باقاعدہ تدوین تیسری چوتھی صدی میں ہوئی۔ ان کا اپنا خیال ہے کہ اس میں اموی اور عباسی خاندانوں نے اپنے مفادات اور مقاصد کے پیش نظر جعلی روایات داخل کر دیں۔ ان کے بعض اعتراضات اپنے اندر جان رکھتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ حدیث اور تاریخ کی تدوین پہلی صدی ہجری ہی

میں شروع ہوگئی تھی۔ خود بعض صحابہ نے حدیث کے مجموعے حضورِ اکرم ﷺ کی حیات اقدس ہی میں مرتب کر لئے تھے اور تاریخ نویسی کا آغاز سیرتِ نبوی اور مغازی کی صورت میں آپ کی وفات کے جلدی بعد شروع ہو گیا۔ غلام احمد پرویز کو یہ معلوم نہیں کہ نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی صدیوں تک قبیلوں اور قوموں کے تاریخی واقعات کا تحفظ نسل در نسل زبانی روایات کے ذریعے کیا جاتا رہا ہے عرب میں تو اس کا خاص اہتمام تھا۔ تحریری تحفظ اس وقت شروع ہوا جب لکھنے کا فن خوب ترقی کر گیا اور عام پھیل گیا۔ زبانی روایات کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اہمیت میں تحریری روایات سے کمتر ہیں۔ زبانی روایات ہی تاریخ کا ماخذ، منبع اور بنیاد بنتی ہیں۔ ابن سعد، طبری وغیرہ کے راوی اکثر ثقہ اور معتبر تھے ایرے غیرے نتھو خیرے نہ تھے۔ آج کل کے زمانے کی طرح اخبارات، رسالے، ریڈیو، ٹیلی ویژن تو ہوتے نہ تھے کہ روزمرہ کے واقعات قلمبند اور ریکارڈ کئے جائیں اور پھر فی زمانہ ایسا کرنے کے باوجود بھی واقعات و بیانات کی صحت کا کوئی بھروسہ نہیں۔ آئے دن تردیدی بیانات اور خبریں پڑھنے میں آتی ہیں۔ اور ریڈیو اور ٹی وی پر غلط بیانات آتے رہتے ہیں۔ آج کل کے اخباری اور ٹی وی رپورٹروں کے مقابلے میں عہد صحابہ کے راوی یقیناً زیادہ قابل اعتماد تھے۔ انہی کے ذریعے جنگ جمل کے اسباب و واقعات کی خبریں نسلاً بعد نسلاً بیان کی جاتی رہیں۔ جنگ جمل کے نہ ہونے کی خبر کسی منہ سے نہ سنی گئی۔ واقدی، ابن سعد، طبری اولیں باقاعدہ مؤرخ ہیں۔ سب نے جنگ جمل کا ذکر کیا ہے۔ ابن اثیر، ابن خلدون، ابوحنیفہ دینوری، مسعودی وغیرہ سب اس کے وقوع پذیر ہونے کے قائل ہیں اور بعد کے دوسرے مؤرخین اور مستشرقین بھی۔ آخر ان مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ مؤرخوں کو کیا پڑی تھی کہ ایک سرے سے ''بے بنیاد'' واقعے کو اسلامی رامائن یا مہا بھارت بنا کر پیش کرتے۔ ع۔ تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا۔

راقم نے غلام احمد پرویز کو ایک خط لکھا تھا کہ وہ اپنے انکار کے ثبوت میں کوئی تاریخی حوالہ پیش کریں۔ ان کی طرف سے ایک صاحب نے جواب دیا جو درج ذیل ہے (اصلی خط میرے پاس محفوظ ہے)

باسمہ تعالیٰ

ادارہ طلوع اسلام

۲۵ ربی گلبرگ......لاہور　　　　فون نمبر ۸۸۰۸۰۰

محترمی!

السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ پرویز صاحب نے تاریخی تحقیق کی رو سے تو ثابت نہیں کیا کہ جنگ جمل یا جنگ صفین سرے سے وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ جب اس دور کی کوئی مستند تاریخ ہی امت میں موجود نہیں تو اس دور کے واقعات کی تاریخی تحقیق کس طرح کی جا سکتی ہے۔ اس بنیادی مشکل کے پیش نظر پرویز صاحب کا مسلک یہ ہے کہ عہد نبی اکرم ﷺ اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق جو کچھ ہماری تاریخ میں آیا ہوا سے قرآن کریم کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لیا جائے۔ اگر وہ قرآن کے مطابق ہے تو اسے صحیح باور کر لیا جائے۔ اگر اس کے خلاف ہے تو اسے مسترد کر دیا جائے۔

یہ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کے متعلق قرآن کریم میں شہادات موجود ہیں کہ ان کی سیرت قرآنی معیار کے مطابق تھی۔ قرآن کریم کی شہادت رحماء بینھم کی ہے۔ پھر اس کی یہ بھی شہادت ہے کہ اللہ تو ان سے راضی ہو گیا اور انہیں اہل جنت قرار دے دیا۔ دوسری طرف قرآن کریم میں بنص صریح موجود ہے کہ جس کسی مومن نے دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دیا وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ قرآن کریم کی ان تصریحات کی روشنی میں کیا اسے ایک ثانیہ کے لئے بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ دو چار دس نہیں پورے کے پورے صحابہ کی آدھی جماعت جنگ میں ایک طرف کھڑی تھی اور دوسری آدھی جماعت ان کے بالمقابل شمشیر بدست صف آرا تھی اور اس مبارزت میں کم سے کم دس ہزار صحابہ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ اگر تاریخ کے اس واقعہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو فرمائیں کہ قرآنی شہادت کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ ہم قرآن کریم پر ایمان لانے کے مکلّف ہیں نہ کہ تاریخ اور پھر تاریخ بھی وہ جو اس عہد کے قریب دو سو سال بعد زبانی روایات کی بناء پر مرتب ہوئی تھی۔

یہ ہے اس باب میں پرویز صاحب کا انداز استدلال۔ اس کی تفصیل انہوں نے اپنی کتاب ''شاہکار رسالت'' میں دی ہے۔

والسلام

(انگریزی میں دستخط عبدالحمید)

برائے ایم۔ ایم۔ خلیل

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ نمبر ۲۔ لاہور[1]

بنام

محترم بشیر احمد ساجد صاحب

یہ خط کسی مفصل تبصرہ کا محتاج نہیں۔ اپنی نوعیت کے یہ ''عظیم مفسر قرآن'' اس بات کو بھول گئے کہ جنگ جمل کسی باہمی عداوت اور ملک و مال کے قضیئے کی بناء پر نہ تھی بلکہ اس کا آغاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے سلسلے میں ہوا اور طرفین کی نیتوں میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ باہمی صلح صفائی سے معاملہ طے پا گیا تھا کہ سبائی سازشیوں نے رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے پر حملہ کر دیا اور پھر جو کچھ ہوا سو ہوا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے واقعہ کی نوعیت کو ٹھیک طور پر سمجھ لیا تھا۔ اسی لئے سوال کرنے والوں سے فرمایا کہ ان کا اور طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کا معاملہ سورۃ الحجر کی آیت ۴۷ کے مصداق ہے یہ قتل عمد نہ تھا طرفین جنت میں ایک دوسرے کے بالمقابل تختوں پر بیٹھیں گے اور ان کے درمیان کسی قسم کی کدورت نہ ہو گی۔ گویا قرآن مجید میں مومنین کے باہمی مناقشات و مشاجرات کی پیش بینی کی گئی اور مبنی بر اخلاص تنازعات کے جنتی انجام کی بھی خبر دے دی گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر پرویز تاریخی حوالے بھی دیتے ہیں اور ان پر اعتبار بھی نہیں کرتے۔ راقم کی رائے میں دنیا میں صحیح ترین تاریخ اگر کسی مذہب، قوم

[1] غلام احمد پرویز اور ادارہ طلوع اسلام کے ارکان اپنے اظہار خیالات کا ذریعہ تو اردو کو بناتے ہیں لیکن دستخط انگریزی میں کرتے ہیں اور اپنے ناموں کو ''ایم۔ ایم۔ خلیل'' وغیرہ لکھتے ہیں۔ مولف

یا ملک کی لکھی گئی ہے تو وہ تاریخ اسلام ہے۔ دوسرے مذہبوں، قوموں، ملکوں نے اپنے قصے کہانیاں اور اساطیری روایتوں کو اپنی تاریخ بنالیا ہے۔

بہرحال ہر دردمند اور مخلص مسلمان یہی سوچتا ہے کہ اے کاش! جنگ جمل اور پھر جنگ صفین کبھی نہ ہوئی ہوتیں۔ لیکن حقیقت کو کیسے جھٹلایا جائے۔ آج چودہ سو سال بعد صرف غلام احمد پرویز پر یہ نئی حقیقت منکشف ہوئی کہ جنگ جمل کی داستان کسی سازشی ٹولے نے وضع کر کے تاریخ اسلام میں داخل کر دی اور ساری دنیائے اسلام دھوکا کھا گئی۔[1] منقولہ بالا خط میں جس آیت قرآنی کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ایک مثالی صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی رحماءُ بینہم (سورہ فتح)۔ بے شک جب یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی تو صحابہ کرام کی یہی کیفیت تھی۔ اس وقت وہ واقعی کافروں پر بہت سخت اور آپس میں بہت رحیم وکریم تھے۔ لیکن قرآن حکیم میں باہمی مشاجرات کی ہمیشہ کے لئے سرے سے نفی تو نہیں کی گئی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ایک غیر حقیقی اور غیر قدرتی صورت حال ہوتی۔ رسول اکرم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ میری امت کا نیک نیتی پر مبنی اختلاف باعث رحمت ہے۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا اختلاف نیک نیتی پر مبنی نہ تھا؟ جیسا کہ تاریخ بیان کرتی ہے طرفین کا مقصد اصلاحِ حال تھا اور خون عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام۔

اگر غلام احمد پرویز کے طرز استدلال کا تتبع کیا جائے تو بے شمار دوسرے حالات و واقعات کو بھی بیک جنبش قلم مسترد کیا جا سکتا ہے جنگ کے عین وقوع کے دوران میں بھی اہم شخصیات میں خط و کتابت ہوئی جو محفوظ رہ گئی۔ دوسروں نے اپنے اعزہ واحباب کو خطوط لکھے اور مجمعوں کے سامنے تقریریں کیں اور پھر عرب کا حافظہ ہمیشہ سے تیز ومضبوط رہا ہے۔ محدثین کی تو خیر بات ہی کیا ہے، ہمارے ابتدائی مؤرخین کی دیانت کا بھی یہ عالم ہے کہ اگر ایک ہی واقعہ کے متعلق ان تک مختلف روایات پہنچتی ہیں تو وہ بھی راوی کے حوالے سے بلاکم وکاست بیان کر دی ہیں۔ انہوں نے آج کل کے مؤرخین اور صحافیوں کا طرز عمل اختیار نہیں کیا کہ اپنے نقطہ نظر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کریں یا سرے سے غائب کر دیں۔ انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس تھا اور خوف خدا بھی۔ بہت سوں نے اپنی تاریخ کا کبھی رطب و یابس پہنچانے کی کوشش کی۔ البتہ بعد کے بعض مؤرخوں میں کہیں کہیں فرقہ وارانہ تعصب کی جھلک ملتی ہے۔ جنگ جمل کسی کے ذہن کی اختراع نہیں۔

---

[1] اسی طرح چند سال پہلے ایک صاحب مسٹر شبیر نیازی نے روزنامہ ڈان (کراچی) میں لکھا تھا کہ موجودہ صحیح بخاری جعلی ہے اصل مسودہ گم ہو گیا تھا۔ جعلی نسخے کی تشہیر واشاعت ہوئی اور سادہ لوح امت مسلمہ نے اسے قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب تسلیم کر لیا۔ گویا مسلمان حدیث کے بارے میں ہی نہیں اپنی تاریخ کے بارے میں بھی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ مؤلف

اُمت مسلمہ کے اتحاد کے تابوت میں آخری کیل

جنگ صفین (ذی الحجہ ۳۶ھ)

جنگ جمل سے فراغت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ مملکت کے نظم ونسق کی درستی میں لگ گئے اور اپنے اعتماد کے عامل مقرر کئے۔ نیز اپنے لشکر کو قدرے آرام کرنے اور اپنا اسلحہ اور ساز وسامان درست کرنے کا وقت دیا۔ پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ کی طرف توجہ کی۔ موخر الذکر جنگ جمل کے دوران میں حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور اپنی تیاریاں بھی کرتے رہے تھے۔ جنگ جمل کے بعد مروان اور دوسرے بنوامیہ بھاگ کر دمشق پہنچ گئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حتی الوسع جنگ اور مسلمانوں کی خونریزی سے بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر اتمام حجت کے لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بیعت کی دعوت دی اور قبیلہ بجیلہ کے سردار مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کو خط دے کر دمشق بھیجا۔ مضمون حسب ذیل تھا:

> ''جن لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، انہوں نے میری بیعت کر لی ہے۔ اس کے بعد کسی کے لئے چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ خلیفہ کے انتخاب کا حق مہاجرین وانصار کو ہے۔ ان کے اتفاق کے بعد جو شخص بیعت سے گریز کرے گا، اس سے بزور لی جائے گی۔ مہاجرین وانصار کی طرح تم بھی بیعت کرلو، عافیت وسلامتی اسی میں ہے ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ قاتلین عثمان کو بہت آڑ بنا چکے۔ بیعت کے بعد باقاعدہ مقدمہ پیش کرو۔ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اس کا فیصلہ کروں گا۔''[1]

خط کا یہ مضمون چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ اس کا لکھنے والا اپنے ارادے کا پکا ہے اور کسی قسم کی ڈپلومیسی پر یقین نہیں رکھتا جبکہ ان کا سابقہ ایک بے حد منجھے ہوئے ڈپلومیٹ اور سیاستدان سے تھا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مصلحتاً کافی دنوں تک حضرت جریر بجلی رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس ٹھہرائے رکھا اور کوئی جواب نہیں دیا تاوقتیکہ مصر کے فاتح اور سابق گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ان کے پاس پہنچ گئے۔ عمرو رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا کہ ''مسلمان کبھی آپ کو علی رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں سمجھیں گے کیونکہ انہیں آپ کے مقابلے میں سبقت فی الاسلام اور قرابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کامیابی کی صورت میں مجھے مصر کی حکومت دینے کا تحریری وعدہ کریں تو میں علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آپ کی مدد کروں گا۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے سودا بازی کر لی۔ اب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی تمام تدبیر وسیاست حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پلڑے میں پڑ گئی۔ عمرو رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے نہ سودا بازی کریں گے نہ انہیں مصر کی حکومت دیں گے۔ اس لئے انہوں نے اپنے

---

[1] اخبار الطوال (ابوحنیفہ دینوری) تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین ندوی، نہج البلاغہ۔ طبری نے بھی مختصراً یہ مضمون بیان کیا ہے۔ مؤلف
اس خط میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی بیعت کی نوعیت اور کیفیت بھی ایک دفعہ پھر بیان کر دی ہے۔ مؤلف

دنیاوی مفاد کی خاطر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے کو ترجیح دی۔ وہ ابتدا ہی سے جاہ پسند واقع ہوئے تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں اوران کے بیٹوں کو اپنے لشکر کی علم برداری اور پراپیگنڈہ کی مہم سپرد کر دی۔

جریر رضی اللہ عنہ کا مشن ناکام

دمشق میں قیام کے دوران میں حضرت جریر بجلی رضی اللہ عنہ شام کے بااثر افراد سے ملے۔ ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پوزیشن واضح کی اور انہیں یقین دلایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ لوگ ان سے متاثر بھی ہوئے۔ اس سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو تشویش پیدا ہوئی مگر انہوں نے جریر رضی اللہ عنہ کو متاثر اور مرعوب کرنے کے لئے اپنا طریق کار جاری رکھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون آلود کرتہ اوران کی زوجہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں دمشق کی جامع مسجد کے منبر پر برابر ایک سال تک نمائش کے لئے رکھی رہیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر دھاڑیں مار کر روتے تھے۔ انہوں نے قسمیں کھائیں کہ جب تک قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل نہ کر دیں تب تک نہ اپنی بیویوں کے پاس جائیں گے نہ سوائے حالت احتلام کے غسل کریں گے اور نہ بستروں پر سوئیں گے۔ جریر بجلی رضی اللہ عنہ نے یہ منظر بار بار دیکھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بعض بہت بااثر سرداروں کے ذریعے سارے شام میں بڑی ہوشیاری سے پراپیگنڈہ کر کے یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کر دی کہ علی رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے خلافت پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ صرف شام باقی رہ گیا ہے اور اب وہ شام اور اہل شام کو تلوار کے زور سے اپنا اطاعت گزار بنانے کے لئے حملہ کی تیاری کر رہے ہیں۔ امرا اور رؤسا، اہل فوج اور عوام سب کے جذبات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑک اٹھے۔ اہم شخصیتوں کو انعام واکرام بھی دیئے گئے۔ یہ سب کچھ دکھانے اور سنوانے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاصد حضرت جریر بجلی رضی اللہ عنہ کو واپس بھیج دیا۔ ان کی سفارت ناکام رہی۔ انہوں نے واپس جا کر تمام صورتِ حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گوش گزار کر دی۔ اس پر مالک اشتر نخعی نے جریر رضی اللہ عنہ پر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مل جانے کا الزام لگایا، انہیں برا بھلا کہا اور قتل کی دھمکی دی جریر رضی اللہ عنہ بگڑ کر قرقیسیا چلے گئے۔ وہ ایک بڑے اور طاقتور قبیلے کے سردار تھے۔ ان کی علیحدگی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قوت کو ضعف پہنچا۔ اشتر نخعی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں شامل تھا۔ اپنے مفاد اور جان بچانے کی خاطر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے پر مجبور ہوا۔ کئی مواقع پر اس کے غلط مشورے، اس کی زبان کی تیزی اور شمشیر آمادگی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بہت مہنگی پڑی۔ ابن سبا اور وہ جنگ جمل کے ذمہ دار بھی تھے۔

مصالحت کی کوششیں

جریر بجلی رضی اللہ عنہ کی ناکام واپسی کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سمجھ لیا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ کے سوا کوئی راستہ کھلا نہیں رہ گیا۔ چنانچہ آپ نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بعض مخلص مسلمانوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے باہمی کشت وخون کی چکی پھر چلنے کو ہے۔ درآنحالیکہ ابھی جنگ جمل کے ہزارہا مقتولوں کا خون خشک نہیں ہوا، بے سہارا بیواؤں اور یتیموں کی آہ وفغاں جاری ہے اور مملکت کا نظم ونسق ابتری کا شکار ہو رہا ہے۔ ایک بزرگ

ابو مسلم خولانی اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ رضا کارانہ طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت واضح کی اور باہمی جنگ وفساد کے تباہ کن نتائج کی طرف توجہ دلا کر انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ سے باز رکھنے اور ان کی بیعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں حسب ذیل خط علی رضی اللہ عنہ کے نام لکھ کر دے دیا:

''خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ تمہارے یہاں تمہاری موجودگی میں قتل کیے گئے۔ تم ان کے گھر کا شوروغل سنتے رہے اور اپنے قول وعمل سے مفسدین کو نہ روکا۔ میں سچی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم سچائی اور اخلاص سے ان کی مدافعت کرتے تو ہم میں سے کوئی بھی تمہاری مخالفت نہ کرتا۔ دوسرا الزام تم پر یہ ہے کہ تم نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو پناہ دی اور وہ اس وقت تمہارے قوت بازو، اعوان وانصار اور مشیر کار ہیں۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے برأت ظاہر کرتے ہو۔ اگر تم اس میں سچے ہو تو قاتلوں کو قصاص کے لئے ہمارے حوالے کر دو۔ اگر ایسا نہیں کرتے تو ہمارے پاس تمہارے لئے صرف تلوار ہے۔ خدا کی قسم! ہم لوگ بحر و بر سے عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو تلاش کر کے قتل کریں گے یا خود جانیں دے دیں گے۔''[1]

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ خط لے کر ابو مسلم خولانی کوفہ گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا تو دس ہزار مسلح آدمی اٹھ کر نعرے لگانے لگے کہ ''ہم سب عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل ہیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو مسلم سے فرمایا کہ ''تم ان لوگوں کو دیکھ رہے ہو اور ان کی باتیں سن رہے ہو۔ میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کی مگر قاتلوں پر قابو پانا میرے لئے ممکن نہ ہو سکا۔'' گویا آپ نے قصاص سے ہاتھ دھو لئے اور سازشی گروہ اور اس کے حامیوں سے مجبوری کی مصالحت کر لی۔ بہر حال آپ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خط کا حسب ذیل جواب لکھ کر ابو مسلم خولانی کے حوالے کیا:

''عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے کسی کو ان کے خلاف نہیں بھڑکایا۔ البتہ جب فساد و ہنگامہ شدت اختیار کر گیا تو میں نے خانہ نشینی اختیار کر لی۔ تم عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو حوالہ کرنے کے مطالبہ کو اپنے لئے ایک بہانہ اور مقصد برآری کا ذریعہ بنانا چاہتے ہو۔ اگر تم شر انگیزی کی روش سے باز نہ آئے تو جو سلوک باغیوں سے کیا جاتا ہے وہی تمہارے ساتھ بھی کیا جائے گا۔''

سفارتوں کے مزید تبادلے بھی ہوئے لیکن خط و کتابت اور زبانی گفتگوؤں میں طرفین نے امن وصلح کی بجائے جارحانہ اور الزامی رویہ ہی اختیار کئے رکھا اور کوئی مفید نتیجہ نہ نکل سکا۔

آمنا سامنا...... جنگ صفین

آخری چارۂ کار کے طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ذی الحجہ ۳۶ ہجری میں اسی ہزار کے لشکر جرار کے

---

[1] تحکیم کے واقعہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے مطالبہ کے بارے میں خاموشی سادھ لی۔ مؤلف

ساتھ شام کی طرف پیش قدمی کی۔ان کے لشکر میں عام مسلمانوں کے علاوہ ستر بدری صحابہ تھے۔سات سو بیعت رضوان والے صحابہ اور چار سو عام مہاجرین وانصار صحابہ تھے یعنی تقریباً بارہ سو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے لشکر میں شامل تھے۔دونوں فوجوں کا صفین کے مقام پر جو دریائے فرات کے مغربی جانب الرقہ کے قریب واقع تھا، آمنا سامنا ہوا۔حضرت معاویہ کی فوج نے پہلے پہنچ کر دریائے فرات کے گھاٹ پر قبضہ کرلیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کو پانی لینے سے روک دیا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے ان کے لشکر نے لڑ کر مخالف لشکر کو وہاں سے ہٹا دیا لیکن انہیں اپنی ضرورت کے لئے پانی لینے سے نہیں روکا۔اس کا مخالف لشکر پر خوشگوار اثر پڑا۔فریقین ایک دوسرے کے کیمپ میں بے خوف وخطر آنے جانے اور باہم ملنے جلنے لگے جیسے سبھی چاہتے ہوں کہ باہم صلح صفائی ہو جائے حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ان کی دلی خواہش تھی کہ جنگ وخونریزی کی نوبت نہ آئے۔ایک بار پھر سفارتوں کا تبادلہ ہوا مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی ضد پر قائم رہے۔طرفین سے انفرادی مبارزت طلبی ہونے لگی پھر محدود پیمانے پر چھوٹے چھوٹے دستوں کی تقریباً روزانہ جھڑپوں کا آغاز ہوا۔محرم ۳۷ھ چونکہ حرمت کا مہینہ تھا اس لئے باہمی رضامندی سے جنگی جھڑپیں موقوف کردی گئیں۔اس دوران میں ملت کے خیر خواہ بزرگ صحابہ حضرت ابودرداء انصاری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ اپنے طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور انہیں جنگ سے باز رہنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلینے کا مشورہ دیا۔ان کا جواب یہ تھا کہ ''اگر علی رضی اللہ عنہ عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کردیں تو میں سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا۔''

دونوں بزرگوں نے جا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ بات بتائی۔یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے بیس ہزار آدمی اٹھ کھڑے ہوئے اور نعرہ لگایا کہ ہم سب عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل ہیں۔یہ دیکھ کر حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ ساحلی علاقے کی طرف چلے گئے اور مسلمانوں کی باہمی جنگ سے کنارہ کش ہوگئے۔امن وصلح کی آخری مخلصانہ کوشش بھی ناکام ہوگئی۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ابتدائی حملہ آوروں اور قتل کے ذمہ داروں کی تعداد اڑھائی ہزار سے بڑھ کر ابن سبا اور مالک اشتر نخعی وغیرہ سازشی سرغنوں کی فریب کارانہ کوششوں سے اب بیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ان پر قابو پانا اور قتل کے اصل ملزموں کو چھانٹ کر کیفر کردار کو پہنچانا مشکل ہوگیا۔فوج پر ان کا کنٹرول نہ رہا۔فوج ان کے حکم پر چلنے کی بجائے ان پر حکم چلانے لگی جیسا کہ آئندہ واقعات سے ظاہر ہوگا۔

جنگ زوروں پر

صفر کے مہینے میں جنگ اپنی تمام شدت، ہولناکی اور تباہی کے ساتھ شروع ہوگئی اور کئی مہینوں تک جاری رہی۔تفصیل سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کو ہدائت کردی تھی کہ

۱- اپنی طرف سے جنگ کا آغاز نہ کرنا

۲- کسی بھاگنے والے مخالف کو قتل نہ کرنا

۳- کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا

۴- کسی کو برہنہ نہ کرنا

۵- کسی مقتول کی لاش کا مثلہ نہ کرنا

۶- کسی کے گھر میں نہ گھسنا، ان کے مال نہ لوٹنا اور عورتیں خواہ تمہیں گالیاں ہی کیوں نہ دیں، ان پر دست درازی نہ کرنا۔

تقریباً نوے معرکے ہوئے۔ فریقین کی ستر ہزار قیمتی جانیں ضائع ہوئیں[1] ایک مغربی مؤرخ نے لکھا ہے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں جتنے مسلمان باہمی آویزش میں مارے گئے وہ ساری دنیا کو فتح کرنے کے لئے کافی تھے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ان جنگوں اور پھر ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور خوارج کے درمیان ہونے والی جنگوں نے اسلامی فتوحات کے سیلاب کے سامنے بند باندھ دیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پر امن حالات میسر آتے تو ممکن تھا کہ ایرانی سلطنت کی طرح بازنطینی سلطنت بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی بلکہ اس سے آگے مشرقی اور جنوبی یورپ کے ممالک نیز سپین اور پرتگال پر بھی اسلامی علم لہرانے لگتا، دوسری طرف چین اور ہندوستان کو بھی مسلمانوں کے گھوڑے روند ڈالتے۔ بہر حال جنگ صفین کے نتیجے میں ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہو گئے۔ ساری مملکت اسلامیہ پر ہلاکت و ویرانی کے آسیب نے اپنے سائے پھیلا دیئے۔

من از بیگا نگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہر چہ کرد آں آشنا کرد!

(مجھے بیگانوں سے کوئی شکایت نہیں میں تو دوستوں کا زخم خوردہ ہوں)

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی شہادت

نوے سالہ بزرگ صحابی حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل تھے ان کے متعلق ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) نے فرمایا تھا کہ ''اے عمار! تجھے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔'' بہت سے صحابہ نے یہ پیش گوئی سن رکھی تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی جنگ جمل سے علیحدگی کی ایک یہ بھی تھی کہ انہوں نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود پایا تھا اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے ان پر حملہ بھی کیا لیکن اپنا دفاع کرنے کے سوا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا ورنہ وہ عمار رضی اللہ عنہ کے لئے کافی تھے۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے لڑے اور شہید ہو گئے۔ اس واقعہ سے لوگوں پر ظاہر ہو گیا کہ وہ باغی گروہ جس کی طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی میں اشارہ ہے وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا گروہ ہے اور حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہے۔

---

[1] تقریباً پینتالیس ہزار شامی اور پچیس ہزار عراقی۔ مؤلف

لیلۃ الحریر اور تحکیم کی پیشکش

جنگ قادسیہ کے آخری معرکے کا نام بھی تاریخ میں لیلۃ الحریر آیا ہے کیونکہ دن رات شدید اور لگا تار جنگ ہوئی تھی حتیٰ کہ دشمن کو شکست فاش ہوئی۔

جنگ صفین کے آخری معرکے کا نام بھی مؤرخوں نے لیلۃ الحریر لکھا ہے کیونکہ اس میں بھی لگا تار دن رات سخت خونریز جنگ ہوئی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ قریب تھا کہ شامی فوج شکست کھا کر میدان چھوڑ دے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مشورے سے نیزوں پر قرآن اٹھا لئے۔ اور کہا کہ ''آؤ ہم تم قرآن کو حکم مان لیں۔ قرآن کا فیصلہ ہم سب کے لئے قابل قبول ہوگا۔'' یہ محض ایک جنگی چال تھی۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ کچھ اس کے حق میں ہوں گے، کچھ اس کے مخالف اور تفرقہ برپا ہو جائے گا۔ اگر سب مان بھی گئے تو معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کو اپنی حالت درست اور مستحکم کرنے اور نئی جنگی حکمت عملی وضع کرنے کی مہلت مل جائے گی۔ چنانچہ نتیجہ ان کی حسب توقع نکلا عراقیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لاکھ سمجھایا کہ یہ دشمن کی چال ہے لیکن انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ انہوں نے ان الحکم الا للّٰہ (حکم اور فیصلہ اللہ ہی کا ہے) کا نعرہ بلند کیا اور حضرت علی کو تحکیم کی پیشکش قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لشکر فیصلہ کن فتح سے ہمکنار ہوتے ہوتے رہ گیا۔ لشکر علی رضی اللہ عنہ کی اس خودسرانہ اسپرٹ کے مقابلے میں معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر ان کا وفادار اور مطیع فرمان تھا اور انہیں اس پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بیس سال سے متواتر اہل شام پر حکمران چلے آ رہے تھے اور اہل فوج اور سرداروں کو انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تازہ تازہ خلافت یا حکمرانی حاصل ہوئی تھی اور وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرح جا و بیجا بیت المال سے دادو دہش کرنے کے قائل نہ تھے اور پھر یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا خفیہ پراپیگنڈہ اور روپیہ کا لالچ بھی لشکر علی رضی اللہ عنہ میں کام کر رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو عالم اسلام کی بہترین شخصیت تھے، اپنے سے کمتر شخص کے مقابلے میں سیاسی لحاظ سے ناکام ہو گئے۔ یہ بات بھی تھی کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں ہزاروں عراقی قتل ہو چکے تھے۔ یتیموں اور بیواؤں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ان کے بعض بااثر سرداروں نے محسوس کیا یا انہیں پراپیگنڈہ اور پیسہ کے ذریعے محسوس کرایا گیا کہ اگر جنگ جاری رہی تو عرب تباہ ہو جائے گا اور اس کی عظمت وحرمت حرف غلط کی طرح مٹ جائے گی۔ فارس کے دہقان ان کے بیوی بچوں کو پکڑ کر لے جائیں گے۔ ادھر اہل روم شامی مسلمانوں پر حملہ کر کے تباہی مچائیں گے اور ان کے اہل وعیال کو لونڈی غلام بنا لیں گے۔ یہ باتیں نیزوں پر قرآن بلند کرنے والے شامیوں نے بھی کہیں اور عراقیوں نے بھی ان کا وزن محسوس کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اہل شکر کو بہت سمجھایا کہ یہ محض ایک فریب ہے لیکن ان کے لشکر کے ایک گروہ نے کہا کہ ''ہم شامیوں کو اسی قرآن کا پابند کرنے کے لئے ہی لڑ رہے تھے۔ اب جبکہ وہ خود ہم کو اس کی طرف بلاتے ہیں تو ہم کیسے انکار کر سکتے ہیں؟'' ان لوگوں میں

سے بعض نے حضرت علی کو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر آپ نے قرآن کو حکم ماننے سے انکار کیا تو ہم آپ کو بھی عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا دیں گے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ بادل ناخواستہ جنگ بندی اور تحکیم کے لئے آمادہ ہو گئے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ جنگ بندی اور تحکیم کے لئے علوی نمائندہ کے انتخاب میں مالک اشتر اور اشعث کندی کی باہمی چشمک اور حسد کو بڑا دخل تھا جس میں اشعث کا پلہ بھاری رہا لیکن ان دونوں کی ذاتی کشمکش سے حضرت علی رضی اللہ عنہ جیتی ہوئی جنگ ہار گئے۔

معاہدۂ تحکیم

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دست راست عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو اپنی طرف سے نمائندہ اور حکم منتخب کیا اور اہل شام میں سے کسی نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو اپنا نمائندہ اور حکم مقرر کرنا چاہتے تھے۔ فریق مخالف کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا لیکن ان کی اپنی ہی فوج اس پر معترض ہوئی کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ تو آپ کے چچا کے بیٹے ہیں ان کا حکم مقرر کیا جانا ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ خود حکم ہوں۔ اس پر آپ نے اشتر نخعی کا نام تجویز کیا لیکن فوج کے بعض سرداروں نے اسے بھی مسترد کر دیا اور کہا کہ وہ تو آپ کا خاص آدمی ہے۔ جنگ کی آگ بھڑکانے اور ہمیں لڑانے مروانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ ہم ایک بالکل غیر جانبدار آدمی بطور حکم چاہتے ہیں اور وہ شخص کوفہ کے سابق گورنر ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف سے مطمئن نہ تھے اور ایسے اہم معاملے میں انہیں اعتماد کے قابل نہ سمجھتے تھے کیونکہ وہ اپنی گورنری کے زمانے میں کوفہ کے لوگوں کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین کرتے رہے تھے گورنری سے علیحدگی کے بعد وہ جنگ میں شریک نہیں ہوئے اور خانہ نشیں ہو گئے تھے۔ بہرحال اس معاملے میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل فوج کے سامنے ہتھیار ڈال کر ان کی مرضی اختیار کرنا پڑی اور چاروناچار حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو ان کے مقام عزلت سے بلا کر اپنا نمائندہ اور حکم مقرر کرنا پڑا۔ عجیب بات ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکریوں نے ان کی مرضی کے حکم پر تو اعتراض کیا لیکن حضرت معاویہ کی مرضی کے حکم عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر کوئی اعتراض نہ کیا حالانکہ وہ جنگ کی ابتدا سے معاویہ رضی اللہ عنہ کے سرگرم رفیق کار، مشیر اور معاون رہے تھے۔ اور کسی لحاظ سے بھی غیر جانبدار نہ تھے بلکہ تحکیم کا شوشہ ہی انہوں نے چھوڑا تھا۔

۱۳ صفر ۳۷ ہجری کو فریقین کے مابین ایک طویل معاہدۂ تحکیم لکھا گیا جس کا خلاصہ یہ تھا:

"دو حکمین کسی فریق کی رورعایت کے بغیر امت کی خیر خواہی کا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب اللہ میں جو کچھ پائیں اس پر عمل کریں گے اور جو کچھ کتاب اللہ میں نہ پائیں اس کے بارے میں اس سنت پر عمل پیرا ہوں گے جو عدل و انصاف پر مبنی ہوگی اور جس پر سب کو اتفاق ہوگا اور کسی کو اس سے اختلاف نہ ہو گا۔ ان کا فیصلہ فریقین کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ اور جو فریق ماننے سے انکار کرے گا حکم اور عامتہ المسلمین اس کے خلاف دوسرے فریق کی مدد کریں گے۔ لیکن اگر یہ فیصلہ کتاب وسنت کے

خلاف ہو یا اس میں کسی فریق کی جنبہ داری پائی جائے تو اس کی پابندی ضروری نہ ہوگی۔ فیصلہ کے اعلان تک جنگ ملتوی رہے گی۔ اور کامل امن وامان قائم رکھا جائے گا۔ دونوں حکموں کے جان و مال محفوظ ہوں گے۔ رمضان تک فیصلہ ہو جانا چاہئے۔ البتہ اگر حکمین مدت کو بڑھانا چاہیں تو باہمی رضامندی سے بڑھا سکتے ہیں۔"[1]

معاہدہ پر فریقین کے سرکردہ لوگوں نے دستخط کر دیئے لیکن اشتر نخعی نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ شام و عراق کی سرحد پر دومۃ الجندل کا مقام فیصلہ کے اعلان کے لئے مقرر ہوا۔ معاہدہ کا مضمون دونوں فوجوں میں سنا دیا گیا۔ اسے سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کا ایک حصہ خلاف ہو گیا اور جنگ کرنے کی رائے دی۔ اور کہا اللہ کے احکام میں انسان کے حکم کا کیا دخل؟ اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں ہو سکتا ان الحکم الا للہ۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ میں خود اس امر تحکیم کے خلاف تھا۔ تم لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا۔ اب صلح کے بعد جنگ کرنا اور اقرار کرنے کے بعد پھر جانا مناسب نہیں۔ لیکن یہ گروہ اپنی رائے پر اڑا رہا۔ آخر علوی لشکر سے علیحدہ ہو گیا اور خوارج کے نام سے مشہور ہوا اسلام میں یہ پہلا فرقہ پیدا ہوا اس کا مزید ذکر آگے آئے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے۔ انہوں نے اپنے متبعین پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی بجائے ان کی اکثریت کی مرضی پر چلنا قبول کر لیا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان لوگوں کی مرضی غلط ہے۔

فیصلہ تحکیم

معاہدۂ تحکیم کے چھ ماہ بعد دومۃ الجندل کے مضافات میں اذرح کے مقام پر دونوں حکم حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جمع ہوئے۔ فریقین کے چار چار سو آدمی بھی پہنچ گئے۔ چونکہ یہ معاملہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا اس لئے بہت سے سرکردہ صحابہ بھی جو مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں سے علیحدہ رہے تھے، حکمین کا فیصلہ سننے کے لئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ، محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ، مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ حضرت احنف بن قیس اور مالک اشتر نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ جانا چاہا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکریوں نے مخالفت کی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے تاکیداً کہا کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بہت ہوشیار اور زیرک آدمی ہیں۔ جو باہمی فیصلہ ہو آپ انہی کو اس کا اعلان کرنے دینا۔ خود پہل نہ کرنا مبادا عمرو رضی اللہ عنہ آپ کو دھوکا دے جائیں، لیکن جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہوا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس مشورے کی پروا نہ کی۔ حکمین کو اپنے اپنے موکلوں کی طرف سے ہدایات کے خطوط آتے تھے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے شامی ہمراہیوں نے ان سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خطوط، پیغامات، ہدایات وغیرہ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا۔ لیکن ابوموسیٰ کے عراقی ساتھی ان سے کرید کرید کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیغامات، ہدایات کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان

---

[1] خلاصہ از تاریخ طبری، نیز تاریخ ابن خلدون حصہ اول

میں سے کم سے کم کچھ لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے درپردہ مل گئے تھے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سادہ لوح اور نیک نیت انسان تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے احکام و ہدایات کو پوشیدہ نہ رکھ سکے اور فریق مخالف بھی ان سے واقف ہو گیا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا تدبیر و سیاست اور فہم و فراست میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ طول طویل مذاکرات ہوئے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی پرزور وکالت کی اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو لالچ بھی دیا کہ اگر تم میری رائے سے اتفاق کرو اور معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کی امارت پر فائز کر دو تو جس شہر کی حکومت تم پسند کرو گے تمہیں دے دی جائے گی۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''عمرو رضی اللہ عنہ! اللہ سے ڈرو۔ دینداری، تقویٰ اور ایمانداری کے لحاظ سے بھلا معاویہ رضی اللہ عنہ کا علی رضی اللہ عنہ سے کیا مقابلہ؟ اگر شرافت قریش کا پاس کیا جائے تو بھی علی رضی اللہ عنہ امارت کے زیادہ مستحق ہیں۔ میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ مہاجرین سابقین کو چھوڑ کر امارت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دی جائے اور تمہارا یہ کہنا کہ اگر میں معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر بناؤں گا تو مجھے حکومت دی جائے گی، تو اس کی نسبت میں یہ کہتا ہوں کہ واللہ! اگر معاویہ رضی اللہ عنہ مجھ کو اپنی کل حکومت و سلطنت دینے کو کہے تو بھی میں اس کو ہرگز خلیفہ نہیں بناؤں گا۔ میں اللہ تعالیٰ کے کاموں میں رشوت نہیں لیتا۔ اے ابن العاص! عرب نے جدال و قتال کے بعد اپنی قسمت کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں دیا ہے۔ اس کو پھر فتنے میں نہ ڈالو'' غرضیکہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے پر عمرو رضی اللہ عنہ سے متفق نہ ہوئے۔ ادھر سے مایوس ہو کر عمرو رضی اللہ عنہ انہیں اس بات پر لے آئے کہ علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو معزول کر کے مسلمانوں کو نئے سرے سے خلیفہ کے انتخاب کا حق دیا جائے۔ آپس میں یہ بات طے پا گئی اور یہ ایسی بات تھی جس کا حکمین کو اختیار نہیں دیا گیا تھا۔

فیصلہ کا اعلان

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا کہ چونکہ آپ مجھ سے ہر لحاظ سے سینئر اور افضل ہیں اس لئے آپ فیصلہ سنائیں آپ کے ہوتے ہوئے مجھے یہ حق نہیں پہنچتا۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو یا تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی وارننگ یاد نہ رہی یا وہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے خوشامدانہ اور نیازمندانہ رویہ سے دھوکا کھا گئے۔ انہوں نے متفق علیہ فیصلہ پر اعتماد کرتے ہوئے اعلان کیا:

''لوگو! ہم نے اس مسئلہ پر غور کیا۔ امت کے اتفاق و اتحاد اور اصلاح کی صورت صرف یہی نظر آتی ہے کہ علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو معزول کر کے خلافت کو شوریٰ پر چھوڑ دیا جائے۔ عام مسلمان جسے اہل سمجھیں اسے منتخب کر لیں۔ اس لئے میں علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو معزول کرتا ہوں۔ آئندہ تم جسے چاہو اپنا خلیفہ چن لو۔''

ان کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اپنا فیصلہ سنایا:

''لوگو! آپ نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ سن لیا۔ انہوں نے اپنے آدمی (علی رضی اللہ عنہ) کو معزول کر دیا۔ میں بھی اسے معزول کرتا ہوں۔ لیکن اپنے آدمی معاویہ رضی اللہ عنہ کو برقرار رکھتا ہوں۔ وہ امیر المومنین

عثمان رضی اللہ عنہ کے ولی اور ان کے قصاص کے طالب ہیں۔ اس لئے ان کی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔''

عمرو رضی اللہ عنہ کا یہ اعلان سن کر ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ چلائے کہ ''خدا تمہیں توفیق نہ دے یہ تم نے کیا کیا؟ تم نے دھوکا دیا اور بدعہدی کی۔'' لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ ایک عظیم فریب اور وعدہ خلافی کا شکار ہو گئے۔ دراصل انہیں ابتدا ہی سے ان کے مدمقابل نے کارِ مفوضہ سے ہٹا کر غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ اور پھر یہ کہ جس طرح معاہدہ تحریری تھا فیصلہ بھی تحریری ہونا چاہئے تھا اب کیا ہو سکتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامیوں کو سخت طیش آیا۔ انہوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حامیوں پر حملہ کر دیا۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر کوڑے برسائے لیکن بے سود۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو سخت افسوس ہوا۔ انہوں نے کہا ''اے ابوموسیٰ! تمہارے حال پر افسوس ہے۔ تم عمرو رضی اللہ عنہ کی چالوں کے مقابلے میں بڑے کمزور نکلے۔'' ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''اب میں کیا کروں۔ اس شخص نے مجھ سے ایک بات پر اتفاق کیا اور پھر اس سے دامن چھڑا لیا۔'' حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اس سے پہلے مر گئے ہوتے تو ان کے حق میں زیادہ اچھا تھا۔'' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ''دیکھو اس امت کا حال کہاں جا پہنچا ہے۔ اس کا مستقبل دو ایسے آدمیوں کے سپرد کر دیا گیا جن میں سے ایک کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے اور دوسرا ضعیف ہے۔'' حاضرین کو یقین تھا کہ عمرو بن العاص نے جو کچھ کیا وہ طے شدہ بات کے بالکل خلاف تھا۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ شرم اور پچھتاوے کے بوجھ تلے دبے ہوئے چپکے سے مکہ چلے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منہ بھی نہ دکھا سکے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ حکمین کو فیصلہ تو یہ کرنا تھا کہ از روئے قرآن و سنت علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ میں سے حق پر کون ہے؟ لیکن وہ اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معزولی پر اتر آئے۔ تاہم اگر وہ اپنے متفقہ فیصلہ پر بھی عمل کرتے اور خلیفہ کا انتخاب دوبارہ ہوتا تو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کامیابی یقینی تھی مگر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی چال نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلا انتخاب ہی کم سے کم شامیوں کی نظر میں خلیفہ بنا دیا۔ صورت حال خراب سے خراب تر ہو گئی۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

''دومۃ الجندل میں جب دونوں حکم مل کر بیٹھے تو سرے سے یہ امر زیر بحث ہی نہیں آیا کہ قرآن و سنت کی رو سے فیصلہ کیا ہو سکتا ہے قرآن میں صاف حکم موجود تھا کہ مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کی صحیح صورت طائفہ باغیہ کو راہ راست پر آنے کے لئے مجبور کرنا ہے[1]۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نص صریح نے متعین کر دیا تھا کہ اس قضیئے

---

[1] دیکھئے سورہ حجرات آیت ۹...... ''پھر اگر ان متحارب، مخالف فریقین میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہو تو زیادتی کرنے والی جماعت سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔''

میں طائفہ باغیہ کون سا ہے۔ ایک امیر کی امارت قائم ہو جانے کے بعد اس کی اطاعت نہ کرنے والے کے بارے میں واضح احادیث موجود تھیں۔ خون کے دعویٰ کا بھی شریعت میں صاف ضابطہ موجود تھا جس کی رو سے دیکھا جا سکتا تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق اپنا دعویٰ ٹھیک طریقہ سے اٹھایا ہے یا غلط طریقہ سے اور معاہدہ تحکیم کی رو سے دونوں صاحبوں کے سپرد یہ کام سرے سے کیا ہی نہیں گیا تھا کہ وہ خلافت کے مسئلے کا جو فیصلہ بطور خود مناسب سمجھیں کر دیں۔ بلکہ ان کے حوالے فریقین کا پورا جھگڑا اس صراحت کے ساتھ کیا گیا تھا کہ ان کے درمیان اولاً کتاب اللہ اور پھر سنت عادلہ کے مطابق تصفیہ کریں گے۔ مگر جب دونوں بزرگوں نے بات شروع کی تو ان سارے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے یہ بحث شروع کر دی کہ خلافت کا مسئلہ اب کیسے طے کیا جائے۔"[1]

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"اس بحث سے قطع نظر کہ دونوں حکموں میں سے ایک نے کیا کیا اور دوسرے نے کیا، خود یہ پوری کارروائی جو دومۃ الجندل میں ہوئی، معاہدۂ تحکیم کے بالکل خلاف اور اس کے حدود سے قطعی متجاوز تھی۔ ان حضرات نے غلط طور پر یہ فرض کر لیا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے کے مجاز ہیں حالانکہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد باقاعدہ آئینی طریقے سے خلیفہ منتخب ہوئے تھے اور معاہدۂ تحکیم کے کسی لفظ سے یہ اختیار ان دونوں صاحبوں کو نہیں سونپا گیا تھا کہ وہ ان کو معزول کر دیں۔ پھر انہوں نے یہ بھی غلط فرض کر لیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے مقابلے میں خلافت کا دعویٰ لے کر اٹھے ہیں حالانکہ اس وقت تک وہ صرف خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے مدعی تھے۔ نہ کہ منصب خلافت کے۔ مزید برآں ان کا یہ مفروضہ بھی غلط تھا کہ وہ خلافت کے مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لئے حکم بنائے گئے ہیں۔ معاہدۂ تحکیم میں اس مفروضے کے لئے کوئی بنیاد موجود نہ تھی۔ اسی بناء پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے فیصلے کو رد کر دیا اور اپنی جماعت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"سنو یہ دونوں صاحب جنہیں تم لوگوں نے حکم مقرر کیا تھا انہوں نے قرآن کے حکم کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور خدا کی ہدائت کے بغیر ان میں سے ہر ایک نے اپنے خیالات کی پیروی کی اور ایسا فیصلہ دیا جو کسی واضح حجت اور سنت ماضیہ پر مبنی نہیں ہے اور اس فیصلہ میں دونوں نے اختلاف کیا ہے اور دونوں ہی کسی صحیح فیصلے پر نہیں پہنچے ہیں۔"[2]

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی تدبیر و سیاست اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی سادہ لوحی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی توقعات سے بڑھ کر ان کے لئے دعویٰ خلافت کی راہ بھی کھل گئی۔ اہل شام اور ان کے دوسرے طرف داروں نے

[1] خلافت وملوکیت صفحہ ۱۴۱

[2] خلافت وملوکیت صفحہ ۱۴۴

انہیں با قاعدہ خلیفہ تسلیم کر لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ سیاسی حل کی بجائے وہ پھر جنگی حل یعنی معاوضہ رضی اللہ عنہ سے بزور بیعت حاصل کرنے کی طرف آ گئے اور جنگی تیاریاں کرنے لگے۔

تحکیم کے بعد

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عراقی ساتھیوں میں پہلا سا اتحاد اور جوش و خروش باقی نہیں رہا تھا ان پر تھکن، بیزاری، بیدلی اور عدم دلچسپی کی کیفیت طاری تھی۔ ان کے اپنے نقصانات کے علاوہ مخالفانہ پراپیگنڈہ اور بعض با اثر افراد کی درپردہ وفاداریاں خریدنے کے لئے روپیہ کا استعمال بھی اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ عراقیوں کی صفوں میں انتشار کے آثار ہویدا تھے۔ ان کی تیاریوں کی رفتار خاصی سست تھی۔ جنگ صفین کے موقع پر اسی ہزار افراد پر مشتمل لشکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا تھا۔ اتنا بڑا لشکر پھر کبھی ان کے جھنڈے تلے جمع نہ ہو سکا۔ عمارہ بن ربیعہ نے کہا کہ جب شیعان علی رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ میدانِ صفین میں گئے تھے تو باہم ایک دوسرے کے دوست تھے اور جب صفین سے لوٹ کر آئے تو ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ تحکیم کے واقعہ کے بعد یہ سب ایک دوسرے کی راہ روکتے، آپس میں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے اور کوڑے مارتے (طبری) بہر حال تگ و دو کے بعد پینسٹھ ہزار کا لشکر جمع ہو گیا۔ لیکن اس اثنا میں حالات نے ایک اور ناخوشگوار بلکہ خطرناک صورت اختیار کر لی۔ یعنی آپ کے خلاف خوارج کا گروہ اٹھ کھڑا ہوا اور ان سے پہلے نپٹنا ضروری ہو گیا۔ یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ خلیفہ بننے کے بعد جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلی بار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف شام کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتے تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے خروج کی وجہ سے شام کا ارادہ ترک کر کے انہیں بصرہ کی طرف بڑھنا اور جنگ جمل میں الجھنا پڑا۔ پھر جنگ صفین میں جب فتح نظروں کے سامنے تھی، تحکیم کا شوشہ چھیڑ دیا گیا اور کئی ماہ کے تعطل کے بعد فیصلہ آپ کے خلاف کیا گیا۔ واقعہ تحکیم کے بعد پھر شام کا عزم کیا تو آپ کی اپنی ہی فوج کا ایک حصہ خوارج کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور بالآخر انہی خوارج میں سے ایک نامراد کے ہاتھوں آپ کو جام شہادت پینا پڑا۔

خوارج اور جنگ نہرواں

اگرچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تحکیم کے خلاف تھے لیکن اپنی فوج کے ایک با اثر اور طاقتور عنصر کی ضد اور دباؤ سے اس پر مجبوراً رضامند ہو گئے تھے۔ جب معاہدہ لکھا جا چکا تو آپ کی فوج کی ایک جماعت اس کی مخالفت میں سرگرم ہو گئی۔ اس نے تحکیم کو کفر قرار دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر زور دیا کہ اپنے گناہ سے توبہ کریں، معاہدہ تحکیم کو منسوخ کریں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ کریں حتیٰ کہ وہ بیعت کر کے مطیع و منقاد ہو جائیں۔ ان کا نعرہ تھا لاحکم الا اللہ (اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں) حضرت علی نے جواب دیا کہ ''میں بھی یہ چاہتا تھا لیکن تمہیں لوگوں نے میری مخالفت کی اور مجھے معاہدہ پر مجبور کر دیا۔ اب میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔'' خوارج نے آپ کو دھمکی دی کہ ''اگر آپ آدمیوں کے حکم کو نہ چھوڑیں گے اور توبہ نہ کریں گے تو ہم آپ سے محض اللہ کی خوشنودی

حاصل کرنے کی خاطر جنگ کریں گے۔'' مختصر یہ کہ علوی فوج کے تقریباً بارہ ہزار افراد معاہدۂ تحکیم کی وجہ سے الگ ہو گئے اور ۱۰ شوال ۳۸ ہجری کو انہوں نے اپنی الگ تنظیم قائم کر لی اور اپنا امیر مقرر کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ انہوں نے بعض متشددانہ اور انتہا پسندانہ عقائد و نظریات قائم کر لئے۔ مثلاً ان کا عقیدہ تھا کہ دین کے معاملات میں کسی انسان کو حکم بنانا کفر ہے، حکم اور اس کا فیصلہ ماننے والے سب کافر ہیں اور ان کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے۔ وہ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلفائے راشدین مانتے تھے جو مسلمان ان کے ہم خیال نہ تھے انہیں کافر اور واجب القتل سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے سے اختلافِ عقیدہ رکھنے والے مردوں، عورتوں، بچوں کو بڑی بے رحمی اور سنگدلی سے قتل کیا اور کسی صحابی اور غیر صحابی مسلمان کی جان ان کے ہاتھوں محفوظ نہ رہی۔ تاریخ ان کے سنگدلانہ قتل کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اسلام میں یہ پہلا مذہبی و سیاسی فرقہ تھا جو قائم ہوا چونکہ ان لوگوں نے خلیفۂ وقت کی اطاعت سے انحراف کیا اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے علیحدگی اختیار کی، اس لئے خارجی (ملت سے نکل جانے والے) کہلائے۔ ان خارجیوں کی ایک بڑی جمعیت کوفہ، بصرہ، مدائن وغیرہ شہروں سے نکل کر نہروان میں جمع ہو گئی۔ ان کا ارادہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنے کا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج سے خط و کتابت کر کے انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو اپنا خصوصی نمائندہ بنا کر خوارج سے مذاکرات کے لئے بھیجا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ خوارج کی دہشت گری اور مسلمانوں کی خونریزی جاری رہی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے آپ پر زور دیا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا قصد کرنے سے پہلے خوارج کی سرکوبی کی جائے اور مسلمانوں کو ان کے مظالم سے بچایا جائے تاکہ شام کی طرف پیش قدمی کرتے وقت عقب محفوظ ہو جائے اور ان کی غیر حاضری میں لوگوں کے گھر بار، مال اسباب، بیوی بچے خارجیوں کی دستبرد سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے خوارج سے نپٹنے کا فیصلہ کر لیا اور فوج کو لے کر نہروان کا رخ کیا۔ خوارج وہاں پہلے سے جمع تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہاں پہنچ کر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور حضرت قیس بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ کو خوارج سے بات چیت کرنے اور انہیں سمجھا کر راہِ راست پر لانے کے لئے بھیجا۔ لیکن خوارج اپنی بات پر اڑے رہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر خوارج کے سامنے ایک مدلل اور موثر تقریر کی، واقعہ تحکیم کے بارے میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کی اور انہیں دعوت دی کہ ان کے ساتھ مل کر اہل شام کے خلاف جنگ کریں۔ خوارج نے جواب دیا کہ ''اے علی! تم تحکیم کو منظور کر کے کافر ہو گئے اور ہم بھی۔ ہم سب نے توبہ کی ہے۔ اگر تم بھی توبہ کر لو تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ورنہ ہم تمہاری مخالفت کریں گے۔'' آپ نے جواب دیا کہ ''میں کیسے اپنے آپ کو کافر کہوں حالانکہ میں مومن ہوں۔ میں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا۔'' خوارج نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

جنگ کے سوا دوسرا چارۂ کار نہ رہا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اعلان کر دیا کہ جو شخص جنگ سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے جھنڈے تلے آ جائے گا یا خوارج کا ساتھ چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف لوٹ جائے گا، اسے امان دی جائے گی۔ یہ اعلان سن کر تقریباً ایک ہزار آدمی خوارج کی صفوں سے نکل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جھنڈے تلے آ گئے۔ ایک

خارجی سردار اپنے پانچ سو ہمراہیوں کو لے کر میدانِ جنگ سے نکل گیا اور ایک بڑا گروہ کوفہ کی طرف لوٹ گیا۔ خارجی سپہ سالار عبداللہ بن وہب راسبی کے ساتھ صرف ساڑھے چار ہزار آدمی رہ گئے۔ پھر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حملہ میں پہل نہیں کی بلکہ خوارج نے اپنا مخصوص نعرہ لاالحکم الا اللہ لگا کر خود ہی حملہ کر دیا اور بڑے تہور اور بے جگری سے لڑے اور خونریز جنگ کے بعد اکثر و بیشتر قتل ہو گئے۔ ان میں اکثریت ایسی تھی جس کی قریبی رشتہ داریاں کوفہ، بصرہ اور مدائن کے لوگوں سے تھیں۔ ان کی شکست اور قتل کے جو اثرات ان کے کوفی، بصری اور مدائنی رشتہ داروں پر پڑے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اچھے ثابت نہ ہوئے۔ آپ کے خلاف رنج، غم، غصہ اور قلق کے جذبات کا پیدا ہونا قدرتی بات تھی طبری کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خارجیوں کو نہ تو مرتدین میں شمار کیا نہ حربی کافروں میں۔ جنگی اسلحہ اور جنگی سواریوں کے سوا ان کے مال اسباب سے تعرض نہیں کیا، غلاموں اور باندیوں کو مقتول خارجیوں کے رشتہ داروں کو واپس کر دیا۔ میدان جنگ میں چار سو خارجی زخمی پائے گئے۔ انہیں امان دی اور ان کی مرہم پٹی کرائی۔ جنگ نہروان ۹ صفر ۳۸ ہجری (۱۷ جولائی ۶۵۸ء) کو پیش آئی۔

نہروان کے بعد

جنگ نہروان سے فارغ ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ وہیں سے شام کی طرف پیش قدمی کریں لیکن فوج نے بیدلی اور عدم دلچسپی کا اظہار کیا، بہت کم لوگوں نے شام پر فوج کشی کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ سب کی ہمت پست ہو رہی تھی اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ فوج خاصے طویل عرصے سے اپنے دینی بھائیوں اور خون کے رشتے داروں سے لڑ رہی تھی اور اپنے عزیزوں کے خون سے اپنے ہاتھ، اپنے نیزے، تلواریں اور دامن تر کر چکی تھی۔ اور اپنے ہی خاندانوں اور قبیلوں کی عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرنے میں ملوث تھی۔ جانوں، مالوں، گھروں، کھیتوں کے نقصان بھی اٹھا چکی تھی اور پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خفیہ ایجنٹ اس کے درمیان اپنا پراپیگنڈا بھی کر رہے تھے اور اس کے سرکردہ افراد کو لالچ بھی دے رہے تھے۔ حضرت علی اپنی فوج کی بے حسی کو دیکھ کر مشوش اور مضطرب تھے۔ ایک دن انہوں نے زوردار خطبہ دیا اور فرمایا:

> ”خدا نے تم کو ایک دشمن کے مقابلے میں کامیابی دی ہے اب یہیں سے دوسرے دشمن کے مقابلے میں اپنے گھوڑوں اور نیزوں کا رخ موڑ لو“

لیکن فوج کے سرداروں نے کہا کہ ”امیر المومنین! ہمارے ترکش خالی ہو گئے ہیں۔ تلواریں کند ہو گئی ہیں۔ نیزوں کے پھل ٹوٹ گئے یا خراب ہو گئے ہیں۔ ہمیں مہلت دیں کہ اپنے شہر جا کر قدرے آرام کریں اور دشمن کے مقابلے کے لئے اپنا اسلحہ اور سامان درست کر کے اچھی طرح تیاری کر لیں اور تازہ دم ہو جائیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حکم تھا کہ لوگ پڑاؤ نہ چھوڑیں اور شہر میں داخل نہ ہوں۔ لیکن وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اجازت کے بغیر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ آپ کے ہمراہ پینسٹھ ہزار میں سے صرف ایک ہزار آدمی رہ گئے۔ مجبوراً آپ کوفہ کو لوٹ آئے۔

علوی فوج کی بے حسی

اس کے بعد فوج نے کبھی جمع ہو کر نہیں دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ وقتاً فوقتاً پرجوش خطبے دیتے رہے اور طعن و ملامت سے بھی کام لیتے رہے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اہل کوفہ و بصرہ نے باہمی مشورہ سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کبھی خلیفہ کی فوج میں شامل ہوں گے نہ اہل شام کے خلاف لڑنے کے لئے نکلیں گے۔ آرام اور تیاری کے مناسب وقفہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو دوبارہ جنگ کے لئے نکلنے پر ابھارا لیکن لوگوں نے سنی ان سنی کر دی۔ لوگ اپنے آرام دہ، پرامن، پرسکون اور محفوظ گھروں میں واپس آنے کے بعد اطمینان و فراغت سے اپنے روزمرہ کے مشاغل اور دلچسپیوں میں لگ گئے۔ انہوں نے نہ لڑائی کی تیاری کی نہ لڑائی کے لئے نکلے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پرزور خطبے بہرے کانوں پر پڑتے رہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، خوارج کے خلاف نہروان کی جنگ میں اہل عراق نے اہل عراق کو، رشتہ داروں نے رشتہ داروں کو قتل کیا تھا۔ یہ بے حسی، بیدلی اور بیزاری اسی کا ردعمل تھی۔ لوگ جنگ و جدال سے اکتا چکے تھے۔ اس پر اہل شام کی سازشیں، ریشہ دوانیاں، جوڑ توڑ، ترغیب و تحریص اور پراپیگنڈا مستزادِ فوج کی طرف سے حکم عدولی کے علاوہ ایک خرابی یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اطلاعات اور خبر رسانی کے ذرائع کمزور تھے۔ دشمنوں کی خبر تو ایک طرف رہی، خود ان کی اپنی فوج کی خبریں بھی ان تک نہیں پہنچتی تھیں۔ اگر پہنچتی تھیں تو بہت تاخیر سے پہنچتی تھیں اور ان کے لئے تدارک مشکل ہو جاتا تھا۔

اس سے پہلے عام تصور یہی تھا کہ اسلامی افواج اسلامی نظریاتی اور سیاسی حدود کے تحفظ اور دشمنان اسلام کے مقابلے میں فتوحات کے لئے ہیں۔ لیکن اب خود مسلمان بار بار باہمی قتل و خون میں مبتلا ہو رہے تھے۔ نئی فتوحات اور اموالِ غنیمت کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ دشمن مسلمانوں پر دلیر ہوتے جا رہے تھے۔ بغاوتوں اور ارتداد کے واقعات پیش آ رہے تھے، اور سرحدوں کا دفاع خطرے میں پڑنے لگا تھا۔ خود خلافت کے ادارہ کا تقدس، عظمت، اہمیت اور مرکزی کردار معرض بحث میں آ گئے تھے۔ جن لوگوں نے خود برضا و رغبت خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اب وہ ان کے احکام کی تعمیل سے پہلو تہی کر رہے تھے۔ ان حالات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کیا کچھ نہیں محسوس کرتے ہوں گے ع۔ زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت!

اگر انہیں پرامن، سازگار اندرونی حالات اور متحد و وفادار ساتھی ملتے تو وہ ملت اسلامیہ کے لئے ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے مساوی شاندار خدمات سرانجام دے سکتے تھے لیکن ان کے بیدل اور غیر متحد ساتھیوں نے ان کی ہمتوں اور قابلیتوں کو پابزنجیر کر دیا۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

''نہروان کے معرکے کے بعد علی رضی اللہ عنہ کی زندگی ایک مسلسل ابتلا اور انتہائی کوفت کی زندگی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ حق آفتاب کی طرح روشن ہے اور یہ کہ ان کے ساتھی قوت اور بہادری، تعداد اور تیاری میں ایسی حیثیت رکھتے ہیں کہ حق تک پہنچ جائیں اور حق کا بول بالا کریں لیکن انہوں نے آپ کا ساتھ

چھوڑ دیا ہے، اپنے فرض سے غافل ہو گئے ہیں۔ بلائے جاتے ہیں تو جواب نہیں دیتے، حکم پاتے ہیں تو اس کی تعمیل نہیں کرتے، فہمائش کی جاتی تو نصیحت گیر نہیں ہوتے انہیں زندگی سے محبت اور موت سے نفرت ہو گئی۔ وہ جنگ سے تنگ اور امن و عافیت کے خوگر ہو گئے۔ وہ راحت سے لذت گیر اور مشقت سے اکتا گئے۔"[1]

آپ وقتاً فوقتاً لوگوں کو حق و صداقت اور فلاح و اصلاحِ ملت کی خاطر جہاد پر ابھارتے رہے۔ نرم و گرم ہر قسم کی باتیں کہتے رہے، لوگوں کو غیرت دلاتے رہے مگر بے سود۔ ایک موقع پر حسب ذیل خطبہ دیا:

"اے لوگو جن کے جسم متحد لیکن دل کی خواہشیں جدا جدا ہیں۔ تمہارے رہنما کی تحریک کمزور اور تمہارے غم خوار کا دل بے چین ہے۔ تمہاری باتیں سخت چٹانوں کی شق کر دیتی ہیں۔ لیکن تمہارے کام دشمنوں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ جب میں تم کو جہاد کی دعوت دیتا ہوں تو تم کہتے ہو بات یہ ہے، بات وہ ہے، بہانے کی سب جھوٹی باتیں! تمہارا مجھ سے مہلت مانگتے رہنا ٹال مٹول کرنے والے مقروضوں اور میدان سے بھاگنے والوں کی سی حرکتیں ہیں۔ ذلیل آدمی ظلم و زیادتی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حق تک پہنچنے کے لئے ضرورت ہے کوشش کی، پختہ ارادے کی اور صبر کو اپنا شعار بنا لینے کی۔ تم اپنے گھر کے بعد کس کی حفاظت کرو گے؟ میرے بعد کس امام کے ساتھ مل کر جہاد کرو گے؟ بخدا مغرور وہ ہے جس کو تم نے فریب میں رکھا۔ جس کے حصے میں تم آئے، بخدا اس کا حصہ نامرادی ہے۔ اب تو میں تمہاری مدد کا خواہاں نہیں اور نہ تم کو سچا جانتا ہوں۔ خدا تم کو مجھ سے جدا کر دے۔ مجھے تم سے بہتر بدل عطا کرے۔ بہت جلد تم ذلت کے گڑھے میں گرو گے۔ تمہارے سروں پر تلوار ہو گی۔ ظالم تم میں خود غرضی رائج کرے گا۔ تمہاری جماعتوں کو منتشر کر دے گا۔ تمہارے گھروں میں فقر و فاقہ ہو گا۔ تھوڑے دنوں بعد تم تمنا کرو گے کہ مجھے پاتے اور میرا ساتھ دیتے۔ اس وقت میری بات کی صداقت تم کو معلوم ہو گی اور اللہ ظالموں ہی کو دور رکھتا ہے۔"[2]

یہ خطبہ کیا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت اور فوج کا مرثیہ کہا ہے۔ نیز اہل کوفہ و بصرہ کو درپیش آنے والی ذلت و مسکنت کی پیش گوئی کی ہے۔ کتنے پر درد اور صداقت کی زہرناکی سے معمور ہیں یہ الفاظ! لیکن لوگ آپ کی تقریریں سنتے اور پھر ادھر ادھر ہو جاتے اور اپنے مشاغل میں لگ جاتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر عالی حوصلہ، صاحب عزیمت، صاحب ایمان و یقین کون ہو گا؟ لیکن ان کی انصاف پسندی، حق کوشی، راست بازی اور اسلامی مساوات پر مبنی دیانتدارانہ اور رصاف دلانہ سیاست نے انہیں اپنے پیروؤں سے مایوس کر دیا۔ ایسی اتھاہ مایوسی اور قوم کی بے حسی سے کسی دوسرے خلیفہ کو سابقہ نہ پڑا۔ البتہ بعض اسرائیلی انبیاء کے صحیفے یہودی قوم کی روش سے ان

[1] الفتنۃ الکبریٰ (خلافت عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ) ترجمہ شاہ حسن عطا۔ ناشر نفیس اکیڈمی، کراچی

[2] الفتنۃ الکبریٰ (خلافت عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ) ترجمہ شاہ حسن عطا۔ ناشر نفیس اکیڈمی، کراچی

کی ایسی ہی مایوسی اور بیزاری پر شاہد ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اس وقت کی عرب دنیا کے دو سب سے بڑے مدبر اور سیاسی شاطر اکٹھے ہو گئے تھے جن کے سیاسی اقدامات اور فیصلے خالص دنیادارانہ تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلامی اصولوں، نظریوں اور قوانین صلح و جنگ سے سرِمو انحراف کرنے والے نہ تھے۔ حیلہ سازیوں اور جوڑ توڑ سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ جدید اصطلاح میں وہ ڈپلومیٹ اور سیاستدان نہ تھے۔ حق و راستی کے حامل تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی طرح خلافت کو علیٰ منہاج نبوت چلانا چاہتے تھے۔ وہ لوگوں کو ناحق عطیات دے کر اور وعدوں کے سبز باغ دکھا کر اپنا طرف دار بنانے کے قائل نہ تھے۔ انہیں بیت المال سے رشوتیں دے کر لوگوں کو اپنے حق میں ہموار کرنا گوارا نہ تھا۔ بیت المال اللہ اور مسلمانوں کی امانت تھا اور آپ اس کے کسٹوڈین تھے۔ عمال میں سے بھی جو بیت المال کے واجبات میں گڑبڑ کرتے تھے، آپ ان سے سخت محاسبہ کرتے تھے۔ تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں مرقوم ہیں۔ اور تو اور خود آپ کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جب بصرہ کے گورنر تھے، انہوں نے بیت المال سے بہت بڑی رقم اپنا حق سمجھ کر لے لی۔ اطلاع ملنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے حساب طلب کیا تو وہ ناراض ہو کر بصرہ کی گورنری اور آپ کا ساتھ چھوڑ کر مکہ چلے گئے۔ اسی طرح آنجناب رضی اللہ عنہ کے حقیقی بڑے بھائی حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی آپ سے علیحدہ ہو کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس دمشق پہنچ گئے کیونکہ آپ نے انہیں بیت المال سے رقم دینے سے انکار کر دیا تھا اس لئے کہ وہ اس کے حق دار نہ تھے۔ اپنے ذاتی مال سے انہیں کچھ دیا مگر وہ مطمئن نہ ہوئے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دربار میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ضروریات سے بڑھ کر عطیات دیئے گئے ان واقعات سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وقار و اقتدار کو دھچکا لگا اور مخالفین کے ہاتھ مضبوط ہوئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علوی مقبوضات پر حملے

تحکیم کی تجویز حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے شاطرانہ ذہن کی پیداوار تھی۔ اس سے حضرت معاویہ نہ صرف شکست اور مغلوبی سے بچ گئے بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں ان کا پلڑا بھاری ہو گیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کے حامیوں نے خلیفہ تسلیم کر لیا۔ پہلے وہ خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے مدعی تھے اور خلیفہ چہارم کی بیعت کو اس سے مشروط کر رکھا تھا۔ اب وہ اہل شام کی طرف سے خلیفہ تسلیم کر لئے جانے پر ایک مساوی مدمقابل کی حیثیت سے خم ٹھونک کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے آ گئے اور کسی ظاہری عذر، بہانے کی بھی ضرورت نہ رہی۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقبوضہ علاقوں میں اپنے مخبر پھیلا دیئے جو انہیں دم دم کی چھوٹی بڑی خبریں پہنچاتے تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذرائع معلومات ناقص تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ یعنی اہل عراق میں پھوٹ پڑ چکی ہے اور وہ مزید لڑنے پر آمادہ نہیں۔ اس لئے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پریشان کرنے، اپنے مقبوضات میں توسیع کرنے اور اپنی طاقت بڑھانے کا منصوبہ بنایا اور علوی مقبوضات پر تاخت تازیاں شروع کر دیں۔ اسلام میں ملوکانہ ملک گیری کا آغاز ہو گیا۔

مصر (۳۸ھ)

مصر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قبضہ تھا جس کی سرحد شام سے ملتی تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خطرہ تھا کہ مصر اور عراق کی جانب سے بیک وقت حملہ ہو جانے کی صورت میں شام سینڈوچ ہو کر رہ جائے گا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر وہ مصر پر غالب آ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر غلبہ پانا آسان ہوگا۔ انہوں نے جنگ صفین کے موقع پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے تحریری عہد نامہ کیا تھا کہ فتح کے بعد مصر کی حکومت موخر الذکر کو سونپ دیں گے۔ تحکیم کے بعد اس وعدہ کے ایفا کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ مملکت اسلامیہ میں مصر بڑا اہم صوبہ تھا۔ اس کا خراج اور وسائل دوسرے صوبوں سے زیادہ تھے۔ وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے قیس بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ گورنر تھے۔ وہ بہت قابل، دور اندیش اور صاحب تدبیر انسان تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتہائی وفادار اور خیر خواہ۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں عراق اور حجاز کی حکومت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ تب انہوں نے پینترا بدلا اور مشہور کر دیا کہ قیس رضی اللہ عنہ در پردہ ان کے اپنے آدمی ہیں اور تمام کام انہی کی مرضی کے مطابق کرتے ہیں۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرف دار اہل خرتبا کو اسی لئے علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے کی ڈھیل دے رکھی ہے اور ان کے روزینے برقرار رکھے ہیں۔ ان کے خفیہ خطوط آتے رہتے ہیں۔ جس طرح سبائیوں نے حضرت عثمان کے خلاف جعلی خطوط پھیلائے تھے اور ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے اکابر صحابہ کی طرف سے بنائے گئے خطوط بھی شامل تھے، اسی طرح قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک جعلی خط وضع کر کے مجمع عام میں سنایا گیا جس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کو سراہا گیا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ مخبروں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی۔ اس طرح قیس رضی اللہ عنہ کی پوزیشن کو مشتبہ بنا دیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کے مابین اہل خرتبا کے بارے میں خط و کتابت ہوئی۔ قیس رضی اللہ عنہ نے مصلحت وقت جان کر ان سے فی الوقت بیعت کا مطالبہ اور جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور محمد بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر زور دیا کہ اہل خرتبا سے جنگ کی جائے۔ اس پر قیس بن سعد رضی اللہ عنہ امارت سے استعفا دے کر مدینہ چلے گئے بعد میں انہوں نے جنگ صفین میں حصہ لیا اور پھر حضرت حسن کے سالار لشکر بھی رہے ان کی جگہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ مصر کے گورنر مقرر کیے گئے جو عہد عثمانی سے اس کے آرزومند تھے۔ یہ اقدام سخت نقصان دہ بلکہ تباہ کن ثابت ہوا۔

محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور محمد بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی والدہ ایک ہی تھیں اور وہ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ یہ دونوں نوجوان تھے اور ناتجربہ کار۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اپنا اثر رکھتے تھے۔ اسی طرح متعدد دوسرے نوجوان بھی مشیروں کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے مصر پہنچتے ہی اہل خرتبا پر حملہ کر دیا۔ یہ لوگ اب تک غیر جانبدار تھے۔ لیکن اب مجبوراً مقابلے پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے شکست کھائی۔ اہل خرتبا کے علاوہ متعدد دوسرے مصری قبائل بھی مخالف ہو گئے اور خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کی دعوت کے نام پر

عام شورش شروع ہوگئی۔ اطلاع ملنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد کی بجائے مالک اشتر نخعی کو مصر کا گورنر بنا کر بھیجا۔ لیکن اسے شام و مصر کی سرحد پر زہر سے ہلاک کر دیا گیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو چھ ہزار لشکر کے ساتھ مصر پر حملہ کے لئے بھیجا۔ جنگ ہوئی، مصریوں نے محمد کا ساتھ چھوڑ دیا۔ معاویہ بن خدیج کندی نے محمد کو گرفتار کر کے شدتِ تشنگی کے عالم میں قتل کر دیا اور ایک بوندِ پانی پینے کو نہ دیا[1] ان کی لاش گدھے کی کھال میں بند کر کے جلا دی گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع پہنچی تو انہیں بے حد صدمہ ہوا۔ انہوں نے اہل عراق کو مصر پر حملہ کے لئے ابھارا مگر وہ لوگ گھروں سے باہر نہ نکلے۔ ۳۸ھ میں مصر اور شمالی افریقہ ہمیشہ کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے نکل گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مصر کی حکومت حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دی اور وہ اپنی وفات تک وہاں حکمران رہے۔

دوسرے علوی مقبوضات پر حملے

مصر اور شمالی افریقہ کی طرف سے فارغ اور مطمئن ہو کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دوسرے مقبوضات عراق، یمن، حجاز وغیرہ کے شہروں اور علاقوں کی طرف اپنے چھاپہ مار فوجی دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔ مقصد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پریشان کرنا، شام کی طرف سے ان کی توجہ ہٹائے رکھنا، علوی رعایا پر اپنی دھاک اور رعب جمانا اور ان سے جبراً صدقات وصول کرنا تھا جو صرف خلیفہ برحق کو واجب الادا تھے۔ تحکیم کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ خود کو خلیفۂ برحق سمجھتے تھے وہ جہاں کہیں ممکن ہو قبضہ کرنا اور لوگوں سے اپنی بیعت لینا چاہتے تھے تاکہ ان کی خلافت کو عمومی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ ان کے فوجی دستے اچانک حملہ آور ہوتے، لوٹ مار کر کے اور خوف و ہراس پھیلا کر تیزی سے پسپا ہو جاتے۔ جہاں کہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دفاعی دستے بروقت پہنچ گئے، انہوں نے شامی دستوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ انبار، مدائن، تیماء، وادی واقوصہ، الجزیرہ، دومۃ الجندل وغیرہ میں آنکھ مچولی کی سی جنگیں ہوئیں۔ مختلف بدوی قبائل سے بھی صدقات وصول کرنے کے لئے حضرت معاویہ نے اپنے فوجی دستے بھیجے۔ نوبت بایں جا رسید کہ ذی الحجہ ۳۹ھ میں انہوں نے اپنے ایک سالار یزید بن شجرہ کو امیر الحج بنا کر مکہ روانہ کیا تاکہ وہاں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گورنر کو نکال دے اور لوگوں سے ان (معاویہ رضی اللہ عنہ) کی بیعت لے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گورنر قثم بن عباس رضی اللہ عنہما مقابلہ نہ کر سکے۔

ان کی طرف سے اطلاع ملنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ سے ایک فوج بھیجی۔ آخر فریقین میں سمجھوتہ ہو گیا کہ حرم میں جنگ و جدال نہیں کیا جائے گا اور ایک غیر جانبدار شخص شیبہ بن عثمان امیر الحج کے فرائض انجام دیں گے۔ حج کے بعد شامی دستہ واپس چلا گیا۔ یہ دراصل ایک ٹیسٹ کیس (Test Case) تھا۔ حضرت معاویہ جانتے تھے کہ جب تک حجاز کے لوگ ان کی بیعت نہیں کریں گے ان کی بیعت مکمل اور خلافت مسلم نہیں ہوگی۔ لہٰذا وہ حجاز کو کسی نہ

---

[1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر پانی بند کرنے والوں میں محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ شامل تھے۔ آخر خود بھی شدتِ تشنگی کے عالم میں پانی کو ترستے ہوئے تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یہ نوجوان صاحب زادے مصری بلوائیوں میں سے شریف ترین نوجوان تھے۔ خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کا خمیازہ انہیں بھی بھگتنا پڑا۔ مؤلف

کسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے چھیننا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۴۰ ہجری میں انہوں نے بسر بن ابی ارطاط کو تین ہزار کا لشکر دے کر روانہ کیا۔ وہ بڑی سرعت سے مدینہ پہنچ گیا۔ اس وقت مشہور بزرگ صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے گورنر تھے۔ انہوں نے حرم نبوی میں جنگ وخونریزی کو پسند نہ کیا اور مدینہ چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کوفہ چلے گئے۔ بسر نے اہل مدینہ کو خوب ڈرایا دھمکایا اور ان سے زبردستی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت لی۔ مدینہ سے مکہ پہنچ کر اس نے اہل مکہ سے معاویہ رضی اللہ عنہ کی جبراً بیعت لی۔ بعض لوگوں کے مکان مسمار کرا دیئے۔ وہاں سے اس نے یمن کا رخ کیا۔ وہاں کے گورنر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی حضرت عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مقابلے کی تاب نہ لا کر کوفہ چلے گئے۔ بسر نے انتہائی ظلم وبربریت سے کام لیا۔ اور تو اور، عبیداللہ بن عباس کے دو کمسن لڑکے جو وہیں رہ گئے تھے، ان کو بڑی بے دردی اور سفاکی سے قتل کرا دیا۔ ان کی والدہ صدمہ کی شدت سے اپنے حواس کھو بیٹھیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کی آمد کی خبر پا کر بسر شام کی طرف بھاگ گیا۔ علوی فوج نے یمن میں امن اور کنٹرول بحال کیا اور مکہ ومدینہ جا کر لوگوں سے دوبارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت لی۔ غرضیکہ بیعت کا معاملہ ایک تماشا بن گیا۔ ۴۰ھ کے ابتدائی مہینوں تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی چھاپہ مار فوجیں سرگرم رہیں اور ان کے ایجنٹ علوی مقبوضات میں خفیہ طور پر جا کر لوگوں کو ان کی بیعت کی دعوت دینے اور اس کے لئے ترغیب وتحریص سے بھی کام لیتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ مدافعانہ اقدامات کئے اور وہ بھی بعد از وقت۔ جنگ صفین اور واقعۂ تحکیم کے بعد انہوں نے کبھی جارحانہ اقدام نہیں کیا۔ وہ شام پر اسی اصول کے مطابق حملہ کرنا چاہتے تھے جس کے ماتحت جنگ صفین لڑی گئی تھی یعنی یہ کہ خلافت ان کا حق ہے اور اہل شام ومصر کو ان کے حلقہ بیعت وخلافت میں لازماً آنا چاہیئے، اس غرض سے وہ اہل عراق کو جہاد پر ابھارتے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ غم وغصہ سے پیچ وتاب کھاتے اور اہل عراق کو پرزور خطبوں سے شرم وغیرت دلاتے لیکن بے سود۔ ایک ایسا ہی خطبہ درج کیا جاتا ہے جو اس قابل ہے کہ ہم اہل پاکستان بھی اپنے حالات کی روشنی (یا تاریکی) میں اس کے مضمرات پر اچھی طرح غور کریں:

''جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ جس نے بیزار ہو کر اسے چھوڑ دیا، اللہ اس کو حقیروں کے ہاتھ سے ذلت اور خواری کے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ میں نے تم لوگوں کو ان سے لڑنے کی رات دن دعوت دی۔ مخفی طور پر کہا اور علانیہ بھی کہا کہ ان کے حملہ کرنے سے پہلے تم مقابلے پر آجاؤ۔ خدا کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ جس قوم کے گھر پر حریف چڑھ کر لڑنے آئے، وہ ذلیل ہوگی۔ تم سب نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیا۔ میری بات تم پر گراں گزری۔ تم نے اس کو پس پشت ڈال دیا۔ اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ تم لوٹے جا رہے ہو۔ مجھے بتایا گیا کہ مسلم اور ذمی عورتوں تک یہ غارت گر پہنچتے ہیں اور ان کے پازیب اور آویزے تک اتار لیتے ہیں اور کافی

مال ومتاع لے کر واپس چلے جاتے ہیں اور ان میں سے کسی کو زخم تک نہیں آتا۔ حیرت اور سخت حیرت کی اور دلوں کو مردہ، دماغوں کو حیران کرنے اور غموں کو بڑھا دینے والی بات ہے کہ وہ اپنے باطل پر اس طرح متحد اور جمے ہوئے ہیں اور تم حق پر ہو کر بھی اس طرح ناکام ونامراد ہو۔ حالت یہ ہے کہ تم تیر نہیں چلاتے بلکہ دوسروں کے تیروں کا نشانہ بنتے ہو، تم حملہ آور نہیں، دوسرے تم پر حملہ کرتے ہیں۔ جب میں نے تم سے موسم سرما میں کہا کہ ان پر حملہ کرو تو تم نے کہا یہ تو سردیوں کے دن ہیں اور جب میں نے گرمیوں میں کہا کہ ان سے لڑو تو تم نے جواب دیا کہ ابھی شدت کی گرمی ہے۔ جب تم سردی اور گرمی سے بھاگتے ہو تو بخدا تلواروں کے سامنے تم کہاں ٹھہرو گے! اے مرغِ بادنما لوگو! تم نے نافرمانی سے میری سب تدبیریں غلط کر دیں اور مجھے غصے سے بھر دیا حتیٰ کہ قریش نے کہا کہ ابو طالب کا بیٹا بہادر ضرور ہے لیکن لڑائی میں صاحب تدبیر نہیں۔ مجھ سے زیادہ لڑائی کا ماہر اور مرد میدان کون ہوگا؟

بخدا میری عمر بیس سال کی بھی نہ تھی کہ میدان جنگ میں کود پڑا اور آج میری عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکی لیکن جس کا حکم نہیں چلتا اس کی رہنمائی کیا!''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت

طبری کے بقول جب فریقین میں سے کسی نے بھی دوسرے کی اطاعت قبول نہ کی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ''اگر تم چاہو تو ایسا کر لو کہ عراق کی حکومت تمہارے حصہ میں ہو اور شام کی میرے حصہ میں تاکہ اس امت سے تلوار رک جائے اور مسلمانوں کے خون نہ بہیں'' اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ راضی ہو گئے۔ کیونکہ آپ دیکھ چکے تھے کہ اہل عراق مخالفین کے خلاف جہاد میں آپ کا ساتھ دینے سے کتراتے ہیں اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فوجی حملوں سے مملکت میں انتشار اور بدامنی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ خارجیوں نے پھر سے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے ہیں اور شورشوں اور بغاوتوں پر تلے ہوئے ہیں۔ لوٹ مار اور فتنہ پھیلا رہے ہیں اور مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے سابقہ ایرانی صوبوں کے لوگوں نے ارتداد اور بغاوت کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ آخر آپس میں یہ طے پایا کہ حجاز، عراق اور تمام مشرقی ممالک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت میں شامل ہوں گے جبکہ شام، مصر اور مغربی ممالک (شمالی افریقہ) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زیر تسلط ہوں گے۔ فریقین ایک دوسرے کے علاقے پر نہ لشکر کشی کریں گے اور نہ کسی قسم کی غارت گری مچائیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مصالحت کی پیشکش قبول کرنے کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار نظر نہ آیا خلافت یا ممالک اسلامیہ کی حکومت باقاعدہ دو حصوں میں بٹ گئی جس طرح اس سے پہلے رومی سلطنت مغربی اور مشرقی دو حصوں میں بٹی تھی۔

اس وقت خیال آتا ہے کہ کاش حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کی ابتداء ہی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مشورہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مان لیا ہوتا اور انہیں اپنی بیعت

کی تکمیل ہوجانے تک شام کی امارت پر قائم رکھا ہوتا تو جنگ صفین کی نوبت نہ آتی نہ ستر ہزار مسلمانوں کا خون بہا ہوتا نہ تحکیم اور اس کے بعد کے واقعات پیش آتے، نہ خلافت راشدہ ختم ہوتی نہ مسلمانوں میں انتشار پھیلتا، نہ حضرت علی کی توانائیاں غیر تعمیری کاموں پر ضائع ہوتیں! لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کو دنیا سے زیادہ دین کا معاملہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے عم زاد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے مشورے کے جواب میں کہا کہ ''میں دین کے معاملے میں مداہنت سے کام نہیں لینا چاہتا۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کامیابی کی وجوہات

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بے شک صحابی تھے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کو کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ مؤخر الذکر کے مقابلے میں اپنی دنیادارانہ سیاست وتدبیر، مردم شناسی، ہوشیاری اور دور اندیشی سے کامیاب ہوئے۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنی کامیابی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''میں چار خصلتوں کے سبب علی ابن طالب رضی اللہ عنہ پر غالب ہوا علی رضی اللہ عنہ اپنا بھید کسی سے نہیں چھپاتے لیکن میں اپنے بھید کی پوری حفاظت کرتا ہوں۔ وہ مصائب سے بچنے کے لئے دوڑتے ہیں اور مصائب ان کو اچانک آلیتے ہیں۔ لیکن میں خندہ پیشانی سے مصائب کا سامنا کرتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر اثر نہیں کرتے۔ ان کے لشکر میں برے سے برے لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں اور وہ اتفاق واتحاد کی نعمت سے بھی محروم ہیں لیکن مجھے ان کی نسبت قریش کی زیادہ تائید حاصل ہے اور میرے لشکر میں کسی قسم کا اختلاف بھی نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ میں جو چاہتا ہوں حاصل کر لیتا ہوں۔

لیکن علی رضی اللہ عنہ اپنی حسب منشا اپنی خواہشات پوری نہیں کر سکتے۔''[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے اور انہیں اپنا طرف دار بنانے کا فن جانتے تھے۔ وہ اسلام میں مشفقانہ ملوکیت کے بانی تھے۔ آج کل کی سیاسی جمہوریت کے جوڑ توڑ انہیں خوب آتے تھے۔ اگرچہ ابتدا میں وہ خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کا دعویٰ لے کر اٹھے تھے لیکن حالات کی سازگاری نے انہیں بتدریج دعوائے خلافت تک پہنچا دیا۔ انہوں نے نہ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون آلود کرتے اور ان کی زوجہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی نمائش کر کے اہل شام اور بعض دوسرے افراد اور گروہوں کی تائید وحمایت حاصل کی اور علی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل کی حیثیت سے ان کے سامنے پیش کیا، انہوں نے قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ کی علوی لشکر میں موجودگی کو بھی خوب اچھالا اور اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا بلکہ بیت المال کا روپیہ بے دریغ خرچ کر کے متعدد عرب قبائل کو بھی اپنا طرف دار بنالیا۔ لوگ علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ سے نکل کر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے رہے لیکن معاویہ رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر علی رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی نہ آیا۔ اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے عمال کا سختی سے محاسبہ کرتے تھے۔ کسی کو بیت المال سے ناحق کچھ نہ دیتے تھے نہ اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان سے بیت المال سے رقم مانگی جس کے وہ حقدار نہ تھے، انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ وہ ناراض ہو کر معاویہ رضی اللہ عنہ کے

---

[1] علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ مصنفہ ابو النصر مصری بحوالہ نقوش جلد ۱۳ صفحہ ۴۲۴

پاس چلے گئے۔ موخرالذکر نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں تین لاکھ دینار دیئے۔ وہ ہمیشہ کے لئے ان کے کیمپ میں شامل ہو گئے۔ پوچھنے والوں سے کہا کہ ''دینی لحاظ سے میرے بھائی علی رضی اللہ عنہ بہترین انسان ہیں اور دنیاوی لحاظ سے معاویہ رضی اللہ عنہ میرے لئے سب سے اچھے ہیں۔'' اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دو اہم عامل مصقلہ بن ہبیرہ الشیبانی اور یزید بن حجیۃ التیمی بھی ان کا ساتھ چھوڑ کر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے کیونکہ آپ نے ان سے خراج میں غبن کرنے پر محاسبہ کیا تھا اور تو اور، آپ کے عم زاد اور بصرہ کے گورنر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی وہاں کا خراج وغیرہ اکٹھا کر کے مکہ چلے گئے کیونکہ ان سے بھی جواب طلبی کی گئی تھی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ ایسے معاملات میں چشم پوشی سے کام لیتے تھے اور بیت المال کو اپنا ذاتی خزانہ سمجھ کر لٹاتے تھے۔ وہ گزشتہ بیس برس سے شام جیسے وسیع اور زرخیز صوبے کے گورنر چلے آتے تھے اور اس کے سارے وسائل پر قابض تھے۔ وہ اہل شام کی نفسیات سے خوب واقف تھے ان سے حلم ونرمی، داد و دہش اور سیر چشمی سے پیش آتے تھے۔ اس لئے ان میں ہر دلعزیز تھے اور وہ ان کے احکام بلاچون وچرا بجالاتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق تھے۔ ان کے لئے معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرح اہل عراق پر انعامات ونوازشات کی بارش کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ وہ اس کے لئے خود کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کا بیشتر حصہ مکہ اور مدینہ میں قریش اور انصار کے درمیان گزرا تھا اور وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں خلیفہ بننے کے سات ماہ بعد عراق کے نو آباد شہر کوفہ کو دارالخلافہ بنا کر وہاں مقیم ہوئے۔ جہاں بھانت بھانت کے قبیلے اور گروہ (نومسلم اور غیر مسلم) آباد تھے جن میں اہل شام کی طرح یک جہتی نہ تھی۔

علی رضی اللہ عنہ اہل عراق کی سرشت سے واقف نہ تھے۔ عراقیوں کو ان سے داد و دہش وغیرہ کی جو امیدیں تھیں وہ پوری نہ ہوئیں اور ان کی اکثریت علی رضی اللہ عنہ سے مایوس ہوتی چلی گئی اور انہوں نے خلیفہ کے احکام اور ہدایات کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ جنگ جمل اور جنگ نہروان کے بعد جب انہوں نے ہزیمت خوردہ متحاربین کا مال و اسباب لوٹنا اور انہیں لونڈی غلام بنانا چاہا تو بھی حضرت علی نے انہیں یہ کہہ کر ایسا کرنے سے روک دیا کہ مسلمانوں سے ایسا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بھی ان میں مایوسی اور بددلی پیدا ہوئی۔ نہروان کے بعد انہوں نے اہل شام سے لڑ کر نہیں دیا بلکہ آپس میں الجھتے رہے۔ اشتر نخعی اور اشعث بن قیس کی باہمی رقابت وعداوت نے لشکر علوی میں نفاق پیدا کر دیا۔ اشتر اور اس کا سبائی گروہ چاہتے تھے کہ جنگ وجدال کا سلسلہ جاری رہے، ان کی طرف کوئی متوجہ نہ ہو اور ان کی جان بچی رہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اشعث صفین کے آخری دنوں میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے در پردہ مل گیا تھا۔ اس نے اپنے قبیلہ کندہ میں تقریر کی کہ ''ہمیں یہ تہیہ کر لینا چاہئے کہ ہم نہیں لڑیں گے کیونکہ عرب کثرت سے مارے جا رہے ہیں اور ناحق مسلمانوں کا خون ہو رہا ہے۔ میں یہ باتیں جنگ سے ڈر کر یا بزدلی سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ مجھے مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں پر ترس آ رہا ہے۔ اگر ہم مارے گئے تو ان غریبوں کا کیا حال ہوگا۔'' غرضیکہ گوناگوں اسباب ووجوہات کی بنا پر لشکر علوی میں اختلافات پیدا ہوتے چلے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بار بار کے پرجوش خطبات کے باوجود شام پر ازسرنو حملہ کے لئے لشکر تیار نہ ہوا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

اہل عراق کے حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے اور ان میں ان کے ایجنٹ بھی کام کر رہے تھے انہوں نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور علوی مقبوضات پر حملے شروع کر دیئے۔ حجاز، یمن، عراق میں انتشار اور بدامنی عام ہو گئی اور مختلف گروہ اپنے اپنے مفادات کی فکر میں لگ گئے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کامیابی میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے مدبر اور سیاستدان کا بڑا ہاتھ تھا، وہ یہ سمجھ کر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مل گئے کہ انہیں علی رضی اللہ عنہ سے کسی دنیاوی مفاد کی توقع نہ تھی جبکہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں مصر کی حکومت دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ جنگ صفین اور تحکیم کی مشکلات سے انہی نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو نکالا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایسا کوئی مدبر، سیاستدان اور زیرک مشیر نہ تھا۔ آپ کے جو مشیر اور قاصد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی بات چیت کے لئے جاتے تھے۔ ان کا انداز جارحانہ اور جنگ خواہانہ ہوتا تھا۔ وہ سفارت کے آداب سے ناواقف ہوتے اور صورت حال کو مزید بگاڑ کر واپس آتے۔

فتوحات اور بغاوتوں کا استیصال

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابتدائے خلافت ہی سے نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا اور یکے بعد دیگرے جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں بادل ناخواستہ الجھنا پڑا اور تحکیم کے بعد اہل شام کے چھاپہ مار دستوں کے خلاف اپنے مقبوضات کا دفاع کرنا پڑا۔ ان کا وقت اور توانائی خانہ جنگیوں میں صرف ہوئے۔ آپ کی خلافت کا سارا زمانہ اندرونی خلفشار میں گزر گیا اور اسلامی فتوحات کا سیل رواں یک لخت رک گیا آپ کے عہد میں کوئی قابل ذکر فتوحات نہ ہو سکیں۔ تاہم سیستان اور کابل میں کچھ پیش قدمی ہوئی اور اسلامی تسلط مستحکم ہوا بلاذری کے مطابق ۳۸ھ یا ۳۹ھ میں سندھ میں سندھ کے سرحدی علاقے پر بھی کامیاب حملہ کیا گیا ۳۸ھ میں بحری راستہ سے کوکن (جنوبی ہند کا مغربی گھاٹ) پر بھی تاخت تازی کی گئی لیکن ان حملوں سے کوئی ٹھوس اور پائیدار نتائج برآمد نہ ہوئے۔ البتہ جنوبی ہند سے تجارت کی راہیں کھل گئیں اور مالا بار، کالی کٹ، معبر وغیرہ علاقوں میں مسلمان تاجروں کی کالونیاں قائم ہونے لگیں اور ان کے ذریعے سے وہاں پرامن طریقے پر اسلام پھیلنے لگا۔

مسلمانوں کو باہمی جنگ و جدال میں الجھے ہوئے دیکھ کر سابق ایرانی سلطنت کے بعض علاقے جو اب علوی مقبوضات میں شامل تھے اور اپنی ہزار سالہ ایرانی شہنشاہی کا دور ابھی نہ بھولے تھے، بغاوت پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اصطخر اور سیستان کی بغاوتوں کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما والی بصرہ نے فرو کیا۔ خراسان کا وسیع صوبہ نہ صرف باغی ہو گیا بلکہ مرتد بھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جعدہ بن ہبیرہ مخزومی (آپ کی ہمشیرہ حضرت ام ہانی بنت ابی طالب کے بیٹے) کو خراسان روانہ کیا مگر وہ ناکام رہے۔ پھر خلید بن قرۃ الیربوعی کو بھیجا۔ طبری کے بیان کے مطابق اہل نیشا پور اور اہل مرو نے صلح کر لی۔ لیکن بلاذری کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک خراسان میں بدامنی جاری رہی۔ کرمان اور فارس کے صوبوں نے بھی بغاوت کی راہ اختیار کی۔ آپ نے زیاد بن ابیہ کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ اس نے اپنی تدبیر و سیاست سے باغیوں کو کچل کر امن و امان قائم کیا۔ خارجیوں کا فتنہ و فساد مزید برآں تھا اور وہ

ایک مستقل دردِ سر بنے ہوئے تھے۔

اگر مملکت کے اندرونی حالات اجازت دیتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی للّٰہیت، تقویٰ، شجاعت، بصیرت، حکمت، عدلِ گستری، مساوات اور جمہوریت پسندی، انسانیت نوازی اور دوسرے اعلیٰ اوصاف کی بنا پر اس قابل تھے کہ بہت سے نئے ممالک اور علاقے اسلامی مقبوضات میں شامل کرتے۔ شاید ایران کی طرح بازنطینی سلطنت بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی اور اسلامی افواج یورپ اور افریقہ کے قلب تک پہنچ جاتیں۔ بہر حال جیسا کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''میں نے اللہ کو اپنے ارادوں کے فسخ ہونے سے پہچانا''[1] ان کے نیک ارادے اور عزائم پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ اپنے وقت کی دنیا کا بہترین اور عظیم ترین انسان اپنے بہترین خیالات و مقاصد کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک نئی نسل پیدا ہو کر جوان ہو چکی تھی اور کاروبارِ حیات میں دخیل۔ اس میں عہد صحابہ کی خصوصیات مٹتی جا رہی تھیں اور طلوع اسلام کا پس منظر نظروں سے جیسے اوجھل ہونے لگا تھا۔ بعینہٖ جیسے قیام پاکستان کے بعد اس کا پس منظر نئی نسل کے ذہن سے غائب ہو گیا اور اس کے ٹکڑے کرنے بلکہ بھارت کے ساتھ متحد ہو جانے کی باتیں ہونے لگیں۔ پاکستان بنانے والے تو خیر دنیا دار لوگ تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے اتنی جلدی بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں جو فتنہ برپا ہوا اور پھر اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سارے عہد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، تجزیہ نگار اس کی پیچیدہ اور زیر سطح لہروں کی تلاش اور تعین میں ورطۂ حیرت میں غوطے کھانے لگتا ہے۔ سبائی انداز کی سازشیں آج بھی پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک کے خلاف کی جا رہی ہیں۔

شہادت

''اے علی! تجھے ایک بدترین خلائق شخص قتل کرے گا''

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

جنگ نہروان کے بعد بچے کھچے خوارج بحرین اور احسا کی طرف نکل گئے۔ اور وہاں اپنے مراکز قائم کر لئے۔ آئندہ زمانوں میں وہیں سے مملکت اسلامیہ کو اپنی خفیہ سازشوں اور بعض دفعہ کھلے حملوں کے ذریعے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے بہت سے نیک اور بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو بڑی سفاکی سے قتل کیا۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے آ کر انہیں برا بھلا کہتے اور قتل کی دھمکیاں دیتے لیکن آپ ان کے خلاف کوئی عملی کارروائی نہ کرتے۔ بعض متبعین نے کہا بھی لیکن آپ نے فرمایا کہ گالیوں کا جواب زیادہ سے زیادہ گالیوں ہی سے دیا جا سکتا ہے جو مجھے پسند نہیں۔ یہ لوگ مرتد بھی نہیں کہ انہیں قتل کیا جائے۔ جہاں تک قتل کی دھمکی کا تعلق ہے تو محض دھمکی پر میں انہیں کیسے پکڑ سکتا ہوں جب تک وہ دھمکی کو عملی جامہ نہ پہنائیں۔ یہ تھا خلیفہ راشد کا رویہ اپنے کھلے دشمنوں کے بارے میں۔ اگر آج کے ترقی یافتہ اور مہذب دور کا کوئی نام نہاد جمہوریت پسند عوام کے

---

[1] عرفت ربی بفسخ العزائم۔

ووٹوں کی مدد سے برسر اقتدار آیا ہوا عوامی صدر یا وزیر اعظم ہوتا یا کوئی آمر مطلق، تو اس کے لئے خارجیوں کو قید و بند میں مبتلا کرنے یا خاموشی سے ٹھکانے لگا دینے، یا فرضی مقدمے ان کے خلاف کھڑے کر کے انہیں ''عدالتی انصاف'' کے ذریعے یا ''پولیس مقابلے'' کے ذریعے دوسری دنیا میں پہنچا دینے کے لئے محض گالیاں یا دھمکیاں کافی جواز ثابت ہوتیں۔ لیکن قرآن وسنت کے علم بردار علی رضی اللہ عنہ سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ خوارج جنگ نہروان میں اپنے قتل عام کو نہیں بھولے تھے۔ وہ انتقام کے لئے خار کھائے بیٹھے تھے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بھی اسلامی دنیا میں اختلاف، انتشار اور فتنہ وفساد کا بانی مبانی سمجھتے تھے۔ چنانچہ تین خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم، برک بن عبداللہ اور عمرو بن بکر حج کے موقع پر مکہ میں اکٹھے ہوئے۔ صورت حال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ نہروان میں ہمارے ہزاروں بھائی قتل ہو گئے۔ ان کے بعد ہم جی کر کیا کریں گے؟ خود مرنے سے پہلے کیوں نہ فتنہ وفساد کے بانیوں علی رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے دنیا کو چھٹکارا دلا دیں۔ یہ لوگ گمراہی کے امام ہیں اور حکومت کے اہل نہیں، راہِ خدا میں ان کا قتل جائز ہے۔ جب تک یہ زندہ ہیں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا جو وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ علی رضی اللہ عنہ سے تو ویسے بھی نہروان کے مقتولوں کا انتقام لینا ضروری ہے۔ تینوں اس پر متفق ہو گئے کہ علی رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا جائے، عبدالرحمٰن بن ملجم، برک[1] بن عبداللہ اور عمرو بن بکر نے بالترتیب حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا ذمہ لیا۔ اور اپنے اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ انہوں نے رمضان المبارک کی ایک ہی تاریخ کو نماز فجر کے وقت تینوں بزرگوں پر حملہ کیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر وار اوچھا پڑا۔ وہ زخمی ہوئے مگر علاج معالجہ سے ٹھیک ہو گئے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اتفاقی علالت کی وجہ سے اس دن نماز فجر کی امامت کے لئے مسجد میں آئے ہی نہیں۔ ان کی جگہ خارجہ بن حذافہ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے عمرو بن بکر نے انہیں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سمجھ کر قتل کر دیا۔ عبدالرحمٰن بن ملجم اور اس کے مقامی خارجی ساتھی شبیب بن اشجعی نے کوفہ کی جامع مسجد میں علی الصبح حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا جب وہ صلوٰۃ، صلوٰۃ کی آواز لگا کر لوگوں کو نماز کے لئے اٹھا رہے تھے۔ شبیب کا وار خالی گیا لیکن ابن ملجم کی زہر میں بجھی ہوئی تلوار آپ کی پیشانی پر پڑی اور فرق سر کو کاٹتی ہوئی دماغ تک پہنچ گئی۔ ساتھ ہی ابن ملجم نے کہا الحکم للہ لا لک یا علی (اے علی حکم اور فیصلہ اللہ کا حق ہے، تمہارا نہیں) حضرت علی کرم اللہ وجہہ گر گئے اور پکار کر کہا کہ حملہ آور بچ کر نہ جانے پائے۔ لوگ دوڑ پڑے۔ شبیب تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ابن ملجم کو لوگوں نے پکڑ لیا۔ جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بھانجے جعدہ بن ہبیرہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد ابن ملجم کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا ''اے اللہ کے دشمن! کیا میں نے تجھ پر احسانات نہ کئے تھے؟'' اس نے جواب دیا، ''ضرور کئے تھے۔'' اس پر آپ نے پوچھا ''پھر تو نے کس لئے میرے قتل پر کمر باندھی؟''

---

[1] یہ شخص مصر کا باشندہ تھا اور اس خالد بن ملجم کا بھائی جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ وشورش میں حصہ لیا تھا اور جسے جنگ قادسیہ کے لئے جاتے ہوئے مدینہ میں دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ٹھٹھکے تھے۔ مولف

ابن ملجم نے جواب دیا ''میں چالیس روز تک استخارہ کرتا رہا اور اللہ سے دعا کرتا رہا کہ اس کی مخلوق میں جو شخص بدترین ہو، وہ قتل ہو جائے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''سن! تو ہی وہ بدترین خلائق ہے اور تو ہی وہ مقتول ہے۔''

قاتل کے متعلق وصیت

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے صاحبزادوں حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ، محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے موجود لوگوں سے فرمایا کہ ''ابن ملجم کو آرام سے رکھا جائے، اچھا کھانا کھلایا جائے اور نرم بستر دیا جائے۔ اگر میں اس زخم سے جانبر نہ ہو سکا تو جان کا بدلہ جان ہے۔ قاتل کو اسی طرح کا زخم لگا کر قتل کر دینا جیسا زخم اس نے مجھے لگایا۔ کوئی ظلم و زیادتی نہ کرنا کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ نہ قاتل کا مثلہ کرنا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مثلہ سے احتراز کرو خواہ وہ باؤلے کتے ہی کا کیوں نہ ہو۔ اگر میں بچ گیا تو اس کے معاملے میں غور کروں گا۔ معاف کر دوں گا یا قصاص لوں گا۔''

تاریخ وفات

زخمی ہونے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ دو دن زندہ رہے۔ زہر میں بجھی ہوئی تلوار کا زخم کاری تھا۔ زہر جسم مبارک میں پھیل گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اتوار کی صبح کو اس دنیائے فانی کو خیر باد کہا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور دنیا اپنے وقت کے افضل ترین انسان کے بابرکت وجود سے محروم ہو گئی۔ خلافت راشدہ کا خاتمہ ہو گیا۔

خارجیوں کے تین ہدفوں میں سے جو بہترین اور مقدس ترین تھا وہ ان کے منحوس تریں اور بدترین شخص کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ بقول خود ''خدا کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔''

زمانے نے ایک نئی کروٹ لی جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے کسی طرح بھی بہتر نہ تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تاریخ وفات کے متعلق مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔

محمد ابن سعد نے واقدی کے حوالے سے حضرت امام حسن کی زبانی ۱۷ ر رمضان بروز جمعہ ۴۰ھ (۲۵ جنوری ۶۶۱ء) تاریخ وفات لکھی ہے۔ طبری، میور اور امیر علی کا بھی اس پر اتفاق ہے البتہ سن عیسوی کی تاریخوں میں کچھ فرق ہے۔

ابن سعد کی دوسری روایت یہ ہے کہ ۱۷ ر رمضان کو جمعہ کے دن آپ رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا اور ۱۹ ر رمضان کو اتوار کے دن وفات پائی۔ یہی رائے مؤرخ عمر ابوالنصر مصری کی ہے۔

سید قاسم محمود نے اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں ۲۱ رمضان تاریخ وفات لکھی ہے مجلّہ نقوش (رسول صلی اللہ علیہ وسلم نمبر) کے مضمون نگار راجہ محمد شریف نے لکھا ہے کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی روز جس دن کہ آپ زخمی ہوئے یا اس کے تیسرے دن ۲۰ رمضان المبارک ۴۰ء کو انتقال فرمایا۔''[۱] سید اطہر حسین[۲] اور فقیر سید وحید الدین[۳] بھی اس سے متفق

---

۱ نقوش رسول نمبر جلد ۷ صفحہ ۲۸۱ ۲ درخشاں خلافت (The Gloriwo Caliphate) صفحہ ۱۳۱

۳ محسن اعظم و محسنین صفحہ ۱۷۶

ہیں ان سب کے برعکس شاہ معین الدین احمد ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ ۲۷رمضان کو زخمی ہوئے اور ۳۰ رمضان کو بروز یک شنبہ (اتوار) فوت ہوئے[1]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا بھی یہی خیال ہے[2]

شہادت کی صبح کو آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحب زادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''آج رات مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے مجھے بہت تکلیف پہنچی ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کے حق میں دعا کیوں نہیں کرتے؟'' چنانچہ میں نے دعا کی ''یا اللہ! مجھے ان لوگوں کا بدل بخش جو میرے لئے ان سے بہتر ہوں اور ان کو میرا ایسا بدل بخش جو ان کے لئے مجھ سے برا ہو۔'' اس خواب اور خواب کی دعا کی صداقت میں کیا شک ہے؟

عمر

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر کے بارے میں بھی روایات میں اختلاف ہے۔ کسی روایت میں اٹھاون، کسی میں انسٹھ، کسی میں تریسٹھ، کسی میں پینسٹھ اور کسی میں ستر بیان کی گئی ہے۔ صحیح ترین قول یہی ہے کہ آپ تریسٹھ سال کی عمر میں شہید کئے گئے۔

تدفین

آپ دارالامارت میں جامع مسجد کے قریب دفن کئے گئے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

عجیب اتفاق

چاروں خلفائے راشدین کے نام حرف عین سے شروع ہوتے ہیں۔ یعنی عتیق رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ اور بنو امیہ میں سے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام بھی اسی حرف سے شروع ہوتا ہے خلیفہ اول اپنی کنیت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عوام اور تاریخ میں زیادہ مشہور ہوئے۔ بہت کم لوگوں نے انہیں عتیق کے نام سے پکارا۔ انہیں چھوڑ کر باقی چاروں عظیم ہستیاں شہادت کے بلند مرتبہ پر فائز ہوئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غیر مسلم ابولولو فیروز کے ہاتھوں جامِ شہادت پینا نصیب ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمانوں ہی کی تلوار کا نشانہ بنے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو بنو امیہ کی سازش سے ان کے اپنے غلام نے زہر دے دیا۔ مشہور برطانوی ادیب جارج برنارڈ شا کے بقول حد سے زیادہ نیک ہونے کا یہی انجام ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدتِ خلافت

آپ کی خلافت چار سال اور نو مہینے رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''میرے بعد خلافت علی منہاج نبوت تیس سال ہوگی۔ اس کے بعد بادشاہی۔'' اگر خلفائے اربعہ کی مدت خلافت میں آپ کے بعد متصل آنے

[1] تاریخ اسلام جلد اول (مطبوعہ غضنفر اکیڈمی، کراچی) صفحہ ۲۰۵

[2] الفتنۃ الکبریٰ (خلافت عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ)

والے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کا چھ ماہ کا عرصہ بھی شامل کرلیا جائے تو یہ تیس سالہ مدت پوری ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

	سال	مہینے	دن
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت۔	۲	۳	۹
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت۔	۱۰	۵	۴
حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت۔	۱۲	--	۱۱
حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت۔	۴	۹	--
حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت۔	--	۶	--
خلاف راشدہ کی کل مدت۔	۲۹	۱۱	۲۴

جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی باہمی خونریزی اور فتنہ واختلاف کو دور کرنے کی نیت سے برضا ورغبت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہو گئے تو ملوکیت کا آغاز ہوا۔

ابن ملجم کا انجام

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وفات کے بعد ان کی قاتل کے بارے میں وصیت پر پوری طرح عمل نہ کیا گیا بلکہ یکے بعد دیگرے اس کے اعضا کاٹے گئے۔ زبان بھی کاٹی گئی اور آخر میں قتل کر کے اس کی لاش کی بوٹیاں کر کے آگ میں ڈال دیا گیا جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مثلہ کرنے سے منع کیا تھا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اظہار افسوس

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دمشق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو وہ آبدیدہ ہو گئے۔ ان کی بیوی نے تعجب سے کہا کہ زندگی میں تو آپ ان سے لڑتے رہے اور اب ان کی موت پر روتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ "علی رضی اللہ عنہ کی وفات سے کیا فقہ اور کیا علم دینا سے رخصت ہو گئے۔"[1]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اظہارِ افسوس

زید بن حسین سے روایت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کی خبر سے مدینہ میں کہرام مچ گیا۔ ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل سوگوار تھا۔ سب لوگ ہجوم کر کے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر گئے۔ دیکھا کہ آپ غم سے نڈھال اور آنسوؤں سے تربتر بیٹھی ہیں۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزارِ اقدس پر تشریف لے جا رہی ہیں روضۂ اقدس کے متصل مسجد نبوی میں جتنے بھی مہاجرین وانصار تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور احترام وسلام سے پیش آئے۔ مگر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے نہ کسی کے سلام کا جواب دیا نہ کوئی اور بات کی۔ شدتِ گریہ سے زبان بندھی اور دل تنگ۔ چادر تک سنبھلتی نہ تھی۔ بار بار پیروں میں الجھتی اور آپ لڑکھڑا جاتیں۔ بڑی

[1] البدایہ والنہایہ

مشکل سے اندر پہنچیں۔حجرہ کی چوکھٹ پکڑ کر کھڑی ہوگئیں اور شکستہ اور رندھی ہوئی آواز میں کہا:

''اے نبی ہدایت تجھ پر سلام! اے ابوالقاسم ﷺ تجھ پر سلام! اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے دونوں ساتھیوں پر سلام! میں آپ ﷺ کے محبوب ترین عزیز کی موت کی خبر سنانے آئی ہوں۔ میں آپ ﷺ کے عزیز ترین فرزند کی یاد تازہ کرنے آئی ہوں۔ بخدا آپ ﷺ کا چنا ہوا حبیب منتخب کیا ہوا عزیز قتل ہوگیا۔ جس کی بیوی افضل ترین عورت تھی واللہ وہ قتل ہوگیا جو ایمان لایا اور ایمان کے عہد پر پورا اترا۔ میں رونے والی غمزدہ ہوں۔ میں اس پر آنسو بہانے اور دل جلانے والی ہوں، اگر قبر کھل جاتی تو تیری زبان بھی یہی کہتی کہ تیرا عزیز ترین اور افضل ترین وجود قتل ہوگیا۔''

الاستیعاب، کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بھی فرمایا کہ ''اب عرب جو چاہیں کریں انہیں کوئی روکنے والا نہیں۔''

اپنا جانشین مقرر کرنے سے احتراز

جب جناب علی رضی اللہ عنہ کے قریبی ساتھیوں نے دیکھا کہ آپ کے جانبر ہونے کی امید نہیں تو عرض کیا کہ ''اے امیر المومنین! اگر خدانخواستہ آپ ہمارے درمیان سے اٹھ جائیں تو کیا ہم آپ کے صاحب زادے حسن رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلیں؟'' آپ نے فرمایا کہ ''نہ تو میں تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ میرے بعد تم اپنے معاملات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہو۔ میں تمہیں اسی حالت میں چھوڑ کر جاؤں جس حالت میں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے چھوڑا تھا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے اصرار کے باوجود اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انتخابی مجلس قائم کر دی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ معاملہ اپنے ساتھیوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ لیکن موروثی حق امامت کی بات نہ کی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آخری نصائح

آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور ان سے فرمایا:

''میں تم دونوں کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ تم دونوں دنیا کو ہرگز تلاش نہ کرنا خواہ دنیا تم سے بغاوت کیوں نہ کرے۔ اور جو شے تم سے ہٹا دی جائے اس پر رونا نہیں۔ ہمیشہ حق بات کہنا، یتیموں پر رحم کرنا، پریشان حال کی مدد کرنا، آخرت کی تیاری میں مصروف رہنا، ہمیشہ ظالم کے دشمن اور مظلوم کے حامی رہنا اور کتاب اللہ کے احکام پر عمل کرنا، اللہ کے دین میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ گھبرانا۔''

پھر خاص طور پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر انہیں نصیحت فرمائی:

''اے میرے بیٹے! تو اللہ سے ڈرتے رہنا، نماز وقت پر ادا کرنا، زکوٰۃ کو اس کے مصرف میں خرچ کرنا اور وضو اچھی طرح کرنا کیونکہ بغیر وضو کے نماز نہیں ہوتی اور زکوٰۃ روکنے والے کی نماز قبول نہیں

ہوتی۔ ہر وقت گناہوں کی مغفرت طلب کرنا، غصہ پینا، صلہ رحمی کرنا، جاہلوں سے بردباری سے کام لینا، قرآن کو لازم پکڑے رہنا، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اور بچنا۔''[1]

اس کے بعد آپ نے اپنے تیسرے بیٹے محمد بن حنفیہ سے فرمایا کہ تم بھی انہی نصیحتوں پر عمل کرنا۔ نیز اپنے بڑے بھائیوں کی توقیر اور احترام کرنا اور جو کچھ اس پر بلا تاخیر عمل کرنا۔

اپنے اہل قبیلہ سے فرمایا:

''اے بنی عبدالمطلب! خبردار، میرے بعد مسلمانوں کا خون بہانے کے درپے نہ ہو جانا۔ میرے قاتل کے سوا اور کسی کو قتل نہ کرنا۔''

آخری وصیت

جب آخری وقت بالکل قریب آ گیا تو آنجناب رضی اللہ عنہ نے ایک طویل اور مفصل وصیت فرمائی جس کے چیدہ چیدہ حصے درج ذیل ہیں۔ وصیت اس قابل ہے کہ دنیا کے موجودہ مسلمان اسے حرز جاں بنائیں۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ علی بن ابی طالب وصیت کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہیں اللہ نے ہدائت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیں۔ یقیناً میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور موت سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں تابع فرمان لوگوں میں سے ہوں۔

اے حسن! میں تجھے اور اپنی تمام اولاد اور اپنے تمام گھر والوں کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں جو تمہارا پروردگار ہے۔ اور اس بات کی کہ تم صرف اسلام کی حالت میں جان دینا۔ تم سب مل کر اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو اور باہمی متفرق نہ ہو جاؤ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ باہم ایک دوسرے سے تعلق رکھنا اور اصلاح کرنا نفل نمازوں اور روزوں سے بہتر ہے۔ تم اپنے تمام رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنا۔ اس سے اللہ تم پر حساب نرم فرمائے گا۔ یتیموں کے معاملے میں اللہ سے ڈرنا نہ تو انہیں اتنا موقع دینا کہ وہ اپنی زبان سے تم سے مدد طلب کریں نہ تمہاری موجودگی میں پریشانی میں مبتلا ہوں۔ اور اللہ سے پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں ڈرو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ پڑوسیوں کے حقوق کی وصیت کرتے رہے حتیٰ کہ ہمیں یہ خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑوسیوں کو وارث بھی نہ بنا دیں۔ قرآن کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ کہیں قرآن پر عمل کرنے میں تمہارے اغیار تم سے سبقت نہ لے جائیں، نماز کے بارے میں اللہ سے ڈرو کیونکہ یہ تمہارے دین کا

[1] تاریخ طبری جلد سوم، خلافت راشدہ حصہ سوم (ترجمہ حبیب الرحمٰن صدیقی)

ستون ہے۔ تم اپنے پروردگار کے گھر (مسجد) کے بارے میں بھی اللہ سے ڈرو اور کسی وقت بھی جب تم زندہ رہو، اسے خالی نہ چھوڑو۔ جہاد کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کرو، زکوٰۃ کے بارے میں بھی اللہ سے ڈرو کیونکہ پروردگار کے غصہ کو بجھاتی ہے۔ ذمیوں کے بارے میں بھی اللہ سے ڈرو۔ تمہارے موجود ہوتے ہوئے کسی پر ظلم نہ کیا جائے۔ اپنے نبی ﷺ کے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں وصیت فرمائی ہے فقرا اور مساکین کے بارے میں بھی اللہ سے ڈرو، انہیں اپنی روزیوں اور کھانے میں شریک کرو۔ اپنے غلاموں کے بارے میں بھی اللہ سے ڈرو۔ دین کے معاملے میں ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ کرنا۔ نیک بات کہو جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کرو ورنہ اللہ تم پر برے لوگوں کو حاکم بنا دے گا۔ پھر تم دعا کرو گے اور تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں گی۔ صلہ رحمی کرو اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ جہاد میں پیٹھ پھیرنے، قطع رحمی اور تفرقہ بازی سے بچو۔ نیکی اور تقویٰ کے معاملے میں ایک دوسرے کی اعانت کرو۔ نافرمانی اور سرکشی میں کسی کی اعانت نہ کرو اور اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ وہ سخت عذاب دینے والا ہے۔''[1]

ترکہ

جب سے ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلامی فتوحات کا دور شروع ہوا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اموالِ غنیمت اور خمس میں سے حصہ ملتا رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے ینبوع میں آپ رضی اللہ عنہ کو ایک جاگیر بھی عطا کی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب مہاجرین وانصار کے وظائف مقرر کئے تو اہل بدر کے وظائف سب سے زیادہ تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ بھی انہی میں شامل تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کے بڑے صاحب زادے حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ بھی (اگرچہ حسنین بدری نہ تھے) ان تمام ذرائع سے آپ کی آمدنی بہت معقول تھی۔ بعض روایات کے مطابق صرف جاگیر سے ساٹھ ہزار درہم کی سالانہ یافت تھی۔ یہ زمین دوسرے لوگ بٹائی پر کاشت کرتے تھے۔ مگر آپ بے حد مخیرّ اور فیاض تھے۔ کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگی ترشی اور فقر و فاقہ ہی سے گزر بسر ہوتی تھی اور اسی میں خوش رہتے تھے۔ خلیفہ ہو کر ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی سنت کے مطابق بیت المال سے اپنا روزینہ صرف بقدر ضرورت لیا۔ وفات کے وقت یہ عالم تھا کہ گھر میں صرف سات سو درہم موجود تھے۔ وہ بھی اس لئے کہ آپ رضی اللہ عنہ ایک خادم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ورنہ یہ بھی راہِ خدا میں دے دیئے ہوتے۔ آپ فقر اسلامی پر کاربند رہے اور اپنی ضرورت سے زیادہ مال کو اللہ کی راہ میں بے دریغ خرچ کرتے رہے۔ المختصر ینبوع کی اراضی اور سات سو درہم نقد آپ کا ترکہ تھے۔

عہد عثمانی کے اواخر میں مسلمانوں میں دولت وامارت کی افراط ہوئی، لوگوں نے بلند و بالا پختہ اور عالی شان

[1] تاریخ طبری (خلافت راشدہ حصہ سوم)

عمارتیں بنوانا شروع کیں اور سرمایہ داری نے بھی سر اٹھایا لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا جو اندازِ معاشرت رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں تھا، وہی آخر تک رہا۔

حلیہ، لباس، غذا وغیرہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ قوی الجثہ تھے۔ درمیانہ قد، چوڑا چکلا سینہ جس پر بال تھے۔ دست و بازو مضبوط، شانے چوڑے اور پر گوشت اور کولھے بھاری تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، شگفتہ چہرہ، کشادہ پیشانی، ریش مبارک دراز اور دونوں شانوں کے درمیان پھیلی ہوئی تھی جو آخر عمر میں بالکل سفید ہوگئی تھی۔ زندگی میں صرف ایک دفعہ مہندی کا خضاب لگایا۔ چندیا کے بال جھڑ گئے تھے۔ چہرے مہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ لباس سادہ موٹے جھوٹے کپڑے کا ہوتا تھا جو کرتے۔ تہبت اور عمامے پر مشتمل ہوتا تھا۔ تہمت نصف پنڈلی تک ہوتی تھی۔ کرتے کی آستین چھوٹی ہوتی تھی۔ اکثر ہاتھ آدھے کھلے رہتے۔ بسا اوقات لباس میں پیوند لگے ہوتے۔

لباس کی طرح غذا بھی سادگی کا نمونہ تھی، کبھی دو سالن ایک ساتھ استعمال نہیں کیے، لباس، غذا وغیرہ کو جسم اور پیٹ کی ناگزیر ضرورت کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اصل انہاک زُہد و ورع، جہاد اور فلاح ملت کے کاموں میں تھا۔ آپ کی مہر خلافت پر الملک للہ (بادشاہی اللہ ہی کی ہے) کندہ تھا۔

ازواج و اولاد

حضرت علی رضی اللہ عنہ کثیر الازواج اور کثیر الاولاد تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی پہلی شادی سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ سے ہوئی۔ ان سے تین صاحب زادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور محسن رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے، آخر الذکر کمسنی ہی میں انتقال کر گئے۔ حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ نے تاریخ اسلام میں اہم اور ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ دو صاحب زادیاں حضرت زینب الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام کلثوم الکبریٰ رضی اللہ عنہا بھی جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہوئیں۔ حضرت زینب کی شادی حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے ہوئی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے حادثہ کربلا کے بعد بچے کھچے قافلہ حسینی کی قیادت و وکالت کی اور عبید اللہ بن زیاد اور یزید کے درباروں میں بڑی بے خوفی اور جرأت سے خاتونِ حق کا کردار ادا کیا۔ حضرت ام کلثوم کی شادی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک صاحب زادے حضرت زید بن عمر رضی اللہ عنہما اور ایک صاحب زادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ یہ وہی زید ہیں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں دمشق تشریف لے گئے۔ وہاں موخر الذکر کے دربار میں ان کے ایک فوجی سپہ سالار بسر بن ابی ارطاط نے حضرت زید کی موجودگی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں نازیبا الفاظ کہے۔ زید ضبط نہ کر سکے اور اپنے عصا سے بسر کا سر پھاڑ ڈالا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا کہ ایک معزز سردار کی نہ صرف اہانت کی بلکہ اسے زخمی بھی کر دیا؟ زید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اگر یہ علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں دوبارہ ایسے ایسے الفاظ استعمال کرے گا تو میں دوبارہ اس کے سر پر ویسی ہی ضرب لگاؤں گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

نے بسر بن ابی ارطاط سے کہا کہ ''تم نے ان (زید) کے نانا کو برا بھلا کہا، اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت ام کلثوم کا نکاح ان کے عم زاد محمد بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ہوا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسری شادی نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد متعدد خواتین سے نکاح کیے۔ حسب ذیل آٹھ خواتین کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں:

۱- خولہ بنت جعفر رضی اللہ عنہا

یہ قبیلہ بنو حنف سے تھیں۔ ان سے محمد بن علی رضی اللہ عنہ تولد ہوئے جو تاریخ میں اپنی والدہ کی نسبت سے محمد بن حنفیہ مشہور ہیں۔ ان کا اپنا تاریخی کردار ہے اہل تشیع کے فرقہ کیسانیہ کے بانی خیال کیے جاتے ہیں۔

۲- ام البنین بنت حزام کلابیہ۔

ان سے چار صاحب زادے عباس اکبر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، جعفر اکبر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ تھے جو سب کے سب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ میدان کربلا میں شہید ہوئے، ان کا کوئی پسماندہ نہ رہا۔

۳- لیلیٰ بنت مسعود۔

یہ بنو تمیم سے تھیں، ان سے دو بیٹے عبداللہ اور ابوبکر پیدا ہوئے۔ اول الذکر کو مختار بن ابی عبید ثقفی نے المذار میں قتل کیا۔ آخر الذکر کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شہید ہوئے۔ یہ دونوں لاولد رہے۔

۴- اسماء رضی اللہ عنہا بنت عمیس خثعمیہ۔

ان سے دو بیٹے یحییٰ اور عون تولد ہوئے۔ یہی اسماء رضی اللہ عنہا محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی والدہ بھی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔

۵- صہبا ام حبیب بنت ربیعہ۔

ان سے عمر اکبر اور رقیہ پیدا ہوئے۔

۶- امامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہا

ان کی والدہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھیں۔ ان سے محمد اوسط پیدا ہوئے۔

۷- ام سعید بنت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہا۔

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دو صاحبزادیوں ام الحسن اور رملہ کبریٰ کی ماں تھیں۔

۸- ایک بیٹے محمد اصغر بن علی رضی اللہ عنہ تھے جن کی والدہ ام ولد تھیں۔ یہ کربلا میں شہید ہوئے ان کے علاوہ متفرق امہاتِ اولاد سے متعدد صاحب زادیاں ہوئیں جن کے نام، ایک بیٹی کے سوا جو کم سنی میں فوت ہو گئیں، ابن سعد

اور طبری نے گنائے ہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کل چودہ بیٹے اور سترہ بیٹیاں تھیں۔ بعض مؤرخوں نے اس تعداد سے اختلاف کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے چار صاحب زادوں حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ، محمد حنفیہ اور عمر ابن التغلبیہ سے نسل چلی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرثیہ

متعدد صحابہ و تابعین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر مرثیے کہے۔ یہاں حضرت ابوالاسود دوئلی رضی اللہ عنہ کے چند اشعار کا ترجمہ دیا جاتا ہے:

۱- خوارج کو جہاں کہیں بھی ہوں کہہ دو، خدا کرے حاسدوں کی آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوں۔

۲- کیا تم نے شہر حرام ہی میں اس کی جدائی کا رنج پہچانا تھا جو سب سے زیادہ نیک تھا۔؟

۳- تم نے اسے قتل کر دیا جو بحر و بر میں سواری کرنے والوں سے بہتر تھا۔

۴- تمام فضائل ان میں جمع تھے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب تھے۔

۵- وہ حق کو قائم کرنے والے تھے اور اس میں شک نہ کرتے تھے۔ وہ اعداء اور اقارب سب سے بلا تمیز عدل کرتے تھے۔

۶- جو علم ان کے پاس تھا اس کو چھپاتے نہ تھے۔ اور وہ مغرور متکبر لوگوں میں سے نہ تھے۔

۷- لوگوں نے جب علی (کرم اللہ وجہہ) کو کھو دیا تو وہ قحط زدہ علاقے کے سرگرداں شتر مرغ جیسے ہو گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت (مختصر جائزہ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت فتنہ و خونریزی اور شکوک و شبہات کے عالم میں ہوئی جبکہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ دارالخلافہ مدینہ میں دندنا رہے تھے اور اہل مدینہ ان کے مقابلے میں لاچار اور بے بس تھے۔ بیت المال لوٹا جا چکا تھا اور خلافت کا نظم و نسق تہ و بالا ہو چکا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص اور امن و امان کی بحالی کا تھا۔ اس میں تاخیر اور ناکامی سے باقی تمام مسائل شاخ در شاخ پھوٹتے چلے گئے۔ جنگ جمل، جنگ صفین، تحکیم، جنگ نہروان، اہل عجم کی بغاوتیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مصر، حجاز، یمن وغیرہ علوی مقبوضات پر حملے یکے بعد دیگرے کسی انقطاع کے بغیر پیش آتے گئے۔ آپ نے ہزار چاہا کہ مسلمانوں میں خونریزی نہ ہو اور محبت اور اخوت کا وہی سنہری دور لوٹ آئے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد بابرکت میں تھا اور پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ کے زمانوں نیز عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں بھی رہا۔ لیکن جب خون عثمان رضی اللہ عنہ کی سرخ آندھی ایک دفعہ چڑھی تو پھر چڑھی ہی رہی۔ جمل، صفین، نہروان کی جنگوں میں تقریباً ایک لاکھ صحابہ اور تابعین کے قتل بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بھی یہ چڑھی ہوئی خونی آندھی نہ اتر سکی۔ مسلم خانہ جنگی کی وجہ سے آپ کی عظیم اور گوناگوں صلاحیتیں پوری طرح بروئے کار نہ آسکیں اور ملت و مملکت کے لئے آپ وہ کچھ نہ کر سکے

جو کر سکتے تھے اور کرنا چاہتے تھے۔ ملکی نظم و نسق میں جو بگاڑ پیدا ہو چکا تھا، اس کی پورے طور پر اصلاح نہ ہو سکی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کامیاب بغاوت کی وجہ سے دوسرے عمال میں بھی وہ دیانت اور ذمہ داری کا احساس نہ رہا جو عہد فاروقی کے عمال میں ہوا کرتا تھا۔ تعمیری اور فلاحی کاموں اور فتوحات کے لئے بھی آپ کو خاطر خواہ فرصت نہ ملی۔ تاہم نامساعد اور مخالف حالات میں آپ جو کچھ بھی کر سکے وہ آپ ہی کا کام تھا۔

مسلم خانہ جنگیوں، بغاوتوں، فتنوں، سازشوں اور گروہ بندیوں کی وجہ سے آپ نظم حکومت پر کما حقہ توجہ نہ دے سکے۔ اضطراب اور انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی، نہ وسیع سلطنت کے سارے صوبے آپ کے زیر نگیں رہ سکے نہ اسلامی مملکت میں مزید توسیع ہو سکی۔ مقبوضہ علاقوں میں بھی بدامنی کی وجہ سے عمال نے صحیح کردار ادا نہ کیا۔ مصر میں آپ کے پہلے گورنر قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے کامیابی سے حکومت چلائی۔ انہیں ہٹا کر محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو تعینات کیا۔ وہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی ٹکر کے نہ تھے۔ نتیجۃً مصر ہمیشہ کے لئے آپ کے قبضے سے نکل گیا۔

مدینہ، بصرہ، یمن خراسان میں آپ نے اپنے چچا زاد بھائیوں قثم بن عباس، عبید اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عباس اور بھانجے جعدہ بن ہبیرہ کو عامل مقرر کیا مگر وہ بھی آپ کی توقعات پر پورے نہ اتر سکے اور غیر مطمئن اور شورہ پشت عراقیوں کی عیب جو زبانیں کھل گئیں انہوں نے کہا کہ "اگر یہی کچھ ہونا تھا تو ہم نے عثمان رضی اللہ عنہ کو یونہی قتل کیا۔" فوج کے عدمِ تعاون اور سرکشانہ رویہ کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ آپ کی فوج میں بدوی قبیلوں اور نو مسلم عجمیوں کی کثرت تھی۔ سابق الایمان لوگ بہت کم تھے۔ زعمائے قریش کی اکثریت نے آپ سے تعاون نہ کیا۔ غالباً وہ نہیں چاہتے تھے کہ نبوت کے بعد خلافت بھی بنو ہاشم کے لئے مخصوص ہو جائے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ابتدائے خلافت میں کہیں زیادہ خطرناک اور پر آشوب حالات سے سابقہ پڑا کہ خود اسلام اور مسلمانوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ لیکن اس وقت مسلمان یکدل و یک جان اور متحد و متفق تھے۔ جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تازہ تازہ انتقال ہوا تھا۔ مسلمانوں میں اسلامی روح پوری طرح زندہ و بیدار تھی۔ اور پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عزمِ محکم کہ اسلامی حکومت کے باغیوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ تمام اہل حل و عقد نے ان کا ساتھ دیا اور باہمی صلاح مشورہ سے ضروری اقدامات کئے۔ مخالفوں کو کچلنے کے لئے جن فوجی سالاروں کا انتخاب کیا گیا وہ ہر طرح سے اہل، وفادار اور قابل اعتماد تھے۔ انہوں نے اپنے فرائض کو بڑی عمدگی سے ادا کیا۔ سبھی سابق الایمان مہاجرین و انصار نے دل و جان سے آپ سے تعاون کیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا جری، بیباک، صاحب عزم، مخلص اور دور اندیش انسان آپ کا دست راست تھا۔ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ شیخین رضی اللہ عنہما کے قریبی مشیر رہے اور وہ آپ کے صائب مشوروں پر عمل اور ان کا اعتراف کرتے رہے لیکن اپنے وقت پر انہیں ایسے مخلص، دور اندیش اور وفادار مشیر میسر نہ آ سکے۔ ویسے بھی آپ میں حد درجہ خود اعتمادی تھی اور دوسروں سے صلاح مشورہ ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے بھی بعض اہم لوگوں کی اہمیت نفس مجروح ہوئی اور وہ آپ سے الگ ہو گئے۔ مجلس شوریٰ معطل ہو کر رہ گئی۔ علم و فضل، تفقہ فی الدین اور فصاحت و بلاغت میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ آپ خود کو خلافت کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے حالانکہ حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ نے ابتدا میں خلیفہ بننے سے انکار کر دیا تھا اور لوگوں کے اصرار پر خلافت قبول کی تھی۔ بزرگ صحابہ خاص کر قریش کے سرداروں کو توقع تھی کہ آپ ان کے مشورہ سے امورِ حکومت سرانجام دیں گے لیکن آپ نے ان کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ سالاران لشکر اور عمالِ حکومت سے بھی سختی سے پیش آئے اور انہیں انعام و اکرام سے نہ نوازا حالانکہ سیاسی حالات کے اضطراب و انتشار کا تقاضا کچھ اور تھا۔ آپ کے دشمن آپ کے خلاف جن ہتھکنڈوں سے کام لے رہے تھے، آپ ان کی سطح پر نہیں اتر سکتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں بعض لوگوں کو زمین کے قطعات دیئے گئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے وہ سب واپس لے لئے۔ اس سے بھی ناراضگی پیدا ہوئی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہ صرف سارے عرب کو از سر نو فتح کیا بلکہ اپنے زمانے کی سپر طاقتوں، مشرقی رومی سلطنت اور ایرانی سلطنت سے بیک وقت جنگ چھیڑ دی اور کامیابیاں حاصل کیں۔ کچھ علاقے فتح ہوئے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عہد میں پوری ایرانی سلطنت اسلام کے قدموں میں آگری اور رومی سلطنت کے اہم مشرقی صوبے شام اردن، فلسطین، مصر اور افریقہ بھی اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے اگرچہ رومی سلطنت قائم رہی۔ عجمیوں نے کچھ برضا و رغبت اور کچھ حالات کی مصلحت سے دھڑا دھڑ اسلام قبول کرنا شروع کیا لیکن ان کے دلوں میں عظیم ایرانی سلطنت کا جسے وہ آسمانی خیال کرتے تھے، عرب کے صحرا نشینوں کے ہاتھوں خاتمہ کھٹکتا رہا اور وہ موقع کے انتظار میں رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے انہوں نے اپنے عزائم کو بروئے کار لانے کا آغاز کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں انہیں بھرپور موقع ملا۔

مدینہ کے ایرانی غلاموں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں سرگرم حصہ لیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ کو دارالخلافہ بنایا تو خراسان، فارس وغیرہ سابقہ ایرانی صوبوں میں بغاوتیں ہوئیں جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دبا دیا مگر ایرانیوں سے نرمی کا سلوک کیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے دیرینہ کینہ کے اظہار اور استعمال کے لئے اور بظاہر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سلوک سے متاثر ہو کر وہ کوفہ و بصرہ کے عرب قبیلوں کے موالی بن گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افواج میں شامل ہو گئے۔ ان کا مقصد مسلمانوں میں نفاق ڈالنا اور انہیں باہم لڑا کر ختم کرنا تھا۔ بادشاہ کی ذات اور اس کے خاندان کے متعلق جو آسمانی تقدس کے خیالات و اعتقادات اہل ایران میں مروج تھے وہ انہوں نے مصلحتاً حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کی طرف منتقل کر دیئے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اور خلافت کو عجمی نومسلموں اور غلاموں سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ بہرحال ایرانیوں نے اپنی سلطنت کی تباہی کا انتقام اسلام اور عربوں سے لے لیا جیسا کہ جدید ایرانی مؤرخ حسین کاظم زادہ نے اپنی تصنیف ''تجلیات روح ایران در ادوار تاریخی'' میں اعتراف کیا ہے۔ (اس کتاب کے اقتباسات کا حوالہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تذکرہ میں دیا جا چکا ہے) انہی ایرانیوں نے بنو ہاشم کو بنو امیہ سے لڑا کر اموی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ اور بنو عباس کو برسر اقتدار لائے جس کے نظم و نسق میں ان کا بہت عمل دخل رہا پھر ہلاکو کے ذریعے عربوں کی اس سلطنت کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ہلاکو کا مشیر ایرانی دانشور نصیر الدین طوسی تھا اور بغداد کے آخری عباسی خلیفہ کے شیعہ وزیر اعظم علقمی

نے اسے حملہ کی دعوت دی تھی۔ ویسے بھی بنوامیہ کی حکومت خالص عرب حکومت تھی جبکہ بنوعباس کے امراء وزراء کی اکثریت ایرانی تھی۔ لیکن ایرانیوں کو بنوعباس کے نام کی عرب حکومت کا وجود بھی ابتدا ہی سے کھلتا رہا تھا۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ شاہ معین الدین ندوی تاریخ اسلام (حصہ اول) میں رقم طراز ہیں:

(عہد صدیقی تک) ''عربوں میں غیر عنصر کی آمیزش نہ ہوئی تھی یعنی وہ قومیں جنہوں نے مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرا، مسلمان نہ ہوئی تھیں اور اُن کی جو قلیل تعداد مسلمان بھی ہوئی تھی، اس نے مسلمانوں میں اتنا اعتماد پیدا نہ کیا تھا کہ ان کے نظام شوریٰ میں دخیل ہو سکتے۔ پھر صحابہ کے اتحاد و اتفاق اور صولت فاروقی کے مقابلے میں مسلمانوں کے خلاف کسی سازش کی ہمت نہ ہوئی اور نہ یہ کامیاب ہوسکتی تھی۔ اسلامی فوجوں میں غیر قوموں کا عنصر شامل نہ تھا۔ جدید الاسلام عربوں تک کی باگ جو غیر اقوام کے مقابلے میں متحد الخیال تھے، اکابر صحابہ کے ہاتھ میں رہتی تھی اس لئے کسی پہلو سے غیر قوموں کو دخل اندازی کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بہت جلد حالات پر قابو حاصل کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک یہ خصوصیات قائم رہیں۔ اس لئے اس زمانہ تک نظام خلافت کو جنبش نہ ہونے پائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے سے مٹنے لگیں۔ جس کے نتائج انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں قریب قریب سب ختم ہوگئیں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ اور ان کی شہادت میں یہودی عبداللہ ابن سبا کی سازش وفتنہ پردازی اور وراثت وحکومت وامامت کے متعلق ایرانیوں سے اخذ کردہ عقائد وتصورات کا بڑا دخل تھا۔ مصری، کوفی اور بصری باغیوں کے ساتھ اہل مدینہ کے ایرانی غلام بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہاں سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہودی۔ ایرانی سازش اور گٹھ جوڑ کا آغاز ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ ناکام کرنے والے اور فرقہ شیعہ کو جنم دینے والے اور اسلام میں مستقل تفرقہ بازی کی بنیاد رکھنے والے نومسلم عجمی ہی تھے۔ مدینہ سے کوفہ میں دارالخلافہ کی منتقلی نے اس میں آسانیاں پیدا کیں لیکن یہ ایک الگ اور طویل داستان ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔

غرضیکہ جو عناصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے ان میں سے اکثر موقع پرست تھے اور دل سے آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ تھے۔ آپ جس تقویٰ، دیانتداری، عدل، مساوات، حق وصداقت اور اصول پسندی کے علمبردار تھے۔ اس کو ماننے اور قبول کرنے کی صلاحیتیں لوگوں کے دلوں سے اٹھتی جاتی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کا طرز عمل صحیح اسلامی طرز عمل تھا۔ لیکن حالات بدل چکے تھے۔ عرب قبائل کے مفاد پرست گروہوں کو آپ کا بے لچک طرز عمل پسند نہ تھا۔ انعامات وکرامات سے مایوس ہوکر وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوتے گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہر صورت میں دین اور خلافت کو بچانے کی کوشش کی اور اس میں اپنی جان تک دے دی۔ جسٹس سید امیر علی لکھتے ہیں:

''اگر آپ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سی سختی ہوتی تو آپ عربوں جیسی شتر بے مہار قوم پر حکومت کرنے میں زیادہ کامیاب رہتے لیکن آپ کی بردباری اور کریم النفسی کا لوگوں نے غلط

مطلب لیا اور آپ کی انسانیت اور صداقت پرستی سے آپ کے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا۔"[1]

اولسنر (Olsner) کہتا ہے کہ

"اگر حضرت علی کو امن و اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع دیا جاتا تو ان کے محاسن ذاتی، ان کی ثابت قدمی اور ان کی اخلاقی فضیلت کی بدولت پرانی جمہوریت کو اور اس کے سیدھے سادے طریقوں کو دوام حاصل ہو جاتا۔"[2]

بہر حال دن رات جنگ و جدال، سازشوں، بغاوتوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی آپ رضی اللہ عنہ نے ایک مثالی خلیفہ راشد کا کردار ادا کیا اور حکومت اور مسلمانوں کو صحیح نہج پر چلانے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کر دیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کے آپ مستحق تھے۔

مختصراً آپ کی سیاسی ناکامی کے حسب ذیل بڑے اسباب تھے۔

۱- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص میں ناکامی

۲- مجلس شوریٰ کا خاتمہ

۳- اکابر قریش اور دوسرے معززین سے عدم التفات۔

۴- حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی

۵- ڈپلومیسی کا فقدان۔ حالانکہ حضرت معاویہ کے مقابلے میں اس کی ضرورت تھی۔

۶- امرائے لشکر اور عمال حکومت کے ساتھ سخت رویہ اور حساب طلبی۔ اب عہد فاروقی نہ رہا تھا۔

۷- مخالفین خاص کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے سفارتی سطح پر بات چیت کے لئے غلط افراد کا انتخاب۔

بحیثیت مجموعی آپ کا عہد خلافت کامیاب نہ رہا۔ آپ کی دانش و حکمت دوسروں کے کام آئی۔

نظم حکومت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکومتی نظم و نسق کا جو ڈھانچہ قائم کیا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے قائم رکھا۔ آپ کو اپنے دور خلافت میں امن و سکون کا ایک لمحہ بھی نہ مل سکا۔ ملکی انتظام پر توجہ کرنے کی آپ کو بہت کم فرصت ملی تاہم آپ کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس تھا اور اپنے عمال کو بھی ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی یاد دہانی کرتے رہتے تھے بلکہ ان کی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ رعایا سے عدل و شفقت کا سلوک کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً احکام بھیجتے رہتے تھے۔ آپ کے متعدد ایسے خطوط تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ عمال کی غلط روی پر محاسبہ کرتے تھے، کبھی خود خط لکھ کر جواب طلبی کرتے اور کبھی تحقیقاتی کمیشن مقرر کرتے تھے، تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دنوں میں عمال میں آزادروی کا جو رجحان پیدا ہو گیا تھا وہ پورے طور پر دبایا نہ جا سکا۔ سول اور فوجی دونوں شعبوں کی

---

۱ مختصر تاریخ صحرانشیناں (A Short History of the Saracens) باب ۵ صفحہ ۵۲

۲ اسپرٹ آف اسلام کا ترجمہ، روح اسلام، صفحہ ۴۳۶

کارکردگی میں ڈھیل پیدا ہوگئی۔ انگریز مؤرخ ایڈورڈ گبن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد کی خانہ جنگی کو یورپ کی نجات قرار دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اس تحقیق کے دوران میں میں ان واقعات کو منظر عام پر لاؤں گا جن سے ہمارے برطانوی آباؤ اجداد اور ہمسائے گاں (فرانس، سپین اور پرتگال) قرآن کی معاشرتی و مذہبی حلقہ بگوشی سے محفوظ رہے۔ روم کی عظمت وشوکت محفوظ رہی قسطنطنیہ کا محکوم ہو جانا رک رہا اور عیسائیوں کے دشمن مسلمانوں کے اندر نفاق اور زوال کی تخم ریزی ہو سکی۔''

دارالخلافہ کو مدینہ سے کوفہ منتقل کرنے سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا۔ آپ اپنی قابل اعتماد بنیاد وا ساس مکہ اور مدینہ بلکہ پورے حجاز سے کٹ گئے اور ایک لحاظ سے اجنبیوں کے درمیان گھر گئے جنہیں اپنے مفادات سے زیادہ اور آپ اور آپ کے مشن سے ہمدردی اور دلچسپی کم تھی۔ لوگوں میں آپ کے حلقہ اطاعت میں داخل ہونے کی بجائے اس سے نکلنے کا رجحان پیدا ہوا اور نظم ونسق کی وہ شان نہ رہی جو عہد فاروقی میں تھی۔

بیت المال

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے پیشروؤں کی طرح اپنے آپ کو بیت المال کا امین سمجھتے تھے۔ اس کی کوڑی کوڑی کا حساب رکھتے اور لیتے تھے۔ ایک پیسہ بھی بیجا صرف نہ ہونے دیتے تھے۔ جزیہ، خراج، غنیمت، زکوٰۃ، صدقات وغیرہ کے اموال آتے ہی مستحقین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ جب آپ بیت المال کا سب روپیہ اہل حقوق میں تقسیم کر کے اسے خالی کر دیتے تو اس میں دو رکعت نفل پڑھتے اور فرماتے'' تجھے گواہی دینی ہوگی کہ میں نے تجھ کو حق کے ساتھ بھرا اور حق ہی کے ساتھ خالی کر دیا۔'' بیت المال کے دروازے مستحق، غربا مساکین وغیرہ کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے، کسی غیر مستحق کو کچھ نہ دیتے خواہ وہ آپ کا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔

ایک دفعہ اصفہان کے خراج میں شہد اور چربی آئی۔ آپ کی صاحب زادی حضرت ام کلثوم کو ضرورت تھی۔ ان کے مانگنے پر خراج کے انچارج حضرت عمر بن ابی سلمہ نے شہد اور چربی کا ایک ایک پیپہ بھیج دیا۔ دوسرے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دو پیپے کم پائے تو عمر بن ابی سلمہ سے جواب طلبی کی۔ انہوں نے صورت واقعہ بتا دی۔ آپ نے اسی وقت دونوں پیپے حضرت ام کلثوم سے واپس منگا کر بیت المال میں داخل کر دیئے جو شہد اور چربی خرچ ہو چکی تھی اس کا اندازہ لگا کر اپنی طرف سے بیت المال میں قیمت جمع کرا دی، اسی طرح کی مثالیں اور بھی ہیں۔

مالی اصلاحات

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صیغۂ مال میں کچھ اصلاحات بھی کیں۔ مثلاً

۱- آپ نے جنگلات پر بھی محصول عائد کیا۔ اس سے پہلے جنگلات محصول سے بری تھے۔

۲- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب گھوڑوں کی تجارت ہونے لگی تو انہوں نے گھوڑوں پر زکوٰۃ عائد کر دی تھی چونکہ عہد نبوی میں گھوڑوں پر زکوٰۃ نہ تھی۔ اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منسوخ کر دی۔

فوجی استحکامات

آپ کا عہد خلافت جنگ و جدال میں گزرا۔ فوج پر آپ کی خصوصی توجہ تھی۔ جنگ صفین کے موقع پر اسی ہزار فوج آپ کے ہمراہ تھی۔ اتنی کثیر فوج اس سے پہلے مسلمانوں نے کسی جنگ میں اکٹھی نہ کی تھی۔ تاہم آپ کو صیغۂ فوج میں اصلاح و ترقی کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ ضرورت کے تحت کچھ فوجی چھاؤنیاں ضرور قائم کیں۔ اصطخر میں حصن زیاد آپ ہی کے دور میں تعمیر ہوا۔

ذمی رعایا سے سلوک

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ذمی رعایا کے حقوق کا خاص خیال رکھتے تھے اور اپنے عمال کو ان کے ساتھ نرم اور عمدہ سلوک کرنے اور ان کے جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ عدل و انصاف اور رعایا پروری میں آپ انہیں مسلمانوں کے مساوی رکھتے تھے اور کوئی امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ بعض علاقوں کے ذمیوں کی طرف سے عمال کے خلاف شکایتیں آئیں تو آپ نے ان کا سختی سے نوٹس لیا اور متعلقہ عمال کو سخت تنبیہہ کی۔ اہل عجم آپ کے نرمی و بردباری کے سلوک سے بہت خوش تھے اور کہتے تھے کہ اس عربی نے نوشیرواں کی یاد تازہ کر دی۔

ایک علاقے کے ذمیوں کی آبپاشی کی نہر پٹ گئی تھی۔ آپ نے وہاں کے عامل کو لکھا کہ ''تمہارے علاقے کے ذمیوں نے درخواست دی ہے کہ ان کی ایک نہر پٹ گئی ہے۔ جس کا بنانا مسلمانوں کا فرض ہے تم اسے درست کرا کے انہیں آباد کرا دو۔ مجھے ان کا آباد رہنا اس سے زیادہ پسند ہے کہ وہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں یا عاجز و درماندہ ہو جائیں یا ملک کی بھلائی میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و محاسن

حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلفائے راشدین اور دوسرے مہاجرین و انصار میں ایک خصوصی امتیاز اور مرتبہ کے مالک ہیں۔ آپ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی بھی ہیں اور داماد بھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دامن نبوت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے۔ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم و تربیت شبانہ روز میسر رہی خلوت و جلوت کی یہ طویل معیت کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ اس نے آپ کو ابتدا ہی سے زر خالص بنا دیا۔ اور ہر قسم کے علمی، اخلاقی، روحانی فضائل سے آراستہ کر دیا۔ نہ تو آپ نے شرک و بت پرستی کی نہ مشرکین عرب کے دوسرے اخلاقی رذائل سے آلودہ ہوئے۔ اول سے آخر تک آپ کی زندگی نہایت پاکیزہ رہی۔ اپنی عزیز ترین صاحب زادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح کرتے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بیٹی! میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان کے بہترین شخص سے کی ہے۔'' جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اعزہ و اقارب کو دعوت اسلام پیش کی تو صرف آپ نے لبیک کہا حالانکہ آپ سب سے کم عمر تھے۔ لیکن آپ نے حق کے قبول و اظہار میں اپنے کسی بڑے

[1] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین ندوی بحوالہ تاریخ یعقوبی

اور بزرگ کا نہ خوف کیا نہ پروا کی۔ ہجرتِ نبوی کے وقت بے خوف اور مطمئن ہو کر بستر نبوت پر سوئے جبکہ مسلح دشمنوں نے چاروں طرف سے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ جہاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سفر ہجرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا فخر حاصل ہوا، وہاں آپ کو بستر نبوی پر تلواروں کی چھاؤں میں سونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جناب خاتم النبیین ورحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو بحیثیت امین کے پیچھے چھوڑ گئے تھے تا کہ لوگوں کی امانتیں ان کے حوالے کر کے مدینہ چلے آئیں اور پھر ایک آخری امانت ۹ ہجری میں حج کے موقع پر مدینہ سے مکہ جا کر حجاج کے مجمع میں ادا کی۔ امیر الحج ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے لیکن سورہ توبہ کی آیات و احکام کا اعلان کرنے کے لئے حضور نے خاص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ ہجرت کے موقع کی طرح اس موقع پر بھی یہ دونوں حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی نمائندے تھے۔ ان میں سے اول الذکر آنحضرت کے خسر اور مؤخر الذکر داماد تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بالترتیب خلیفہ اول اور خلیفہ چہارم ہوئے۔

جناب علی رضی اللہ عنہ نے تمام غزوات نبوی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بڑے بڑے کفار اور اعدائے اسلام آپ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اکثر لشکر اسلام کا علم آپ کے سپرد ہوا۔ انفرادی مبارزت طلبی میں ہر دشمن کو شکست دی اور قتل کیا۔ آپ کی ذاتی شجاعت و پہلوانی کا یہ اثر ہے کہ آج بھی پاکستان اور بھارت کے مسلمان پہلوان کشتی کے اکھاڑے میں علی علی کے نعرے لگاتے ہوئے اترتے ہیں۔ صلح نامہ حدیبیہ آپ ہی نے لکھا۔ جب قریش کے نمائندے نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رسول اللہ کے الفاظ پر اعتراض کیا اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے یہ الفاظ کاٹ دینے کو کہا تو بھی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبے ہوئے علی رضی اللہ عنہ نے کاٹنے سے انکار کر دیا۔ خیبر کا قلعہ قموص فتح ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ تب جناب رسالت مآب نے فرمایا کہ ''کل میں ایسے شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ یہ اعزاز حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا قلعہ قموص ضرب حیدری سے فتح ہوا اور اس کا سردار مرحب جو ہزار سوار کے برابر سمجھا جاتا تھا آپ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو مدینہ میں اپنا نائب بنا کر چھوڑ گئے اور فرمایا کہ ''اے علی رضی اللہ عنہ! تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کی موسیٰ سے۔ البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔'' غدیر خم کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس کا میں مولا (دوست) ہوں، علی رضی اللہ عنہ بھی اس کا مولا (دوست) ہے۔'' فاتح قادسیہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس نے علی رضی اللہ عنہ کو تکلیف دی اس نے مجھ کو تکلیف دی'' ام المومنین حضرت ام سلمیٰ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب رحمت للعالمین شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس نے علی رضی اللہ عنہ سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی اس نے اللہ سے محبت کی۔'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ''میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات مجموعۂ کمالات تھی۔ کتنے ہی مفاخر ان کی ذات میں جمع ہو گئے تھے۔ آپ حافظ قرآن اور کاتب وحی تھے۔ قرآن کی تعلیم براہِ راست مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم سے پائی تھی۔ کلام اللہ پر بڑی وسیع نظر تھی۔ فرماتے تھے کہ قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس کے متعلق میں نہ جانتا ہوں کہ وہ کس بارے میں، کہاں اور کس کے

متعلق نازل ہوئی۔[1] آپ کو قرآن سے استنباطِ مسائل واحکام کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ حضور ﷺ کی رحلت کے بعد آپ نے کچھ عرصہ خانہ نشیں رہ کر آیتوں اور سورتوں کی نزولی ترتیب کے مطابق قرآن حکیم کا ایک نسخہ مرتب کیا تھا۔[2]

حضور ﷺ کی رحلت کے بعد پہلے تین خلفائے راشدین کے عہد میں ملکی وملی معاملات خاص کر جہاد میں سرگرم حصہ نہیں لیا۔ البتہ آپ مجلس شوریٰ کے اہم رکن تھے اور اپنی اصابت رائے، علم قرآن وحدیث اور تفقہ فی الدین کی بنا پر بہت عمدہ مشورے دیتے رہے۔ لیکن اپنا زیادہ وقت علمی، عقلی، روحانی مشاغل میں صرف کرتے رہے۔ علم وفضل میں آپ تمام صحابہ سے بڑھ کر تھے۔ اپنی خلافت کے دوران میں ایک دفعہ خطبہ دیتے ہوئے حاضرین وسامعین سے فرمایا کہ ''مجھ سے جو سوال چاہے پوچھو، میں سب کے جواب دوں گا۔'' ایسی بھرپور خوداعتمادی کے ساتھ کوئی دوسرا بزرگ ایسی بات نہ کہہ سکا۔

رسول اللہ ﷺ کے فرمودات (احادیث) سننے کا سب سے زیادہ موقع آپ کو ملا۔ آپ سے پانچ سو چھیاسی احادیث مروی ہیں۔ کسی دوسرے خلیفہ راشد سے اتنی احادیث مروی نہیں، نہ انہیں اس کی مہلت ملی نہ ایسے گوناگوں مسائل پیش آئے جن میں احادیث کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو ابتداء میں صحابہ کو روایت حدیث سے منع کرتے تھے کہ مبادا لوگ قرآن وحدیث کو غلط ملط کردیں۔ صرف چند دوسرے صحابہ مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مرویات آپ سے زیادہ ہیں۔ آپ ان معدودے چند صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے احادیث نبوی قلمبند کرنے کا اہتمام کیا۔

بنیادی ذرائع علم (قرآن وحدیث) سے احکام ومسائل مستنبط کرنے کے لئے جس ذہانت، طباعی، دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی کی ضرورت تھی وہ آپ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آپ کو قرآن وحدیث سے جزوی اور فروعی مسائل واحکام اخذ کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے آپ کو یمن میں قاضی بنا کر بھیجا تھا اور فرمایا تھا کہ اقضٰی ہم علی (علی رضی اللہ عنہ سب سے بہتر قاضی) ہیں اپنے پیشرو خلفائے ثلاثہ کے عہد میں بھی آپ فتاویٰ اور قضا کی خدمات سرانجام دیتے اور حدود نافذ کرتے رہے۔ تفقہ فی الدین اور شریعت کی اصل روح کے علم میں آپ کا کوئی ہم سر نہ تھا۔ آپ مسائل اور مقدمات کی تہہ تک فوراً پہنچ جاتے تھے۔ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں آپ نے اپنے خلاف لڑنے والوں کے متعلق جو رویہ اختیار کیا اس سے امت کے علماء وفقہا نے مسلمانوں کی باہمی جنگ کے متعلق پورا ضابطہ اخلاق مستنبط کیا۔

شعروشاعری سے بھی شغف تھا اگرچہ مروجہ دیوان جعلی خیال کیا جاتا ہے کیونکہ وہ آپ کے مرتبہ سے فروتر ہے۔

عربی زبان کی نحو کی ایجاد کا سہرا آپ کے سر ہے۔ بصرہ کے قاضی حضرت ابوالاسود دوئلی کو آپ نے اس کی تعلیم دی۔ غرضیکہ آپ وہ مردِ دانا تھے جس کے بیان میں حکمت کے چشمے ابلتے تھے۔ آپ کی زبان سے خطابت، فصاحت اور بلاغت کا سیلاب امنڈتا تھا۔ آپ نے وقتاً فوقتاً جو خطبات دیئے اور خطوط لکھے وہ اس پر شاہد ہیں۔

---

1. طبقات ابن سعد جلد ۳

2. ابن ندیم نے ''فہرست'' میں اس ترتیب کی تفصیل دی ہے۔ مؤلف

معروف کتاب نہج البلاغہ آپ کے خطبات، مکتوبات اور منشورات کا مجموعہ ہے جو آپ کی وفات کے تقریباً تین سو سال بعد مرتب کیا گیا اگرچہ اس کی تاریخی حیثیت کو چیلنج کیا گیا ہے اور بعض خطبات کو الحاقی قرار دیا ہے (خاص کر خطبہ "شقشقیہ" کو تو سراسر جعلی مانا ہے اوروں کو چھوڑ کر ایرانی محقق اور فاضل ڈاکٹر صادق تقوی کی تصنیف دستور علی دیکھ لیجئے۔") تاہم اس میں شک نہیں کہ اس کا ایک بڑا حصہ صحیح ہے۔ تاریخ طبری، اخبار الطوال، تاریخ یعقوبی اور مروج الذہب (مسعودی) میں بھی آپ کے متعدد خطوط اور خطبات محفوظ ہیں۔ صفائے باطن، تزکیۂ نفس اور روحانی معارف واسرار کی گرہ کشائی میں آپ درجہ کمال پر تھے۔ صوفیا کے اکثر سلسلوں مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ کا آغاز آپ سے ہوتا ہے دنیا کی تاریخ میں ایسی جامع کمالات شخصیتیں بہت کم ہوئی ہیں۔

سیرت وکردار

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی خلق نبوی اور تعلیمات اسلامی کا حسین پیکر تھی، زُہد وتقویٰ، ریاضت و عبادت، علم، تفقہ، دیانت، صیانت، نرم خوئی، انکسار، بردباری، عدل ومساوات، خدا ترسی، سخاوت، فیاضی اور رضا کارانہ فقر وفاقہ آپ کے اخلاق وزندگی کے نمایاں پہلو تھے۔ رذائل وذمائم اور دنیاوی مزخرفات سے آپ کا دامن ہمیشہ پاک رہا۔ جنگ وجدال کی مصروفیات میں بھی شب بیداری اور عبادت گزاری میں کبھی فرق نہ آیا۔ راتوں کو عبادت کرتے اور دن کو روزہ رکھتے۔ نماز پڑھنے لگتے تو بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا اور رنگ متغیر ہو جاتا۔ فرماتے کہ وہ امانت اٹھانے کا وقت آیا ہے جس کے ساتوں زمین وآسمان متحمل نہ ہو سکے۔ بڑے انہماک اور خضوع وخشوع سے نماز ادا کرتے اور اپنی خبر نہ رہتی۔ نماز ہی کی فکر میں شہید ہوئے۔

انفاق فی سبیل اللہ

اللہ کی راہ میں بے دریغ خرچ کرتے۔ آپ کے دروازے غریبوں، مسکینوں، محتاجوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے۔ کبھی کوئی سائل آپ کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خود فقر وفاقہ کی زندگی گزارتے۔ چالیس ہزار زکوٰۃ کی آمدنی رکھنے کے باوجود تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے۔ اپنے زمانہ خلافت میں ایک دفعہ تہمت خریدنے کے لئے رقم نہ تھی۔ اپنی تلوار بیچنا چاہی اور مسجد میں اعلان کیا۔ ایک جاں نثار نے تلوار نہ بیچنے دی اور اپنے پاس سے رقم قرض دے دی۔ کبھی اپنے لئے کوئی ڈھب کا مکان نہ بنا سکے۔ ساری عمر معمولی سے مکان میں گزارہ کرتے رہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا شادی کے وقت جو بہت مختصر اور معمولی سا سامانِ جہیز ساتھ لائی تھیں۔ ساری عمر اس میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

سادہ زندگی

جہیز فاطمی کے علاوہ مینڈھے کی ایک کھال تھی جو راتوں کو بستر کا کام دیتی تھی اور دن کو اسی میں گھوڑے، اونٹ وغیرہ کو چارہ ڈالتے تھے، اوڑھنے کے لئے ایک مختصر سی چادر تھی۔ جس سے بیک وقت سر اور پاؤں ڈھانکنا ممکن نہ تھا۔ ایک دفعہ شدید سردی میں آپ ایک معمولی پرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے اور ٹھٹھر رہے تھے۔ ایک دیکھنے والے

نے عرض کیا کہ ''امیر المومنین! بیت المال میں آپ کا اور آپ کے اہل وعیال کا بھی حق ہے آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟'' مطلب یہ تھا کہ ایک موٹی اونی قیمتی چادر بیت المال کے خرچ سے لے لیجئے۔ آپ نے جواب دیا کہ ''میں مسلمانوں کے حصہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا'' یعنی اگر میں اپنے حصہ سے زیادہ لوں تو دوسرے مسلمانوں کی حق تلفی ہوگی۔ اسی طرح ایک دفعہ آپ کے غلام قنبر نے کہا کہ بیت المال میں آپ کا اور آپ کے اہل وعیال کا بھی حق ہے لیکن آپ اپنے لئے کچھ باقی نہیں چھوڑتے۔ اس لئے میں نے آپ کے لئے ایک چیز چھپالی ہے۔ پوچھا وہ کیا؟ قنبر نے عرض کیا کہ چل کر ملاحظہ فرمالیجئے۔ جا کر دیکھا تو سونے اور چاندی کے برتن تھے۔ فرمایا ''تیری ماں تجھے روئے۔ تو میرے گھر کو اتنی بڑی آگ میں دھکیلنا چاہتا تھا'' اسی وقت سارے برتن مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب تک زندہ رہیں، گھر کا سارا کام کاج خود کرتی رہیں۔ چکی پیستی تھیں اور پانی کی مشکیں بھر کر لاتی تھیں۔ بعض دفعہ فاقوں کی نوبت بھی آجاتی تھی، خلیفہ ہو کر بھی آپ کی گھریلو زندگی کا انداز وہی رہا۔ زُہد وتقویٰ، فقر وسادگی آپ کا شعار رہے۔ نہ دولت کدے پر چوکی پہرہ نہ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ۔

آپ کی پوری زندگی انتہائی سادگی کا مظہر تھی۔ جاہ وحشم، شان وشوکت اور تکلفات کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر نکلیں کوئی محافظ وغیرہ ساتھ نہ ہوتے تھے۔ اپنا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ اپنا جوتا تک خود گانٹھ لیتے تھے کھانا بھی بہت معمولی ہوتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ خلیفۂ وقت کو مسلمانوں کے مال میں دو پیالوں کا حق ہے۔ ایک خود کھائے اور اپنے اہل وعیال کو کھلائے، دوسرا اللہ کی مخلوق کے سامنے پیش کرے۔ عام طور پر جو کی روٹی آپ کی خوراک رہی۔ نفیس اور پر تکلف غذاؤں سے آخر تک پرہیز کرتے رہے۔ کپڑوں میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے عہد کی سادہ زندگی، عدل وانصاف اور اسلامی اخوت ومؤدت کو واپس لانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر حالات بدل چکے تھے۔ آپ کے مدمقابل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقا پر تکلف زندگی بسر کرتے تھے۔

شجاعت

حق کی خاطر جنگ وجدال ہو تو شیر بیشۂ شجاعت تھے۔ ذاتی عداوت کسی سے نہ تھی۔ اور نہ ذاتی انتقام کے لئے جنگ کی نہ کسی کو قتل کیا۔ صلح اور جنگ دونوں میں آپ اسلام کے اعلیٰ اور مثالی اصولوں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ واقعہ مشہور ہے کہ کسی جنگ میں آپ حریف پر غالب آگئے اور اس کے سینے پر چڑھ کر اسے قتل کرنا چاہتے تھے کہ اس نے زندگی سے مایوس ہو کر آپ کے منہ پر تھوک دیا۔ اس پر آپ اسے چھوڑ کر الگ کھڑے ہوگئے۔ وہ شخص حیرت زدہ رہ گیا۔ اور کہا ''اے علی رضی اللہ عنہ! آپ مجھ پر قابو پا چکے تھے، پھر چھوڑ کیوں دیا؟'' فرمایا کہ ''پہلے میری جنگ تمہارے ساتھ محض خدا کے لئے تھی۔ جب تم نے میرے منہ پر تھوک دیا تو اس میں ذاتی عنصر شامل ہوگیا۔ اب اگر میں تم کو قتل کرتا تو اس میں ذاتی انتقام کا جذبہ شامل ہوتا اس لئے میں نے چھوڑ دیا'' وہ شخص متاثر ہوا اور مسلمان ہو گیا جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، خیبر کا قلعہ قموص آپ کی شجاعت وتہور سے فتح ہوا۔

جنگ صفین میں آپ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پکارا کہ ''کیوں مسلمانوں کا خون بہاتے ہو آؤ ہم تم

دونوں باہم لڑکر فیصلہ کرلیں۔ جو غالب آئے وہی مسلمانوں کا امیر ہو۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو پہلو بچا گئے لیکن ان کے دست راست حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ میدان میں آپ کے سامنے آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ اس طرح وار کیا کہ عمرو رضی اللہ عنہ گھوڑے سے گر گئے اور برہنہ ہو گئے۔ شیر خدا رضی اللہ عنہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو جانے دیا۔ اگر کوئی دنیادار حکمران اور سیاستدان ہوتا تو یہ سنہری موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے عظیم مدبر اور سیاستدان اور جنگ صفین کے روح رواں کو زندہ نہ چھوڑتا اور شاید جنگ ختم ہو جاتی۔ جنگ صفین کی لیلۃ الہریر کو آپ کے ہاتھ سے ایک ہی دن رات میں پانچ سو مخالف قتل ہوئے۔ آپ نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے بارے میں خطرناک حد تک امن و صلح جوئی کی پالیسی اختیار کئے رکھی۔ آپ وہ مثالی مومن تھے جس کے متعلق اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　　رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

تاریخ کے قاری کو ہر لحظہ آپ کی نئی شان نئی آن دکھائی دیتی ہے۔ آپ گفتار و کردار میں اللہ کی برہان تھے۔

صائب الرائے

آپ بڑے زیرک، سریع الفہم، نکتہ شناس اور صائب الرائے تھے۔ جنگ و سیاست میں اگر آپ کی فوج آپ کی عقل و رائے کا اتباع کرتی تو جنگ صفین کا فیصلہ کچھ اور ہوتا اور معاہدۂ تحکیم کی نوبت نہ آتی اور اگر تحکیم کے موقع پر بھی آپ کے سردارانِ فوج آپ کے مشورہ پر چلتے تو تحکیم کا نتیجہ آپ کے حق میں ہوسکتا تھا۔ لیکن فوج نے آپ کو اپنے پیچھے چلانا چاہا اور بار بار نافرمانی کا مظاہرہ کیا۔ آپ کے پیشرو خلفا کو آپ کے صائب مشوروں پر بڑا اعتماد تھا۔ آپ کے دانشمندانہ اقوال و امثال اس کثرت سے تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں کہ اور کسی کے شائد ہی ہوں گے۔

عدل و مساوات

آپ نے عدل و مساوات کو ہمیشہ زندہ رکھا۔ دوست، دشمن سب کے ساتھ عدل سے پیش آتے۔ جو چیز اپنے لئے پسند کرتے وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرتے۔ اس میں آقا اور غلام کا بھی امتیاز نہ تھا۔ ایک دفعہ دو چادریں خریدیں۔ اپنے غلام قنبر سے کہا کہ دونوں میں سے جو تمہیں پسند ہو لے لو۔ اس نے اپنی پسند کی لے لی تو دوسری اپنے لئے رکھ لی۔ بے نفسی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تکبر اور تفاخر سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، ایک دفعہ ایک شخص تعظیماً آپ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تو منع کر دیا اور فرمایا کہ اس میں والی کے لئے فتنہ اور مومن کے لئے ذلت ہے۔[1]

---

[1] کاش آج کے مسلمان حکمران بھی اس پر عمل کریں اور مسلمانوں کو اس اجتماعی ذلت سے بچائیں۔ وہ لوگوں کو اپنے پیچھے چلانے میں اپنی انا کی تسکین اور اپنے لئے باعث فخر و شان سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں، کہیں آنا جانا ہو تو گھنٹوں پہلے ان سڑکوں پر عوام کی آمد و رفت بند کر دی جاتی ہے اور پھر آگے پیچھے محافظوں کی گاڑیوں کی قطاریں ہوتی ہیں اور جن جلسوں میں انہیں خطاب کرنا ہوتا ہے وہاں بہت سے لوگ رونق بڑھانے کے لئے زبردستی یا کرائے پر لائے جاتے ہیں اور ہوائی اڈوں پر بڑوں کے علاوہ کمسن بچوں بچیوں کی استقبالی پریڈ کرائی جاتی ہے اس طرح اپنی ہر دلعزیزی کا منظر پیش کیا جاتا ہے یہ ہے ان کی اسلامی، مساوات اور جمہوریت پسندی۔ مولف

ایک دفعہ آپ کی زرہ گم ہوگئی جسے آپ نے ایک ذمی یہودی کے پاس دیکھا تو دعویٰ کیا کہ وہ آپ کی ہے لیکن یہودی نے انکار کیا۔ آپ نے قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا اور یہودی کے ساتھ عدالت میں پیش ہوئے۔ قاضی نے پوچھا کہ ''امیر المومنین! آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ زرہ آپ کی ہے؟'' فرمایا کہ ''میرا بیٹا حسن اور غلام قنبر اس کے گواہ ہیں۔'' قاضی نے جواب دیا کہ باپ کے حق میں بیٹے کی اور مالک کے حق میں غلام کی گواہی قبول نہیں کی جا سکتی۔'' آپ خاموش ہو گئے۔ پھر قاضی نے یہودی سے پوچھا کہ تم کیسے کہتے ہو کہ یہ زرہ تمہاری ہے؟ یہودی نے جواب دیا کہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس پر میرا قبضہ ہے۔ قاضی نے یہودی کے حق میں مقدمہ خارج کر دیا۔ مدعی امیر المومنین مدعا علیہ یہودی کے ساتھ خاموشی سے عدالت سے باہر آ گئے۔ باہر آ کر یہودی نے کہا کہ ''امیر المومنین! یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ آپ لے لیجئے میں نے آپ کا اور آپ کی عدالت کا انصاف دیکھ لیا۔ ایسے ہی انصاف پر زمین آسمان قائم ہیں۔ آپ خلیفۂ وقت ہو کر مجھے ایسے معمولی آدمی کے ساتھ اپنے ہی مقرر کردہ قاضی کی عدالت میں مدعی بن کر پیش ہوئے۔ قاضی نے آپ کی کوئی رعائت اور لحاظ نہ کیا اور اصولِ شہادت پر عمل کرتے ہوئے مقدمہ کا فیصلہ آپ کے خلاف اور میرے حق میں کر دیا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کا دین سچا ہے اور آپ خلیفۂ برحق ہیں۔ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ مجھے اپنا دین سکھائیے۔'' (آج کے مسلمان حکمران اپنے آپ کو کسی ملکی عدالت میں حاضری سے بالاتر اور اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں اور اگر کوئی جج انہیں عدالت میں بلانے کی جسارت کرے تو اس کی خیر نہیں۔)

بازاروں کی نگرانی

آپ درہ ہاتھ میں لے کر تن تنہا کوفہ کے بازاروں میں گھومتے پھرتے۔ کوئی محافظ ساتھ نہ ہوتا، تاجروں اور دکانداروں کو ٹھیک ناپ تول کی تاکید کرتے اور تنبیہ کرتے کہ بعض سابق قومیں اسی وجہ سے عذابِ الٰہی کا نشانہ بنیں اور ہلاک و برباد ہوئیں کہ وہ ناپ تول میں دیانتداری سے کام نہ لیتی تھیں۔ اجناس وغیرہ کے نرخوں کی نگرانی کرتے تاکہ دکاندار گاہکوں سے زیادہ وصول نہ کریں۔ خود اس دکاندار سے کبھی سودا نہ خریدتے جو آپ کو جانتا پہچانتا ہوتا مبادا وہ خلیفہ ہونے کی وجہ سے غیر معمولی رعایت سے کام لے۔ بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے، کمزوروں، ناتوانوں کی مدد کرتے، قصورواروں کو موقع پر سزا دیتے۔

ایک جامع تبصرہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وفات کے بعد آپ کے ایک رفیق ضرار اسدی کسی کام سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ انہوں نے ضرار سے کہا کہ ذرا اپنے ساتھی علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اوصاف بیان کرو۔ ضرار نے پہلے تو عذر معذرت کی لیکن معاویہ رضی اللہ عنہ کے اصرار پر یوں بیان کیا:

''وہ نہایت بلند عزائم کے مالک اور بڑے عالی حوصلہ انسان تھے۔ فیصلہ کن بات کہتے تھے اور عادلانہ فیصلہ کرتے تھے۔ ان کے ہر سمت سے علم پھوٹتا تھا اور حکمت ٹپکتی تھی۔ دنیا اور اس کی دلفریبیوں سے

گھبراتے تھے۔ رات کی تاریکی ان کو مرغوب تھی کیونکہ اس میں وہ اپنے معبود کے آگے بڑی توجہ اور انہماک سے جھکے رہتے تھے۔ عبرت پذیر دل اور بہت غور و فکر کرنے والا دماغ رکھتے تھے۔ ان کا لباس ادنیٰ ہوتا تھا اور خوراک بہت معمولی۔ وہ ہم سے بہت اعلیٰ و ارفع ہونے کے باوجود ہمارے درمیان بہت بے تکلفی سے رہتے تھے۔ ہم بڑی آزادی کے ساتھ جو کچھ چاہتے ان سے پوچھتے۔ وہ اپنی بڑائی کا خیال کئے بغیر نہایت سادگی کے ساتھ ہم سے باتیں کرتے رہتے تھے اس بے تکلفی کے باوجود ان کی ہیبت اور وقار اتنا زیادہ تھا کہ ہمیں آزادی کے ساتھ ان سے بولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ متقی اور پرہیزگار انسان کی قدر کرتے تھے۔ اور غربا کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کے سامنے طاقتور باطل کی طمع نہ کر سکتا تھا۔ بعض دفعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رات گزر رہی ہے، ستارے جھلملا رہے ہیں اور وہ اپنی داڑھی مٹھی میں دبائے مار گزیدہ کی طرح بے قرار اور غم رسیدہ کی طرح اشکبار کہہ رہے ہیں ''اے مردار دنیا! جا اور کسی اور کو فریب دے۔ میں تجھے تین طلاقیں دے چکا۔ اب کبھی تیری طرف رجوع نہ کروں گا۔ تیری عمر تھوڑی اور تیرا مقصد حقیر ہے۔ اے میرے خدا! میرا سفر طویل ہے اور میرا توشہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ راستہ کٹھن ہے۔ اے مرے مالک! مجھے اپنے فضل و کرم سے پار پہنچا۔ تیری اعانت اور نصرت کے بغیر میں منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔''

ضرار کی زبان سے یہ سن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آبدیدہ ہو گئے اور کہا ''خدا ابوالحسن رضی اللہ عنہ پر رحم کرے۔ وہ واقعی ایسے ہی تھے جیسا تم نے بیان کیا۔''[1]

گزشتہ صدی کے مشہور انگریز ادیب ٹامس کارلائل نے لکھا ہے کہ

''جواں مرد علی رضی اللہ عنہ سے تم محبت کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خدا نے بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں شرافت و سخاوت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی اور ان کا ضمیر قوتِ عمل، اولو العزمی اور بیباکی سے گوندھا تھا، وہ بے مثل شہسوار اور شیر بیشۂ شجاعت تھے۔ ان اوصاف کے ساتھ رقت قلب، صدق و ایمان اور پاکیزگی عمل مستزاد تھے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیات و موت ایک ستائی ہوئی فضیلت اور ایک شہید نفس مطمئنہ کی خونی تاریخ بن گئی۔

دارمیہ حجونیہ کا واقعہ

بنی کنانہ کی ایک سیاہ فام فربہ اندام عورت دارمیہ حجونیہ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے یہ عورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بے باک ثنا خواں تھی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر کھلی نکتہ چینی کیا کرتی تھی۔ اپنی خلافت کے زمانے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حج کے لئے مکہ گئے تو معلوم ہوا کہ وہ عورت بھی آئی ہوئی ہے۔ اسے بلا بھیجا اور پوچھا کہ ''تو علی رضی اللہ عنہ

[1] تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی بحوالہ ریاض النضرہ نیز ''دس بڑے مسلمان'' از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی بحوالہ اخبار الطوال

سے محبت اور مجھ سے بغض کیوں رکھتی ہے؟'' اس نے بلا جھجک جواب دیا کہ ''میں علی رضی اللہ عنہ سے اس لئے محبت رکھتی ہوں کہ وہ رعیت کے ساتھ انصاف کرتا تھا۔ سب کو استحقاق کے مطابق دیتا تھا۔ مسکینوں سے محبت کرتا تھا اور دینداروں کی تعظیم کرتا تھا اور تجھ سے بغض اس لئے رکھتی ہوں کہ تو اپنے فضل سے لڑا اور جس کا تو مستحق نہ تھا اس حق کا طالب ہوا۔ تو نے خونریزی کرائی، فیصلوں میں ناانصافی کی اور ہوائے نفس کے مطابق حکومت کی۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا ''تو نے علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا بھی ہے؟'' جواب دیا، کیوں نہیں؟ واللہ اس کی حکومت نے تیری طرح فتنے میں نہیں ڈالا اور دولت نے تیری طرح غافل نہیں کیا۔ اس کا کلام تاریکی سے دلوں کو اس طرح جلا کرتا تھا جیسے تیل برتن کا زنگ چھڑا دیتا ہے۔''

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا ''بے شک تو سچ کہتی ہے۔ اگر کوئی حاجت ہو تو بیان کر۔''

اس نے کہا ''مجھے ایک سو اونٹنیاں سرخ رنگ[1] کی دے جن کے ساتھ ان کا ساربان بھی ہو۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا ''اگر میں تجھے یہ سو اونٹنیاں دے دوں تب بھی میری جگہ تیرے دل میں علی رضی اللہ عنہ کے برابر ہوگی یا نہیں؟''

دارمیہ نے کہا ''سبحان اللہ! کیا اس کے سوا کسی دوسرے کی جگہ میرے دل میں ہو سکتی ہے؟''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے سو اونٹنیاں دے دیں اور کہا ''واللہ! اگر علی رضی اللہ عنہ زندہ ہوتا تو ان میں سے ایک اونٹنی بھی تجھے نہ دیتا۔''

دارمیہ نے کہا ''واللہ! اونٹنی تو اونٹنی وہ تو ایک بلی کا بچہ بھی مسلمانوں کے مال میں سے دینے والا نہ تھا۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم

اگرچہ مندرجہ بالا موضوع پر ایک الگ باب باندھنے کی خاص ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ ایک گروہ کی دانست میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور آپ کے پیشرو خلفائے ثلاثہ اور بعض دوسرے کبار صحابہ کے درمیان تعلقات دشمنی کی حد تک پہنچ گئے تھے حالانکہ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی آپس میں قریبی رشتہ داریاں تھیں اور ان کے بعد ان کے بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں، پوتیوں اور نواسوں، نواسیوں کے بھی باہم ازدواجی رشتے قائم ہوئے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ایک دوسرے کے بارے میں اقوال و آرا اور باہمی سلوک کا حوالہ دے دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض منصف مزاج حضرات کے ذہن سوچنے اور بدلنے پر مائل ہو جائیں۔ گزشتہ چودہ سو سال میں مسلمان آپس کے تفرقہ و انتشار کی وجہ سے بہت نقصان اٹھا چکے ہیں۔ اگر آئندہ بھی ہم فرقہ بازی اور گروہ بندی کا شکار رہے تو تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہے گی اور ہم دنیا کی قوموں کے سامنے ذلیل و رسوا ہوتے رہیں گے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے ؂

---

[1] سرخ رنگ کی اونٹنی سب سے قیمتی سمجھی جاتی تھی۔

[2] ابو سہل تمیمی کی روایت۔ مولانا حالی کا مضمون مطبوعہ رسالہ ''معارف'' (پانی پت) ستمبر ۱۹۰۱ء

اے کہ تشنا سی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکر رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ ہشیار باش

قرآن مجید نے فرما دیا ہے کہ: تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ○

(ترجمہ: وہ کچھ لوگ تھے جو گزر گئے۔ جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کے لئے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لئے ہے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے (۲:۱۳۴)

ہمیں اس وقت تعمیر ملت کی ضرورت ہے۔ گڑے مردے اکھاڑنے اور ان کے نام پر ایک دوسرے کو برا کہنے اور باہم دست و گریباں ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ یہ چیز ہمارے لئے دنیاوی اور اخروی فلاح کی ضامن ہے۔ ان بزرگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اللہ ہم سے ان کے بارے میں جواب طلبی نہیں کرے گا۔ ہم سے تو یہ پوچھا جائے گا کہ ہم نے قرآن وسنت کی روشنی میں سچے مسلمان کی زندگی بسر کی یا نہیں۔

گزشتہ صدی کے اردو کے مشہور مصنف اور بے مثل ادیب مولانا محمد حسین آزاد اثنا عشری شیعہ تھے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر نے ۱۸۵۷ء میں مسلمانان ہند کی آزادی کی خاطر انگریزوں کے ہاتھوں پھانسی کی سزا پائی۔ آزاد ''دربار اکبری'' میں عقل عامہ کو اپیل کرتے ہیں:

''ذرا خیال کر کے دیکھو اسلام ایک، خدا ایک، پیغمبر ایک۔ شیعہ سنی کا اختلاف ایک منصب خلافت پر ہے جس کے واقعہ کو آج تیرہ سو برس گزر چکے ہیں۔ وہ ایک حق تھا۔ سنی بھائی کہتے ہیں کہ جنہوں نے لیا حق لیا۔ شیعہ کہتے ہیں کہ نہیں حق اوروں کا تھا ان کا نہ تھا۔ اگر پوچھیں کہ انہوں نے اپنا حق خود کیوں نہ لیا؟ جواب دیں گے، صبر کیا اور سکوت کیا۔ تم لینے والوں سے اس وقت لے کر دلوا سکتے ہو؟ نہیں۔ لینے والے موجود ہیں؟ نہیں۔ اچھا جب یہ صورت ہے تو آج تیرہ سو برس کے بعد اس معاملے کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فسادِ عظیم کھڑا ہو جائے، چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزا جاتا رہے، کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں۔ دوستیاں ہوں تو دشمنی ہو جائے، دنیا جو مزرعتہ الآخرت ہے، اس کا وقت کارہائے مفید سے ہٹ کر جھگڑے میں جا الجھے، قوم کی اتحادی قوت ٹوٹ کر چند در چند فتنے گلے پڑ جائیں۔ یہ کیا ضرورت؟ بہت خوب، تم ہی حق پر سہی۔ لیکن انہوں نے صبر اور سکوت کیا۔ اگر ان کے ہو تو تم بھی صبر اور سکوت کرو۔ زبانی بدگوئی اور بدکلامی کرنا اور بھٹیاریوں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے اور کیا انسانیت ہے؟ کیا تہذیب ہے؟ اور کیا حسن خلق ہے؟ تیرہ سو برس کے معاملے کی بات ایک بھائی کے سامنے اس طرح کہہ دینی جس سے اس کا دل آزردہ بلکہ جل کر خاک ہو جائے، اس میں خوبی کیا ہے؟ میرے دوستو! اول ایک ذرا سی بات تھی، خدا جانے کن کن لوگوں کے جوش اور کن کن سببوں سے تلواریں درمیان آ کر لاکھوں خون بہہ گئے۔ خیر، اب وہ خون خشک ہو

گئے۔ زمانہ کی گردش نے پہاڑوں اور جنگلوں کی مٹی ان پر ڈال دی۔ ان جھگڑوں کی ہڈیاں اکھیڑ کر تفرقہ کو تازہ کرنا اور اپنائیت میں فرق ڈالنا کیا ضرور ہے؟ اور دیکھو اس تفرقے کو تم زبانی باتیں نہ سمجھو۔ یہ وہ نازک معاملہ ہے کہ جن کے حق کے لئے تم آج جھگڑے کھڑے کرتے ہو وہ خود سکوت کر گئے۔ تقدیری بات ہے کہ اسلام کے اقبال کو ایک صدمہ پہنچنا تھا، سو نصیب ہوا۔ فرقے کا تفرقہ ہو گیا۔ ایک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پورا زور تھا، آدھا ہو گیا اور تم دیکھو تیرہ سو برس کے حق کے لئے آج جھگڑتے ہو؟ نہیں سمجھتے کہ ان جھگڑوں کو تازہ کرنے میں تمہاری تھوڑی جمعیت اور مسکین فرقے میں ہزاروں حقداروں کے حق برباد ہوتے ہیں۔ بنے ہوئے کام بگڑتے ہیں، روزگار جاتے ہیں، روٹیوں سے محتاج ہو جاتے ہیں، آئندہ نسلیں لیاقت اور علم و فضل سے محروم رہی جاتی ہیں۔ میرے شیعہ بھائی اس کا جواب ضرور دیں گے کہ جوشِ محبت میں مخالفوں کے لئے حرفِ بدزبان سے نکل جاتے ہیں۔ اس کے جواب میں فقط اتنی بات کا سمجھنا کافی ہے کہ عجب جوشِ محبت ہے جو دو لفظوں میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور عجب دل ہے جو مصلحت کو نہیں سمجھتا۔ ہمارے مقتداؤں نے جو بات نہ کی ہم کریں اور قوم میں فساد کا منارہ قائم کریں۔ یہ کیا اطاعت اور پیروی ہے؟

سب ایک ہی منزلِ مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گزرگاہ دنیا میں یکجا ہو گئے ہیں۔ رستے کا ساتھ ہے۔ بنا بنایا کارواں چلا جاتا ہے۔ اتفاق اور ملن ساری کے ساتھ چلو گے، مل جل کر رہو گے، ایک دوسرے کا بوجھ اٹھاتے چلو گے، ہمدردی سے کام بٹاتے چلو گے، تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائے گا۔ اگر ایسا نہ کرو گے اور ان جھگڑالوؤں کے جھگڑے تم بھی پیدا کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ آپ بھی تکلیف پاؤ گے اور ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے۔ جو مزے کی زندگی خدا نے دی ہے بدمزہ ہو جائے گی۔"[1]

علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ "اے علی رضی اللہ عنہ! تمہاری مثل حضرت عیسیٰ کی مانند ہے جن سے یہودیوں نے اتنا بغض و عناد کیا کہ ان کی والدۂ محترمہ کو تہمت لگائی (نیز ان کے قتل کرنے کے درپے ہوئے) اور عیسائیوں نے ان سے اتنی محبت کی کہ ان کو ان کے مرتبہ سے بڑھا دیا۔ دونوں افراط و تفریط کا شکار ہو گئے اور راہ اعتدال سے ہٹ گئے۔" چنانچہ خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں حد سے گزر گئے۔ آپ کو کافر کہا اور بالآخر شہید کر دیا۔ ایک دوسرے گروہ نے آپ کو خدا کا اوتار بنا دیا اور آپ کے مزعومہ مخالفوں کو برا بھلا کہنا اپنا شعار بنالیا۔

یہاں ہم خلفائے راشدین اور عام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہج البلاغہ[2] سے چند اقتباسات درج کرتے ہیں۔

---

[1] دربار اکبری صفحہ ۳۸۳-۳۸۲

[2] اردو ترجمہ نیرنگ وضاحت از سید ذاکر حسین اثنا عشری۔ مطبوعہ مطبع یوسفی، دہلی

اصحاب رسول ﷺ

''میں نے اصحاب محمد ﷺ کو دیکھا ہے۔ تم میں کوئی بھی تو ان کا نظیر نہیں۔ وہ اس حالت میں صبح کرتے تھے۔ الجھے ہوئے بال، غبار آلود چہرے۔ ان کی راتیں قیام وسجود میں گزرتی تھیں۔ وہ اپنی معاد (آخرت) کے ذکر سے ایسے ہوجاتے تھے جیسے بقیہ تنہ خرما۔ سجدوں کے طول سے ان کی آنکھوں کے درمیان (پیشانیوں پر) گٹے پڑپڑ کے ایسے ہوگئے تھے جیسے بکریوں کے زانو۔ جب خدا کا ذکر ہوتا تو ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہوئی جیب و دامن تربتر کردیتی تھیں، وہ خوفِ عقوبت اور اجر وثواب سے ایسے لرزتے تھے جیسے سخت آندھی سے درخت جنبش کیا کرتے ہیں۔'' (صفحہ ۱۰۵)

جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مندرجہ بالا سرٹیفکیٹ دو چار یا آدھی درجن صحابہ کو نہیں دیا بلکہ ان کی پوری جمعیت کو دیا ہے۔

آگے چل کر اصحاب کے متعلق پھر ارشاد ہوتا ہے:

''کہاں ہیں وہ گروہ جنہیں اسلام کی طرف بلایا جاتا تھا اور وہ اسے قبول کر لیتے تھے۔ وہ قرآن کو پڑھتے تھے اور اپنے اعتقادات کو اس کے ساتھ مضبوط کرتے تھے۔ جہاد کے لئے برانگیختہ ہوتے تھے۔ ان کی آنکھیں روتے روتے تباہ ہوگئی تھیں۔ ان کے شکم روزہ رکھتے رکھتے لاغر ہو گئے تھے۔ دعائیں کرتے کرتے ان کے ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ شب بیداریوں سے ان پر زردیاں چھا گئی تھیں۔ سجدوں کا غبار ان کے چہروں پر موجود رہتا تھا۔ وہ لوگ میرے بھائی تھے جو چلے گئے۔''

(صفحہ ۱۳۵)

ان جانے والے بھائیوں میں ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور بے شمار دوسرے شامل تھے۔

خلافت کے بارے میں آپ ﷺ نے جو بیان قیس بن عباد اور ابن الکواء کو دیا تھا وہ گزشتہ صفحات میں درج کیا جاچکا ہے، جس میں آپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کو تسلیم کرنے ان کی بیعت کرنے اور ان سے تعاون کرنے کا ذکر کیا ہے۔

گیارہویں شیعہ امام حضرت حسن عسکری کی قرآن کے پارۂ اول کی تفسیر ملتی ہے اس کے صفحہ ۲۵ پر جناب امام نے اصحاب رسول ﷺ کے متعلق اہل بیت کا عقیدہ یوں بیان کیا ہے:

''تمہیں (مسلمانوں) یہ حکم ہے کہ ان لوگوں (صحابہ کرام) کے راستے پر چلو جن پر یوں انعام ہوا کہ اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان لائے۔ ان کی آل اور صحابہ کرام افضل ترین امت اور منتخب تھے۔ جو مرد یا عورت حضرت محمد (ﷺ) ان کی آل اور صحابہ سے محبت رکھے اور ان کے دشمنوں سے دشمنی رکھے تو اس نے خدا کے عذاب سے بچاؤ کے لئے ایک مضبوط قلعہ بنالیا محفوظ رکھنے والی ڈھال بنوالی۔''

صفحہ ۲۳ پر فرماتے ہیں:

''آل محمد ﷺ تمام انبیاء کی آل سے افضل ہے اور اصحاب محمد ﷺ تمام انبیاء کے اصحاب سے افضل ہیں اور امت محمدیہ تمام انبیا کی امت سے افضل ہے۔''

نہج البلاغہ ہی میں ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ آپ کے لئے خلافت کی وصیت کر گئے تھے؟ فرمایا کہ ''ہم رضائے الٰہی کے پابند ہو کر اس کی قضا پر راضی ہیں اور ہم نے اس کے حکم کو تسلیم کیا ہے۔ قسم خدا کی میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے رسول ﷺ کی تصدیق کی ہے اور اب میں کیونکر اس کی تکذیب کرنے والا ہو سکتا ہوں؟ جب میں نے اپنے امور پر نظر کی تو ناگاہ میں نے دیکھا کہ میرا خدا کے لئے اطاعت کرنا اپنے لئے بیعت لینے سے مقدم ہے۔ (نہج البلاغہ اردو ترجمہ ص ۴۵)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خط حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام

''بے شک مجھ سے اس قوم نے بیعت کی ہے جس نے ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ سے بیعت کی تھی اور اسی امر پر بیعت کی جس پر ان سے بیعت کی تھی۔ اب کسی شخص حاضر کو حق نہیں ہے کہ وہ رد کر دے اور نہ شخص غائب کو۔ فی الحقیقت شوریٰ مہاجرین اور انصار کا حق ہے پس جس شخص کے حق میں انہوں نے اجتماع کیا اور اس کو نامزد کر دیا تو ان کا یہ اجتماع خوشنودی خدا ہے۔''

(نہج البلاغہ اردو صفحہ ۲۹۹)

اس خط سے ظاہر ہے کہ آپ خلافت کو شورائی اور انتخابی سمجھتے تھے نہ کہ موروثی امامت اور مہاجرین و انصار صحابہ کو حق انتخاب دیتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے خیر

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو تعریفی خطبے دیئے وہ تاریخ میں موجود ہیں اور اس کتاب میں ان کے حالات میں معہ حوالہ درج کئے جا چکے ہیں۔ نیز جنگ نہاوند کے موقع پر جب دوسرے صحابہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خود سالار لشکر ہو کر جانے کا مشورہ دیا تھا اور اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں خود مدینہ ہی میں رہنے اور کسی دوسرے کو سپہ سالار بنا کر بھیجنے کی صلاح دی تھی جسے انہوں نے قبول کیا۔ اس کا بھی گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ صلاح بڑی صائب تھی اور ملی و ملکی مفاد پر مبنی ہونے کے علاوہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں خلوص اور ہمدردی کی آئینہ دار بھی تھی۔ اس کے علاوہ نہج البلاغہ (اردو صفحہ ۲۵٦) پر یہ خطبہ ملتا ہے:

''فلاں شخص[1] کے شہروں کی آبادی خدا کے لئے ہو کہ جس نے ٹیڑھے کو سیدھا کیا اور علت کا علاج

---

[1] مراد ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔ بعض شیعہ حضرات صحابۂ ثلاثہ کا نام درج کرنے کی بجائے فلاں فلاں وغیرہ لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحب زادوں کے نام ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ رکھے اور انہیں انہی ناموں سے پکارا کیجئے۔ مولف

کیا۔ فتنے کو پیچھے کیا اور سنت کو قائم کیا۔ پاک دامن کیا۔ کم عیب، نہایت عمدہ دین میں پہنچا شر سے بالا رہا، خدا کے احکام کی پیروی کی، کما حقہ تقویٰ کیا۔ رحلت کی تو آپ کے بعد لوگ شاخوں میں بٹ گئے۔ نہ بے خبر کو راستہ سوجھتا تھا نہ باخبر ہی مطمئن تھے۔''

شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت سے جب سے وہ خلیفہ ہوئے ان کی کنیت سے مخاطب نہیں کرتے تھے بلکہ امیر المومنین کہہ کر خطاب کرتے تھے اور یہ بات اسی طرح کتب سیر و تاریخ میں بیان ہوئی ہے۔''[1]

پھر یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی صاحب زادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا عقد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کیا تھا ان کے بطن سے حضرت زید بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت رقیہ بنت عمر رضی اللہ عنہ ہوئے۔ کیا اس رشتہ مصاہرت میں باہمی اخلاص و مودت کو دخل تھا یا نفاق و مخالفت کو؟

تقسیم اموال و غنائم اور تعیین وظائف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ان کے صاحب زادوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دوسرے بنی ہاشم سے ترجیحی سلوک کیا اور وظائف کے رجسٹر میں بھی ان کے نام سرفہرست درج کرائے۔

خلافت عثمان رضی اللہ عنہ

جب لوگوں نے عثمان رضی اللہ عنہ سے بیعت کی اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم خوب جانتے ہو کہ میں اپنے غیر سے زیادہ حکومت و بیعت کے لئے قابل اور مستحق ہوں اور خدا کی قسم میں تسلیم کرتا ہوں جب تک امورِ مسلمین سلامت رہیں اور اس کے ایام خلافت میں کھلم کھلا ظلم و جور نہ ہو۔ گو خاص مجھ پر ظلم و ستم ہوتے رہیں۔''[2] (نہج البلاغہ اردو ص ۶۶)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور آپ ہم زلف تھے کہ دونوں داماد رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آپ کی پھوپھی ام حکیم بیضا کی صاحب زادی اروی کے بیٹے تھے۔ گویا دوہری رشتہ داری تھی۔

آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان سے بھرپور تعاون کرتے رہے اور انہیں صائب مشورے دیتے رہے۔ محاصرہ کے دوران میں ان کے دروازے پر اپنے صاحب زادوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ان کی حفاظت کے لئے تعینات کیا تھا۔

فرقہ بندی کی مذمت اور ممانعت

آپ مسلمانوں کے باہمی تفرقہ و انتشار کو سخت ناپسند کرتے تھے نہج البلاغہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبانی ارشاد ہے:

[1] شرح نہج البلاغہ جلد ۳۔ صفحہ ۶۲۴۔ مطبوعہ ایران

[2] یہاں ظلم و جور کا اثبات نہیں بلکہ ایک امکان اور مفروضہ کا بیان ہے یعنی اگر میری ذاتی حق تلفی ہو تو مجھ پر زیادتی بھی ہو۔ تو بھی عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت تسلیم کرتا ہوں اسی میں ملت کی بھلائی ہے۔ مؤلف

''مسلمانوں کا خدا ایک، نبی ایک، کتاب ایک۔ کیا خداوند عالم نے انہیں اختلاف کا حکم دیا ہے؟''

(اردو ترجمہ صفحہ ۲۵)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

''خبردار! تم خود کو دین میں فرقہ بندی سے دور رکھو۔ کیونکہ برسر حق جماعت جسے تم مکروہ سمجھ رہے ہو بہتر ہے باطل فرقہ بندی سے جسے تم پسند کرتے ہو۔ بے شک پروردگار عالم نے اگلوں اور پچھلوں میں سے کسی (فرقہ پرست) کو بہتری نہیں بخشی۔'' (نہج البلاغہ اردو ترجمہ صفحہ ۲۰۳)

ایک دوسرے موقع پر بھی فرقہ بندی سے بچنے کی سخت تاکید کی کیونکہ باہمی جنگوں خاص کر جنگ صفین اور جنگ نہروان اور تحکیم کے بعد آپ کو ملت اسلامیہ گروہوں میں بٹی نظر آ رہی تھی۔ پہلے سیاسی گروہ بندی اور پھر مذہبی گروہ بندی کا آغاز ہوا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سے فرماتے ہیں:

''بڑے گروہ کے ساتھ ملے رہو۔ جماعت کو خدا کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ خبردار! فرقہ بندی سے بچے رہنا۔ جو شخص جماعت سے الگ ہو جائے وہ شیطان کے نرغے میں آ جاتا ہے جیسے کہ ریوڑ سے الگ بکری بھیڑئے کی غذا بن جاتی ہے۔ خبردار! جو شخص فرقہ بندی کا داعی ہو، اسے ہلاک کر دو اگرچہ میری ہی دستار کے نیچے ہو۔''[1]

اب چند حوالے دوسرے ماخذوں سے:

علامہ زمخشری ''الموافقۃ بین اہل بیت والصحابہ'' میں لکھتے ہیں:

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت ہو چکی تو آپ نے تین بار کھڑے ہو کر فرمایا کہ ''اگر میری خلافت کسی کو ناپسند ہو تو میں تمہاری بیعت فسخ کرتا ہوں۔'' اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ ''خدا کی قسم! نہ ہم آپ سے بیعت فسخ کرتے ہیں اور نہ کبھی اس کی خواہش کریں گے۔ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی امامت کے لئے آگے بڑھایا ہے۔ اب کون پیچھے ہٹا سکتا ہے؟''

شیعہ مؤرخ سید ذاکر حسین جعفری نے بھی اپنی تصنیف ''تحفۃ الاحباب فی تاریخ اصحاب'' میں اپنے رنگ میں اس روایت کی تصدیق کی ہے۔ دیکھئے کتاب مذکور کا دوسرا باب صفحہ ۱۴۔ لکھتے ہیں:

''جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت مکمل ہو گئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رونا شروع کر دیا اور تین دن تک برابر روتے رہے اور کہتے رہے کہ لوگو! میری بیعت توڑ دو۔ میں خلافت کا اہل نہیں ہوں۔ مسجد نبوی کے درمیان مجمع عام میں علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عظمت، ان کی فضیلت اور ان کی سبقت فی الاسلام بیان کر کے بیعت کر لی تھی۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا اعلان کیا تو ہر بار سب سے پہلے علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا کی قسم! میں تم سے بیعت نہیں توڑوں گا اور نہ تم کو ہرگز

[1] نہج البلاغہ ص ۲۶۱ بحوالہ، سیرت علی، نیز صحابہ کرام حضرت علی کی نظر میں، از منشی عبدالرحمٰن خاں ص ۵۴

اپنی بیعت فسخ کرنے دوں گا۔"

ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ

علامہ زمخشری نے مزید لکھا ہے کہ ایک دفعہ کچھ لوگوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں چہ مگوئیاں کیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"واللہ یہ دونوں بحکم خدا تعالیٰ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے پہلے خلیفہ تھے اور انہوں نے مجھ پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا...... مجھ کو ان سے افضل کہنے والوں کے دلوں میں نفاق ہے اور ان کا مقصد مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا ہے۔"[1]

علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں مشاجراتِ صحابہ کے سب سے پہلے راوی ابو مخنف شیعی کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک خطبہ کے مندرجہ ذیل جملے نقل کیے ہیں:

"جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا اور انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ کو۔ ان دونوں حضرات کی سیرتیں احسن تھیں اور انہوں نے عدل و انصاف سے امت کے ساتھ عمل کیا۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا:

"عثمان تو ہم میں سے نیک، زیادہ صلہ رحمی کرنے والے، زیادہ صاحب حیا، پاک طینت اور خداوند تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔"[2]

باہمی تعاون

مشہور شیعہ مؤرخ جسٹس سید امیر علی نے "مختصر تاریخ صحرا نشینیاں"[3] میں لکھا ہے:

"خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ قاضی القضاۃ اور مہتمم زکوٰۃ تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کہ عالم تھے خط و کتابت اور اسیرانِ جنگ پر مامور تھے۔ وہاں کوئی کام بغیر صلاح و مشورہ کے انجام نہ پاتا تھا۔" (صفحہ ۵۶)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں آپ قاضی تھے اور حدود نافذ کرتے تھے۔

غرضیکہ آپ نے خلفائے ثلاثہ کے ہاتھ پر برضا و رغبت بیعت کی، ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے ان کی مجلس مشاورت کے سرگرم رکن رہے اور ان سے بھرپور تعاون کرتے رہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کی بیوہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے آپ نے نکاح کیا اور ان کے بطن سے پیدا شدہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو

[1] الموافقۃ بین اہل بیت والصحابہ، نیز تاریخ طبری جلد ۲۔

[2] البدایہ والنہایہ جلد ۷، صفحہ ۱۹۴

[3] (A Short History of Saracens)

اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنی صاحب زادی ام کلثوم بیاہ دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آپ ہم زلف تھے۔

طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ

جنگ جمل کے خاتمے پر طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ان کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ آپ ان کی اسلامی خدمات اور بزرگی کے معترف تھے اور ان کے خلاف کسی بغض وغصہ کا اظہار نہیں کیا نہ کبھی ان کی شان کے خلاف الفاظ استعمال کئے۔ بلکہ سورۂ اعراف کی آیت ۴۱ پڑھی اور فرمایا کہ میرا اور طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس آیت کا مصداق ہے۔ زبیر رضی اللہ عنہ آپ کی پھپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے صاحب زادے تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کربلا کے بعد ان کی صاحب زادی یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پوتی حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے مصعب نے نکاح کیا تھا۔ نیز جیسا کہ سید امیر علی نے اپنی ''مختصر تاریخ صحرانشینیاں'' میں صفحہ ۲۰۲ پر لکھا ہے، انہی حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا کا مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہما کے قتل کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک پوتے سے نکاح ہوا لیکن اموی خلیفہ سلیمان نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر زبردستی جدائی کرا دی۔ کیا یہ سب باہمی عداوت کی علامات ہیں؟

آپ کی بیعت خلافت جن حالات میں ہوئی، اس سے بعض کبار صحابہ شک میں پڑ گئے۔ بعض نے عارضی طور پر بیعت سے ہاتھ روکے رکھا کہ صورت حال واضح ہونے پر فیصلہ کریں گے۔ بعض نے بیعت تو کی مگر جنگ جمل، جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر مخالفوں سے جنگ نہیں کی۔ لیکن آپ کی مخالفت بھی نہیں کی۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں ان حضرات کی عدم شرکت کے متعلق آپ رضی اللہ عنہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

> ''اچھا مقام وہ تھا جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور سعد بن مالک رضی اللہ عنہ (سعد بن ابی وقاص) نے اختیار کیا کہ اس جنگ سے علیحدہ رہے کیونکہ یہ کام اگر انہوں نے صحیح کیا تب تو ان کے اجر عظیم میں کیا شبہ ہے اور اگر اس جنگ سے علیحدہ رہنا کوئی گناہ بھی تھا تو اس کا معاملہ بہت ہلکا ہے۔''

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تحکیم کے وقت اذروح میں حاضر ہوئے اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے چکمہ کھا جانے پر انہیں خوب لتاڑا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

اور تو اور، آپ کے کیمپ میں جو لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو برا کہتے تھے، انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ

> ''معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی برا نہ سمجھو کیونکہ وہ جس وقت نہ ہوں گے تو تم سروں کو گردنوں سے اڑتا دیکھو گے۔''[1]

آپ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف مومنانہ رویہ ہی رکھا۔ جنگ وجدال کے باوجود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بعض

---

[1] شرح عقیدہ واسطیہ

فقہی مسائل میں آپ سے رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ وراثت خنثیٰ کے متعلق معاویہ رضی اللہ عنہ کا استفسار اور علی رضی اللہ عنہ کا جواب ایک تاریخی ریکارڈ ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باہمی تعلقات کا ذکر جنگ جمل کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ جنگ جمل کے بعد جو باہمی گفتگو ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جس طرح عزت و احترام کے ساتھ انہیں مدینہ روانہ کیا اس سے کسی بغض و عداوت کی بوتک نہیں آتی۔ رخصت کرتے وقت آپ نے بھرے مجمع میں فرمایا کہ ''یہ (عائشہ رضی اللہ عنہا) دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم ہیں۔'' آپ کی وفات پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مزار نبوی پر حاضر ہو کر جس غم والم کا اظہار کیا وہ آج بھی قاری کا دل ہلا کر رکھ دیتا ہے اور آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ ان بزرگ ہستیوں کے درمیان ذاتی عداوتیں اور مخالفتیں نہ تھیں۔ جو کچھ پیش آیا، اگرچہ وہ ملت کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوا لیکن ان کی نیتوں میں فتور نہ تھا۔ اسے اجتہادی غلطی ہی کہا جا سکتا ہے اور اگر آپ بہت زیادہ جدید ذہن کے واقع ہوئے ہیں تو غلطی محض کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے فوق البشر اور مبرا عن الخطا ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اللہ سے استغفار ہی کرتے رہے۔ ہم ان سے بہت ہی کمتر اور گھٹیا درجے کے انسان ہیں۔ ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ان کے اعمال و کردار میں ان کے سینکڑوں سال بعد کیڑے نکالتے رہیں اور اسے کار ثواب سمجھتے رہیں۔ تعمیری سوچ اور تجزیہ کی اور بات ہے۔ اللہ کو نیتوں اور دلوں کا حال ہم سے زیادہ معلوم ہے۔ ان میں اکثر وہ نفوس قدسی بھی شامل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ ان کی مخلصانہ دینی خدمات کی بنا پر اپنی کتاب مقدس میں اپنی خوشنودی اور مغفرت کی بشارت دے چکا ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان سے خوشنودی کا اظہار کیا ہے۔ تعجب ہے کہ عالم عیسائیت کی رومن کیتھولک اکثریت کا پوپ تو نئی دنیا کے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنے کلیسا کے اس دو ہزار سال پرانے عقیدہ کو سرکاری طور پر مردود قرار دے دے کہ یہودیوں نے مسیح علیہ السلام کو مصلوب کیا تھا اور انہیں اس جرم سے بریت کی سند دے دے لیکن مسلمانوں کے بعض گروہ مشاجرات صحابہ کو اچھالتے رہیں نہ صرف ان کے کارناموں کا انکار کر دیں بلکہ ان پر زبان طعن بھی دراز کرتے رہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے اہل فکر و تحقیق تعصبات سے بالاتر ہو کر ہماری گزشتہ تاریخ پر گہری نظر ڈالیں اور اسے منقح کر کے پیش کریں۔ کیا ہم اپنی تاریخ کا ایک مصدقہ ایڈیشن (Auttorised Version) پیش نہیں کر سکتے؟

افراط و تفریط (بلا تبصرہ)

کتاب ''کوکب دری فی فضائل علی رضی اللہ عنہ'' مسلمانوں کے ایک گروہ میں بڑی معروف اور مقبول ہے۔ اس کے مصنف سید محمد صالح کشفی ہیں جو اسنی الحنفی (؟) بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ، مناقب مرتضوی کے نام سے سید شریف حسین سبزواری نے کیا ہے اور البرہان بک ڈپو، ۳۵ ید بشتر روڈ، کرشن نگر لاہور نے شائع کیا

ہے۔غلوئے عقیدت کے نمونے کے طور پر اس میں سے صرف چند اقوال کے اقتباسات یہاں بلاتبصرہ درج کئے جاتے ہیں یہ اقوال جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب کئے گئے ہیں۔ان میں جہاں جہاں لفظ ''میں'' آیا ہے اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

(باب سوم صفحہ ۱۹۷) نقل کفر......

''۱- میں ذوالقرنین ہوں جس کا ذکر کتب سماوی میں ہے۔

۲- میں وہ ہوں جس کے پاس سلیمان کی انگوٹھی موجود ہے (یعنی میں تمام مخلوقات جن وانس وغیرہ میں متصرف اور حاکم ہوں)

۳- میں ہوں وہ شخص جو خلائق کے حساب کا متکفل اور ذمہ دار ہوں۔

۴- میں لوح محفوظ ہوں۔

۵- میرے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ان کنجیوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۶- میں ہر چیز کی حقیقت سے آگاہ اور خبردار ہوں۔

۷- میں ہوں بادلوں کا پیدا کرنے والا

۸- میں ہوں درختوں کو پتے دینے والا اور ان کو سرسبز کرنے والا

۹- میں ہوں چشمے نکالنے والا اور نہروں اور ندیوں کو جاری کرنے والا۔

۱۰- میں ہوں دابۃ الارض۔

۱۱- موسیٰ کلیم اللہ کا عصا میں ہوں اور میں اس سے تمام مخلوق کو پیشانی کے بالوں سے پکڑنے والا ہوں۔اور ان میں قابض اور متصرف ہوں۔

۱۲- میں وہ شخص ہوں کہ میں نے عالم ملکوت میں نظر کی۔پس اپنے سوا اور کوئی چیز نہ پائی اور وہ غیر بے شک غائب تھا۔''[1]

ماہنامہ معارف اسلام (لاہور) شمارہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۲ء صفحہ ۶۰-۶۳ سے اقتباس:

(ذیل کے تینوں اقتباسات وشاہکارِ رسالت، کے صفحات ۴۸۶، ۴۸۷ اور ۴۸۸ سے نقل کئے گئے ہیں)

''میں (علی رضی اللہ عنہ) خدا کے اسمائے حسنہ، امثال علیا اور آیات کبریٰ ہوں اور میں جنت اور دوزخ کا مالک ہوں۔میں اہل جنت کو جنت میں داخل کروں گا اور اہل نار کو جہنم میں ڈالوں گا......اور میری ہی

---

[1] حسب ذیل شعر کا اتہام مولانا رومی پر باندھا گیا ہے۔

چنداں کہ نظر کردم و دیدم بہ حقیقت

از ہر دو جہاں مقصد و مقصود علی رضی اللہ عنہ بود

ترجمہ: میں غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کائنات کی تخلیق کا مقصود علی رضی اللہ عنہ اور صرف علی رضی اللہ عنہ ہیں) اس زمین میں ایک طویل اطاقی غزل دیوان شمس تبریز (دیوان رومی) میں موجود ہے۔ مولف

طرف ساری مخلوق کی بازگشت ہوگی اور میں ہی مرکز ہوں میری ہی طرف ہر ایک شئے بعد قضاء الٰہی رجوع کرتی ہے اور میرے ہی ذمہ ساری مخلوق خدا کا حساب ہے......اور میں ہی وہ ہوں جس کے پاس کل مخلوق کی موت اور مصائب اور فیصلہ جات کا علم ہے......اور میں لاٹھی والا اور نشان والا ہوں اور میں ہی ہوں جس کے لئے بادل، گرج، بجلی، ستارے، سورج اور چاند مسخر کر دیئے گئے ہیں...... اور میں ہی ہوں جس کو خدا نے اپنا نام، اپنا کلمہ، اپنی حکمت اپنی فہم عطا فرمائی ہے۔''

رسالہ مذکور کے شمارہ نومبر ۱۹٦٧ء سے دو اقتباسات:

۱-''قربان جائیں اس مظہر العجائب والغرائب اسد اللہ الغالب کے کہ جب اس نے تورات موسیٰ میں ظہور فرمایا تو خدا کا منہ اور خدا کا کلام بن گیا۔ جب وہ زبور میں جلوہ افروز ہوا تو تحمید وتمجید کا لباس اوڑھ کر لحن داؤد بن گیا۔ جب اس کی تجلیات غزل الغزلات میں ظاہر ہوئیں تو تقدیس وعبودیت کی دعاؤں میں سلیمان علیہ السلام کا لہجہ بن گیا۔ جب وہ انجیل عیسیٰ علیہ السلام میں نمودار ہوا تو مددگار اور طفل معصوم بن گیا۔ جب وہ صحیفۂ یوحنا میں ضیا پاش ہوا تو اسپ سفید پر سوار ہو کر شیر کی آواز میں آیات حمد پڑھنے لگا۔ جب وہ قرآن حمید میں روشن ہوا تو جگہ جگہ اس کا ذکر، جگہ جگہ اس کی فضیلت، جگہ جگہ اس کی مدحت، جگہ جگہ اس کی شجاعت، جگہ جگہ اس کی کرامت، کبھی وہ یداللہ کی صورت میں خدا کا ہاتھ، کبھی وہ لسان صدق انبیا کی صورت میں رسولوں کی سچی زبان۔'' (صفحہ ۹۱)

۲- یہ بے مثال و بے نظیر امام (حضرت علی رضی اللہ عنہ) اول زرتشت کے لئے زند و پاژند میں پہنچا تو شعلہ جوالہ کی صورت میں۔ جین مت میں گیا تو شانتی اور اہنسا کی صورت میں ویدوں میں اس نے روپ دھارا تو اوم کی صورت میں۔

شاستروں میں روپ دکھایا تو پرم آتما کی صورت میں، گیانوں میں قدم رکھا تو مہابلی کی صورت میں، گیتا میں جلوہ ریز ہوا تو نارائن کی صورت میں، رامائن میں ضوفشاں ہوا تو مہاتم کی صورت میں اور دیوتاؤں کو نظر آیا تو سنگھ کی صورت میں......سنگھ، شیر، اسد، لائن......اسی شیر کی، اسی سنگھ کی ہزار ہا سال سے مندروں، شودواروں میں پرستش کی جا رہی ہے۔'' (صفحہ ۹۱-۹۲)

آغا خانی خوجوں اور بوہروں کے عقائد کی تفصیل ڈاکٹر زاہد علی واسطی نے اپنی کتاب ''ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام'' میں دی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق مختصراً ان کا عقیدہ یہ ہے:

''ادوار سابقہ میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ وشنو تھے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ویدویاس کا قالب اختیار کیا۔ جب حضرت علی اپنی معروف عام حیثیت میں نمودار ہوئے تو وشنو کا دسواں اوتار (نش کلنکی) تھے...... بعض خوجے یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ حضرت علی (نعوذ باللہ) خدا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پیغمبر

تھے۔موجودہ آغا خاں تک تمام آئمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اوتار تصور کیے جاتے ہیں۔‘‘[1]
آغا خانی جماعت کا کلمہ یہ ہے:
اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمد الرسول الله واشهد ان امير المومنين علی الله
(ترجمہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ علی اللہ ہیں (یا علی اللہ میں سے ہیں)

خلافت راشدہ کا خاتمہ

چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے ساتھ اسلام کی مثالی ریاست وحکومت کا خاتمہ ہو گیا۔آپ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کے بڑے صاحب زادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ تقریباً چھ ماہ خلیفہ رہے لیکن اس مختصر دور کی کوئی اہمیت نہیں۔انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی اور خلافت سے دستبردار ہو گئے پھر رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ملوکیت کا آغاز ہوا۔اولسنر (Olsner) اپنی کتاب ’’مذہب محمد ﷺ کے اثرات‘‘ میں لکھتا ہے:

’’اس طرح وہ ہر دلعزیز جمہوری حکومت ختم ہوگئی جس کی بنیاد سر قبیلی سادگی پر رکھی گئی تھی اور جو پھر کبھی کسی مسلمان قوم میں نمودار نہ ہوسکی۔اس انتخابی حکومت کے بعد صرف قرآن پر مبنی فقہ اور شرعی قوانین باقی رہ گئے۔البتہ غاصبوں اور جابروں کی افواج قاہرہ کے باوجود بھی تھوڑا بہت جمہوری جوش وجذبہ قوم میں باقی رہ گیا جس سے چھوٹی ریاستوں کو ایک خاص شان وشوکت حاصل ہوئی اور بڑی ریاستوں کو زور وقوت کی افزونی۔‘‘[2]

جسٹس سید امیر علی رقم طراز ہیں:

’’(خلافت راشدہ کے دوران میں) کیا لشکر گاہ میں اور کیا شہر میں،کوئی شخص امورِ مملکت سے ناواقف نہ رکھا جاتا تھا۔ہر جمعہ کی نماز کے بعد امیر المومنین جماعت کو روزمرہ کے اہم واقعات سے آگاہ کرتا تھا۔صوبوں کے حاکم اپنے اپنے علاقوں میں اس کی مثال کی تقلید کرتے تھے۔ان عام مجمعوں میں ہر مسلمان شامل ہونے کا مجاز تھا۔جمہوریت اپنی بہترین صورت میں حکمران تھی۔خلیفہ اسلام امیر المومنین الوہیت کے ہالے میں گھرا ہوا نہ تھا۔وہ اپنی مملکت کے نظم ونسق کے معاملے میں اپنی رعایا کے سامنے جوابدہ تھا۔خلفائے راشدین نے جس سخت گیری سے اپنے آپ کو عوام کی بہبود کے لئے وقف کر رکھا تھا اور جس انتہائی سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔وہ ہادیٔ اسلام کی مثال کی پوری

---

[1] مرزا احمد سعید دہلوی مرحوم کی کتاب ’’مذہبی اور باطنی تعلیم‘‘

[2] (De Effectsdela Religion de Mohamet)

پوری تقلید تھی۔ وہ اپنے آقا کی طرح مسجد میں جا کر شریک نماز ہوتے تھے اور جماعت سے خطاب کرتے تھے۔ اپنے مکانوں پر غریبوں اور مظلوموں سے ملتے تھے اور ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کی فریاد پر کان دھرتے تھے۔ انہوں نے خدم وحشم اور ظاہری شان وشوکت کے بغیر محض اپنے حسن کردار و سیرت کی مدد سے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی جب تک اسلامی جمہوریت قائم رہی کسی خلیفہ کی مجال نہ ہوئی کہ عدالتوں کے فیصلوں میں تصرف یا ان کی خلاف ورزی کرے۔‘‘[1]

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

’’کسی نئی حکومت کے لئے جس نے بزور شمشیر اقتدار حاصل کیا ہو، یہ قدرتی طور پر مشکل ہوتا ہے کہ محکوموں کو فوراً اپنا گرویدہ بنالے۔ لیکن ابتدائی مسلمانوں نے مفتوحہ قوموں کو انتہائی اعتماد اور وابستگی کے محرکات مہیا کئے ...... انہوں نے اپنے محکوموں کے شہری حقوق کا مکمل تحفظ کیا۔ انہوں نے تمام مفتوحہ قوموں کو پوری پوری مذہبی آزادی دی۔ اس معاملے میں ان کا کردار موجودہ زمانے کی بہت سی مہذب حکومتوں کے لئے قانونی اور مذہبی رواداری کی افضل ترین مثال ہے۔ نہ تو انہوں نے کوڑے مار کر عورتوں کو ہلاک کیا اور نہ انہیں جلاوطن کر کے سائبیریا بھیجا تا کہ وہاں کانوں میں محنت شاقہ کریں اور اپنے محافظوں کی دست درازیاں اور زیادتیاں سہیں۔ ان میں اتنی دانشمندی تھی کہ انہوں نے کسی مفید خلائق معاشرتی ادارے میں دخل اندازی نہیں کی جو کسی مفتوحہ ملک میں موجود تھا اور جوان کے دین کے منافی نہ تھا۔‘‘[2]

افسوس! یہ اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے، حضرت معاویہ کے زمانے تک خلافت کی بعض اچھی خصوصیات قائم رہیں عربوں کی آزادی، جمہوریت پسندی اور حق گوئی و بے باکی کی سپرٹ کو پورے طور پر دبایا نہ جا سکا۔ لیکن انہوں نے اپنی وفات سے قبل اپنے بیٹے یزید کے لئے تحریص وترہیب کے ذریعے بیعت لی اور سلطنت و حکومت کو موروثی بنا دیا۔ مسلمانوں کو پھر کہیں اپنی پسند اور مرضی کی انتخابی حکومت میسر نہ آسکی۔

خلافت راشدہ کی حیثیت بالعموم اور عہد شیخین رضی اللہ عنہما کی بالخصوص دنیا کی تاریخ کے ریگستان میں ایک سرسبز و شاداب اور دلکشا نخلستان کی ہے۔ خلفائے اربعہ میں سے ہر خلیفہ کا بابرکت وجود اپنے خاص وقت کی ضرورت کا قدرتی جواب تھا۔

ہر خلیفہ اپنے وقت پر اسی ترتیب سے آیا اور اپنے وقت کے مسائل سے نپٹا جو اللہ کی طرف سے مقدر ہو چکا تھا۔ اس ترتیب میں تبدیلی سارے نظم خلافت کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ جن مسائل سے عہدہ برآ ہوئے وہ کسی دوسرے کے بس کے نہ تھے عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام کو جو غلبہ اور شوکت عطا کی وہ انہی کا حصہ تھا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے

---

[1] روح اسلام (ترجمہ اسپرٹ آف اسلام) صفحہ ۲۲۳

[2] روح اسلام (ترجمہ اسپرٹ آف اسلام) صفحہ ۲۲۴

ثروت و دولت کے طوفان میں اپنی تونگری کے باوجود جس طرح سادگی، سخاوت اور مساوات کا عملی مظاہرہ کر کے سرمایہ داری کے خلاف بند باندھنا چاہا وہ کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔ علی رضی اللہ عنہ نے فتنہ و فساد کے دور میں خلافت کو علیٰ منہاج نبوت برقرار رکھنے کے لئے مخالفت کے طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان دے دی۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے علی رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حقدار تھے۔ تو بے شک اس نے ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور مہاجرین و انصار سب کو خطا وار ٹھہرایا نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مشہور حدیث کو بھی جھٹلایا کہ میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔

آدمی سوچتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ایسا ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ حکومت الٰہیہ کا یہ تیس سالہ دور دنیا کی تاریخ میں ایک منارۂ نور کی حیثیت سے جگمگاتا رہے گا اور حکمرانوں اور محکوموں کو سیاست، عدالت، مساوات، حق گوئی، آزادی، معاشرت، معیشت کے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا رہے گا۔ دنیا کے ترقی یافتہ ملک جس فلاحی مملکت کی طرف آج آ رہے ہیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے چار جانشینوں نے عملاً قائم کر کے دکھادی تھی۔ عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ختم ہوا تو عہد خلافت کو بھی ختم ہونا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ شائد اللہ کو بھی خلافت راشدہ کو ہمیشہ کے لئے قائم رکھنا منظور نہ تھا دنیا کو صرف ایک روشن اور مثالی نمونۂ حکومت دکھا کے چھوڑ دیا۔ آئیڈیل رہنمائی اور سعی کے لئے ہوتے ہیں۔ ان تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حالات کے ساتھ تصورات اور خیالات میں تبدیلی کا آنا ناگزیر ہوتا ہے۔ بہرحال اگر خلافت راشدہ محض تیس سال کی قلیل مدت کے لئے تھی اور پھر کبھی قائم نہ ہو سکی (سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے ڈھائی سالہ دور حکومت کے) تو اس سے اس خلافت کی توہین و تحقیر ہوتی ہے نہ اسے ایک عارضی اور مصنوعی طرزِ حکومت کہا جا سکتا ہے نہ اس کی اہمیت میں کمی آتی ہے نہ خدا کی مشیت اور نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی ریاست پر کوئی حرف گیری کی جا سکتی ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاغ کا حق ادا کر دیا اور اس کے اولیں جانشینوں نے اس پر عمل کر کے دکھادیا۔ بنی امیہ اور بنی عباس کی نیم مذہبی نیم دینوی حکومتوں کے بعد سلطانی و شہنشاہی ادوار آئے۔ آمریت اور مطلق العنانی نے مسلمان عوام میں ملک خدا کا حکم بادشاہ کا تصور پیدا کر دیا اور وہ محض بے بس اور محکوم رعایا ہو کر رہ گئے۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً حق گوئی و بیباکی کے آئین جوانمردی پر عمل کرنے والے افراد بھی ان میں پیدا ہوتے رہے۔ موجودہ صدی کے غیر ملکی دور غلامی میں وہ اپنے ذہنی، عقلی، سیاسی، معاشی، معیشی، معاشرتی علوم و اصول کو فراموش کر کے مغربی سرمایہ داری، اشتراکیت عقلیت وغیرہ کے پیچھے بھاگتے ہیں اور ہر راہرو کے ساتھ تھوڑی دور چل کر رہ جاتے ہیں۔ جمہوریت کا جو خواب اسلام نے دیکھا تھا شاید کبھی اس کی روشن تعبیر سامنے آجائے۔ سوتے ہوؤں میں کچھ کسمساہٹ اور حرکت کے آثار نظر آتے تو ہیں۔

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ

(امین الامت)

''ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے۔ میری امت کے امین ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ہیں''

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

''اگر میں ابوعبیدہ کو پاتا تو انہیں خلیفہ بناتا''۔

(فاروق اعظم رضی اللہ عنہ)

۲ ہجری

کفر و اسلام کا پہلا معرکہ میدان بدر میں گرم ہے۔ کفار مکہ زبردست جنگی تیاری کر کے اسلام کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے عزم سے جوشِ کفر اور حمیت جاہلیت کے ساتھ لڑ رہے ہیں چشم فلک نے ایک عجیب بلکہ ناقابل یقین منظر دیکھا ہے کہ اگر باپ[1] مسلمانوں کی طرف سے شمشیر بدست ہے تو بیٹا[2] مشرکین کی حمایت میں تیغ و سناں چلا رہا ہے۔ بھانجا[3] اسلام کے لئے جان فشانی سے لڑ رہا ہے تو دوسری طرف ماموں[4] لات و ہبل کی سربلندی کا خواہاں اس کے مقابل ہے۔ ایک بھائی[5] دین حق کا علمبردار اور دوسرا کفر و شرک کا حامی باہم زندگی اور موت کی کشمکش میں الجھے ہوئے ہیں۔ بیٹا دین حق کے لئے جذبۂ شہادت سے سرشار خوفِ جاں سے بے نیاز ہو کر میدان میں اترا ہے اور اس کے مقابلے میں اس کا باپ باطل کے فال وفر کی حفاظت کے لئے خم ٹھونک کر آیا ہے۔ باپ کفر و شرک کی ساری غضبناکی کے ساتھ بیٹے پر پے در پے وار کئے جا رہا ہے تا کہ دین آبائی سے منحرف ہونے والے بیٹے کو خاک و خون میں ملا دے لیکن راہیں جدا ہو جانے اور قطع علائق کے باوجود بیٹے کے دل میں باپ کا لحاظ باقی ہے۔ وہ طرح دیئے جا رہا ہے، باپ کے وار بچا رہا ہے لیکن خود کوئی وار نہیں کرتا کہ شائد اب بھی باپ کو سمجھ آ جائے اور وہ باز آ جائے، کافی دیر تک وار بچاتے رہنے کے بعد جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ باپ اس کی جان لینے پر تلا ہوا ہے اور دشمن کی فوج کے بڑے بڑے سردار اسے بڑھاوا دے رہے ہیں تو اسے اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کی یہ فرزندانہ لیت و لعل اور صلہ رحمی کی کوشش اسلام کے لئے باعث نقصان نہ بن جائے۔ چنانچہ اس کی تلوار برق خرمن سوز کی طرح اچانک چمکتی ہے اور ایک ہی وار میں باپ کا نامبارک و ناپاک سر کٹ کر دور جا گرتا اور خاک و خون میں غلطیدہ ہو جاتا ہے۔ بیٹا ایک نگاہِ غلط انداز سے دیکھ کر پھر جہاد میں مصروف ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کفار اپنی قوم کے سترگاہائے سرسبد کی لاشیں میدان بدر میں اور اتنے ہی اسیران جنگ مسلمانوں کے قبضے میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

---

1. حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
2. عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے
3. حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
4. عاص بن ہشام جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا
5. حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے کافر بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا

جب پیغمبر اسلام ﷺ بدر سے مدینہ واپس آتے ہیں تو وحیٔ خداوندی نازل ہوتی ہے (ترجمہ)

''تم کبھی نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار ہو کہ اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (سورۂ مجادلہ: آیت ۲۲)

حضورِ اکرم ﷺ کا روئے اقدس خوشی سے چمک اٹھتا ہے۔ آپ ﷺ ایک لمبے قد، چھریرے جسم اور چھدری داڑھی والے ادھیڑ عمر کے سادہ مزاج، سنجیدہ طبع شخص کی طرف زیر لب تبسم کے ساتھ دیکھتے ہیں جیسے اللہ کی طرف سے نازل شدہ اظہارِ خوشنودی کے سرٹیفکیٹ پر اپنی مہر بھی ثبت کر دی ہو۔ صحابۂ کرام اس شخص کو مبارکباد دیتے ہیں۔ وہ اللہ کے رسول ﷺ کے اظہار خوشنودی سے خوش ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کرتا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے بدر کے معرکۂ حق و باطل میں اپنے ہاتھوں اپنے کافر باپ کو جہنم رسید کیا ہے، وہ دل ہی دل میں جناب رسالت مآب ﷺ کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کا یہ محکم سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والے خوش نصیب جاں نثار رسول ﷺ فدائے اسلام اور امین الامت، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے جو آئندہ چل کر عظیم سپہ سالار اور فاتح شام و فلسطین ہوئے اور تاریخ عالم کی عظیم ہستیوں میں شمار ہوئے۔

۹ ہجری میں جب نجران کے عیسائیوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بات چیت کے بعد اس نے خراج کی ادائیگی پر رضامندی ظاہر کی اور درخواست کی کہ کوئی امین شخص ان کے ساتھ بھیج دیا جائے۔ حضور ﷺ نے اپنے ایک پروانے کی طرف محبت کی نظر سے دیکھا۔ کشیدہ قامت، نحیف الجثہ، روشن چہرہ۔ حضور ﷺ نے اہل نجران سے فرمایا ''یہ ابوعبیدہ بن الجراح ہیں اور اس امت کے امین ہیں۔ یہ تمہارے ساتھ جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کا عطا کردہ یہ لقب ہمیشہ کے لئے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام کا جزو بن گیا اور وہ عوام و خواص میں امین الامت مشہور ہو گئے۔ اسی لئے اپنے آخری ایام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ابوعبیدہ زندہ ہوتے تو میں انہیں بلا کھٹکے خلیفہ نامزد کر دیتا کیونکہ وہ امت محمدیہ ﷺ کے امین تھے اور ان سے کسی خیانت کا اندیشہ نہ ہوا تھا۔

نام ونسب۔ پیدائش

عجیب بات ہے کہ دربارِ رسول کا یہ اہم رتن نہ اپنے اصل نام سے تاریخ میں مشہور ہوا نہ اپنے باپ کے نام سے۔ ان کا اصل نام عامر اور باپ کا نام عبداللہ تھا لیکن ان کی شہرت ان کی کنیت ابوعبیدہ کے نام سے ہوئی اور باپ کے نام کی جگہ دادا جراح کا نام کنیت کے ساتھ لگا۔ اس طرح وہ عامر بن عبداللہ کی بجائے ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کہلائے۔ باپ کا نام شاید اس لئے ترک کر دیا کہ وہ حالت کفر میں ان کے اپنے ہاتھ سے قتل ہوا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امین الامت کے لقب سے نوازا۔ ان کا تعلق قبیلہ فہر سے تھا جو قریش کی آخری شاخ تھی۔ فہر پر ان کا سلسلۂ نسب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ والد تو اسلام سے محروم رہا اور مسلمان بیٹے کے ہاتھوں حق و باطل کی جنگ میں مارا گیا لیکن والدہ امیمہ بنت غنم ایمان کی دولت سے بہرہ یاب ہوئیں اور صحابیت کا شرف حاصل کیا۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہجرتِ نبوی سے چالیس سال پہلے پیدا ہوئے۔ مکہ کے عام متوسط گھرانوں کے بچوں کی طرح پرورش اور تربیت ہوئی۔ فنونِ سپہ گری میں مہارت حاصل کی اور تجارتی کاروبار شروع کیا۔ قبولِ اسلام سے پہلے ہی شراب نوشی، بت پرستی اور دوسرے اعمالِ شنیعہ سے ہمیشہ محترز رہے۔

قبولِ اسلام

سعید روحوں کو سعید روحوں سے قدرتی انس اور لگاؤ ہوتا ہے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا اٹھنا بیٹھنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ انہی کی ترغیب سے تقریباً انتیس سال کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے جبکہ ابھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دارارقم کو مرکزِ دعوت نہیں بنایا تھا۔ ان کے اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام میں ایک آدھ دن کا فرق تھا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نویں مسلمان شمار ہوتے ہیں۔ اسلام لانے کے بعد دوسرے مٹھی بھر مسلمانوں کی طرح ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے لئے بھی آزمائش اور ابتلا کا دور شروع ہوگیا۔ انہوں نے بڑے صبر واستقامت سے ہر قسم کے شدائد ومصائب کو برداشت کیا۔ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مواخاۃ حضرت سالم رضی اللہ عنہ سے قائم کی تھی جو حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے مولا تھے۔

ہجرت

۵ نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے گیارہ مردوں اور چار مسلمان خواتین نے حبشہ (موجودہ ایتھوپیا) کی جانب ہجرت کی اور وہاں اطمینان سے زندگی گزارنے لگے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مزید تراسی مردوں اور بیس خواتین نے ادھر کا رخ کیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے۔ پھر جب مدینہ کی طرف عام ہجرت کا حکم ملا تو وہ بھی وہاں چلے گئے۔

مدینہ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ قائم کی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی مواخاۃ کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ''اصابہ''، ''سیر الصحابہ'' اور ''سیرت النبی'' کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان

کی مواخاۃ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے قائم کی۔ جبکہ ابن سعد رضی اللہ عنہ کے مطابق محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے۔ وہ بھی بڑے عظیم المرتبہ صحابی تھے۔ فتوحاتِ شام میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے۔ وہیں طاعون عمواس میں پہلے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اپنا قائم مقام سپہ سالار مقرر کیا۔ بعد میں وہ بھی وہیں وفات پا گئے۔ ابن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق ان کی مواخاۃ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے قائم کی گئی۔ لیکن بزرگ صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے صحیح مسلم[1] میں روایت کی ہے کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی مواخاۃ ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ سے قائم کی گئی[2] جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے باپ تھے۔ مذکورہ بالا انصار صحابہ میں سے کسی سے بھی مواخاۃ قائم کی گئی ہو، یہ حقیقت ہے کہ وہ سب بلند مرتبہ بزرگ تھے اور محبت اسلام، سیرت، اخلاق اور سماجی مرتبہ میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے ملتے جلتے تھے۔

مدنی زندگی۔ غزوات وسرایا

مدینہ پہنچ کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنی تمام توانائیاں خدمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خدمت اسلام کے لئے وقف کر دیں۔ وہ سابقون الاولون اور اکابر مہاجر صحابہ میں سے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشوروں میں شامل ہوتے تھے۔ بدر، احد، خندق، خیبر، بیعت رضوان، فتح مکہ، حنین، طائف، تبوک غرضیکہ تمام غزوات و مشاہدات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے اور شجاعت وجاں نثاری کا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا۔ غزوۂ بدر میں اپنے ہاتھ سے اپنے کافر باپ کو قتل کیا۔ غزوۂ احد میں جب درّہ پر تعینات مجاہدین کی غلطی کی وجہ سے مسلمان افراتفری میں میدان چھوڑ کر بھاگے تو درجن بھر دوسرے صحابہ کے ساتھ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بھی ثابت قدم رہے اور آخر تک میدان میں ڈٹے رہے۔ جب کفار کی یورش سے جناب رحمت العالمین صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے اور زرہ کی دو کڑیاں رخسارِ مبارک میں چبھ گئیں تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ دوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور اپنے دانتوں سے کھینچ کر کڑیاں نکالیں۔ اس کوشش میں ان کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ دانت تو کیا، جان بھی چلی جاتی تو وہ ''شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم'' کہتے۔ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جنت کی بشارت دی۔ بعد کی زندگی میں دوسرے کارناموں کے مقابلے میں وہ اس واقعہ کو اپنے لئے سب سے زیادہ باعث افتخار اور درجہ نجات سمجھتے رہے۔

۵ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بنوثعلبہ کے غارت گروں کی سرکوبی کے لئے چالیس صحابہ کا سالار بنا کر ذوالقصہ بھیجا۔ انہوں نے ڈاکوؤں پر حملہ کر کے انہیں بھگا دیا۔ مدینہ کے اطراف وجوانب میں ان کی غارت گری اور ڈاکہ زنی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ دشمن کا ایک شخص ہاتھ آیا جو مسلمان ہو گیا۔

---

1. کتاب الفضائل باب مواخاۃ النبی
2. عشرۂ مبشرہ کے مصنف قاضی حبیب الرحمٰن کی بھی یہی رائے ہے۔ اور غالباً یہ صحیح ترین روایت ہے۔ مؤلف

٦ ہجری میں بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ میں شامل ہوئے اور معاہدۂ صلح پر دستخط کرنے والوں میں شامل تھے۔ ۷ ہجری غزوۂ خیبر میں بہادری سے لڑے پھر حضور ﷺ نے ان کی سرکردگی میں دوسو صحابہ کو جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، قبیلہ قزاعہ کے خلاف ذات السلاسل کی طرف بھیجا تاکہ وہاں پہلے سے موجود حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کو دشمن کے مقابلے میں کمک پہنچائیں۔ اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اگرچہ پوری فوج کا سالار انہیں ہونا چاہئے تھا لیکن عمرو بن العاص کی ضد پر انہوں نے اپنی فطری انکساری اور عدم جاہ پسندی کے باعث عمرو رضی اللہ عنہ کی ماتحتی قبول کر لی۔ سرورِ کائنات ﷺ نے انہیں جس مقصد کے لئے بھیجا تھا وہ انہیں لشکر کی سپہ سالاری سے زیادہ عزیز تھا۔ نہایت بہادری سے لڑ کر دشمن کو بھگا دیا۔ جب حضور ﷺ کو ان کا اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا قضیہ معلوم ہوا تو فرمایا ''اللہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ پر رحمت نازل فرمائے۔'' یہ دعا ان کے عمدہ رویئے اور اختلاف سے بچنے کی کوشش پر خوشنودی کا اظہار تھی۔

۸ ہجری میں حضور اقدس ﷺ نے تین سو سے کچھ زائد مہاجرین و انصار پر مشتمل ایک سریہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مدینہ منورہ سے پانچ روز کی منزل پر ساحلی علاقے کی طرف قبیلہ جہینہ کی ایک شاخ کی سرکوبی نیز قریش کے قافلوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کے لئے بھیجا۔ ابھی کارِ مفوضہ انجام کو نہ پہنچا تھا کہ رسد ختم ہوگئی۔ صرف کھجوروں کی ایک تھیلی رہ گئی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے راشن بندی کر دی۔ ہر مجاہد کو صرف ایک کھجور یومیہ دی جانے لگی اور سبھی صبر و شکر سے اس پر گزارہ کرتے رہے۔ اس کے بعد درختوں کے پتے کھانے کی نوبت آ گئی۔ اور کئی دن یہ سلسلہ چلا۔ منہ میں چھالے پڑ گئے اور پاخانے کی کیفیت بکریوں کی مینگنیوں کی سی ہوگئی۔ اس وجہ سے اس فوجی مہم کا نام سریۃ الخبط (لشکر برگ) پڑ گیا۔ اگرچہ اصل نام اس کا سریہ سیف البحر تھا، بعد میں اللہ نے ایک بہت بڑی مچھلی سمندر کے ساحل پر اچھال دی جو کئی مہینے تک کے لئے کافی ثابت ہوئی۔ یہ واقعہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بزرگ ساتھیوں کے صبر و ثبات کی ایک مثال ہے۔

۸ ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ لشکر کے زرہ پوش مجاہدین کی قیادت آپ کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے بعد غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں بھی شجاعت و جاں نثاری کا حق ادا کیا

ان جنگی خدمات کے علاوہ حضور اکرم ﷺ نے وقتاً فوقتاً بعض دوسری خدمات بھی ان کے سپرد کیں اور انہوں نے احسن طریقے سے سرانجام دیں۔ ۹ ہجری میں اہل نجران کی درخواست پر انہیں مذہبی تعلیم دینے، ان کے جھگڑوں، مقدموں کا فیصلہ کرنے اور جزیہ وصول کرنے کے لئے بھیجا اور فرمایا کہ ''یہ میری امت کا امین ہے۔ اسے تمہارے ساتھ بھیجتا ہوں۔''

ایک دفعہ بحرین سے جزیہ کی وصولی پر مامور کئے گئے اور بہت سامال لے کر واپس آئے۔

۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ کی ہم رکابی میں حج کے لئے مکہ گئے، غرضیکہ سرورِ کائنات ﷺ کی حیاتِ دینوی کے آخری دم تک حاضر باش اور خدمت گزار رہے۔ جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی اسے حسن و خوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ بہادری، فداکاری، خلوص اور ایثار میں خود بخود ممتاز ہوتے چلے

گئے۔ کبھی ارادۃً خود کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بڑے مرنجاں مرنج اور صابر بزرگ تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری دم تک ان سے خوش رہے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں

حجۃ الوداع سے واپسی کے تھوڑے عرصہ بعد جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا انصار نے اپنے میں سے خلیفہ منتخب کرنا چاہا اور سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے۔ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین بھی نہ ہونے پائی تھی کہ یہ انتہائی خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی۔ اطلاع ملنے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سقیفہ بنی ساعدہ میں گئے۔ تفصیل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں دی جا چکی ہے۔ معاملہ کو سلجھانے میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس نازک موقع پر انہوں نے مصالحت کی سب سے زیادہ کوشش کی اور انصار سے کہا کہ ''اے گروہ انصار تم نے سب سے پہلے اللہ کے دین کی مدد کی۔ اب تم ہی سب سے پہلے فتنہ و اختلاف کی بنیاد رکھنے والے نہ بنو۔'' اس کا حاضرین پر اثر ہوا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے اخلاص، بے نفسی، بردباری، صلح کل طبیعت اور دھیمے مزاج کو معاملہ سلجھانے میں بڑا دخل تھا۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق لوگ خود ان کے پاس بیعت کرنے کے لئے آئے مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا اس منصب کا اہل نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انصار سے فرمایا کہ ''یہاں عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان کی جو قدر و منزلت تھی وہ سب کو معلوم ہے اس لئے ان دونوں میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ اس کے جواب میں عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم میں سب سے بہتر ہیں اور خلافت کے سب سے زیادہ اہل ہیں ہم ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ بیعت کے لئے بڑھائے لیکن حضرت بشیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا کہ ٹھہرو پہلے مجھے بیعت کرنے دو۔ چنانچہ پہلے انہوں نے بیعت کی اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے۔

سپہ سالاری

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فتنہ ارتداد کو کچلنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھرپور تعاون کیا اور اس کے بعد شام و فلسطین کی مہمات میں سپہ سالار مقرر کئے گئے اور عظیم کارنامے سرانجام دیئے۔ جب بازنطینی سلطنت کی مدینہ پر حملہ کی نیت سے شام میں فوجوں کے اجتماع کی خبریں آنے لگیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے کچھ پہلے ۱۳ ہجری میں ہرقل قیصر قسطنطنیہ کی افواج کا مقابلہ کرنے اور آگے بڑھ کر شیر کو خود اس کی کچھار میں للکارنے کے لئے پانچ پانچ ہزار پر مشتمل چار لشکر تیار کئے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو حمص (شام کا ایک اہم صوبہ) یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو دمشق، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو فلسطین اور شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو اردن کی طرف پیش قدمی کرنے والے لشکر کا سالار مقرر کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر چاروں لشکر اتفاق سے کسی ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سالار اعظم ہوں گے۔ فوجی مجاہدین کی روانگی سے ایک دن پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر چند مفید ہدایات دیں اور اپنے ماتحت جہاد پر جانے والے ایک ہزار بزرگ صحابہ (جن میں ایک سو بدری تھے) سے حسن سلوک کی تاکید کی پھر بعد میں خود حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا:

''ابوعبیدہ! میں نے خوب اچھی طرح دیکھا ہے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں کس عزت اور محبت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور ان کے حضور میں تمہاری کتنی قدر و منزلت تھی۔ اس وجہ سے میری نگاہ میں تمہاری بڑی وقعت ہے۔ میں خدائے عزوجل کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج تمام روئے زمین پر میں کسی شخص کو بھی تمہارے اور عمر بن الخطاب کے برابر نہیں سمجھتا۔ ہر اس انسان کی عزت جو مجھ سے ملتا ہے میری نظر میں تمہاری وقعت سے کم ہے۔ جاؤ اللہ تعالیٰ تمہارا حافظ و ناصر ہو۔''[1]

جب لشکر روانہ ہونے لگا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ لشکر میں گئے اور ایک بار پھر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے یوں خطاب کیا:

''ابوعبیدہ! تم میدان جنگ میں جا رہے ہو۔ وہاں اعمال نیک بجا لانا تاکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کا موجب ہو۔ شہید کی موت بہترین موت ہے۔ پس کفار کے مقابلے میں پیٹھ نہ پھیرنا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے تمہارا نامۂ اعمال تمہارے دائیں ہاتھ میں دے اور دنیا و آخرت میں تمہیں آرام پہنچائے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان نیک اور پاک نفس لوگوں میں سے ہو جو ہر وقت اپنے خدا سے ڈرتے رہتے ہیں جو دنیا کی آلائشوں میں نہیں پھنستے اور جنہوں نے آخرت ہی کو اپنا توشہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے تمہیں اس امر کی توفیق دی کہ تم ایک فوج لے کر خدا کے دشمنوں سے جنگ کرنے جا رہے ہو۔ پس علم اسلام بلند کرنے کے لئے اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ اور ان لوگوں سے جہاد کرو جو ظلم و طغیان میں حد سے بڑھ گئے ہیں دن رات عیش پسندی جن کا کام ہے، رعایا سے بے خبر اور ملک سے بے پرواہ ہیں۔ جنہوں نے اپنے خالق اور مالک کو چھوڑ کر جھوٹے اور فرضی معبود کی پرستش شروع کر دی ہے اور اپنے شرک و کفر میں برابر بڑھتے جا رہے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر رخصت ہو۔ خدائے پاک و برتر ایسے سب لوگوں پر فتح عطا فرمائے اور تمہیں پوری پوری کامیابی بخشے۔ آمین''[2]

ولیم میور لکھتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو یہ بھی تاکید کی کہ جو علاقے فتح ہو جائیں وہاں اچھی اور منصفانہ حکومت کا نظام قائم کریں، وعدہ ایفائی کریں، ہمیشہ راست گوئی سے کام لیں، سفیروں کا احترام کریں، جہاں ضرورت سمجھیں وہاں رازداری اختیار کریں اور کبھی تساہل و تغافل کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر نے جابیہ پہنچ کر اسے فتح کر کے اپنا مرکز بنا کر دوسرے شامی علاقوں کے خلاف

---

[1] ''دس بڑے مسلمان'' مصنفہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ص ۸۷-۲۸۶

[2] ''دس بڑے مسلمان'' مصنفہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ص ۸۸-۲۸۷

جہاد کا آغاز کرنا تھا۔ چاروں فوجوں میں سے ان کی فوج میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مدینہ کی کثرت تھی، غالباً اس لئے کہ چاروں سپہ سالاروں میں وہ سب سے بلند مرتبہ صحابی تھے۔ اثنائے راہ میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے شام کا شہر مآب فتح کیا۔ اہل شہر کو جزیہ کی ادائیگی پر امان دے دی۔ وہاں سے چل کر جابیہ پہنچے جہاں کثیر التعداد بازنطینی افواج کے اجتماع کی خبر ملی۔ شام کے شہری باشندے اور عیسائی عرب بھی ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے مقابلے پر کمر بستہ تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے خلیفۃ المسلمین کو صورت حال سے مطلع کیا اور کمک بھیجنے کی درخواست کی۔ خط پا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم بھیجا کہ عراق کے محاذ کی کمان حضرت مثنیٰ بن حارثہ کے سپرد کر کے خود جلد سے جلد آدھی فوج کے ساتھ شام کے محاذ پر پہنچ جائیں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے انتہائی تیز رفتاری سے خلیفہ کے حکم کی تعمیل کی اور اپنی فوج کے ہمراہ بصریٰ پہنچ گئے۔ شہر کے گورنر نے اطاعت قبول کر لی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فوج حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی فوج میں مل گئی۔ خلیفہ کے حکم سے حضرت یزید بن سفیان رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ بھی اپنی فوجیں لے کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے اور سب نے مل کر اجنادین کا رخ کیا۔ مسلمانوں کی متحدہ فوج کی تعداد پینتیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

جنگ اجنادین۔ دیگر فتوحات

۲۸ جمادی الاول ۱۳ ہجری کو اجنادین کے مقام پر ایک لاکھ بازنطینی فوج سے مقابلہ پیش آیا جس کا سپہ سالار بازنطینی شہنشاہ ہرقل کا بھائی تھیوڈور تھا اور خود ہرقل حمص میں موجود تھا۔ یہ ایک اہم، شدید اور خونریز جنگ تھی۔ بازنطینی اپنے اہم شہروں اور علاقوں کا پوری تیاری سے دفاع کرنے پر تلے ہوئے تھے لیکن پینتیس ہزار مسلمان مجاہدوں نے ایک لاکھ رومیوں کو شکست فاش دی۔ ایک قلیل تعداد کے سوا پوری رومی فوج تباہ ہو گئی۔ سپہ سالار تھیوڈور حمص کی طرف بھاگ گیا وہاں سے قیصر ہرقل نے ذلت و رسوائی کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا وہاں وہ قعر ذلت و گمنامی میں ڈوب کر مر گیا۔ خود ہرقل انطاکیہ چلا گیا اجنادین کی فتح کے تقریباً ایک ماہ بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے جانشین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی پالیسی کو جاری رکھا۔

اجنادین کی فتح کے بعد غزوہ، سامریہ، نابلس، لد (لڈا) جافہ، بیت جبرین وغیرہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ لوگوں کے جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ بالغ مردوں پر جزیہ عائد کر دیا گیا اور اراضی پر خراج۔ رملہ، عسقلان، عکرہ، سدون وغیرہ نے بھی اپنے دروازے مسلمانوں کے لئے کھول دیئے۔

اور پھر متحدہ عساکر اسلام کے جھنڈے دنیا کے قدیم ترین شہر اور شام کے دارالحکومت دمشق کے سامنے جا لہرائے۔

فتح دمشق

دمشق جسے شہروں کی ملکہ بھی کہا جاتا تھا، کا محاصرہ ۱۶ محرم ۱۴ ہجری کو شروع ہوا اور چھ ماہ تک جاری رہا۔ یہ پہلا

قلعہ بند اور مضبوط فصیل والا شہر تھا جس سے مسلمانوں کو سابقہ پڑا۔ انہیں ایسے شہروں کو سر کرنے کا نہ تجربہ تھا نہ ضروری سروسامان ان کے پاس تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر پانچوں سالار معہ اپنی اپنی فوجوں کے محاصرہ کے لئے اکٹھے ہو گئے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اپنی فوج کے ساتھ مشرقی دروازے (باب الجابیہ) پر تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ ان کے بالمقابل مغربی دروازے پر۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور شرجیل رضی اللہ عنہ کی افواج بھی مختلف دروازوں پر شہر کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھیں۔ بازنطینی محصورین گاہے گاہے نکل کر جنگ کرتے اور پھر شہر کے اندر گھس کر دروازے بند کر کے قلعہ بند ہو جاتے۔ انہیں امید تھی کہ قیصر کمک بھیجے گا مگر اسلامی افواج کی چوکسی نے ان کی امیدیں خاک میں ملا دیں۔ ایک رات جبکہ شہر میں کوئی جشن برپا تھا اور فصیل کے محافظین بھی جشن کی خوشیوں اور اکل و شرب میں شامل ہو کر پہرہ داری سے غافل تھے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنے کچھ ساتھیوں سمیت قلعہ کی فصیل پھاند گئے اور لڑتے بھڑتے دروازہ کھول دیا۔ ان کی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ لیکن جب وہ وسط شہر میں کسیروں یا تیلیوں کے بازار میں پہنچے تو وہاں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی فوج سے سامنا ہوا۔ معلوم ہوا کہ حاکم شہر نے ان سے صلح کر کے ادھر کا دروازہ کھول دیا تھا۔ تھوڑی سی ردوکد کے بعد صلح قبول کر لی گئی۔ اہل شہر کو امان دے دی گئی۔ ان کے جان و مال مکانات، گرجے محفوظ قرار دیئے گئے۔

اس بارے میں اختلاف ہے کہ فتح دمشق کے موقع پر اسلامی افواج کا سپہ سالار اعظم کون تھا؟ خالد رضی اللہ عنہ یا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ؟ افواج کو شام بھیجتے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ جب کسی ایمرجنسی کی وجہ سے اسلامی افواج ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار اعظم ہوں گے۔ بعد میں جب خالد رضی اللہ عنہ کو عراق کے محاذ سے شام کے محاذ پر بھیجا تو واضح طور پر یہ نہیں لکھا کہ وہ متحدہ افواج کے سپہ سالار اعظم ہوں گے۔ نہ اپنے ابتدائی احکام منسوخ کئے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو شام میں برسرپیکار فوجوں کی مدد کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہ صرف اپنی فوج کے سالار تھے۔ لیکن جیسا کہ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خالد رضی اللہ عنہ اپنے کارناموں سے خود ہی سپہ سالار بن جاتے ہیں۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ منکسر المزاج اور بردبار قسم کے انسان تھے۔ انہیں دوسروں پر سپہ سالاری کی دھونس جمانے اور اپنی بڑائی کی نمائش کا بھی شوق نہ تھا۔ وہ تو خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں سپہ سالار تھے۔ ورنہ اگر انہیں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھی کسی دوسرے سالار کے ماتحت لڑنے کا حکم دیا جاتا تو بھی وہ پس و پیش نہ کرتے جیسا کہ ایک سریہ کے موقع پر ان کے اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے درمیان واقعہ پیش آیا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اگر دمشق کے محاصرہ کے وقت ان کی جگہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہوتے تو ممکن تھا کہ خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے درمیان کوئی کھینچا تانی کی صورت قیادت کے بارے میں پیدا ہو جاتی۔ خالد رضی اللہ عنہ کے شامی محاذ پر پہنچ جانے کے چند ماہ بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا اور انہیں اپنے احکام میں ردوبدل کرنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ دمشق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتح ہوا۔ صلح نامہ پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دستخط کئے معین الدین ندوی نے سیر الصحابہ میں ابن اثیر کے حوالے

سے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ ہی کو دمشق کے محاصرے کے دوران میں سپہ سالار اعظم لکھا ہے۔ شاید صورت حال یہ رہی ہو کہ خالد رضی اللہ عنہ نے اگر حکماً نہیں تو عملاً سپہ سالاری سنبھال لی ہو اور مرنجاں مرنج ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا ہو خصوصاً جبکہ ہر سالار اپنی اپنی فوج کے ساتھ شہر کے کسی دروازے یا فصیل کے کسی حصے کے سامنے مورچہ بند تھا۔ روایات یہ بھی کہتی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے بعد ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری کی توثیق کی۔ خالد رضی اللہ عنہ صرف اپنے حصہ فوج پر برقرار رہے اور ایک سال بعد جنگ یرموک کے خاتمہ پر اس سے بھی انہیں معزول کر دیا گیا اور وہ ایک عام فوجی افسر ہو کر رہ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابو عبیدہ انہیں اپنے حکم سے مختلف مہمات کے سالار بنا کر بھیجتے رہے اور انہوں نے شام میں اس حالت میں بھی کارنامے سرانجام دیئے۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جیسے شریف، نیک دل، نرم مزاج اور خیر خواہ امت سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ اللہ کی تلوار (خالد رضی اللہ عنہ) کو نیام میں ڈال دیتے، وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جنگی بصیرت اور مہارت سے بخوبی آگاہ تھے اس لئے انہیں ماتحت سالار کی حیثیت سے برقرار رکھا۔

معرکہ فحل

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے شام کی طرف فوجیں بھیجتے وقت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو دمشق کی فتح اور گورنری کے لئے نامزد کیا تھا۔ ان کی مدد کے لئے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے کمانڈر پہنچے تھے۔ فتح کے بعد یزید رضی اللہ عنہ بطور گورنر رہے اس اثنا میں بازنطینی فوجیں بیسان کے مقام پر جمع ہونے لگی تھیں۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اپنی افواج کے ساتھ ان کے بالمقابل فحل کے مقام پر خیمہ زن ہوئے بازنطینی سپہ سالار نے صلح کی گفتگو کے لئے اپنا سفیر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا۔ وہ جب اسلامی کیمپ میں پہنچا تو وہاں سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے نظر آئے، ادنیٰ و اعلیٰ، افسر اور ماتحت، سپہ سالار اور سپاہی میں کوئی فرق و امتیاز دکھائی نہ دیا۔ سپہ سالار اعظم کے لئے نہ تو کوئی ممتاز قسم کا خیمہ اور سروسامان تھا، نہ اس کے خیمے کے گرد کوئی پہرہ دار تھا، نہ سپہ سالار اعظم دوسروں سے زیادہ قیمتی اور مکلّف لباس سے پہچانا جا سکا۔ خیمے میں بہت سے لوگ زمین پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ آخر سفیر نے مجبور ہو کر حاضرین سے پوچھا کہ آپ لوگوں کا سپہ سالار اعظم کون ہے؟ لوگوں نے ایک سیدھے سادھے خاک نشین شخص کی طرف اشارہ کیا۔ سفیر کو یقین نہ آیا۔ اس نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے براہ راست تصدیق چاہی کہ کیا آپ ہی سپہ سالار ہیں؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے کہا کہ آپ لوگ اپنے ملک کو واپس چلے جائیں۔ آپ کے ہر فوجی کو دو دو طلائی دینار دیئے جائیں گے۔ سپہ سالار کو ایک ہزار دینار اور خلیفہ کو دو ہزار دینار حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ''ہمیں مال و دولت کی حرص نہیں۔ دو دینار کیا دو لاکھ بھی قبول نہیں۔ ہم اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے نکلے ہیں۔ ہمارا مقصد اللہ کی زمین کو فتنہ و فساد اور برائی سے پاک کرنا ہے۔ تم اسلام قبول کر لو تو ہمارے بھائی ہو ہمارے تمہارے حقوق برابر، جزیہ دینا قبول کرو تو ہم تمہاری حفاظت کریں گے ورنہ ہمارے تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔'' سفیر دھمکیاں دیتا ہوا لوٹ گیا۔ اگلی صبح کو دونوں فوجوں کا تصادم ہوا۔

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اسلامی فوج کے قلب کی کمان خود کر رہے تھے۔ انہوں نے دشمن کے مقابلے میں قلیل التعداد اسلامی فوج کو بڑی ہوشیاری سے لڑایا اور فتح حاصل کی حالانکہ تعداد، اسلحہ اور دوسرے سروسامان کے لحاظ سے بازنطینیوں کا پلہ بہت بھاری تھا، لیکن قانونِ خداوندی یہ ہے کہ ایمان سامان کے مقابلے میں زیادہ وزنی ہوتا ہے اور اکثر اہل ایمان کی بہت تھوڑی تعداد نے غیر اہل ایمان کی بھاری تعداد کو شکست دی ہے۔ فحل کی فتح کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردن کا تمام علاقہ لشکر اسلام کے قبضے میں آ گیا۔

فحل کی فتح ۱۳ ہجری کے اختتام سے تقریباً ایک ماہ پہلے ہوئی۔ انہی شرائط پر جو نابلس وغیرہ شہروں کو دی گئیں۔

حمص

فحل سے فارغ ہو کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حمص کی طرف پیش قدمی کی جو شام کے ایک بڑے ضلع یا صوبے کا صدر مقام تھا اور جنگی اور سیاسی اہمیت رکھتا تھا۔ ابتداً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں حمص ہی کی فتح کے لئے نامزد کیا تھا، پہلے بعلبک پر گزر ہوا جو ایک قدیم شہر تھا اور بعل کی پرستش کا بہت بڑا مرکز رہ چکا تھا۔ اور یہیں بعل کے پجاریوں کا حضرت الیاس علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تھا اور وہ ہزیمت کے بعد قتل کئے گئے تھے اہل شہر نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کرنے کی بجائے صلح کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ انہیں جان و مال کی امان دی گئی۔ ان کے عبادت خانے اور مکانات محفوظ قرار دیئے گئے۔ جو اپنے مذہب پر قائم رہے ان پر جزیہ اور خراج عائد کیا گیا۔

راہ کے دوسرے چھوٹے بڑے شہر اور مقامات فتح کرتے ہوئے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حمص پہنچے اور محاصرہ کر لیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ قیصر کی طرف سے فوجی امداد سے مایوس ہو کر اہل شہر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان سے بھی بعلبک والوں کا سا سلوک کیا گیا۔ اہل شہر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حسن سلوک سے بہت متاثر ہوئے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے مشہور صحابی عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو وہاں بطور گورنر چھوڑا اور خود لاذقیہ کے مضبوط قلعے کا رخ کیا۔ راستے میں شیرز، حمات، معرت النعمان وغیرہ مقامات فتح کئے۔

فتح لاذقیہ

قلعہ لاذقیہ کے حفاظتی انتظامات نہایت مستحکم تھے۔ اہل شہر کے پاس رسد کے ذخائر کی افراط تھی۔ محاصرہ کی پروا کئے بغیر وہ شہر کے اندر معمول کے مشاغل اور کاروبار میں مصروف رہے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے آخر شہر کے باہر سامنے کے میدان میں راتوں رات بہت سے گڑھے کھدوائے اور انہیں اوپر سے گھاس پھوس وغیرہ سے ڈھانپ دیا اور صبح کو محاصرہ اٹھا کر حمص کی طرف روانہ ہو گئے محصور فوج اور اہل شہر شہر فصیل پر سے ان کی روانگی کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور شہر کے دروازے کھول کر باہر آنے جانے لگے۔ ادھر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ رات کو اپنی فوج سمیت واپس آ کر گڑھوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ صبح کو جب شہر کے دروازے کھلے تو اچانک حملہ کر دیا۔ دشمن کو دروازے بند کرنے کا موقع نہ دیا۔ شہر فتح ہو گیا۔

معرکۂ یرموک (رجب ۱۵ ہجری)

پے در پے شکستوں، دمشق، حمص، لاذقیہ، قنسرین وغیرہ ایسے اہم شہروں اور وسیع وعریض زرخیز علاقوں سے بے دخلی ومحرومی کی وجہ سے بازنطینی شہنشاہ سراپا قہر بن گیا۔ اسے اور اس کے بطریقوں اور امرا کو یہ یقین نہیں آتا تھا کہ عظیم اور طاقتور سلطنت ایران کو ذلت آمیز شکست دینے کے بعد وہ عرب کے بے سروسامان بادیہ نشینوں کے مقابلے میں اپنی کثیر التعداد افواج اور بے پناہ جنگی سروسامان کے باوجود ہار بھی سکتے ہیں۔ اب اس نے ایک بھرپور اور فیصلہ کن آخری ضرب عساکر اسلامی پر لگانے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے ایک عظیم لشکر رومیوں[1] (یونانیوں) شامیوں، اہل جزیرہ اور اہل ارمینیا پر مشتمل دریائے یرموک کے کنارے وادیٔ واقوصہ میں جمع کیا جس کی تعداد دو لاکھ تھی۔ پادریوں کی ایک بڑی تعداد فوج کے ہمراہ تھی جو دین مسیح کی حفاظت وحرمت کے لئے سپاہیوں کو جانیں لڑا دینے کے لئے جوش دلا رہی تھی۔ اس زبردست لشکر کے مقابلے کے لئے تمام مسلمان سالارانِ لشکر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ باہمی مشورہ سے مفتوحہ شہروں اور علاقوں میں منتشر دستوں کو واپس بلا لیا گیا اور فوج کی مجموعی تعداد تقریباً چالیس ہزار ہو گئی جبکہ دشمن فوج کی تعداد دو لاکھ تھی بلکہ ایک روایت کے مطابق دو لاکھ چوبیس ہزار۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ چونکہ درپیش صورت حال میں مسلمان مفتوحہ آبادی کی حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوں گے۔ اس لئے وصول کردہ جزیہ اور خراج انہیں واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ کئی لاکھ کی خطیر رقم حمص اور دوسرے شہروں کے باشندوں کو واپس کر دی گئی۔ اس انصاف پسندی سے عیسائی اور یہودی آبادی بہت متاثر ہوئی۔ چنانچہ وہ روتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ خدا پھر مسلمانوں کو واپس لائے اور بازنطینیوں سے محفوظ رکھے۔ دنیا کی تاریخ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی اس دیانت اور حق پسندی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے خلافت راشدہ کے دوران میں بے شمار سنہری ریکارڈ قائم کئے جو آج تک توڑے نہیں جا سکے۔ مجاہدین کو محاذ جنگ پر جاتے وقت بھی اپنی بیویاں ساتھ رکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ کیونکہ ان میں بہت سے بادیہ نشین ہوتے تھے جن کے مستقل گھر بار اور ٹھکانے نہ ہوتے تھے اور ان کے اہل وعیال ان کے ساتھ ہی حرکت کرتے تھے۔ دوسرے ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ مفتوحہ ممالک کی غیر مسلم عورتوں کی طرف کشش اور رغبت پیدا نہ ہو[2] نیز ایمرجنسی میں عورتیں زخمیوں کو پانی پلاتی اور ان کی مرہم پٹی بھی کرتی تھیں۔ اس لئے اس موقع پر خواتین اور بچوں کی حفاظت کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی اپنی رائے تھی کہ لاذقیہ کا مضبوط شہر عیسائیوں اور دوسرے ذمیوں سے خالی کرا لیا

---

[1] دراصل مشرقی رومی سلطنت رومی نہ تھی بلکہ یونانی تھی جو رومن ایمپائر سے الگ ہو کر قائم ہوئی تھی اور یونانی چرچ کی معتقد تھی۔ اس کو بازنطینی سلطنت بھی کہتے ہیں۔ مؤلف

[2] آج کل کی مہذب، ترقی یافتہ اور طاقتور قوموں نے لڑائی کے دوران میں اس کی عام اجازت دے رکھی ہے کہ افواج کے ساتھ طوائفوں کے دل بادل بھی ہوتے ہیں تاکہ فوجیوں کی تفریح طبع کا سامان رہے۔ پردہ پوشی کی غرض سے انہیں خوبصورت نام دے دیئے جاتے ہیں مثلاً ویمنز اگیزی لیسٹری کور (WAC) یعنی عورتوں کا امدادی دستہ وغیرہ۔ مؤلف

جائے اور مسلمان عورتوں بچوں کو وہاں اپنے ایک فوجی دستے کی حفاظت میں رکھا جائے لیکن حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ جو فوجی سالاروں میں سے ایک تھے، اس رائے کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اہل شہر کو پناہ دے چکے ہیں اور وہ ہماری حفاظت میں آ چکے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ انہیں شہر سے نکال دیں خواہ یہ عارضی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے بڑی فراخدلی سے اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور کہا کہ بے شک جو معاہدہ ہم نے اہل شہر سے کیا ہے ہم اسے کسی حالت میں اپنے طور پر توڑ نہیں سکتے تاوقتیکہ ان کی طرف سے عہد شکنی نہ ہو۔ لہٰذا واقعی انہیں شہر سے نکالنے کا کوئی جواز نہیں۔

کیا آج کی ''مہذب'' سپر پاورز کے سپریم کمانڈروں میں سے کسی کی ایسی انسانیت نوازی، عہد کی پابندی اور انصاف پرستی کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟ مشرق و مغرب کی تاریخ کو کھنگال جایئے جواب نفی میں ہو گا۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ عورتیں لشکر کے ساتھ ہی رہیں گی اور ان کا ساتھ رہنا بہت مفید ثابت ہوا۔ مؤرخوں نے جن میں ولیم میور اور دوسرے مستشرقین بھی شامل ہیں۔ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمان عورتوں نے جنگ یرموک میں اہم کردار ادا کیا۔ زخمیوں کو اٹھانے، پانی پلانے اور مرہم پٹی کرنے کے علاوہ بازنطینیوں کے خلاف لڑیں بھی اور ایک طرف سے جب مسلمان دبتے ہوئے پیچھے ہٹے تو عورتوں نے خیموں کی چوبوں سے ان کا استقبال کیا اور انہیں شرم و غیرت دلا کر پیچھے کو موڑا اور مردانہ وار لڑنے کے لئے بڑھا دیا اور انہی چوبوں سے خود بھی دشمن کے خلاف لڑیں۔

یہ درست ہے کہ نئی تازہ دم اور کثیر بازنطینی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو اپنے فوجی دستے شام کے مفتوحہ شہروں اور علاقوں سے واپس بلا کر ایک جگہ اکٹھے کرنے پڑے اور وصول شدہ ٹیکس تک واپس کر دیئے اور یہ گویا وقتی طور پر ان علاقوں سے دستبرداری کی علامت تھی۔ لیکن ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور ان کی فوج نے مفتوحہ آبادی سے جو مشفقانہ اور منصفانہ سلوک کیا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مفتوحین ان کی فتح اور بازنطینیوں کی شکست کی دعائیں مانگتے تھے اور دل سے مسلمانوں کی فتح کی آرزو کرتے تھے۔ سر ولیم میور جیسا متعصب مستشرق بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''اگر مسلمانوں نے شامی عوام سے اچھا سلوک نہ کیا ہوتا اور ان کے مذہب کی مخالفت کی ہوتی تو اس (جنگ یرموک کے) موقع پر ان کی پوزیشن بہت خراب ہوتی۔ لیکن مفتوحہ آبادی سے ان کا نرم سلوک، عدل و انصاف اور دیانت و امانت، بازنطینیوں کے ظلم و تشدد اور عدم رواداری کے مقابلے میں بہت نمایاں تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب نئی بازنطینی فوج بڑی تیاریوں کے ساتھ دوبارہ سین پر نمودار ہوئی تو مسلمان ہر لحاظ سے ایک دوست ملک میں تھے، شامی عیسائیوں کو عرب حملہ آوروں کے ماتحت بازنطینی حکومت کے مقابلے میں کہیں زیادہ شہری اور سیاسی آزادیاں حاصل تھیں اور وہ اپنی سابقہ حالت کی طرف لوٹ جانے کے ہرگز خواہش مند نہ تھے۔ یہودیوں سمیت حمص کے باشندوں

نے یہ پختہ فیصلہ کر لیا تھا کہ بازنطینیوں پر اپنے شہر کے دروازے بند رکھیں گے اور جنگ کے نتیجہ کا انتظار کریں گے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر انہیں اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹنا بھی پڑا تو بھی ان کی حالت بازنطینیوں کی سابق حکومت کے دوران سے بدتر نہ ہوگی۔ جب مسلمان وہاں سے ہٹے تو انہوں نے تمام وصول کردہ ٹیکس واپس کر دیئے کیونکہ وہ اپنے معاہدہ کے مطابق سردست مفتوحین کے جان و مال کی حفاظت کرنے سے قاصر تھے، ایک نسطوری بشپ نے ۱۵ ہجری میں لکھا، عربوں کو خدا نے حکومت دی ہے اور وہ ہمارے آقا بن گئے ہیں لیکن وہ عیسائی مذہب کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ وہ ہمارے مذہب کی حفاظت کرتے ہیں اور ہمارے گرجوں اور کانونٹوں کو تحائف وغیرہ دیتے ہیں۔ مسلمان فاتحین اور عیسائی رعایا کے درمیان خوشگوار تعلقات کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ دونوں مذہبوں کے عبادت گزار اپنی اپنی عبادت کے لئے دمشق کے گرجا گھر ایک ہی دروازے سے داخل ہوتے تھے۔"[1]

جنگ کے آغاز سے پہلے رومی سپہ سالار نے صلح کی بات چیت کے لئے اپنا سفیر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔ وہ نماز مغرب کے وقت پہنچا اور مسلمانوں کے ذوق و شوق عبادت، خضوع و خشوع، نظم و ضبط اور مساوات کے مظاہرے سے بہت متاثر ہوا اور مسلمان ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے رومی سپہ سالار باہان سے گفتگو کے لئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بھیجا مگر گفتگو بے نتیجہ رہی۔ اگلے دن جنگ کی تیاری ہوگئی۔ فوجی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے سالارانِ فوج کے سامنے تجویز پیش کی کہ بہتر یہ ہوگا کہ الگ الگ سالاروں کے زیر کمان لڑنے کی بجائے فوج کی ایک متحدہ کمان ہو اور ہر روز سالاروں میں سے باری باری ایک سپریم کمانڈر یا سپہ سالار اعظم ہو جس کے حکم اور اشارے پر پوری فوج عمل کرے۔ انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر سب متفق ہوں تو پہلے دن کی جنگ کے لئے انہیں سپہ سالار مان لیا جائے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے سالار بھی اس پر رضامند ہو گئے۔ خالد رضی اللہ عنہ نے اپنی جنگی بصیرت اور مہارت سے کام لے کر اپنی قلیل فوج کو بڑی عمدگی سے مرتب اور منظم کیا اور خطیبوں، قاریوں اور مقرروں نے اپنے خطبوں، تقریروں، مناسب آیات قرآنی کی تلاوت اور رزمیہ اشعار سے ہر فوجی میں انتہائی جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت پیدا کر دیا۔ ذرا اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی اس نظم کو پڑھئے اور چشم تصور سے مسلمان مجاہدین کے جوش و خروش اور جذبۂ جہاد و شہادت کا اندازہ کیجئے:

جنگ یرموک کا ایک واقعہ

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند — تھی منتظر حنا کی عروسِ زمینِ شام
اک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب — آ کر ہوا امیر عساکر سے ہم کلام
اے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ رخصت پیکار دے مجھے — لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام

[1] خلافت کا عروج و زوال ص ۲۸-۱۲۷- مطبوعہ ایڈنبرا، ایڈیشن ۱۹۱۵ء

بیتاب ہو رہا ہوں فراقِ رسول ﷺ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہ ﷺ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفت تیغ بے نیام
بولا امیر فوج کہ وہ نوجواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمد ﷺ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہِ رسول امیں ﷺ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غفور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضور ﷺ نے

(بانگ درا)

ضمنی طور پر اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ہی اس موقع پر اصل سپہ سالارِ اعظم تھے۔ اقبال نے انہیں کتنا خوبصورت خراج تحسین پیش کیا ہے　ع

جس کی نگاہ تھی صفت تیغ بے نیام!

اور ''امین امت'' کا ایمان ہے کہ　ع

پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضور ﷺ نے!

قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں اور ان کے خزانے اللہ نے مسلمانوں کو عطا کر دیئے۔

مصالحت کی گفتگو کی ناکامی کے بعد جنگ شروع ہوئی۔ ہولناک، شدید اور خوفناک جنگ۔ مسلمانوں کے خلاف بازنطینیوں کی یہ آخری بھرپور جنگی مزاحمت تھی۔ وہ بڑی بے جگری اور تہور سے لڑے لیکن مسلمانوں کے جوشِ جہاد کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ مسلمانوں کو اپنی جنگی پوزیشن سے بھی فائدہ پہنچا۔ دشمن فوج وادیٔ واقوصہ میں تین طرف سے بند ہو کر رہ گئی تھی۔ دریا اور پہاڑوں سے گھری ہوئی۔ باہر نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا جس کے سامنے مسلمان فوج تھی۔ کئی دفعہ بازنطینیوں نے تابڑتوڑ حملے کر کے مسلمانوں کو پیچھے ہٹایا، کبھی میمنہ کو دبایا، کبھی میسرہ پر دباؤ ڈالا، کبھی قلب پر یلغار کی مگر بے سود۔ آخر مسلمانوں کو عظیم الشان اور فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ تقریباً ایک لاکھ رومی میدان جنگ میں کھیت رہے یا دریا میں ڈوب گئے۔ تین ہزار مسلمان شہید ہوئے جن میں متعدد بزرگ صحابہ بھی تھے۔ اس جنگ میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ عشرۂ مبشرہ کے زبیر رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے بھی شجاعانہ کارنامے سرانجام دیئے۔

شہنشاہ ہرقل انطاکیہ میں جنگ کے نتیجے کا منتظر تھا۔ جب اسے شکست فاش کی خبر پہنچی تو وہ بالکل مایوس ہو گیا اور وہاں سے بسرعت تمام قسطنطنیہ کی طرف کوچ کر گیا۔ جاتے ہوئے لبنان کی پہاڑیوں سے شام کے سرسبز میدانوں پر حسرت کی نگاہ ڈالی اور کہا ''اے شام! تجھ پر آخری سلام۔ اب تو میرا نہیں دشمن کا ہے اور دشمن کے لئے کیسا اچھا ملک ہے!''

یرموک کی فتح کے بعد شام ایک سدھائے ہوئے پالتو اونٹ کی طرح خاموش بیٹھ گیا۔ یہود و انصاریٰ نے اپنے شہروں کے دروازے مسلمانوں کے لئے کھول دیئے اور وہ گانے بجانے والوں کو ساتھ لے کر نکلے جشن منایا اور ٹیکس ادا کیے۔

اس کے بعد ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور خالد رضی اللہ عنہ نے قنسرین، انطاکیہ، حلب وغیرہ مشہور اور اہم شہر بھی فتح کر لئے۔ یہ فتوحات ۱۷ ہجری میں مکمل ہو گئیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ معزولی کے بعد مدینہ روانہ ہو گئے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حمص کی امارت سنبھال لی۔

واقدی، طبری، بلاذری وغیرہ مؤرخوں نے جنگ یرموک کے حالات جنگ قادسیہ کے حالات کی طرح بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہاں ان کا موقع نہیں۔

فتح بیت المقدس کے موقع پر

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اجنادین کی فتح سے فارغ ہو کر نواحی دیار و امصار فتح کئے اور پھر بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے طول کھینچا۔ شہنشاہ ہرقل کی طرف سے کوئی موثر امداد نہ پہنچی۔ اہل شہر محاصرے کی سختیوں سے تنگ آ گئے۔ وہاں کے بطریق اعظم نے شہر مسلمانوں کے حوالے کرنے کی پیشکش اس شرط پر کی کہ خود خلیفۃ المسلمین بہ نفس نفیس آ کر شہر کو امان دیں اور صلح نامہ پر دستخط کریں۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا اور تشریف لانے کی درخواست کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ سے جابیہ پہنچے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے سالاران لشکر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ ثانی کے استقبال کے لئے وہیں پہنچ گئے اور صلح نامہ لکھا گیا۔ اس پر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے بطور گواہ دستخط کئے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سینئر کمانڈر تھے اور موقع پر موجود بھی تھے بلکہ ساری کارروائی میں پیش پیش رہے تھے۔ معاہدہ پر ان کے دستخط نہ ہونے پر تعجب ہوتا ہے۔ کسی مؤرخ نے اس کی توجیہہ نہیں کی۔ حالانکہ جابیہ پہنچنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے میرا بھائی، میرا بھائی کہہ کر بڑے تپاک سے بغل گیر ہوئے تھے اور بہت خوش تھے کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ خود خلیفہ کی طرح بالکل سادہ لباس میں تھے جبکہ دوسرے سالاران لشکر نے قیمتی ریشمی کپڑے زیب تن کر رکھے تھے اگرچہ زیر لباس اسلحہ بند تھے۔ معاہدۂ بیت المقدس کی تفصیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں دی جا چکی ہے۔

فتح دمشق کے معاہدہ پر بھی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے دستخط نہیں کئے حالانکہ سالار لشکر تھے۔

رومیوں کی آخری کوشش

۱۷ ہجری میں بازنطینیوں نے ایک آخری حرکت مذبوحی کی۔ شمالی شام، شمالی عراق الجزیرہ اور آرمینیا کے کردوں، عرب بدوؤں، عیسائیوں اور ایرانیوں نے ہرقل سے اپیل کی کہ مسلمانوں کے خلاف ان کی مدد کرے۔ انہوں نے اپنی طرف سے تیس ہزار فوج کی پیشکش بھی کی۔ اگرچہ الجزیرہ کے مضبوط قلعے حضرت سعد بن ابی وقاص

فتح کر چکے تھے اور وہاں اپنے فوجی دستے بھی تعینات کر دیئے تھے تاہم خانہ بدوش بدوی قبائل پر مکمل کنٹرول نہ ہو سکا تھا اور وہ اپنی مدد اور حفاظت کے لئے قیصر یا کسریٰ کی طرف نگاہیں لگائے رکھتے تھے۔ قیصر ہرقل کی بحری طاقت برقرار تھی۔ اس نے موقع کو غنیمت جانا اور اسکندریہ سے ایک بڑی بحری فوج کے ساتھ انطاکیہ پر حملہ کر دیا جبکہ بدوی قبائل کے ایک عظیم لشکر نے حمص کا محاصرہ کر لیا۔ قنسرین، حلب اور شمالی شام کے بعض دوسرے شہروں نے بغاوت کر دی۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کمک کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا۔ انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو فوراً کوفہ سے امدادی فوج بھیجنے کا حکم دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی زیر سرکردگی کوفہ سے فوج روانہ کی۔ پھر بھی رومی اور اسلامی فوج کا تناسب انیس اور ایک کا تھا، ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ دشمن کے ٹڈی دل کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ ایک جوشیلی اور موثر تقریر سے مجاہدین کے دلوں کو گرما دیا۔ پھر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ کشتوں کے پشتے چھوڑ کر مرج الدیباج تک بھاگتا چلا گیا۔ اس شکست فاش نے دشمن کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ تمام شہر اور علاقے پھر سے مسلمانوں کے زیر اطاعت آ گئے۔ ایک ساحلی شہر قیساریہ (قیصریہ) رہ گیا تھا۔ ایک طویل محاصرے کے بعد ۱۹ ہجری میں وہ بھی فتح ہو گیا۔

شام، آرمینیا، الجزیرہ میں بازنطینی حکومت کا خاتمہ

آئندہ کے لئے اہل جزیرہ اور اہل آرمینیا کی طرف سے خطرے کا انسداد کرنے کے لئے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ علاقے بھی کامل طور پر فتح کر کے اسلامی ممالک محروسہ میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے فوجی دستے چاروں طرف روانہ کئے جنہوں نے بڑے اور اہم شہر رقہ، حران نصیبین، میافارقین، سمساط، قرقیسیا، عین الوردہ، سروج وغیرہ فتح کر لئے۔ اس طرح جزیرہ، آرمینیا اور شام سے سات سو سالہ بازنطینی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ الجزیرہ کے اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا۔

گورنری

فتوحات کے بعد ملکی نظم و نسق کو مستحکم اور استوار کرنے کی نوبت آئی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو سارے شام کا گورنر مقرر کر دیا۔ شمال میں ان کی فتوحات کی حدود انطاکیہ سے جانب مشرق جاتے ہوئے دریائے فرات تک اور جنوب میں عرب اور مصر سے سرحدیں ملتی تھیں۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے انتظام حکومت کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام پر بھی توجہ کی۔ بہت سے عرب قبائل جو مذہباً عیسائی تھے اور مدت ہائے دراز سے شام میں آباد تھے۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی تبلیغ، حسن اخلاق اور حسن سلوک سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ تلواروں سے وہ کام نہ ہوا جو تبلیغ نے کر دکھایا۔ بہت سے رومیوں اور شامیوں نے بھی بلا جبر و اکراہ اسلام قبول کر لیا۔ انہوں نے ایسے اقدامات کئے جن سے رعایا کو فائدہ پہنچا اور وہ مطمئن ہو گئی اور اسلام کے کاز کو تقویت ملی۔

۱۸ ہجری میں جب عرب میں شدید قحط پڑا تو ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے چار ہزار اونٹ غلے سے لدے ہوئے مدینہ روانہ کئے۔ اس سے قحط زدہ آبادی کو کافی سہارا ملا۔

طاعون عمواس اور وفات

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو شام کی امارت سنبھالے اور قحط کے سلسلے میں امدادی انتظامات کرتے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ ۱۸ ہجری (۶۳۹ء) میں شام اور عراق میں طاعون کی شدید وبا پھیل گئی۔ ابتدا فلسطین کے شہر عمواس سے ہوئی جہاں اسلامی افواج جمع تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً پچیس ہزار مجاہدین اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جن میں بہت سے بزرگ صحابہ بھی تھے۔ شام و فلسطین میں وبا کا بہت زور تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو وہ بسرعت تمام مدینہ سے روانہ ہوئے۔ سرغ کے مقام پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے ان کا استقبال کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صورت حال کا جائزہ لیا اور سرکردہ صحابہ اور جہاندیدہ بزرگوں سے مشورہ کیا۔ سب نے یہی کہا کہ فی الحال وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہوجانا چاہئے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان کرادیا کہ میں کل صبح روانہ ہوں گا۔ سب لوگ میرے ہمراہ چلیں۔ لیکن تقدیر الٰہی پر صابر و شاکر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نہ مانے اور جرأت اظہار سے کام لیتے ہوئے بیباکانہ کہا کہ "اے عمر رضی اللہ عنہ! تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو؟" انہوں نے برا مانے بغیر جواب دیا کہ "ہاں! تقدیر الٰہی سے تقدیر الٰہی ہی کی طرف بھاگتا ہوں۔" مگر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ وہیں ٹھہرے رہے۔ خلیفہ انہیں بڑا عزیز اور محترم جانتے تھے اور انہیں طاعون سے بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مدینہ واپس پہنچ کر لکھ بھیجا کہ ضروری صلاح مشورے کے لئے فوراً مدینہ چلے آؤ۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ طلبی کا اصل مطلب سمجھ گئے اور جواب دیا کہ قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہے گا۔ میں مسلمانوں کو چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ اپنی ماتحت فوج کے ساتھ وابستگی نے انہیں خلیفہ کا حکم ماننے سے بھی باز رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کا جواب پڑھ کر رو دیئے۔ پھر لکھا کہ اگر تم نہیں آتے تو کم سے کم اتنا تو کرو کہ افواج کو مرطوب نشیبی مقامات سے دوسرے بہتر مقامات پر منتقل کردو جہاں وبا کا اثر نہ ہو یا کم ہو۔ چنانچہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ فوج لے کر جابیہ چلے گئے جو آب و ہوا کے لحاظ سے ایک پر فضا اور صحت افزا مقام تھا لیکن وبا سے ان کی صحت متاثر ہو چکی تھی، جابیہ پہنچنے کے بعد ان پر طاعون کا حملہ ہوا اور وہ پیک اجل کو لبیک کہتے ہوئے اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ وفات کے وقت سن شریف اٹھاون سال تھا۔ وفات سے پہلے حضرت معاذ بن جبل انصاری رضی اللہ عنہ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی اور تجہیز و تکفین کی اور ایک خوبصورت اور دلدوز تقریر کی۔

مدفن

اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ دمشق میں دفن کئے گئے۔ مزار سے ملحق ایک مسجد ہے جو ان کے نام سے موسوم ہے۔ قاضی حبیب الرحمٰن نے "عشرۂ مبشرہ" میں "اسد الغابہ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا مدفن عمواس یا رملہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق دمشق اور بیت المقدس کے درمیان بیسان کے مقام پر دفن کئے گئے۔ ایسی مشہور اور اہم شخصیت کے مقام دفن کے بارے میں روایات کا یہ اختلاف تعجب خیز ہے جب یہ بات مسلم ہے کہ انہوں نے جابیہ میں انتقال فرمایا تو قرین قیاس یہی لگتا ہے کہ انہیں

جابیہ میں دفن کیا گیا ہوگا۔ وہاں سے ان کی میت کو طاعون کے گڑھ عمواس میں واپس لے جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ نہ یہ کہ اہل لشکر کسی اپنی صوابدید کی بنا پر جابیہ سے دوسری جگہ لے گئے ہوں۔ اگر جابیہ میں دفن نہیں کیا تو بیسان یا فخل میں سے جو نزدیک تریں مقام ہوگا، وہاں دفن کیا گیا ہوگا۔ بہر حال انسائیکلوپیڈیا کی روایت کہ ان کا مدفن دمشق میں ہے اور مزار سے ملحق ایک مسجد بھی ہے، درست ہو سکتی ہے۔

اولاد و ازواج

ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے یزید اور عمیر تھے۔ ان کی والدہ ہند بنت جابر بن وہب تھیں جبکہ "سیر الصحابہ" کے مصنف کے مطابق یزید کی والدہ ہند بنت جابر تھیں اور عمیر کی والدہ ورجا۔ یہ دونوں بیٹے لاولد فوت ہوئے اور ان کا سلسلہ نسل نہیں چلا۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ پر انقطاع الی اللہ کا غلبہ تھا اور دنیا داری اور تاہل سے زیادہ رغبت نہ تھی۔ دوسرے بزرگ صحابہ کے برعکس انہوں نے زیادہ شادیاں نہ کیں۔

ذریعۂ معاش

تاریخ وسیر کی کتابیں اس بارے میں خاموش ہیں کہ مکی زندگی کے دوران میں اور پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد عہد نبوی میں آپ کا ذریعہ معاش کیا تھا۔ شیخین رضی اللہ عنہما کے عہد میں تو خیر سپہ سالار کی حیثیت سے رومیوں کے خلاف شام میں جہاد کرتے رہے اور اموالِ غنیمت سے حصہ پاتے رہے وہ درویش خدامست تھے۔ دنیا کا زیادہ جنجال نہیں پالا۔ کنبہ بھی مختصر تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ جہاد شام سے پہلے تھوڑی بہت تجارت گزراوقات کے لئے کرتے ہوں گے۔ مدینہ اور خیبر میں یہودیوں کی متروکہ اراضی اور باغات وغیرہ میں سے بھی کچھ حصہ ملا ہوگا۔ بہر حال وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرح مالدار نہ ہوئے۔ اور ترکہ میں غالباً اپنی وہی تلوار، نیزہ اور زرہ چھوڑی ہوگی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے سفر شام کے دوران میں ان کے ہاں دیکھی تھی۔

حلیہ

محمد ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ دراز قامت، دبلے پتلے، لمبوترے چہرے، ابھرے سینے اور چھدری داڑھی والے تھے۔ رخسار پچکے ہوئے گوشت سے خالی۔ سامنے کے دو دانت غزوۂ احد میں ٹوٹ گئے تھے۔ داڑھی کو مہندی اور نیل کا خضاب لگاتے تھے۔

سیرت و اخلاق

شام کے فاتح اور بازنطینیوں کی قوت پر ضرب کاری لگانے والے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی شخصیت تاریخ اسلام کے علاوہ تاریخ عالم میں بھی نمایاں نظر آتی ہے اس میں ایک عجیب شان دلربائی ہے۔ غیروں نے اور اپنوں نے بھی کہیں کہیں اسلام کی ابتدائی تاریخ کے بعض دوسرے بڑے جرنیلوں، فاتحوں اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ

کے ہم عصروں پر نکتہ چینی کی ہے لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور کردار پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکا۔ ان کا کردار ہر لحاظ سے ایک مثالی مومن کا قابل تعریف کردار ہے۔ محاسن اخلاق کے لحاظ سے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صفوں میں ان کا مرتبہ بہت بلند اور بہت آگے ہے۔ جسے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ''امین الامت'' کہیں ان کا مقام ایسا ہونا ہی چاہئے۔ دوسری قوموں نے بھی بڑے بڑے جرنیل اور فاتح پیدا کئے۔ ہنی بال، اسکندر یونانی، اٹیلا، چنگیز خان، نپولین وغیرہ کے ناموں اور خونی کارناموں سے دنیا واقف ہے لیکن ان میں اخلاقی بلندی و دلکشی، عظمت کردار تقویٰ، پاکبازی، سادگی، حق پرستی، انصاف پروری، رحم دلی، مساوات اور انکساری کا نام ونشاں نہیں ملتا۔ ان کے صحیفۂ حیات میں بے مقصد خونریزی سے پرہیز، مفتوحین سے حسن سلوک، ان کے جان و مال کی عزت و آبرو کی حفاظت اور خدا خوفی کا کوئی باب نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بلند کرداری کا لوہا دشمنوں سے بھی منوا لیا اور ان کے دل موہ لئے۔ جب جنگی مصلحت کے تحت انہیں حمص اور بعض دوسرے شہر اور علاقے خالی کرنے پڑے تو انہوں نے جو ٹیکس وصول کئے تھے وہاں کے باشندوں کو جوں کے توں واپس کر دیئے، اس پر وہ لوگ رو رو کر ان کی فتح مندانہ واپسی کی دعائیں مانگتے تھے۔ دنیا میں کسی غیر مسلم جرنیل نے ایسا کردار پیش نہیں کیا بلکہ ایسے نازک مواقع پر مزید لوٹ کھسوٹ ہی کی اور مفتوحین کی عزت و آبرو بھی ان سے محفوظ نہ رہی۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں سے سلوک مساویانہ اور برادرانہ تھا۔ محبت اور خلوص ان کا شعار تھا ان کے زیر کمان مجاہدین ان سے آزادی سے بات کرتے تھے اور کبھی کسی نے حکم عدولی نہ کی۔ بازنطینی سفیروں نے انہیں معمولی لباس میں عام مجاہدین کے ساتھ اس طرح فرش خاک پر بیٹھا دیکھا کہ انہیں پوچھنا پڑا کہ تمہارا سردار کون ہے؟

ولیم میوؔر لکھتا ہے کہ ایک دفعہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ موٹے جھوٹے کھردرے اونی لباس میں مفتوحہ عوام کے سامنے آئے تو ان کے رفقا اور ماتحتوں نے شرم محسوس کی اور ملامت کے انداز میں کہا کہ آپ شام میں اسلامی فوج کے سپہ سالار اعظم ہیں اور ہم یہاں دشمنوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ دشمنوں کو مرعوب اور متاثر کرنے کے لئے آپ یہ لباس بدل کر بہتر اور نفیس لباس زیب تن کیجئے۔ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ میں اپنی وہ حالت تبدیل نہ کروں گا جس میں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا۔ انہوں نے سپہ سالاری کے منصب کو ایک فرض سمجھ کر قبول کیا تھا اور اپنے اندر کسی قسم کی مفتخرانہ تبدیلی نہیں آنے دی۔ نہ اس منصب سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا۔ جیسے شروع میں تھے ویسے ہی آخر تک رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض جرنیلوں کے اندوختوں کی حساب طلبی کی اور بظاہر جواز سے فالتو رقمیں ان سے واپس لے کر بیت المال میں داخل کر دیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ محاسبہ کی زد میں نہیں آئے۔ بلکہ ان کی سادگی، اخلاص اور دیانت وامانت کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ اگر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو میں اپنی جگہ انہیں خلیفہ نامزد کر دیتا۔

وہ بڑے رحم دل اور نرم مزاج تھے۔ اور کسی کا دل نہ دکھاتے تھے۔ جب خلیفہ کی طرف سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا حکم آیا تو انہیں افسوس ہوا اور کچھ عرصہ تک اس حکم کو چھپائے رکھا پھر اس کی بادل ناخواستہ تعمیل کرائی اور کوشش کی کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو کم سے کم صدمہ اور پریشانی (Embarrasment) ہو، ان کی دلجوئی کے لئے

فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں۔ کمان سے ان کی معزولی کے بعد بھی انہیں فوجی دستوں کی سرداری پر مامور کرتے رہے۔ ذرا بھی حریفانہ چشمک یا برتری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے بچتے تھے۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ زہد و تقویٰ کے درجۂ کمال پر تھے۔ وہ سابقون الاولون میں سے تھے۔ وہ ان بلاکشانِ محبت میں سے تھے جنہوں نے راہ حق میں ہر قسم کے مصائب و شدائد برداشت کیے۔ پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور آخر میں مدینہ کی طرف۔ وہ ان مہاجرین اولین میں سے تھے جنہوں نے اسلام کی خاطر گھر بار چھوڑا اور راہ حق میں اپنا سب کچھ لٹا دیا اور کوئی بھی قربانی دینے سے دریغ نہ کیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اطاعت ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ جذبۂ جہاد، شجاعت، ایثار، استغنا، نرمی اور شفقت، زُہد و عبادت خشیت الٰہی، سادہ مزاجی، سادگی، تواضع اور انکساری ان کی شخصیت کا کارنر سٹون (Corner Stone) تھے۔ جسٹس سید امیر علی ''تاریخ صحرا نشیناں'' میں لکھتے ہیں کہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نرم مزاج، حلیم الطبع، رحم دل، عقلمند اور دور اندیش واقع ہوئے تھے۔ دنیا اور اس کی نعمتوں اور سامانِ عیش و عشرت سے انہیں بالکل رغبت نہ تھی۔

مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبل انصاری رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر اہل لشکر کے سامنے ایک بڑی مؤثر اور درد انگیز تقریر کی:

''ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ آپ پر خدا کی رحمت ہو۔ آپ بلاشبہ ان لوگوں میں سے تھے جو زمین پر نہایت فروتنی اور انکسار سے چلتے ہیں، خدا کو بکثرت یاد کرتے ہیں اور اس کے لئے راتوں کو نمازوں میں کھڑے رہتے ہیں۔ آپ نے اپنی ساری عمر نہایت اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ گزاری۔ آپ یتیموں کے نگران اور مسکینوں پر رحیم تھے۔ متکبر اور مغرور لوگوں سے علیحدہ رہتے تھے اور عوام سے محبت اور نرمی سے پیش آتے تھے۔''[1]

پھر جب نماز جنازہ پڑھانے لگے تو مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''مسلمانو! آج تم سے ایسا شخص جدا ہو گیا جس کی مانند میں نے کوئی اور شخص نہیں دیکھا۔ وہ تم سب سے زیادہ نمود و نمائش سے بری تھے۔ سادگی اور قناعت ان کا زیور تھا۔ وہ مسلمانوں کے انتہائی خیر خواہ تھے۔ وہ خلق اللہ سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ پس تم ان کے لئے زیادہ سے زیادہ رحمت کی دعا مانگو۔ آئندہ کوئی شخص ان کی مانند تمہارا امیر اور سپہ سالار نہیں ہوگا۔''[2]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے محاسن اخلاق کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ یہ تھیں وہ خوبیاں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دل و جان سے پسند تھیں اور اس لئے وہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی کہتے تھے اور ان کی وفات پر روئے اور اپنی وفات کے وقت حسرت سے کہا کہ اگر آج ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو میں انہیں بے فکر

1. دس بڑے مسلمان مصنفہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (حالات ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ)

2. دس بڑے مسلمان

ہو کر خلیفہ نامزد کر دیتا'' سیر الصحابہ'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ'' حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے صحیفہ اخلاق میں خدا ترسی، اتباعِ سنت، تقویٰ، زہد، تواضع، مساوات اور ترحم کے ابواب نہایت روشن ہیں۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب ایک بہادر شخص قیس بن مکشوح کو کچھ فوج دے کر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تو نصیحت کی کہ'' میں تم کو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں بھیج رہا ہوں۔ وہ اس خوبی کے انسان ہیں کہ جب ان کے ساتھ کوئی زیادتی کرتا ہے تو وہ اس سے نرمی اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ جو ان سے بدسلوکی کرتا ہے وہ اس سے نیک برتاؤ کرتے ہیں۔ جو ان کے ساتھ دشمنی کرتا ہے وہ اس کے ساتھ دوستی کرتے ہیں۔ پس تم کسی صورت میں بھی ان کی نافرمانی نہ کرنا...... وہ اپنے ماتحتوں پر نہایت مہربان ہیں اور ان کے ساتھ رفق و مدارات سے پیش آتے ہیں اور انہیں کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس میں ان کا فائدہ نہ ہو۔''[1]

یہ تھی رائے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے متعلق۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہ'' امین الامت'' تھے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کیسے اچھے آدمی ہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں زہد، اخلاص، سادگی اور دیانت وغیرہ محاسن کی بنا پر اپنا بھائی کہتے تھے اور ان کی مخالفت کو مکروہ سمجھتے تھے۔
شیخین رضی اللہ عنہما کے نزدیک ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

غزوۂ بدر میں انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مشرک باپ کو قتل کیا غزوۂ احد میں ثابت قدم رہے اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسارِ مبارک سے زرہ کی کڑیاں اپنے دانتوں سے کھینچ کر نکالیں اور اس کوشش میں ان کے دو دانت جاتے رہے۔ طاعونِ عمواس میں جان اس لئے دے دی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وبازدہ مقام سے بھاگنے سے منع فرمایا ہے نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ'' طاعون میں مرنے والا شہید ہے، پیٹ کی بیماری میں مرنے والا شہید ہے۔ جو عورت حاملہ مر جائے وہ شہید ہے اور پسلی کی بیماری والی (نمونیہ کی مریضہ) بھی شہید ہے۔''[2]

اس حدیث نبوی کے مطابق حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شہادت کے ایک مرتبہ پر فائز ہوئے ایک دوسری روایت کے مطابق حادثے میں مرنے والا، چوروں، ڈاکوؤں سے اپنے جان و مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جانے والا بھی شہید ہے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا لباس اور غذا دونوں انتہائی سادہ تھے، سفر شام کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوسرے سالارانِ لشکر کی رومی فیشن کی پر تکلف پوشاکوں کے مقابلے میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا سادہ عربی لباس دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے اور میرا بھائی، میرا بھائی کہہ کر بغل گیر ہوئے ان کی رہائش گاہ پر پہنچ کر جب وہاں بھی ڈھال، تلوار، زرہ اور اونٹ کے پالان کے سوا کچھ نہ پایا تو فرمایا'' ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ! تم کچھ ضروری سامان رکھ لیتے تو اچھا ہوتا۔'' انہوں نے جواب دیا کہ'' ہمارے لئے یہی کافی ہے اور یہی ہمیں بہت جلد ہماری آسائش گاہ تک پہنچا دے

1۔ دس بڑے مسلمان

2۔ طبقات ابن سعد جلد سوم (حالات ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ)

گا۔'' اسی موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ! کیا ہماری دعوت نہ کرو گے؟ انہوں نے روٹی کے سوکھے ٹکڑے لاکر آگے رکھ دیئے اور کہا کہ ''میری تو یہی غذا ہے۔ پانی میں بھگو کر کھا لیتا ہوں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر رقت طاری ہو گئی۔ ایک دفعہ از راہِ آزمائش حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چار سو طلائی دینار اور چار ہزار نقرئی درہم حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو بھیجے اور قاصد سے کہا کہ دیکھنا وہ انہیں کیا کرتے ہیں۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے وہ ساری رقم قاصد کے دیکھتے دیکھتے حاجت مندوں میں تقسیم کر دی۔ قاصد نے جا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا تو انہوں نے فرمایا کہ ''سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جس نے اسلام میں ایسے آدمی شامل کئے جو یہ کرتے ہیں۔''

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے وظائف مقرر کئے تو ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے ابتدا میں لینے سے انکار کیا بلکہ سرے سے کوئی حق الخدمت لینے پر تیار نہ ہوئے اور کہا ''عمر رضی اللہ عنہ! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو دنیا کی آلائشوں میں آلودہ کرتے ہو۔'' آخر بڑی مشکل سے راضی ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی کے مشورہ سے عمالِ حکومت کی بڑی تنخواہیں مقرر کیں تاکہ رشوت و خیانت کی طرف میلان پیدا نہ ہو۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا وظیفہ بطور خلیفہ بھی ان کے مشورہ سے مقرر کیا گیا تھا۔ ان میں جھگڑوں، تنازعوں کا تصفیہ کرنے کی عمدہ صلاحیت تھی۔ خلافت کے متعلق انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جو قضیہ کھڑا کر دیا تھا، اسے خیر و خوبی سے سلجھانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا بلکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تو خود ان کا نام تجویز کر دیا تھا۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو تبلیغ اسلام سے بہت شغف تھا۔ شام کے عرب قبائل تنوخ، بنو سلیح، بنی طے وغیرہ جو کئی نسل پہلے عیسائیت اختیار کر چکے تھے، ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی تبلیغی مساعی سے مسلمان ہو گئے اور اسلام کے لئے تقویت و استحکام کا باعث بنے۔

کبھی کبھی وعظ و نصیحت بھی کیا کرتے تھے۔ شام کی امارت کے زمانے میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''خبردار! بہت لوگ اپنے نفس کو عزیز رکھتے ہیں مگر وہی ذلیل دشمن ہے۔ لوگو! اپنی پرانی برائیوں کو نئی نیکیوں سے دور کرو۔'' انہوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کی:

> عامر! میری کامیابی کا راز صرف یہ تھا کہ میں نے کبھی اپنی ہستی کو مرتبۂ انسانیت سے بالاتر نہیں سمجھا اور میں ایسا کیوں سمجھتا جبکہ میں اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھا کہ ایک قوت بھی فنا سے محفوظ نہیں۔ اگر میں اس قابلیت اور اعلیٰ دماغی پر ناز کرتا تو اس سے بڑھ کر کون سا جرم ہو سکتا تھا؟ کیونکہ میں اس سے ناواقف نہ تھا کہ ایک معمولی مرض میرے تدبر و تفکر کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ میری قوت گویائی اور میرا عزم و استقلال ایک ایسی نعمت تھی جو چند لمحوں میں مجھ سے واپس لی جا سکتی تھی۔ سب سے بڑھ کر خود میری زندگی فانی ہے جس کی ہنگامہ آفریں مصروفیت نے مجھے شہرۂ آفاق بنا دیا۔ وہ بھی زوال اور فنا سے محفوظ نہ تھی۔ میں ہمیشہ عالم بیداری میں موت کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا تھا اور سوتے وقت اپنے سرہانے رکھ کر سویا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے گھمنڈ، تکبر، تصنع اور انانیت نے

میرے محسوسات پر اقتدار حاصل نہیں کیا۔

بیٹا! یہ سچ ہے کہ میں اپنی اصلاح میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا، اگر تم میری اس آخری وصیت پر عمل کرو گے تو میں یقین کرتا ہوں کہ تم اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرو گے۔ خدا تم کو نیک عمل کی توفیق دے۔ آمین۔"[1]

مجاہدانہ مصروفیات کی وجہ سے ان سے صرف چودہ احادیث مروی ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما، حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ، حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ وغیرہ بزرگ صحابہ نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔

---

[1] "دس بڑے مسلمان" نیز محمد احمد انصاری کا مضمون "ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی وصیت ان کے بیٹے کے نام" مطبوعہ، سیارہ ڈائجسٹ، جولائی ۱۹۲۷ء، مضمون نگار نے بیٹے کا نام عامر لکھا ہے جبکہ خود ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا اپنا اصل نام عامر تھا اور بیٹے کا عمیر۔ مؤلف

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

شاہ سوارِ اسلام (رجل صالح)

۱- ارم فداك ابی و اُمی

(تیر چلا، میرے ماں باپ تجھ پر قربان)

۲- ارم ایها ایضًا الحرور

(اے زور آور نو جوان تیر چلا)

(رسول اکرم ﷺ)

شوال ۳ ہجری

غزوۂ احد کا صعب وسخت دن ہے۔ کفر واسلام کا دوسرا معرکہ شدید گرم ہے۔ اللہ کے سات سو صاحب عزم و ایمان بندے اولیں ہلے میں اپنے سے چار گنا سے بھی زیادہ تین ہزار مشرکین مکہ کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں لیکن دشمنوں میں بھگدڑ مچتے دیکھ کر عقبی درے پر تعینات تیر اندازوں کی اکثریت رسول اللہ ﷺ کے تاکیدی فرمان کو فراموش کر کے اپنی ڈیوٹی کے مقام کو چھوڑ کر مالِ غنیمت لوٹنے کے لئے دوڑ پڑتی ہے۔ درہ کو خالی پا کر شکست خوردہ دشمن کا گھوڑ سوار دستہ یک لخت پلٹ کر ادھر سے مسلمانوں کے عقب پر حملہ کر دیتا ہے۔ مسلمانوں پر سراسیمگی اور افراتفری کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اس ناگہانی حملے سے ان کی قوت و جمعیت پراگندہ ہو جاتی ہے اور متعدد شہید اور زخمی ہو جاتے ہیں۔ پھر دشمنوں کی طرف سے جھوٹا نعرہ بلند ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ شہید ہو گئے۔ اس سے مسلمانوں کی رہی سہی ہمتیں بھی ٹوٹ جاتی ہیں اور ان کی اکثریت مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر منتشر ہو جاتی ہے۔ بہت سے جری اور قوی صحابی ہتھیار پھینک کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اب لڑنے کا کیا فائدہ جب رسول ﷺ خدا ہی نہ رہے؟ تاہم اس تاریک صورت حال میں بھی کوئی درجن بھر نفوس قدسیہ نے اپنے لہو کے چراغوں سے روشنی کر رکھی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ اور آٹھ دس دوسرے صحابہ، جن میں ایک جانباز صحابیہ ام عمارہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں، شمع رسالت ﷺ کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہیں اور کفار کے بے پناہ ہجوم کے مقابلے میں انتہائی بے جگری، سرفروشی اور صبر واستقامت سے لڑ رہے ہیں۔ حضرت زید بن سکن رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمراہی انصاری نوجوان جناب رسالت مآب ﷺ کے دست مبارک پر قربانی، جاں کی بیعت کر کے آپ ﷺ کی حفاظت میں لڑ کر حق بیعت ادا کر چکے ہیں۔

ترے آستاں پہ جینا ترے آستاں پہ مرنا
یہی غائت تمنا یہی اوج سرفرازی

پروانوں کے اس مختصر ہجوم میں ایک گٹھے ہوئے جسم اور قوی پنجہ والا قدرے چھوٹے قد کا اکتیس بتیس سال کا شعلہ جوالہ قسم کا جوان بھی ہے جو لگاتار انتھک انداز سے دشمنوں پر تیر پر تیر چلائے جا رہا ہے۔ وہ اپنی ذاتی حفاظت سے قطعاً بے نیاز معلوم ہوتا ہے۔ اسے خیال ہے تو اپنے ہادی، اپنے آقا محمد مصطفیٰ ﷺ کی حفاظت کا ہے۔ اس کا ہر تیر اپنے نشانے پر بیٹھتا ہے۔ کسی دشمن کو زخمی اور لہولہان اور کسی کو جہنم رسید کرتا ہے۔ اس کی تیر اندازی اور جذبۂ جاں نثاری نقطۂ عروج پر ہیں۔ جناب رسالت مآب ﷺ فرماتے جاتے ہیں ارم فداک ابی وامی (تیر چلائے جا میرے ماں باپ تجھ پر قربان!) اور کبھی فرماتے ہیں ارم ایھا الغلام الحزور (اے زور آور نوجوان تیر چلا)

جناب سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جملے اس نوجوان کے لئے زندگی کا سب سے بڑا شرف اور اعزاز ہیں بلکہ اس کی آئندہ نسلوں کے لئے بھی۔ طلحہ بن طلحہ ایک دیو قامت کافر حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کی نیت سے آگے بڑھتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فدا کار تیرانداز تاک کر ایک تیر چلاتا ہے جو اس دشمن خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حلق میں جا کر ترازو ہو جاتا ہے، زبان کتے کی طرح باہر نکل آتی ہے اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اس طرح اللہ کے اس جانباز غازی کی وہ دعا پوری ہو جاتی ہے جو اس نے آغازِ جنگ سے پہلے مانگی تھی کہ ''بارالہا! میرا مقابلہ بڑے بہادر اور تیز و تند دشمن سے ہو۔ تو مجھے اتنی طاقت عطا فرما کہ میں اسے تیرے دین کی خاطر قتل کر دوں۔'' جب تیرانداز کا اپنا ترکش خالی ہو جاتا ہے تو جناب رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ترکش کے تیر اپنے ہاتھوں سے نکال نکال کر اسے دیتے جاتے ہیں اور وہ چلاتا جاتا ہے۔ اکثر تیر نشانے پر بیٹھتے ہیں۔ اس طرح اس انتھک نوجوان نے کوئی ایک ہزار تیر چلائے اور دشمنوں کو آگے بڑھنے سے روک رکھا۔ بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکش بھی خالی ہو جاتا ہے اور ایک دشمن آگے بڑھ کر بڑی شدت سے حملہ آور ہوتا ہے۔ صرف بغیر پھل کا ایک تکا باقی ہے وہ جوانمرد اسی کو چلّے پر چڑھا کر تاک کر دشمن کی پیشانی پر مارتا ہے۔ دشمن گر کر برہنہ ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فدائی کی قدراندازی اور دشمن کی بدحواسی پر مسکرانے لگتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ فدا کار نوجوان دشمنوں کے ہاتھوں زخم بھی کھاتا ہے لیکن ترکش خالی ہو جانے کے بعد بھی اپنے ہادی و آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے سینہ سپر رہتا ہے۔ رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حق میں دعا فرماتے ہیں ''الٰہی! اس کے تیر کو نشانہ پر بٹھا اور اس کی دعا کو قبول فرما۔'' آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کے نرغے سے نکل کر احد کی چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں اور دشمن مکہ کو لوٹ جاتے ہیں۔

ایک دوسرا موقع ''رجل صالح''

مدینہ میں دن رات افواہیں اڑتی ہیں کہ رومی مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حملہ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ تمام صحابہ دن رات چاق و چوبند اور ہتھیار بند رہتے ہیں۔ سخت خطرہ ہے کہ کہیں بے خبری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر رات کو حملہ نہ کر دیا جائے۔ یہودی بھی رومیوں کی سازش میں شامل ہیں۔ ایک ایسی ہی تاریک اور بھیانک رات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر استراحت کے لئے لیٹتے ہیں تو فرماتے ہیں ''کاش آج کوئی رجل صالح اور جری بندہ حفاظتی پہرے کے لئے ہوتا۔'' اتنے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ اور اسلحہ کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ حضور رسالت مآب پوچھتے ہیں کون ہے؟ جواب آتا ہے ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم سعد بن مالک۔ میں نے سوچا اندھیری رات ہے مبادا کوئی خطرہ پیش آئے اس لئے پہرہ دینے کو حاضر ہوا ہوں۔'' سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خوش ہوتے ہیں اور دعا دیتے ہیں[1]

یہ پیکر فدائیت، یہ صاحب عزم و استقامت یہ قدرانداز جس نے احد کے ہنگامہ رستاخیز میں سرفروشی اور جانبازی کا حق ادا کر دیا اور جس رجل صالح نے راتوں کو بھی اسلحہ بند ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجہاد نیز اسد الغابہ

رضا کارانہ پہرہ دیا، آخر کون تھا؟

یہ رجل صالح وہ بزرگ ہیں جنہیں تاریخ ان کے باپ ابووقاص مالک کی کنیت کی نسبت سے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ یا سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کے نام سے یاد کرتی ہے اور جنہیں ان کے رفقا کے مقابلے میں کئی کئی شرف اور امتیاز حاصل ہیں۔ انہوں نے اسلام کی خاطر پہلی خونریزی کی۔ راہ خدا میں پہلا تیر چلایا، راتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے ہتھیار بند ہو کر پہرہ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں "رجل صالح" (نیک مرد) کہا۔ یہی وہ واحد صحابی ہیں جن کی نماز جنازہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے بھی شرکت کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں ان سے خوش رہے اور جنت کی بشارت دی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد بھی اسلام کے لئے ان کی جان نثارانہ خدمات کا سلسلہ جاری رہا۔ انہوں نے عہد فاروقی میں دنیا کی قدیم ترین اور عظیم ترین سلطنت ایران کو ختم کر کے وہاں اسلام کا بول بالا کیا۔ تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے "فداک ابی وامی" کے الفاظ نہیں سنے۔ احد کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے فدا کرنے میں اپنے والدین جمع کر دیئے۔ یہ درست ہے کہ احد کے دن یہ خصوصی شرف صرف حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہی کو حاصل ہوا اگرچہ دوسری روایات میں ہے کہ ایک ایسے ہی نازک موقع پر یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے لئے بھی استعمال کئے لیکن اس میں اولیت حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہی کو حاصل ہے، بہرحال یہ دونوں بزرگ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور ناموران اسلام میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی عتبہ ابھی کافر تھے اور مدینہ میں بہت پہلے سے رہائش پذیر تھے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور ان کے چھوٹے بھائی عمیر رضی اللہ عنہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے پر انہی کے پاس ٹھہرے تھے، وہ جنگ احد میں مکہ کے کافروں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑے اور ان کے ایک پتھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اس سے بہت دکھ ہوا۔ بعد میں آپ نے مختلف مواقع پر بار بار فرمایا کہ "خدا کی قسم میں عتبہ[1] سے زیادہ کسی شخص کے خون کا پیاسا نہیں ہوا۔"

نام ونسب

اسلام کے اس پہلے تیر انداز کا نام سعد رضی اللہ عنہ اور کنیت ابواسحاق تھی۔ باپ کا اصل نام مالک تھا اور کنیت ابووقاص۔ وہ ظہورِ اسلام سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ تاریخ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو کبھی سعد بن مالک رضی اللہ عنہ اور کبھی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کے قبیلہ بنوزہرہ سے تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ بھی اسی قبیلہ سے تھیں اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے والد کی چچازاد بہن تھیں۔ اس رشتے

---

[1] یہی وہ عتبہ ہیں جن کے بیٹے حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ جنگ قادسیہ کے ہیروؤں میں شمار ہوتے ہیں اور جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں جوش وخروش اور بہادری سے لڑ کر شہید ہوئے۔ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علمبردار تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ خود تو غیر جانبدار رہے لیکن اپنے بھتیجے کو انہوں نے منع نہیں کیا۔ مؤلف

سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں زاد بھائی ہوئے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی والدہ حمنہ بنو امیہ سے تھیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی پھوپھی ہالہ بنت وہیب کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب سے ہوا تھا۔ وہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی والدہ تھیں۔ اس طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے حقیقی پھپھی زاد بھائی تھے یوں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی قریش کے تین معزز خاندانوں بنی زہرہ، بنی ہاشم اور بنی امیہ سے قرابت تھی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں کلاب بن مرہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔

پیدائش

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سال پیدائش اور عمر کے متعلق روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ ہجرت نبوی سے تقریباً تیس سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئے اور مکہ کے خوشحال گھرانوں کے بچوں کی طرح ان کی پرورش اور تربیت ہوئی۔ لکھنا پڑھنا سیکھا، مروجہ فنونِ جنگ بالخصوص تیر اندازی میں مہارت حاصل کی اور غالباً عام اہل مکہ کی طرح تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔

قبولِ اسلام

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تقریباً سترہ سال کی عمر میں پہلی نزولِ وحی کے ساتویں دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ترغیب سے اسلام قبول کیا۔ آپ کے چہرہ پر ابھی خط نہیں نکلا تھا اور نمازیں فرض نہیں ہوئی تھیں صحیح بخاری کی روایت کے مطابق وہ اپنے آپ کو ''ثلث اسلام'' یعنی تیسرا مسلمان کہا کرتے تھے۔ لیکن مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے پہلے چھ سات خوش نصیب ہستیاں اسلام کی نعمت سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ تھا کیونکہ ابھی عام تبلیغ کا حکم نہ ہوا تھا اور مسلمان ابھی اپنے اسلام کا اظہار کھلم کھلا نہیں کرتے تھے۔ سعد رضی اللہ عنہ تیسرے مسلمان ہوں یا ساتویں اسلام لانے میں سبقت کے باعث وہ سابقون الاولون میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے بعد سات روز تک کوئی دوسرا بالغ مرد اسلام نہیں لایا۔ اس لئے اس عرصے میں وہ اپنے آپ کو تیسرا مسلمان سمجھتے رہے۔

جس وقت وہ اسلام کی نعمت سے بہرہ یاب ہوئے، ان کے خاندان کے تمام مرد عورت، خورد و کلاں کفر و شرک کی ضلالت میں مبتلا تھے۔ سعید الفطرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے اہل خاندان کے اعتقادات و جذبات و احساسات اور ردعمل کی پروا نہ کرتے ہوئے داعی حق کی آواز پر لبیک کہا۔ ماں کو اپنے بیٹے سے بڑی محبت تھی اور وہ بھی اس کے بڑے فرمانبردار تھے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ اس کا پیارا بیٹا آبائی دین کو چھوڑ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نئے دین کا پیرو بن گیا ہے تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ اس نے بیٹے کو سمجھانے اور اسلام سے پھیرنے کی بہت کوشش کی مگر یہ وہ نشہ نہ تھا جسے ترشی اتار دیتی۔ پھر اس نے بیٹے پر دباؤ ڈالنے کے لئے اس سے بول چال بند کر دی۔ اور جذباتی اپیل کرنے کے لئے کھانا پینا سائے میں بیٹھنا بھی ترک کر دیا۔ وہ تین دن تک بھوکی پیاسی رہی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بہت پریشان ہوئے مگر ماں سے محبت کے باوجود ان کے پائے استقامت وعزیمت میں لغزش نہ آئی۔ ماں نے کہا

کہ میرا حق ادا کرنا تجھ پر واجب ہے۔ تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کرے گا۔ لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ متاثر نہ ہوئے اور کہا:

''ماں! تم سے مجھے بے حد محبت ہے لیکن اگر تمہارے جسم میں ہزار جانیں ہوں اور ایک ایک کر کے ہر جان نکل جائے تو بھی اسلام کو نہ چھوڑوں گا۔''

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ اس پر سورۂ عنکبوت (۲۹) کی آٹھویں آیت نازل ہوئی جس کا ترجمہ یہ ہے:

''ہم نے انسان کو ہدائت کی ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔''

بعض محدثین (مسلم، ترمذی، احمد ابوداؤد، نسائی) کے مطابق یہ آیت حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہی کے بارے میں نازل ہوئی، سورۂ لقمان کی آیت ۱۵ میں بھی اس مضمون کا اعادہ کیا گیا۔ اس لئے ممکن ہے کہ بعض دوسرے مسلمان ہونے والے نوجوان بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار ہوئے ہوں۔

بیٹے (حضرت سعد رضی اللہ عنہ) کے عزم واستقلال کو دیکھ کر ماں نے بالآخر حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مشرکین مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم وشدائد کا مقابلہ بڑی استقامت اور پامردی سے کیا۔ شروع میں کفار کے شر وفساد سے بچنے کے لئے مکہ کی پہاڑیوں کی گھاٹیوں میں چھپ چھپ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ چند دوسرے صحابہ کے ساتھ ایک ویران گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ چند مشرک ادھر آ نکلے۔ انہوں نے پہلے اسلام اور مسلمانوں پر آوازے کسے، ان کا تمسخر اڑایا اور پھر ان پر حملہ کر دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اسلامی محبت وغیرت جوش میں آ گئی۔ کسی مردہ اونٹ کی شانے کی ہڈی قریب ہی پڑی تھی۔ انہوں نے وہ اٹھا کر اس زور سے ایک مشرک کے سر پر دے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر مشرکین نے راہِ فرار اختیار کی۔ اب تک مسلمانوں کو دشمنوں کے مقابلے میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام کی راہ میں دشمن کا خون بہایا۔

مشرکین مکہ نے اسلام کی بڑھتی ہوئی اشاعت سے خائف ہو کر بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم اور بنی مطلب شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ تین سال تک یہ مقاطعہ جاری رہا اگرچہ یہ مقاطعہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کا تھا۔ لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہونا گوارا نہ کیا اور اپنی رضا ورغبت سے ان کے مصائب وابتلا میں شامل رہے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو انہیں سوکھے چمڑے کا ٹکڑا مل گیا۔ اسے پانی سے دھویا، صاف کیا اور آگ پر بھونا۔ پھر کوٹ کر پانی میں گھولا اور ستو کی طرح پیا تا کہ بھوک کی آگ بجھے۔

ہجرت

حضرت سعد رضی اللہ عنہ مکہ میں رہ کر کفار کی سختیاں برداشت کرتے رہے حتیٰ کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دے دیا۔ تب آپ اپنے کمسن چھوٹے بھائی حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مدینہ چلے گئے اور وہاں اپنے بڑے بھائی عتبہ کے مکان پر قیام کیا جو مکہ میں ایک شخص کو قتل کر کے مدینہ بھاگ آیا تھا اور وہیں رہائش کر لی تھی لیکن ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

مؤاخاۃ

مکہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی مواخاۃ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سے کی تھی جوان کی طرح ایک امیر خاندان سے تھے لیکن اسلام لانے پر ان کی والدہ نے انہیں گھر سے بے دخل کر دیا تھا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اہل مدینہ کو اسلام سکھانے کے لئے وہاں بھیج دیا اور انہوں نے یہ کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ غزوۂ احد میں مسلمانوں کے علمبردار تھے اور علم اسلام کو سربلند رکھتے ہوئے شہید ہوئے۔ مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ہمنام حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ قبیلہ اوس کے سردار سے ان کی مواخاۃ قائم کی۔ انہوں نے بھی اسلام کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

غزوات۔ راہِ خدا میں پہلا تیر

ہجرت مدینہ کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ہر مشکل وقت پر اسلام اور داعی اسلام کے لئے جاں نثاری کا مظاہرہ کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ آنحضرت نے ہجرت کے تھوڑے دن بعد مشرکین مکہ کی سرگرمیوں کا پتہ چلانے اور ان کے تجارتی قافلوں کو مرعوب کرنے کے لئے حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کی زیر کمان ساٹھ صحابہ پر مشتمل ایک سریہ بطن رابغ کی طرف بھیجا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی اس میں شامل تھے۔ اہل سریہ کی مڈبھیڑ مشرکین مکہ کے دو سو افراد پر مشتمل ایک قافلہ سے ہوئی، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی میں پہل کرنے سے منع کر دیا تھا، اس لئے مسلمانوں نے قافلے پر حملہ نہیں کیا اور قافلہ بھی پہلو بچا کر نکل گیا۔ لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اسلامی جوش وحمیت کے تحت کفار کی طرف ایک تیر چلا ہی دیا۔ یہ پہلا تیر تھا جو اسلام کی راہ میں چلایا گیا۔ مکہ میں راہِ خدا میں سب سے پہلی خونریزی بھی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔ مدینہ پہنچ کر راہِ خدا میں پہلا تیر بھی انہی کی کمان سے نکلا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بدر، احد سے لے کر خندق، خیبر، فتح مکہ، حنین، طائف وغیرہ تمام غزوات میں شرکت کی۔ فتح مکہ کے موقع پر مہاجرین کے تین جھنڈوں میں سے ایک جھنڈا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا بیعت رضوان اور سفر تبوک میں بھی حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے۔ بعض سریوں میں شرکت اور بعض کی قیادت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ انہیں پیار اور شفقت سے ماموں کہتے تھے۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے مجمع میں تشریف رکھتے تھے۔ سعد رضی اللہ عنہ آتے دکھائی دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ میرے

ماموں ہیں۔کوئی ایسا ماموں تو دکھائے۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو سوتے جاگتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال رہتا تھا۔

غزوہ بدر میں بڑے جوش وجذبہ اور جانبازی سے لڑے۔ان کے حملوں کا یہ حال تھا کہ اگرچہ پیدل تھے لیکن شہ سوار معلوم ہوتے تھے۔کفار مکہ کے مشہور سردار۔سعید بن عاص کو قتل کیا اور اس کی قیمتی تلوار ''ذوالکتیفہ'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے بطور خاص حاصل کی۔ان کے چھوٹے بھائی حضرت عمیر رضی اللہ عنہ جنگ بدر میں شریک ہونے کے خواہش مند تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کمسنی کی وجہ سے پہلے تو اجازت نہ دی اور وہ رونے لگے۔تب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان کی آزادگی اور دل شکستگی کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے لئے اجازت مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے کمسن بھائی کے بڑے شوق اور محبت سے تلوار باندھی اور وہ بھی بڑی بہادری سے لڑے۔آخر کفارِ عرب کے مشہور بہادر شہسوار عمرو بن عبدود کے ہاتھوں جام شہادت پیا۔ یہ عمرو غزوہ خندق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔جنگ بدر میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تین دشمنوں کو قیدی بھی بنایا۔

فتح مکہ کے موقع پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ دس ہزار، قدوسیوں کے اس لشکر میں شامل تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھا اور مہاجرین کے تین علمبرداروں میں سے ایک تھے جنگ حنین میں شدید علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کی اور صحت کے لئے دعا فرمائی ۹ رہجری میں جب پہلی دفعہ مسلمانوں نے اسلامی طریقے سے حج کیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ امیر الحج تھے۔کچھ دوسرے صحابہ کے ساتھ سعد رضی اللہ عنہ نے معلّمی کی خدمات انجام دیں۔انہوں نے عہد نبوی کے تمام غزوات اور مشاہدات میں حصہ لیا۔

بیماری اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی

۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا۔پھر مکہ میں سخت بیمار ہو گئے اور زندگی کی امید نہ رہی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے رو کر عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے پاس کافی مال ہے اور اولاد میں صرف ایک بیٹی ہے۔[1] آج اگر آپ اجازت دیں تو دو تہائی مال صدقہ کر دوں اور ایک تہائی بیٹی کے لئے رہنے دوں۔'' لیکن رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک تہائی صدقہ کرنے کی اجازت دی اور فرمایا کہ ''یہ بھی بہت ہے۔اگر تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ جاؤ تو یہ ان کو مفلس چھوڑ جانے سے بہتر ہوگا تاکہ وہ دوسروں کے سامنے دست سوال دراز نہ کریں۔اے سعد! تم اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے حتیٰ کہ اپنے بیوی بچوں کے منہ میں جو لقمہ ڈالو گے سب کا اجر تمہیں ملے گا۔'' انفاق مال کے بارے میں تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے۔لیکن رونا پھر نہ تھما اور آنسوؤں کی جھڑی کے درمیان عرض کیا کہ

[1] بعد میں بہت سے بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں۔حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ دور بین کے قربان جائیے۔انہوں نے حسن معاشرت اور اسلامی معیشت کا ایک عام سنہری اصول بھی بیان کر دیا اور جیسے سعد رضی اللہ عنہ کی آئندہ کثیر العیالی کو بھی دیکھ لیا۔ہمارے اشتراکیت پسند حضرات اس واقعہ پر غور کریں۔مؤلف

یارسول اللہ ﷺ! مجھے مکہ میں موت آ رہی ہے حالانکہ میں اس سرزمین سے ہمیشہ کے لئے ہجرت کر گیا تھا، دعا فرمائیے کہ مجھے مکہ میں موت نہ آئے۔'' آنحضرت ﷺ نے انہیں تسلی دی، ان کے حق میں دعا فرمائی اور بشارت دی کہ ''اے سعد رضی اللہ عنہ! تم اس وقت تک زندہ رہو گے جب تک کہ تم سے ایک قوم کو نقصان اور دوسری کو نفع نہ پہنچ جائے۔'' اللہ نے حضور ﷺ کی دعا قبول فرمائی۔ سعد رضی اللہ عنہ صحت یاب ہو گئے اور پھر آپ ﷺ کی پیشین گوئی یوں بدرجۂ کمال پوری ہوئی کہ چند ہی سال بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں ایران فتح ہو گیا۔ ساسانی سلطنت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور اسلام کا بول بالا ہوا۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں

رسول اکرم ﷺ کے وصال کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کسی تردد اور تاخیر کے بغیر ان کی بیعت کر لی اور ان کے بعد آنے والے خلفا حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں قبیلہ ہوازن پر عامل مقرر کیا۔ انہوں نے اپنے فرائض منصبی بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی عہد خلافت تک وہ اسی منصب پر رہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے صحابہ کے اتفاق رائے سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بنی ہوازن سے مدینہ واپس بلا کر اس لشکر کی قیادت سونپی جسے ایران کی قوت کو توڑنے، قادسیہ، دارالحکومت مدائن، بابل اور دوسرے اہم شہروں اور صوبوں کو فتح کرنے کا اعزاز حاصل کرنا تھا اور جس کی سپہ سالاری سے سعد رضی اللہ عنہ کی قسمت میں دنیا کے عظیم اور مشہور سپہ سالاروں کی صف میں شامل ہونا لکھا تھا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ بڑے فعال اور سرگرم نظر آتے ہیں عہدِ نبوی میں اپنے دینی اخلاص، حب رسول ﷺ اور سرفروشی کے طفیل انہوں نے زبان وحی ترجمان سے دس جنتیوں میں شمار ہونے کی بشارت سنی تھی۔ اور یہ بشارت ان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھی۔ عہد فاروقی میں انہوں نے جو کارنامے سرانجام دیئے وہ نہ صرف ان کی اپنی کتاب زندگی کا ایک سنہری باب ہیں بلکہ اسلام اور دنیا کی تاریخ کا بھی۔ وہ دنیا کی قدیم ترین اور طاقتور تریں سلطنت کے فاتح ہیں. جو بحیرۂ روم سے کشمیر تک اور بحیرہ خزر سے خلیج فارس تک لاکھوں مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ عرب آبادی کے علاقے عراق عرب اور یمن بھی اس میں شامل تھے بلکہ کسریٰ تو پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا غلام سمجھتا تھا۔ صرف دس پندرہ سال پہلے ایرانی سلطنت اپنی حریف مشرقی رومی سلطنت کو شکست فاش دے کر اپنی عظمت، قوت اور برتری کا لوہا منوا چکی تھی اور اب عرب کے بادیہ نشین اس سے پنجہ آزمائی کے لئے اٹھے تھے۔ اونٹنی کا دودھ پینے والے، سوسمار کا گوشت کھانے والے اور ننگے پاؤں پھرنے والے! حالات نے انہیں تخت کیانی کی آرزو کرنے پر ابھارا تھا۔

سوئے ایران

ایران کی فتح کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت کے دوران میں بھی پیشین گوئی کی تھی اور سراقہ بن جعشم سے فرمایا تھا کہ میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھتا ہوں، پھر غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھودتے ہوئے بھی قیصر و کسریٰ کے کنگرے دیکھے تھے۔ یہ پیشین گوئیاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور اکثر دوسرے صحابہ کرام کو بھی معلوم تھیں۔ ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز نے آپ کا تبلیغی نامۂ مبارک حقارت سے پھاڑ کر پھینک دیا تھا اور کہا تھا کہ میرا غلام ہو کر مجھے ایسا خط لکھتا ہے! اطلاع ملنے پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ”کسریٰ نے میرا خط نہیں پھاڑا، اپنی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے کر دی ہے۔“ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ قدرت کی طرف سے ایران سے آویزش اور اس کی فتح کے اسباب خود بخود پیدا ہوتے چلے گئے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز میں جب فتنہ ارتداد نے سر اٹھایا تو اہل بحرین بھی مرتد ہو گئے۔ ایرانی حکام نے ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کی۔ جھوٹی نبیہ سجاح کو بھی ایرانی اشیرباد حاصل تھی۔ مرتدین سے نپٹنے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ جب تک عراق عرب سے ایرانیوں کو بے دخل کر کے وہاں کے عرب قبائل کو ان کے غلبہ وحکومت سے نجات نہیں دلائی جاتی، مملکت اسلامیہ کی سرحدیں محفوظ نہیں رہیں گی اور حکومت ایران کی سازشیں اور فتنہ انگیزیاں تشویش واضطراب کا باعث بنتی رہیں گی اور ہر وقت اچانک تصادم کا خطرہ رہے گا۔ اسی اثناء میں حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی۔ ایک بہادر اور پر جوش مسلمان قبائلی سردار۔ خلیفہ اول کی خدمت میں حاضر ہوئے ایرانیوں سے ان کی سرحدی جھڑپیں ہو چکی تھیں اور خسرو پرویز کے بعد ایرانی حکومت کی سیاسی اور فوجی کمزوری کا کچھ تجربہ اور مشاہدہ انہیں ہو چکا تھا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صورت حال سے مطلع کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں ایرانیوں سے جنگ چپاول لڑنے کی اجازت دے دی اور مزید فوج بھیجنے کا وعدہ کیا۔ ایرانی سلطنت کی قوت و شوکت کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو کچھ فوج دے کر عراق عرب بھیجا۔ انہوں نے بناج پہنچ کر مثنیٰ کی مقامی قبائلی فوج کی بھی کمان سنبھال لی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں کو پے در پے شکستیں دے کر ان کی کمر توڑ دی۔ عراق کے عربوں پر سے ایرانیوں کا رعب وداب ختم کر کے انہیں دلیر کر دیا۔ ۱۳ ہجری میں خلیفہ اول نے خالد رضی اللہ عنہ کو رومیوں کے مقابلے کے لئے شام بھیج دیا اور مثنیٰ رضی اللہ عنہ ان کے قائم مقام سالار لشکر مقرر کئے گئے۔ خالد رضی اللہ عنہ کے شام جانے کے بعد ایرانی ایک دفعہ پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور مفتوحہ علاقوں میں بغاوت کرا دی اور ایک بڑی فوج بھاری سامان جنگ کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف میدان میں اتر پڑی۔ تفصیلات حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حالات کے تحت دی جا چکی ہیں۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ مثنیٰ کمک حاصل کرنے کے لئے مدینہ پہنچے۔ وہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بستر موت پر تھے اور اسی شام فوت ہو گئے۔ لیکن اپنی وفات سے پہلے انہوں نے اپنے جانشین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تاکید کر دی کہ سب سے پہلا کام یہ کریں کہ مثنیٰ کے لئے امدادی فوج روانہ کریں۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ ثقفی کی کمان میں فوج گئی اور مثنیٰ ان کے نائب سالار لشکر

ہوئے۔ ایرانی جرنیلوں کو متعدد شکستیں دینے کے بعد ایک غلط جنگی چال کی وجہ معرکۂ جسر میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ابوعبید شہید ہو گئے۔ آخر مثنیٰ نے کمان سنبھالی اور صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے معرکہ بویب میں معرکہ جسر کا ایرانیوں سے بھرپور انتقام لیا۔ بویب کی عبرتناک شکست سے یک لخت پوری ایرانی قوم بیدار اور متحد ہو گئی۔ امراء و رؤسا نے اپنے اختلافات ترک کر کے باہم مصالحت کر لی اور بڑے زور شور سے جنگی تیاریاں کیں۔ مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں میں بغاوت پھیلا دی۔ مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے خط کے ذریعے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور مزید فوج بھیجنے کی درخواست کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سارے عرب میں جہاد کی منادی کر دی اور رضا کار مجاہدین طلب کئے۔ مدینے میں حد نظر تک سرفروش مجاہدین ہی نظر آنے لگے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ خلیفہ اول کے زمانے سے نجد (قبیلہ ہوازن) میں عامل کی حیثیت سے تعینات تھے۔ انہوں نے وہاں سے ایک ہزار جنگ آزما مجاہدین مدینہ بھیجے۔ اب لشکر مجاہدین کے سپہ سالار کے انتخاب کا معاملہ سامنے آیا۔ اہل الرائے صحابہ میں کئی دن تک صلاح مشورے ہوتے رہے۔ جب بنو ہوازن کے مجاہدین مدینہ پہنچے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بول اٹھے۔ ''میں نے پالیا۔''

''کون؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا

''سعد بن مالک رضی اللہ عنہ'' ابن عوف نے جواب دیا۔

اس پر تمام اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں نجد (ہوازن) سے بلا کر علم امارت سپرد کیا اور مناسب ہدایات دیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کرنے اور خلیفہ کی ہدایات کے مطابق اقدامات کرنے کا یقین دلایا۔ انہوں نے سلطنت ایران کی عظیم فوجی قوت سے بھرپور اور آخری ٹکر لینے کی ذمہ داری بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قبول کر لی جیسے اللہ نے انہیں اسی کام کے لئے پیدا کیا ہو۔ یہ عظیم خود اعتمادی توکل علی اللہ کا نتیجہ تھی۔

جنگ قادسیہ

روانگی کے وقت خلیفہ ثانی نے حضرت سعد بن ابی وقاص رحمۃ اللہ علیہ کو ایک آخری نصیحت کی:

''میں تمہیں عراق میں لڑنے والے اسلامی لشکر کا سالار بنا کر بھیج رہا ہوں۔ یاد رکھو کہ تم ایک سخت اور تکلیف دہ مہم پر جا رہے ہو، اس میں کامیابی کے لئے حق و صداقت پر ہونا ضروری ہے اس لئے تم خود بھی بھلائی کو شعار بناؤ تا کہ تم فتح سے ہمکنار ہو سکو۔ تکلیف کے موقع پر صبر سے کام لو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ مدینہ سے تقریباً چار ہزار فوج کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ راستے میں اور دستے آ کر ملتے گئے، حتیٰ کہ شراف پہنچتے پہنچتے فوج کی تعداد تیس ہزار ہو گئی۔ اس فوج میں ستر بدری صحابہ اور تین سو وہ تھے جو بیعت رضوان کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں تھے۔ اتنی ہی تعداد ان صحابہ کی بھی تھی جنھوں نے فتح مکہ میں

حصہ لیا تھا۔

شراف میں مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے بھائی معنیٰ حاضر خدمت ہوئے اور مثنیٰ کے انتقال کی خبر دی۔ انتقال سے پہلے انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لئے جو مفید اور ضروری مشورے دیئے تھے وہ گوش گزار کئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے کارناموں کی تعریف وتحسین کی اس اہم اور نازک موقع پر ان کے انتقال کر جانے پر اظہارِ افسوس کیا۔ ان کی عظیم اسلامی خدمات کے اعتراف اور ان کے اہل وعیال کی سرپرستی وکفالت کے لئے ان کی بیوہ سلمیٰ سے نکاح کر لیا۔ شراف میں ٹھہر کر انہوں نے اپنی فوج کا جائزہ لیا۔ اس کو فوجی نقطہ نظر سے از سرِ نو منظم کیا۔ میمنہ ومیسرہ پر الگ الگ افسر تعینات کئے۔ قاضی، خزانچی، مترجم، منشی، خطیب، طبیب اور رسد کا بندوبست کرنے والے مقرر کئے۔ پھر وہاں سے چل کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق قادسیہ میں پڑاؤ کیا جو ایک سرسبز مقام تھا۔ اسلامی فوج کے پیٹھ کی جانب عرب کے پہاڑ تھے اور سامنے دشمن کی سرزمین۔ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام اسلامی افواج کے لئے بہت موزوں تھا۔ شراف سے قادسیہ جاتے ہوئے عذیب کے مقام پر ایرانیوں کا اسلحہ خانہ ہاتھ لگا۔ عورتوں اور بچوں کو ایک گھوڑ سوار دستے کی حفاظت میں وہاں چھوڑا۔ قادسیہ پہنچ کر چاروں طرف ہرکارے اور جاسوس دوڑا دیئے کہ دشمن کی نقل وحرکت اور گرد ونواح کی آبادی کی خبریں لائیں۔ قادسیہ کے وسیع وعریض میدان کے کنارے پر ایک قلعہ نما چھوٹا سا محل تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اسے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ جاسوس خبر لائے کہ رستم بن فرخ زاد افواجِ ایران کا سپہ سالار مقرر ہوا ہے اور وہ ساباط میں خیمہ زن ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی تو وہاں سے حکم آیا کہ جنگ سے پہلے اتمام حجت کے لئے شاہ ایران یزدگرد کو قبولِ اسلام کی دعوت دینے کے لئے سفیر بھیجے جائیں۔ سعد رضی اللہ عنہ نے قبائلی سرداروں میں سے چودہ بارعب اور باوقار اشخاص کو منتخب کر کے ایرانی دارالسلطنت مدائن بھیجا جو قادسیہ سے تقریباً چالیس میل دور تھا۔ حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ سفرا کے سرگروہ تھے۔ یہ سفراء عربی جبے زیب تن کئے، شانوں پر یمنی چادریں ڈالے، ہاتھوں میں کوڑے لہراتے، موزے چڑھائے، اسپانِ تازی کی ننگی پیٹھوں پر سوار اس شان سے یزدگرد کے دربار میں دراتے ہوئے گئے کہ گھوڑے رانوں سے نکلے جاتے تھے اور بار بار زمین پر ٹاپ مارتے تھے سفیروں کی ہیئت کذائی سے یزدگرد پر ہیبت طاری ہوگئی۔ اس نے بڑے متکبرانہ انداز میں اسلامی سفیروں سے کہا کہ تمہیں ہمارے ملک پر بلاوجہ حملہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ تم واپس جاؤ۔ ہم تم میں سے ہر ایک کو دولت سے مالا مال کئے دیتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور کہا کہ ہمارے آنے کا مقصد لوٹ مار اور دولت کا حصول نہیں۔ اللہ نے ہمارے درمیان اپنا پیغمبر پیدا کیا اور اخلاقی لحاظ سے ہماری کایا پلٹ دی۔ ہم دولت اکٹھی کرنے کی بجائے اللہ کے دین کو پھیلانا اور فتنہ وفساد ختم کر کے امن وامان کی فضا قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری تین شرطیں ہیں:

۱- اسلام قبول کر لو تو تم ہمارے بھائی ہو گے۔ کوئی نزاع باقی نہ رہے گا۔

۲- اگر اسلام قبول نہ کرو تو جزیہ دینا قبول کرو۔ ہم تمہاری اور تمہارے اہل ملک کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔

۳- اگر اسلام اور جزیہ میں سے کوئی بات بھی قبول نہ کرو تو پھر تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے

گی۔

صحرانشینوں کی یہ بیبا کانہ گفتگو سن کر نوجوان ایرانی شہنشاہ جوشِ غضب سے کھول اٹھا۔ شاہنامہ کے مصنف فردوسی نے اس موقع پر خود یزدگرد کا جامہ پہن لیا ہے (آخر تھا تو ایرانی نژاد ہی اور وہ بھی ایران میں نشو ونما پانے والے ایک خاص گروہ کا پیرو! یہاں اس کی ایرانی عصبیت ابھر آئی) اور یزدگرد کی زبان سے کہلوایا:

زشیر شتر خوردن و سوسمار   عرب راہجائے رسیداست کار
کہ تخت کیاں را کند آرزو   تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

یعنی عرب کے یہ بدو جو اونٹنیوں کا دودھ پی کر اور گوہ کا گوشت کھا کر گزران کرتے تھے اب ان کی یہ حالت اور جرأت ہوگئی ہے کہ ایران کے تخت سلطنت کی آرزو کرنے لگے ہیں۔ اے آسمان! تجھ پر ہزار افسوس ہے!

پھر اس نے مٹی کے ڈھیلوں کا ایک ٹوکرا منگایا اور سفیروں سے کہا کہ سرزمین ایران تو تم کیا لوگے، میں تمہیں یہ دیتا ہوں۔ اٹھاؤ اور چلتے بنو۔ عاصم بن عمرو نے جلدی سے ٹوکرا اٹھا لیا اور سب نے گھوڑوں کی باگیں قادسیہ کی طرف موڑ دیں۔ اپنے کیمپ میں پہنچ کر مٹی کا ٹوکرا حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھ دیا اور کہا ''اے سعد رضی اللہ عنہ! مبارک ہو۔ دشمن نے خود اپنی زمین ہمیں دے دی۔''

اس واقعہ کے تھوڑی ہی دیر بعد ایرانی سپہ سالار رستم دربار میں پہنچا تو یزدگرد نے اسے فخریہ بتایا کہ کس طرح اس نے سادہ لوح عرب سفیروں کی توہین کی۔ رستم واقعہ سن کر سٹپٹا گیا اور اپنے بادشاہ سے کہا کہ سادہ لوح وہ نہیں تھے بلکہ آپ خود سادہ لوح ہیں کہ اپنی مملکت کی مٹی ان کے حوالے کردی۔ پھر اس نے عرب سفیروں کے پیچھے سوار دوڑائے کہ مٹی کا ٹوکرا واپس لے آئیں مگر وہ انہیں نہ پا سکے۔ یہ بدشگونی رستم کے دل میں گھر کر گئی۔

رستم اپنی ہر طرح کے ساز و سامان سے مسلح ایک لاکھ بیس ہزار قابل جنگ فوج، (ساٹھ ستر ہزار امدادی نفری اس کے علاوہ تھی) جس میں تیس تربیت یافتہ جنگی ہاتھی شامل تھے۔ ساتھ لے کر ساباط سے نکلا اور جندی سابور (دریائے فرات کی ایک شاخ) کے دوسرے کنارے پر خیمہ زن ہوا۔ دونوں فوجوں کے درمیان یہی ندی حائل تھی۔ بہر حال وہ بہت لیت ولعل سے کام لے رہا تھا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے ایک منحوس خواب دیکھا تھا جس کی وجہ سے خائف تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ نہ ہونے پائے اور عرب کچھ مال و اسباب لے کر واپس لوٹ جائیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بھی کوئی عجلت نہ تھی۔ وہ بلی اور چوہے کا کھیل کھیل رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً فوجی دستوں کو مفصلات میں بھیجتے جو ایرانیوں سے سامانِ رسد چھین کر لے آتے اور علاقے میں دہشت اور عدم تحفظ کا احساس پھیلاتے تاکہ رعایا اور ایرانی مرزبان (چھوٹے چھوٹے بادشاہ اور جاگیردار) اور سرکردہ لوگ یا تو اسلام قبول کرلیں یا ذمی بن جائیں۔ انہوں نے اطراف وجوانب میں اپنے جاسوس بھی پھیلا دیئے تھے جن کے ذریعے ایرانیوں کی نقل وحرکت، تیاریوں اور افواج کے رنگ ڈھنگ، دشمن کے کیمپ اور مورال کی خبریں باقاعدگی سے ملتی رہتی تھیں اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مزید ہدایات حاصل کرتے رہتے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ خود ایرانی افواج نے اپنے دیہات اور رعایا پر زیادتیاں کی تھیں اور ان کے ننگ و ناموس پر بھی حملے کئے تھے جس کا بہت

خراب ردعمل ہوا تھا۔ ستم رسیدہ لوگ چلا اٹھے اورانہوں نے ایرانی شہنشاہ سے فریاد کی کہ یا تو فوراًان کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے ورنہ وہ عربوں کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یزدگرد نے بے صبر ہو کر رستم پر زور دیا کہ دشمن سے جنگ کر کے اس کا قلع قمع کرے۔

حالات کے اندازہ سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یقین ہو گیا کہ ایرانی سلطنت اب چند دنوں کی مہمان ہے۔ وہ پرسکون تھے۔ رستم جواب تک ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا، شہنشاہ کے حکم سے اسے کچھ سلسلہ جنبانی شروع کرنا پڑی، اس کی درخواست پر صلح کی بات چیت کرنے کے لئے اب کے حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت ربعی بن عامر کو بطور سفیر بھیجا۔ وہ اس شان سے گئے کہ گھوڑے کا خوگیرا اپنے لباس کے اوپر بطور زرہ پہن رکھا تھا۔ اسی کا ایک ٹکڑا بطور پٹکا کمر سے باندھا ہوا تھا اور ایک دوسرا ٹکڑا سر پر لپیٹ رکھا تھا۔ تلوار چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تھی، انہیں مرعوب کرنے کے لئے رستم نے اپنا دربار بڑے اہتمام سے آراستہ کیا۔ دیبا کا فرش تھا، سنہری گاؤ تکیئے اور حریر کے پردے۔ صدر میں تخت مرصع پر رستم طلائی تاج پہنے بڑے رعب وشان سے بیٹھا تھا۔ مردانِ جنگی اور امرائے دربار قیمتی لباس پہنے، ہتھیاروں سے اوپچی بنے اپنے منصب ومرتبہ کے مطابق صف بستہ بیٹھے یا کھڑے تھے۔ ربعی نے اس شان و شوکت کے مظاہرے کو بڑی بے نیازی سے دیکھا۔ وہ فرش کے کنارے پہنچ کر گھوڑے سے اترے، اس کی لگام کو ایک گاؤ تکیئے سے اٹکا دیا اور نیزے کی نوک سے قیمتی فرش کو چھیدتے ہوئے رستم کی طرف بڑھے۔ اہل دربار نے ان سے ہتھیار رکھوانے کی کوشش کی۔ انہوں نے بڑی بے باکی سے کہا کہ میں تمہارا بلایا ہوا آیا ہوں۔ اگر میرا ہتھیار بند آنا تم لوگوں کو پسند نہیں تو میں واپس جاتا ہوں، رستم نے انہیں اجازت دے دی تو وہ آہستہ آہستہ رستم کے تخت کی طرف بڑھے اور قریب پہنچ کر اپنا نیزہ فرش پر مارا جو اسے چیرتا ہوا زمین میں گڑ گیا، اہل دربار کے لئے ان کا یہ انداز وحشیانہ اور غیر مہذبانہ تو تھا ہی، لیکن ہیبت خیز بھی تھا۔ رستم نے ان سے پوچھا کہ ''تم لوگوں نے ہمارے ملک پر ناحق چڑھائی کیوں کی ہے؟'' انہوں نے جواب دیا ''اس لئے کہ مخلوق کی بجائے خالق کی عبادت کی جائے اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرایا جائے'' اس پر رستم نے کہا کہ ''میں عمائدین دربار سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دوں گا'' رستم کے درباریوں کو حضرت ربعی کے ہتھیار بڑے گھٹیا قسم کے معلوم ہوئے، انہوں نے کہا کیا انہی ہتھیاروں سے ایران کی سلطنت فتح کرو گے؟ یہ سن کر ربعی نے اپنی تلوار میان سے نکالی تو ایرانیوں کی آنکھوں میں بجلی سی کوندگئی۔ انہوں نے تلوار کی کاٹ آزمانے کے لئے ڈھالیں پیش کیں تو ربعی نے ان کے ٹکڑے اڑا دیئے۔

ربعی کا مشن ادھورا رہا۔ وہ واپس چلے آئے۔ رستم زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو رستم کے پاس بطور سفیر بھیجا۔ انہیں مرعوب اور متاثر کرنے کے لئے رستم نے پہلے سے بھی کہیں زیادہ درباری شان وشوکت، عظمت وسطوت اور فوجی رعب وداب کی نمائش کی مگر بقول حالی ؎

ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر رستم کے شاندار اور پر تکلف تخت کی طرف بڑھے اور اس کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ اس پر اہل دربار میں سخت برہمی پھیل گئی اور انہوں نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کو بازو سے پکڑ کر تخت سے نیچے اتار دیا۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ ''تم پر افسوس ہے۔ میں یہاں خود نہیں آیا بلکہ تم لوگوں کی دعوت پر آیا ہوں، اس لئے تمہارا مہمان ہوں اور مہمان کے ساتھ اس قسم کا سلوک زیب نہیں دیتا۔ تمہاری طرح ہمارے ہاں یہ نہین ہوتا کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے تمام لوگ اس کے آگے بندوں کی طرح سر جھکائیں۔'' مغیرہ رضی اللہ عنہ کی باتوں نے درباریوں کو متاثر کیا اور ان میں سے بعض نے کہا کہ ہماری غلطی تھی کہ ایسی آزاد طبع اور مساوات پسند قوم کو ذلیل اور وحشی سمجھتے تھے۔ خود رستم بھی کھسیانا سا ہوگیا اور معذرت کے انداز میں کہا کہ یہ خادموں کا فعل تھا۔ پھر اس نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کے ترکش سے تیر نکال کر از راہ حقارت کہا کہ ان تکلوں سے کیا ہوگا؟ جواب ملا کہ آگ کی لو گو چھوٹی ہو پھر بھی آگ آگ ہی ہوتی ہے۔ پھر رستم نے ان کی تلوار کے میان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طنز کی کہ بڑا بوسیدہ ہے۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ نے فوراً جواب دیا کہ درست! لیکن تلوار پر باڑھ ابھی رکھی گئی ہے۔ پھر مطلب کی بات شروع ہوئی، رستم نے ایرانی سلطنت کی عظمت وقوت جتائی کہ تم لوگ اب بھی اپنے ملک کو لوٹ جاؤ تو ہم تمہیں انعام سے مالا مال کر دیں گے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ تین ہی صورتیں ہیں۔ یا اسلام، یا جزیہ یا تلوار۔ رستم آگ بگولا ہوگیا اور آفتاب کی قسم کھا کر کہا کہ کل تمام عرب کو تہس نہس کر دوں گا۔ یوں صلح وآشتی کے مذاکرات ناکام ہوکر آخر فیصلہ تلوار پر ٹھہرا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی مردم شناسی اور دور اندیشی کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ایرانی شہنشاہ اور پھر ایرانی جرنیل کے پاس جانے کے لئے سفیروں کا بہترین انتخاب کیا اور اتمام حجت کے لئے ایرانیوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دیا اور اپنے اسلامی اصولوں سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہ ہوئے۔ جنگ قادسیہ کے حالات (اور جنگ یرموک) کی تفصیل سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ جن کا دہرانا یہاں مقصد نہیں۔ راقم نے جنگ قادسیہ کی تھوڑی سی تفصیل حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حالات میں دی ہے۔ مختصر یہ کہ مغیرہ رضی اللہ عنہ کی سفارت کی ناکامی کے بعد اگلے روز ایرانی فوج نہر عبور کر کے اسلامی فوج کے مقابل صف آرا ہوگئی۔ مسلمانوں کے لئے دنیا کی قدیم اور عظیم ایرانی سلطنت کی بے پناہ فوجی طاقت سے نبرد آزمائی کا وقت آپہنچا تھا۔ اللہ نے یہ فخر اور اعزاز ''فارس العرب[1]'' کی تقدیر میں لکھا تھا۔ ان کے حکم سے شاعر، خطیب اور قاری اپنے زرمیہ اشعار، ولولہ انگیز تقریروں اور جہاد و قتال کے متعلق قرآنی آیات کی تلاوت سے مجاہدین کے دل بڑھا رہے تھے۔ ہر مجاہد جذبہ جہاد اور شوقِ شہادت سے سرشار تھا۔ ماریں تو غازی، مریں تو شہید۔ صرف تیس ہزار اہل ایمان اپنے معمولی ہتھیاروں کے ساتھ دو لاکھ ایرانیوں کے مقابل تھے جن کے پاس اعلیٰ سے اعلیٰ اسلحہ کے علاوہ تیس جنگی تربیت یافتہ ہاتھی بھی تھے جنہیں دشمنوں کی صفوں میں تباہی مچانے اور سامنے آنے والے حملہ آوروں کو کچل ڈالنے کی خاص

[1] حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ ماہر تیر انداز ہونے کے علاوہ مشاق گھڑ سوار بھی تھے ان کی اعلیٰ شہسواری کی وجہ سے وہ لوگوں میں فارس العرب (عرب کا شہسوار) بھی مشہور تھے۔ مولف

تربیت دی گئی تھی۔ سردارانِ لشکر اور امرا کی سواری کے ہاتھی ان کے علاوہ تھے اور پھر بڑے بڑے تیرانداز، نیزہ بردار اور تیغ زن ان پر سوار تھے۔ سامانِ رسد بے شمار تھا اور اپنی جانی پہچانی سرزمین پر لڑنے کا فائدہ مزید برآں۔ میدانِ جنگ سے دارالحکومت مدائن تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہرکارے اور نقیب تعینات کر دیئے گئے تھے تاکہ جنگی صورت حال کی تازہ ترین خبریں باآواز بلند بیان کرتے رہیں اور وہ جلد سے جلد یزدگرد تک پہنچتی رہیں۔ خبررسانی کی یہ ریلے ریس ایرانیوں کی نظر میں اس جنگ کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔

فارس العرب حضرت سعد رضی اللہ عنہ عرق النساء کی تکلیف (یا رانوں اور سرینوں پر پھوڑے پھنسیوں) کی وجہ سے گھوڑے پر سواری سے معذور تھے۔ اس لئے بہ نفسِ نفیس میدان جنگ میں نہ اتر سکے۔ میدان جنگ کے ایک کنارے پر چھوٹا سا قدیم محل انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا، اس کی بالائی چھت پر منڈیر سے لگ کر بیٹھ گئے اور وہیں سے فوج کی کمان شروع کی۔ میدان جنگ میں خالد بن عرفطہ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ لڑائی کی لحہ لحہ بدلتی صورت حال سے نپٹنے کے لئے پرچوں پر احکام اور ہدایات لکھ کر خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہ کی طرف پھینکتے تھے۔ وہ دوسرے سالارانِ فوج تک احکام پہنچاتے اور نقشہ جنگ میں ضروری تبدیلی کرتے تھے۔ اس سے پہلے دنیا کی تاریخ میں کسی سپہ سالار نے ابلاغِ احکام کا یہ طریقہ میدان جنگ میں اختیار نہیں کیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ طریقہ نہ صرف کامیابی سے استعمال کیا بلکہ جدید دنیا کے کمانڈروں کے لئے ایک مثال قائم کر دی۔ اب میدان جنگ میں احکام لاسلکی اور ٹیلی فون سے پہنچائے جاتے ہیں جو ابلاغ کے تیز ترین طریقے ہیں۔ فوجوں کے سپریم کمانڈر میدان جنگ سے دور اپنے جنگی ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر وہیں سے نائب کمانڈروں کو ہدایات دیتے ہیں۔ کچھ سالوں بعد ممکن ہے ٹیلی پیتھی کے طریقوں سے بھی کام لیا جانے لگے۔ امریکہ اور روس میں اس پر تحقیقات ہو رہی ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک دور دراز میدان جنگ میں لڑتے ہوئے حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کو عین خطبہ جمعہ کے دوران میں ایک ایسا ہی ٹیلی پیتھک پیغام دیا تھا جس نے مسلم لشکر کو شکست اور تباہی سے بچا لیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا پہلا حکم یہ تھا کہ ''میں تین دفعہ اللہ اکبر کا نعرہ لگاؤں گا۔ تیسرا نعرہ ختم ہوتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا جائے۔'' لیکن وہ ابھی پہلا ہی نعرہ لگا پائے تھے کہ ایرانی لشکر کی طرف سے حرکت ہوتے دیکھ کر حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنے زیر کمان دستے کو لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے فوجی سالاروں نے بھی حملہ کر دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ یہ جوش و خروش اور اپنے اولیں حکم کی خلاف ورزی دیکھ کر صرف یہ کہہ کر رہ گئے کہ اللہ قعقاع کو معاف کرے۔

تین دن اور ایک رات انتہائی خوفناک جنگ ہوئی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بڑی ہوشیاری اور دوراندیشی سے جنگی ہدایات دیتے رہے، دونوں فوجیں تخت یا تختہ کا معاملہ سمجھ کر بڑی بے جگری اور بہادری سے لڑیں۔ انفرادی شجاعت کے عدیم النظیر کارنامے چشم فلک نے دیکھے۔ ایرانی ہاتھیوں نے بڑی تباہی مچائی۔ مگر حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ اور ان کے جیالے ساتھیوں نے ان کا تدارک کیا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر ان سے بھڑ گئے اور بہت سوں کی سونڈیں کاٹ ڈالیں یا تیروں سے آنکھیں پھوڑ ڈالیں اور ہودے الٹ دیئے۔ سونڈ کٹے اندھے ہاتھیوں نے پسپا ہوتے ہوئے

ایرانی فوج ہی کو روند ڈالا۔ قعقاع رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے اونٹوں پر برقعہ نما قسم کی بھاری بھرکم جھولیں ڈال کر انہیں گھوڑوں کے لئے خوفناک بنا دیا جو بدکتے اور بے قابو ہونے لگے۔ قعقاع رضی اللہ عنہ، عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ، ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ، عمرو بن معدیکرب، طلیحہ بن خویلد، ابو محجن ثقفی رضی اللہ عنہ وغیرہ جانبازوں نے اسلامی جوش وحمیت اور غیرت وشجاعت کے ایسے درخشاں کارنامے سرانجام دیئے کہ آئندہ نسلوں کے لئے تاریخ کے صفحات میں ثبت ہو گئے۔

مشہور مرثیہ گو شاعرہ خنسا رضی اللہ عنہا بھی اپنے چار بیٹوں کے ساتھ اس جنگ میں شریک تھی۔ اس نے اپنے بیٹوں میں جوشِ جہاد پیدا کیا۔ وہ مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کی خبر ملی تو خنساء رضی اللہ عنہا نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اسے چھ شہیدوں کی ماں ہونے کا اعزاز عطا کیا۔ نہ وہ روئی، نہ آنسو بہائے نہ اپنے بیٹوں کا مرثیہ کہا۔ اس سے پہلے وہ ساری عمر اپنے بھائی صخر کی موت پر مرثئے کہتی رہی تھی اور اسی مرثیہ گوئی سے اس کی سارے عرب میں شہرت تھی۔

ابو محجن ثقفی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ابو محجن ثقفی رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے شراب نوشی کے الزام میں اسے اپنے ہیڈ کوارٹر والے محل کے ایک نچلے کمرہ میں پابزنجیر کر کے قید کر رکھا تھا کہ جنگ کے خاتمہ پر اس کے معاملے کی تحقیق کر کے فیصلہ کریں گے۔ ابو محجن رضی اللہ عنہ کے کمرے کی کھڑکی سے میدان جنگ کا منظر دکھائی دیتا تھا، وہ مجاہدوں کو تلواریں، نیزے، تیر چلاتے، جان کی بازی لگاتے، مارتے مرتے دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف سے اسے اسلامی فوج کا پہلو دبتا نظر آ رہا تھا اور وہ یہ منظر دیکھ دیکھ کر بے تاب و بے قرار ہو رہا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیوی سلمٰی (جو پہلے حضرت مثنیٰ بن حارثہ کے نکاح میں تھیں۔ ان کی وفات کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کیا تھا) ادھر سے گزریں تو ابو محجن رضی اللہ عنہ نے ان سے درخواست کی کہ خدا کے لئے میرے ہاتھ پاؤں کھول دو اور مجھے آزاد کر کے ہتھیار وغیرہ دے دو تا کہ میں میدان جنگ میں جا کر دوسرے مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑ سکوں، اگر زندہ رہا تو جنگ کے خاتمہ پر آ کر زنجیریں دوبارہ پہن لوں گا۔'' سعد رضی اللہ عنہ کے حکم کی وجہ سے سلمٰی نے انکار کر دیا۔ ابو محجن رضی اللہ عنہ بڑا عمدہ شاعر تھا۔ اس نے بڑے حسرت ناک انداز میں شعر پڑھنے شروع کئے:

''اس سے بڑھ کر اور کیا غم ہو سکتا ہے کہ سوار تیزہ بازی اور تیغ زنی کر رہے ہیں اور میں زنجیروں میں بندھا پڑا ہوں جب میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں تو زنجیر روک لیتی ہے اور دروازے اس طرح بند کر دیئے جاتے ہیں کہ پکارنے والا پکارتے پکارتے تھک جاتا ہے اور کوئی نہیں سنتا۔''

سلمٰی دوبارہ ادھر سے گزریں تو ابو محجن رضی اللہ عنہ کے اشعار سن کر ان کا دل پگھل گیا۔ انہوں نے سعد رضی اللہ عنہ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے ابو محجن رضی اللہ عنہ کو نہ صرف رہا کر دیا۔ بلکہ سعد رضی اللہ عنہ کے ہتھیار اور گھوڑا بھی انہیں دے دیا۔ ابو محجن رضی اللہ عنہ نے ہتھیار اور گھوڑا لے کر اپنا منہ سر لپیٹا اور غراتے ہوئے شیر کی طرح دشمن پر اس زور سے حملہ کیا کہ

صفیں کی صفیں الٹ دیں اور پرے کے پرے کاٹ کر رکھ دیئے۔ گھوڑے کو کاوا دے کر جدھر سے نکل جاتا۔ دشمن کا ٹڈی دل کائی کی طرح پھٹ جاتا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بالا خانے سے یہ منظر دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ اچانک غیب سے نمودار ہونے والا یہ جری مجاہد کون ہے، ہتھیار اور گھوڑا میرے معلوم ہوتے ہیں اور حملے کا انداز ابو محجن کا سا ہے لیکن وہ تو قید میں پڑا ہے! جب رات کو جنگ رکی تو ابو محجن نے واپس آ کر پھر سے بیڑیاں پہن لیں، جب سعد رضی اللہ عنہ کو ابو محجن رضی اللہ عنہ کی کارگزاری معلوم ہوئی تو کہا ''خدا کی قسم! میں ایسے جانباز کو سزا نہیں دے سکتا۔ سارا واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا۔ وہاں سے حکم آیا کہ اگر ابو محجن آئندہ کے لئے توبہ کرے تو اسے سزا نہ دی جائے۔ حکم سن کر ابو محجن نے کہا ''خدا کی قسم! آئندہ میں کبھی شراب کے نزدیک نہ جاؤں گا۔''[1]

اس واقعہ نے ابو محجن رضی اللہ عنہ اور سلمٰی دونوں کو اسلامی تاریخ میں زندۂ جاوید کر دیا

اس سے پہلے مسلمانوں کو دشمن کی اتنی بڑی تجربہ کار، مسلح اور ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ، جنگی ہاتھیوں والی فوج سے ایسی شدید اور خونریز جنگ کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن بالآخر مسلمانوں کی قوت ایمانی، جوش جہاد، شوق شہادت اور عزم و استقبال کے سامنے ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ رستم ایک عام مسلمان سپاہی ہلال بن علقمہ کے ہاتھوں مارا گیا۔[2] ایرانی جانیں بچانے کے لئے افراتفری میں جدھر منہ آیا بھاگنے لگے۔ اس جنگ میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار مسلمان شہید ہوئے اور تقریباً تیس ہزار ایرانی مارے گئے۔ بچی کھچی ایرانی فوج شمال کی طرف بھاگ گئی۔ جنگ قادسیہ نے عراق عرب اور عراق عجم کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ یہ علاقے مکمل طور پر اسلام کے زیر اقتدار آ گئے۔ ان علاقوں کے اکثر عیسائی عرب قبائل مسلمان ہو گئے۔ پارسیوں نے بھی اسلام کی طرف رغبت کی یا جزیہ دینا قبول کیا۔ دیہاتی اور غیر جنگی آبادی کو مسلمانوں نے کچھ نہیں کہا۔ اس جنگ میں درفش کاویانی بھی مسلمان کے ہاتھ آیا جو کاوہ لوہار نے ضحاک (عربی) کے خلاف فریدوں (ایرانی) کی حمایت میں بغاوت کرتے وقت تیار کیا تھا اور اسے ہزاروں سال سے بابرکت اور فتح و نصرت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ابتدا میں یہ جھنڈا چیتے کی کھال سے بنی ہوئی لوہار کی دھونکنی سے بنایا گیا تھا۔ لیکن اب ہیرے، جواہرات سے مزین تھا جن کی قیمت کا اندازہ ایک لاکھ دینار لگایا گیا۔ میدان جنگ سے جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا اس میں سے ہر مجاہد کے حصے میں چھ چھ ہزار درہم آئے۔ اس سے پہلے کبھی اتنا حصہ کسی کو نہ ملا تھا۔

---

[1] طبری اور بعض دوسرے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ابو محجن نے شراب نہیں پی تھی۔ صرف شراب کی تعریف میں اشعار پڑھے تھے جیسا کہ دوسرے شاعروں نے بھی ایسا کیا ہے، اسے شراب نوشی پر محمول کر لیا گیا۔ مؤلف

[2] شاہنامہ کے مصنف ابوالقاسم فردوسی نے اپنی رزمیہ نظم میں یہ دکھایا ہے کہ رستم انفرادی جنگ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ چونکہ سعد رضی اللہ عنہ مشہور تیر انداز تھے اس لئے فردوسی کو یہ قرین قیاس معلوم ہوا کہ سعد رضی اللہ عنہ کی تیر اندازی سے رستم ہلاک ہوا۔ اس کی ایرانیت اور نسلی تعصب اس کے اسلام اور حق گوئی پر غالب آ گئے۔ اس نے نہ چاہا کہ رستم ایک معمولی مجاہد کے ہاتھوں مارا جائے، دراصل ایرانیوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو فتح ایران اور ایرانی سلطنت کے خاتمہ کے لئے معاف نہیں کیا۔ مؤلف

بابل۔کوثی۔بہرہ شیر

تقریباً دو ماہ بعد جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی صحت بحال ہوگئی اور وہ گھوڑ سواری اور فوجی نقل وحرکت کے قابل ہو گئے تو انہوں نے بابل کا رخ کیا جہاں بچی کھچی ایرانی فوج ہرمزان، فیروزان اور مہران کی زیر قیادت جمع ہوگئی تھی۔لیکن پھر شکست کھا کر تتر بتر ہوگئی۔سعد رضی اللہ عنہ بابل میں خیمہ زن ہو گئے۔فوجی دستے چاروں طرف پھیلا دیئے اور دریائے دجلہ اور فرات کا پچاس میل چوڑا درمیانی علاقہ دشمنوں سے خالی کرالیا۔علاقے کے سرکردہ زمیندار، جاگیردار اور قبائلی سردار آ آ کر اظہارِ اطاعت وفرمانبرداری کرنے لگے۔سعد رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت زہرہ بن حویہ رضی اللہ عنہ نے کوثی کے تاریخی شہر پر حملہ کیا اور وہاں کے حاکم شہریار کو قتل کر کے شہر پر قبضہ کرلیا۔مقامی روایات کے مطابق یہ وہی جگہ تھی جہاں نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قید کیا تھا۔قید خانہ کی جگہ اب تک موجود اور محفوظ تھی، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بابل سے جا کر اس کی زیارت کی، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجا اور پھر یہ آیت پڑھی وتلک الایام نداولها بین الناس

(اور ہم زمانے کو لوگوں کے درمیان گھماتے، ادلتے، بدلتے رہتے ہیں)

کوثی سے آگے ایک مستحکم قلعہ بہرہ شیر تھا جہاں شاہ ایران کا ایک خاص مہیب اور زور آور پالتو شیر رکھا جاتا تھا۔اسلامی لشکر وہاں پہنچا تو شیر کو حملہ کے لئے چھوڑ دیا گیا۔سعد رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ نے تلوار کے ایک ہی وار سے اسے دو ٹکڑے کر دیا۔انہوں نے ہاشم کی پیشانی چوم لی۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ وہاں دو مہینے مقیم رہے اس اثناء میں ایرانی شہر کو خالی کر کے چپکے سے نکل گئے اور دریا کا پل عبور کر کے مشرقی مدائن میں جمع ہو گئے تھے جہاں شہنشاہ یزدگرد موجود تھا۔بہرہ شیر مدائن کا مغربی حصہ تھا جو دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر آباد تھا۔ایرانیوں نے پل توڑ ڈالا تا کہ مسلمان دریا عبور کر کے خاص مدائن (مشرقی حصہ) پر حملہ نہ کرسکیں۔یزدجرد نے بہرہ شیر (مغربی مدائن) پر مسلمانوں کے قبضہ کی خبر سن کر اپنے اہل وعیال اور خزانوں کو حلوان بھیج دیا اور خود بھی فرار کی تیاریاں کرنے لگا۔

مدائن کی فتح (۱۵ ہجری)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدائن پر پیش قدمی کی اجازت آ گئی۔گرمی کا موسم تھا اور دجلہ طغیانی پر تھا۔ایرانیوں نے پل تباہ کرنے کے علاوہ گھاٹ پر سے کشتیاں بھی ہٹالی تھیں یا تباہ کردی تھیں۔دوسرے کنارے پر فوج تعینات کر دی تھی، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ہر صورت میں دریا عبور کرنے کا ارادہ کرلیا۔دریا عبور کرنے کے ظاہری اور عام وسائل نہ پا کر انہوں نے اللہ کا نام لے کر حسبنا اللہ ونعم الوکیل کہہ کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور پھر پوری فوج نے دریا میں گھوڑے دوڑا دیئے۔اور وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، صف بندی کے انداز میں، ایک دوسرے سے باتیں کرتے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف بڑھے۔دریا کی طغیانی کے باوجود کسی قسم کا جانی، مالی نقصان نہ ہوا۔مسلمانوں کو دریا کی طوفانی لہروں سے کھیلتے اطمینان سے آگے بڑھتے دیکھ کر دوسرے کنارے پر تعینات

فوجی دستے انگشت بدنداں رہ گئے۔ ہیبت اور خوف نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا اور وہ ''دیواں آمدند، دیواں آمدند'' کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک فوجی دستے نے کچھ مزاحمت کی مگر بے سود۔ لشکر اسلام کسریٰ کے مشہور اور عالی شان قصر سفید میں داخل ہو گیا۔ آخری کسریٰ ہمیشہ کے لئے اس عظیم نوشیروانی محل کو خیر باد کہہ کر حلوان کی طرف جا چکا تھا۔ اگرچہ مغربی مدائن پر ۱۵ ہجری کے آخر میں اسلامی قبضہ ہو گیا تھا لیکن طبری کے مطابق مشرقی مدائن میں مسلمانوں کا داخلہ صفر ۱۶ ہجری میں ہوا۔ شہر خالی پڑا تھا۔ ایرانی شہنشاہ، اس کے ساتھی امراء وزراء، سالاران فوج اور متمول شہری جو مال واسباب، خزانے لے جا سکتے تھے لے گئے۔ اس کے باوجود بے حد قیمتی اسباب وسامان شاہی محلات میں موجود تھا۔ زرنگار عظیم الشان محلات اور شاندار اور خوبصورت باغات کو دیکھ کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عبرت ہوئی انہوں نے شاہی محلات کا چکر لگایا۔ چاروں طرف افسردگی اور سناٹے کا عالم تھا کسریٰ کی ہزار سالہ شاہانہ عظمت وسطوت سرنگوں ہو چکی تھی۔ وہ باجبروت ایرانی سلطنت جس نے پندرہ بیس سال پہلے دنیا کی دوسری عظیم بازنطینی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اب خود نزع کے عالم میں تھی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی دنیا کی بے ثباتی کے اس منظر سے بہت متاثر ہوئے۔ سعد رضی اللہ عنہ کی زبان سے بے اختیار سورہ دخان کی آیات ۲۵ اور ۲۹ نکلیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

''کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام، اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پس نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ انہیں مہلت دی گئی۔''

مدائن سے مسلمانوں کو اربوں دینار کا مالِ غنیمت حاصل ہوا جس میں عقل انسانی کو دنگ کرنے والی بیش قیمت اشیا اور نادر ونایاب عجوبے شامل تھے ان میں مشہور زمانہ طلائی تخت بہار بھی شامل تھا جس کا رقبہ ساٹھ مربع گز تھا اور جو گراں بہا لعل وجواہر سے مرصع تھا۔ خالص سونے کے گھوڑے اور اونٹ بھی تھے جن کے سینوں پر یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ ان کے سوار اور ساربان بھی سونے کے تھے اور سر پر ہیروں کے تاج۔ نوشیرواں کا زرنگار مرصع تاج، اس کے خوبصورت جڑاؤ کنگن[1] گزشتہ بادشاہوں کے جڑاؤ خنجر اور تلواریں سونے اور چاندی کے پیالے اور بے شمار دوسرے عجائبات۔ سرکاری خزانے اور عجائبات کے علاوہ بھاگ جانے والے اہل شہر کے گھروں سے بھی بے اندازہ قیمت کے کپڑے، جواہرات وزیورات، عطریات ہاتھ آئے۔

مجاہدین کی دیانت کا یہ عالم تھا کہ جس کے جو چیز ہاتھ لگی سب نے ایک جگہ لا کر جمع کرا دی۔ ایک مجاہد کو جواہرات سے بھرا ہوا صندوقچہ ملا جو اس نے بجنسہ لا کر جمع کرا دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حیرت سے اس کا نام پوچھا مگر اس نے بتانے سے انکار کر دیا اور جلدی سے جا کر دوسرے مجاہدوں میں مل گیا تا کہ اسے کوئی پہچان نہ سکے، سعد رضی اللہ عنہ نے تمام نوادرات اور بیش قیمت اشیا بجنسہ مدینہ روانہ کر دیں جو خمس کے علاوہ تھیں۔ نوادرات کے یہ

[1] یہ کنگن جب مدینہ پہنچے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سراقہ بن جعشم رضی اللہ عنہ کو پہنائے۔ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ کسریٰ اعظم کے کنگن اور ایک بادیہ نشین عرب کے ہاتھوں میں! دیکھنے والوں نے یہ منظر عبرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ مولف

خزانے دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ قوم جس نے یہ چیزیں بھیجی ہیں نہایت ہی دیانتدار ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''چونکہ آپ خود دیانتدار ہیں اس لئے رعایا بھی دیانتدار ہے'' (کرپشن، بددیانتی ہمیشہ اوپر سے شروع ہوتی ہے) سب چیزیں ٹکڑے کر کے اہل مدینہ میں تقسیم کردی گئیں۔ جبکہ ہر مجاہد کے حصے میں بارہ ہزار درہم مالِ غنیمت میں سے آئے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قصر ابیض کے وسیع و عظیم ایوان کسریٰ کو نماز باجماعت کے لئے مخصوص کردیا پہلا جمعہ آیا تو وہیں خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ ایوان میں تصاویر اور نقوش تھے جنہیں برقرار رہنے دیا گیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے امن و امان کی منادی کرادی۔ گردونواح کے بڑے بڑے رئیسوں اور جاگیرداروں نے اطاعت قبول کرلی۔ جو لوگ گھر بار چھوڑ کر پناہ گاہوں کی تلاش میں نکل گئے تھے وہ سب واپس آگئے اور فاتحین کا حسن سلوک، انصاف اور رواداری دیکھ کر اسلام قبول کرنے لگے۔ جنہوں نے اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہا وہ ذمی بن گئے۔ جلدی ہی آپس میں اتنا ربط وضبط پیدا ہوگیا کہ باہم رشتے ناطے ہونے لگے تا آنکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آج کل کی اصطلاح میں ''ترقی یافتہ'' ایرانی عورتوں سے سادہ مزاج مجاہدین کے نکاح کی حوصلہ شکنی کرنی پڑی کیونکہ انہیں اندیشہ ہوا کہ ایرانی عورتیں سیدھی سادی عرب عورتوں کی جگہ نہ لے لیں۔

جلولا اور دیگر فتوحات

مدائن کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ علاقے کا نظم و نسق مستحکم کرنا شروع کیا۔ لیکن یزدگرد نے حلوان پہنچ کر ایک بڑی فوج جمع کرلی۔ قادسیہ اور مدائن سے بھاگے ہوئے فوجی سالار بھی وہاں پہنچ گئے اور مسلمانوں سے دوبارہ جنگ آزمائی کے لئے جلولا[1] کے مستحکم قلعہ کو فوجی کارروائیوں کا مرکز بنایا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حالات لکھ بھیجے اور پیش قدمی کی اجازت مانگی جو دے دی گئی۔ قعقاع رضی اللہ عنہ اور ہاشم رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بارہ ہزار مجاہدین نے جلولا پر حملہ کیا طویل محاصرے کے بعد سخت خونریز جنگ ہوئی اور مسلمان فتح یاب ہوئے۔ تقریباً ایک لاکھ ایرانی مارے گئے۔ بے شمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ ہزاروں ایرانی قیدی بنا لئے گئے۔ لیکن خلیفہ کے حکم سے انہیں آزاد کردیا گیا۔ یزدگرد حلوان سے رے کی طرف بھاگ گیا اس کے بعد مسلمانوں نے حلوان، تکریت، موصل، حت قرقیشیا اور ماسبذان بھی فتح کرلئے۔ وہاں کے بدوی عرب قبائل حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے۔ یزدگرد پر آخری ضرب لگانے کے لئے سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آگے بڑھنے اور اس کا تعاقب کرنے کی اجازت مانگی لیکن جواب آیا کہ ''دولت و حکومت کے مقابلے میں مجھے مسلمانوں کا خون زیادہ عزیز ہے۔ کاش ہمارے اور ایرانیوں کے درمیان آگ کا دریا حائل ہوتا۔ نہ وہ ہماری طرف بڑھتے نہ ہم ان کی طرف۔ فی الحال تم آگے نہ بڑھو اور مفتوحہ علاقوں کا نظم و نسق درست کرو۔''

---

[1] بغداد سے چھیانوے میل دور جانب مشرق۔ آج کل اسے قرلز باہط کہتے ہیں۔ مولف

گورنری۔ نظم ونسق

اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فوج کی سپہ سالاری چھوڑ کر مفتوحہ علاقے کی گورنری سنبھالی۔ حکومت کا صدر مقام مدائن ہی رہا۔ عراق عرب کے بدو قبائل کی اکثریت نے بطیب خاطر اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کی طرف سے حکومتی نظم ونسق کی راہ میں کوئی دشواریاں نہیں پیدا کی گئیں۔ البتہ ان کی تسلی بخش طریقے سے آباد کاری کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کے برعکس خالص ایرانی نژاد آبادی۔ خاص کر اس کا اعلیٰ طبقہ...... جو اپنے آپ کو حاکم قوم سمجھتی آئی تھی، ابھی تک پورے طور پر نئے انقلاب سے سمجھوتہ نہیں کر پائی تھی اور نظم ونسق میں رکاوٹیں پیدا کرتی تھی کوئی ملک فتح کرنے کے مقابلے میں اس پر بہترین طریقے سے حکمرانی کرنا اور اس کا نظم ونسق چلانا شاید زیادہ ہی مشکل ہے یا کم سے کم اتنا ہی مشکل۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے باوجود اس کے کہ انہیں پہلے سے ملکی نظم ونسق چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا، بڑی قابلیت اور دوراندیشی سے ملکی انتظام کیا اور نئی حکومت کے اصول اسلام کی روشنی میں مرتب کئے۔ وہ ایک کامیاب سپہ سالار تھے، ہی گورنر کی حیثیت سے بھی بڑے کامیاب رہے۔ انہوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ہدائت کے مطابق سارے عراق کی مردم شماری کرائی اور اراضی کی پیمائش بھی۔ اسلام میں یہ پہلی مردم شماری اور پیمائش اراضی تھی۔ دربارِ خلافت کے فیصلے کے مطابق تمام اراضی کو سابق مالکوں اور کاشتکاروں کے قبضے میں رہنے دیا۔ البتہ جن زمینوں کا کوئی مالک نہ تھا۔ وہ سرکاری اراضی قرار دی گئیں اور مستحق اور اہل لوگوں کو زراعت کے لئے تفویض کر دی گئیں۔ ان میں سے مسلمان مجاہدین کو بھی الاٹ کی گئیں اور مدینہ کے بعض سرکردہ اصحاب کو بھی۔ زمینوں کے لگان اور جزیہ کی وصولی کے قوانین نافذ کئے گئے۔ نادار بوڑھے اور معذور ذمیوں کو جزیہ کی وصولی سے بری کر دیا گیا بلکہ حکومت کی طرف سے ان کے نان ونفقہ کا بندوبست کیا گیا۔ کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ البتہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقا کے حسن خلق، حسن سلوک اور عدل پسندی سے متاثر ہو کر بڑے بڑے ایرانی رئیس، جاگیردار اور مرزبان خودبخود مسلمان ہو گئے۔ دیلم کا شاہی رسالہ جو چار ہزار سپاہیوں اور افسروں پر مشتمل تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہو کر خودبخود مسلمان ہو گیا۔

کوفہ کی تعمیر (۱۷ ہجری)

مدائن دجلہ کے کنارے واقع تھا۔ اس کی مرطوب اور شہری آب وہوا عرب کے صحرانشینوں کو راس نہ آئی اور ان کی صحت پر اس کا برا اثر پڑا۔ وہ کمزور ہو گئے، چہرے زرد اور صورتیں بدل گئیں۔ جب ان کا ایک وفد مدینے پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے کمزور جسم اور زرد چہرے دیکھ کر متاثر ہوئے۔ وفد نے انہیں بتایا کہ مدائن کی آب وہوا انہیں راس نہیں آئی حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بھی اسی مضمون کا خط ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواباً لکھا کہ ”عربوں کی حالت اونٹ کی سی ہے۔ انہیں ایسی جگہ راس نہیں آتی جو اونٹ کو راس نہ آئے۔ تم ان کے لئے کوئی اور جگہ تلاش کرو۔ لیکن میرے اور ان کے درمیان سمندر حائل نہ ہو۔ بری اور بحری دونوں راستوں سے وہاں تک رسائی ممکن ہو۔ درمیان میں کوئی دریا نہ پڑتا ہو۔“ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے حکم پر حضرت

حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دریائے فرات کے مغربی کنارے پر قدیم شہر حیرہ سے چند میل جانب جنوب زمین کا انتخاب کیا۔ جو ریتلی اور کنکریلی تھی۔ صحرائے بے گیاہ سے ہٹی ہوئی اور مرطوب زمین سے بلند تھی۔ دریا کا کنارہ ہونے کی وجہ سے سبزہ وگل کا منظر نہایت خوش نما تھا۔ تکوف کے معنی اجتماع بیان کئے گئے ہیں اور یہ بھی کہ ریتلی زمین کے مستدیر ٹکڑوں کو کوفان کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک ''کوفہ'' ایسی زمین ہے جس میں مٹی اور ریت کے ساتھ بجری ملی ہوئی ہو۔ اس نئے اسلامی شہر کی بنیاد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے رکھی تو اس کا نام کوفہ پڑ گیا۔ سبزہ وگل کی فراوانی اور منظر و ماحول کی خوبصورتی کی وجہ سے عربوں نے اسے ''خدالعذرا'' (عارض محبوب) بھی کہنا شروع کر دیا۔

یہ پہلا شہر تھا جو اسلام کی تاریخ میں آباد کیا گیا۔ شہر کی تعمیر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کی گئی۔ ایک پارسی ماہر تعمیرات روزبہ کی خدمات سے استفادہ کیا گیا۔ اس کا نقشہ مربع شکل کا تھا۔ وسط شہر میں ایک وسیع و عریض جامع مسجد تعمیر کی گئی۔ جس میں بیک وقت تقریباً چالیس ہزار افراد کے لئے نماز پڑھنے کی گنجائش تھی۔ مسجد سے ملحق بیت المال اور گورنر کا مکان تھا جو قصر سعد رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور ہوا۔ ایک مہمان خانہ عام بھی بنایا گیا جس میں بیرونجات سے آنے والے قیام کرتے تھے۔ شہر کی سڑکیں کشادہ اور سیدھی بنائی گئیں۔ مختلف قبیلے الگ الگ محلوں میں آباد کئے گئے جو زیادہ تر جنوبی عرب بالخصوص اہل یمن سے تھے۔ ابتداً تقریباً ایک لاکھ کی آبادی کی گنجائش رکھی گئی لیکن جلدی ہی یہ آبادی دو لاکھ تک پہنچ گئی۔ اور پھر کئی گنا ہوگئی۔ یہ شہر اسلام کی طاقت کا مرکز اور زبردست چھاؤنی بن گیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے ہی میں اس نے بڑی سرعت سے عظمت وشان کے مرحلے طے کئے۔ چنانچہ وہ اسے ''راس الاسلام'' کہتے تھے۔ تقریباً چالیس ہزار مجاہدین ہر وقت اس چھاؤنی میں جمع رہتے تھے، بعد کی اسلامی تاریخ میں اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے اپنا دارالخلافہ قرار دیا اور اسی شہر میں شہادت پائی۔ ابن بطوطہ کے زمانے تک حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے تعمیر کردہ دارالامارت کے کھنڈر باقی تھے۔ وہ کوفہ کی جامع مسجد اور خوبصورت بازاروں کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ شہر ''اب سرکشوں کی دست درازی کے باعث ویران ہو گیا ہے۔'' ولیم میور کے بقول اسلامی ادب، دینیات اور سیاست پر جو اثر کوفہ اور بصرہ نے ڈالا وہ باقی دنیائے اسلام کے مجموعی اثر سے کہیں بڑھ کر ہے۔'' اب یہ عراق کا ایک معمولی سا شہر ہے زیادہ تر زائروں کی زیارت گاہ۔ بنو عباس کے عہد میں بغداد نے اس کی جگہ لے لی، بہر حال حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے دنیائے اسلام میں سب سے پہلے ایک عظیم اور اہم شہر بڑے سلیقے اور منصوبہ بندی سے آباد کیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے خلاف شکایات اور تحقیقات

حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنی گورنری کے زمانے میں اہل کوفہ سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے ان کی ضروریات کا خیال رکھتے اور ان کی شکایات رفع کرتے تھے۔ تاہم بعض شورہ پشت اور خیرہ سر اشخاص نے آپ کے خلاف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس شکایات پیش کیں۔ جو یہ ہیں:

۱- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ کے گورنر حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر مقرر کر کے ایرانیوں سے آخری فیصلہ کن جنگ (نہاوند) کے لئے روانہ کیا خلیفہ کے حکم سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ان کے لئے کوفہ سے امدادی دستے بھیجنے پڑے۔ کوفہ کی ایک جماعت کو یہ ناگوار گزرا اور انہوں نے کہا کہ عامل بصرہ نے ناحق یہ نئی لڑائی اپنے سر لے لی ہے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے ان معترضین کی شکایت خلیفہ کو لکھ بھیجی۔ اس بناء پر ایک شخص جراح بن سنان اور اس کے چند ساتھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے مخالف ہو گئے۔ انہوں نے مدینہ جا کر خلیفہ کے سامنے سعد رضی اللہ عنہ کے خلاف طرح طرح کی شکایتیں کیں۔ سب سے اہم شکایت یہ تھی کہ سعد رضی اللہ عنہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھاتے۔

۲- سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے محل کے سامنے ڈیوڑھی تعمیر کرا کر پھاٹک لگا دیا ہے۔ اس لئے اہل حاجت ان سے نہیں مل سکتے۔

۳- حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو تحقیقات کے لئے کوفہ بھیجا۔ وہ کوفہ کی جامع مسجد اور دوسری مسجدوں میں جا کر لوگوں سے ملے اور حالات پوچھے۔ سب نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی خوبیاں بیان کیں۔ البتہ ایک شخص ابوسعدہ نے کہا کہ ”سعد رضی اللہ عنہ نہ مساوات کے ساتھ تقسیم کرتے ہیں اور نہ کسی نزاع میں انصاف کرتے ہیں۔“

سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا

یہ سن کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ”اے اللہ! اگر یہ شخص جھوٹا ہے تو اس کی عمر دراز کر اسے ہمیشہ مفلس رکھ، اسے اندھا کر دے اور اسے فتنوں میں مبتلا کر“ سعد رضی اللہ عنہ کی یہ بددعا اس شخص کے حق میں پوری ہوئی۔ لوگوں نے اسے کوفہ کی گلیوں میں رلتے اور ذلیل ہوتے دیکھا کوئی حال پوچھتا تو کہتا کہ ”سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا لگ گئی“[1]

نماز کے متعلق شکایت بھی غلط نکلی البتہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے مکان کے آگے ڈیوڑھی موجود تھی جسے خلیفہ کے نمائندہ نے آگ لگا کر جلا دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ خاموش دیکھتے رہے۔ دراصل ڈیوڑھی بنوا کر عوام کو اپنے سے دور رکھنا مقصود نہ تھا۔ سعد رضی اللہ عنہ کا مکان بازار کے عین وسط میں تھا۔ بازار کے شور و شغب کی وجہ سے سخت کوفت ہوتی تھی اور گھر کے اندر بیٹھ کر ایک دوسرے کی بات تک سننا مشکل تھا۔ شکایت کرنے والوں نے ڈیوڑھی کی تعمیر کو غلط رنگ میں پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خوف ہوا کہ ڈیوڑھی گورنر اور اہل حاجت کے درمیان حائل نہ ہو جائے اور پھر دوسرے صوبوں کے گورنر بھی ایسی ڈیوڑھیاں بنوا کر اپنے آپ کو عوام سے دور نہ کر لیں۔

اہل کوفہ کے حق میں بددعا

کوفہ والوں کے غیر ذمہ دارانہ، کاذبانہ، معاندانہ اور احسان فراموشانہ رویہ سے بددل ہو کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان کے حق میں بددعا کی کہ ”الٰہی! نہ ان سے کوئی گورنر خوش رہے اور نہ یہ کسی گورنر سے خوش رہیں۔“ تاریخ

[1] صحیح بخاری بہ روایت عبدالملک باب وجوب القراۃ الامام والماموم فی الصلوٰۃ

بتاتی ہے کہ یہ بددعا بھی قبول ہوئی۔

حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی تحقیقات سے پہلے فتح قادسیہ کے ایک ہیرو عمرو بن معدیکرب مدینہ گئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ ''کیا لوگ سعد رضی اللہ عنہ سے خوش ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا کہ ''میں نے سعد رضی اللہ عنہ کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ لوگوں کے لئے چیونٹی کی طرح دانہ دانہ جمع کرتے اور مہربان ماں کی طرح شفقت کرتے ہیں۔ مساوات کے ساتھ تقسیم کرتے قضیوں میں عدل کرتے اور قابلیت کے ساتھ جہاد کرتے ہیں۔''

گورنری سے علیحدگی

اگرچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے خلاف شکایات غلط ثابت ہوئیں تاہم کوفہ میں مخالف گروہ کی موجودگی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں وہاں بحیثیت گورنر برقرار رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ آئے تھے اور مدینہ ہی میں رہ گئے۔ وہاں خود فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان سے امامت نماز کے متعلق پوچھا اور جواب سے مطمئن ہو کر فرمایا ''بے شک تمہاری نسبت یہی خیال ہو سکتا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا نصف اثاثہ بیت المال میں داخل کر دیا جیسا کہ بعض دوسرے امراء لشکر اور گورنروں کے ساتھ کر چکے تھے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اس کا افسوس نہ تھا لیکن نماز کے متعلق لغو الزام کا بہت افسوس ہوا۔ کہا کرتے تھے کہ ''میں عرب میں سب سے پہلا شخص ہوں جس نے راہ خدا میں تیر اندازی کی۔ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ درختوں کے سوکھے پتے کھا کھا کر دشمنوں کے خلاف لڑتے تھے، لیکن خدا کی شان آج یہ بنو اسد پیدا ہوئے ہیں جو خود مجھے مذہب سکھاتے ہیں کہ میں نماز اچھی طرح نہیں پڑھاتا۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ ۲۱ ہجری تک کوفہ کے گورنر رہے۔

متفرق انتظامات

اہل انبار نے اپنی زرعی زمینوں کے لئے پانی کی کمی کی شکایت کی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان کے لئے دریائے فرات سے نہر کھدوانا شروع کی لیکن کچھ تو درمیان میں پہاڑ آجانے اور کچھ ان کی گورنری کا عہدہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ آخر حجاج بن یوسف کے زمانے میں مکمل ہوئی۔ لیکن نہر سعد رضی اللہ عنہ ہی کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تقلید میں بصرہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے دریائے دجلہ سے اہل بصرہ کے لئے نہر کھدوائی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک عمدہ اور قابل تقلید مثال قائم کی۔

کوفہ کی چھاؤنی میں ابتداء دس دس سپاہیوں پر ایک افسر ہوتا تھا اور وہی اپنے ماتحت سپاہیوں میں ان کی تنخواہیں تقسیم کرتا تھا۔ افسروں نے تنخواہوں کی تقسیم میں کچھ گڑبڑ اور بے قاعدگی کی۔ اہل فوج میں آزردگی اور بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے تحقیق کر کے نئے سرے سے عہدے اور تنخواہیں مقرر کیں اور سات سات سپاہیوں پر ایک افسر مقرر کیا فوج کا اطمینان واعتماد بحال ہو گیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ شہری اور فوجی معاملات کے بارے میں ہر وقت چوکنا رہتے تھے مفتوحہ علاقوں کے

اندرونی معاملات کے لئے سرحد اور سرحد پار کے واقعات پر بھی نظر رکھتے اور ان سے باخبر رہتے اور حسب ضرورت دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی امداد کے لئے بھی کوفہ چھاؤنی سے فوجی دستے بھیجا کرتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کوئی ناراضگی نہ تھی نہ انہوں نے کسی بددیانتی یا نااہلی کی بنا پر انہیں گورنری سے معزول کیا البتہ وہ کوفہ میں پارٹی بازی اور افتراق کی فضا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے دل میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت تھی بلکہ اپنے بعد سعد رضی اللہ عنہ کو خلافت کا بھی اہل سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شہادت کے وقت خلیفہ کے انتخاب کے لئے جو انتخابی مجلس قائم کی سعد رضی اللہ عنہ کو اس کا رکن مقرر کیا اور اپنے جانشین کو وصیت کی کہ اگر سعد رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب نہ ہوں تو انہیں والی (گورنر) ضرور بنایا جائے۔ میں نے انہیں کسی خیانت یا نااہلی کی بنا پر برطرف نہیں کیا تھا۔"

خلافت عثمان رضی اللہ عنہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد نئے خلیفہ کے انتخاب کے سلسلے میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے حق انتخاب سے برضا و رغبت دستبردار ہو گئے اور دوسرے ارکان مجلس کی طرح اپنا حق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور ان سے تعاون کرتے رہے۔

دوبارہ گورنری اور معزولی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت یاد تھی انہوں نے اپنی خلافت کے سال اول کے اختتام پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو پھر کوفہ کا گورنر بنا کر وہاں بھیج دیا۔ وہ وہاں تقریباً تین سال تک گورنر رہے اور عمدہ نظم و نسق کیا پھر عام روایت کے مطابق ۲۶ ہجری میں کوفہ کے بیت المال کے مہتمم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جھگڑا ہو گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے کچھ قرضہ لے رکھا تھا۔ ابن مسعود نے اس کی واپسی کا تقاضا کیا اور مہلت دینے سے انکار کر دیا۔ سعد رضی اللہ عنہ نے ان کے تقاضا اور ضد سے تنگ آ کر ان کے خلاف بددعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو وہ گھبرا گئے۔ کیونکہ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے حق میں دعا کی تھی کہ "اے اللہ! سعد رضی اللہ عنہ کی دعا قبول فرما اور اس کی تیر افگنی درست رکھ۔" رسول اکرم ﷺ کی اس بابرکت دعا نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مستجاب الدعوات بنا دیا تھا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو ان کی مستجاب الدعواتی کے بعض واقعات معلوم بھی تھے۔ اس لئے انہوں نے التجا کی کہ "اے سعد رضی اللہ عنہ! منہ سے اچھا کلمہ نکالنا۔" سعد رضی اللہ عنہ نے بددعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے کر لئے۔ جب یہ قضیہ دربارِ خلافت تک پہنچا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دونوں سے اظہار ناراضگی کیا اور دونوں کو اپنے اپنے عہدوں سے معزول کر دیا۔[1]

لیکن مشہور مصری مؤرخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس روایت کو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ بنی امیہ نے ہوسِ جاہ و حصولِ اقتدار کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر زور دیا کہ کوفہ جیسے اہم ترین صوبے کا گورنر ان کے قبیلے کے کسی رکن کو

[1] الاستیعاب جلد ۲ تذکرہ سعد رضی اللہ عنہ، سیر الصحابہ، مصنفہ معین الدین ندوی

بنایا جائے۔ چنانچہ بنی امیہ کے ایک ایسے فرد کو گورنر مقرر کیا گیا جس کا ماضی اچھا نہ رہا تھا۔ کسی سرکردہ اور بزرگ صحابی کو اس منصب کے لئے منتخب نہیں کیا۔ چونکہ ایامِ فتنہ میں سعد رضی اللہ عنہ غیر جانبدار رہے اس لئے دونوں متحارب فریق سعد رضی اللہ عنہ سے کنارہ کش رہے اور کسی نے ان کی طرف سے صفائی پیش کی نہ الزامات کی جواب دہی اور مدافعت کی۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ جسے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے مجلس شوریٰ کے لئے پسند کیا ہو جسے منصب خلافت کا امیدوار بنایا ہو اور اگر خلیفہ نہ ہو سکے تو اس کا تعاون ضروری قرار دیا ہو وہ ایسی کمزوری دکھائے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ ممکن نہیں تھا کہ عوام کی بھلائی اور خیر خواہی کے خلاف کسی ایک شخص کے لئے ذاتی فائدہ کے خواہاں ہوں۔ انہوں نے تو ہمیشہ عام مسلمانوں کے مفاد کو مقدم رکھا۔ ان کی وصیت کہ سعد رضی اللہ عنہ سے کام لینا اور انہیں گورنر بنانا کا مطلب سعد رضی اللہ عنہ کو خوش کرنا یا ان کی طرف داری کرنا یا اپنے ساتھیوں پر انہیں مقدم کرنا نہ تھا بلکہ نئے خلیفہ اور مسلمانوں کو یہ مخلصانہ مشورہ تھا کہ سعد رضی اللہ عنہ کی قابلیت اور جنگی معاملات میں ان کی مہارت سے فائدہ اٹھانا۔ اس لئے کہ ایرانی علاقوں کے معاملات مسلمانوں کی منشا کے مطابق اطمینان بخش نہ تھے۔ ایرانی اقتدار کا بڑی حد تک خاتمہ ضرور ہو چکا تھا لیکن ابھی کسریٰ (یزدجرد) زندہ تھا اور ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ایران میں فتوحات کی ابتدا بڑی تیزی سے ہوئی لیکن عہد عمر رضی اللہ عنہ میں فتح کی تکمیل نہ ہو سکی۔ معرکہ قادسیہ کے مرد میدان سعد رضی اللہ عنہ ہی کسریٰ کے حکومت کے فاتح تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے آخری وقت میں چاہا کہ فتوحات کا جو سلسلہ سعد رضی اللہ عنہ نے شروع کیا تھا، وہی اس کی تکمیل کریں۔ اگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ زندہ رہتے تو گمان غالب ہے کہ سعد رضی اللہ عنہ کو پھر کوفہ بھیج دیتے جو شخص، ثلث اسلام، کہلائے، اسلام کا پہلا تیر انداز ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اپنے ماں باپ فدا کریں، اس سے خوش ہوں اور اسے ان دس آدمیوں میں شمار فرمائیں جن کے لئے جنت کی ضمانت دی گئی ہو۔ جو فاتح قادسیہ اور ایرانی سلطنت کا خاتمہ کرنے والا ہو جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس شوریٰ میں حاضری کا حکم دیا ہو جسے خلافت کا امیدوار بنایا ہو جسے خلافت نہ ملنے پر گورنر بنانے کی خواہش ظاہر کی ہو، ممکن نہیں کہ وہ بیت المال کے قرض کے بارے میں خواہ کم ہو یا زیادہ ٹال مٹول سے کام لے اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس پر شک وشبہ کریں اور عثمان رضی اللہ عنہ خفا ہو کر اس کے خلاف اقدام کا ارادہ کریں اور پھر بقایا وصول کر کے معاف کر دیں۔

دراصل یہ واقعہ ولید بن عقبہ بن ابی معیط[1] اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے درمیان پیش آیا جسے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے خلط ملط کر دیا گیا۔

اگرچہ متداول کتب تواریخ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے لیکن طٰہ حسین کی رائے بڑی وزنی اور دل لگتی ہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کی کشمکش کے دوران میں بہت سی جعلی روایات گھڑی گئیں۔ سعد رضی اللہ عنہ کچھ اپنی غیر جانبداری کی بنا پر...... کہ انہوں نے جمل اور صفین کے معرکوں میں یہ کہہ کر حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا کہ پہلے مجھے کوئی ایسی تلوار لا دو جو چلتے وقت مسلم اور کافر میں امتیاز کر سکے...... اور کچھ اپنے بیٹے عمر بن

[1] حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بعد کوفہ کے گورنر مقرر کئے گئے۔ مولف

سعد رضی اللہ عنہ سانحہ کربلا کے ایک کردار کی وجہ سے غلط اور من گھڑت روایات کی زد میں آ گئے۔ یا تو ان کی کردار کشی کی گئی یا انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی۔

واقعہ کی اصل صورت کچھ بھی ہو، اتنی بات یقینی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تین سال اور بروایت بعض ایک سال بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو گورنری سے معزول کر دیا اور پینتیس سالہ ولید بن عقبہ نے کوفہ جا کر ان سے امارت کا چارج لیا بلاذری کی روایت ہے کہ چارج حوالے کرتے وقت حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ولید سے کہا کہ ''یا تو میرے بعد عقل مند ہو گیا یا میں تیرے بعد احمق ہو گیا۔'' ولید نے جواباً کہا کہ ''ابواسحاق! ناراض نہ ہوں، یہ تو بادشاہی ہے، کبھی ایک کے حصے میں آتی ہے کبھی دوسرے کے۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''تم لوگ اسے واقعی بادشاہی بنا کر چھوڑو گے۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دو مختصر جملوں میں بہت کچھ کہہ دیا۔

بہر حال وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وفادار رہے اور ان کی مخالفت میں کبھی سرگرمی نہیں دکھائی۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف مخالفت بغاوت کی صورت اختیار کر گئی تو غیر جانبدار اور گوشہ نشیں ہو گئے۔ البتہ جب باغیوں نے خلیفہ کے مکان کا گھیراؤ کر لیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں سمجھانے اور انتہائی اقدام سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ پھر باغیوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کی جگہ انہیں خلافت کی پیشکش کی لیکن انہوں نے باغیوں کو جھڑک دیا اور صاف انکار کر دیا۔ وادیٔ عقیق میں ان کی کچھ زمین تھی وہاں ایک پختہ مکان بنوا کر گوشہ نشیں ہو گئے۔ کبھی کبھی اپنے اونٹ چرانے نکل جایا کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا انہیں بہت دکھ ہوا۔ ان کے بیٹے عمر اور بھتیجے ہاشم بن عتبہ نے لوگوں کو ان کی بیعت پر قائل کرنا چاہا اور کہا کہ ایک لاکھ تلواریں آپ کی حمایت پر آمادہ ہیں لیکن انہوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت اختیار کر لی۔

امورِ مملکت میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا۔ مسلمانوں کی باہمی جنگوں میں غیر جانبدار رہے بہر حال وہ صورتِ حالات پر متاسف تھے اور مسلمانوں کی باہمی خونریزی پر کڑھتے تھے۔ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے کسی قسم کی پریشانی یا مسئلہ پیدا نہیں کیا۔

جنگ صفین کے بعد جب معاہدہ تحکیم کا اعلان کیا گیا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب مسلمانوں کی باہمی خونریزی بند ہو جائے گی۔ فیصلہ کے دن بڑی امید کے ساتھ اذرح پہنچے لیکن جب وہاں کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا تو بڑے مایوس ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وکیل ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اے ابوموسیٰ تمہارے حال پر افسوس ہے تم عمرو کی چالوں کے مقابلے میں بڑے کمزور نکلے'' مدینہ واپس آ کر زندگی کے باقی ایام گوشہ تنہائی میں خاموشی سے گزار دیئے۔ آخری عمر میں بصارت جاتی رہی تھی۔

وفات

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ۵۵ ہجری میں وفات پائی۔ سترہ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے تھے۔ تیرہ سال بحالت اسلام مکہ میں اہل مکہ کے مظالم سہتے رہے۔ تیس سال کی عمر میں ہجرت کی۔ ہجرت کے بعد پچپن سال زندہ رہے اور اسلام کے لئے عظیم کارنامے سرانجام دیئے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر تقریباً پچاسی سال تھی۔ جب آپ کی وفات کی خبر عقیق سے مدینہ پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ جو امہات المومنین بقید حیات تھیں انہوں نے پیغام بھیجا کہ جنازہ مسجد نبوی میں پڑھا جائے تاکہ وہ بھی شریک ہوسکیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بے شمار دوسرے افراد کے علاوہ امہات المومنین نے بھی عشرۂ مبشرہ کے آخری بزرگ کی نماز جنازہ پڑھی۔ جنگ بدر میں جو جبہ پہن کر آپ نے جہاد کیا تھا وہ گزشتہ نصف صدی سے بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا تھا۔ وفات کے وقت وہ پرانا جبہ نکلوایا اور فرمایا کہ مجھے اسی کا کفن دینا۔ میں نے یہ اسی دن کے لئے محفوظ رکھا تھا، جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔ وفات کے وقت ڈھائی لاکھ درہم بطور ترکہ چھوڑے۔

حلیہ

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی عائشہ رضی اللہ عنہا کے مطابق وہ پست قامت، فربہ اندام اور قوی پنجہ تھے۔ سر بڑا اور انگلیاں موٹی تھیں۔ بال گھنے تھے۔ آخری عمر میں سیاہ خضاب لگاتے تھے۔ بعض روایتوں میں بلند قامتی اور چپٹی ناک کا ذکر ہے۔

ازواج واولاد

آج شائد یہ عجیب بات معلوم ہو لیکن اس زمانے کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور جنگی حالات میں عجیب نہ تھی اور نہ قابل اعتراض کہ خلفائے راشدین سمیت متعدد دیگر صحابہ کی طرح حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بھی وقتاً فوقتاً متعدد نکاح کئے۔ ان کی نو بیویوں کے نام کتب تاریخ میں ملتے ہیں۔ ان بیویوں سے ان کے سترہ یا اٹھارہ بیٹے اور اتنی ہی بیٹیاں ہوئیں آج کل کی ''اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور ماڈرن خواتین'' شاید خلفاء اور عشرۂ مبشرہ کے دوسرے بزرگوں کی کثرتِ ازواج پر ناک بھوں چڑھائیں اور اعتراض کریں۔ لیکن یہ الگ موضوع ہے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سب سے بڑے بیٹے کا نام اسحاق تھا۔ انہی کے نام پر آپ کی کنیت ابو اسحاق تھی۔ وہ لاولد مر گئے۔ بعض نے اسلامی جنگوں میں حصہ لیا اور شہادت پائی۔ البتہ آپ کے ایک بیٹے عمر بن سعد ایک گروہ کی نظر میں مبغوض قرار پائے کیونکہ وہ سانحہ کربلا کے وقت اس فوجی دستے کے سردار تھے جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا میدان کربلا میں ابن زیاد کے حکم سے گھیراؤ کیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے بہت کوشش کی کہ یہ سانحہ پیش نہ آئے مگر حالات ان کے اختیار میں نہ تھے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایران کی فتح اور جنگ جمل و جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں عدم شرکت ہی کیا کم تھی کہ اس پر عمر بن سعد رضی اللہ عنہ پر طرح طرح کے الزام وضع کر کے لگائے گئے اور یوں باپ بیٹا کو

ایک گروہ نے معتوب ومقہور ٹھہرانے کی پوری کوشش کی۔ یہ سب کچھ نیم سیاسی نیم مذہبی وجوہات کی بنا پر کیا گیا۔

سیرت وکردار

شہسوار اسلام حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ذات جامع صفات تھی۔ وہ سابقون الاولون میں سے تھے اور اس وقت ایمان لائے جب ایسا کرنا بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ مالدار گھرانے سے تعلق تھا لیکن اسلام کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ بہت پیاری ماں کو بھی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایمان، عقیدہ اور ارادہ میں پہاڑوں کا سا عزم وثبات رکھتے تھے۔ دین حق کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کا انہوں نے عزمِ محکم، ثابت قدمی اور خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں بھی ان کی بڑی وقعت تھی تاریخ اسلام تو کیا دنیا کی تاریخ میں ان کی سی عظمت کردار کے حامل افراد کمیاب ہیں، اسلام، داعیٔ اسلام اور خلفائے وقت کی اطاعت اور وفاداری کا انہوں نے پوری طرح حق ادا کیا۔ ابتدائے اسلام ہی سے خوف خدا، زُہد وتقویٰ، حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم، فروتنی اور بے نیازی ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ ان کی راتوں کا بیشتر حصہ اذکار وعبادات میں گزرتا تھا۔ طبیعت زُہد ورہبانیت کی طرف مائل تھی۔ ایک دفعہ فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو رہبانیت اور صوم وصلوٰہ میں غلو سے منع نہ فرمادیا ہوتا تو میں بھی اسی راہ پر چلتا۔ اور پھر اس شہسوار اسلام کی راتیں جائے نماز پر اور دن گھوڑے کی پشت پر میدان جہاد میں گزرنے لگے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ درختوں کے پتے کھا کھا کر جہاد کیا ہے۔'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین کے سوا تمام غزوات اور مشاہد ان میں شریک رہے۔ بدر، احد، میں انتہائی شجاعت اور فداکاری کا مظاہرہ کیا۔ شدید علالت کی وجہ سے غزوۂ حنین میں شامل نہ ہوسکے بارہا رضا کارانہ طور پر سفر وحضر میں حضور رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے راتوں کو پہرا دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور دعائیں حاصل کیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فداک ابی وامی (میرے ماں باپ تجھ پر قربان) فرمایا۔ اس اعزاز میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے یہ خصوصی دعا کی کہ ''اے اللہ! سعد رضی اللہ عنہ کی دعائیں قبول فرما۔'' چنانچہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔ لوگ ان سے دعائے خیر کے طالب رہتے تھے اور ان کی بددعا سے ڈرتے تھے۔ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ اپنے لئے کبھی خلافت وحکومت کی خواہش اور کوشش نہیں کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی انتخابی مجلس میں شامل تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ سعد رضی اللہ عنہ خلافت کے اہل ہیں لیکن انہوں نے اس کا امیدوار بننا پسند نہ کیا اور اپنا انتخاب کا ووٹ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا کہ جس کے حق میں چاہیں استعمال کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری ایام میں جب فتنہ پیدا ہوا تو گوشہ نشیں ہو گئے اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور جنگ وجدال پر کڑھتے اور اس کے فرو ہونے کی دعائیں مانگتے۔ کوئی پوچھتا تو کہتے کہ ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ میرے بعد عنقریب ایک فتنہ برپا ہوگا جس میں سونے والا بیٹھنے والے سے، بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اچھا ہوگا۔''

جہاد کا جذبہ وشوق، غیرتِ دین، اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حق گوئی و بیباکی، زُہد وتقویٰ، انصاف پسندی، صبر و استقلال سادگی، انکسار، ایثار اور سخاوت حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے نمایاں اوصاف تھے۔ زُہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی مالدار آدمی سے کوئی تحفہ یا ہدیہ قبول نہیں کیا۔ غریبوں کے ساتھ بیٹھنا اور ان کی مدد کرنا انہیں بہت پسند تھا سخاوت اور انفاق فی سبیل اللہ میں ممتاز تھے۔ غریبوں، مسکینوں کے لئے ان کے دروازے کھلے رہتے، کوئی سوالی خالی ہاتھ نہ جانے پاتا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا شمار مالدار صحابہ میں ہوتا تھا......اوروں کی مدد بے دریغ کرتے۔ ان کی اپنی غذا، پوشش اور بودوباش ہمیشہ سادہ رہی۔ جب مدینہ سے دس میل دور وادی عقیق میں امورِ مملکت سے الگ تھلگ ہوکر رہائش اختیار کرلی تو اپنے اونٹ اور بکریاں خود چرایا کرتے تھے اور اس میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہیں اس حالت میں دیکھ کر ان کے ایک صاحب زادے کو شرم محسوس ہوئی اور کہا کہ "یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آپ جنگل میں اونٹ چرائیں اور دوسرے لوگ اپنے لئے خلافت اور حکومت کی کوشش کریں۔" اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قدرے سختی سے جواب دیا کہ "چپ رہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا مستغنی اور پرہیزگار بندے کو دوست رکھتا ہے۔"

سچی بات کہنے میں کسی کا خوف، لحاظ نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے عند الملاقات انہیں یا ایہا الملک (اے بادشاہ) کہہ کر خطاب کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر مجھے امیر المومنین کہتے تو کیا حرج تھا، جواب دیا کہ "خدا کی قسم! یہ بادشاہت ہی ہے۔ جس طرح آپ کو یہ حکومت ملی ہے اس طریقے سے اگر مجھے ملتی تو میں اسے ہرگز پسند نہ کرتا۔" صحیح مسلم میں روایت ہے کہ اپنے زمانہ حکومت میں ایک دفعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ آئے۔ وہاں حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ ان سے کہا کہ کیا تم علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم نہیں کرتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ معاذ اللہ! علی رضی اللہ عنہ میں تین خصوصیتیں ایسی ہیں جو کسی دوسرے میں نہیں ہوسکتیں [1] وہ فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شوہر ہیں [2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ تم میرے لئے ویسے ہی ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہارون علیہ السلام تھے [3] خیبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ کل میں جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دوست رکھتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسے دوست رکھتے ہیں۔" یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شرمندہ ہوگئے۔ احمد ذکی صفوت نے اپنی تصنیف عمر بن عبدالعزیز میں مزید لکھا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر آپ نے مسجد میں کھڑے ہوکر علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کیا تو میں مسجد سے نکل جاؤں گا اور دوبارہ مسجد میں قدم نہیں رکھوں گا۔ لہٰذا معاویہ رضی اللہ عنہ اس سے باز رہے حتیٰ کہ ۵۵ ہجری میں سعد رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔

ایک عظیم جرنیل اور فاتح ہونے کے ساتھ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بڑے رقیق القلب بھی تھے کسی کو تکلیف میں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور حتیٰ الوسع مدد کرتے۔ ان پر اللہ کے خوف کا غلبہ رہتا تھا۔ نمازِ تہجد بڑی خشوع وخضوع سے ادا کرتے اور نماز کے بعد بڑے عجز والحاح سے دعا مانگتے کہ "اے اللہ! میرے گناہوں سے درگزر فرما اور مجھے اپنے بندوں کی خدمت کرنے کی توفیق دے۔" اکثر خوفِ خدا سے روتے روتے ریش مبارک آنسوؤں

سے تر ہو جاتی۔

علم و فضل اور تفقہ فی الدین میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ مسائل پوچھنے والوں کو مطمئن کر کے واپس بھیجتے۔ روایت حدیث میں بہت محتاط واقع ہوئے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے ان سے کچھ پوچھا تو کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں تم سے ایک کہوں گا تو تم اس پر سو بڑھا لو گے۔ ان کی اسی احتیاط پسندی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر سعد رضی اللہ عنہ کوئی حدیث بیان کریں تو پھر کسی دوسرے سے نہ پوچھو متعدد صحابہ اور تابعین نے ان سے روایت کی ہے۔ ان کی روایات کی تعداد دو سو پندرہ ہے۔

انصار مدینہ سے بڑے تپاک اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تدبیر و سیاست، قیادتِ جہاد، فتوحات و جہانگیری اور نظم و نسق حکومت سے بہرہ وافر عطا کیا تھا۔ وہ ایک عظیم جرنیل اور فاتح، ایک قابل منتظم اور گورنر اور بڑے آباد کار (بانی کوفہ) تھے ایک جرنیل کی حیثیت سے ان کا شمار دنیا کے عظیم ترین اور کامیاب ترین جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ایران کی ہزار سالہ پرانی، طاقت ور اور پرشکوہ سلطنت کا خاتمہ کیا اور آتش کدۂ ایران کی آگ ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کا مصداق ٹھہرے۔[1] وہ ایک جری اور حوصلہ مند سپہ سالار تھے اور منصوبہ بندی کے ماہر۔ اور اللہ پر کامل توکل رکھتے تھے۔ تیس ہزار اسلامی فوج گھوڑوں سمیت ان کی قیادت میں طغیانی پر آئے ہوئے دجلہ میں اتر گئی اور ایرانی دارالحکومت مدائن میں داخل ہو گئی اور ایرانی، دیواں آمدند، دیواں آمدند، کہتے ہوئے بھاگ گئے۔ انہوں نے کسی معرکے میں شکست نہیں کھائی اور غیر ضروری خونریزی بھی نہیں کی۔ انہوں نے مفتوحہ علاقوں اور رعایا کا بڑا عمدہ انتظام کیا۔ ان کی فتوحات ٹھوس اور پائیدار تھیں۔ ان کے حسن سلوک سے مفتوحہ آبادی نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا۔ ان کے کارنامے تاریخ میں زندہ جاوید اور درخشاں رہیں گے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بے شک وہ اسلام کے بڑے ہیروؤں میں سے ایک تھے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے۔

---

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''اے سعد! تم اس وقت تک نہیں مرو گے جب تک کہ تم سے ایک قوم کو نقصان اور دوسری کو نفع نہ پہنچ جائے۔ نقصان ایران کو اور نفع مسلمانان عرب کو پہنچا۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح ایران اور کسریٰ کے کنگن سراقہ بن جعشم کو پہنائے جانے کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پوری ہوئی۔ مولف

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

ثالث بالخیر (دومۃ الجندل کا جوانمرد)

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اہل زمین میں بھی امین ہیں اور اہل آسمان میں بھی‘‘

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

’’عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ دنیا میں بھی میرے دوست ہیں اور آخرت میں بھی‘‘

۶ ہجری کا پر آشوب اور تشویش ناک زمانہ تھا۔ مدینہ دشمنوں میں اس طرح گھرا ہوا تھا جیسے بتیس دانتوں میں اکیلی زبان۔ مسلمانوں کے خلاف دشمنوں کی سازشوں اور متوقع حملوں کی خبریں متواتر آ رہی تھیں اور رسول اللہ ﷺ دشمنوں کے دفعیہ کے لئے سرایا بھیجتے تھے۔ اگرچہ اس سے پہلے دومۃ الجندل کا عرب حکمران جو مذہباً عیسائی تھا اور غسانیوں کا حلیف، حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک خچر اور ایک بیش قیمت ریشمی جبہ بھیج چکا تھا جو اطاعت وصلح جوئی کا اظہار تھا۔ لیکن اب پھر دومۃ الجندل سے تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں مدینہ پر حملہ کی نیت سے لشکر جمع ہو رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ فتنہ کے پیشگی سدباب کے لئے کئی دن سے سوچ رہے تھے۔ شعبان کی ایک صاف اور چمکیلی صبح کو حضور ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو بلا بھیجا۔ پیغام ملتے ہی ایک چھریرے جسم کے طویل قامت، دراز ریش، دراز کاکل، سرخ وسفید خوبصورت چہرے اور ستواں ناک والے صحابیؓ جن کے پاؤں میں قدرے لنگ تھا، بڑے ادب واحترام سے حاضر خدمت ہوئے اور سلام عرض کیا۔ آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے تو فرمایا: ''ابو محمد! مجھے دومۃ الجندل کی طرف سے تشویش ناک خبریں آ رہی ہیں۔ وہاں مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے لشکر جمع ہو رہا ہے۔ تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے ادھر روانہ ہو جاؤ۔ سات سو مجاہد تمہارے ساتھ جائیں گے۔ دومۃ الجندل پہنچ کر وہاں کے سردار اور اس کے قبیلہ کلب کو پہلے اسلام کی دعوت دینا اگر وہ اسلام لے آئیں تو قبیلہ کے سردار کی لڑکی سے نکاح کر لینا۔ لیکن اگر لڑائی کی نوبت آئے تو دیکھنا کسی کو دھوکا نہ دینا، خیانت اور بدعہدی نہ کرنا، بچوں، عورتوں کو قتل نہ کرنا، خدا کے باغیوں سے دنیا کو پاک کر دینا۔''

اگلی صبح کو وہ صحابی ہتھیار لگائے، عمامہ باندھے خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ ایک نظر ان کے عمامہ پر ڈالی۔ پھر انہیں اپنے قریب بلایا۔ ان کا عمامہ اتار کر اپنا سیاہ عمامہ اپنے ہی دست مبارک سے ان کے سر پر باندھا اور دونوں شانوں کے درمیان تھوڑا سا شملہ چھوڑ دیا۔ اور فرمایا کہ ''ابو محمد! عمامہ یوں باندھا کرو کیونکہ یہ احسن اور اعرف ہے۔'' ابو محمد رضی اللہ عنہ کی خوش نصیبی کے کیا کہنے ؎

کلاہِ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید
کہ سایہ برسرش انداخت چوں تو سلطانی!

ابو محمد نے حضور اکرم ﷺ کا عطا کردہ مقدس اور بابرکت عمامہ بعد میں بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا اور اسے وقتاً فوقتاً اہم مواقع پر پہنتے رہے۔ اپنا سیاہ عمامہ ابو محمد کو پہنانے کے بعد حضور ﷺ نے سالارِ لشکر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک پرمغز اور پرتاثیر خطبہ ارشاد فرمایا:

''اے لوگو! بلاؤں کے نازل ہونے سے پہلے پانچ باتوں کا خیال رکھو۔ کسی ملک میں جب کم تولنے کا

رواج ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ قحط نازل کرتا ہے اور پھلوں میں کمی آجاتی ہے اور جب کسی قوم میں بدعہدی رواج پذیر ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیتا ہے۔ اور جب زکوٰۃ ادا نہیں کی جاتی تو بارش موقوف ہو جاتی ہے۔ اگر بے زبان جانور نہ ہوں تو ایک قطرہ بھی نہ برسے۔ اور جب کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو طاعون پھیلتا ہے اور جب قرآنی احکام پر عمل چھوڑ دیا جاتا ہے تو ان میں اختلاف بڑھ جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔'' [1]

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ کی کنیت بھی ابو محمد تھی۔ لیکن یہ ابو محمد جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عنائت خاص کے مستحق ٹھہرے، کون خوش نصیب تھے؟ یہ تھے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ۔ جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''وہ اہل زمین میں بھی امین ہیں اور اہل آسمان میں بھی۔'' نیز دعا فرمائی تھی کہ ''اے اللہ عبدالرحمٰن کو عز و وقار عطا فرما۔''

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو شخص میرے بعد تم لوگوں (امہات المومنین) کی خبر گیری کرے گا وہ سچا اور پاک نفس ہوگا'' اور ابن عوف کے حق میں دعا فرمائی کہ ''اے اللہ! عبدالرحمٰن کو چشمہ سلسبیل سے سیراب کر۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد یہی عبدالرحمٰن امہات المومنین کے خبر گیر رہے۔

غرضیکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں سات سو صحابہ کرام کا سالار بن کر دومۃ الجندل گئے۔ وہاں پہنچ کر حسب ارشاد نبوی تین دن تک اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ تیسرے دن دومۃ الجندال کا حکمران اصبغ بن عمرو کلبی عیسائیت ترک کر کے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا اور اس کے قبیلے کے بہت سے لوگ بھی مسلمان ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اصبغ کی لڑکی تماضر سے نکاح کر لیا اور اسے اپنے ساتھ مدینہ لے آئے۔

خاندان...... پیدائش

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ قریش کے قبیلہ بنو زہرہ میں سے تھے، فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے تھا۔ خود حضور رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی والدۂ ماجدہ بھی اسی قبیلے سے تھیں۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام شفا تھا۔ والدہ کی طرف سے ان کا نسب پانچویں پشت میں اور باپ کی طرف سے چھٹی پشت میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ ان کی والدہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کے موقع پر دایہ کی خدمات انجام دی تھیں اور سب سے پہلے انہی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا جو ایک بہت بڑا شرف اور امتیاز ہے وہ بھی مسلمان ہوئیں اور مدینہ ہجرت کی۔ قبیلہ بنو زہرہ اگرچہ قریش کی طرف

[1] سیرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ از سید فضل ابن احمد۔ قاضی حبیب الرحمٰن نے بھی ''عشرہ مبشرہ'' میں یہ خطبہ نقل کیا ہے معمولی الفاظ کا فرق ہے۔ مؤلف

سے جنگ بدر میں شریک ہوالیکن کسی مسلمان کوقتل نہیں کیا۔ان کی تلواریں مسلمانوں کے خون سے آلودہ نہ ہوئیں۔

اسلام لانے سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا نام عبدالکعبہ یا عبدعمرو تھا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر عبدالرحمٰن رکھا۔کنیت ابومحمد تھی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عام الفیل (مکہ پر ابرہہ کے حملہ کا سال) کے دس سال بعد ۵۸۱ عیسوی میں پیدا ہوئے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دس سال چھوٹے تھے۔

قبولِ اسلام

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بعثت نبوی کے وقت تیں سال کے تھے اور ایک کامیاب تاجر تھے۔آپ کے والد عوف کا پیشہ بھی تجارت تھا اور وہ ایک تجارتی سفر کے دوران میں مارے گئے تھے۔حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں فطری سلامت روی اور پرہیز گاری تھی۔کبھی شراب نہیں پی۔اہل مکہ کی دوسری اخلاقی برائیوں سے بھی ہمیشہ دور رہے۔ابتدا ہی سے صالح زندگی کی طرف مائل تھے۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کوشش سے انہوں نے راہِ ہدائت پائی اور اسلام کے السابقون الاولون میں شمار ہوئے۔وہ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ایک ہی دن اسلام لائے۔ابن سعد کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی دارارقم کو مرکز دعوت وتبلیغ نہیں بنایا تھا۔بعض نے آپ کو چھٹا مسلمان لکھا ہے،بعض نے تیرہواں۔عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں ایک ایسا چہرہ دیکھتا ہوں جس کو دیکھ کر نیکی کی امید بندھتی ہے۔'' اسلام لانے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن اکثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے لگے۔دوسرے مسلمانوں کی طرح انہیں بھی مشرکین مکہ کی طرف سے سختیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ہجرت

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بعض دوسرے مسلمانوں کی طرح مشرکین مکہ کے مظالم سے تنگ آکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ۵ بعثت میں حبشہ کی جانب دو دفعہ ہجرت کی۔ان کے ساتھ دس مرد اور چار عورتیں تھیں۔جن میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ صحابہ شامل تھے۔خواتین میں بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا زوجہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا (جو بعد میں ام المومنین ہوئیں) بھی شامل تھیں۔اس سے پہلے قافلے کے بعد اور مسلمان بھی ہجرت کر کے حبشہ پہنچتے رہے۔وہاں نجاشی شاہ حبشہ کے عدل وانصاف کی وجہ سے یہ لوگ امن چین سے رہنے اور سکون وآسائش کی زندگی گزارنے لگے۔

کچھ عرصہ بعد ان مہاجرین کو غلط اطلاع ملی کہ اہل مکہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے ہیں۔چنانچہ سب لوگ مکہ واپس آگئے اور ظلم وتشدد کا دور پھر سے شروع ہو گیا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ حبشہ جانے کی اجازت دے دی۔اب کے تراسی مردوں اور بیس خواتین نے ہجرت کی۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوف پھر ان میں شامل تھے۔کئی سال تک یہ

لوگ حبشہ میں رہے۔ جب ۱۳ نبوت میں رسول اللہ ﷺ نے حکم خداوندی سے مدینہ کو ہجرت کی تو حبشہ سے یہ مہاجرین بھی مدینہ پہنچ گئے جن میں حضرت عبدالرحمٰن بھی تھے۔ مدینہ میں آنحضرت ﷺ نے انہیں مسجد نبوی کے متصل مکان کے لئے ایک قطعہ زمین عطا کیا۔ انہوں نے تجارت کے نفع سے وہاں ایک عالی شان قلعہ نما مکان تعمیر کیا۔

مواخاۃ

رسول اللہ ﷺ ایک عظیم ماہر نفسیات اور مزاج شناس مردم تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کی مزاجی، روحانی کیفیات اور سماجی حیثیات کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی باہمی مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم کی۔ چنانچہ مکہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی مواخاۃ ان کے ہم قبیلہ بزرگ صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے قائم کی۔ دونوں عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں۔ جب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے تو آنحضرت ﷺ نے ان کی مواخاۃ وہاں کے ایک بااثر اور صاحب ثروت بزرگ حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ سے کرا دی۔ موخر الذکر انہیں گھر لے گئے اور فرمایا کہ میں مدینہ کا سب سے مالدار شخص ہوں۔ میں آپ کو اپنا آدھا مال دیئے دیتا ہوں اور میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جو آپ کو پسند ہو، میں اُسے طلاق دے دیتا ہوں۔ عدت پوری ہونے کے بعد آپ اس سے نکاح کر لیں۔'' حضرت عبدالرحمٰن کی غیرت، ہمت اور جوانمردی نے یہ گوارا نہ کیا۔ انہوں نے اپنے اسلامی بھائی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اللہ آپ کے مال ومنال اور اہل وعیال میں برکت دے۔ آپ صرف مجھے بازار کا راستہ بتا دیں۔ تجارت میں مہارت تو رکھتے ہی تھے، بازار میں کچھ خرید وفروخت کی اور نفع میں کچھ گھی اور پنیر لے کر واپس آئے۔ غرضیکہ مدینہ پہنچتے ہی اپنا آزاد تجارتی کاروبار شروع کر دیا جو بڑی سرعت سے ترقی کرتا گیا۔ اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ چوٹی کے خوشحال تاجروں میں شمار ہونے لگے۔

غزوات میں شرکت

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے تمام غزوات ومشاہدات میں شریک رہے۔ بدر واحد کے غزوات میں بڑی جانبازی اور ثابت قدمی سے لڑے غزوۂ احد میں ان کے دو دانت شہید ہوئے اور بیس سے زیادہ زخم سامنے کی طرف کھائے۔ پاؤں کے زخم کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے لنگڑے ہو گئے۔ دشمنوں کے سخت دباؤ اور نرغہ کے باوجود حضور اکرم ﷺ کی حفاظت کے لئے بے جگری سے لڑے اور فداکاری کا مظاہرہ کیا۔ وہ ان مٹھی بھر صحابہ میں سے تھے جو حضور ﷺ کے ساتھ آخر دم تک ثابت قدم رہے نہ صرف غزوۂ خندق، غزوۂ خیبر، بیعت رضوان، فتح مکہ، غزوۂ حنین، غزوۂ طائف، سفر تبوک، حجۃ الوداع میں حضور ﷺ کے ساتھ رہے بلکہ کوئی چھوٹا موٹا سفر اور غزوہ بھی ایسا نہ تھا جس میں حضور ﷺ تشریف لے گئے ہوں اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پیچھے رہ گئے ہوں۔ دومۃ الجندل کی خصوصی مہم کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ فتح مکہ کے فوراً بعد جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قبیلہ خزیمہ کے کچھ لوگ غلطی سے قتل ہو گئے تو ان میں اور حضرت عبدالرحمٰن میں تلخ کلامی ہوئی۔ اس پر حضور ﷺ نے

خالد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "اگر تو اللہ کی راہ میں کوہ احد کے برابر بھی سونا خرچ کرے تب بھی عبدالرحمٰن کی نصف دن کی خدمت گزاری کے برابر نہ ہوگا۔" سفر تبوک کے دوران میں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رفع حاجات، وضو وغیرہ کے سلسلے میں دیر ہوئی اور نماز فجر کا وقت تنگ ہونے لگا تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے دوسرے صحابہ کے کہنے پر نماز فجر کی امامت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی اقتداء میں ایک رکعت ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تک کسی نبی نے اپنی امت کے کسی رجل صالح کے پیچھے نماز نہیں پڑھ لی اس کی وفات نہیں ہوئی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اپنے قریب رکھتے تھے اور ان کی اصابت رائے کی وجہ سے ان پر اعتماد کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا یہ عالم تھا کہ حتی الوسع کسی بھی موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ اپنے وقت کا زیادہ حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت و رفاقت میں گزارتے تاکہ فرمودات نبوی سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا سیکھیں۔

ترے آستاں پہ جینا تیرے آستاں پہ مرنا
یہی غائت تمنا یہی اوج سرفرازی

عہد نبوی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہر اہم واقعہ میں شریک رہے اور اپنا کردار ادا کیا۔ افتاء کی خدمت بھی ان کے ذمہ رہی۔ عہد نبوی کے مفتیوں میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک سفر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ میں اپنا نائب بھی مقرر کیا تھا۔

عہد خلفائے راشدین میں

سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تیسرے چوتھے نمبر پر تھے۔ پھر ان سے بھرپور تعاون کرتے اور مخلصانہ مشورے دیتے رہے۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام بطور خلیفہ تجویز کرتے وقت سب سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان سے مشورہ طلب کیا۔ معاملہ نہایت اہم تھا اور ملت کی فلاح و بہبود کا اس پر دارومدار تھا۔ لہٰذا شخصیتوں کا لحاظ کئے بغیر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اخلاق اور بیباکی سے کہا کہ "اے خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! بے شک عمر رضی اللہ عنہ نہایت قابل ہیں لیکن سخت مزاج واقع ہوئے ہیں۔" صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "عمر رضی اللہ عنہ کی سختی میری نرمی کی وجہ سے تھی۔ جب خلافت کا بوجھ خود ان کے سر پر آ پڑے گا تو خود بخود نرم ہو جائیں گے۔" حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے معاملہ دوسرے اہل الرائے صحابہ کے سامنے پیش کیا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بعد انہوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پورا پورا تعاون کیا۔ وہ مجلس شوریٰ کے اہم رکن تھے اور خلیفہ ثانی ان کی رائے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اور اکثر اوقات انہیں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ۱۳ ہجری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد کے پہلے حج کا امیر الحج حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو بنا کر بھیجا۔ اگر کسی کو خلیفہ سے کچھ پوچھنا ہوتا تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وساطت سے پوچھتے۔ جتنی آزادی سے وہ حضرت

عمر رضی اللہ عنہ جیسے باجبروت خلیفہ سے بات کر لیتے تھے، کسی دوسرے کو کم ہی ہمت ہوتی تھی۔ ان کی اصابت رائے کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ قدر کرتے تھے اور اس لئے انہیں مدینہ سے باہر نہ جانے دیتے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا بھی کہ "آپ ہمیں مدینہ سے باہر جہاد کے لئے کیوں نہیں جانے دیتے؟" انہوں نے کہا کہ اس سوال کا جواب دینے سے نہ دینا بہتر ہے، اور تو اور، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعض دفعہ راتوں کی گشت اور پہرے کے لئے بھی ساتھ لے جاتے، ایک دفعہ ایک قافلہ مدینہ میں رات کے وقت پہنچا۔ چونکہ اس کے پاس مسلمانوں کا مال تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سوچ کر اہل قافلہ تھکے ماندے ہوں گے، رات کو خود اس کی پہرہ داری کا ارادہ کیا اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو اپنے ہمراہ لیا، چنانچہ دونوں جلیل القدر بزرگوں نے ساری رات قافلہ کی حفاظت کے لئے پہرہ دیا۔ اسی طرح جب جنگ جلولا (۱۶ ہجری) اور جنگ نہاوند (۲۱ ہجری) سے بے انتہا مالِ غنیمت آیا اور مسجد نبوی کے کھلے صحن میں رکھا گیا تو بھی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے پہرہ دیا اس بیش قیمت کھلے مال کو صبح کو جوں کا توں پا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ جنگ قادسیہ کے موقع پر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ملی مصالح کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خود سپہ سالار بن کر جانے کی مخالفت کی اور سپہ سالاری کے لئے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا تھا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منظور کیا۔ یہ انتخاب بڑا تاریخی اور بڑا کامیاب ثابت ہوا۔

رومیوں کے خلاف جنگ یرموک کے موقع پر بھیجی جانے والی امدادی فوج میں آپ بطورِ خاص جوش و خروش سے شامل ہوئے۔ بیت المقدس کی فتح (۱۵ ہجری) کے موقع پر جابیہ کے مقام پر جو معاہدہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خصوصی موجودگی میں تحریر کیا گیا اس پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بھی بطور گواہ دستخط کئے۔

صحابہ میں سے خلیفہ ثانی کو اگر کسی سے کچھ بے تکلفی تھی تو وہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہی سے تھی، اور بعض دفعہ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے انہی سے رجوع کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہیں کچھ روپے کی ضرورت تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے قرض مانگا۔ موخر الذکر نے کہا کہ "امیر المومنین! آپ مجھ ہی سے کیوں مانگتے ہیں، آپ بیت المال سے بھی قرض لے سکتے ہیں اور عثمان رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے صاحب استطاعت سے بھی۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "ایسا اس لئے کرتا ہوں کہ شائد میں بیت المال کو رقم واپس کرنا بھول جاؤں اور کسی دوسرے سے لوں تو شائد وہ لحاظ یا کسی اور وجہ سے مجھ سے رقم کی واپسی کا مطالبہ نہ کرے اور میں بھول جاؤں۔ لیکن تم اپنی رقم مجھ سے مانگ کر بھی ضرور واپس لے لو گے۔"

۲۳ ہجری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری حج میں ان کے ساتھ تھے اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی ضروریات کی دیکھ بھال اور حفاظت آپ کے ذمہ تھی۔ حج سے واپسی کے تھوڑے دن بعد جب ابولولو فیروز نے نماز فجر کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کیا تو انہوں نے گرنے سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ امامت کے لئے آگے بڑھایا۔ چنانچہ آپ نے جلدی جلدی نماز پڑھائی اور پھر زخمی خلیفہ کو ان کے گھر پہنچایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت، انتخابی مجلس کی نامزدگی اور بالآخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے حالات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھے جا چکے ہیں۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تاریخ ابوالفدا اور بعض دوسری روایات کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کرنا چاہا تھا لیکن ان کے انکار پر عشرۂ مبشرہ کے باقی ماندہ چھ اصحاب پر مشتمل انتخابی مجلس قائم کی جس میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وصیت کی کہ اگر ارکان مجلس میں اختلاف ہو اور ووٹ برابر تقسیم ہو جائیں تو اس رائے کو ترجیح ہو گی جدھر عبدالرحمٰن ہوں گے۔ بہترین صائب الرائے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہیں ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ گویا جدید اصطلاح میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو ویٹو کا حق دے دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب میں کردار

جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے، خلافت کے لئے ان کے انتخاب میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نامزد کردہ انتخابی کونسل یا مجلس شوریٰ کے ایک رکن تھے جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جانشین کے انتخاب کی ذمہ داری تفویض کی گئی تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کرنا چاہا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ”خدا کی قسم! مجھے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کی بجائے میرے گلے پر چھری رکھ کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک اتار دی جائے۔“ ان کے انکار کے بعد ہی انتخابی کونسل مقرر کی گئی تا ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت تھی کہ اگر کونسل کے نصف حضرات ایک طرف اور نصف دوسری طرف ہوں تو جس طرف عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہوں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما...... جو امیدوار خلافت نہ تھے لیکن بحیثیت مبصر کے کونسل کے اجلاس میں شامل تھے اور کاسٹنگ ووٹ دینے کے مجاز تھے...... اپنا ووٹ اس دھڑے کو دیں۔ یہ اہمیت تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی اصابت رائے کو دیتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ان کے منتخب ہو جانے کا خاصا امکان تھا۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ قریش کے دو بڑے قبیلوں بنی امیہ اور بنی ہاشم کے نامور نمائندوں ...... حضرت عثمان اور حضرت علی ...... کی موجودگی میں ان کا خود آگے آنا ملت کے مفاد میں نہ ہوگا۔ ویسے بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت ان کے سامنے تھا۔ وہ خلافت کی بھاری ذمہ داریوں سے آگاہ تھے اور اسے کانٹوں کی سیج بلکہ تلوار کی دھار پر چلنے سے کم نہ سمجھتے تھے۔ ذاتی طور پر ارکان میں سے کسی نے بھی اپنے استحقاقِ خلافت کا دعویٰ نہیں کیا نہ دوسروں میں کنویسنگ کی۔ عمر ابونصر نے لکھا ہے اور طبری نے بھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اپنی حمایت کے لئے اپیل کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے رفیع الشان بزرگ سے یہ بات مستبعد معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال انتخابی کونسل کے ارکان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ درپیش صورتِ حال مسلمانوں کے لئے بالکل نئی اور غیر متوقع تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ایک ہنگامی صورت حال کا نتیجہ تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت تجویز کر دیا تھا جس کی مسجد نبوی میں صحابہ

[1] بحوالہ سیرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ از فضل بن احمد

کے مجمع عام نے تصدیق کر دی تھی۔ اب معاملہ چھ کبار صحابہ کے سپرد تھا، انہی کی رائے سے انہی میں سے ایک کو کثرت رائے سے منتخب کرنا تھا لیکن ان میں باہم اختلافِ رائے پیدا ہو گیا۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں تھے جبکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے حق میں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کسی دوسرے کے حق میں کوئی رائے نہ دی۔ نہ نام واپس لیے[1]......اس طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنی ترجیح وحمایت کا اظہار کر کے بالترتیب حضرت علی اور حضرت ابن عوف کے حق میں دستبردار ہو گئے تین دن کے اندر انتخاب ہو جانا چاہئے تھا۔ دو دن گزر چکے تھے۔ عوام وخواص شدید اضطرابی کیفیت سے دوچار تھے سب کی نظریں انتخابی کونسل پر لگی ہوئی تھیں۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک بے حد اہم اور تاریخی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ امت مسلمہ زیادہ دیر تک بغیر خلیفہ کے نہ رہے اور کسی قسم کا فتنہ وشر پیدا نہ ہو جائے، انہوں نے دوسرے ارکان سے کہا کہ ''میں خلافت کی امیدواری سے دستبردار ہوتا ہوں۔ اگر آپ لوگ مجھ سے پکا وعدہ کریں کہ میرے فیصلہ کو بے چون وچرا تسلیم کر لیں گے تو میں حکم بننے کو تیار ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں رشتہ داری، دوستی، ذاتی پسند وناپسند سے بالاتر ہو کر صرف ملی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ حضرات میں سے موزوں ترین کے حق میں فیصلہ دوں گا۔'' سب نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حکم مان لیا......مؤخر الذکر نے لوگوں کے خیالات، میلانات اور ترجیحات معلوم کرنے میں شبانہ روز تگ ودو کی۔ کبار صحابہ سے مشورے کئے۔ مختلف قبائل کے سرداروں، فوجی افسروں اور صوبوں کے گورنروں (جو حج سے واپسی پر مدینہ میں موجود تھے) سے تبادلہ خیال کیا۔ حج سے واپس جانے والے مسلمانوں کے قافلوں کی رائیں بھی معلوم کیں۔ مدینہ کے عوام کے خیالات بھی معلوم کئے اور امہات المومنین کی رائے بھی دریافت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ ''اگر میں یہ منصب آپ کو سونپ دوں تو کیا آپ احکامِ الٰہی، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور طریقہ شیخین رضی اللہ عنہما پر چلنے کا مجھ سے عہد کرتے ہیں اور اگر آپ کے مدمقابل کو منتخب کروں تو کیا آپ اس کی اطاعت کریں گے؟'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ اور ذہنی تحفظ کے جواب ہاں میں دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے احکامِ الٰہی اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے کا تو وعدہ کیا لیکن طریقہ شیخین رضی اللہ عنہما کے بارے میں کہا کہ میں اپنی صوابدید، ہمت اور حوصلے سے بھی کام لوں گا۔'' بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کی صورت میں ان کی اطاعت کرنے کا یقین دلایا۔ غالباً وقت کے حالات کا تقاضا یہ تھا کہ پیش رو خلفا کے طریق عمل کو جاری رکھا جائے۔ اس لئے طریقہ شیخین رضی اللہ عنہما سے انحراف کی بات نہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو پسند آئی نہ دوسرے اصحابِ شوریٰ کو کیونکہ اس سے فوری طور پر اختلافات کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ تھا، دوسرے وہ ذاتی استصواب رائے سے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اکثریت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں ہے۔ لوگوں کو یہ پسند نہ تھا کہ نبوت اور خلافت ایک ہی خاندان میں جمع ہو جائیں۔ ویسے بھی عرب کا قبائلی معاشرہ جمہوری آزادی ومساوات کا خوگر چلا آتا تھا جس میں روایات کی پابندی کو بڑا دخل تھا۔ ان تمام باتوں کو

[1] انتخابی مجلس کے چھٹے رکن حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ مدینہ سے باہر گئے ہوئے تھے اس لئے شریک مشاورت نہ ہو سکے۔ مؤلف

ذہن میں رکھ کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گئے۔ان کا اپنا کوئی ذاتی مفاد نہ تھا۔وہ ایک دولت مند تاجر تھے۔ان کا تعلق قبیلہ بنو زہرہ سے تھا۔نہ وہ بنو ہاشم میں سے تھے نہ بنوامیہ میں سے کہ ان پر علی رضی اللہ عنہ (بنو ہاشم) یا عثمان رضی اللہ عنہ (بنوامیہ) کی جانبداری کا گمان ہوتا۔انہوں نے فیصلہ کرتے وقت ملت کے اجتماعی مفاد اور کثرتِ رائے کو مدنظر رکھا۔

انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ سیاہ عمامہ سر پر باندھا اور مسجد نبوی میں مسلمانوں کے مجمع عام میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور ایک موثر تقریر کی۔انہوں نے کہا کہ میں نے لوگوں کی حالت کا اچھی طرح اندازہ کر لیا ہے۔وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہاتھ بڑھایئے تاکہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔چنانچہ سب سے پہلے خود انہوں نے بیعت کی پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد تمام مسلمانوں نے۔اگر عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی تقریر خلافِ واقعہ ہوتی تو مجمع میں شور و ہنگامہ پیدا ہو جاتا۔صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تین چار طرف داروں نے آواز اٹھائی جواباً بنی امیہ کی طرف سے بھی دو تین آوازیں بلند ہوئیں جن کا حکم اور مجمع نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی منہاج السنہ میں روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کے وقت جیسا اتفاق ہوا ایسا اتفاق کسی کی بیعت کے وقت نہ ہوا۔''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میری امت گمراہی پر اتفاق نہیں کر سکتی۔''اسی سے خلافت عثمان رضی اللہ عنہ پر اجماع کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں کثرت رائے کا اعتراف حامیوں اور نکتہ چینوں سبھی نے کیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ایک انتہائی اہم اور تاریخ ساز کردار ذاتی اغراض و مقاصد سے بالاتر ہو کر کیا جیسا کہ بعد کے دور عثمانی کے واقعات نے بھی ثابت کر دیا۔انہوں نے انتخاب خلیفہ کے پیچیدہ اور اہم مسئلے کو اپنی ذہانت، دینی بصیرت، دور اندیشی، تدبر، ایثار، بے غرض اور بے لوث مساعی سے اطمینان بخش طریقے سے حل کر دیا جس میں انہوں نے عام رجحان کے علاوہ عرب قبائل کی سربراہی کی روایت کو بھی مدنظر رکھا۔انہوں نے اپنے حسن تدبر اور بے لوث کوشش سے ملت اسلامیہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا اور یہ کوئی معمولی کوشش اور جدوجہد نہ تھی، انہوں نے معروضی قسم کا فیصلہ ذاتی پسند اور ناپسند سے بالاتر ہو کر اخلاص اور نیک نیتی سے کیا......تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان سے کوئی ذاتی مفاد یا منفعت حاصل نہیں کی حالانکہ وہ بعد میں آٹھ سال تک زندہ رہے۔وہ خوف سے بالاتر تھے......کوئی لالچ، کوئی خوف ان کے فیصلہ کو متاثر نہ کر سکا۔مولانا معین الدین ندوی لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ گو اسلام نے قبائل کو متحد کر دیا تھا تاہم ایک حد کے منافست و مسابقت کا خیال باقی تھا اور لوگ اس کو پسند نہ کرتے تھے کہ نبوت و خلافت ایک ہی قبیلہ یعنی بنو ہاشم میں مجتمع ہو جائے چنانچہ خلافت مرتضوی میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں وہ اسی منافست کا نتیجہ تھیں۔حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی نگاہِ عاقبت بین نے اس کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو

جناب امیر رضی اللہ عنہ پر ترجیح دی۔ ورنہ اسلام کا شیرازہ اسی وقت بکھر جاتا جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا...... بہر حال حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اس عقدہ کو جس ایثار، دور اندیشی اور دانائی سے حل کیا، وہ یقیناً ان کی زندگی کا مایہ ناز کارنامہ ہے"[1]

اسلام میں یہ تحکیم کا پہلا واقعہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں سے ایک کا انتخاب کرنے کے لئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں سرانجام پایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم (حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ) کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دیا۔ دوسرا واقعہ تحکیم خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان کے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان پیش آیا جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے حکم حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ...... حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم ان کا کیس ہار گئے۔ یعنی دونوں دفعہ ایسا ہی ہوا...... آج کل کی جدید مہذب اور ترقی یافتہ دنیا میں بھی حکم یا ثالث بنائے جاتے ہیں اور اکثر حالات میں ان کے فیصلے سیاسی مصالح پر مبنی ہوتے ہیں نہ کہ حق وانصاف پر۔ خود ہمارے پاکستان کے معاملے میں انگریز قانون دان سر ریڈکلف کو برطانوی حکومت نے مقرر کیا اور پاکستان کو بجبوری اسے قبول کرنا پڑا تا کہ قبل آزادی کے متحدہ ہندوستان کو بھارت اور پاکستان میں تقسیم کر کے علاقوں اور جغرافیائی سرحدوں کا تعین کرے۔ اس شخص نے صاف بددیانتی اور دھاندلی سے کام لے کر وہ علاقے بھی بھارت کو دے دیئے جن میں مسلم آبادی کی اکثریت تھی۔ اس نے رشوت اور سیاسی دباؤ کے تحت کشمیر میں داخلہ کے لئے بھی بھارت کو مسلم آبادی والے علاقہ کی پٹی دے دی۔

قیاس کہتا ہے کہ اگر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ عہد عثمانی کے اواخر اور نئے خلیفہ کے انتخاب تک زندہ رہتے تھے تو شاید اپنے ناخن تدبیر سے الجھے ہوئے معاملات کی گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہو جاتے اور فتنہ وخونریزی کا دروازہ نہ کھلنے پاتا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ پہلے حج کے موقع پر خلیفہ نے انہی کو امیر الحج بنا کر بھیجا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا ان کے وقار میں اضافہ کے لئے فرمائی تھی، عہد عثمانی اس کی قبولیت کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ انہوں نے خلیفہ گر کا کردار ادا کیا تھا۔ لوگ خلیفہ سے زیادہ اپنی شکایات ان کے پاس لے کر آتے اور وہ ان کے تدارک کے لئے خلیفہ کو مشورہ دیتے یا ممکن ہوتا تو خود ان کا تدارک کر دیتے۔ اپنی تجارتی، خانگی اور متعبدانہ مصروفیات میں سے دینی اور ملی معاملات کے لئے وقت نکالتے اور تکالیف بھی برداشت کرتے۔ چونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت کا فیصلہ دے کر ایک بھاری ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے، اس لئے وہ خلیفہ کے احکام واعمال پر نگاہ رکھتے۔ مثلاً ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس صدقات کے اونٹ آئے۔ بازار میں ان کی جو زیادہ سے زیادہ قیمت لگی وہ انہوں نے اپنے پاس سے ادا کر کے اونٹ مروان بن حکم کو دے دیئے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔

[1] سیرۃ الصحابہ' حصہ مہاجرین کی دوسری جلد' مہاجرین حصہ اول طبع ثانی ۱۹۵۱ء

خلافت پر بیعت کرتے وقت ان سے جو عہد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنت پر عمل کرنے کا لیا تھا۔ ان کو یاد دلایا اور کہا کہ ''کیا ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ، کو ایسا کرتے دیکھا؟ یہ سب اونٹ واپس کر دیجئے۔'' چنانچہ اونٹ واپس کرا کر دم لیا۔ غالباً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی یہ پہلی خلاف ورزی یا تبدیلی دباؤ کے تحت تھی جس سے بعد میں دوسروں کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔

عہد عثمانی میں بھی افتاء کی خدمت آپ کے ذمہ رہی۔

بعد کے زمانے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر جانبداری کا الزام لگایا گیا۔ بعض نے کہا چونکہ ان کی ایک زوجہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا حضرت عثمان کے ماں جائی بہن تھیں۔ اس لئے ان پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے بنو امیہ کا دباؤ تھا۔ دوسروں نے کہا چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عمر رسیدہ تھے اس لئے حضرت عبدالرحمٰن کا خیال تھا کہ وہ جلدی فوت ہو جائیں گے اور ان کے بعد خود انہیں خلافت کا موقع مل جائے گا۔ لیکن یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں جو اس وقت وضع کی گئیں جب بنو ہاشم اور بنو امیہ میں اختلافات پیدا ہوئے خاص کر بنو عباس کی حکومت کے دوران میں۔ ولیم میور ایک متعصب مستشرق ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف الزام تراشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا لیکن حضرت عبدالرحمٰن کے خلوصِ نیت، بے لوثی اور غیر جانبداری کا اعتراف اسے بھی کرنا پڑا۔ اپنی تصنیف ''خلافت کا عروج وزوال'' میں لکھتا ہے:

> ''یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے حکم کی حیثیت سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں خلوص اور نیک نیتی سے روگردانی کی۔ انہوں نے وہ کیا جو ان کے خیال میں ملت کے لئے بہترین تھا۔''[1]

اس کے بعد حاشیہ میں لکھتا ہے:

> ''انہوں (عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ) نے ناگوار اور تکلیف دہ فریضہ ایک مخلص اور بے لوث محب ملک وقوم کی طرح ادا کیا۔ انہوں نے دن رات ایک کر کے سرکردہ زعمائے قوم کے خیالات ورجحانات معلوم کئے اور انتخابی کونسل کے ارکان کے باہم دگر مخالفانہ دعووں کو تطبیق دینے کی انتہائی کوشش کی۔ (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ کی نامزدگی کا فوری سبب معلوم کرنا آسان نہیں۔ بنو عباس کے عہد کی روایات میں اس انتخاب کی وجہ یہ فرض کر لی گئی ہے کہ (حضرت) علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ضمیر کے تقاضا کے مطابق یہ یقین دہانی کرانے میں ہچکچاہٹ سے کام لیا کہ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کار پر چلیں گے۔ قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تو وہ پوری طرح عمل کریں گے۔ لیکن اپنے پیشرووں کے اسوۂ پر صرف اس حد تک عمل کریں گے جہاں تک وہ خود اس سے متفق ہوں گے۔ جن روایات میں یہ تفصیل ملتی ہے کہ (حضرت) عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کیسے پہلے (حضرت) علی رضی اللہ عنہ سے اور پھر (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ سے

---

[1] خلافت کا عروج وزوال (Caliphate, Its Rise, Decline And Fall) صفحہ ۱۹۷ ایڈیشن ۱۹۱۵

سوالات کئے اور انہوں نے جو جواب دیئے، ان کے انداز اور منشا و مدعا میں مجھے بنو عباس کی طرح فرض کر لینے کے لئے کافی وجوہ نہیں ملتیں۔ بنو عباس کے زمانے کی دوسری جعلی روایات میں سے یہ بھی ایک ہے۔"[1]

عمر ابوالنصر نے غالباً اپنی اپج سے یہ بات بھی لکھی ہے کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمان چاہتے تھے کہ انہیں سخت گیری سے چھٹکارا ملے جو خلیفہ ثانی کے عہد میں انہیں برداشت کرنا پڑتی تھی اور ان دنیاوی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے جن سے وہ آج تک محروم تھے۔ وہ اپنے آپ میں بھی اس تہذیب کو جلوہ گر دیکھنے کے خواہش مند تھے جس کی چمک عظیم الشان تہذیب و تمدن رکھنے والی حکومتوں کو فتح کرنے کے بعد وہ دیکھ رہے تھے لیکن اس سے حقیقی فائدہ حاصل کرنے کا ان کو موقع نہ مل سکا تھا۔"

عمر ابوالنصر مصری کی اس عبارت کے بین السطور میں پڑھا جائے تو مطلب یہ نکلے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نعوذ باللہ ایک جابر اور متشدد خلیفہ تھے اور انہوں نے لوگوں کو عظیم الشان تہذیب و تمدن رکھنے والے، مفتوحہ ممالک (مثلاً مصر) کی طرح عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے سے روک رکھا تھا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہو گئے تو وہ بھی اس بارے میں اسوۂ عمر رضی اللہ عنہ پر چلیں گے۔ لیکن عثمان رضی اللہ عنہ نرم مزاج ہیں اور خود دولت مند ہونے کی وجہ سے آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس لئے وہ خلیفہ بن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت گیر پالیسی پر نہیں چلیں گے اور لوگ لذائذ دینوی سے بہرہ ور ہو سکیں گے اور آسانی سے دنیا کما سکیں گے۔ اس لئے جس شخص سے بھی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے مشورہ طلب کیا یا رائے پوچھی اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے حق میں جواب دیا۔ لہٰذا کثرت رائے کی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔ یہ دور کی کوڑی لانے کی بات ہے۔ دولت، آرام، عیش پسندی اور مفتوحہ مہذب ممالک کی شاندار تہذیب کی تقلید یا اس سے مستفید ہونے کا سوال کسی کے پیش نظر نہ تھا۔ اگر ہوتا تو لوگ عہد عثمانی کے اواخر میں انہی باتوں پر معترض کیوں ہوتے؟ خاص کر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی مہم اور جدوجہد انہی کے خلاف تھی۔ اور پھر عہد فاروقی میں ایک فلاحی مملکت عملاً وجود میں آ چکی تھی سب کو روٹی، کپڑا، مکان ملتا تھا اور خود خلیفہ مجمع عام میں کہتا تھا کہ اگر دور افتادہ دریائے فرات کے کنارے ایک بکری بھی بھوکی مر گئی تو اللہ عمر رضی اللہ عنہ سے جواب طلبی کرے گا۔ موقع اور حالات کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام و فلسطین میں لڑنے والے مجاہدوں کو قیمتی ریشمی لباس پہننے اور پر تکلیف غذائیں کھانے کی اجازت دے دی تھی انہوں نے جائز طریقے سے دولت کمانے سے بھی کسی کو منع نہیں کیا بلکہ خود لوگوں کو مشورہ دیتے تھے کہ اپنا فالتو روپیہ اونٹ، بکری، گھوڑوں وغیرہ کی تجارت میں لگائیں یہ "احساس محرومی" کا تصور ابوالنصر کے ذہن کی پیداوار ہے اور اس کا عثمان رضی اللہ عنہ کی ترجیح سے کوئی تعلق نہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ملت کی خیر خواہی کے لئے حالاتِ حاضرہ کا گہری نظر سے جائزہ لے کر ایک غیر جانبدار مبصر اور حکم کے طور پر اپنا فیصلہ دیا۔ غیب کا علم تو انہیں نہ تھا۔ ان کی نیت نیک تھی۔ پھر حالات جو پیش

---

[1] خلافت کا عروج و زوال (Caliphate, Its Rise, Decline And Fall) صفحہ ۱۹۷ ایڈیشن ۱۹۱۵

آئے سو آئے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت خلیفہ منتخب ہو جاتے تو شاید بارہ برس بعد پیش آنے والے حالات کا اسی وقت آغاز ہو جاتا۔

اگرچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عہد عثمانی میں ملکی و سیاسی مہمات میں زیادہ سرگرم حصہ نہیں لیا لیکن بعض روایات کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کے نصف آخر میں ان کی بعض پالیسیوں کی بنا پر کچھ اختلافات پیدا ہو گئے تھے جو نیک نیتی اور امت کی خیر خواہی پر مبنی تھے لیکن اختلافات کا مطلب باہمی رنجش اور عداوت نہیں۔ اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت ہر بدری صحابی کو اپنے ترکہ میں سے چار سو طلائی دینار دینے کی وصیت کی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی یہ رقم وصول کی۔ اگر باہمی ناراضگی ہوتی تو کیوں لیتے؟

ذریعۂ معاش

تجارت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا خاندانی پیشہ چلا آتا تھا۔ وہ مکہ میں بھی تجارتی کاروبار کرتے تھے۔ مدینہ پہنچ کر بھی انہوں نے روزِ اول سے تجارت شروع کر دی اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق تجارت کرتے تھے۔ ملاوٹ، بیجا نفع خوری اور ذخیرہ اندوزی سے بچتے تھے۔ ان کا ایک بڑا اصول یہ تھا کہ ملتا ہوا نفع واپس نہ کیا جائے خواہ کتنا ہی کم ہو۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جس تجارت کا منشا زیادہ نفع کمانا ہو وہ تجارت نہیں کوئی اور شے ہے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہمیشہ یاد رہتا تھا کہ سچا تاجر صدیقوں کا ہم نشیں ہوگا۔ (کاش پاکستان کے تاجر حضرات بھی اس ارشاد نبوی پر عمل کرتے) اللہ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی تجارت میں اسقدر برکت دی کہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں پتھر کو بھی ہاتھ لگاؤں تو سونا ہو جاتا ہے ان کا شمار چند دولت مند ترین صحابہ میں ہوتا تھا۔ بہت کمایا، بہت خرچ کیا۔ قارونیت کی راہ پر نہیں چلے۔ ان کو ''دھن دیئے دھن نہ گھٹے'' پر یقین تھا۔ عمر کے آخری حصے میں زراعت بھی بڑے پیمانے پر شروع کر دی تھی۔ مقام جرف کی اراضی میں بیس اونٹوں سے آب پاشی اور کاشت کاری کرتے تھے، دوسرے بدری صحابہ کی طرح وہ بھی بڑے وظیفہ پانے والوں میں سے تھے۔ مالِ غنیمت میں سے بھی حصہ ملتا تھا، لیکن وہ اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس طرح فراخدلی سے راہ خدا میں خرچ کرتے رہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانے میں کرتے تھے۔

انفاقِ فی سبیل اللہ

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے تجارت و زراعت سے بے اندازہ دولت کمائی اور راہِ خدا میں دل کھول کر بے اندازہ خرچ کی۔ انہیں انفاقِ فی سبیل اللہ میں بہت انہماک تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارۂ ابرو کے منتظر رہتے تھے کہ ملی مصالح پر خرچ کرنے کا حکم دیں تو مال و اسباب پیش کریں۔ عامتہ المسلمین کی حاجت روائی کے لئے بھی آپ کے دروازے کھلے رہتے تھے۔ احتکار و اکتناز ان کا اور دوسرے صحابہ کا شعار نہ تھا۔ وہ آیہ ''قل العفو'' کے رمز آشنا تھے۔ ان کے صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کے بہت سے واقعات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں اور

کمونزم کی باتیں کرنے والوں اور سرمایہ داروں کے لئے مشعل راہ۔ ایک دفعہ ان کا بہت بڑا تجارتی قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا مدینہ پہنچا جس میں اور چیزوں کے علاوہ سات سو اونٹوں پر صرف گندم، آٹا اور دوسری اشیائے خوردنی بار تھیں۔ انہوں نے سارے کا سارا غلہ اور دوسرا تجارتی سامان، اونٹوں اور ان کے پالانوں سمیت اللہ کی راہ میں مسلمان حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپیل پر اپنا نصف مال پیش کر دیا۔ پھر دو دفعہ ایسا ہوا کہ چالیس چالیس ہزار طلائی دینار دیئے۔ مسلمانوں کی جہاد کی تیاریوں کے لئے پانچ سو گھوڑے اور ڈیڑھ ہزار اونٹ دیئے۔

ایک دفعہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ''اے ابو محمد! تم مالدار اور صاحب ثروت ہو۔ لیکن جنت میں تم گھسکتے گھسکتے جاؤ گے۔ اس لئے اللہ کو قرض دو تا کہ وہ تمہارے پاؤں کھول دے۔'' ابن عوف رضی اللہ عنہ نے پوچھا ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ کو کیا قرض دوں؟'' فرمایا ''جس پر تمہاری شام گزری ہو اس سے شروع کرو۔'' پھر پوچھا ''کیا سب کا سب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟'' فرمایا ''ہاں۔'' چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اللہ کی راہ میں سب کچھ لٹانے کا ارادہ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے چلے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیجا کہ ''جبریل نے آ کر کہا ہے کہ ابن عوف کو مہمان نوازی، مساکین کو کھانا کھلانے اور سائلین کی حاجت روائی کا حکم دیجئے اور وہ اپنے قرابت داروں سے شروع کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کے مال کی زکوٰۃ ہو گئی۔'' چنانچہ ایسا ہی کیا

عہد نبوی کے بعد ایک دفعہ حضرت ابن عوف کے پانچ سو اونٹ غلہ اور دوسرے بہترین مال تجارت سے لدے ہوئے آئے۔ وہ سب کے سب راہ خدا میں صدقہ کر دیئے۔

ایک دفعہ ایک قطعہ زمین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ چالیس ہزار دینار میں بیچا اور ساری کی ساری رقم راہ خدا میں تقسیم کر دی۔ اس فیاضی اور سخاوت کے باوجود اکثر متفکر رہتے کہ کہیں کثرتِ مال آخرت میں نقصان کا باعث نہ ہو۔

ملی امور میں دل کھول کر خرچ کرتے تھے، اس کے علاوہ اپنے قبیلہ بنو زہرہ کے غربا و مساکین کی اعانت بالخصوص اپنے ذمہ لے رکھی تھی اور بالعموم مدینہ کے سبھی حاجت مندوں کی کفالت کرتے تھے۔ مدینہ کی تقریباً ایک تہائی آبادی کو صلہ رحمی کے طور پر دیتے تھے ایک تہائی کے قرضے اپنے پاس سے ادا کرتے تھے اور کچھ لوگوں کو ان کی ضرورت کے لئے قرضِ حسنہ دیتے تھے۔ لیکن کیا مجال کہ کبھی اظہار و نمائش کی دانستہ کوشش کی ہو۔ علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں لکھا ہے کہ ''آپ خدا کی راہ میں بہت خرچ کرنے والے تھے۔'' اسی طرح، القول المختار، کا مصنف بھی اعتراف کرتا ہے کہ ''آپ بہت زیادہ صدقہ کرنے والے تھے۔''

ترکہ اور وصیت

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ راہ خدا میں خرچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ جتنا خرچ کرتے تھے اللہ اس سے کہیں زیادہ دیتا تھا۔ وفات کے وقت ساڑھے چھبیس لاکھ دینار چھوڑے۔ ایک ہزار اونٹ،

ایک سو گھوڑے، تین ہزار بکریاں اور اراضی اس کے علاوہ تھیں۔ سونے کی اتنی بڑی مقدار تھی کہ اسے کلہاڑیوں سے کاٹنا پڑا۔ چار بیویوں میں سے ہر ایک کے حصہ میں اسی ہزار درہم آئے۔ بقیہ ترکہ میں حسب ذیل خصوصی وصیت کی:

۱- ایک سو بدری صحابہ جو بقید حیات تھے، ان میں سے ہر ایک کو چار چار سو دینار دیئے جائیں۔ یعنی کل چالیس ہزار دینار۔

۲- پچاس ہزار دینار غربا و مساکین میں تقسیم کیے جائیں

۳- ایک ہزار اونٹ فی سبیل اللہ دیئے جائیں

۴- ایک باغ مالیتی چار لاکھ درہم امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے لئے چھوڑا

آج کے کروڑ پتی مسلمان کو حضرت ابن عوف کا اسوہ دعوت تقلید دیتا ہے۔ ہے کوئی اس راہ پر چلنے والا؟ نکتہ چینی بہت آسان ہوتی ہے

امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی حفاظت اور خبر گیری

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات سے فرمایا تھا کہ میرے بعد جو شخص تمہاری حفاظت اور خبر گیری کرے گا وہ نہایت صادق اور نیکوکار ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد یہ خدمت حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اپنے ذمہ لی۔ وہ حج و عمرہ کے سفر میں امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے ساتھ جاتے۔ سواری، پردہ اور دوسری ضروریات کا انتظام کرتے۔ جہاں امہات المومنین کا پڑاؤ ہوتا خود اس کی حفاظت کرتے اور کسی کو قریب نہ آنے دیتے۔ وقتاً فوقتاً ہدیئے اور تحائف بھیجتے رہتے۔ مختلف مواقع پر بڑی بڑی رقوم بھی پیش کیں۔ ایک دفعہ ایک جائیداد پیش کی جو چالیس ہزار دینار میں فروخت ہوئی۔ ایک دوسرے موقع پر چار لاکھ درہم بھیجے۔ وفات کے وقت بھی اپنے ترکہ میں سے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے لئے ایک باغ کی وصیت کی جو چار لاکھ میں فروخت ہوا۔ رقم امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے آپس میں بانٹ لی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ "اللہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو جنت کے چشمہ سلسبیل سے سیراب کرے۔"

سیرت و اخلاق و علم و فضل

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ علم و فضل، تفقہ فی الدین اور اصابت رائے میں ممتاز تھے۔ وہ ان چند صحابہ میں سے تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارک ہی میں فتویٰ دینے کی اجازت دے رکھی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی یہ خدمت ان کے ذمہ رہی اور انہوں نے متعدد مواقع پر گہری دینی بصیرت کا اظہار کیا۔ بعض اہم مواقع پر اپنے علم حدیث کی بنا پر خلیفۂ وقت کو فیصلہ کرنے میں مدد دی۔ مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا سوال اٹھایا گیا تو انہوں نے اس حدیث کی تصدیق کی کہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں وراثت نہیں۔ عہد فاروقی میں جب ایران فتح ہوا

تو سوال پیدا ہوا کہ آتش پرست ایرانیوں کو کس زمرے میں رکھا جائے۔ حضرت ابن عوف نے یہ بتا کر مسئلہ حل کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کی طرح آتش پرستوں کو بھی ذمی قرار دیا تھا۔ طاعونِ عمواس کے موقع پر انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جہاں طاعون ہو وہاں نہ جاؤ اور اگر وہاں پہلے سے موجود ہو تو وہاں سے نہ نکلو۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ایک سنجیدہ اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ نے انہیں دینی اور دنیاوی معاملات میں بصیرت اور دور اندیشی سے بہرہ وافر عطا فرمایا تھا۔ تدبر اور دیانت و امانت میں سربرآوردہ تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اہل زمین میں بھی امین ہیں اور اہل آسمان میں بھی" نیز یہ کہ سچے، مخلص، پاک نفس اور صابر ہیں۔ مزید یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی خبر گیری کرے گا وہ صادق اور نیکوکار ہوگا۔ اور یہ حضرت ابن عوف تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی کہ "اے اللہ! عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو وقار عطا فرما" اور یہ بھی کہ "اے اللہ! عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو جنت کے چشمہ سلسبیل سے سیراب فرما" اپنے فہم و فراست، تدبر، اصابت رائے، دور اندیشی، معاملہ فہمی اور انصاف پسندی میں اسلام لانے سے پہلے بھی ممتاز تھے۔ قبول اسلام کے بعد اپنی تمام توانائیاں اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ عشرۂ مبشرہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ جیسے زاہد مرتاض اور ماہرین حکمت و حکومت بھی تھے۔ علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ جیسے سرفروش مجاہد اور جنگ آزما ہیرو بھی، ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے سپہ سالار بھی۔ لیکن شیخین رضی اللہ عنہما کے بعد تدبر، اصابت رائے اور دور اندیشی میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ بارہا نازک مواقع پر انہوں نے اپنے ناخن تدبیر سے گرہ کشائی کی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفا کے زمانے میں جو خدمت بھی انہیں تفویض کی گئی انہوں نے خوشدلی، دور اندیشی، ایثار، پیشگی اور دیانت داری سے سرانجام دی۔ خدمت کے بدلے کبھی عظمت کی تمنا نہیں کی۔ مناصب سے دور بھاگتے رہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں خلیفہ نامزد کرنا چاہا مگر صاف کنی کترا گئے۔ تاہم انہوں نے پس منظر میں رہتے ہوئے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔

تقویٰ، ایثار، استغناء، سخاوت اور فیاضی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے، اللہ نے ظاہری اور باطنی غنا سے نوازا تھا، کثرت مال سے خائف اور متفکر رہتے تھے۔ ہمیشہ بے لوثی اور غیر جانبداری سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمات سرانجام دیں۔ تفرقہ بازی سے دور رہے۔ آپ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ایک ایک دن میں تیس تیس غلام آزاد کرتے رہے جبکہ ایک معمولی غلام کی قیمت بھی ڈیڑھ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ اپنے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ انہیں وہی کھلاتے پلاتے جو خود کھاتے پیتے تھے۔ غلاموں کی موجودگی کے باوجود اپنا کام اپنے ہاتھ سے کر لیا کرتے تھے۔

عبادات میں بڑا انہماک تھا۔ نماز بڑے خضوع و خشوع سے پڑھتے۔ نوافل کی کثرت کرتے۔ کم سے کم آٹھ حجوں میں ان کے موجود ہونے کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے نفلی روزے بڑی کثرت سے رکھتے۔ ابوالہیاج کا بیان ہے

کہ انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا کہ وہ زبان سے کہتے جا رہے تھے ''الٰہی! مجھے نفس کے بخل سے بچائیو۔'' کفر کی حالت میں بھی کبھی شراب نہیں پی۔ زندگی کی مباح لذتوں سے اپنا حصہ لیتے تھے۔ وہ دراصل ایک دولت مند درویش تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرتے وقت ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی۔ رونگٹے کھڑے ہو جاتے، موت کو بہت یاد رکھتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا یہ عالم تھا کہ حتی الوسع کسی بھی موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دل میں انتہائی درد و گداز اور استغنا پیدا کر دیا تھا۔ مدینہ میں ایک دفعہ ایک تجارتی قافلہ لدا پھندا ایسے وقت پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ شہر میں اشیائے ضرورت خصوصاً اشیائے خورد و نوش کی قلت تھی۔ اس لئے اونٹوں کی آوازیں اور ان کی گھنٹیوں اور ساربانوں کا شور سن کر بہت سے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبے میں کھڑا چھوڑ کر قافلے کی طرف دوڑ گئے تاکہ ضروری سامان کی خریداری سے محروم نہ رہ جائیں۔[1] صرف چند صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں رہ گئے۔ جن میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی تھے حالانکہ تجارتی قافلہ انہی کا تھا لیکن وہ کسی اشتیاق یا تشویش کا اظہار کئے بغیر دلجمعی اور اطمینان سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سنتے رہے۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اکثر سفر و حضر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر تشریف لے جاتے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے ہو لیتے سیر الصحابہ کے مصنف نے مسند احمد کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے باہر تشریف لائے اور کھجوروں کے باغ میں جا کر سربسجدہ ہو گئے اور دیر تک اسی عالم میں رہے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حسب معمول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے چلے آئے تھے۔ سجدہ کی طوالت سے انہیں اندیشہ ہوا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اطہر اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس پہنچ گئی۔ اس لئے گھبراہٹ کے عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر اقدس کے قریب ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کیا بات ہے؟ انہوں نے اپنی گھبراہٹ بیان کی۔ جناب رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ جبریل علیہ السلام نے آ کر مجھے بشارت دی کہ جو مجھ پر درود بھیجے گا، اللہ اس پر درود بھیجے گا اور جو مجھ پر سلام بھیجے گا، اللہ اس پر سلام بھیجے گا۔ پس میرا یہ طویل سجدہ اپنے مولا کے حضور سجدۂ شکر تھا۔''

ابن عساکر سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صاحب زادی حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے۔ گھر میں چولہا سرد پڑا تھا۔ کھانا پکانے اور کھانے کے کوئی آثار نہ تھے۔ معلوم ہوا کہ گھر میں فاقہ ہے سرور صلی اللہ علیہ وسلم کائنات نے اپنے عالی قدر نواسوں حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کو بھوک سے بلکتے دیکھا۔ تھوڑی دیر میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے سالن اور روٹی لے آئے جسے کھا کر حضرات حسنین رضی اللہ عنہما خوشی سے کھیلنے کودنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو دعا دی کہ ''اللہ تمہارے دنیاوی امور کی کفالت کرے۔ آخرت کا میں ضامن ہوں۔''

---

[1] سورۃ جمعہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے

اسی طرح ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ! دنیا اور آخرت دونوں میں تم میرے دوست ہو۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو سوتے جاگتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا خیال رہتا تھا اور کوشش کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت صحبت میں گزاریں۔

راتوں کو نینداور بستر سے الگ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر و خیریت دریافت کرنے کے لئے نکل پڑتے کہ مبادا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی جانب سے اچانک کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے اخلاص و محبت، صدق و صفا، تقویٰ و پاکدامنی، جاں نثاری اور انفاق فی سبیل اللہ سے بہت متاثر تھے اور اکثر انہیں دعائیں دیتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کر کے مغموم و محزون رہتے۔ اپنی دولت و ثروت کے مقابلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فقر و فاقہ کی زندگی کو یاد کر کے رویا کرتے۔ شمائل ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ چند صحابہ ان کے مکان پر جمع تھے۔ اندر سے ایک بڑے برتن میں روٹی اور گوشت لایا گیا۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ دیکھ کر رونے لگے۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ اے ابو محمد! کیا بات ہوئی؟ کیوں روتے ہو؟ جواب دیا کہ ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وصال تک کبھی بھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے جو کی روٹی ہی سے شکم سیری کی ہو۔ اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جہاں تک میرا خیال ہے، ہم لوگوں کی یہ ثروت کی حالت کسی بہتری کے لئے نہیں ہے۔'' خوف دامن گیر رہتا کہ خدانخواستہ اس وعید میں داخل نہ ہو جائیں کہ تم اپنی خوبیوں اور نیکیوں کا بدلہ دنیا ہی میں پا چکے ہو۔ جیسا کہ آیت قرآنی میں وارد ہے کہ اذھبتم طیبٰتکم فی حیٰوتکم الدنیا۔ کہا کرتے کہ اب اس خوشحالی اور فارغ البالی کی حالت میں دنیا میں ہمارا زیادہ عرصے تک رہنا ٹھیک نہیں۔

ایک دفعہ افطاری کے وقت پر تکلف کھانا سامنے رکھا گیا۔ مسلمانوں کی ابتدائی فقر و فاقہ کی حالت یاد کر کے رونے لگے۔ فرمایا کہ ''مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مجھ سے اچھے تھے کہ شہید ہوئے تو کفن کے لئے صرف ایک چادر تھی جس سے سر ڈھانپتے تو پاؤں ننگے ہو جاتے اور پاؤں ڈھانپتے تو سر کھل جاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا بھی شہادت کے وقت یہی عالم تھا حالانکہ وہ مجھ سے بہتر تھے۔ لیکن اب دنیا ہمارے لئے بہت کشادہ ہو گئی ہے میں ڈرتا ہوں کہ میری نیکیوں کا معاوضہ اسی دنیا میں نہ ہو گیا ہو۔'' یہ کہہ کر بہت روئے اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

آپ کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ اگرچہ پر تکلف نہ تھا لیکن خوشحالی کا آئینہ دار ضرور تھا۔

خارش یا کسی دوسرے عارضے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ریشمی لباس پہننے کی اجازت دی تھی اور وہ دور خلفا میں بھی ریشم و حریر کا قیمتی لباس پہنتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کی وجہ سے کبھی کسی نے شرعی اعتراض نہ کیا۔ لیکن ایک دفعہ جب ان کے صاحب زادے بھی ریشمی قمیض پہن کر ان کے ہمراہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے صاحب زادے کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر قمیض پھاڑ ڈالا اور فرمایا کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں ریشم پہننے کی اجازت دی تھی، تمہارے لڑکے کو نہیں۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ

خاموش رہے۔

اکثر سیاہ عمامہ باندھا کرتے اور کہا کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند تھا۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

''اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح (انہوں نے) بہت سی شادیاں مختلف قبائل کے بااثر، صاحب اقتدار اور معزز گھرانوں میں کیں...... اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت کی ذمہ داری لے لیتے تو بلاشبہ بہت سی نسبتیں اور بہت سے تعلقات اپنے ساتھ وابستہ کر سکتے اور ان نسبتوں اور تعلقات کو بہت اچھی طرح ہم آہنگ بھی بنا لیتے جس کی وجہ سے بہت سے ٹوٹے ہوئے جڑ جاتے۔ وہ عوام کی دولت کا انتظام بھی اپنی دولت کی طرح کرتے، برمحل صرف کرتے، ٹھکانے سے لگاتے، نفع بخش بناتے اور انصاف کے ساتھ خرچ کرتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں مجلس شوریٰ میں رکھا اور یہ کہہ کر انہیں تمام صحابہ سے ممتاز کر دیا کہ اگر تین ایک طرف ہوں اور تین دوسری طرف، تو جدھر عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہوں اس کو پسند کرو۔ گویا ووٹوں کی برابری کی صورت میں حق ترجیح دے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں مجلس شوریٰ کا قریب قریب صدر بنا دیا۔''

طٰہٰ حسین مزید لکھتے ہیں کہ ''بعض صحابہ کی نظر میں عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دینا بہت سی خرابیوں سے بچ جانا تھا۔ کیونکہ انصار سمیت ان کی تمام سرکردہ خاندانوں میں رشتہ داری تھی اور وہ یکساں طور پر سبھی کو قابل قبول ہوتے۔ لیکن انہوں نے خلافت کی امیدواری نہیں کی اور دو امیدواروں میں حکم بننا منظور کر لیا۔ دونوں امیدواروں نے آپ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر رضامندی کا اظہار کر دیا...... اپنی ذات کو حکومت اور اس سے لپٹے ہوئے شکوک وشبہات سے اونچا رکھا اور یہ گوارا کیا کہ ایک معمولی آدمی کی طرح اپنی دنیا اور اپنے دین تک اپنے کو محدود کر لیں۔''

ابن عساکر نے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے آ کر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے حسب ذیل گستاخانہ سوال و جواب کئے اور انہوں نے نہایت نرمی، تحمل اور بردباری سے جواب دیئے:

سوال: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کوئی اور پیغام بھی پہنچایا جو ہم تک نہ پہنچایا آپ کو کوئی ایسی بات بتائی جو دوسروں کو نہ بتائی ہو؟

جواب: (نہایت نرمی سے)۔ میں بھی وہی کچھ جانتا ہوں جو تم جانتے ہو۔ تم سے اور دوسروں سے کوئی الگ پیغام مجھ تک نہیں پہنچا۔

سوال: پھر کیا وجہ ہے کہ ہم تو دنیا سے دور بھاگتے اور آپ لوگ اسے گلے لگاتے ہیں، ہم لوگ جہاد کے لئے گھروں سے نکلتے ہیں اور آپ لوگوں کو یہ گراں معلوم ہوتا ہے حالانکہ آپ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تربیت سے براہ راست فیض اٹھایا اور اس لئے آپ لوگ ہمارے پیشوا ہیں؟

جواب: (بدستور نرمی سے) ہم میں اور تم میں کوئی امتیاز نہیں۔ جب خدا نے مصائب اور شدائد کے ذریعے

ہمیں آزمایا تو ہم نے صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔لیکن پھر جب ہمیں مال و دولت کی فراوانی سے پرکھنا چاہا تو ہم سے برداشت نہ ہوسکا۔

ان جوابات میں کسی تفوق، کسی بڑائی، کسی غرور وتکبر یا دولت وثروت کے نشے کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ بلکہ آخری جواب کے آخری حصے سے ایک قسم کی حسرت اور پشیمانی ٹپکتی ہے۔ یہ ایک ایسی روح کی پکار ہے جو اپنی کار گزاری پر مطمئن نہ ہو اور ایک معمولی معترض کے سامنے اپنی خامی کا صاف اعتراف کرے۔ یہ انکسار، یہ اعتراف عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی عظمت کی دلیل ہے۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی صحابہ وہ گروہ یا قوم تھے جن پر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکابر صحابہ کو مدینہ سے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ اس لئے وہ عموماً جہاد میں بھی شامل نہ ہو سکتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے احتجاج بھی کیا تھا اور وجہ بھی پوچھی تھی مگر وہ ٹال گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور دوسرے بزرگ صحابہ جنہوں نے عہد نبوی کے غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، عہد خلفا میں بھی جہاد سے کتراتے نہ تھے بلکہ خلیفۂ وقت انہیں صلاح ومشورہ وغیرہ کے لئے نیز ان کے اثرات کو باہر پھیلنے سے روکنے کے لئے انہیں باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ شام کی مہم پر جانے کے لئے اپنے آپ کو پیش بھی کیا تھا۔ جہاں تک مال و دولت کا تعلق ہے، ان بزرگ حضرات نے ناجائز ذرائع سے جمع نہ کیا اور نہ کبھی اس کو راہ خدا میں خرچ کرنے سے دریغ کیا۔ قیاس کہتا ہے کہ مندرجہ بالا سوال و جواب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری نصف عہد میں ۳۲ ہجری یا اس سے کچھ قبل ہوئے ہوں گے جبکہ بدوی عرب قبائل قریش کے اکابر مہاجرین اور سابقون الاولون کے اثر ورسوخ کے خلاف ہوتے جا رہے تھے اور اسے چیلنج کرنے کے موڈ میں تھے اور قریش کا اقتدار انہیں کھلنے لگا تھا۔

حلیہ

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ خوبصورت وجیہہ اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ چھریرا جسم دراز قامت اور رنگ سرخ وسفید تھا۔ قرص نقرہ جیسا سفید اور روشن چہرہ۔ سینہ کسی قدر آگے کو نکلا ہوا تھا، ستواں ناک، آنکھیں بڑی بڑی اور پلکیں گھنی تھیں۔ جلد ملائم تھی۔ داڑھی اور سر کے بالوں میں تغیر نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے خضاب نہیں لگاتے تھے۔ ریش دراز تھی۔ سر کے بال کانوں سے نیچے تک گھنگرالی کاکلوں کی صورت میں لٹکتے تھے۔ کلائیاں مضبوط، ہتھیلیوں پر گوشت اور انگلیاں موٹی تھیں۔ غزوۂ احد میں سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ پاؤں کے زخم کے باعث لنگڑا کر چلتے تھے۔

ازواج واولاد

دوسرے اکابر صحابہ کی طرح حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بھی مختلف اوقات میں مختلف قبائل کے بااثر اور معزز گھرانوں میں متعدد شادیاں کیں۔ محمد بن سعد نے طبقات میں ان کی چودہ بیویوں کے نام گنوائے ہیں۔ بیویوں سے لطف ومحبت کا برتاؤ کرتے تھے اور اپنی مالی حیثیت کے مطابق مہر ادا کرتے تھے۔ ایک انصاری خاتون سے شادی کی تو بیس ہزار دینار بطور مہر ادا کیے۔ تاریخ نے ان کے اکیس بیٹوں اور سات بیٹیوں کے نام محفوظ رکھے ہیں۔ بعض بیٹوں نے جہاد افریقہ میں حصہ لیا اور شہید ہوئے۔

روایت حدیث

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ روایت حدیث میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکثر حاضر رہنے کے باوجود ان سے صرف پینسٹھ احادیث مروی ہیں۔ عشرۂ مبشرہ والی حدیث بھی آپ نے روایت کی ہے جو یہ ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں، علی رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں، طلحہ رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں، زبیر رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں، سعید بن زید رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

(مسند احمد حنبل وغیرہ)

صحیح بخاری میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے بھی عشرہ مبشرہ والی حدیث مروی ہے۔ جس میں انہوں نے ازراہ انکسار اپنا نام نہیں لیا، صرف اشارہ کیا ہے یہاں آپ کی روایت کردہ چند اہم اور بصیرت افروز احادیث کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔

عالم عابد سے بہتر ہے

عالم کو عابد پر ستر درجہ فضیلت حاصل ہے۔ ہر درجہ کی پستی و بلندی میں وہی فرق ہے جو آسمان اور زمین کی پستی و بلندی میں ہے۔

بہترین اعمال

تھوڑی سی سمجھ اور تھوڑا سا مسائل کا علم بہت سی عبادت سے بہتر ہے۔ تمہارے بہترین اعمال وہ ہیں جو آسان اور سہل ہیں۔ یعنی جن پر مواظبت ہو سکے۔

صدقہ دینے، معاف کرنے اور سوال نہ کرنے کی عظمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں ہیں۔ میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔

۱- صدقہ سے مال کبھی کم نہیں ہوتا۔ اس لئے تم صدقہ کرو۔

۲- کوئی بندہ کسی کے ظلم و زیادتی کو صرف خدا کی خوشنودی کے لئے معاف نہیں کرتا مگر خدا اس کو بہت بلند کرتا اور بڑھاتا ہے۔

۳- کوئی بندہ دست سوال دراز نہیں کرتا مگر اس پر تنگ دستی اور فقر و احتیاج کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔

عورت اور جنت

جب عورت اپنی پنج وقتہ نمازیں پڑھ لے اور رمضان کے روزے رکھ لے اور اپنے شوہر کے خاص حقوق کی نگہداشت کرلے اور اس کے احکام کی تعمیل کرلے، تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے اس میں داخل ہو جائے۔

صلۂ رحمی اور قطع رحم

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں اور میں بہت رحم کرنے والا ہوں۔ میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام سے حصہ دیا ہے۔ جو صلہ رحمی کرتا ہے، میں بھی اپنی رحمت اس کو پہنچاتا ہوں اور جو قطع رحم کرتا ہے میں بھی اسے بالکلیہ اپنی رحمت سے منقطع اور مایوس کر دیتا ہوں۔

مریض کی عیادت

جس نے مریض کی عیادت کی، وہ بیٹھنے تک خدا کی رحمت میں داخل ہوتا ہے اور جب بیٹھ جاتا ہے تو رحمت اسے چاروں طرف سے ڈھانپ لیتی ہے۔

غلاموں سے سلوک

تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو غلاموں سے اچھا سلوک کرے۔

وفات

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی عمر پر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے پچھتر سال اس دنیائے فانی میں گزارے۔ محمد ابن سعد نے طبقات میں نیز صاحب اکمال نے ان کا سال وفات ۳۲ ہجری دیا ہے جبکہ ابن اثیر نے ۳۵ ہجری لکھا ہے۔ بعض کی رائے میں ان کا سال وفات ۳۱ ہجری ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس سال چھوٹے تھے۔ اس لئے حضور کی وفات کے وقت ان کی عمر ترپین سال تھی۔ ان کی عمر پچھتر سال جبھی ہوتی ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بائیس سال زندہ رہے ہوں۔ لہٰذا ۳۲ ہجری ہی صحیح سال وفات معلوم ہوتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے کتب حمران سے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت کی وصیت لکھوائی تھی۔ انہیں معلوم ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے احتجاج اور اپنی نارضامندی کا اظہار کیا اور اللہ سے دعا کی کہ ''باری تعالیٰ! مجھے عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے اس دنیا سے اٹھا لے۔'' دعا قبول ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جن فتنوں کے آثار

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخر عہد میں دکھائی دینے لگے تھے، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ان سے مشوش تھے اور عاقبت کے متعلق فکرمند۔ وہ فتنوں اور بلاؤں کے نزول سے پہلے اپنے خالق حقیقی کے ہاں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی وفات پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو الفاظ کہے وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان کے جنازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ ''اے ابن عوف! جا تو نے دنیا کا صاف پانی پایا اور گدلا چھوڑ دیا۔'' یعنی نیکی اور بھلائی حاصل کی اور برائی اور فتنے سے بچ گئے۔

انہیں کفن بھی کیا خوب اور متبرک ملا۔ ایک خاتون اپنے ہاتھ سے ایک چادر بن کر بطور خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر لائیں۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چادر تہمد کے طور پر باندھی اور بڑی تعریف کی۔ ہدیہ لانے والی کی دلجوئی کا یہ ایک حسین انداز بھی تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے وہ چادر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لئے مانگ لی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر تک باندھنے رکھنے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو عنائت فرما دی۔ انہوں نے یہ چادر سنبھال کر اپنے کفن کے لئے محفوظ رکھی۔

علالت کے دوران میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے طور پر کہلا بھیجا کہ اگر آپ چاہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے بھائیوں ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دفن ہوں۔ مگر انہوں نے ازراہ ادب انکار کیا اور شکریہ کے ساتھ کہلا بھیجا کہ آپ کا گھر تنگ ہو جائے گا جو مجھے گوارا نہیں۔ نیز مجھ میں اور عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ میں یہ قول وقرار تھا کہ ہم میں سے جو بعد میں وفات پائے وہ پہلے وفات پانے والے کے پہلو میں دفن ہو۔ لہٰذا مجھے انہی کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ ان کی وصیت کی تعمیل کی گئی۔ خلیفۂ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور جنت البقیع میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ (جنت البقیع میں سب سے پہلے دفن ہونے والے مسلمان) کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ سلطان ابن سعود کی حکومت سے پہلے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے مزارات پر ایک ہی قبہ ہوا کرتا تھا۔ اب صرف حجاج کے معلم مٹی ہوئی قبروں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ رہے نام اللہ کا!

وفات پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہلا بھیجا کہ جنازہ میرے گھر کے سامنے سے لے جایا جائے۔ چنانچہ آپ کی خواہش کے احترام میں ایسا ہی کیا گیا اور آپ نے ان پر نماز جنازہ پڑھی۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جنازہ اٹھانے والوں میں شامل تھے اور کہتے جاتے تھے واجبلاہ۔ یعنی افسوس کہ پہاڑ جیسا عظیم انسان چل بسا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

۱- صدقہ ت
۲- کوئی بند
بڑھات
۳- کوئی بڑ
عورت اور
جب
نگہداشت
اس میں داخ
صلۂ رحمی
اللہ
اپنے نام
اسے بالکل
مریض
جہ
اسے چار
غلامول
ت

دنیا
جبکہ ا
دس س
ہے کہ

تھی
تعالیٰ

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ

صاحب امر......(چلتا پھرتا شہید)

''جو شخص زمین پر شہید کو چلتا پھرتا دیکھنا چاہے وہ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے۔''

(رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

اُحد کا میدان کارزار ہے۔ مسلمان ابتدائی کامیابی کے بعد درے پر تعینات تیر اندازوں کی غلطی سے قریش مکہ کے نرغے میں آچکے ہیں اور بدحواسی میں افراتفری اور بھگدڑ مچ گئی ہے دشمن نے اپنی تمام کوششوں اور حملوں کا ہدف نبی آخرالزماں ﷺ کی ذات اقدس کو بنالیا ہے تیروں، تلواروں، نیزوں، پتھروں کے حملوں کا رخ انہی کی طرف ہے وہ اسلام کی جڑ بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے پر تلے ہوئے ہیں۔ محمد ﷺ نہیں رہیں گے تو اسلام بھی نہیں رہے گا۔ نہ بانس ہوگا نہ بانسری بجے گی، نہ چراغ جلے گا نہ روشنی ہوگی۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

کفار کی اچانک اور بے پناہ یورش سے مسلمانوں کی اکثریت تتر بتر ہو چکی ہے۔ نبی صادق و مصدوق ﷺ کے گرد صرف دس بارہ جاں نثار باقی رہ گئے ہیں جو سینکڑوں ہزاروں دشمنوں کے مقابلے میں جو کھی لڑ رہے ہیں، حضور اکرم ﷺ کی حفاظت کے لئے آپ ﷺ کے ہاتھ پر موت کی بیعت کرنے والے انصار کا دستہ حضرت زید بن سکن رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جاں نثاری کا حق ادا کر کے شہید ہو چکا ہے۔ علمبردار اسلام مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے جھنڈا کو اونچا رکھنے کی کوشش میں جذب وجنون جہاد کا انتہائی مظاہرہ کرتے ہوئے دشمنوں کی تلواروں سے یکے بعد دیگرے اپنے دونوں ہاتھ کٹوا دیئے اور پھر کٹے ہوئے بازوؤں اور دانتوں کی مدد سے جھنڈے کو سنبھالتے ہوئے مرتبہ شہادت حاصل کر لیا ہے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے شیر حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی کئی دشمنوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد خود جنت میں پہنچ چکے ہیں۔ اور ان کی لاش کا بڑی بے دردی سے مثلہ کیا جا چکا ہے۔ اب حضور رحمت للعالمین ﷺ کے گرد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذوالفقار چمکتی دکھائی دیتی ہے یا حضرت ابو دجانہ انصاری رضی اللہ عنہ کی وہ تلوار جو آغاز جنگ میں خود جناب رسالت مآب ﷺ نے انہیں عنایت کی تھی اور وہ زخم پر زخم کھا کر لیکن اپنے آقا و مولا ﷺ کو بہر صورت بچا کر اس کا حق ادا کر رہے ہیں کبھی تلوار چلاتے ہیں، کبھی اپنے جسم کو ڈھال بنالیتے ہیں کہ ہادی برحق پر آنچ نہ آنے پائے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنی تیر اندازی کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ جب ان کا اپنا ترکش خالی ہو جاتا ہے تو نبی ملاحم ﷺ اپنا ترکش بھی انہیں دے دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ''اے سعد! تیر چلائے جا، میرے ماں باپ تجھ پر قربان۔ ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے بھی کمال شجاعت و فدا کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ لڑتے لڑتے ان کے ہاتھ میں دو کمانیں اور ایک تلوار ٹوٹ چکی ہے اور تو اور حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا بھی حضور ﷺ کے دفاع میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا رہی ہیں اور دوہری زرہ پہنے ہوئے ابن قمیہ کے مقابلے میں آجاتی ہیں اسے زخمی کرتی ہیں اور خود بھی زخمی ہو جاتی ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سب شمع رسالت ﷺ کے گرد پروانہ وار جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر لڑ رہے ہیں۔ کفار کے حملے شدید سے شدید تر ہوتے جا

رہے ہیں۔ اتنے میں کفار جناب ختمی مرتبت ﷺ کے شہید ہو جانے کی جھوٹی افواہ اڑا دیتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کے رہے سہے حوصلے بھی ٹوٹنے لگتے ہیں اور کچھ لوگ ہتھیار پھینک کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اب لڑنے سے کیا حاصل؟ حضرت انس بن نضر ان رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرتے ہیں اور بیٹھ رہنے کی وجہ معلوم ہونے پر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اب جینے سے کیا حاصل؟ پھر کفار پر حملہ کر کے مردانہ وار لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کرتے ہیں۔

اس تمام افراتفری، مایوسی، ہنگامہ آرائی اور یورشِ اعدا کے دوران میں ایک میانہ قامت، گندم گوں، خوبرو، بسیار مو، پتلی ناک والا شخص رسول اکرم ﷺ کے سب سے زیادہ قریب تھا اور دشمنوں کے حملوں کو روکنے کے لئے شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا۔ اسے اپنی جان کی قطعاً کوئی پروانہ تھی۔ اگر فکر اور پروا تھی تو یہی کہ اس کے آقا و مولا ﷺ کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ کبھی وہ آگے بڑھ کر دشمنوں پر حملہ کرتا، کبھی دشمنوں کے حملے کو روکنے کے لئے سرکارِ دو جہاں ﷺ کے سامنے ڈھال بن جاتا۔ تیروں، تلواروں، نیزوں کے وار اپنے جسم اور ہاتھوں پر لیتا، اس کی جارحانہ اور مدافعانہ رفتار میں بجلی کی سی تیزی تھی۔ زخموں سے اس کا جسم چھلنی ہو گیا، تلوار کے وار سے دو انگلیاں کٹ گئیں۔ حضور ﷺ کی طرف آنے والے ایک تیر کو بھی اپنے ہاتھ پر لیا جو ہتھیلی کو چھیدتا ہوا نکل گیا اور ہاتھ ہمیشہ کے لئے شل ہو گیا۔ ایک اور وار سے پاؤں کی رگ نسا کٹ گئی۔ کھاؤں کدھر کی چوٹ، بچاؤں کدھر کی چوٹ، کا عالم تھا، سر میں یکے بعد دیگرے دو نیزے لگے۔ تمام خون بہہ گیا۔ پیشانی میں ایک بہت چوکور زخم لگا۔ لیکن اللہ کا وہ جوانمرد لڑتا رہا اور حضور اکرم ﷺ کو دشمنوں کے حملوں سے حتی الوسع بچاتا رہا۔ پھر یوں ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک چٹان پر چڑھنے کا ارادہ کیا مگر دوہری زرہ کے بوجھ کی وجہ سے نہ چڑھ سکے اور پاؤں رپٹنے سے گڑھے میں گر گئے۔ وہی زخموں اور خون میں نہایا ہوا شخص پھرتی سے گڑھے میں اترا اور اپنی پیٹھ حضور ﷺ کے آگے جھکا دی۔ آپ ﷺ اس کی پیٹھ پر چڑھے اور اوپر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دست مبارک پکڑ کر باہر نکالا۔ حضور ﷺ کو اپنی پیٹھ پر لادے وہ شخص لے کر چلا اور کفار سے لڑتا بھڑتا آپ ﷺ کو لے کر محفوظ جگہ پر پہنچ گیا وہ خود اس وقت ادھ موا اور نیم بے ہوش ہو رہا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی سلامتی کی خبر پا کر بکھرے ہوئے صحابہ آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ پہلے اپنے ساتھی کی خبر لو۔ اس نے اپنے پر جنت واجب کر لی۔ یہ چلتا پھرتا شہید ہے۔

شمع رسالت ﷺ کا یہ پروانہ کون تھا؟

تاریخ اسلام میں یہ صحابی رسول ﷺ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے دنیا کی تاریخ میں عقیدت، عزیمت، فدائیت اور شجاعت کی درخشاں مثال قائم کر دی۔ گننے والوں نے ستر سے زائد زخم ان کے جسم پر گنے۔ احد کا دن ان کا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں "طلحہ الخیر" کا لقب دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں ہمیشہ "صاحب احد" کہہ کر پکارتے تھے۔ تین ہزار کفار کے مقابلے میں سات سو اللہ والوں کی صف بندی اور ان میں سے بھی کوئی درجن بھر جاں نثاروں کی اپنے ہادی برحق ﷺ کے گرد جانفروشانہ حصار بندی، حق و باطل کی

ایسی جان کاہ آویزش اور جذبۂ جاں سپاری کے ایسے مناظر چشم فلک نے پہلے کاہے کو دیکھے ہوں گے۔

طلحہ الخیر، طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کا اسلام کے ابتدائی ہیروؤں میں بہت بلند مقام ہے۔

ابتدائی حالات......نام ونسب

(حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کے ایک چھوٹے قبیلہ بنی تیم سے تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی اسی قبیلہ سے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب چھٹی پشت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ ان کے والد عبید اللہ اسلام قبول کرنے سے پہلے وفات پا گئے۔ والدہ صعبہ بنت عبداللہ ایمان لائیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد تک زندہ رہیں اگرچہ ابتدا میں سخت مخالف رہیں۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ مکہ کے ان چند لوگوں میں سے تھے جو ظہورِ اسلام سے قبل لکھنا پڑھنا جانتے تھے[1] دوسرے شرفائے مکہ کی طرح ان کا پیشہ بھی تجارت تھا اور اوائل جوانی سے شام، یمن، عراق کی طرف تجارت کی غرض سے جایا کرتے تھے۔ فن تقریر وخطابت میں مہارت رکھتے تھے، عرب کے خطباء میں شمار ہوتے تھے۔[2])

قبولِ اسلام

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ترغیب وتبلیغ سے ایمان لائے۔ ایمان لانے والوں میں ان کا آٹھواں نمبر ہے۔ قبول اسلام کے ساتھ ہی ابتلا وآزمائش کا دور شروع ہوگیا۔ ان کے بڑے بھائی عثمان نے ان کو اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک ہی رسی میں باندھ کر مارا اور بہت تشدد کیا ان کے قبیلہ بنو تیم نے بھی دونوں کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ تاہم حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس واقعہ کی وجہ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ کو ''قرینین'' (ساتھی) کہا کرتے تھے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ اکثر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہتے تھے۔ بارہ تیرہ سال تک دوسرے مسلمانوں کی طرح مشرکین قریش کے ہاتھوں سختیاں اور تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ شعب ابی طالب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بنو ہاشم کے ساتھ بائیکاٹ کے تین جانگزا سال گزرے مگر پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

ہجرت

جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہمراہ لے کر مدینہ ہجرت کی تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بہ سلسلۂ تجارت شام گئے ہوئے تھے محمد ابن سعد کی طبقات میں روایت ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ کے دوران میں الخرار سے آگے کوچ کیا تو اگلے دن صبح کے وقت راستے میں طلحہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی جو شام سے قافلے کے ہمراہ آرہے تھے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کچھ شامی پارچات ہدیہ کے طور پر پیش کئے جنہیں اس بے سروسامانی کے عالم میں پاکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشنودی کا اظہار کیا اور طلحہ رضی اللہ عنہ کے حق

---

[1] عقد الفرید۔

[2] ابن ندیم

میں دعا کی۔ طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ اہل مدینہ بہت دنوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے مشتاق اور منتظر ہیں۔ مکہ واپس پہنچ کر طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے تجارتی کاروبار کو سمیٹا اور پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اہل وعیال کو ساتھ لے کر مدینہ روانہ ہو گئے۔ وہاں حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام کیا جو بیعت عقبہ اولیٰ کے بزرگوں میں سے تھے۔

مواخاۃ

مکہ کے دور ابتلا میں ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہ کی مواخاۃ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے قائم کی تھی دوسری روایت میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کا ذکر آتا ہے۔ دونوں عشرۂ مبشرہ میں سے تھے۔ پہلی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مواخاۃ قائم کرتے وقت صحابہ کی مزاجی، معاشی، سماجی، ذہنی اور روحانی کیفیات کو ملحوظ رکھتے تھے، اس لحاظ سے زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کا کیریئر بھی ملتا جلتا ہے۔ ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں حضرت طلحہ کی مواخاۃ حضرت ابی بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ سے قائم کی جو مشہور صحابہ میں سے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے فہم قرآن کی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے اور انہیں ''یا سیدی'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

غزوات میں شرکت، طلحۃ الخیر، طلحۃ الجواد، طلحۃ الفیاض

غزوۂ بدر کے سوا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سبھی غزوات ومشاہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ غزوۂ بدر میں اس لئے شریک نہ ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو قریش کے قافلے کی خبر لانے کے لئے بھیج دیا تھا۔ قافلہ راستہ بدل کر اور پہلو بچا کر نکل گیا۔ جب وہ یہ خبر لے کر آئے تو لشکر قریش سے میدانِ بدر میں جنگ ختم ہو چکی تھی۔ تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلحہ رضی اللہ عنہ اور سعید رضی اللہ عنہ کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا اور اس طرح انہیں عملاً اصحابِ بدر میں محسوب کیا۔ بدر سے غیر حاضری کی تلافی انہوں نے غزوۂ احد میں شجاعت وجاں نثاری کے عظیم مظاہرے سے کی۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جسے یہ دیکھنا پسند ہو کہ ایک شخص مر کر بھی زمین پر چلتا پھرتا ہے وہ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو دیکھے۔ مطلب یہ کہ طلحہ رضی اللہ عنہ زندہ شہید ہیں۔ یہ غالباً سورۂ احزاب کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

(ترجمہ: ایمان والوں میں سے کتنے مرد ہیں کہ سچ کر دکھایا جس بات کا عہد کیا تھا پھر کوئی تو ان میں پورا کر چکا ذمہ اپنا اور کوئی ان میں راہ دیکھ رہا ہے اور بدلا نہیں ایک ذرہ)۔

غزوۂ حنین میں بھی بڑی پامردی اور جاں فشانی دکھائی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے طلحۃ الجواد، کا لقب دیا (تبوک کے جیش عسرت کی تیاری کے لئے بہت سامال واسباب پیش کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''طلحۃ الفیاض'' کے لقب سے

نوازا۔

اس لئے لوگ انہیں طلحۃ الخیر، طلحۃ الجواد اور طلحۃ الفیاض کے القاب سے پکارتے تھے۔

غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقع پر منافقین سویلم یہودی کے مکان پر جمع ہو کر مسلمانوں میں انتشار اور بد دلی پھیلاتے اور انہیں جنگ میں شمولیت سے روکنے کے لئے سازشیں کررتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلحہ رضی اللہ عنہ کو اس کے انسداد پر مامور فرمایا۔ انہوں نے چند صحابہ کو ساتھ لے کر بڑی ہوشیاری اور مستعدی سے سویلم کے مکان کو گھیر لیا اور اسے آگ لگا دی اور منافقین کا منصوبہ ناکام بنا دیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض سرایا کا سالار بنا کر بھی انہیں بھیجا اور وہ کامیاب رہے۔ ۱۰ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں شامل ہوئے۔

صحیح بخاری (کتاب المناقب) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے وقت طلحہ رضی اللہ عنہ سے راضی تھے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مضمون نگار لکھتا ہے کہ ہجرت کے بعد طلحہ رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیروں، صلاح کاروں اور قریب ترین دوستوں میں سمجھے جاتے تھے۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور ان کے مختصر عہد خلافت میں ان سے تعاون کرتے رہے۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نامزدگی پر انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے یہ کہہ کر احتجاج کیا تھا کہ ''عمر رضی اللہ عنہ آپ کی موجودگی میں ہم پر سخت گیری کرتے تھے۔ جب وہ خود خلیفہ ہوں گے تو کیا کچھ نہ کریں گے۔ انہیں نامزد کر کے آپ اللہ کو کیا جواب دیں گے۔'' حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا کہ ''میں اللہ سے کہوں گا کہ میں تیرے بہترین بندے کو تیرے بندوں کے معاملات کا نگران چھوڑ کر آیا ہوں اور سنو! عمر رضی اللہ عنہ اس لئے سختی کرتے تھے کہ میں نرمی سے کام لیتا تھا۔ جب وہ خود خلیفہ ہوں گے تو ویسی سختی نہیں کریں گے۔'' اس جواب سے طلحہ رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے اور خوشدلی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی، ان سے تعاون کرتے رہے اور ان کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ اپنی وفات کے وقت انہوں نے اپنا جانشین منتخب کرنے کے لئے جن چھ اصحاب کی مجلس قائم کی طلحہ رضی اللہ عنہ ان میں سے ایک تھے کثرت رائے سے وہ خلیفہ بھی منتخب ہو سکتے تھے۔ کیتانی نے یہ بے پر کی اڑائی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کی سازش میں طلحہ رضی اللہ عنہ ملوث تھے حالانکہ وہ اس حادثہ فاجعہ کے وقت مدینہ سے باہر گئے ہوئے تھے اور ان کی غیر حاضری ہی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں انتخابی مجلس کا رکن نامزد کیا تھا۔

چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت تاکید تھی کہ تین دن کے اندر نیا خلیفہ منتخب کر لیا جائے اور طلحہ رضی اللہ عنہ اس دوران میں سفر سے واپس نہ آئے، اس لئے بقیہ پانچ بزرگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو منتخب کر لیا اور عام لوگوں نے بیعت کر لی، واپس آ کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو یہ امر ضرور ناگوار گزرا کہ انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن انتخاب کے کرتا

دھرتا حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں صورتِ حال سمجھائی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی فراخدلی سے پیش کش کی ''طلحہ! اگر تمہیں اس کی خواہش ہے تو میں خلافت کا منصب تمہارے لئے خالی کئے دیتا ہوں۔'' طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا ''کیا آپ واقعی ایسا کرنے پر تیار ہیں؟'' عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''بے شک'' اس پر طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''اگر ایسا ہے تو میں مطمئن ہو گیا۔ آپ سے سرتابی نہیں کر سکتا۔'' اس کے بعد دونوں کے تعلقات خوش گوار ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان پر عنایت کی نظر رکھتے تھے ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پچاس ہزار درہم قرض لئے۔ کچھ عرصہ بعد کہلا بھیجا کہ کسی کو بھیج کر اپنی رقم منگوا لیجئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے طلحہ رضی اللہ عنہ کے پیغامبر سے کہہ دیا کہ طلحہ رضی اللہ عنہ میری طرف سے رقم ادا سمجھ لیں۔ ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو دو لاکھ درہم بطور عطیہ دیئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دونوں صاحبان کے باہمی تعلقات خوشگوار تھے۔ البتہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں سبائی گروہ کی سازشوں ریشہ دوانیوں اور بعض اکابر صحابہ سے منسوب جعلی خطوط کی بنا پر ان کی بعض پالیسیوں پر اعتراض ہوئے اور بے چینی پیدا ہوئی تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی معترضین کے ہم نوا بن گئے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے بزرگ صحابہ نے وقتاً فوقتاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقاتیں کیں تاکہ اصلاحِ احوال کی صورت پیدا ہو سکے مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ سازش کے تانے بانے بہت وسیع اور مضبوط ہو چکے تھے۔

مستشرقین کے زیرِ اثر اور ان کی تقلید میں مصری مؤرخین ڈاکٹر طٰہٰ حسین رضی اللہ عنہ، حسن ابراہیم حسن، عمر ابو النصر وغیرہ طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کی آرزوئے خلافت پر زور دیتے ہیں کہ وہ عثمان رضی اللہ عنہ کی جگہ لینا چاہتے تھے، راقم کے نزدیک ان کا یہ الزام بے بنیاد ہے۔ اول تو یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں طلحہ رحمۃ اللہ علیہ یا زبیر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بن جانے کا بہت کم امکان تھا اور دونوں تو بیک وقت کسی طرح بھی خلیفہ نہیں بن سکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں طلحہ رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے لیکن تاریخ ان حالات و واقعات کے بارے میں خاموش ہے جو شدید مخالفت کا باعث ہوئے ہوں بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ اور اپنے غلام قنبر کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازے پر پہرہ دینے اور مخالفوں کو ان سے دور رکھنے کے لئے بھیجا۔ وہاں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں بیٹوں محمد اور موسیٰ کو اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بڑے بیٹے عبد اللہ کو بھی بھیجا اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع میں زخمی بھی ہوئے۔ کیا کوئی اپنے دشمن کے دفاع کے لئے اپنے بیٹوں کی جانیں خطرے میں ڈال سکتا ہے؟ اور پھر طٰہٰ حسین خود تسلیم کرتے ہیں کہ خود علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ باغیوں کا راستہ روکنے کے لئے مدینہ سے باہر جا کر خیمہ زن ہوئے تھے اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ عشرۂ مبشرہ کے دو اور بااثر بزرگ حضرت سعد بن ابی وقاص اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ علی رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، سعد رضی اللہ عنہ اور سعید رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں طلحہ رضی اللہ عنہ کو اپنے خلیفہ منتخب ہو جانے کا کیسے یقین ہو سکتا تھا؟ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محاصرے کے دوران میں اور ان کی شہادت کے بعد بھی بصری باغیوں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کی پیش کش کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا

تھا۔ یہ بھی یاد رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری بھی تھی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بھی تھی لیکن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی کوئی ایسی قرابت داری نہ تھی جو دوسرے کے مقابلے میں انہیں کسی ترجیح کا مستحق ٹھہراتی۔ عمر ابو النصر اور دوسرے مصری مؤرخین کا یہ کہنا کہ طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سب سے بڑے دشمن تھے، سمجھ میں نہیں آتا۔ طلحہ رضی اللہ عنہ ہوں یا عشرۂ مبشرہ کے دوسرے اصحاب، ان سے کسی ذاتی دشمنی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بعض پالیسیوں خاص کر بنوامیہ کو نوازنے اور انہیں اعلیٰ مناصب دینے کی بنا پر ان کی مخالفت کرنے لگے تھے لیکن ان کے جانی دشمن تو نہیں ہو گئے تھے۔ اسلام کے ارباب حل وعقد کا مرکز مدینہ تھا۔ خلیفہ کے انتخاب میں فیصلہ کن ووٹ اہل مدینہ کا ہوتا تھا۔ جسے اہل مدینہ نے خلیفہ تسلیم کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی، دوسرے صوبوں کے لوگ خود بخود اس کی بیعت کر لیتے تھے۔ باغی یہ جانتے تھے۔ اس لئے ان کی بھی یہ کوشش رہی کہ اہل مدینہ اپنے میں سے کسی کو منتخب کر کے اس کی بیعت کر لیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، بصرہ کے باغیوں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو اور کوفہ کے باغیوں نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کی پیشکش کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ کیا کوئی طالع آزما اہل ہوس ایسا کرتا؟

دراصل اکابر مدینہ، جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور بہت سے دوسرے مہاجرین وانصار شامل تھے، میں سے کسی کو سان گمان تک نہ تھا کہ آدھی دنیا کے لاکھوں، کروڑوں مسلمانوں میں سے ڈھائی ہزار مصری، کوفی اور بصری باغی ایک گھناؤنی سازش کے تحت بدو عربوں اور عجمی غلاموں کو ساتھ ملا کر خلیفہ برحق کو شہید کر دیں گے۔ بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت قبول کر لی تو سب سے پہلے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ ہی نے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بعض روایات میں ہے کہ ان سے زبردستی بیعت لی گئی، بعض میں ہے کہ انہوں نے اس شرط پر بیعت کی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیں گے۔ حالات کی مجبوریوں سے اس میں تاخیر ہوئی اور پھر باغیوں نے بیعت کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس سے طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کے دلوں میں شکوک وشبہات اور قصاص سے مایوسی نے جگہ پکڑ لی اور وہ اپنے طور پر قصاص پر کمربستہ ہو گئے۔ یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ مقتول خلیفہ کا قصاص لینا اس کے جانشین کا کام تھا نہ کہ طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ یا معاویہ رضی اللہ عنہ کا؟ بہر حال ہوا جو کچھ ہوا اور اسلام پر جو ابتلا آئی سو آئی۔ چونکہ اس المیہ میں سب سے زیادہ گھناؤنا کردار مصری باغیوں اور ان کے سرغنہ ابن سبا کا تھا، مصری مؤرخین شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی صفائی پیش کرتے اور طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کو اس المیہ کا ذمہ دار قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ تو ابن سبا کے وجود کا بھی انکار کر دیتے ہیں اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جن بزرگوں پر وہ الزام لگاتے ہیں انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دی تھی، یا شاید وہ اس کے بھی منکر ہیں۔ صدیوں پہلے مصر میں عبیدیوں نے حکومت کی۔ وہ علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر باقی عشرۂ مبشرہ کے مخالف تھے، اہل مصر میں ہنوز اس کے اثرات باقی ہیں بہر حال قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں جنگ جمل پیش آئی اور مسلمانوں میں باہمی خونریزی ہوئی۔

جنگ جمل اور شہادت

جنگ جمل کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے۔ جنگ جمل میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا کردار اپنے مواخاتی بھائی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بالکل متوازی چلتا ہے۔ وہ زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اصلاح حال اور قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے ارادے سے اپنے حامیوں کو لے کر بصرہ پہنچے کیونکہ وہاں طلحہ رضی اللہ عنہ کے حامیوں کی کثرت تھی یہ ایک طرح کی زود پشیمانی کا ردعمل تھا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طلحہ رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی خبر پہنچی تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے اس وقت جن آدمیوں کی مخالفت کی خبر پہنچی ہے ان میں سب سے زیادہ نیک اور سخی طلحہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنی فوج کے ساتھ بصرہ پہنچ گئے۔ امت مسلمہ کے خیر خواہ اور مخلص حضرات کی کوششوں سے باہمی تصفیہ کی صورت پیدا ہوگئی جس سے سب خیر خواہانِ ملت کو خوشی ہوئی لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل سازشی گروہ اور قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی فکر پڑ گئی۔ انہوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق بیک وقت دونوں لشکروں پر رات کی تاریکی میں حملہ کر دیا۔ علی رضی اللہ عنہ سمجھے کہ طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ نے غداری کی۔ طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہی خیال کیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا صبح کو اپنے اونٹ پر سوار ہو کر شہر سے کیمپ میں آئیں تو جنگ جاری تھی۔ انہوں نے چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کو جنگ سے باز رکھنا چاہا مگر جنگ کے شور و ہنگامہ میں کسی نے ان کی بات نہ سنی۔ ~~پھر جیسا کہ~~ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے حالات میں بیان کیا گیا، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آواز دے کر باہر بلایا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول یاد دلایا، انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ میدان جنگ سے اپنا گھوڑا نکال کر لے گئے۔ انہیں دیکھ کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی میدان چھوڑ جانے کا ارادہ کیا لیکن مروان بن حکم نے تاک کر زہریلا تیر مارا جوان کے گھٹنے میں لگا اور خون جاری ہو گیا اور ہزار کوشش کے باوجود بند نہ ہو سکا۔ مروان نے بھانپ لیا تھا اور وہ ڈر گیا کہ اگر طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی جنگ کو خیر باد کہہ دیا تو میدان علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ رہے گا اور پھر مروان اور اس کے ساتھی بنو امیہ کا انجام برا ہو گا اور ان کا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ جب خون بند نہ ہو سکا تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا ''زخم کو چھوڑ دو اور خون بہنے دو۔ یہ تیر خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ ہم نے عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں مداہنت سے کام لیا۔ آج ہم اس کے تدارک میں اس سے بہتر کوئی شے نہیں پاتے کہ اپنا خون بہا دیں۔ اے اللہ! تو عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ مجھ سے لے لے تاکہ وہ خوش ہو جائیں[1]۔'' کتنا کربناک اظہارِ پشیمانی ہے! حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے میں ان سے خاطر خواہ تعاون نہ کرنے کی وجہ سے ان کی ناراضی کا احساس تھا۔

ایک روایت یہ ہے کہ زخمی حالت میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا غلام انہیں بصرہ شہر کے اندر لے گیا اور دار خرابہ میں اتارا۔ بے ہوشی طاری تھی۔ تھوڑی دیر بعد انتقال کر گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ دوسری روایت میں جو زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ جنگ ختم ہو گئی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے میدان جنگ کا چکر لگایا اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ

---

[1] طبقات ابن سعد

کی لاش پر گزر ہوا۔ فرمایا ان کو بٹھاؤ۔ لوگوں نے بٹھا دیا۔ جناب علی ؓ نے ان کے چہرے سے مٹی صاف کی اور متأسفانہ لہجے میں چشم پر آب ہو کر کہا کہ ''اے ابو محمد! مجھے یہ بات بہت شاق گزری ہے کہ میں تمہیں آسمان کے تاروں کے نیچے خاک و خون میں لتھڑا ہوا دیکھوں۔ خصوصاً جبکہ تم جہاد فی سبیل اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی حفاظت میں کافی حصہ لے چکے تھے کاش میں اس واقعہ سے بیس دن پہلے انتقال کر جاتا۔'' یہ کہہ کر حضرت علی ؓ روئے اور ان کے رفقاء بھی رو پڑے۔[1]

مدفن

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے طرفین کے تمام مقتولین کی نماز جنازہ پڑھائی اور پھر تمام لاشوں کو دفن کرنے کا حکم دیا۔ حضرت طلحہ ؓ الکلا کے ساحل پر دفن کئے گئے۔ بہت بعد میں ان کے کسی عزیز نے خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ ''تم لوگ مجھے اس پانی سے بچا کر چین کیوں نہیں دیتے؟ میں غرق ہو گیا ہوں۔'' تین دفعہ یہی بات کہی۔ جب قبر کھود کر نعش نکالی گئی تو وہ پانی کے اثر سے ساگ کی طرح سبز ہو چکی تھی اور داڑھی اور چہرے کا جو حصہ زمین کے متصل تھا اسے زمین کھا گئی تھی۔ پھر ابو بکرہ ؓ کے مکانات میں سے ایک مکان خرید کر اس میں انہیں دفن کر دیا گیا[2] گزشتہ صدی کے مشہور بزرگ حضرت سید غوث علی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی تذکرۂ غوثیہ میں فرماتے ہیں کہ انہوں نے بصرہ کی سیاحت کے دوران میں حضرت طلحہ ؓ اور حضرت زبیر ؓ کے مزارات کی زیارت کی تھی۔

عمر/مماثلت

وفات کے وقت حضرت طلحہ ؓ کی عمر تقریباً چونسٹھ سال تھی تقریباً اتنی ہی عمر حضرت زبیر ؓ کی ہوئی۔ دونوں اصحاب کا کیریئر قبولِ اسلام سے یومِ وفات تک متوازی چلا۔ دونوں نے تقریباً ایک ہی عمر میں ایک ہی دن اسلام قبول کیا۔ غزوات میں اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے لئے فداکاری کے جوہر دکھائے۔ بدر کو یوم زبیر ؓ اور احد کو یوم طلحہ ؓ کہا گیا۔ دونوں نے تجارت اور زراعت سے خوب کمایا اور اللہ کی راہ میں خوب لٹایا۔ دونوں کو جنگ جمل میں دھوکے اور غداری سے قتل کیا گیا۔ نو آباد اسلامی شہروں کوفے اور بصرے میں بالترتیب زبیر ؓ اور طلحہ ؓ کے حامیوں کی اکثریت تھی۔

حضرت علی ؓ نے فرمایا:

ابن سعد نے ربعی بن خراش سے طبقات میں روایت کی ہے کہ وہ جنگ جمل کے بعد حضرت علی ؓ کے

---

[1] عشرۂ مبشرہ از قاضی حبیب الرحمن

[2] اکابر صحابہ حضرت جابر بن عبد اللہ ؓ اور حضرت حذیفہ بن الیمان ؓ کے مزارات جو بغداد سے زیادہ دور نہ تھے ۱۹۳۶ میں اسی طرح خوابوں کی بنا پر کھودے گئے۔ انہوں نے بھی پانی قریب پہنچ جانے کی شکایت کی تھی اور پھر دوسری جگہ (سلمان پاک) پر بڑی دھوم دھام سے دفن کئے گئے۔ اجساد مبارک بالکل صحیح و سالم حالت میں تھے۔ دنیا بھر کے صحافیوں، سیاحوں اور سفیروں وغیرہ نے یہ منظر دیکھا اور متعدد غیر مسلم یہ منظر دیکھ کر متاثر اور مسلمان ہوئے۔ مؤلف

پاس بیٹھے تھے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے عمران حاضر ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں مرحبا کہا اور اپنے پاس فرش پر بٹھایا اور کہا کہ مجھے امید ہے کہ اللہ مجھے اور طلحہ رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں میں سے کرے گا جن کے متعلق اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:

وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ[1]

مجلس میں حاضر ابن الکواء نے دخل در معقولات دیتے ہوئے کہا کہ اللہ اس سے بہت زیادہ عادل ہے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس طرح چلائے کہ مکان ہل گیا، اپنا درہ لے کر اس کے پاس گئے اور اسے مارا اور کہا کہ ''تیری ماں نہ رہے کیا تو اور تیرے ساتھی اس کا انکار کرتے ہیں؟ یہاں سے دور دفع ہو جاؤ۔ اگر میں اور طلحہ رضی اللہ عنہ اس آیت کے مصداق نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا؟''

عمران نے کہا کہ ''امیر المومنین! آپ نے مجھے مرحبا کہا حالانکہ آپ نے میرے والد کو قتل کیا اور میرا مال لے لیا۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''بھتیجے! تمہارا مال بیت المال میں محفوظ ہے۔ صبح جا کر لے لینا۔ میں نے اس پر صرف اس لئے قبضہ کیا تھا کہ لوگ اچک نہ لیں۔ برادر زادے! جب تمہیں کوئی حاجت ہو تو ہمارے پاس آنا۔''

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مضمون نگار نے صحیح لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ نے جو رویہ اختیار کیا اس کے متعلق رائے زنی اور فیصلہ کرنا راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے ہمیشہ ایک نازک سوال بنا رہا ہے اور ایک اقلیتی گروہ کے سوا سب نے اس معاملے میں بہت احتیاط برتی ہے اور اسے ان کی اجتہادی غلطی قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی ہے۔

راقم نے جنگ جمل کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حالات میں ایک مختصر تبصرہ پیش کیا ہے یہاں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ کیا جنگ جمل (نیز جنگ صفین) کے بڑے کردار ''رحماء بینہم'' کے قرآنی فرمان سے واقف نہ تھے کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی تعریف سورۂ فتح میں ان الفاظ کے ساتھ کی ہے اور انہیں باہم رحیم و شفیق قرار دیا ہے؟ کیا بیعت رضوان کے اصحابِ شجرہ کی اہمیت اور اللہ کی ان سے خوشنودی کا لوگوں کو علم نہ تھا حالانکہ قرآن خود یہ سرٹیفکیٹ علی الاعلان دیتا ہے اور ہمیشہ کے لئے دیتا ہے؟ کیا باہمی جنگ و جدال کے باوجود یہ قرآنی تعریف ان پر صادق آئے گی یا اس تعریف کو ملحوظ رکھتے ہوئے صحابہ کے باہمی جنگ و جدال سے انکار کر دیا جائے؟ کیا ان فتنوں میں ملوث صحابہ اور تابعین عشرۂ مبشرہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور ان کی خدمات سے بے خبر تھے؟ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اسلامی خدمات، دینی عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی قرابت قریبہ اور ان کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی ان کے مخالفین کو خبر نہ تھی؟ یہ اور ایسے کئی سوالات پردۂ دماغ پر بار بار ابھرتے ہیں ع

ہزار نکتہ باریک تر زمو اینجاست! بہرحال یہ بزرگ و معزز ہستیاں اپنے اللہ کے پاس پہنچ چکی ہیں اور اللہ ہم سے زیادہ بہتر ان کے متعلق جانتا ہے ع

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش!

---

[1] ترجمہ: ہم قیامت کے دن ان کے دلوں سے کینہ نکال دیں گے اور وہ ایک دوسرے کے سامنے بھائی بھائی بن کر تختوں پر بیٹھیں گے (۱۵:۴۷)

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا حلیہ

درمیانہ قد، گندمی رنگ، شگفتہ صورت، بسیار مو، باریک اور خوبصورت ناک، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ پر بڑھاپے کا اثر ظاہر نہ ہوتا تھا، چونکہ بال سفید نہ ہوتے تھے اس لئے کسی قسم کا خضاب استعمال نہ کرتے تھے۔ بہت تیز تیز چلتے تھے، زرد رنگ کے کپڑے پہننا پسند کرتے تھے، جنگ جمل کے دن سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے۔

ذریعۂ معاش

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا ابتدا ہی سے اصل ذریعہ معاش تجارت تھا۔ مدینہ میں بھی غزوات کے دنوں کے سوا تجارت کرتے تھے اور اس میں اللہ نے بہت برکت دی۔ مدینہ میں یہود کی متروکہ اراضی میں سے آپ کو بھی حصہ ملا اور آپ نے زراعت بھی شروع کر دی۔ حجاز میں سب سے پہلے گیہوں کی کاشت آپ ہی نے کی۔ خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں بھی آپ کو ایک قطعہ اراضی دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عراق کی فتح کے بعد وہاں بھی آپ کو زمین ملی۔ غرضیکہ بعض دوسرے اکابر صحابہ کی طرح آپ تاجر بھی تھے اور زمیندار بھی۔ ظاہر ہے کہ مدینہ کے باہر کی زمینیں خود تو کاشت نہ کرتے ہوں گے اپنے کارندوں سے کاشت کرواتے ہوں گے یا بٹائی پر دیتے ہوں گے۔ آپ کی روزانہ آمدنی ایک ہزار دینار تھی۔ اس کے باوجود غذا، لباس وغیرہ بہت سادہ تھے۔ کبھی کبھی قیمتی لباس پہن لیتے تھے۔ آمدنی کا بیشتر حصہ اپنے اعزہ و اقارب اور دوسرے حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

اولاد و ازواج

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہما نے اپنی زندگی میں سات خواتین سے نکاح کئے۔ ان سات ازواج اور دو امہاتِ ولد سے ان کے گیارہ بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ وہ بیٹوں کے نام پیغمبروں کے ناموں پر رکھتے تھے۔ سب سے بڑے بیٹے محمد رضی اللہ عنہ تھے جنہیں کثرتِ عبادت کی وجہ سے ''سجاد'' کہا جاتا تھا۔ ان کی والدہ حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا تھیں جو ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں۔ اس ناطے سے طلحہ رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمزلف تھے، محمد رضی اللہ عنہ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔

دوسرے بیٹوں کے نام عمران (بن حمنہ رضی اللہ عنہ)، موسیٰ، یعقوب، اسماعیل، اسحاق، صالح عیسیٰ، یحییٰ، زکریا اور یوسف تھے، مؤخر الذکر دونوں اور بیٹی عائشہ کی والدہ ام کلثوم بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما تھیں۔ باقی تین بیٹیوں کے نام صعبہ، مریم اور ام اسحاق تھے، آخر الذکر سے حضرت امام حسن بن حضرت علی رضی اللہ عنہما نے نکاح کیا ان کے یہاں طلحہ بن حسن رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا۔ ان سے فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔[1]

---

[1] طبقات ابن سعد جلد سوم، حالات طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، جو حضرات حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دشمنی کے راگ الاپتے ہیں، وہ غور کریں کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یکے بعد دیگرے نکاح کیا اور حضرت حسن نے اپنے بیٹے کا نام طلحہ رکھا، کیا یہ دشمنی کی علامت ہے؟ مؤلف

سیرت و کردار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور خوفِ خدا کے بعد حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے کردار کی دوسری نمایاں خصوصیت جود وسخا اور انفاق فی سبیل اللہ تھی۔ ان کے نزدیک اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں جان، مال، اولاد کی کوئی وقعت نہ تھی وہ بہت مالدار صحابہ میں سے تھے۔ بڑے کریم النفس، سخی اور فیاض تھے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں، طلحہ الجواد اور طلحہ الفیاض کا لقب دیا۔ طبری نے لکھا ہے کہ قبیصہ بن جابر اسدی نے لوگوں سے کہا کہ ''کیا میں تم کو بتاؤں کہ میں نے کن لوگوں کی صحبت اٹھائی ہے؟ میں عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہا ہوں۔ ان سے بڑھ کر فقہ اور وعظ و نصیحت میں میں نے کسی کو نہ پایا، پھر طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہا ہوں۔ میں نے ان سے بڑھ کر بے مانگے مال کثیر دینے والا کسی کو نہ دیکھا'' (تاریخ طبری جلد چہارم، باب ۷) ایک ہزار درہم ان کی یومیہ آمدنی تھی لیکن انہوں نے اس آمدنی کو گڑا خزانہ بنا کر اولاد و ازواج کے لئے سینت سینت کر نہیں رکھا نہ اسے اپنے لئے فخر و غرور کا سرمایہ بنایا، حلال کی کمائی ہوتی تھی۔ آج کل کے سرمایہ داروں، صنعت کاروں اور بڑے زمینداروں کی طرح زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے اور اپنے گھر بھرنے کے لئے خلافِ شرع ہتھکنڈے اور ناجائز طریقے استعمال نہ کرتے اور نہ دوسروں کا استحصال کرتے تھے۔ جب تک آیا ہوا مال اللہ کی راہ میں خرچ نہ کر لیتے چین سے نہ بیٹھتے، غریبوں، یتیموں، بیواؤں، ضرورت مند رشتہ داروں اور اہل قبیلہ کو بے دریغ دیتے اور ان کی حاجت روائی کرتے۔ بہت زیادہ صلہ رحمی کرنے والے تھے، غریب نو مسلموں کو بھی بہت دیتے تھے۔ بڑے مہمان نواز تھے۔ دستر خوان کھلا تھا۔ ایک دفعہ چار لاکھ درہم گھر میں آئے۔ جب تک انہیں حاجت مند رشتہ داروں اور غربا و مساکین میں تقسیم نہیں کر دیا، بے چین متفکر اور ملول رہے خاندان کے خاندان اور قبیلے کے قبیلے ان کے انفاق اور فیاضی پر پل رہے تھے۔ کتنے معزز لیکن مفلس گھرانوں کی آبرو ان کے جود وسخا پر قائم تھی۔ ایک ہاتھ سے دیتے دوسرے کو خبر نہ ہوتی۔ قبیلہ بنی تیم کا کوئی نادار ایسا نہ تھا کہ طلحہ رضی اللہ عنہ نے اس کی اور اس کے اہل و عیال کی حاجت روائی نہ کی ہو۔ وہ تنگ دستوں کو خادم دیتے، مقروضوں کا قرض ادا کرتے، بیواؤں کے نکاح کراتے اور غلاموں کی گردنیں چھڑاتے تھے۔ صبیحہ تیمی تیس ہزار درہم کا مقروض تھا۔ طلحہ رضی اللہ عنہ نے اس کے سر سے یہ بوجھ اتارا۔ غیرت مند مفلسوں کے لب سوال کھولنے سے پہلے ان کی ضرورت پوری کر دیتے تھے ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ایک قطعہ اراضی فروخت کرنے سے سات لاکھ درہم وصول ہوئے۔ رقم لے کر گھر آئے تو کہا کہ رات کو مال اس کے گھر میں رہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ اللہ کے امر عزیز میں سے رات کو کیا اس کے پاس آئے گا (ہو سکتا ہے کہ اسی حالت میں کہ مال گھر میں موجود ہو اور موت آ جائے اور پھر اللہ کے سامنے اس کی جواب دہی کرنی پڑے) چنانچہ رات اس طرح گزاری کہ ان کے قاصد اس مال کو لے کر مستحقین و مستضعفین کو دینے کے لئے مدینہ کے گلی کوچوں میں پھرتے رہے۔ پچھلی رات ہونے تک ایک درہم بھی باقی نہ رہا۔ اپنے گھر میں زر و مال رکھنا پسند نہ تھا تحائف اور ہدایا بھی دیتے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ہر سال دس ہزار درہم بھیجتے تھے۔ ذی القرد میں

ایک چشمہ تھا جو طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھاری قیمت پر خرید کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔)

(دھن بانٹنے سے دھن نہیں گھٹتا۔ اللہ کو دیا ہوا قرضِ حسنہ کئی گنا بڑھ کر واپس ملتا ہے۔ زبردست مصارف اور بے پناہ سخاوت کے باوجود حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی دولت بڑھتی ہی رہی۔ وفات پر بیس لاکھ درہم اور دو لاکھ دینار چھوڑے، غیر منقولہ جائیداد کی قیمت تین کروڑ درہم سے کم نہ تھی، چاروں بیویوں میں سے ہر ایک کو اسی ہزار درہم نقد ملے۔ بیٹوں، بیٹیوں کے حصے الگ تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے موسیٰ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''ابو محمد (طلحہ رضی اللہ عنہ) نے سخی، شریف اور نیک بن کے زندگی بسر کی اور فقیر ہو کے مقتول ہوئے۔'' ایک دفعہ ایک شخص یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

فَتًی کَانَ یُدْنِیْهِ لَغِنٰی مِنْ صَدِیْقِهٖ
اِذْهُوْا اِسْتَغْنٰی وَ یُبْعِدُهُ الْفَقْرَ

(ترجمہ: وہ ایسا جوانمرد تھا کہ اس کی دولت نے اسے دوستوں کے قریب کر دیا تھا جبکہ اسے کسی کی ضرورت نہ تھی اور تنگ دستی نے اسے اس کے دوستوں کو دور پھینک دیا)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے سن کر فرمایا کہ ''اس کے مصداق تو ابو محمد (طلحہ رضی اللہ عنہ) تھے، اللہ ان پر رحم کرے۔'' مرفہ الحالی کے باوجود مزاج میں سادگی اور بے نیازی تھی۔ عمر بھر سادہ غذا کھاتے اور سادگی سے بسر کرتے رہے دستر خوان وسیع تھا جو آئے، کھائے مگر کھانے پر تکلف نہ ہوتے تھے، طبیعت میں بے خوفی اور بے باکی تھی حق بات کہنے سے ہچکچاتے نہ تھے۔

آپ کی معاشرتی زندگی بڑی خوشگوار اور دلکش تھی، حسن معاشرت میں ممتاز تھے، بیوی بچوں میں محبوب اور ہر دلعزیز تھے۔ وہ فرض کو زندگی اور زندگی کو فرض سمجھتے تھے، عتبہ بن ربیعہ کی حسین و جمیل صاحب زادی ام ابان کو بہت سے معزز، دولت مند، حسین اور ذہین افراد نے شادی کے پیغام دیئے لیکن انہوں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو سب پر ترجیح دی۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ ''میں طلحہ رضی اللہ عنہ کے اوصافِ حمیدہ سے خوب واقف ہوں۔ وہ گھر آتے ہیں تو ہنستے ہوئے، باہر جاتے ہیں تو مسکراتے ہوئے کچھ مانگو تو بخل نہیں کرتے اور خاموش رہو تو مانگنے کا انتظار نہیں کرتے، کوئی کام کر دو تو شکر گزار ہوتے ہیں، خطا ہو جائے تو معاف کر دیتے ہیں۔''

ایسے ہوتے ہیں مسلمان جو مر کر بھی نہیں مرتے، قبر بھی ان کی لاش سے مس ہوتی ہے تو جی اٹھتی ہے اور روز محشر تک انہیں امانت کی طرح رکھتی ہے۔

روایت حدیث

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے اڑتیس احادیث مروی ہیں۔ انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ رضی اللہ عنہ

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ

(حواریٔ رسول ﷺ)

''ہر پیغمبر کے حواری ہوتے ہیں۔ میرے حواری زبیر بن العوام ہیں''

(رسول اکرم ﷺ)

''زبیر ارکان دین میں سے ایک رکن ہیں''

(فاروق اعظم رضی اللہ عنہ)

۵ہجری

جنگ احزاب کا پر آشوب اور پر خطر زمانہ ہے۔ مشرکین مکہ نے اپنے حلیف قبائل کی مدد سے دس ہزار مسلح فوج اکٹھی کر کے مدینہ کا محاصرہ کر رکھا ہے اس سے پہلے عرب کی تاریخ میں اتنی بڑی فوج کبھی کسی جنگ کے موقع پر اکٹھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ فوج اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اسلحہ اور رسد کی بھی شدید قلت ہے۔ اندر سے بنی قریظہ کے یہودیوں نے حملہ آوروں سے ساز باز کر کے بدعہدی اور غداری پر کمر باندھی ہے اور ہر دم خطرہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا نہ گھونپ دیں۔ بنی قریظہ بڑا طاقتور قبیلہ ہے، ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس اور قلعہ بند۔ ان کی گڑھی کی طرف جاتے ہوئے اکیلے دو کیلے مسلمان گھبراتے ہیں۔ موسم سخت سرد اور طوفانی ہے۔ رسولِ خدا ﷺ بنی قریظہ کے عزائم، تیاریوں اور نقل و حرکت کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی بستی میں جانا شیر کے کچھار میں جانے کے مترادف ہے۔ صورتِ حال بڑی نازک، سنگین اور تشویشناک ہے۔ اس لئے سرکارِ دو عالم ﷺ رضا کار طلب کرتے ہیں، ارشاد فرماتے ہیں:

''کوئی ہے جو بنی قریظہ کی خبر لائے؟''

جواب میں صرف ایک آواز بلند ہوتی ہے

''یا رسول اللہ ﷺ! اس کام کے لئے میں حاضر ہوں'' ایک دراز قامت، وجیہ اور قوی نوجوان کھڑا ہو کر کہتا ہے۔

''کوئی ہے جو بنی قریظہ کی خبر لائے؟'' حضور ﷺ صحابہ کے مجمع سے دوبارہ پوچھتے ہیں ''یا رسول اللہ ﷺ میں حاضر ہوں۔'' پھر وہی نوجوان جواب دیتا ہے لیکن سرورِ کائنات ﷺ پھر تیسری دفعہ اپنا سوال دہراتے ہیں اور خاموش مجمع کے چہروں پر اپنی مستفسرانہ و متجسمانہ نظر دوڑاتے ہیں۔ مجمع سے پھر وہی آواز بلند ہوتی ہے کہ ''میرے آقا میں یہ خدمت انجام دوں گا۔''

حضورِ اکرم ﷺ صاحب آواز کے حق میں دعا فرماتے ہیں اور اسے اجازت دیتے ہیں وہ صاحب اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے ہیں، ان کی ٹانگیں تقریباً زمین کو چھو رہی ہوتی ہیں۔ صحابہ کا مجمع انہیں رشک و آفرین کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ آخر وہ بنی قریظہ کے ارادوں، تیاریوں اور تعداد کے متعلق مفصل معلومات حاصل کر کے واپس آتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مفصل رپورٹ پیش کرتے ہیں جو مسلمانوں کے لئے بڑی مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس جان جوکھوں کے کام کی انجام دہی پر جناب رحمت للعالمین ﷺ بہت خوش ہوتے ہیں اور خبر لانے والے سے مخاطب ہو کر فداک ابی وامی (میرے ماں باپ تجھ پر قربان) کہتے ہیں۔ پھر جاں نثاروں کے

مجمع سے فرماتے ہیں کہ "ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں۔ میرے حواری زبیر بن العوام ہیں۔"[1]

تو یہ تھے زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، حواری رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا صحابی یہ امتیاز، یہ شرف، یہ خصوصیت حاصل نہ کرسکا جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان فداک ابی وامی کا تعلق ہے اس میں بھی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ صرف ایک دوسرے صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ شریک ہوسکے اور وہ بھی عشرۂ مبشرہ میں شامل ہیں مدتوں بعد جب ایک شخص نے کہا کہ میں حواری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ہوں، تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "اگر تو زبیر بن العوام کا بیٹا ہے تو سچ کہتا ہے ورنہ جھوٹا ہے۔" مطلب یہ کہ صرف زبیر رضی اللہ عنہ ہی کو یہ لقب اور اعزاز مرحمت کیا گیا تھا۔ تاریخ میں یہ لقب انہی سے مخصوص ہو کر رہ گیا۔[2]

خاندان اور قبولِ اسلام

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کی شاخ بنی اسد سے تھا۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور اوائل عمر ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں اور حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ آپ کے ماموں تھے۔ ان کے پردادا خویلد اسلام کی خاتون اول ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد تھے۔ اس لئے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حقیقی بھتیجے تھے ان کی والدہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اسلام کے ابتدائی عہد میں مسلمان ہوئیں وہ بڑی بہادر اور اولوالعزم خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے زبیر رضی اللہ عنہ کی پرورش اور تربیت میں بڑی کوشش کی۔ وہ اس خیال سے آپ پر بہت سختی کرتی تھیں کہ جوان ہو کر سخت جان، سخت کوش، نڈر اور بہادر بنیں اور لشکروں کی قیادت کریں۔ چنانچہ زبیر رضی اللہ عنہ بچپن ہی سے بڑے شہزور، شجاع، حوصلہ مند اور پُراعتماد تھے۔ ایک دفعہ بچپن میں

---

1. صحیح بخاری، روایت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما

2. شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں کہ حواری وہ شخص ہے جس پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا اثر اتنا پڑا ہو کہ اس نے اس کی قوت عملیہ کو اتنا بڑھا دیا ہو کہ اعلائے کلمۃ اللہ میں وہ بے اختیار ہو اور یہ حالت طاری ہو کہ

من نہ باختیارِ خود می روم از قفائے او
آں دو کمند عنبریں می بردم کشاں کشاں

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ تفہیم القرآن، جلد اول (طبع اول) کے صفحہ ۲۵۶ پر سورۂ آل عمران کے تشریحی حاشیہ نمبر ۴۹ کے تحت لکھتے ہیں کہ "حواری کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو ہمارے ہاں انصار کا مفہوم ہے۔ بائبل میں بالعموم حواریوں کے بجائے شاگردوں کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعض مقامات پر انہیں رسول بھی کہا گیا ہے مگر رسول اس معنی میں کہ مسیح علیہ السلام ان کو تبلیغ کے لئے بھیجتے تھے نہ اس معنی میں کہ خدا نے ان کو رسول مقرر کیا تھا آگے چل کر تفہیم القرآن جلد پنجم میں سورۃ الصف کے تفسیری حاشیہ نمبر ۱۹ کے تحت مزید لکھتے ہیں کہ "اس لفظ کی اصل حور ہے جس کے معنی سفید کے ہیں۔ دھوبی کو حواری کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ کپڑے دھو کر سفید کر دیتا ہے خالص اور بے آمیز چیز کو بھی حواری کہا جاتا ہے۔ جس آٹے کو چھان کر بھوسی نکال دی گئی ہو اسے حواری کہتے ہیں۔ اسی معنی میں خالص دوست اور بے غرض حامی کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ابن سیدہ کہتا ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی کی مدد کرنے میں مبالغہ کرے وہ اس کا حواری ہے۔" یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنا مخلص دوست اور بے غرض حمایتی محقق کر کے اس لقب سے نوازا ہے۔ مؤلف

اپنے سے کہیں زیادہ عمر کے آدمی سے لڑ پڑے اور اس کا ہاتھ توڑ ڈالا۔ اسے شکایتاً حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس لایا گیا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی بجائے مطمئن انداز میں شکایت کنندہ سے کہا "اے شخص! تو نے زبیر کو کیا سمجھا تھا؟ کیا تو نے اسے پنیر سمجھا یا کھجور؟ یا پر پھیلانے والا شکرا؟ ابتدائی عمر ہی میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جنگی فنون میں مہارت حاصل کر لی تھی جس سے ان میں غایت درجے کی دلیری، حوصلہ مندی اور خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔

محمد ابن سعد (مصنف طبقات) کی روایت کے مطابق حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے چار پانچ دن بعد سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ اسلام کے سابقون الاولون میں آپ کا درجہ بہت بلند ہے۔ عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نیز بعض دوسرے نوجوان مسلمانوں کی عمریں بھی قبول اسلام کے وقت کم و بیش اتنی ہی تھیں۔ اس سے ایک حقیقت بڑی واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ یہ نوجوان جن کی عمریں بیس سال سے بھی کم تھیں اور انگریزی محاورے کے مطابق (Teenager) تھے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے قبل نبوت کے دور کو اپنی کم سنی کے ایام سے دیکھتے چلے آئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ اور حسن سیرت سے متاثر تھے۔ اعلانِ نبوت کے ساتھ ہی وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ایمان لے آئے۔ اگرچہ سردارانِ قریش طنزاً یہ کہتے رہے کہ یہ کیسا دین ہے جو ہماری قوم کے بے سمجھ چھوکروں نے یا پھر غلاموں نے قبول کیا ہے اور ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دراصل یہ ان نام نہاد اور بزعم خویش "عقل کل" قسم کے سرداروں کی اپنی بے سمجھی اور بدنصیبی تھی کہ وہ پیچھے رہ گئے۔ قبولِ اسلام کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے دین حق کی خاطر ہر قسم کے مصائب اور شدائد بڑی ثابت قدمی اور خندہ پیشانی سے برداشت کئے۔ ان کا چچا انہیں کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر ناک اور آنکھوں میں دھواں دیا کرتا تھا مگر اسلام کا نشہ ایسی ترشیوں، تلخیوں سے اترنے والا نہ تھا۔ زبیر رضی اللہ عنہ چچا سے کہتے کہ کچھ بھی کرو، اب میں کافر نہیں ہو سکتا۔ اس وقت مکہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل اور کمزور تھی۔ کفار دشمنی اور اذیت رسانی پر تل گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے باہمی ربط و اتحاد اور تسلی و تقویت کے لئے مختلف صحابہ کی مزاجی روحانی کیفیت اور سماجی و معاشی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے باہمی مواخاۃ قائم کر دی تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی مواخاۃ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ سے قائم کی جنہوں نے آخر تک آپ کا ساتھ نبھایا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان کی مواخاۃ قائم کی گئی۔ مؤخر الذکر نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنا وصی بنایا تھا۔

اپنی شہزوری، شجاعت، جنگی مہارت، غیرت، خودداری اور خود اعتمادی کے باوجود زبیر رضی اللہ عنہ بھی دوسرے صحابہ کی طرح کفارِ مکہ کے مظالم اور سختیاں صبر و تحمل سے برداشت کرتے رہے کیونکہ مقابلے کے لئے ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہ تھی لیکن ایک دفعہ جب یہ افواہ پھیل گئی کہ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچائی ہے اور قید کر لیا ہے تو زبیر رضی اللہ عنہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ ننگی تلوار لئے مرنے مارنے کا تہیہ کئے کفار کے مجمع میں گھس گئے اور اپنے ہادی و آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پہنچ گئے۔ افواہ غلط نکلی۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ زبیر کیا بات ہے؟ عرض کیا

کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بتایا گیا کہ دشمنوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچائی ہے۔اس لئے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہونے کا عزم لے کر نکلا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے جذبہ فدائیت پر بہت خوش ہوئے،تعریف کی اور دعا فرمائی۔ زبیر رضی اللہ عنہ کی تلوار پہلی تلوار تھی جو اسلام اور داعی صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی حمایت اور حفاظت کے لئے اٹھی۔جب مشرکین مکہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کرنے کی وجہ سے ابولہب کے سوا جملہ بنی ہاشم، کیا مسلم کیا کافر کا مقاطعہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بنی ہاشم شعب ابی طالب میں محصور ہوگئے تو زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی رضا کارانہ طور پر ان کا ساتھ دیا اور مقاطعہ اور فقر و فاقہ کی تکالیف خندہ پیشانی سے برداشت کیں لیکن تکالیف اور مصائب سے گھبرا کر اسلام سے روگردانی کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

ہجرت

کفار قریش کے مظالم جب حد سے گزر گئے تو ۵ نبوی میں ہادئ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے پیروان توحید کو حبشہ (موجودہ ایتھوپیا) کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ہجرت کرنے والوں میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔مسلمان حبشہ میں امن چین سے رہے۔اس دوران میں شاہ حبشہ کو کسی دشمن سے جنگ پیش آگئی۔مہاجر صحابہ نے اپنے میں سے کسی کو محاذِ جنگ پر بھیجنا چاہا تاکہ جنگی صورت حال کی خبریں بھیجتا رہے اور ضرورت ہو تو مہاجرین بھی شاہ حبشہ کی مدد کے لئے لڑنے جائیں۔زبیر رضی اللہ عنہ سب سے کمسن تھے،مگر انہوں نے اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے پیش کیا۔وہ مشک کے سہارے دریائے نیل کو عبور کر کے میدانِ جنگ میں پہنچے اور چند روز کے بعد واپس آکر شاہِ حبشہ کی فتح کی خبر سنائی۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ طبعاً مہم جو تھے اور خطرات میں کودنے سے نہ گھبراتے تھے۔اسلام اور مسلمانوں کے لئے اپنی جان بھی داؤ پر لگانے سے نہ گھبراتے تھے۔بعدازاں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے ۱۳ نبوی میں مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت اختیار کی۔سب سے آخر میں جب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ہجرت کی تو راستے میں زبیر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی جو شام کے تجارتی سفر سے واپس آرہے تھے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ پارچات بطور ہدیہ پیش کئے جو سفر ہجرت کی بے سروسامانی میں غنیمت معلوم ہوئے۔

مدینہ پہنچ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر رضی اللہ عنہ کی مواخاۃ حضرت کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ سے قائم کی۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا بلند مرتبہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔یہ وہ بزرگ تھے جن سے غزوۂ تبوک میں عدم شمولیت کی بنا پر بازپرس کی گئی تو انہوں نے دوسروں کی طرح عذر تراشنے کی بجائے اپنے تساہل اور کوتاہی کا صاف صاف اعتراف کیا۔اس پر مسلمانوں کو ان سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لینے کا حکم دیا گیا حتیٰ کہ بیوی کو بھی انہیں چھوڑ کر میکے چلے جانے کی ہدایت کی گئی۔اس عالم میں کعب رضی اللہ عنہ پر زمین و آسمان کی وسعتیں تنگ ہوگئیں۔قیصر روم نے انہیں ورغلانے اور لالچ دینے کے لئے اپنے آدمی بھیجے مگر انہوں نے ان کو دھتکار دیا اور ایک سچے مگر خطا کار مسلمان کی

طرح توبہ وزاری کرتے رہے تا آنکہ اللہ نے سورۂ توبہ میں ان کی قبولیت توبہ کی نوید سنائی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں سب سے پہلے قبولیت توبہ کی خوشخبری اور مبارکباد دی جسے انہوں نے کبھی فراموش نہ کیا بلکہ احساسِ ممنونیت کے ساتھ یاد رکھا۔ یہ روایت محمد ابن سعد (طبقات) کی ہے لیکن اسد الغابہ کی روایت کے مطابق حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت سلمہ بن وقش انصاری رضی اللہ عنہ کے بھائی بنائے گئے تھے۔ سلمہ رضی اللہ عنہ بدر اور احد میں شریک ہوئے اور احد میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اس غزوہ میں ان کے والد اور چچا بھی ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا حق ادا کرتے ہوئے شہیدوں کی صف میں شامل ہوئے۔ ممکن ہے کہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے مواخاۃ قائم ہوئی ہو۔

مدنی زندگی، غزوات میں شرکت

مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک خاصا بڑا قطعہ زمین مکان کے لئے دیا۔ پھر بنونضیر کے اموال میں سے زرعی زمین کا ایک ٹکڑا عطا کیا جس میں کھجور کا باغ تھا۔ مدینہ میں زبیر رضی اللہ عنہ زراعت بھی کرتے تھے اور تجارت بھی۔ ان کا عقد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بڑی صاحب زادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ذات النطاقین سے ہوا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما انہی کے بطن سے تھے۔ اول الذکر مدینہ میں پیدا ہونے والے پہلے مسلمان بچے تھے جن کی پیدائش پر سارے مسلمانوں نے خوشی منائی۔ مدنی زندگی میں زبیر ان صحابہ میں سے تھے جو میدان جنگ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے اور نماز میں ان کے تقریباً عین پیچھے ہوتے تھے۔ یہ خصوصیت ان صحابہ کی تھی جو ضرورت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ مسلمانوں کی امامت اور قیادت کے اہل سمجھے جاتے تھے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شامل ہوئے اور انتہائی شجاعت و جاں نثاری کا مظاہرہ کرتے رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جس مشن پر بھی بھیجا انہوں نے اسے خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ ۲ ہجری میں بدر کا معرکہ پیش آیا۔ بظاہر یہ تین سو تیرہ بے سروسامان اللہ والوں کا ایک ہزار مشرکوں سے مقابلہ تھا لیکن حقیقت میں یہ حق و باطل کی ایک انتہائی اہم فیصلہ کن اور تاریخ ساز جنگ تھی۔ بدر کے دن صرف دو مسلمانوں کے پاس گھوڑے تھے۔ جن میں سے ایک گھوڑ سوار حضرت زبیر رضی اللہ عنہ تھے اور اپنا مخصوص زرد عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ وہ ایسی بہادری اور جانبازی سے لڑے کہ یوم بدر کو یوم زبیر رضی اللہ عنہ کہا گیا۔ عتبہ بن سعید بن العاص کو اپنی قوت و شجاعت پر بڑا غرور تھا۔ سب سے پہلے وہ سراپا آہن پوش ہو کر دشمنوں کی طرف سے میدان میں آیا اور للکارا کہ ''میں ابوذات الکرش ہوں۔ کوئی ہے جو میرے مقابلے میں آئے اور اپنی بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرے؟'' سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ پا کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے۔ زرہ میں سے عتبہ کی صرف آنکھیں کھلی تھیں۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے تاک کر اس زور سے نیزہ مارا کہ آنکھوں میں گڑ کر رہ گیا اور عتبہ اپنی بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم چھوڑ کر جہنم رسید ہوا۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کی لاش پر پاؤں رکھ کر بڑی مشکل سے نیزہ کھینچ کر نکالا۔ اس کے دونوں سرے مڑ

گئے یہ نیزہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور یادگار مانگ لیا۔ یہ نیزہ تاریخ میں عنزہ کے نام سے مشہور ہوا۔ پاکستان نے جو میزائل تیار کئے ہیں ان میں سے ایک کا نام عنزہ رکھا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد یہ نیزہ خلفائے راشدین کے پاس رہا۔ غزوۂ بدر میں زبیر رضی اللہ عنہ کے متعدد زخم آئے۔ شانے پر تو اتنا گہرا زخم لگا کر مندمل ہو جانے کے بعد بھی ایک گڑھا سا رہ گیا جس میں انگلی چلی جاتی تھی۔ ان کے صاحب زادے حضرت عروہ بچپن میں زخم کے اس گڑھے میں انگلی ڈال کر کھیلا کرتے تھے، نیزے کے علاوہ اس جنگ میں زبیر رضی اللہ عنہ کی تلوار بھی کفار سے قتال کرتے کرتے مڑ گئی تھی اور اس میں دندانے پڑ گئے تھے۔ یہی اس کی پہچان تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بعد یہ تلوار ان کے صاحب زادے عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس رہی۔ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حجاز و عراق میں اپنی خلافت قائم کر لی تھی جو عبدالملک بن مروان کے عہد تک قائم رہی۔ ان کی شہادت کے بعد عبدالملک نے یہ تلوار ان کے بھائی حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ کو دے دی اس کی قیمت تین ہزار درہم پڑی، غرضیکہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا نیزہ اور تلوار دونوں آئندہ نسلوں کے لئے تاریخی یادگار بن گئے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ غزوۂ بدر میں فرشتے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی ہیئت پر نازل ہوئے، انہی کی طرح زرد عمامے باندھے ہوئے۔ اس روایت سے غزوۂ بدر میں زبیر رضی اللہ عنہ کا اہم کردار اجاگر ہو کر سامنے آتا ہے۔

اگلے سال ۳ ہجری میں غزوۂ احد پیش آیا۔ اس میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو علم اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو سپہ سالاری عطا ہوئی۔ وہ بڑی بے جگری اور جاں بازی سے لڑے۔ وہ ان فدائیانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے جو مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہو جانے کے باوجود پروانوں کی طرح شمع رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع رہے۔ دشمنوں کے ہاتھوں زخم پر زخم کھائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں ڈٹے رہے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوچ کر کہ ابوسفیان مسلمانوں کو پراگندہ اور زخمی سمجھ کر کہیں دوبارہ حملہ نہ کر دے، مسلمانوں سے فرمایا کہ "کون ہے جو ابوسفیان اور اس کے لشکر کا تعاقب کرے گا؟" زخم خوردہ ہونے کے باوجود ستر صحابہ کی ایک جماعت تعاقب کے لئے تیار ہو گئی جن میں ابوبکر رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ...... خسر اور داماد...... دونوں شامل تھے حالانکہ آخر الذکر سخت زخمی تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۷۲

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ط لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝[1]

کا اشارہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف ہے

۵ ہجری میں غزوۂ خندق کے موقع پر جب شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت مسلمان خواتین کے کیمپ کی حفاظت خاطر خواہ طریقے سے نہ کر سکے اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (بنت عبدالمطلب والدہ زبیر رضی اللہ عنہ) اور دوسری خواتین نے خیموں کی چوبوں سے یہودیوں کو مار بھگایا بلکہ ایک کو تو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے جہنم رسید ہی کر

[1] ترجمہ: جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہا ان میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں ان کے لئے بڑا اجر ہے

دیا۔ تو حالات کی نزاکت کو بھانپ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر رضی اللہ عنہ کو کیمپ کی حفاظت پر مامور کر دیا۔ انہوں نے کیمپ کو دشمن کے حملہ سے بڑی ہوشیاری اور بہادری سے محفوظ رکھا۔ اسی غزوہ کے موقع پر انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ''حواریٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' کا لقب عطا کیا گیا۔

۶ ہجری میں بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ کے چودہ سو نفوس قدسی میں زبیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے جن سے سورۂ فتح میں اللہ نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ حدیبیہ سے مراجعت کے بعد ۷ ہجری کی ابتدا میں یہودِ خیبر کی سازشوں اور فتنہ انگیزیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے خیبر پر حملہ کیا گیا تو زبیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے۔ خیبر کے سردار مرحب کے مارے جانے کے بعد اس کا بھائی یاسر، جو ہزار جنگ جوؤں پر بھاری سمجھا جاتا تھا، میدان میں نکل کر مبارزت خواہ ہوا اور زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔

۸ ہجری میں فتح مکہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے تین علمبرداروں میں سے ایک زبیر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تھا۔ جب وہ فتح مکہ کے بعد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اٹھ کر ان کے چہرے سے گرد صاف کی جو ایک بڑا اعزاز تھا۔ فتح مکہ کے بعد غزوہ حنین میں بھی شریک ہوئے۔ دشمنوں کی بے پناہ تیراندازی سے اسلامی لشکر ابتداً تتر بتر ہو گیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد ثابت قدمی اور بہادری سے لڑتے رہے دشمن کی ایک بڑی تعداد ایک گھاٹی میں گھات لگائے بیٹھی تھی۔ زبیر رضی اللہ عنہ ادھر سے گزرے تو سب نے بیک وقت ان پر حملہ کر دیا مگر حواری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی جرأت اور استقامت سے مقابلہ کیا اور گھاٹی ان سے خالی کرا لی۔ طائف کے محاصرے، تبوک کی مہم اور حجۃ الوداع کے موقع پر بھی زبیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے، غرضیکہ کوئی ایسی مہم یا معرکہ نہیں ہوا جس میں زبیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نہ رہے ہوں۔ ولیم میور لکھتا ہے کہ ''وہ (زبیر رضی اللہ عنہ) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں رہنے والے مشہور ترین ہیروؤں میں سے ایک تھے۔''

خلفائے راشدین کے عہد میں

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اگرچہ ابتدا میں ان کا رجحان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف تھا لیکن انہوں نے ملت کی اکثریت سے جدا رہنا پسند نہ کیا اور منتخب خلیفہ کی اعانت میں سرگرم ہو گئے۔ جب مرتدین نے مدینے پر چڑھائی کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے ایک مختصر دستے کی قیادت سپرد کی۔ انہوں نے حملہ آوروں کو نواحِ مدینہ سے مار بھگانے میں بڑا کام کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور ہر طرح سے تعاون کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اور تین دوسرے بزرگ صحابہ کو چار ہزار فوج کے ساتھ شام و فلسطین میں مصروفِ جہاد مجاہدین کی مدد کے لئے روانہ کیا اور لکھا کہ ان چار سالاروں میں سے ہر ایک ہزار سوار کے برابر ہے۔ اس لئے یہ نہ سمجھو کہ چار ہزار مجاہدین بھیج رہا ہوں بلکہ انہیں آٹھ ہزار سمجھو۔ بازنطینیوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ یرموک میں زبیر رضی اللہ عنہ کمال بہادری اور تہور سے لڑے۔ سیدھا دشمن فوج کے قلب پر حملہ کیا،

قلب کو چیرتے، دشمنوں کو تہ تیغ کرتے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نکل گئے، دشمنوں نے گھیرا ڈال کر گرفتار یا قتل کرنے کی بہت کوشش کی اور گھوڑے کی لگام تک پکڑ لی مگر زبیر رضی اللہ عنہ درید و برید وشکست، کا سماں پیدا کرتے ہوئے بچ کر نکل گئے اگرچہ شدید زخمی ہوئے۔

فتح مصر

شام وفلسطین کے بعد جب خلیفہ کی اجازت کے بغیر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر پر حملہ کیا اور مدد مانگی تو بلاذری کے بیان کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زبیر رضی اللہ عنہ کو مصر کا والی بنانا چاہا لیکن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''مجھے اس کی حاجت نہیں۔ البتہ مجاہد اور مسلمانوں کے مددگار کی حیثیت سے وہاں جانے کو تیار ہوں۔'' جب وہ مصر پہنچے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ یہاں طاعون ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ''ہم تو طعن (نیزہ بازی) اور طاعون (موت) کے لئے ہی آئے ہیں۔'' ببیلون کا محاصرہ ستمبر ۶۴۰ء میں شروع ہوا اور ۹-اپریل ۶۴۱ء کو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی بہادری سے فتح ہوا۔ وہ اس طرح کہ محاصرے کی طوالت سے تنگ آکر ایک دن حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آج میں مسلمانوں پر فدا ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر تلوار سونت لی اور سیڑھی کی مدد سے چند صحابہ کے ہمراہ قلعہ کی فصیل پر چڑھنے لگے۔ اوپر سے دشمنوں نے تیر برسائے، پتھروں، اینٹوں وغیرہ کی بارش کی لیکن زبیر رضی اللہ عنہ نے فصیل پر چڑھ کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ محصورین یہ سمجھ کر کہ مسلمان قلعہ میں داخل ہو گئے، بدحواس ہو کر بھاگے، زبیر رضی اللہ عنہ مارتے دھاڑتے فصیل سے نیچے اترے اور قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ اسلامی سپاہ اندر داخل ہو گئی۔ حاکم نے امان طلب کی جو دے دی گئی۔ مؤرخ بلاذری کے زمانے (تیسری صدی ہجری) تک زبیر رضی اللہ عنہ کی یہ یادگار سیڑھی موجود تھی۔ مصر کی فتح کی تکمیل میں بھی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے خاصا بڑا کردار ادا کیا۔ اسی لئے ''تذکرۃ الکرام...... تاریخ خلفائے عرب و اسلام'' کا مصنف لکھتا ہے کہ دور خلافت میں آپ (زبیر رضی اللہ عنہ) کا نام خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بعد فاتحین اسلام میں شمار کیا گیا۔'' لیکن فتوحات کے علاوہ عہد رسالت میں ان کے دوسرے کارنامے بھی تھے جن کی بنا پر وہ حامی اسلام، حواریٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہلائے اور عشرۂ مبشرہ میں شمار ہوئے، یہ امتیاز خالد رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ جیسے فاتحین کے نصیب میں نہ تھا۔ ایک دفعہ اپنے بیٹے سے فرمایا کہ ''میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں حتیٰ کہ شرم گاہ بھی نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں زخمی نہ ہوا ہو۔'' اور خصائص کے علاوہ فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی یہ خصوصیت ہی سب سے بڑی خصوصیت تھی جو عشرۂ مبشرہ کا طرۂ امتیاز تھی۔

فتح کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے مصر میں اپنے لئے ایک قطعہ زمین کی حد بندی کی اور اس میں ایک مکان بنوایا۔ عہد عثمانی میں ان کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے جب عبداللہ ابن ابی سرح کے ہمراہ افریقیہ (شمال مغربی افریقہ) پر حملہ کیا تو اسی مکان میں فروکش ہوئے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے افریقیہ کی فتح میں ایسا ہی اہم کردار ادا کیا جیسا ان کے والد محترم نے مصر کی فتح میں ادا کیا تھا۔

مصر کی فتح کے بعد زبیر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر زور دیا کہ مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی جائیں

لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجازت سے خراج کی بنیاد پر مصری کسانوں ہی کے پاس رہنے دیں اس کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ مدینہ واپس چلے گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک وہیں رہے۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن تھے۔ بعض روایات کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے نواح میں ساری وادیٔ عقیق زبیر رضی اللہ عنہ کو بطورِ جاگیر کاشت کے لئے دے دی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انسانوں کو جانچنے اور پرکھنے کا بڑا اونچا اور کڑا معیار رکھتے تھے جس پر بہت کم لوگ پورا اترتے تھے۔ لیکن وہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ''زبیر رضی اللہ عنہ ارکان دین میں سے ایک رکن ہیں۔'' یہ بہت بڑا اخراج تحسین ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیوان تیار کرایا تو دوسرے اہل بدر کی طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بھی پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کئے۔ بدریوں سے بڑے وظیفے صرف امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے تھے یعنی بارہ ہزار درہم سالانہ۔ زبیر رضی اللہ عنہ یہ وظیفہ لیتے رہے لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں ان سے اختلافات پیدا ہوئے تو دیوان سے اپنا نام کٹوا دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ انہیں چھ لاکھ درہم دیئے جس سے انہوں نے بصرہ اور مصر میں زمینیں خریدیں۔ یہ عطائیں ان کی عظیم اسلامی خدمات کے اعتراف کے طور پر تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کے اختلافات اصولی تھے جنہیں دشمنی پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ صحابہ خاص کر عشرۂ مبشرہ کا اختلاف اور اتفاق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا، اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محاصرہ کے دوران میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع میں جانبازی کے جوہر دکھانے کی پیش کی۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسلمانوں کا خون بہانے کے خلاف تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو منع کر دیا۔ تب انہوں نے اپنے صاحب زادے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ان کے محل کے دروازے پر حفاظت کے لئے مقرر کر دیا جو باغیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے زخمی بھی ہوئے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور ان کی تکفین و تدفین کی اگرچہ بعض روایات میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کا نام بھی آیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہلک طور پر زخمی ہونے کے بعد عشرۂ مبشرہ کے جن بقیۃ السلف چھ مقتدر صحابہ پر مشتمل مجلس شوریٰ یا انتخابی مجلس نامزد کی تھی تا کہ ان کے جانشین کا انتخاب کرے، زبیر رضی اللہ عنہ اس کے ایک رکن تھے۔ وہ خود بھی خلافت کے امیدوار ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنی بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا۔ پھر جب اراکین مجلس نے بالاتفاق معاملہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا تو زبیر رضی اللہ عنہ نے بلاحیل وحجت ان کی بیعت کر لی۔ عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں دوسرے بزرگ صحابہ کی طرح وہ مدینہ ہی میں رہ کر تجارت اور زراعت میں مصروف رہے اور خلیفہ کو حکومتی و سیاسی امور میں مخلصانہ مشورے دیتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بعض پالیسیوں کو ناپسند کرنے اور الگ تھلگ رہنے لگے۔ تاہم شدید مخالفوں میں سے نہ تھے، صرف اصلاح چاہتے تھے۔ عثمان رضی اللہ عنہ انہیں پسند کرتے تھے اور وقتی اختلاف اور رنجش کے باوجود انہیں عطیات دیتے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ایک دفعہ چھ لاکھ درہم بطور عطیہ دیئے جس سے زبیر رضی اللہ عنہ نے کوفہ، بصرہ اور مصر میں زمینیں خریدیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان زمینوں کی کاشت خود نہیں کرتے تھے، دوسروں سے کرواتے

تھے اور اگر ایسا کرنا خلافِ اسلام ہوتا تو ان سے خلافِ اسلام عمل کرنے کی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ سالِ نکسیر میں جب عثمان رضی اللہ عنہ سخت بیمار ہو گئے اور لوگوں نے ان کو اپنا جانشین نامزد کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے فرمایا ''کیا زبیر رضی اللہ عنہ کو نامزد کر دوں؟'' اس سے ان کے دل میں زبیر رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت پر انہیں بہت رنج ہوا۔ بلوائیوں نے انہیں خلیفہ بنانا چاہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ باغیوں کے دباؤ اور اہل مدینہ کی درخواست پر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت قبول کر لی تو انہوں نے اس شرط پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت قبول کر لی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام ان کے قاتلوں سے لیا جائے گا۔ اگرچہ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ انہیں گھر سے زبردستی پکڑ کر مسجد میں لے گئے تھے اور قتل کی دھمکی پر انہوں نے مجبوراً بیعت کی تاہم قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کی شرط اپنی جگہ تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف اور جنگ جمل

حضرت علی رضی اللہ عنہ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ سے پیدا ہونے والی ابتری اور انتشار کا جائزہ ہی لے رہے تھے تاکہ صورت حال پر قابو پانے کے لئے مناسب اقدامات کر سکیں اور قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے ذمہ داروں سے انتقام لے سکیں۔ اس میں کئی مہینے گزر گئے۔ تاخیر نے غلط فہمیوں کو جنم دیا اور خون عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ شدت پکڑ گیا۔ طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ کا عثمان رضی اللہ عنہ سے اختلاف محض اصلاحِ حالات کے لئے تھا۔ وہ نہ ان کے عزل کے خواہاں تھے نہ ان کے قتل کے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ خود اسلام کے نام لیواؤں کے ہاتھوں خلیفۂ برحق کا خونِ بے گناہ اسلام کے حرمِ ثانی شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں یوں بیدردی سے بہایا جائے گا۔ کچھ مخلص صحابہ کو زود پشیمانی نے آ گھیرا کہ وہ خلیفہ مظلوم و شہید کی کما حقہ مدد اور دفاع نہ کر سکے۔ اور کچھ بغض علی رضی اللہ عنہ میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی پوزیشن مستحکم کر کے قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کی طرف سے تاخیر کو غلط معنی پہنائے گئے۔ انہیں قاتلوں کا حامی اور مربی سمجھا گیا حالانکہ ان کا اپنا دامن خونِ عثمان رضی اللہ عنہ سے پاک تھا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا داماد ہونے کے باوجود انہوں نے ان کے مقابلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابتداً ترجیح دی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جانشین کے انتخاب کے وقت وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب باغیوں نے انہیں خلیفہ بنانا چاہا تو صاف انکار کر دیا تھا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مشروط بیعت کر لی تھی۔ تفصیلات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حالات میں دی جا چکی ہیں۔ بہر حال زبیر رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم خیال اصحاب نے قصاص کے لئے آواز اٹھائی۔ علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اس سے غافل نہیں لیکن ایسی جماعت کے ساتھ کیا کروں جس پر میرا کوئی قابو نہیں۔''
حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے کوفہ اور بصرہ میں بہت سے حامی موجود تھے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر آپ ہمیں ان شہروں میں بھیجیں تو ہم وہاں اپنے حامیوں کی مدد سے موجود باغیوں کو پکڑنے اور انتقام لینے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس تجویز کو پسند نہ کیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان دونوں حضرات نے کوفہ اور بصرہ کی گورنری مانگی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا۔ یہ دوسری بات درست نہیں معلوم ہوتی۔

زبیر رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصر کی گورنری پیش کی تھی اور انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ حالات خراب سے خراب تر اور پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے گئے۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ دونوں خلافت کے خواہاں تھے۔ یہ الزام بھی غلط ہے کیونکہ ان دونوں نے باغیوں کی پیش کش مسترد کر دی تھی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دونوں تو بیک وقت خلیفہ نہ بن سکتے تھے نہ اس بات پر دونوں میں اتحاد ہوسکتا تھا۔ چند ماہ کے بعد انتقامِ عثمان رضی اللہ عنہ سے مایوس ہو کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ (اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی)[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اجازت لے کر عمرہ کے لئے مکہ روانہ ہو گئے۔

وہاں عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کا حال سن کر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، بنی امیہ کے افراد اور دوسرے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے اور انہوں نے حالات کی اصلاح اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے عزم سے بصرہ کا رخ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف شام کی طرف پیش قدمی کا پروگرام بنا چکے تھے۔ انہوں نے زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی بصرہ روانگی کو زیادہ اہم اور خطرناک سمجھا اور مدینہ کے بزرگ صحابہ کے منع کرنے کے باوجود ان کے تعاقب میں بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تفصیل کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حالات میں جنگ جمل کے واقعہ کا مطالعہ کیجئے۔ بصرہ پہنچ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ۔ طلحہ رضی اللہ عنہ۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کے مابین حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی مساعی سے بات چیت ہوئی اور دونوں پارٹیاں صلح اور قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ پر متفق ہو گئیں۔ اس پر عبداللہ ابن سبا یہودی، مالک اشتر اور دوسرے باغیوں نے اپنے مستقبل کو مخدوش پا کر ایک سوچی سمجھی سازش کے مطابق رات کے پچھلے پہر بیک وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کے کیمپ پر حملہ کر دیا۔ اور جنگ جمل چھڑ گئی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے مسلمان کو مسلمان کا خون بہاتے دیکھا تو فرمایا: ''آہ! مسلمان جب زور و قوت میں پہاڑ بن گئے تو خود ٹکرا کر چور چور ہو جانا چاہتے ہیں۔'' علی رضی اللہ عنہ نے طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کو اور انہوں نے علی رضی اللہ عنہ کو بدعہدی اور فریب کاری کا مرتکب گردانا۔ دن چڑھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آواز دے کر طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کو بات چیت کے لئے بلایا۔ وہ گھوڑے پر سوار اپنی فوج سے نکل کر آئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی گردن سے اپنے گھوڑوں کی گردنیں ملا دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا:

''زبیر! تمہیں یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم دونوں اکٹھے تھے اور باہم ہنس بول رہے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر تم سے پوچھا تھا کہ کیا تمہیں علی سے محبت اور دوستی ہے؟ تم نے جواب دیا تھا کہ ''ہاں! یا رسول اللہ'' ایک دن تم علی رضی اللہ عنہ سے لڑو گے حالانکہ حق علی کی طرف ہوگا۔'' یہ سن کر زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''ہاں مجھے یاد آ گیا۔ میں جنگ سے دستبردار ہوتا ہوں۔''

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا ''کیا تم نے میری بیعت نہیں کی؟'' انہوں نے کہا ''ہاں لیکن میری گردن پر تلوار رکھی ہوئی تھی۔'' بہرحال حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جنگ سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔

---

[1] اس موقع سے جنگ جمل تک ان دونوں بزرگوں کا کردار ایک ہو جاتا ہے اور وہ ایک ساتھ جیتے اور ایک ساتھ مرتے ہیں۔ مؤلف

انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے جانا چاہا مگر وہ اپنی خالہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا جن کے اونٹ کے گرد گھمسان کی جنگ شروع تھی اور انہیں ان کے اونٹ سمیت میدانِ کارزار سے نکالنا ممکن نہ تھا، کا ساتھ نہ چھوڑ سکے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی صورت حال کو سمجھ کر میدان جنگ کو چھوڑنا چاہا مگر مروان بن حکم اموی نے یہ سمجھ کر کہ اگر یہ دونوں صاحب چلے گئے تو جنگ ختم ہو جائے گی، نہ عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام لیا جا سکے گا نہ بنی امیہ کے کاز کو تقویت پہنچ سکے گی، نہ علی رضی اللہ عنہ اور خلافت کے دوسرے ممکن دعویدار بھی طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ ختم ہو سکیں گے، (دراصل اموی گروہ اپنے خاص مقاصد کے لئے طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہمراہ ہو گیا تھا) تاک کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھٹنے پر زہریلا تیر مارا۔ کوشش کے باوجود خون بند نہ ہو سکا اور وہ وہیں شہید ہو گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کے گرد جنگ جاری رہی۔

شہادت

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ مدینہ کے قصد سے میدانِ جنگ سے نکلے تو نوے سالہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں میدان جنگ میں تھے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا لیکن آخر الذکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی یاد تھی کہ ایک باغی گروہ عمار رضی اللہ عنہ کو شہید کرے گا۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے اس گروہ میں سے نہ ہونا چاہا، انہوں نے اپنے دفاع کے سوا عمار رضی اللہ عنہ پر جارحانہ ہاتھ نہیں اٹھایا حالانکہ ان کے لئے ایسا کرنا بہت آسان تھا۔ عمار رضی اللہ عنہ بعد میں جنگ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

میدانِ کارزار سے نکل کر جب زبیر رضی اللہ عنہ بصرہ سے کچھ دور باہر وادی السباع میں پہنچے تو ابن جرموز نامی ایک شخص ان کا ہم سفر بن گیا۔ ظہر کے وقت جب دونوں ایک دوسرے کو امان دے کر نماز پڑھنے لگے تو ابن جرموز نے دغا بازی اور غداری کی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو سجدے کی حالت میں شہید کر دیا۔ ابن سعد رضی اللہ عنہ نے تھوڑے تھوڑے اختلاف سے متعدد روایتیں بیان کی ہیں لیکن کثرت رائے ابن جرموز ہی کے بارے میں ہے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خوشنودی اور حصول انعام کی توقع میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا سر اور ان کی تلوار لے کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں پہنچا لیکن انہوں نے شرفِ باریابی دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ''ابن صفیہ کے قاتل کو دوزخ کی بشارت دے دو۔'' اس بد بخت نے کہا کہ ''کیا زبیر رضی اللہ عنہ اہل مصیبت سے نہ تھے؟'' (یعنی جن پر قیامت کے دن مصیبت آئے گی اور اللہ کا عذاب ہوگا) جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''تیرے منہ میں خاک! میں تو یہ امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میں زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے حق میں اللہ نے فرمایا ہے کہ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ○[1]

ابن جرموز حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا سر اور تلوار وہیں چھوڑ کر مایوس و نامراد چلا گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے پھوپھی زاد، پچاس سال کے اسلامی بھائی اور تمام غزوات رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کے شانہ بشانہ راہ خدا میں لڑنے والے زبیر رضی اللہ عنہ پر روئے اور ان کی تلوار پکڑ کر فرمایا کہ ''واللہ! یہ وہ تلوار ہے

[1] ترجمہ: ہم قیامت کے دن ان کے دلوں سے کینہ نکال دیں گے اور وہ ایک دوسرے کے سامنے بھائی بن کر تختوں پر بیٹھیں گے'' (۱۵:۴۷)

کہ بارہا اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے بے چینی دور ہوئی اور مصائب کا ازالہ۔'' یہ ایک بہت بڑا اور سچا خراج تحسین ہے جو شیر خدا رضی اللہ عنہ نے اپنے خلاف تلوار اٹھانے والے کو بادلِ اندوہگیں پیش کیا۔ وہ زبیر رضی اللہ عنہ کو اشجع العرب کہا کرتے تھے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ جنگ جمل کے دن ۱۰ جمادی الآخر ۳۶ ہجری کو وادی السباع میں دھوکے سے شہید کئے گئے۔ ان کے غلام عطیہ نے انہیں وہیں سپرد خاک کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ وادی السباع کے معنی ہیں شیروں کی وادی اور زبیر رضی اللہ عنہ کے معنی ہیں شیر کی طرح بہادر۔ اور وہ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے خلاف معرکہ آرائی کے نتیجے میں شہید ہوئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے قاتل کو دوزخ کی بشارت تو دی لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی کیونکہ اس وقت حالت جنگ قائم تھی اور زبیر رضی اللہ عنہ کی جنگ سے دستبرداری اور علی رضی اللہ عنہ سے ذاتی صلح کا کوئی باقاعدہ اعلان نہ ہوا تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جنگ کی صبح کو ان کے والد نے انہیں بلایا اور کہا کہ ''اے پیارے بیٹے! ایسا نظر آتا ہے کہ آج میں بحالت مظلومی قتل کیا جاؤں گا۔'' ایسا ہی ہوا۔

جنگ جمل اور اس میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے کردار کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی المناک شہادت کے فوراً بعد یہ دوسرا عظیم المیہ تھا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے ربع صدی بعد امت مسلمہ کو دوچار ہونا پڑا۔ دراصل ان منحوس اور تباہ کن واقعات کا سلسلہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت ہی سے شروع ہو گیا تھا اور ان سب کے پس پشت ایرانی اور یہودی سازش کارفرما تھی جس کا مقصد مسلمانوں سے انتقام لینا اور اسلام کی قوت کو ختم کرنا تھا۔ جب حضرت علی نے دارالخلافہ کوفہ منتقل کر لیا تو اسلام دشمن سازشی قوتوں کو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے مزید اور آسان مواقع ہاتھ آ گئے۔ جنگ جمل کی صبح کو حضرت زبیر نے اور پھر حضرت طلحہ نے بھی ترک جنگ کا جو رویہ اختیار کیا، بلکہ اس سے ایک دن پہلے ہی فریقین معاہدۂ صلح پر راضی ہو گئے تھے، اس سے اس قیاس آرائی اور بدگمانی کی تکذیب ہوتی ہے کہ حضرت طلحہ اور زبیر اپنے لئے خلافت یا کم سے کم کوفہ اور بصرہ کی حکومت کے خواہش مند تھے۔ دراصل ان کا مقصد حضرت عثمان کی شہادت سے پیدا شدہ صورت حالات کی اصلاح اور باغیوں سے ان کا انتقام لینا تھا۔ ان کو حضرت علی سے کوئی ذاتی عداوت نہ تھی اور پھر معاہدۂ صلح پر رضامندی کے بعد رات کے اندھیرے میں سبائی سازشیوں نے جس طرح طرفین پر حملہ کر دیا، یہ سب باتیں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مستشرق مصنفین اور ان سے متاثر مصری مؤرخین ڈاکٹر طٰہٰ حسین[1] پروفیسر حسن ابراہیم حسن[2] اور سید امیر علی[3] کے الزامات کی تردید کرتی ہیں ان کی صلح اور لڑائی، ان کی

[1] خلافت عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ (ترجمہ فتنۃ الکبریٰ)

[2] اعلام الاسلام

[3] مختصر تاریخ صحرانشینیاں طٰہٰ حسین اور حسن ابراہیم حسن مصری ہیں اور مصر ہی سے ابن سبا نے فتنہ کا آغاز کیا۔ یہ اور دوسرے مصری مصنف مصر اور اہل مصر کے خلاف ہر الزام کو جھٹلانے پر کمربستہ رہتے ہیں۔ مؤلف

زندگی اور موت اللہ اور اس کے دین کے لئے تھی۔ وہ ذاتی اغراض اور طمع سے بہت بلند تھے۔ بہر حال وہ بھی انسان تھے۔ ان کی سوچ اور عمل میں بھی غلطی کا امکان ہوسکتا تھا۔ ان کے خلوصِ نیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ نیک نیتی پر مبنی باہمی اختلافات ہوسکتے تھے، جو حدیث نبوی کے مطابق باعث رحمت ہیں۔ امت کا سوادِ اعظم صحابہ کے عدول ہونے پر متفق ہے۔ واقعات سے چودہ سو سال کی دوری پر اصل حقائق کی تنقیح بہت مشکل ہوگئی ہے ایک گروہ نے سیاسی اختلافات کو مذہبی رنگ دے دیا ہے۔ متناقض روایات کے انبار لگا دیئے گئے ہیں۔ بہر حال جن نفوسِ قدسیہ کو تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا گیا ہے، انہیں خود اللہ اپنی کتاب مقدس میں اپنی خوشنودی کا سرٹیفکیٹ بار بار دے چکا ہے مثلاً بیعت رضوان میں چودہ سو صحابہ شامل تھے، سورۂ فتح کی آخری آیات کی رو سے وہ سب اللہ کی خوشنودی سے بہرہ یاب ہوگئے۔ علی رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ سب اس زمرے میں آتے ہیں۔ دوسری جگہ اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے) یہ رضامندی اور خوشنودی وقتی اور لمحاتی نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کے مستقبل کا رویہ بھی جانتا تھا۔ رسولِ خدا نے انہیں غیر مشروط طور پر جنت کی بشارت دی۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زبیر رضی اللہ عنہ کے قاتل ابن جرموز سے جو الفاظ کہے وہ بھی اس پر گواہ ہیں کہ وہ زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنا ذاتی دشمن نہیں سمجھتے تھے اور آیت قرآنی کے مطابق توقع کرتے تھے کہ قیامت کے دن وہ اور زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ جنت کے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی غل وغش نہ ہوگی۔ راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ اگر زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ کے دلوں میں خلافت یا کوفہ و بصرہ کی حکومت کی خواہش ہوتی تو وہ منافقانہ طریقے سے کبھی علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے۔

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

بہر حال یہ ایک اندوہناک حقیقت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تنبیہ اور پیشین گوئی کے مطابق ان کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں باہم خونریزی کا دروازہ کھل گیا جو پھر کبھی بند نہ ہوسکا۔ ہر مخلص مسلمان بڑی دلسوزی سے سوچتا ہے کہ کاش! جنگ جمل نہ ہوئی ہوتی! کاش مسلمانوں کی تلواریں ایک دوسرے کے خلاف بے نیام نہ ہوئی ہوتیں! ملی دلسوزی کا تو یہی تقاضا ہے کہ غلام احمد پرویز کی طرح جنگ جمل (اور پھر جنگ صفین اور جنگ نہروان سے بھی) یہ کہہ کر انکار کردیا جائے کہ جو لوگ قرآن کے سرٹیفکیٹ "رحماء بینہم" کے مصداق تھے وہ آپس میں کیسے جنگ وجدال کرسکتے تھے؟ لیکن بعض دوسری تلخ حقیقتوں کی طرح جنگ جمل بھی ہماری تاریخ کی ایک تلخ حقیقت ہے اور "رحماء بینہم" کی بجائے سبائی گروہ کی سازش کی پیداوار۔ صالح، دردمند اور مخلص طبائع آج بھی اس سے سبق حاصل کرسکتی ہیں۔ سبائیت آج بھی زندہ اور فعال ہے آج بھی دنیائے اسلام ایک شدید بحران سے دوچار ہے اور نہ جانے کتنے ابن سبا اپنی ریشہ دوانیوں اور تخریبی کارروائیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ جنگ جمل کے بعد پھر کبھی امت مسلمہ کا اونٹ سیدھی کروٹ نہ بیٹھ سکا۔ اسلام کی اشاعت اور فتوحات کا سیل رواں رک گیا اور وہ اپنوں ہی کو خس وخاشاک کی مانند بہا لے گیا۔ طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کی ابتدائی اجتہادی غلطی کا سبائیوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اسلامی تاریخ کے دھارے کا رخ غلط جانب کو موڑ دیا گیا۔ جب طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنی غلطی کا

احساس ہوا تو وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا اور وہ اپنی جانیں دے دینے کے سوا کوئی تلافی نہ کر سکے۔ بہر حال طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ پر منافقت، بدعہدی، حرصِ حکومت یا بزدلی کا الزام لگانا سراسر غلط ہے اور نعوذ باللہ خود ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت اور مردم شناسی میں شک کرنا ہے کہ انہوں نے زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنا حواری بنایا اور ان کے لئے فداک ابی و اُمی کے الفاظ استعمال کئے اور طلحہ رضی اللہ عنہ کو ''جواد'' اور ''خیر'' اور ''فیاض'' کے القاب سے پکارا۔ جب علی رضی اللہ عنہ کے یاددلانے سے زبیر رضی اللہ عنہ پر حق واضح ہو گیا تو وہ بلا توقف اپنے موقف اور جنگ سے دستبردار ہو گئے۔

عبداللہ ابن سبا کی موجودہ صدی میں ایک مثال پہلی عالمی جنگ کے ''لارنس آف عربیا'' کی ہے۔ شاید وہ بھی یہودی الاصل تھا۔ خادم حرمین شریفین ترک مسلمانوں اور عرب مسلمانوں کے درمیان جو نفاق انگیز، تباہ کن اور ہلاکت آفریں کردار اس نے ادا کیا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اس کی مکاری اور فریب کاری سے مشرق وسطیٰ کے عربوں نے سلطنت عثمانی کے خلاف بغاوت کر کے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ عثمانی سلطنت اور خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور مشرق وسطیٰ کے عرب اس کے وعدوں کے فریب میں آ کر اب تک خمیازہ بھگت رہے ہیں بلکہ اسرائیل کا خنجر بھی ان کے سینے میں پیوست کر دیا گیا ہے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی عمر

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی عمر کے متعلق مختلف روایات ہیں جن میں ان کی عمر ساٹھ سے ستر سال بیان کی گئی ہے، محمد ابن سعد نے آپ کے بیٹوں عبداللہ رضی اللہ عنہ اور عروہ رضی اللہ عنہ کی روایات کے حوالے سے چونسٹھ برس لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ زبیر رضی اللہ عنہ سولہ سال کی عمر میں سنہ ا نبوی میں ایمان لائے۔ مکہ اور مدینہ میں تیئس سال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں گزارے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت ان کی عمر انتالیس سال تھی۔ خلافت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخر تک مزید پچیس سال زندہ رہے اور جمادی الآخر ۳۶ ہجری میں شہادت پائی۔ اس لئے آپ کی عمر کم وبیش چونسٹھ سال ہی ہوتی ہے۔

حلیہ

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ایک وجیہہ اور شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ دراز قد، متوازن جسم، گندمی رنگ، چھدری داڑھی، سر کے بال لمبے۔ آخری دم تک صحت بہت اچھی تھی۔ اس میں تغیر نہیں ہوا تھا نہ بڑھاپے کے آثار پائے جاتے تھے۔ ہمیشہ چاق چوبند رہے۔

ازواج واولاد

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں چھ نکاح کئے۔ ان کی وفات کے وقت چار بیویاں موجود تھیں۔ سب سے پہلی شادی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماء ذات النطاقین سے ہوئی جو خود تاریخ میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ ان کے بطن سے مدینہ میں زبیر رضی اللہ عنہ کے بڑے صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ عنہ اور عروہ رضی اللہ عنہ تولد ہوئے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ مدینہ میں پیدا ہونے والے پہلے مسلمان بچے تھے۔ ان کی ولادت پر مسلمانوں نے خوشی

منائی۔ وہ بہت بہادر تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں افریقیائی جنگوں میں انہوں نے بڑے کارنامے انجام دیئے اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد حجاز وعراق میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ زبیر رضی اللہ عنہ کے دوسرے صاحب زادے عروہ رضی اللہ عنہ نے علم حدیث وفقہ کو محفوظ اور شائع کرنے میں بڑا کام کیا۔ نیز سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی کتاب مرتب کی۔ زبیر رضی اللہ عنہ کے صاحب زادوں میں تیسری تاریخ ساز شخصیت مصعب کی ہے جن کی والدہ، رباب بنت انیف تھیں۔ وہ بڑے بہادر اور عمدہ سپہ سالار تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی عبداللہ رضی اللہ عنہ کے لئے عراق فتح کیا۔ ان کے جیتے جی عبداللہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر کوئی آفت نہیں آئی۔ ان کے مارے جانے پر اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کہا کہ ''آج قریش کا شجاع تریں انسان مارا گیا۔''

مختصر یہ کہ زبیر رضی اللہ عنہ کے چھ بیویوں سے گیارہ لڑکے اور نو لڑکیاں ہوئیں یہ روایت ابن سعد کی ہے۔ بعض روایات میں سات بیویوں، نو لڑکوں اور نو لڑکیوں کا ذکر آیا ہے۔ زبیر رضی اللہ عنہ اپنے بیٹوں کے نام شہداء کے ناموں پر رکھا کرتے تھے اس امید پر کہ شاید اللہ انہیں شہادت کے مرتبہ پر فائز کرے۔ مثلاً

عبداللہ، عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نام پر
عروہ، عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نام پر
حمزہ، حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے نام پر
جعفر، جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نام پر
عبیدہ، عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کے نام پر
وغیرہ وغیرہ

مرثیے

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ان کی زوجہ محترمہ حضرت عاتکہ[1] بنت زید رضی اللہ عنہا نے ایک دلدوز مرثیہ کہا۔ بعض دوسرے حضرات نے بھی مرثیے کہے لیکن شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بہت عمدہ اور سچا مرثیہ کہا۔ منجملہ اور باتوں کے حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا:

> ''وہ (زبیر رضی اللہ عنہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر قائم رہے۔ وہ اہل حق سے محبت کرتے رہے اور حق بہت عمدہ چیز ہے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت قریبہ حاصل تھی، چنانچہ بہت سے مصائب زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور کئے اور ان سے اسلام کو نصرت حاصل ہوئی پس ان کی مثل نہ ان سے پہلے تھا اور نہ اب قیامت تک ہوگا۔''

---

[1] یہ مشہور صحابی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ تھیں۔ پہلے حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے نکاح میں تھیں۔ ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا۔ ان کی شہادت پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے۔ مؤلف

سیرت و اخلاق

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ چند اوّلیں مسلمانوں میں سے تھے۔ انہوں نے اسلام کی خاطر ہر قسم کی سختیاں عزم و حوصلہ سے برداشت کیں اور قربانیاں دیں۔ ہر مشکل وقت پر دین کے لئے سینہ سپر رہے۔ اسلام اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے پہلے تلوار انہوں نے اٹھائی۔ پہلے حبشہ (ایتھوپیا) اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ تمام غزواتِ نبوی میں شرکت کی۔ احد، بدر، خندق، خیبر اور حنین میں سرفروشانہ کارنامے سرانجام دیئے۔ بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ میں شامل ہوئے۔ فتح مکہ میں ایک فوجی دستہ کی قیادت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ابتدائے عہد میں مرتدین کو مدینہ سے بھگانے کے لئے لڑے۔ عہد فاروقی میں شام اور مصر کے جہاد میں شریک ہوئے۔ مصر کی فتح میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ وہ نہایت شجاع، نڈر، مہم جو تھے اور اسلام اور مسلمانوں کی خاطر جان ہتھیلی پر رکھے رہتے تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں بہت محبت تھی اور ان کے ہر حکم پر لبیک کہتے تھے۔ وہ عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ موت کا خوف ان کے ارادوں میں حائل نہ ہوسکتا تھا۔ تقویٰ، خشیت الٰہی، پرہیز گاری، رقیق القلبی، غیرت، خودداری، بے نیازی، سخاوت اور ایثار میں پیش پیش تھے۔ دیانت اور صداقت میں ممتاز تھے ابتدا میں تجارت کرتے تھے۔ عہد نبوی اور عہد خلفا میں انہیں زرعی اراضی ملی تو زراعت بھی کرنے لگے تھے۔ تجارت اور زراعت دونوں میں بڑے کامیاب تھے۔ عہد فاروقی میں دوسرے بدری صحابہ کی طرح ان کا بھی پانچ ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر ہوگیا تھا۔ مالِ غنیمت میں سے بھی حصہ ملتا تھا۔ مالدار صحابہ میں سے تھے۔ ایک ہزار غلام ان کے لئے کام کرتے تھے۔ ان کی کمائی میں سے ایک درہم بھی اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ نہیں کرتے تھے، سب کا سب یتیموں، بیواؤں اور دوسرے حاجت مندوں کو دے دیتے۔ لباس اور غذا میں بڑی سادگی سے کام لیتے تھے۔ البتہ میدان جنگ میں اعلیٰ اور عمدہ ریشمی کپڑے پہن کر جاتے غالباً دشمن کو مرعوب کرنے کے لئے۔ ویسے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جلدی بیماری کی وجہ سے انہیں بطورِ خاص ریشمی کپڑے پہننے کی اجازت دے دی تھی۔ ان کی عظمت اخلاق اور عظیم اسلامی خدمات کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ''زبیر رضی اللہ عنہ ارکان دین میں سے ایک رکن ہیں'' [1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انہیں اپنے بعد خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بعض اختلافات کے باوجود انہیں ان کی مظلومانہ شہادت پر سخت افسوس اور ندامت ہوئی اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو حفاظت کے لئے ان کے مکان کے دروازے پر مقرر کیا اور وہ ان کی حفاظت میں لڑتے ہوئے زخمی ہوئے۔ مقتدر صحابہ میں سے انہوں نے اور طلحہ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے قصاص کے لئے آواز بلند کی اور اسی سلسلے میں اپنی جان بھی دے دی۔

زبیر رضی اللہ عنہ امانت اور دیانت کے لئے مشہور تھے اور عمدہ منتظم بھی تھے۔ لوگ اپنی امانتیں ان کے پاس رکھواتے تھے اور مرتے وقت انہیں اپنی اولاد اور ترکے کا محافظ، سرپرست اور امین بناتے تھے۔ خود حضرت

[1] اسد الغابہ۔

عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ صحابہ نے بھی انہیں اپنا وصی مقرر کیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے نہایت دیانتداری سے ان کے مال کی حفاظت کی اور ان کے پسماندگان پر اپنے مال میں سے خرچ کیا۔ یتیموں کی پرورش میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ اللہ کی راہ میں بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ لوگوں کی امانتیں بھی قرضے کے طور پر رکھتے تھے۔ اور حاجت مندوں پر خرچ کردیتے تھے۔ شہادت کے وقت بائیس لاکھ درہم کے مقروض تھے۔ جنگ جمل کی صبح کو اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد سب سے پہلے میرا قرض ادا کرنا اور اگر ادائیگی سے عاجز آجاؤ تو میرے مولیٰ (اللہ) سے مدد مانگنا۔ انہوں نے کوئی درہم و دینار ترکہ میں نہیں چھوڑا۔ البتہ زرعی اراضی تھی اور گیارہ مکان مدینے میں، دو بصرے میں، ایک کوفے میں اور ایک مصر میں۔

مکان سب کے سب اللہ کی راہ میں وقف کردیئے تھے۔ اراضی بیچ کر قرضہ ادا کرنے کی کوشش کی گئی اور قرض خواہوں کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھتیجے اور داماد حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کے چار لاکھ درہم بھی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر قرض تھے۔ انہوں نے قرضہ معاف کردینے کی پیش کش کی لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے قرضہ کی ادائیگی میں انہیں ایک قطعہ زمین دے دیا[1] مؤخر الذکر متواتر چار سال تک حج کے موقع پر اعلان کرتے رہے کہ جس کا کوئی قرضہ ان کے باپ کے ذمے ہو ان سے لے لے۔ غیر منقولہ جائیدادوں کی فروخت سے حاصل شدہ رقم میں سے قرضوں کی ادائیگی کے بعد باقی رقم زبیر رضی اللہ عنہ کی بیواؤں اور اولاد میں تقسیم کی گئی۔ ہر بیوہ کے حصے میں گیارہ لاکھ درہم آئے۔

بعض حق ناشناس لوگ روسی اشتراکیت کے پراپیگنڈہ کے زیر اثر یا کسی دوسری وجہ سے زبیر رضی اللہ عنہ اور دوسرے بزرگ صحابہ پر سرمایہ داری کا الزام رکھتے ہیں، وہ تعصب جہالت اور جنبہ داری سے بالاتر ہو کر سوچیں کیا یہ وہ سرمایہ داری ہے جس کے خلاف کارل مارکس اور اس کے دوسرے ہم نواز زہر اگلتے ہیں؟ محض سرمائے کی موجودگی سے آدمی سرمایہ دار نہیں ہو جاتا۔ عہد نبوی کے سرمایہ دار وہ تھے جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے لئے ہر موقع پر اپنی دولت بے دریغ لٹائی اور ان کی ان خدمات کا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتراف کیا۔ قرآنی نیز اشترا کی اصطلاح میں بھی اصل سرمایہ دار وہ ہے جو خزانے کا سانپ بن کر بیٹھ رہے انہی کے لئے قرآن میں سخت وعید آئی ہے۔ یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ قرآن میں سونے چاندی کا ذکر آیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ اسلام کے پہلے سوشلسٹ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اپنے پاس سونا چاندی نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنے وظیفہ کی رقم کو تانبے کے سکوں میں تبدیل کرالیا کرتے تھے تاکہ قرآنی وعید کی زد میں نہ آئیں۔ سرمایہ داری دراصل فکر و عمل اور ذہنیت کی ایک مخصوص کیفیت کا نام ہے جس کے تحت دولت کے استعمال یا عدم استعمال سے طبقاتی امتیازات اور دوسری معاشی

---

[1] طبقات ابن سعد۔

جو لوگ علی رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ میں ذاتی عداوت وغیرہ کے افسانے گھڑتے ہیں وہ اس واقعہ پر غور کریں۔ کیا یہ عداوت کا اظہار ہے یا مودت کا؟ مؤلف

اور معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں اہل حاجت کا استحصال کیا جاتا ہے اور بعض طبقوں میں محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر قرآن کے حکم کے مطابق مقررہ زکوٰۃ وصدقات اور ''حق سائل ومحروم'' ادا کیا جاتا رہے تو طبقاتی کشمکش اور معاشرتی خرابیوں کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ اسلام نے جائز طریقے سے دولت کمانے (جسے قرآن اللہ کا فضل ڈھونڈنے کا نام دیتا ہے) سے منع نہیں کیا البتہ اس میں سے اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرنے پر زور دیا ہے تاکہ دولت ایک فرد یا کنبے یا کچھ افراد یا کنبوں میں جمع ہو کر نہ رہ جائے۔ دولت گردش میں رہنی چاہئے اور سب کی ضروریات پوری ہوتی رہنی چاہئیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے بعد جو دولت بچ رہے اس کے جمع کرنے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ اگر دولت جمع کرنے کی قطعی ممانعت ہوتی تو زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی اور تقسیم وراثت کے احکام بے معنی ہوتے بلکہ قرآن میں ان کے نزول ہی کی ضرورت نہ ہوتی۔ زکوٰۃ کی ادائیگی (جو اسلام کے بنیادی ارکان خمسہ میں سے ہے) اور تقسیم وراثت کے احکام میں جمع مال و دولت کو پہلے سے لازم اور فرض مانا گیا ہے۔ اسلام ہر معاملے میں افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے اور ان کے حالات میں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ فتح مکہ کے بعد وہ وہیں سخت بیمار ہو گئے اور بظاہر جینے کی امید نہ رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں اپنا سارا مال راہ خدا میں دے دینا چاہتا ہوں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک تہائی مال دے دینے کی اجازت دی۔ اور فرمایا کہ اپنے اہل وعیال کو بے زر چھوڑ جانے سے زردار چھوڑ جانا بہتر ہے۔ اگر خدائی حکم یہ ہوتا کہ سب کچھ راہ خدا میں دے دو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سعد رضی اللہ عنہ کو صرف ایک تہائی مال کا حکم نہ دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جمع مال سے منع نہیں کیا لیکن انفاق مال کا حکم ضرور دیا اور کون نہیں جانتا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، زبیر ابن العوام رضی اللہ عنہ اور دوسرے مالدار قریش وانصار نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے ہر موقع پر بے دریغ خرچ کیا۔ اگر مذکورہ بالا صحابہ یا دوسرے صحابہ یا عامتہ المسلمین میں سے کچھ لوگ دولت دین کے ساتھ دولت دنیا سے بھی بہرہ یاب تھے اور انہوں نے اس دولت کے جملہ حقوق بھی ادا کئے اور راہ خدا میں اپنا مال لٹایا تو ان پر اللہ تعالیٰ کا دوہرا فضل ہوا ایسے دولت مند ایک حدیث نبوی کی رو سے دوسرے مسلمانوں پر سبقت لے گئے۔ چنانچہ اگر سرمایہ داری وہ تھی جس کے حامل اور نمائندے زبیر رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ وغیرہ تھے تو کاش ایسی سرمایہ داری کا ساری دنیا میں دور دورہ ہوتا اور ایسے سرمایہ دار قدم قدم پر ملتے، سرمایہ کو اس کا استعمال مذموم یا مستحسن بناتا ہے کیا آج کل بھی کوئی جناب عبدالستار ایدھی کی سرمایہ داری کو مذموم کہہ سکتا ہے، کاش ہمارے ملک میں سینکڑوں، ہزاروں عبدالستار ایدھی پیدا ہو جائیں سرمایۂ آخرت میں کسی کے لئے طوقِ جہنم اور کسی کے لئے پروانۂ جنت ہوگا۔ عشرۂ مبشرہ کے ''سرمایہ داروں'' نے اللہ کو قرض حسنہ دے دے کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کی۔ ان کے مال سے اسلام اور مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ یہ جو ہمارے زمانے میں روسی

اشتراکیت[1] سے مرعوب ہو کر ملکیت زمین اور ملکیت سرمایہ کے متعلق مباحث چھیڑے گئے ہیں اور آثارِ صحابہ کے متعلق طرح طرح کی موشگافیاں نیم جاہلانہ طریقے سے کی جا رہی ہیں۔ اس بارے میں عہد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صحابہ کے تاریخی عمل پر گہری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان کا طرز عمل ہمارے لئے مشعل راہ ہونا چاہئے نہ کہ مارکس، اینگلز، لینن اور ماؤ کا عمل۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور صحابہ کے عہد کو ''خیر القرون'' کہا ہے یعنی اس عہد میں ہمہ جہتی خیر کا پہلو غالب تھا اور آنے والوں کے لئے مثالی نمونہ۔ دولت بھی اس میں آجاتی ہے۔ ایسا کرنے سے اسلام کا زرّیں اصولِ اعتدال نکھر کر سامنے آجائے گا اور ہمیں یہ اعلان کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ ''اسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے۔'' اگر ہم اسلام کو اپنا دین تسلیم کرتے ہیں تو سیاست اور معیشت بھی اس میں آجاتے ہیں یقیناً ''خیر القرون'' کے بزرگ دین، سیاست اور معیشت کو ہم سے بہتر سمجھتے تھے۔

مندرجہ بالا عبارت ایک طویل جملۂ معترضہ کے طور پر آگئی۔ ذکر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی سیرت و کردار کا تھا سیر الصحابہ کے مصنف معین الدین ندوی مرحوم نے مسند احمد کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے علم اصلاح بلند کیا تو ایک شخص نے آکر کہا کہ ''اگر حکم دیجئے تو علی رضی اللہ عنہ کی گردن اڑا دوں؟'' بولے، ''تم تن تنہا اس قدر عظیم الشان فوج کا مقابلہ کیسے کرو گے؟'' کہا ''میں علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں جا کر شامل ہو جاؤں گا اور موقع پا کر دھوکے سے قتل کر دوں گا۔'' فرمایا: ''نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''ایمان قتل ناگہانی کی زنجیر ہے۔ اس لئے کوئی مومن کسی کو اچانک نہ مارے۔'' افسوس کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ دونوں اچانک مارے گئے۔ مارنے والوں نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کی۔

روایت حدیث

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ روایت حدیث میں سخت محتاط تھے۔ کسی کے پوچھنے پر فرمایا کہ میں جب سے اسلام لایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا نہیں ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کچھ سنا۔ لیکن میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے بھی سنا کہ ''جو مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں کر لے۔'' اس احتیاط پسندی کی وجہ سے دوسرے صحابہ کے مقابلے میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے صرف اڑتیس احادیث مروی ہیں۔ رضی اللہ عنہ

---

[1] حالانکہ اب روس اور چین بھی مارکسی نظریات سے تائب ہوتے جا رہے ہیں اور زمین اور سرمایہ کے متعلق ان کے نظریات بدل رہے ہیں۔ مؤلف

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ

(دگرگوں کرد تقدیر عمر رضی اللہ عنہ را)

نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ......خطاب کے بیٹے عمر! آج یوں شمشیر بکف کہاں جا رہے ہو؟

عمر بن خطاب ......(غضبناک آواز میں) آج محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قصہ پاک کروں گا۔ کیونکہ وہ اپنی پھونکوں سے کعبہ کا چراغ گل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنے دین سے قریش میں فتنہ وفساد اور تفرقہ وانتشار پھیلا دیا ہے، بھائی کو بھائی سے، باپ کو بیٹے سے، ماں کو بیٹی سے جدا کر دیا ہے۔ اور ہمارے بتوں کو برا کہتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ تباہ ہونے کو ہے، وہ نہ رہے گا تو فتنے کی جڑ کٹ جائے گی۔

نعیم رضی اللہ عنہ......پہلے اپنے گھر والوں کی خبر لو۔ تمہاری بہن اور بھائی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کر چکے ہیں۔

عمر......ہائیں! کیا سچ کہتے ہو؟

نعیم......بالکل سچ

عمر......اچھا! تو پہلے گھر والوں ہی کی خبر لیتا ہوں۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نمبر آئے گا۔

عمر غصے میں بھرے، دانت کچکچاتے، ہونٹ چباتے، تلوار ہلاتے بڑی تیزی سے چلتے ہوئے اپنا رخ بدل لیتے ہیں۔ نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتنہ ٹلا۔ لیکن متفکر بھی ہیں کہ اب یہ سیل بلا کہاں جائے گا اور کیا غضب ڈھائے گا۔

عمر......ایک دروازے پر پہنچ کر بڑے زور سے کھٹکھٹاتے ہیں۔ اندر سے کچھ پڑھنے کی آواز آ رہی ہے

اندر سے ایک زنانہ آواز کون ہے؟

عمر......(غضبناک آواز میں) دروازہ کھولو۔ میں ہوں عمر۔

مکان کے اندر ایک کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ پھر دروازہ ذرا سا کھلتا ہے ایک نورانی صورت نوجوان خاتون نمودار ہوتی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ اسے دھکا دیتے ہوئے بڑی بے صبری سے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ گھر کے اندر نوجوان خاتون کے علاوہ ایک پروقار، بلند وبالا، قوی الجثہ، گندم گوں نوجوان بھی موجود ہے، تقریباً بیس سال کی عمر ہوگی۔ عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر اضطراب اور گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوتے ہیں، لیکن پھر وقار اور سکون کی کیفیت بحال ہو جاتی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ سیدھا اس کی طرف جاتے ہیں اور گریبان سے پکڑ کر دھاڑتے ہیں کہ "تم لوگ کیا پڑھ رہے تھے؟"

نوجوان......کچھ نہیں

عمر......سچ بتا، میں نے خود سنا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تو بھی بے دین ہو گیا ہے۔ تجھ پر بھی بنو ہاشم کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جادو چل گیا ہے، ٹھہر! میں تجھے اس بے دینی کا مزا چکھاتا ہوں۔

پھر اس کے لمبے لمبے بالوں سے پکڑ کر نیچے گرا دیتے ہیں اور گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دیتے ہیں۔ اس اندھی مار کٹائی سے نوجوان کا سر پھٹ جاتا ہے اور وہ اپنے ہی خون میں نہا جاتا ہے وہ صحت مند اور توانا ہے۔ چاہتا تو عمر کی دراز دستی کا جواب دیتا یا کم سے کم اپنا دفاع ہی کرتا مگر وہ ایسا نہیں کرتا کیونکہ اپنے ستانے والوں کے خلاف ابھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ وہ صرف زبان سے کہتا ہے کہ

اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمد رسول اللّٰہ

(میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں) یہ سن کر عمر کا جوش غضب اور بڑھ جاتا ہے اور ان کی مار پیٹ میں مزید شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر نوجوان خاتون جو پٹنے والے نوجوان کی بیوی ہے، آگے بڑھتی ہے اور اپنے شوہر کو بچانے کے لئے سینہ سپر ہو جاتی ہے لیکن وہ بھی عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بری طرح پٹ جاتی ہے اور اس کا چہرہ لہولہان ہو جاتا ہے۔ تب وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے اور عمر رضی اللہ عنہ کو چیلنج کرتی ہے۔

"عمر! یہ سچ ہے کہ ہم دونوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کر چکے ہیں، اب موت بھی اسلام کو ہمارے دلوں سے نہیں نکال سکتی۔ اب ہم کبھی بت نہیں پوج سکتے، تجھ سے جو ہو سکتا ہے کر لے"

عمر رضی اللہ عنہ زخمی خاتون کا یہ چیلنج سن کر ششدر رہ جاتے ہیں۔ اس کے زخمی چہرے پر نظر ڈالتے ہیں تو دل پگھلنے لگتا ہے۔ ایک مبہم سی پشیمانی لاحق ہو جاتی ہے کہ شاید چھوٹی بہن اور بہنوئی کو ناحق مارا۔ وہ خاصی نرم آواز میں اپنی بہن سے کہتے ہیں:

"اچھا تم لوگ جو کچھ پڑھ رہے تھے، مجھے بھی دکھاؤ، میں بھی اسے پڑھ کر دیکھوں کہ یہ کیا چیز ہے جو لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دیوانہ بنائے دیتی ہے۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ تو کہیں اسے ضائع نہ کر دے۔" نوجوان خاتون جواب دیتی ہے

"نہیں میں صرف اسے پڑھ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیسا اسلام ہے۔" عمر رضی اللہ عنہ جواب دیتے ہیں،

"اگر پڑھنا چاہتا ہے تو پہلے غسل کر کے پاک صاف ہو جا۔ یہ اللہ کا کلام ہے ناپاک ہاتھوں میں نہیں دیا جا سکتا۔"

"یہ کیوں؟ آج سے پہلے میں نے کبھی کوئی ایسا کلام نہیں پڑھا جس کے پڑھنے سے پہلے غسل کرنا پڑا ہو؟"

"یہ قرآن ہے، اللہ کا مقدس کلام...... اسے ناپاک نہیں چھو سکتے۔"

عمر پر ذہنی مرعوبیت کے اثرات نمایاں ہیں۔

"تو میں گو ناپاک ہوں۔ خیر! پانی لاؤ میں غسل کرتا ہوں۔"

بہن پانی لا کر دیتی ہے اور غسل کی ترکیب بتاتی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن و قلب کی مرعوبیت کے تاثرات چہرے پر چھا گئے ہیں غسل سے فراغت کے بعد نوجوان خاتون قرآن پاک کے اجزا عمر رضی اللہ عنہ کے آگے لا کر رکھ دیتی

ہے۔ یہ سورہ طٰہٰ ہے۔ عمر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کر کے پڑھنے لگتے ہیں اور ایک ایک لفظ کے ساتھ متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں اور دل و دماغ سے کفر کی تاریکی اور زنگ اترتا چلا جاتا ہے چہرے کی رنگت اور دل کی کیفیت بدلتی جاتی ہے۔ کلام اللہ کے الفاظ و بیان کی شوکت وندرت اور فصاحت و بلاغت انہیں مسحور کر لیتی ہے۔ معانی و مضمون کی رفعت وطرفگی اور تاثیر کفر و شرک کی کثیف و تاریک دنیا سے اٹھا کر انہیں ایک دوسرے ہی عالم میں لے جاتی ہے جو بہت پاکیزہ ولطیف ہے جب وہ اس آیہ کریمہ پر پہنچتے ہیں کہ

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ○ (آیت ۱۴)

ترجمہ: میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تو میری ہی عبادت کیا کر اور میری یاد کے لئے نماز پڑھا کر) تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں سبحان اللہ! کیا عمدہ کلام ہے! اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمد رسول اللّٰہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)

اور یوں رسول اللہ ﷺ کی ایک دن پہلے کی مانگی ہوئی دعا اللہ نے ایک خوش نصیب کے حق میں قبول فرمائی۔ جناب رسالت مآب ﷺ نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی تھی کہ بارالٰہا! عمرو بن ہشام اور عمر بن الخطاب میں سے جو تجھے پسند ہو، اسے اسلام میں داخل فرما! اول الذکر تو ابوجہل بن کر رہا اور دوسرے کو اللہ نے فاروق اعظم بنا دیا، اللہ کی راہ میں پٹنے اور لہولہان ہونے والے یہ نوجوان میاں بیوی کون تھے؟ یہ عمر بن الخطاب کے بہنوئی اور چچازاد بھائی سعید بن زید رضی اللہ عنہ تھے اور ان کی بیوی عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت خطاب تھیں۔ اللہ نے ان سعید روحوں کی استقامت وعزیمت ایمانی کے ذریعے عمر بن الخطاب کو اسلام کے دوسرے خلیفہ راشد ہوئے اور دنیا کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جا سکتی۔

تو یہ تھے ابوالاعور سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ۔ موحد ابراہیمی زید بن عمرو کے سابق الایمان موحد و مومن بیٹے، جن کے باپ قیامت کے دن تن تنہا ایک امت کی حیثیت سے اٹھیں گے۔ حدیث عشرۂ مبشرہ کے راوی بھی یہی سعید بن زید رضی اللہ عنہ ہیں۔ رضی اللہ عنہ۔

خاندان

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی اور بہنوئی تھے۔ اور قبیلہ بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی والدہ فاطمہ بنت بعجہ قبیلہ بنوخزاعہ میں سے تھیں۔ والدہ کا نام بھی فاطمہ، زوجہ اول کا نام بھی فاطمہ، دونوں نے اپنے شوہروں کی زندگی میں عمدہ کردار ادا کیا۔ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زوجہ محترمہ تھیں اور فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا ان کی والدہ۔ ان کے علاوہ بھی تاریخ اسلام میں کتنی ہی فاطمائیں ہیں جن کے نام عزت واحترام کے ساتھ زندہ رہیں گے۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوالاعور تھی۔ ان کے والد زید بن عمرو بن نفیل اپنے زمانے کے دین

ابراہیمی کے واحد موحد تھے جو نہ بتوں کی پوجا کرتے تھے نہ ان پر چڑھاوے چڑھاتے تھے، نہ بتوں کے نام کی قربانی اور کھانا وغیرہ کھاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نبوت سے پہلے دیکھا تھا انہوں نے دین حق کی تلاش میں شام، عراق اور جزیرہ کا سفر کیا۔ یہودی اور عیسائی عالموں، راہبوں سے ملاقاتیں بھی کیں لیکن گوہر مقصود کے حصول میں ناکامی ہوئی تو ہاتھ اٹھا کر کہا: ''اے اللہ! تو گواہ رہ کہ میں تیرے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوں۔'' وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ''اے اللہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تجھے اپنی عبادت کا کون سا طریقہ پسند ہے تو میں اسی طریقہ سے تیری عبادت کرتا۔'' ان کی توحید پرستی کی وجہ سے قریش ان کے دشمن اور درپئے آزار ہو گئے اور وہ بھری دنیا میں اپنے آپ کو تنہا پاتے تھے، خود ان کے بھائی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے والد خطاب ان کو بہت تنگ کرتے تھے، اگر زید کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ ملتا تو وہ یقیناً اسلام لاتے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال پہلے کسی نے غلطی سے یا شبہ سے انہیں بلادلخم میں قتل کر ڈالا اور وہ غار حرا کے دامن میں دفن کئے گئے جہاں سے اسلام کا سورج طلوع ہونا تھا، زید کہا کرتے تھے کہ ''میں اس نبی کا منتظر ہوں جو آلِ اسماعیل میں سے ہوگا۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق انہوں نے عامر بن ربیعہ سے کہا تھا کہ اگر میں نے آلِ اسماعیل کے ہونے والے نبی کو پا لیا تو ان پر ایمان لاؤں گا لیکن اگر بدقسمتی سے مجھے یہ سعادت نصیب نہ ہوئی تو اے عامر! اگر تمہاری زندگی وفا کرے اور تم انہیں پاؤ تو میرا اسلام عرض کرنا۔'' چنانچہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد عامر اسلام لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زید کا سلام پہنچایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سلام کا جواب دیا اور ان کے لئے رحمت کی دعا کی نیز فرمایا کہ میں نے زید کو جنت میں دامن کشاں دیکھا ہے۔ بعد میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زید کے انجام کے متعلق سوال کیا۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ زید کی مغفرت کرے اور ان پر رحمت کرے وہ دین ابراہیمی پر مرے اور قیامت کے دن وہ تنہا ایک امت کی حیثیت سے اٹھیں گے۔ اس کے بعد مسلمانوں میں سے کوئی یاد کرنے والا ان کے لئے دعائے مغفرت کئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

زید کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ زندہ درگور کی جانے والی معصوم بچیوں کو بچا کر اپنے تحفظ میں لے لیا کرتے تھے اور ان کی کفالت کرتے تھے۔ اگر بعد میں ان کے والد اپنے پاس رکھنے اور پرورش کرنے پر آمادگی ظاہر کرتے تو انہیں واپس دے دیتے، ورنہ خود ان کی پرورش کرتے اور جوان ہونے پر شادیاں کر دیتے، یہ اتنی بڑی سماجی اور اخلاقی خوبی تھی کہ قبل اسلام کے عرب میں ناپید تھی۔

قبولِ اسلام

تو اس اپنی ذات میں ایک امت، زید بن عمرو بن نفیل کے سپوت تھے حضرت ابوالاعور سعید بن زید رضی اللہ عنہ۔ زیدؔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے اور ان پر ایمان لانے کی حسرت لے کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ مگر سعید الفطرت باپ کے سعید الفطرت بیٹے نے ایمان لانے میں کافی جلدی سے کام لیا اور ریعانِ جوانی ہی میں تقریباً

پندرہ سولہ سال کی عمر میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر سابقون الاولون میں شامل ہو گئے موحد باپ کی تربیت اور عملی مثال نے انہیں اس کے لئے پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا۔ سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے اس وقت اسلام قبول کیا جب مسلمانوں کی تعداد بے حد قلیل تھی۔ وہ کمزور اور بے یارومددگار تھے، اور علانیہ اپنے اسلام کا اظہار کرتے ہوئے بھی ہچکچاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی دارارقم کو اپنا مرکز دعوت و تبلیغ نہ بنایا تھا۔ بالآخر انہی سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی کا قبول اسلام عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا باعث بن گیا اور یہ وہ عظیم الشان واقعہ ہے جو اسلامی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ پھر سعید رضی اللہ عنہ کی والدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی مسلمان ہو گئیں۔ مکہ میں دوسرے مسلمانوں کی طرح انہوں نے بھی سختیاں جھیلیں۔

ہجرت

جب حضرت سعید رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ محترمہ نے دوسرے صحابہ کی طرح مدینے کی طرف ہجرت کی تو وہاں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ[1] کے بھائی رفاعہ بن عبدالمنذر کے ہاں قیام کیا تا آنکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مکان کے لئے ایک قطعہ زمین عطا کیا۔ رفاعہ رضی اللہ عنہ بدر و احد کے غزوات میں شامل ہوئے۔ احد میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

مواخاۃ

مدینہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی مواخاۃ حضرت رافع بن مالک زرقی رضی اللہ عنہ سے قائم کی جو انصار کے طبقہ اولیٰ میں سے ہے۔ مدینہ کے ان آٹھ آدمیوں میں سے تھے جو سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے اور غزوہ احد میں شہادت پائی۔

غزوات میں شرکت

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ غزوہ بدر کے سوا تمام غزوات و مشاہد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے اور نہایت شجاعت، استقامت اور فداکاری سے لڑے۔ جیسا کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے حالات میں مذکور ہوا، غزوہ بدر سے کچھ دن پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو شام سے آنے والے قافلہ قریش کا پتہ لگانے کے لئے بھیجا تھا۔ جب وہ قافلے کی خبر لے کر واپس آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی فتح سے واپس آ رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعید رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ کو بھی مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا اور فرمایا کہ جہاد کا ثواب بھی ملے گا۔ گویا بدریوں کی فہرست میں شامل کر لئے گئے۔ صحیح بخاری میں حضرت سعید رضی اللہ عنہ کا نام اصحاب بدر کی فہرست میں پایا جاتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر ایک دستہ فوج کے افسر تھے۔

عہد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں

جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے ساتھ تعاون کرتے رہے اور جو خدمت بھی

---

[1] یہ ابولبابہ رضی اللہ عنہ وہی مشہور صحابی ہیں جن کے نام سے آج بھی مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اسطوانہ ابولبابہ موجود ہے۔ ان کی قبول توبہ کا ذکر احادیث میں ہے۔ مؤلف

ان کے سپرد کی گئی اسے حسن وخوبی سے سرانجام دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جہادِ شام میں پیدل فوج کے افسر تھے۔ جنگ اجنادین میں رسالہ کے سپہ سالار تھے اور اپنی شجاعت سے امتیاز حاصل کیا۔ دمشق کے محاصرہ میں حصہ لیا۔ جنگ فحل میں پیدل فوج کی قیادت کی۔ حمص کے رومی گورنر کو لڑائی میں قتل کیا جس کے بعد حمص پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ جنگ یرموک میں جب مسلمانوں کے میمنہ کو رومیوں نے دبا لیا اور ان کے پاؤں اکھڑنے لگے تو جن افسروں نے انتہائی پامردی، ثابت قدمی اور قوتِ ایمانی کا مظاہرہ کیا ان میں سعید بن زید رضی اللہ عنہ بھی تھے مولانا شبلی، الفاروق میں لکھتے ہیں کہ ''سعید بن زید رضی اللہ عنہ غصہ میں گھٹنے ٹیکے ہوئے کھڑے تھے، رومی ان کی طرف بڑھے تو شیر کی طرح جھپٹے اور مقدمہ کے افسر کو مار کر گرا دیا۔ پھر قلب سے نکل کر زوردار حملہ کیا۔ اور رومی دور تک پسپا ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ میدان کے سرے پر جو نالہ تھا اس کے کنارے تک آ گئے۔ وہ ان کی لاشوں سے پٹ گیا اور میدان خالی ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے کچھ مدت کے لئے انہیں دمشق کا گورنر بھی مقرر کیا لیکن وہ گورنری سے مستعفی ہو کر رضا کارانہ طور پر پھر جہاد میں شریک ہو گئے اور جب تک پورا شام فتح نہیں ہو گیا جہاد میں اپنی ہمت اور توانائی صرف کرتے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اپنے جانشین کے انتخاب کے لئے جو مجلس شوریٰ یا انتخابی کونسل نامزد کی تھی اس میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو اس لئے شامل نہ کیا کہ وہ ان کے رشتہ دار تھے حالانکہ وہ ہر لحاظ سے اس کے اہل تھے۔ تاہم سعید رضی اللہ عنہ چونکہ فطرتاً قناعت پسند، خاموش طبع اور جاہ پسندی سے نفور واقع ہوئے تھے۔ انہیں یہ بات ناگوار نہیں گزری اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور خاموشی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت وہ کوفہ میں تھے۔ سانحۂ شہادت کی جب خبر ملی تو انہیں سخت رنج وافسوس ہوا۔ کوفہ کی جامع مسجد میں تقریر کی اور کہا کہ ''اے لوگو! تم نے جو سلوک عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ روا رکھا اگر اس سلوک کی وجہ سے کوہ احد اپنی جگہ سے ٹل جائے تو اس کا ٹل جانا مناسب ہوگا۔'' شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جب فتنوں نے سر اٹھایا تو ان سے بالکل الگ تھلگ رہے اور حالات پر کڑھتے رہے۔ بقیہ زندگی زُہد وعبادت میں گزار دی۔ نہ جنگ جمل میں کسی طرف سے شریک ہوئے نہ جنگ صفین میں مدینہ کے قریب وادیٔ عقیق میں گوشہ نشیں ہو گئے اور زندگی کے بقیہ ایام وہیں خاموشی سے گزار دیئے۔

مؤرخین نے ان کے مفصل حالات لکھنے میں ایک قسم کے بخل سے کام لیا ہے، غالباً اس لئے کہ وہ نمود ونمائش اور جاہ طلبی سے دور بھاگتے تھے اور پہلے دو خلفاء کے دور کے بعد وہ اسلامی ریاست اور معاشرے کے معاملات میں بہت کم سرگرم اور فعال دکھائی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ تاریخ اس بارے میں بھی خاموش ہے کہ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیعت بھی کی تھی یا نہیں تاہم ان کے دل میں خلیفہ چہارم کا بے حد احترام تھا، ایک دفعہ کوفہ کی جامع مسجد میں کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ ایک دریدہ دہن نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ برداشت نہ کر سکے اور گورنر کو مخاطب کرتے ہوئے سختی سے فرمایا کہ ''اے مغیرہ! یہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ تیرے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو برا بھلا کہتے ہیں اور تو

انہیں منع نہیں کرتا کیا تو نہیں جانتا کہ علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی؟ مغیرہ رضی اللہ عنہ ان دنوں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی ڈانٹ سن کر پی گئے اور آئیں بائیں کر کے ٹال گئے۔

حضرت سعید رضی اللہ عنہ جنگ جمل، جنگ صفین اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات پر بہت کڑھتے تھے۔

وفات

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے نزدیک وادی عقیق میں جمعہ کے دن دوپہر سے قبل وفات پائی جہاں انہوں نے مستقل رہائش اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ محمد ابن سعد نے ''طبقات'' میں سال وفات ۵۰ھ یا ۵۱ھ لکھا ہے۔ ابن خلدون، اسد الغابہ اور تذکرۃ الکرام کے مصنفین بھی اس پر متفق ہیں۔ اگرچہ بعض نے سال وفات ۵۵ ہجری بھی لکھا ہے لیکن اجماع ۵۱-۵۰ ہجری پر ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی یہ سالِ وفات دیا ہے۔

مدینہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نماز جمعہ کی تیاری کر رہے تھے کہ انہیں حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر ملی۔ انہوں نے نمازِ جمعہ ترک کر دی اور عقیق تشریف لے گئے۔ عقیق سے ان کی میت لوگوں کے کندھوں پر مدینہ لائی گئی۔ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے غسل دیا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حنوط ملا اور نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز جنازہ میں لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ نے انہیں لحد میں اتارا۔ یہی سوچتے ہوں گے کہ ع

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو دار البقیع میں سپرد خاک کیا گیا۔

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوفہ میں وفات پائی اور کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ لیکن مؤرخین نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔

وفات کے وقت سن شریف تقریباً اسی برس تھا۔

سیرت و کردار

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ ہمیشہ بغض و افتراق سے بچ کر رہے اور جمیع مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ ان کے دل میں موجزن رہا۔ طبیعت میں سادگی اور انکسار تھا۔ دل دنیاوی جاہ و حشمت سے بے نیاز تھا۔ علم و فضل کے لحاظ سے فضلائے صحابہ میں سے تھے، صرف عقیق کی جاگیر پر گزر بسر تھی۔ آخر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عراق میں کچھ جاگیر دے دی تھی۔ اہل بدر واحد کے برابر وظیفہ ملتا تھا۔ طمع سے پاک اور قناعت پسند تھے۔ لوگوں کے حقوق کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مستجاب الدعوات واقع ہوئے تھے۔ ایک دفعہ بنی امیہ کے زمانے میں جب مروان بن الحکم، مدینہ کا گورنر تھا، اروی نامی عورت نے اس سے شکایت کی کہ سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے اس کا ایک قطعہ زمینِ ز

بردستی ہتھیا لیا ہے۔ مروان نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ انہوں نے مروان کو جواب دیا کہ ''تم میری نسبت یہ بدگمانی کرتے ہو کہ میں نے اس عورت کا قطعہ زمین غصب کر لیا ہے درآنحالیکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص ایک بالشت بھر زمین پر ظلم سے قبضہ کرے گا، قیامت کے دن اسے ویسے سات قطعات زمین کا طوق پہنایا جائے گا۔ لیکن مروان نہ مانا اور حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے قسم کھانے کو کہا۔ اس پر وہ متنازعہ زمین سے دستبردار ہو گئے لیکن بددعا کی کہ ''یا اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو یہ اندھی ہو جائے اور اسے اسی کی زمین میں موت آئے یا اپنے ہی گھر کے کنوئیں میں گر جائے۔ اور مسلمانوں پر میرا حق اور سچائی ظاہر ہو جائے۔'' خدا کی قدرت دیکھئے کہ اس نے اپنے نیک اور سچے بندے کی دعا قبول کی تھوڑی ہی مدت بعد اروی کی بینائی جاتی رہی۔ پھر ایک دن وہ اپنے ہی گھر کے کنوئیں میں گر کر مر گئی۔ تب سے اہل مدینہ میں یہ کہاوت بن گئی کہ

اعماكِ الله كما اعمى الاروى

یعنی خدا تجھے اسی طرح اندھا کر دے جس طرح اس نے اروی کو اندھا کیا

روایتِ حدیث

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے اڑتالیس احادیث مروی ہیں۔ عشرۂ مبشرہ والی حدیث کے راوی بھی وہی ہیں؟ رضی اللہ عنہ

کتابیات

۱	تفہیم القرآن	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۲	ترجمان القرآن جلد دوم	مولانا ابوالکلام آزادؒ
۳	تفسیر پارۂ اوّل	امام حسن عسکریؒ
۴	صحیح بخاری	امام بخاریؒ
۵	[illegible] مسلم	امام مسلمؒ
۶	تجرید بخاری	امام بخاریؒ
۷	مشکوٰۃ المصابیح	(اُردو ترجمہ مظاہر حق)
[illegible]	[illegible]ی	امام احمد بن عیسیٰ ترمذیؒ
۹	[illegible]	ایضاً
[illegible]	[illegible]الحدیث	مولانا محمد منظور نعمانی
۱۱	[illegible] ابن ہشام	اُردو ترجمہ از مولانا عبدالجلیل صدیقی، مولانا غلام رسول مہر
[illegible]	[illegible] ابن سعد	محمد ابن سعد (اُردو ترجمہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی، کراچی)
۱۳	[illegible]مد رسول اللہ	اُردو ترجمہ ''سیرت ابن اسحاق از ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مشمولہ نقوش رسول نمبر جلد ۴)
۱۴	تاریخ طبری	امام محمد ابن جریر طبری (اُردو ترجمہ شائع کردہ نفیس اکیڈمی، کراچی)
۱۵	الاخبار الطّوال (اُردو ترجمہ)	ابوحنیفہ دینوری
۱۶	فتوح البلدان	البلاذری (اُردو ترجمہ)
۱۷	تاریخ مسعودی	(مروج الذہب) (اُردو ترجمہ)
[illegible]	تاریخ الخلفاء	جلال الدین سیوطی (اُردو ترجمہ لطیف الدین احمد)
[illegible]	تاریخ ابن خلدون	عبدالرحمٰن (اُردو ترجمہ)

۲۰ مقدمہ تاریخ ابن خلدون	عبدالرحمٰن ابن خلدون (اُردو ترجمہ سعد حسن خاں یوسفی)
۲۱ ازالۃ الخفاء	شاہ ولی اللہؒ
۲۲ سیرت النبیؐ	مولانا شبلیؒ
۲۳ رحمت للعالمینؐ	قاضی سلیمان منصور پوری
۲۴ حیاتِ محمدؐ	محمد حسین ہیکل (اُردو ترجمہ)
۲۵ محسن اعظم و محسنین	فقیر وحید الدین
۲۶ اسلام (انگریزی)	جسٹس امیر علی (اُردو ترجمہ روح اسلام، از ہادی حسین)
۲۷ اے شارٹ ہسٹری آف سراسنز (انگریزی)	ایضاً (مختصر تاریخ صحرانشینانِ عرب)
۲۸ تاریخ عربز (انگریزی)	فلپ کے حتی (عربوں کی تاریخ)
۲۹ تاریخ اسلام	مولانا معین الدین ندوی
۳۰ سیر الصحابہ	مولانا معین الدین ندوی
۳۱ خلفائے محمدؐ	(عمر ابوالنصر، اُردو ترجمہ نقوش، رسول نمبر جلد میں شامل)
۳۲ سیرت سرورِ عالمؐ	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۳۳ خلافت و ملوکیت	ایضاً
۳۴ تاریخ دعوت و عزیمت	سیّد ابوالحسن علی ندوی
۳۵ اسلامی انسائیکلوپیڈیا	سیّد قاسم محمود
۳۶ آیاتِ بینات	نواب محسن الملک
۳۷ اثر المشاہیر اسلام	ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن
۳۸ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (انگریزی)	
۳۹ محمدؐ (انگریزی)	ابوبکر سراج (مارٹن لنگز)
۴۰ Gloricaus Caliphat (انگریزی)	
۴۱ ابوبکر، صدیق اکبرؓ	محمد حسین ہیکل (اُردو ترجمہ)
۴۲ سیّد ابوبکر صدیقؓ	حبیب الرحمٰن خان شیروانی
۴۳ ابوبکر صدیقؓ	سعید احمد اکبر آبادی

۴۴	خلیفہ ابوبکرؓ (انگریزی)	ایم اے عزیز
۴۵	الفاروق	مولانا شبلی
۴۶	عمر فاروق اعظمؓ	محمد حسین ہیکل (اُردو ترجمہ)
۴۷	خلافت ابوبکرؓ و عمرؓ	ڈاکٹر طٰہٰ حسین (اُردو ترجمہ شاہ حسن عطا)
۴۸	الفتنۃ الکبریٰ	ڈاکٹر طٰہٰ حسین (اُردو ترجمہ از عبدالحمید نعمانی) موسومہ ''حضرت عثمان اور حضرت علیؓ تاریخ وسیاست کی روشنی میں''
۴۹	شاہکارِ رسالت	غلام احمد پرویز
۵۰	حضرت عمر بن الخطابؓ	راجہ محمد شریف (نقوش رسول نمبر جلد نمبر ۷)
۵۱	حضرت علی کرم اللہ وجہہ	ایضاً
۵۲	ماہنامہ قومی ڈائجسٹ	ابوبکر صدیقؓ نمبر
۵۳	ایضاً	عمر فاروقؓ نمبر
۵۴	ایضاً	علی المرتضیٰؓ نمبر
۵۵	علیؓ	ڈاکٹر محمد حمید اللہ
۵۶	سیرت علیؓ	نامی
۵۷	کوکب دری فی فضائل علیؓ	سیّد محمد صالح کشفی (اُردو ترجمہ مناقب مرتضوی از سیّد شریف حسین سبزواری)
۵۸	تحفۃ الاحباب فی تاریخ اصحابؓ	سیّد ذاکر حسین جعفری
۵۹	خلفائے راشدین کی باہمی یگانگت	منشی عبدالرحمٰن خاں
۶۰	نیرنگ فصاحت	(اُردو ترجمہ نہج البلاغہ از سیّد ذاکر حسین اثناعشری)
۶۱	صحابہ کرام حضرت علیؓ کی نظر میں	منشی عبدالرحمٰن
۶۲	دستور علیؓ (فارسی)	ڈاکٹر صادق نقوی ایرانی
۶۳	سیّدت عبدالرحمٰنؓ بن عوف	سیّد فضل بن احمد
۶۴	تذکرہ الکرام......تاریخ خلفائے عرب واسلام	
۶۵	الموافقۃ بین اہل بیت والصحابہ	علامہ زمخشری
۶۶	دس بڑے مسلمان	شیخ محمد اسماعیل پانی پتی
۶۷	عشرہ مبشرہ	سیّد جلال الدین جعفری تھانیسری
۶۸	عشرہ مبشرہ	قاضی حبیب الرحمٰن

۶۹ تجلیات روح ایران درادوار تاریخی (فارسی) کاظم زادہ (بحوالہ شاہکارِ رسالت)
۷۰ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح طالب ہاشمی
۷۱ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص ایضاً
۷۲ سیرت عائشہؓ سیّد سلیمان ندویؒ
۷۳ عمر بن عبدالعزیز احمد ذکی صفوت
۷۴ قرآنی تصور مملکت ڈاکٹر محمد حمیداللہ
۷۵ کتاب الخراج (اُردو ترجمہ) امام ابو یوسف
۷۶ عہد نامہ عتیق
۷۷ دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس (انگریزی) ڈاکٹر مورس برکاتی
۷۸ دربارِ اکبری محمد حسین آزاد
۷۹ تذکرۂ غوثیہ شاہ گل حسن
۸۰ تاریخ ادبیات عربی استاذ احمد حسن زیات
اُردو ترجمہ عبدالرحمٰن سورتی
۸۱ انسانیت موت کے دروازے پر ابوالکلام آزاد
۸۲ سیر المصنفین محمد یحییٰ تنہا
۸۳ مذہبی تعلیم اور باطنی تعلیم مرزا محمد سعید دہلوی
۸۴ محمڈن ازم (انگریزی) آرا ے گب
۸۵ روسی رہنماؤں کے نام خط الیزاندر سولژے نیتسن

نوجوانوں کے لیے رہنما کتاب

تصریحات

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتبہ: سلیم منصور خالد

☆ طلبہ وطالبات سے خطابات

☆ سوالات پر پُرمغز جوابات

☆ مولانا مودودیؒ کی اسیری کی مکمل روداد

البدر پبلی کیشنز

23-راحت مارکیٹ اُردو بازار لاہور

فون: 042-37225030-0300-8485030

فقہ کی تدوین جدید کے لیے رہنما کتاب

اصولِ فقہ

حصہ اوّل - حصہ دوم

مولانا معین الدین خٹک

* اُردو زبان میں اصولِ فقہ پر سہل اندازِ تحریر
* علمی مسائل پر محققانہ آراء کا مجموعہ

مضبوط جلد - معیاری کاغذ - آفسٹ طباعت

البدر پبلی کیشنز

23-راحت مارکیٹ اُردو بازار لاہور

فون:042-37225030-0300-8485030

اصلاحِ اخلاق و معاشرت کے لیے

نہایت مفید کتاب

اسلامی زندگی

ڈاکٹر محمد علی ہاشمی

ترجمہ: محمد رضی الاسلام ندوی

- زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ہر گھر کی ضرورت
- اسلامی تہذیب و معاشرت کے نمایاں پہلو

البدر پبلی کیشنز

23-راحت مارکیٹ اُردو بازار لاہور

فون: 042-37225030-0300-8485030

سیرتِ پاک ﷺ پر ہماری دو خوبصورت کتابیں

الروح والریحان

محمد وقاص خان

☆ نوجوانوں کے لیے خوبصورت تحفہ ☆ سیرت پاک پر منفرد تحریر

آسان اور عام فہم زبان ☆ مستند واقعات

خوبصورت اور مضبوط جلد۔ معیاری کاغذ۔ آفسٹ طباعت

ھو سیّدنا ﷺ

ڈاکٹر اُم کلثوم

خواتین اور طالبات کے لیے نہایت مفید

دل نشین اندازِ بیان۔ دل میں اتر جانے والا اندازِ تحریر

خوبصورت ٹائیٹل۔ اعلیٰ اور معیاری کاغذ

البدر پبلی کیشنز

23۔ راحت مارکیٹ اُردو بازار لاہور

فون: 042-37225030-0300-8485030

عشرہ مبشرہ

بشیر ساجد